تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دارالاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ ـــــــ فون ۲۱۳۷۶۸

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دار الاشاعت کراچی
طباعت : ۱۹۹۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات در ۶ جلد

...... ملنے کے پتے ......

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 26- نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بک ڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی،
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور۔

ادارۃ المعارف جامعہ دار العلوم کراچی
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انار کلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ کئی ماہ کی کوشش کے بعد دارالاشاعت کراچی کی جانب سے تفسیر مظہری اردو کا ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

میرے والد ماجد جناب الحاج محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں اشاعت دین کے پیش نظر قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، سیرت و تاریخ کی متعدد گرانقدر کتب کی طباعت کی خدمات انجام دی وہاں ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ تفسیر مظہری کی طباعت واشاعت کا شرف بھی حاصل کریں کیونکہ حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی" نے اس تفسیر میں ایک خاص طرز یہ بھی اختیار فرمایا کہ مسلک کے اعتبار سے احناف اور شافعی مسلک کے نظریاتی اختلافات بھی واضح فرمائے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ احناف کا اس سلسلے میں کیا مقام ہے۔ اس وجہ سے اس کی افادیت اور بھی بہت بڑھ گئی ہے، نیز مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف قرآن و حدیث اور فقہ میں اپنے وقت کے نامور علماء میں شامل تھے تو دوسری طرف باطنی علوم اور تزکیہ سلوک میں بھی شیخ وقت سمجھے جاتے تھے، شاید اسی وجہ سے یہ تفسیر تمام دینی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی ہے۔

اس تفسیر کا اردو ترجمہ مولانا سید عبدالدائم جلالی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوۃ المصنفین دہلی کے زیر اہتمام فرمایا تھا، لیکن یہ تفسیر اب تک عوام کو بسہولت دستیاب نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نے (حسب اجازت حکومت سندھ پاکستان DPR (NO /2/PB/91.213.24.3.1991) سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

حتی الامکان اس کی اشاعت میں کوشش کی ہے کہ اغلاط نہ رہ جائیں، لیکن پھر بھی تمام حضرات سے درخواست ہے کہ کوئی غلطی نظر آئے تو ادارے کو مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازیں اور دنیا و آخرت کے لئے نافع بنائیں، آمین

طالب دعا **خلیل اشرف عثمانی**
ولد محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نوٹ:۔ پہلے یہ تفسیر ہاتھ کی کتابت اور لیتھو طریقہ طباعت پر دستیاب تھی اب الحمد للہ کمپیوٹر کی عمدہ کتابت اور آفسٹ طریقہ طباعت کے ساتھ اور آیات کے نمبر کے ساتھ اور عنوان کے مقامات کو انڈر لائن کرکے پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین

فہرست مضامین تفسیر مظہری اردو جلد بارہویں

اے اللہ کہ تیرے سوا کوئی قابل عبادت نہیں ہم تیری ثنا کرتے ہیں تیری پاکی کا اقرار کرتے ہیں تیری مدد کے خواستگار ہیں۔ تجھ سے معافی کے طالب ہیں تو جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے نکال لیتا ہے ہر بھلائی تیرے ہی قبضہ میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو ہر چیز پر قابو رکھتا ہے۔ تو ہی ہمارا مالک ہے اور آسمان وزمین اور ان کی ساری کائنات کا مالک ہے ہم تجھ سے تیرے پیغمبر اور محبوب اور اپنے آقا ومخدوم حضرت محمد ﷺ کے لئے نیز تمام انبیاء اور پیغمبروں اور نیک بندوں کے لئے رحمت وسلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ آمین

سورۃ الملک مکی ہے اس میں ۳۰ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَبٰرَكَ یہ لفظ برکت سے ماخوذ ہے برکت اس زیادتی کو کہتے ہیں جو زیادتی والے کے کمال پر دلالت کرتی ہے اور مقتضی نقصان نہیں ہوتی۔ مخلوق کی صفات میں نقص ہونا لازم ہے اس لئے وہ کمال وصفی جس پر لفظ تَبٰرَكَ دلالت کر رہا ہے صفات مخلوق سے بالکل منزہ ہوگا (گویا تبارک کا معنی ہو تعالیٰ اور متنزہ) اللہ پر تمام اسماء وصفی کا اطلاق محض نتائج کے لحاظ سے ہوتا ہے مبادی ساقط الاعتبار ہوتے ہیں (مثلاً اللہ کا ایک اسم وصفی رحمٰن ہے۔ رحمت کا معنی ہے ایسا میلان نفس جس کا نتیجہ مہربانی اور احسان ہو میلان نفس مبدء احسان ہے اور احسان میلان نفس کا نتیجہ اور ظاہر ہے کہ اللہ نفس اور نفسانیات سے پاک ہے اس لئے اس کی ذات میں میلان نفس ہونے کا احتمال ہی نہیں میلان نفس تو حقیقت میں نفس کا تاثر ہوتا ہے کسی قرابت دوستی یا اور کسی قسم کے تعلق کے زیر اثر دل میں رقت اور جھکاؤ پیدا ہوتا ہے اس رقت اور جھکاؤ کا تقاضا ہوتا ہے کہ جس کو دیکھ کر تاثر ہوا ہے اس کے ساتھ مہربانی کی جائے اللہ میں تاثر کہاں ممکن ہے۔ اثر پذیری کمزوری اور عجز کی نشانی ہے اور اللہ نہ عاجز ہے نہ ضعیف۔ اس لئے اللہ پر لفظ رحمان کا اطلاق اس اعتبار سے نہیں کہ اس کے اندر میلان نفس پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے رحمان ہونے کا معنی یہ ہے کہ میلان نفس کا جو نتیجہ ہوتا ہے اور جو نفسانی میلان کا (انسان میں) باعث ہوتا ہے یعنی احسان اور مہربانی وہ اللہ میں محقق ہے پس اللہ رحمٰن ہے یعنی محسن ہے منعم ہے فضل کرنے والا ہے یہی حالت اللہ کے بابرکت ہونے کی ہے برکت کا معنی ہے زیادتی جس کا تقاضا متبرک کا کمال وصفی اور ہر نقص سے متنزہ ہے۔ اللہ کی شان میں زیادتی مقداری نہیں بلکہ مرتبہ اور متنزہ کی ہے پس اللہ صاحب برکت ہے یعنی بزرگ شان والا اور مشابہت مخلوق سے پاک ہے) اور جس طرح دوسرے عظمت ظاہر کرنے والے صیغے (مثلاً کَبِیْرٌ، عَظِیْمٌ، مُتَعَالِی) اللہ کے کمال وصفی پر دلالت کرتے ہیں اسی طرح یہ لفظ بھی اس کی بڑائی کو ظاہر کرتا ہے۔

الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ لفظ ید متشابہات میں سے ہے کیونکہ اللہ جسمانی مادی ہاتھ نہیں رکھتا۔ علماء متاخرین نے ید کی تفسیر قدرت سے کی ہے (یعنی اسی کے قبضہ وقدرت میں ملک ہے) ملک یعنی ہر چیز پر اقتدار اور ہر شئے پر تصرف۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ یعنی جس چیز کو وہ چاہے اس پر وہ

قَدِيْرٌ قدرت رکھتا ہے (مراد یہ ہے کہ شئ اگرچہ مصدر ہے لیکن اس جگہ اسم مفعول کا معنی مراد ہے یعنی مشئ کے معنی میں ہے اور مشئ سے مراد ہے وہ چیز جس کو اللہ چاہتا ہے اس صورت میں یہ لفظ معدومات ممکنہ کو شامل ہے اور محال کو شامل نہیں کیونکہ محال واقعی وہی ہوتا ہے جس پر نہ ممکن کو قدرت ہوتی ہے نہ واجب کو جیسے اللہ کی صفات کمالیہ کا سلب۔ ذات الٰہی کا فناء وغیرہ) جس چیز کا اللہ ارادہ کرے اس کو کوئی دفع نہیں کر سکتا اس لئے اس کے سوا کسی سے امید وبیم رکھنا جائز نہیں۔

اس آیت میں گویا اللہ کے وجود اس کے کمال وصفی اور ہر نقص سے پاک ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور دعویٰ کا تقاضا ہے کہ دلیل بیان کی جائے اس لئے بعد آنے والی آیات کو بطور دلیل ذکر فرمایا۔ دعویٰ مذکورہ کے ثبوت کی کچھ نشانیاں تو خود انسانوں

میں موجود ہیں یعنی موت و حیات کی پیدائش کچھ آسمانوں میں موجود ہیں یعنی آسمانوں کی تخلیق کی ہم آہنگی اور ان کے اندر کسی رخنہ کا نہ ہونا۔ کچھ زمین میں موجود ہیں یعنی زمین کا قابل سکونت ہونا کچھ زمین کے پیداوار میں موجود ہیں یعنی (زندہ مخلوق کا) رزق (جو بقائے حیات کا سبب ہے) اور پرندوں کے قطار در قطار جھنڈ۔ ان چیزوں کا ذکر تو بطور دلیل کیا گیا ہے (اس سے اللہ کی قدرت اس کی صفات کاملہ اس کی ہستی اور اس کا بے عیب ہونا ثابت ہوتا ہے) درمیان میں ذیلی[1] طور سے ان کافروں کے عذاب کا بھی تذکرہ کر دیا ہے جو نہ صداء حق سنتے ہیں اور نہ دلائل و آیات کو سمجھتے ہیں اور ان اہل ایمان کے ثواب کو بھی بیان کر دیا ہے جو اللہ کا خوف رکھتے اور براہین و شواہد کے مطالعہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فرمایا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ حیات اللہ کی بھی صفات ہے اور مخلوق کی بھی (مطلق) حیات کے لئے صاحب حیاۃ کا عالم قادر اور صاحب ارادہ ہونا لازم ہے۔ اللہ نے اپنے ارادہ اور ممکنات کی استعداد (فطری) کے موافق مختلف ممکنات کو مختلف درجات کی زندگی عطا فرمائی ہے (الف) کسی مخلوق (یعنی انسان) کو ایسی زندگی عطا فرمائی جس کے نتیجہ میں اللہ کی ذات و صفات کی معرفت اس کو حاصل ہو گئی یہی وہ امانت ہے جس کو انسان نے برداشت کر لیا اور تمام آسمان زمین پہاڑ اس کو اٹھانے سے خوف زدہ ہو گئے یہ حیات (معرفت اندوز) اللہ کی طرف سے محض القاء نوری کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اس کو اور اس کے مقابل والی موت کو آیت اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ میں بیان فرمایا ہے (یعنی وہ حیات معرفت اندوز سے محروم تھا ہم نے اس کو ایمان و معرفت دے کر زندہ کیا) امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کا کچھ (پرتو) ڈال دیا تو جس کو اس نور کا کچھ حصہ مل گیا اس نے ہدایت پائی اور جس کو نہ ملا وہ گمراہ ہو گیا (اسی لئے) میں کہتا ہوں کہ علم الٰہی (کے مطابق لکھ کر) قلم خشک ہو گیا (ب) کسی مخلوق کو ایسی زندگی بخشی کہ حس اور حیوانی حرکت کو وہ اپنے ساتھ لے آئی اس حیات اور اس کے مقابل (موت حیوانی) کی تعبیر اس آیت میں فرمائی ہے کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ تم بے حس و حرکت تھے اللہ نے تم کو حیات (حیوانی) عطا کی پھر وہ تم کو بے حس و حرکت کر دے گا پھر زندگی عطا کرے گا (ج) کسی مخلوق کو ایسی زندگی عطا کی کہ وہ اپنے ساتھ صرف نمو (تناسب طبعی کے موافق لمبائی چوڑائی اور موٹائی میں بیشی) لاتی ہے اس حیات (نباتی) کو اور اس کے (موت نباتی) کو اس آیت میں ظاہر فرمایا یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی زمین کے خشک ہونے کے بعد اللہ اس کو نباتی زندگی عطا فرماتا ہے یہ تینوں زندگیاں روح انسانی روح حیوانی اور نفس نباتی پھونکے جانے سے حاصل ہوتی ہیں جمادات میں ان تینوں اقسام میں سے کسی قسم کی زندگی نہیں ہے اسی لئے بتوں کے متعلق فرمایا اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ لیکن جمادات بھی ایک گونہ زندگی سے بے بہرہ نہیں ہیں آیت وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ اس پر دلالت کر رہی ہے اس آیت کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ حیات جمادی تو (ہر قسم کے) وجود کے لئے لازم ہے اللہ نے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ہر چیز

---

[1] ذیلی ذکر سے مراد یہ ہے کہ دلیل کی تکمیل سے کفار کے عذاب اور اہل ایمان کے ثواب کا تعلق نہیں۔ یہ مراد نہیں کہ عذاب و ثواب کا اس جگہ ذکر بے محل یا غیر مفید یا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کی ہستی اور اس کی صفات کے منزہ ہونے کا ثبوت آیات کونیہ کو گہری نظر سے دیکھنے اور دیکھنے کے بعد ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ایمان لائے گا۔ وہ ثواب کا مستحق ہو گا اور جو منکر ہو گا عذاب پائے گا۔ عذاب و ثواب کا ذکر نہ بے محل ہے نہ غیر مفید۔

اس فقیر کے خیال میں اگر تفسیری تقریر اس طرح کی جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ آیات مذکورہ میں تمام انسانوں کے لئے درس ہدایت دیا گیا ہے۔ کچھ انسان کسی دعوی کے ثبوت کے لئے براہین و دلائل کے خواستگار ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے براہین تکوینی بیان کر دیں کچھ لوگ کم حوصلہ اور کوتاہ نظر ہوتے ہیں براہین کو نہیں سمجھتے انکی قوت مطالعہ ضعیف ہوتی ہے ان کی ہدایت کے لئے اعمال کے اچھے برے نتائج کی تصویر کشی اور ترغیب و تربیت کافی ہوتی ہے۔ آیات مذکورہ میں ضمنی طور پر ان چیزوں کی بھی صراحت فرما دی۔ واللہ اعلم۔

اللہ کی پاکی اور ثنا کا اظہار کرتی ہے (اور بغیر حیات کے نہ تسبیح ممکن ہے نہ حمد) لہ

موت کا معنی ہے مطلقاً زندگی نہ ہونا یا ایسی چیز میں زندگی نہ ہونا جو زندہ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے (جیسے نابینا انسان یا حیوان کو ہی کہا جاتا ہے کیونکہ انہی میں بینا ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے دیوار کو نابینا نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ دیوار میں بینا ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے) بصورت اول موت و حیات میں نفی و اثبات کا تقابل ہے اور بصورت دوئم عدم و ملکہ کا تقابل ہے دونوں صورتوں میں موت ایک وصف عدمی ہوگا جس کا تقاضا ہے کہ حقیقت ممکن کا عدم حیات عارضہ پر مقدم ہے (یعنی موت کو حیات پر تقدم حاصل ہے) ہم نے جو آیات اوپر نقل کی ہیں یعنی اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ اور آیت كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ اور آیت يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اور آیت كُنْ فَيَكُوْنَ یہ تمام آیات اسی مضمون کی طرف رہنمائی کررہی ہیں اور چونکہ موت کو زندگی پر طبعی تقدم حاصل ہے اس لئے اس جگہ (خلق الموت والحیاۃ) میں بھی موت کا ذکر حیات سے پہلے کیا۔

کچھ علماء موت کو صفت وجودی قرار دیتے ہیں (یعنی جس طرح زندگی ایک امر وجودی ہے اسی طرح موت بھی ایک وجودی مخلوق ہے) اس صورت میں موت و حیات کے درمیان تقابل تضاد ہوگا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوں گی گویا علم قدرت احساس حرکت وغیرہ سے جسم کو روکنے والی جسمانی کیفیت کا نام موت ہوگا اس قول کے ثبوت میں آیت خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ کو پیش کیا گیا ہے تخلیق موت کا تقاضا ہے کہ موت امر وجودی ہو کیونکہ جو چیز اصلاً معدوم ہے وہ مخلوق نہیں۔ اعدام اصلیہ مخلوق نہیں ہیں۔

ہم اس قول کی تردید میں کہتے ہیں کہ موت کوئی انضمامی امر نہیں کہ باہر سے لاکر جسم کے ساتھ اس کو ملا دیا جاتا ہو بلکہ ایک انتزاعی صفت ہے جو مُردوں کے اجسام سے انتزاع کی جاتی ہے (امر انتزاعی کا وجود محض انتزاعی ہوتا ہے انتزاع کرنے والا عمل کسی سے اپنے دماغ میں کسی وصف کا انتزاع کرلیتا ہے اگر انتزاع کرنے والا عمل انتزاع نہ کرے تو اس وصف کا کوئی وجود واقعی نہیں ہوتا گویا امر انتزاعی اختراعی ہوتا ہے اور محض ذہنی۔ خارج میں امر انتزاعی کا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا۔ پس موت بھی ایسی ہی ایک چیز ہے کہ مردہ کو دیکھ کر دماغ اس سے عدم حس و ارادہ اور فقدان حرکت و عمل کا مفہوم اخذ کرلیتا ہے ورنہ عدم حس عدم ارادہ عدم حرکت و عمل کوئی خارجی چیزیں نہیں ہیں) جس طرح نابینا کو دیکھ کر نابینائی کا انتزاع کیا جاتا ہے بصیرت کشف کا فیصلہ ہے کہ علم الٰہی میں ہر چیز اپنی نقیض کے ساتھ الگ الگ امتیاز کو لئے ہوئے موجود تھی اور ہے زندگی اور اس کی نقیض موت علم اور اس کی نقیض جہالت قدرت اور عجز بینائی اور نابینائی غرض تمام اعدام اصلیہ اپنے نقائض اضافی کے ساتھ علم الٰہی میں ثابت ہیں جس رنگ سے صفات کمالیہ رنگین ہیں اسی رنگ سے اس مرتبہ میں اللہ نے ان کے اعدام کو رنگین بنا دیا ہے تمام ممکنات کی ماہیات وجودِ خارجی سے پہلے علم خداوندی کے مرتبہ میں ثبوت اور تقرر رکھتی ہیں یہی حقائق کونیہ اور اعیان ثابتہ ہیں جو اگرچہ بجائے خود صفات کا پرتو ہیں لیکن آنے والے وجود خارجی کی اصل بھی ہیں اور موجودات خارجیہ انہی کے سائے ہیں ہر ماہیت (وجود خارجی سے پہلے) درجۂ تقرر و ثبوت میں کون اول کہلاتی ہے تمام ممکنات خارجیہ اعیان ثابتہ کے سائے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ مبدء فیاض (خالق کائنات) سے ہر ممکن کو جو وجود خارجی عطا ہوتا ہے وہ ثبوت کونی یا تقرر علمی کی وساطت سے ہوتا ہے اعیان ثابتہ کے حجاب زجاجی (لیمپ کی چمنی) سے نور وجود چھنکر باہر آتا ہے اسی کی طرف آیت مَثَلُ نُوْرِهٖ

امام رازی اور دوسرے اکابر اہل تفسیر نے تسبیح جمادی کو حالی تسبیح قرار دیا ہے یعنی ہر چیز کی فطرت خلقت بناوٹ اور پر حکمت صنعت خالق کی حکمت قدرت اور توحید پر دلالت کررہی ہے۔ مگر یہ فقیر اکابر کرام کی اس تشریح کو سمجھنے سے قاصر رہا کیونکہ مخلوق سے خالق اور مصنوع سے صانع کی قدرت حکمت اور توحید پر استدلال تو ہر ہوشمند کرتا اور ہر سمجھدار اس کو سمجھتا ہے اگر تسبیح سے یہی دلالت حال مراد ہے تو پھر اس سے آگے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ کیوں فرمایا اور کیوں انسانی دانش کو ہر چیز کی تسبیح حالی سمجھنے سے قاصر قرار دیا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی تسبیح سے تسبیح مقالی ہی مراد ہے مگر ہر نوع کا مقال جدا جدا ہے ہر ایک کی زبان الگ ہے اور انسان دوسری مخلوق کی زبان نہیں جانتا اس کی تسبیح نہیں سمجھتا شاید حضرت قاضی صاحب نے ایک گونہ حیات جمادی کی صراحت کی ہے اس سے اسی طرف اشارہ ہے۔

کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن یاد رکھو کہ صفات اور ممکنات خارجیہ کے درمیان اعیان ثابتہ کی وساطت صرف اسی دنیا میں ہے آخرت میں وجود اور صفات وجود کا فیضان مبدء فیاض کی طرف سے اعیان ثابتہ کی وساطت کے بغیر ہوگا یہی وجہ ہے کہ دنیا میں تمام ممکنات آماجگاہ فناء ہیں اور آخرت میں کسی کے لئے فنا نہیں پس آیات مذکورہ یعنی کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَیْنَاکُمْ اور اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنَاہُ وغیرہ واضح دلالت کررہی ہیں کہ موت صفت ممکن ہے اور حیات پر مقدم ہے۔ رہا خَلَقَ الْمَوْتَ کا معنی تو اس جگہ خلق کا معنی اظہار ہے یعنی حیات کو موجود کر کے یا زائل کر کے اللہ نے موت کو ظاہر کیا یا یہ مطلب کہ اللہ نے مردوں کو اس طرح کردیا کہ عدم حیات ان سے منتزع ہوتی ہے۔ خلق کا معنی تقدیر (اندازہ کرنا) بھی ہے یعنی اللہ نے موت وحیات کا اندازہ کرلیا۔

بغوی نے بروایت عطاء حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے دنیا میں موت کو خَلَقَ (مقدر) کردیا ہے اور آخرت میں (دوامی) زندگی کو۔ میں کہتا ہوں شاید حضرت ابن عباسؓ کی مراد یہ ہے کہ اللہ نے دنیوی زندگی کی تعبیر موت سے اور۔ آخرت کی زندگی کی تعبیر حیات سے فرمائی ہے۔ کیونکہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ اعیان ثابتہ ممکنات خارجیہ کے اصول ہیں اور تمام موجودات ممکنہ کی حقیقت میں عدم داخل ہے۔ اس لئے دنیوی زندگی موت کی آمیزش سے خالی نہیں اور فی الحال اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ اور کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ اور کُلُّ شَیْئٍ ھَالِکٌ کہنا صحیح ہے کیونکہ صیغۂ مشتق (اسم فاعل صفت مشبہ وغیرہ) کا حال میں استعمال حقیقی ہے اور ماضی و مستقبل کے معنی میں مجازی۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ موت عرض نہیں بلکہ جسم ہے اس کی پیدائشی شکل مینڈھے کی ہے اور زندگی کی پیدائشی صورت گھوڑی کی بدور سافرہ میں سیوطیؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اس قول کی بنیاد حضرت ابن عباسؓ کے اس قول پر ہے جس کو بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ اللہ نے موت کو چتکبرے مینڈھے کی شکل پر اور زندگی کو چتکبری گھوڑی کی شکل پر پیدا کیا ہے موت کا مینڈھا جس طرف سے گزرتا ہے اور جس کو اس کی بو بھی آجاتی ہے وہ مرجاتا ہے اور زندگی کی گھوڑی وہی تھی جس پر جبرئیل اور تمام انبیاء سوار ہوتے تھے جس چیز کی طرف سے یہ گھوڑی گزرتی تھی اور جو چیز اس کی بو سونگھ لیتی تھی وہ زندہ ہوجاتی تھی اسی گھوڑی کے قدم کے نیچے کی مٹھی بھر خاک سامری نے لیکر بچھڑے کے اندر ڈالی تھی جس کی وجہ سے وہ زندہ ہوگیا تھا۔

میں کہتا ہوں اس روایت سے یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ موت اور زندگی صفت نہیں جسم ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چتکبرے مینڈھے کی شکل کا ایک جسم ہے جس کو موت کہا جاتا ہے اور گھوڑی کی شکل کا ایک جسم ہے جس کو زندگی کہا جاتا ہے اول الذکر جس چیز کی طرف سے گزرتا ہے اور وہ چیز اس کی بو پالیتی ہے تو مرجاتی ہے اور موخر الذکر جس چیز کی طرف سے گزرتا ہے تو وہ چیز زندہ ہوجاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ موت وزندگی بعینہ اس حیوان کے جسم کا نام ہے بلکہ جس طرح زہر کے قرب سے ایک خاص اثر مرتب ہوتا ہے اسی طرح ان دونوں جانوروں کے گزرنے اور ان کی بو محسوس کرنے سے ایک اثر پیدا ہوجاتا ہے جو موت وزندگی ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جب دوزخی دوزخ کو اور جنتی جنت کو جاچکیں گے تو موت کو لاکر دوزخ اور جنت کے درمیان ذبح کردیا جائے گا اور پھر ایک پکارنے والا پکارے گا اے اہل جنت (آئندہ) موت نہیں اور اے دوزخ والو آئندہ موت نہیں۔ اس وقت جنت والوں کی مسرت بالائے مسرت ہوگی اور دوزخیوں کا رنج بالائے رنج۔ صحیحین میں حضرت ابن سعیدؓ کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن موت کو چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لاکر دوزخ جنت کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اس حدیث کے آخر میں ہے پھر اس کو حکم کے مطابق ذبح کردیا جائے گا۔ حاکم اور ابن حبان نے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا موت کو چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا الخ ان روایات کے سلسلہ میں سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ان کے معنی پر غور نہ کیا جائے صرف مان لیا جائے اور دوسرے متشابہات کی طرح ان

کے (حقیقی) علم کو اللہ کے سپرد کردیا جائے (اور کہہ دیا جائے ہمارا ان پر ایمان ہے اور ان کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے) سیوطی نے حکیم ترمذی کا یہی قول نقل کیا ہے لیکن صوفیہ صافیہ کو چونکہ عالم مثال کا بھی کشف ہوا ہے اور عالم مثال میں ہر جوہر عرض بلکہ ہر غیر مادی چیز بلکہ باری تعالیٰ کی بھی ایک شکل ہے باوجودیکہ اللہ ہر شباہت سے پاک ہے اور عالم مثال پر ہی اس حدیث کو محمول کیا جاتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے باپ کو بے ریش و بروت جوان کی شکل میں دیکھا اس کے دونوں پاؤں میں سونے کی جوتیاں تھیں۔ کبھی اللہ کی قدرت سے صورت مثالیہ عالم مثال سے عالم شہادت کی طرف منتقل ہو کر آجاتی ہے بکثرت اولیاء کی اس سلسلہ میں کرامتیں مشہور ہیں تو ممکن ہے کہ قیامت کے دن خدا عالم مثال سے موت کی صورت مثالیہ لوگوں کے سامنے لے آئے اور بحکم الٰہی اسکو ذبح کردیا جائے تاکہ جنت اور دوزخ والے سمجھ جائیں کہ (موجودہ مکان میں) ہمیشہ رہنا ہے (آئندہ کبھی) موت نہیں ہوگی اسلام، ایمان، قرآن اعمال، امانت رحم اور دنیوی ایام کے حشر کا جو صحیح احادیث میں تذکرہ آیا ہے اس کی مراد بھی یہی ہے (کہ عالم مثال میں چونکہ ان سب کی صورتیں ہیں وہ ہی صورتیں سامنے لے آئی جائیں گی)

سیوطی نے بدور سافرہ میں بیان کیا ہے کہ تمام اعمال اور معانی (یعنی اجسام کے علاوہ) یہی مخلوق ہیں جن کی صورتیں اگرچہ ہم کو نظر نہیں آتیں لیکن اللہ کے علم میں ان کی صورتیں ہیں اہل حقیقت نے صراحت کی ہے کہ معانی کی حقیقتوں سے واقف ہونا اور ان کو بصورت جسمانی مشاہدہ کرنا کشف (اولیاء) کی ایک خاص قسم ہے احادیث اسکی بکثرت شاہد ہیں (انتہی) سیوطیؒ کا یہ قول عالم مثال کا بیان ہے (اولیاء کو عالم مثال ہی کا کشف ہوتا ہے عالم مثال ہی میں وہ معانی کی صورتیں دیکھتے ہیں)

لِيَبْلُوَكُمْ یعنی اوامر و نواہی کا پابند بنا کر اللہ تمہارے ساتھ بھی ویسا ہی عمل کرنا چاہتا ہے جیسا ممتحن امتحان دینے والوں کے ساتھ (ان کے درجات کو الگ الگ کردینے کیلئے) کرتا ہے (مطلب یہ کہ بندوں کو مکلف کرنا بصورت امتحان ہے لیکن یہ امتحان اس لئے نہیں کہ اللہ کو بندوں کی وہ حالت معلوم ہوجائے جو پہلے معلوم نہ تھی بلکہ اس لئے ہے کہ بندوں کے درجات کو الگ الگ کردیا جائے کوئی دوزخی اور کوئی جنتی ہوجائے۔

اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یہ جملہ لِيَبْلُوَكُمْ کا مفعول دوئم ہے بغویؒ نے بروایت حضرت ابن عمرؓ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ اَحْسَنُ عَمَلًا (یعنی) کون زیادہ اچھی سمجھ رکھتا ہے اور کون ممنوعات الٰہیہ سے اپنے نفس کی بازداشت کرنے والا ہے اور کون اطاعت الٰہیہ میں زیادہ سرگرم ہے (گویا عمل سے مراد ہے فہم تقویٰ اور اطاعت لِيَبْلُوَكُمْ کا تعلق خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ سے ہے یعنی تخلیق موت و حیات کی حکمت یہ ہے کہ فرمان بردار اور نافرمان کا (جدا جدا) ظہور ہوجائے کیونکہ اوامر و نواہی کا پابند بنانے کا مدار زندگی پر ہے زندگی ہی کی وجہ سے تعمیل احکام کی قدرت حاصل ہوتی ہے اور موت ایک واعظ ہے جس سے دانشمند نصیحت اندوز ہوتا ہے اور آخرت کے لئے توشہ فراہم کرنے کا موقع غنیمت سمجھتا ہے۔

حیوۃ و موت کا انقلاب صانع حکیم مختار کے وجود کی دلیل ہے حضرت عمارؓ بن یاسر کی مرفوع روایت ہے موت سب سے بڑا واعظ ہے اور ایمان سب سے بڑی دولت ہے۔ رواہ الطبرانی۔

امام شافعی اور امام احمد نے ربیع بن انس کا مرسل قول نقل کیا ہے کہ دنیا سے بے رغبت بنانے اور آخرت کی اندرونی طلب پیدا کرنے کے لئے موت کافی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے سات چیزوں سے پہلے عمل کرلو جو تمہارے سامنے آئیں گی۔ (۱) ایسا افلاس جو (خدا اور احکام خدا کو) فراموش کرادے۔ (۲) ایسی دولت جو سرکش بنادے۔ (۳) تباہ کن بیماری (۴) بے علم بنادینے والا بڑھاپا۔ (۵) (دنیا کو چھڑا دینے والی) موت۔ (۶) دجال یہ ایسا شر ہے جس کا (ہر پیغمبر کے زمانہ میں) انتظار کیا جاتا رہا ہے اور (۷) قیامت کی ساعت جو سب سے بڑی مصیبت اور تلخ ترین حقیقت ہے۔ ترمذی اور حاکم نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ احمد اور مسلم نے بروایت حضرت ابوہریرہؓ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ چھ چیزوں سے پہلے (اصلاح

اعمال) کرلو۔ (۱) مغرب سے آفتاب کا طلوع (۲) دھواں۔ (۳) دابتہ الارض، (۴) دجال، (۵) وہ چیز جو ہر شخص کے لئے مخصوص ہے یعنی موت اور (۶) وہ امر جو عمومی ہوگا یعنی قیامت بیہقیؒ نے حضرت ابولامہؓ کی روایت سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ　یعنی نافرمانوں سے انتقام لینے پر خدا غالب ہے۔

الْغَفُورُ ② یعنی جس کو چاہے بخشنے والا ہے۔

الَّذِي خَلَقَ　یہ ھُوَ کی دوسری خبر یا اَلْغَفُوْرُ کی صفت یا موصول اول (یعنی اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ) سے بدل ہے۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا　یعنی طبقات والے سات آسمان طِبَاق طَبَق کی جمع ہے جیسے جبال حبل کی یا طبقة کی جمع ہے جیسے رحاب رحبة کی۔ یا طِبَاقًا فعل محذوف کا مصدر۔ (یعنی مفعول مطلق) ہے موچی اگر جوتہ کو تہ بر تہ کر کے سیتا ہے تو کہتے ہیں۔ طَابَقَ النَّعلَ بہر حال لفظ طِبَاق جمع ہو یا فعل محذوف کا مصدر سَمٰوات کی صفت ہے یا حال ہے، سَمٰوات سَبع اور ان کی درمیانی مسافت کا بیان سورۂ بقر میں لکھا جا چکا ہے۔

مَا تَرٰى　یہ خطاب صرف رسول اللہ ﷺ کو ہے یا مخاطب عام ہے کوئی ہو اس میں مانفی کے لئے ہے یا استفہام انکاری کے لئے موخر الذکر صورت میں مالفظ تَرٰی کا مفعول مقدم ہوگا۔

فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ　خَلق کی اضافت عہدی ہے سَمٰوَاتِ سَبعَ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے مراد ہیں۔ تعریف جنس کے لئے اضافت نہیں ہے (یعنی عمومی مخلوق مراد نہیں ہے بلکہ آسمانی ہی مراد ہیں) کیونکہ جنس خلق میں تو بہت زیادہ واضح تفاوت ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ کی جانب خَلق کی اضاف تعظیمی ہے (یعنی رحمٰن اتنا عظیم الشان ہے کہ ساتوں آسمان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں) ہاں اگر تفاوت سے مراد ہو عدم تناسب اور توازنِ ضروری سے تجاوز (یعنی نقص اور عیب) تو اضافت جنسی ہو سکتی ہے (کیونکہ کسی مخلوق میں تخلیقی عدم تناسب اور نقص نہیں ہے) اس وقت عبارت کا مقتضا (یعنی مفہوم لازم) یہ ہوگا کہ مخلوق کی پیدائش جن احوال کے ساتھ ہوئی ہے ان سے بہتر احوال کا امکان ہی نہ تھا یعنی مجموعی اعتبار سے اس سے اعلیٰ نظام ممکن نہ تھا۔

مِنْ تَفٰوُتٍ　لفظ مِنْ زائد ہے یا تبعیض کے لئے ہے (یعنی کچھ بھی تفاوت) بشرطیکہ ما کو نافیہ قرار دیا جائے لیکن اگر ما کو سوالیہ کہا جائے تو مِنْ بیانیہ ہوگا۔

پورا جملہ (مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ) سبع سموات کا حال ہے یا خَلق کے فاعل یا اس کے مفعول سے حال ہے۔

(بجائے فِیْ خَلْقِهٖ کہنے کے فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ کہنے میں یعنی) بجائے ضمیر لانے کے الرحمن کا لفظ ذکر کرنے میں یا بجائے فِیہِ کہنے کی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ کہنے میں آسمانوں کی تخلیق کے (بے عیب اور ناقص نہ ہونے کی صراحت ہے کیونکہ ان کی تخلیق ایسی ذات کی طرف منسوب ہے جو ہر عیب سے پاک اور رحمت سے متصف ہے (اس لئے اس کی تخلیق بھی ناقص نہیں ہو سکتی) یا کَیفَ خُلِقَتْ سوال محذوف ہے اور یہ جملہ پہلے کلام سے بالکل الگ سوال محذوف کا جواب ہے۔ مراد یہ ہے کہ تعمیر انسانی کی طرح تخلیق خداوندی میں کوئی خرابی اور نقص نہیں ہے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ　یہ شرط محذوف کی جزا ہے یعنی اگر تمہارا خیال ہو کہ بار بار دیکھنے سے آسمانوں کی تخلیق میں کچھ عدم تناسب دکھائی دیا جائے گا تو پھر دیکھ لو۔

هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③　تم کو کوئی شگاف نظر نہ آئے گا فُطُور کا لفظ فَطَرَہٗ (اس کو پھاڑ دیا) سے ماخوذ ہے اس میں لفظ مِن زائد ہے یا تبعیض کے لئے ہے (کوئی شگاف) اور استفہام تقریری ہے۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ　اس جملہ کا عطف فَارْجِع پر ہے اور تثنیہ (یعنی لفظ کَرَّتَیْنِ جو کَرَّۃً کا

تثنیہ ہے) تکثیر کے لئے ہے (صرف دو مرتبہ دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ) بار بار دیکھنا مراد ہے جیسے لفظ لبیک میں (صرف دو مرتبہ حاضری مراد نہیں بلکہ بکثرت حاضری مراد ہے)

یَنْقَلِبْ ب ساکن ہے یہ (ارْجِعْ) امر کا جواب ہے۔

اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا دھتکاری ہوئی۔ خَاسِئٌ کا معنی ہے ناکام نامراد ذلت اور حقارت کے ساتھ دور پھینکا ہوا۔

وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۞ یَنْقَلِبْ کے فاعل یعنی اَلْبَصَرُ کا پہلا حال خَاسِئًا تھا یہ دوسرا حال ہے حَسِيْرٌ کا معنی ہے ماندہ یعنی بار بار دیکھنے سے تھکی ہوئی۔

بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ نچلا دنیوی آسمان موج بستہ ہے (یعنی لہریں ہے جن کو روک دیا گیا ہے) دوسرا آسمان سفید زمرد کا ہے۔ تیسرا لوہے کا چوتھا پیتل کا پانچواں چاندی کا چھٹا سونے کا ساتواں یاقوت سرخ کا۔ ساتویں آسمان اور ذات خداوندی کے حجابوں کے درمیان نور کے سات صحراء ہیں۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا یعنی نچلا آسمان جو زمین سے (بہ نسبت دوسرے آسمانوں کے) قریب ہے۔

بِمَصَابِيْحَ مَصَابِيْحَ سے مراد ہیں ستارے یہ تاریکی کے چراغ ہیں ان سے راستہ مل جاتا ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ تمام تارے دنیوی آسمان میں پیوست ہیں اس صراحت کے خلاف علماء فلکیات کا قول بے دلیل ہے ستاروں کی حرکات کے تعدد سے ہر ستارہ کے لئے جدا فلک ہونے پر استدلال کرنا نامکمل ہے۔ جب تک آسمان کا فرق والتیام (پھٹنا اور جڑنا یعنی عنصری اجسام کی طرح اس کے اندر توڑ جوڑ ہونا) محال ثابت نہ کر دیا جائے اس وقت تک (ضخامت فلک کے اندر ستاروں کی پیوستگی اور شیر کا محال ہونا اور) ہر ستارہ کا خصوصی فلک ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ جسم آسمان کا توڑ جوڑ عقلاً جائز ہے اور شرعاً ضروری۔

وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ یعنی شیاطین جب (ملائکہ کی باتیں) چوری سے سننا چاہتے ہیں تو ان کے مارنے کے لئے ستاروں کو ہم نے آتشی پتھر بنایا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ستارے اپنی جگہ سے ہٹ کر شیطانوں پر پتھروں کی طرح برستے ہیں بلکہ ان سے مجسم شعلے ٹوٹ کر شیطانوں پر پڑتے ہیں۔

وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ اور آخرت میں ہم نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے۔

عَذَابَ السَّعِيْرِ ۞ دہکتی آگ کا عذاب۔

اس کلام میں شیاطین کے عذاب کا ذکر آیا تھا اس لئے اس سے متصل عام کافروں کے عذاب کا ذکر فرمایا کیونکہ شیطان بھی کافروں کے گروہ میں شامل ہیں اور کافر بھی شیطانوں کے بھائی ہیں۔ فرمایا۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞ یعنی جہنم برا ٹھکانا ہے۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا جب کافروں کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا شَهِيْق گدھے کی آواز یعنی گدھے جیسی آواز، جہنم کی آگ سے نکلتی ہوئی سنیں گے یہ آگ کی آواز ہوگی یا ان لوگوں کی جو ان داخل ہونے والوں سے پہلے جہنم میں جا چکے ہوں گے یا خود ان کی ہوگی۔ لَهَا حال ہے شَهِيْقًا کا شَهِيْقًا نکرہ تھا اس لئے حال کو اس سے پہلے ذکر کر دیا۔

وَّهِيَ تَفُوْرُ ۞ ہانڈی کی طرح جہنم میں ابال آتا ہوگا ہناد نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ جس طرح کم پانی والے کنویں سے بھی پانی اوپر کو ابلتا ہے اسی طرح کافروں کے داخلہ کے بعد جہنم میں ابال آئے گا۔ یہاں مجازی معنی (جوش کی شدت) مراد ہے۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ مِنَ الْغَيْظِ کا تعلق تَمَيَّزُ سے ہے اور پورے جملہ میں تَفُوْرُ کے فاعل (یعنی جہنم) کی حالت بیان کی ہے اور جملہ وَهِيَ تَفُوْرُ کا غضب یا خود آگ کا غصہ ہے جو اللہ کے دشمنوں پر ہوگا۔ آگ کی طرف غیظ کی نسبت

مجازی ہے بطور استعارہ۔ یا حقیقی ہے لیکن حقیقی نسبت اس وقت ہو گی جب آگ کا صاحب شعور ہونا ثابت کر دیا جائے۔ جس طرح جمادات کا شعور ہم نے ثابت کیا ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ فوج سے مراد ہے کافروں کی جماعت۔

سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ جب کافروں کی کوئی جماعت دوزخ کے اندر ڈالی گئی تو دوزخ کے نگرانوں نے زجر و تذلیل کے طور پر ان سے پوچھا۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ کیا تمہارے پاس اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے پیغمبر نہیں پہنچے تھے۔ یہ جملہ علیحدہ ہے سوال ہو سکتا تھا کہ جب کافروں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا تو ان سے کیا کہا جائے گا۔ اس محذوف سوال کا جواب اس جملہ میں دیا گیا ہے۔ كُلَّمَا کا تعلق سَاَلَهُمْ سے ہے اور استفہام تقریری ہے۔

قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ انہوں نے کہا یہ مستقبل کی حکایت ہے نَذِیْرٌ صیغۂ صفت ہے یا بمعنی جمع ہے یا مصدر ہے اس صورت میں مضاف محذوف ہو گا یعنی اہل انداز (ڈرانے والے) یا بغیر حذف مضاف کے خود مصدر کو صفت قرار دیا جائے اور مقصود مبالغۂ انذار ہو یا صیغہ صفت بمعنی مفرد ہے (ڈرانے والا) مطلب یہ کہ کافروں نے کہا ہم میں سے ہر ایک کے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔ قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ میں بَلٰى کے مفہوم کی تاکید ہے۔

فَكَذَّبْنَا لیکن ہم نے نذیر کو جھوٹا قرار دیا اور اتنی زیادہ تکذیب کی کہ کہہ دیا۔

وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اللہ نے کچھ نہیں اتارا۔ اس فقرہ میں کتاب اتارنے کا بھی انکار ہے اور پیغمبر بنا کر بھیجنے کا بھی۔

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ بظاہر یہ کافروں کا کلام معلوم ہوتا ہے جس سے تکذیب کو پختہ کرنا مقصود ہے کہ تم بڑی گمراہی میں ہو اور بڑی گمراہی میں ہونا جھوٹے ہونے کی علامت ہے ممکن ہے یہ کلام دوزخ کے فرشتوں کا ہو۔ یعنی فرشتوں نے کافروں سے یہ الفاظ کہے۔ اگر نَذِیْر بمعنی واحد ہو اور اَنْتُمْ جمع کی ضمیر ہے (تو کلام میں توافق نہ ہوگا) لیکن اس وقت مراد انبیاء کی جماعت ہی ہو گی مگر خطاب میں حاضر کو غائب پر ترجیح دی گئی یعنی اے مخاطب تو اور تیری طرح کے تمام لوگ تم سب بڑی گمراہی میں ہو یا ایک کی تکذیب کو پوری جماعت کی تکذیب کے قائم مقام قرار دیا (کیونکہ پیام سب کا ایک تھا اور ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا تھا اب ایک کو جھوٹا قرار دینا سب کو جھوٹا قرار دینا ہوا)

وَقَالُوْا گذشتہ قَالُوْا پر عطف ہے۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ یعنی اگر ہم بغیر عناد کے گوش قبول سے سنتے اور سنی ہوئی دلیلوں سے جو حقانیت ثابت ہو رہی تھی اس کو مان لیتے۔

اَوْ نَعْقِلُ یعنی ایسی عقلی دلائل و براہین پر غور کرتے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کے پیام پر ایمان لانے کو ضروری قرار دینے والی ہیں۔

نَسْمَعُ کو نَعْقِلُ سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دلائل سمعیہ براہین عقلیہ سے زیادہ واجب التسلیم اور زیادہ صحیح ہوتی ہیں تنہا عقل (حق و صداقت کو پالینے کے لئے) کافی نہیں ہے۔ آیت سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ عقل صحیح (یعنی وہ عقل جو آمیزش وہم سے پاک ہو) وحی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اَوْ کا لفظ (تردید کے لئے نہ ہو بلکہ) واؤ (عاطفہ) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو یعنی اگر ہم نَذِیْر کے کلام کو سن لیتے اور اس کے معنی کو سمجھ لیتے اور بصیرت اندوز لوگوں کی طرح اس پر غور کر لیتے تو آج دوزخ میں نہ ہوتے۔

مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ یعنی دوزخیوں میں ہمارا شمار نہ ہوتا۔ ہم ان میں سے نہ ہوتے۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ قَالُوْا پر عطف تفسیری ہے یعنی انہوں نے اپنے جرم کا ایسے وقت اعتراف کیا جب

اعتراف غیر مفید تھا اعتراف کا معنی ہے پہچاننے کے بعد اقرار کرنا اور گناہ سے مراد ہے کفر ذنب چونکہ اصلاً مصدر ہے (اور مصادر میں باعتبار اصل جمع نہیں ہوتی) اس لئے ذنب کو بصورت جمع نہیں ذکر کیا۔

فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ سُحْقًا مصدر (مفعول مطلق) ہے اس کا فعل محذوف ہے یعنی فَاَسْحَقَهُمُ اللّٰهُ سُحْقًا اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا کلام میں ایجاز اور معنی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے یہ تغیر کیا گیا۔ یہ جملہ معترضہ بددعائیہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ یعنی جو لوگ اپنے رب کے اس عذاب سے ڈرتے ہیں جو ابھی تک ان پر نہیں آیا اور ظاہر نہیں ہوا۔ یا بالغیب سے یہ مراد ہے کہ وہ ابھی عذاب کے سامنے نہیں پہنچے یا یہ کہ وہ تنہائی میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ منافقوں کی طرح نہیں ہیں یا غیب سے مراد وہ حصہ بدن ہے جو مخفی ہے یعنی دل، یعنی وہ دلوں میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ یعنی ان کے گناہوں کی مغفرت

وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ اور بڑا ثواب ہے جس کے مقابلہ میں ہر لذت کا تصور حقیر ہے یہ جملہ معترضہ ہے اللہ نے (پہلے) کافروں پر ہونے والے عذاب پر تنبیہ کی پھر اس کے مقابلہ میں مومنوں سے مغفرت و ثواب کا وعدہ فرمایا اور ثواب کی اساسی تمہید خشیۃ (خوف) کو قرار دیا (گویا) اس امر پر تنبیہ کی کہ ایمان سے اصل مقصود خشیۃ ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خوف الٰہی دانش کی چوٹی ہے ترمذی بروایت حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مشرک آپس میں رسول اللہ ﷺ کی شان میں کچھ ناشائستہ باتیں کرتے تھے اور کہتے تھے چپکے چپکے باتیں کرو کہیں خدا نہ سن لے اور محمد ﷺ کو اطلاع ہو جائے جبرئیلؑ آکر رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچا دیتے تھے اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ (دونوں امر کے صیغے ہیں) لیکن امر بمعنی خبر ہے یعنی تمہارا چپکے چپکے باتیں کرنا اور بلند آواز سے بولنا دونوں علم الٰہی میں برابر ہیں (اللہ دونوں سے واقف ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں) پہلے کفار کا ذکر غائبانہ تھا اس آیت میں (تفنن کلام کے علاوہ) تہدید پیدا کرنے کے لئے غائب سے حاضر کی طرف کلام کو موڑ کر روئے خطاب کافروں کی طرف کیا گیا۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ مساوات (سابقہ) کی یہ علت ہے یعنی اللہ دلوں کی باتوں سے واقف ہے زبان پر لانے سے پہلے ہی وہ ان کو جانتا ہے نہ اس کو بلند آواز سے بولنے کی ضرورت نہ آہستہ آہستہ کہنے کی۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی علم کی نفی ثبوت علم کی موجب ہے یعنی جس نے سینوں کو اور سینوں کے اندرونی خیالات کو بلکہ ہر چیز کو پیدا کیا وہ قلبی اسرار سے ناواقف کس طرح ہو سکتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جس کو اللہ نے پیدا کیا اس سے ناواقف کیونکر ہو سکتا (پہلی صورت میں اَلَا يَعْلَمُ کا مفعول محذوف ہے اور مَنْ فاعل ہے اور دوسری صورت میں يَعْلَمُ کی ضمیر (یعنی اللہ) فاعل ہے اور مَنْ خَلَقَ مفعول ہے) بہر حال کلام سابق کی یہ تاکید ہے۔

وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ خَلَقَ کی ضمیر سے حال ہے یعنی اللہ کا علم ہر چیز تک رسائی رکھتا ہے خواہ وہ چیز ظاہر ہو یا باطن۔ ع ۱۴ ۱

هُوَ الَّذِيْ اللہ کی ندرت آگیں صنعت اس کے علم اور اس کی قدرت کی ہمہ گیری کو ظاہر کر رہی ہے لیکن کافر جاہل ہیں وہ اس سے ناواقف ہیں پھر اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمتیں اداء شکر کی مقتضی ہیں لیکن کافر ناشکرے ہیں نعمت کا تقاضا پورا نہیں کرتے آئندہ آیات میں کافروں کی اس جہالت اور بداطواری پر تنبیہ کرنے کے لئے اپنی حیرت آفریں صنعت کو بیان فرمایا ہے۔

جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا ذلول بمعنی سہل یعنی اللہ نے تمہارے لئے زمین کو ایسا بنا دیا کہ تم آسانی کے ساتھ اس میں چل پھر سکتے ہو ایسا (نرم اور سخت) نہیں کیا کہ چلنا پھرنا ناممکن ہو الناقۃ الذلول فرماں بردار سرکشی نہ

کرنے والی اونٹنی کو کہا جاتا ہے۔

فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا　مناکبِ ارض سے مراد ہیں زمین کے اطراف آدمی کے مونڈھے کو اسی مناسبت سے منکب کہا جاتا ہے بعض کا قول ہے کہ مناکب سے پہاڑ مراد ہیں۔

اس آیت میں زمین کی انتہائی فرماں پذیری کی تصویر کشی ہے لونٹ (یا گھوڑے وغیرہ) کے شانہ پر کوئی سوار نہیں ہوتا نہ جانور کسی کا اپنے شانہ پر سوار ہونا برداشت کرتا ہے لیکن زمین کی فرماں پذیری اس حد تک ہے کہ زمین کے شانوں پر چلنا ممکن ہے تو معلوم ہوا کہ زمین (ہر سواری سے زیادہ سہل الرکوب ہے اور اس) کا کوئی حصہ ایسا نہیں کہ چلنے والے کا فرمان پذیر نہ ہو۔

وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۚ　یعنی خداداد نعمت کی طلب کرو (کھانے سے مراد ہے طلب کرنا اور رزق سے مراد ہے نعمت خداوندی)

وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ⑮　یعنی اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے وہ اپنی دی ہوئی نعمتوں کے ادائے شکر کی باز پرس کرے گا۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ　حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کیا بصورت نافرمانی ان کو اس خدا کے عذاب کا جو آسمان میں ہے ڈر نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا روزانہ جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے اللہ نچلے آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کوئی ہے مجھ سے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں۔ کوئی ہے مجھ سے مانگنے والا کہ میں اس کو عطا کروں کوئی ہے مجھ سے معافی مانگنے والا کہ میں اس کے گناہ معاف کروں (بخاری و مسلم) مسلم کی دوسری روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ پھر اللہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتا ہے کون عرض کرتا ہے اس خدا سے جو نہ نادار ہے نہ حق تلفی کرنے والا (ندائے رحمت کا یہ سلسلہ فجر ہونے تک جاری رہتا ہے۔ (اس روایت کی روشنی میں بغیر کسی تاویل و توجیہ کے) یہ آیت متشابہات میں سے ہے کیونکہ اللہ (مادیت سے منزہ ہونے کی وجہ سے) آسمان میں سکونت پذیر اور مکان گیر ہونے سے پاک ہے اس لئے سلف نے اس آیت کی توضیح کرنے سے سکوت اختیار کیا ہے صوفیہ کا اس جگہ وہی قول ہے جو آیت يَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر میں ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ علماء متاخرین نے آیت کی مختلف تاویلیں کی ہیں مثلاً اللہ کا حکم۔ اللہ کا فیصلہ آسمانوں میں جاری ہے یا یوں کہا جائے کہ عرب کے گمان کے موافق آیت کا نزول ہوا (عرب خدا کو آسمان میں خیال کرتے تھے) یا سماء سے آسمان مراد نہیں ہے بلکہ بلندی مراد ہے مگر بلندی بھی مکانی نہیں بلکہ مرتبہ کے لحاظ سے یعنی اللہ اونچے مرتبہ پر ہے۔ استفہام بہر حال انکاری ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَنْ فِي السَّمَآءِ سے اللہ نہیں بلکہ وہ فرشتے مراد ہیں جن کے متعلق انتظام امور ہے ان کی حیثیت (مادی) اسباب و ذرائع کی ہے زمین کو دھنسانے اور سنگبار طوفان لانے کے لئے وہ (غیبی) کارندے ہیں۔

اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ　یعنی کیا انکو ڈر نہیں کہ اللہ انکو زمین میں دھنسادے اور زمین کے اندر چھپادے جیسا قارون کو دھنسا دیا تھا۔

فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ⑯　اِذًا مفاجات (ناگہان اچانک) کے لئے ہے اور تَمُوْرُ کا معنی ہے ہلنے لگے زمین میں زلزلہ آجائے یعنی اچانک زمین میں لرزہ پیدا ہو جائے (اور اللہ کافروں کو زمین کے اندر دھنسادے)

اَمْ اَمِنْتُمْ　اَمْ بمعنی هَلْ (استفہامیہ) ہے اور استفہام انکاری ہے۔

مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۗ　حاصِب سنگبار طوفان جیسا قوم لوط پر آیا تھا۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ　کلام سابق کے مضمون پر اس کا عطف ہے یعنی میں تم کو ڈراتا ہوں اور جب تم خود عذاب کو دیکھ لوگے تو تم کو۔

كَيْفَ نَذِيْرِ ⑰　میرے ڈرانے کی کیفیت معلوم ہو جائے گی مگر اس وقت جان لینا سود مند نہ ہو گا۔ (نَذِیر بمعنی اِنذار۔ ڈرانا)

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿۱۸﴾ یہ قسم محذوف کا جواب ہے نکیر بمعنی انکار کسی چیز کو برا جاننا یعنی ان کے خلاف میری ناگواری جو بصورت نزول عذاب ہو گی (ان کو معلوم ہو جائے گی) اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی اور کافروں کے لئے تہدید عذاب ہے۔ استفہام تعجب کے لئے بھی ہے اور تاکید مدعا کے لئے بھی اور جملہ سوالیہ (اگرچہ انشاء یہ ہے لیکن) خبریہ کی تاویل میں ہو کر کَذَّبَ پر معطوف ہے یعنی گزشتہ کافروں نے تکذیب کی اور ان کے خلاف میری ناگواری بہت زیادہ ہو گئی (پہلا کلام خطابی ہے اور یہ کلام بصورت غائب ہے پس) کلام کا رخ خطاب سے غائب کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا ہمزہ استفہام کی اور واؤ (و) عطف کے لئے ہے۔ معطوف علیہ محذوف ہے اصل کلام یوں مانا جائے گا کیا انہوں نے آسمان وزمین کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا اور

إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ ان پرندوں کو نہیں دیکھا جو ان کے اوپر بازو پھیلائے اڑتے ہوتے ہیں۔ فَوْقَهُمْ کا تعلق صَافَّاتٍ سے ہے صافات سے اَلطَّيْرِ کی حالت بیان کی گئی ہے اور دیکھنے سے مراد ہے۔ آنکھوں سے دیکھنا کیونکہ يَرَوْا کے بعد الیٰ مذکور ہے۔ صَافَّات کا معنی ہے فضا میں اڑنے کی حالت میں بازو پھیلائے ہونا پرندے جب پر پھیلائے ہوتے ہیں تو شہ پر (اور ان سے اندر والے پر) ترتیب کے ساتھ پھیلے ہوتے ہیں۔

وَيَقْبِضْنَ ۚ صَافَّاتٍ پر عطف ہے یعنی اور پرندے پر سمیٹتے ہیں قَابِضَات کی جگہ يَقْبِضْنَ (اسم کی جگہ فعل) لانے سے مقصود ہے حدوث اور تجدد کا اظہار کیونکہ اڑتے وقت پر پھیلے رہنا اصل ہے اور پروں کا سمٹنا عارضی طور پر اس وقت ہو جاتا ہے جب پرندہ حرکت کرنے کے لئے پروں کو سیٹنے سے مدد لینا چاہتا ہے یہ بھی احتمال ہے کہ معطوف علیہ (فعل) محذوف ہو یعنی پرندے کبھی پر پھیلاتے ہیں کبھی سمیٹتے ہیں۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ اس جملہ میں صافات کے فاعل کی حالت کا بیان ہے یعنی فضا میں پرندوں کو ان کی فطرت کے خلاف صرف رَحْمٰن ہی روکے رکھتا ہے۔

إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ﴿۱۹﴾ یعنی عجیب غریب چیزوں کی تخلیق و تدبیر سے اللہ واقف ہے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ

اس سے پہلے أَوَلَمْ يَرَوْا آ چکا ہے اس جگہ اَمْ متصلہ ہے مطلب یہ ہو گا کہ کیا انہوں نے ایسی مصنوعات کو دیکھ کر اس بات کو نہیں سمجھا کہ خسف زمین اور سنگبار طوفان کا عذاب دینے پر اللہ کو قدرت حاصل ہے یا ان کے پاس ان کا کوئی جتھا اور لشکر ایسا ہے جو رَحْمٰن کے مقابلہ میں ان کی حمایت کر سکے اور خدا کے بھیجے ہوئے عذاب کو دفع کر سکے۔

بعض لوگ قائل ہیں کہ تکرار استفہام سے بچنے کے لئے اس جگہ ام کو ابتدائیہ قرار دیا جائے گا۔ نہ متصلہ ہو گا نہ منفصلہ۔ مَنْ استفہامی مبتدا ہے ھٰذَا خبر ہے اَلَّذِیْ صفت ہے یا بدل ہے یَنْصُرُکُمْ، جُنْدٌ کی صفت ہے چونکہ لفظ جُنْد مذکر ہے اس لئے یَنْصُرُ مذکر لایا گیا۔

سوال

اسم اشارہ (ہٰذا) اور اسم موصول (اَلَّذِی) کو ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی ان کے ذکر کے بعد کلام کے جو معنی پیدا ہوتے ہیں وہ بغیر ذکر کے بھی سمجھ میں آتے تھے (کیا ان کا ذکر بے فائدہ ہے)

جواب

ابہام کے بعد تفصیل کرنے سے مطلب زیادہ دل نشین ہو جاتا ہے ھٰذَا الَّذِیْ میں ابہام ہے صرف موصوف کے ذکر

میں صفت کا ذکر مبہم ہوتا ہے اس کے بعد هُوَجُنْدٌ کہنے سے مبہم صفت کی تفصیل ہو گئی۔

یہ بھی احتمال ہے کہ هٰذَا مبتدا ہو اور اَلَّذِیْ خبر ہو اور يُقَالُ محذوف قرار دیا جائے اور پورے جملہ کو اس کا مفعول (نائب فاعل) قرار دیا جائے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَمَّنْ يُّقَالُ هٰذَا الَّذِیْ هُوَجُنْدٌ لَّكُمْ۔

جُند سے مراد وہ بت ہیں جن کو اہل شرک معبود قرار دیتے تھے۔ یعنی یہ بات تو تصور میں بھی نہیں آتی کہ یہ بت مدد کر سکیں یا تم کو رزق دے سکیں۔ یا جُند سے مراد کافروں کے حمایتی ہیں۔

اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾ غُرور سے مراد ہے شیطانی فریب یعنی شیطان فریب دیتا ہے کہ اللہ کا عذاب ان پر نازل نہ ہوگا اور یہ اغواء محض فریب ہوتا ہے ناقابل اعتماد۔

پہلا کلام (لَكُمْ) خطابی تھا اس جگہ (اَلْكَافِرُوْنَ) غائبانہ مذکور ہے کلام کا رخ خطاب سے غیبت کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ یعنی تم کو رزق کون دے گا۔ اگر خدا اپنا رزق تم سے، روک لے یعنی بارش اور رزق پیدا کرنے والے اسباب (فطری) روک لے یا رزق پیدا کرنے والے اسباب کی اثر انگیزی ختم کر دے (بارش ہو ہوا بھی چلے زمین میں قوت نامیہ بھی ہو مگر غلہ پیدا نہ ہو)

اس عبارت کی نحوی تعلیل بھی وہی ہے جیسی مذکورہ بالا عبارت کی ذکر کر دی گئی۔

بَلْ لَّجُّوْا یعنی کافر بڑھتے جاتے ہیں (جمے ہوئے ہیں)

فِیْ عُتُوٍّ گمراہ کنی میں

وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾ اور حق سے دوری اختیار کرنے میں (اول کی وجہ) کافروں کی انتہائی جہالت ہے اور (دوسری کا باعث) کافروں کی طبعی نفرت ہے۔

اَفَمَنْ يَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی کلام تقریری اور رنگ استفہامی ہے یعنی کلام میں مخاطب کو حق کا اقرار کرنے پر آمادہ کیا گیا ہے (مقصود یہ ہے کہ استفہام سے مراد طلب علم نہیں۔ نہ جواب دینے سے عجز کا اظہار مقصود ہے بلکہ مدعا کو مدلل طور پر ثابت کرنا غرض ہے)

مُكِبًّا (اسم فاعل) اکباب سے مشتق ہے اور اکباب کا مادہ کَبَّ ہے کَبَّ متعدی ہے اور اکباب لازم ہے یہ امر (یعنی ثلاثی مجرد کے باب کا متعدی ہونا اور باب افعال کا لازم ہونا) عربی میں نادر ہے جیسے قشع اللّٰہ السحاب فاقشع اللہ نے بادل کو پھاڑ دیا اور ابر پھٹ گیا۔

یا مُكِبًّا کا مفعول محذوف ہے یعنی مُكِبًّا نَفْسَهٗ اپنے آپ کو سرنگوں کرنے والا (اس صورت میں اِكْبَاب بھی متعدی ہوگا) قاموس میں ہے كَبَّهٗ اور اَكَبَّهٗ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی اولٹ دیا۔ پچھاڑ دیا اور کبته فاکب بھی آتا ہے میں نے اس کو اوندھا کر دیا وہ اوندھا ہو گیا اس صراحت سے معلوم ہوا کہ اِكباب لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖ کا معنی ہے کہ راستہ کی دشواری اور نشیب و فراز کی وجہ سے چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گر پڑتا ہے (اس صورت میں اکباب متعدی نہ ہوگا۔ بلکہ صاحب ماخذ یعنی متصف بمادہ ہونے کا معنی ہوگا

اَمَّنْ يَّمْشِیْ سَوِيًّا یا جو سیدھا چلتا ہے عناد کی طرف سے مڑا ہوا۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾ یعنی ہموار راستہ آیت مذکورہ میں مَنْ موصولہ مبتدا ہے اور اَهْدٰی خبر ہے یا خبر محذوف ہے معطوف علیہ میں خبر مذکور تھی اس لئے یہاں اسی پر اکتفا کیا گیا۔ بہرحال (استفہام تقریری ہونے کی وجہ سے) یہاں اس امر کا اقرار واجب ہے کہ ہموار راستہ پر سیدھا چلنے والا ہدایت یافتہ ہوتا ہے مومن کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ بصیرت کے ساتھ دانش اور (رسول کے) بتائے ہوئے راستہ پر وہ چلتا ہے اور کافر نہ دانش سے کام لیتا ہے نہ رسول کی بات سنتا ہے اس لئے مومن کافر کے مقابلے میں ہدایت یافتہ ہوتا ہے۔

ایک شبہ

اَھْدٰی اسم تفضیل ہے جس کا معنی ہے زیادہ ہدایت یافتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت یافتہ تو کافر بھی ہے اصل ہدایت تو اس کو بھی حاصل ہے مگر مومن اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔

ازالہ

لفظ اَھْدٰی نہیں چاہتا کہ مفضل علیہ (کافر) میں اصل ہدایت واقعی طور پر متحقق ہو بلکہ فرضی وجود کافی ہے (یعنی کافر میں اگر بالفرض ہدایت مان بھی لی جائے تب بھی مومن اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے)

قتادہ نے فرمایا جو شخص دنیا میں گناہوں پر اوندھا ہوگا قیامت کے دن منہ کے بل چلے گا جب کہ مومن سیدھے چل رہے ہوں گے بخاری اور مسلم نے بیان کیا حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کافر کو منہ کے بل کیسے چلا جائے گا فرمایا کیا وہ خدا جو دنیا میں قدموں سے چلاتا ہے قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں ہے۔ ایسی ہی روایت حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے (گزشتہ کلام میں کافروں کی فریب خوردگی کی صراحت کی تھی) اس جملہ میں ان کی حالت بد کو اور زیادہ واضح کر دیا۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مذکورہ بالا (دونوں آیات) اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ اور اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ میں صراحت فرمائی تھی کہ کافروں کا کوئی حمایتی نہ ان کی مدد کر سکتا ہے نہ ان کو رزق دے سکتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نصرت و رزق کون عطا کرتا ہے اس سوال (مقدر کے جواب میں فرمایا کہ تم کو نصرت و رزق وہی عطا فرماتا ہے جس نے تم کو پیدا کیا تا کہ تم اس کو پہچانو اور اس کی عبادت کرو۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ اور تمہارے کان بنائے تا کہ نصیحتوں کو سنو۔

وَالْاَبْصَارَ اور آنکھیں بنائیں تا کہ مصنوعات الٰہیہ کو دیکھو۔

وَالْاَفْـِٕدَةَ اور دل بنائے تا کہ غور کرو اور عبرت اندوز ہو اَلسَّمْعَ اصل میں مصدر ہے اور مصدر کی جمع (اصل وضع کے اعتبار سے) نہیں آتی اس لئے اَلسَّمْعَ کو بصورت مفرد ذکر کیا لیکن اَلْبَصَر اور اَلْفُؤَاد کی یہ حالت نہیں ہے (یہ مصدر نہیں ہیں) اس لئے اَلْاَبْصَارَ اور اَلْاَفْـِٕدَةَ کو بصورت جمع ذکر کیا) اس کے علاوہ اَلسَّمْعَ کو مفرد اور اَلْاَبْصَارَ اور اَلْاَفْـِٕدَةَ کو جمع لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کان سے ایک ہی نوع کا علم حاصل ہوتا ہے اور آنکھ سے علم حاصل ہونے کی متعدد صورتیں ہیں۔ (رنگ شکل مقدار حسن و قبح وغیرہ) اور دل سے ادراک بھی مختلف طریقوں سے ہوتا ہے (شک وہم ظن یقین حصولی حضوری مختلف تصورات و تخیلات وغیرہ)

قَلِيْلًا یعنی تھوڑا شکر یا کم وقت میں (دونوں صورتوں میں موصوف محذوف ہے اول صورت میں مفعول مطلق اور دوسری صورت میں مفعول فیہ ہوگا۔

مَّا (لفظاً) زائد ہے اور (معنیً) مفہوم قلت کی تاکید ہے (یعنی بہت ہی کم شکر یا بہت تھوڑے وقت میں شکر)

تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تم شکر کرتے ہو قلت شکر سے مجازاً مکمل نفی شکر مراد ہے (یعنی تم بالکل شکر نہیں کرتے یا کسی وقت شکر نہیں کرتے)

قُلْ یہ (لفظاً) زائد اور (معنیً) مفید تاکید ہے

هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ یہ جملہ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ سے بدل ہے۔

وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ اسی کے پاس تم کو جزا سزا کے لئے لے جایا جائے گا۔ یہ جملہ ذَرَاَكُمْ کے فاعل (یعنی

اللہ) کا حال ہے۔

وَيَقُولُونَ یعنی وعید قیامت کا انکار کرنے اور بہت ہی بعید الوقوع قرار دینے کے لئے کافر کہتے ہیں۔

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یہ وعدہ حشر کب پورا ہو گا۔

اِنْ كُنْتُمْ اے نبی اور مسلمانوں (یعنی رسول اللہ ﷺ اور مسلمان کفار کے مخاطب ہیں) اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ حشر کے متعلق صحیح بات کہتے ہو تو بتاؤ اس کا وقت کب آئے گا۔

قُلْ کلام سابق سے ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب کافر قیامت کا وقت پوچھتے ہیں تو اس ان کے جواب میں ہم کیا کہیں اس سوال کا جواب بتانے کے لئے فرمایا کہ تم ان سے کہہ دو۔

اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ کہ قیامت کے وقت کا (معین ٹھیک ٹھیک) علم اللہ ہی کو ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾ میں تو اس کے واقع ہونے کی خوفناک اطلاع دینے والا ہوں اور خوفناک اطلاع کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ خطرناک چیز مستقبل میں واقع ہو گی کب اس کا صحیح وقت جاننے کی ضرورت خبر دینے والے کے لئے نہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ جب کافر اس وعدہ کے وقوع کو دیکھیں گے یعنی جس چیز سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے جب وہ چیز ان کے سامنے آجائے گی۔ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک اس سے مراد عذاب آخرت ہے لیکن مجاہد کا قول ہے کہ جنگ بدر کی تباہی مراد ہے۔

زُلْفَةً (زُلْفَة بمعنی قرب ہے لیکن مراد ہے) قریب

سِيْٓـَٔتْ تو بدنما سیاہ ہو جائیں گے۔

وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کافروں کے منہ عذاب کو دیکھنے سے۔

وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی عذاب ہے جس کے جلد آنے کے تم خواستگار تھے۔ تَدَّعُوْنَ دعاء سے مشتق ہے یعنی تم طلب کرتے تھے یا دعوی سے ماخوذ ہے یعنی تمہارا دعوی تھا کہ قیامت نہ آئے گی۔

قُلْ اے محمد مکہ کے مشرک جو تمہاری موت کے آرزو مند ہیں تم ان سے کہہ دو۔

اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا بھلا بتاؤ کہ اللہ اگر مجھے اور میرے ساتھیوں کو مار ڈالے یا ہماری موت کو موخر کر کے ہم پر رحم کرے (تم کو دونوں صورتوں میں کیا فائدہ پہنچے گا) اَرَاَيْتُمْ میں ابتدائی ہمزہ استفہام تقریری کے لئے ہے۔ رُؤْيَت (دیکھنے) سے مراد جاننا ہے (رَاَيْتُمْ کا صیغہ اگرچہ ماضی ہے لیکن) اس کا معنی ہے مجھے بتاؤ (یعنی امر کے معنی میں ہے) اور افعال قلوب (رائی، علم، وجد، حسب وغیرہ) کے بعد جملہ شرطیہ نفی کی طرح ہوتا ہے اور استفہام مفید تعلیق ہوتا ہے۔

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾ استفہام (یعنی مَنْ بمعنی کون) انکاری ہے یعنی عَذَابِ اَلِيْم سے کافروں کو کوئی پناہ نہیں دے گا حاصل مطلب یہ ہے کہ ہماری موت کے جو تم خواستگار ہو اس سے تم کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہو گا تمہارے لئے مفید تو یہ امر ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی تلاش کر و اور بت عذاب خداوندی سے بچا نہیں سکتے۔ بعض اہل تفسیر نے اس طرح آیت کا مطلب بیان کیا ہے کہ اگر خدا مجھے اور میرے ساتھیوں کو مار ڈالے تو ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں عذاب دے گا اور اگر رحم کر کے ان کو معاف کر دے تب بھی باوجود ایماندار ہونے کے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہم کو اس کے عذاب کا ڈر لگا رہتا ہے کیونکہ اس کا حکم ہمارے معاملہ میں بہر حال نافذ ہے لیکن تم تو کافر ہو تم کو اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ یعنی گزشتہ کلام میں جس ہستی کے وجود قدرت اور تسلط کی دلائل بیان کی گئی ہیں وہی بڑے رحم والا ہے جس کی عبادت میں خود بھی کرتا ہوں اور تم کو بھی اسی کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں تمام نعمتیں عطا کرنے والا (الرحمٰن) وہی ہے (عطاء نعمت کا تقاضا ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے)

اٰمَنَّا بِهٖ ہم اس کے رحمٰن ہونے سے واقف ہیں اس لئے ہمارا اس پر ایمان ہے۔

اس جملہ کا مضمون هُوَ الرَّحْمٰنُ کے مضمون کی تائید کر رہا ہے۔

وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا چونکہ اس پر ہمارا ایمان ہے اس لئے اسی پر ہمارا بھروسہ ہے اس جملہ میں عَلَيْهِ کو تَوَكَّلْنَا سے مقدم ذکر کرنا حصر پر دلالت کر رہا ہے (اسی پر ہمارا بھروسہ ہے) حصر کا مفہوم هُوَ الرَّحْمٰنُ سے بھی مستفاد ہوتا ہے (وہی رحمٰن ہے) اس جملہ میں اس کی تائید ہو جاتی ہے گویا یہ جملہ سابق دونوں جملوں کی تاکید کر رہا ہے حقیقت میں اس آیت کا مفہوم نتیجہ ہے ان دلائل کا جو پہلے بیان کی گئی ہیں اور اسی پر مومنوں اور کافروں کے آئندہ حکم کی بناء ہے اسی لئے۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۹﴾ میں فاءِ سببیت لائی گئی ہے (فاء کا ما قبل فاء کے مابعد کے لئے علت اور سبب ہے) یعنی تم جزاسزا کے دن جان لو گے کہ ہم دونوں میں سے کون کھلی ہوئی گمراہی میں تھا تم یا ہم۔ اس آیت میں کافروں کے لئے تہدید اور تخویف ہے اسی طرح آئندہ آیت میں بھی کافروں کو ڈرایا گیا ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اس کی تشریح اوپر کی جاچکی ہے۔

اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا اگر تمہارا پانی (تمہارے کاموں میں استعمال ہونے والا پانی) زمین کے اندر اتنے گہراؤ پر چلا جائے کہ ڈول وہاں تک نہ پہنچ سکیں (یعنی تمہاری رسائی وہاں تک نہ ہو سکے)

غَوْر مصدر ہے (گہراؤ میں چلا جانا) یہاں وصفی معنی مراد ہیں (بہت گہرا)

فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ﴿۳۰﴾ لفظ مَعِیْنٍ (بمعنی اسم فاعل) العَیْنُ الجَارِیَۃ (جاری چشمہ) سے مشتق ہے یعنی بہتا ہو اپانی یا (بمعنی اسم مفعول العَیْنُ البَاصِرَۃ سے مشتق ہے یعنی ظاہر نمایاں آسانی سے حاصل ہو جانے والا (مطلب یہ ہے کہ اگر پانی ناقابل رسائی گہرائی تک پہنچ جائے تو پھر کون (سوائے خدا کے) یہ بہتا ہوا یا آسانی کے ساتھ حاصل ہونے والا پانی تمہارے لئے فراہم کر سکتا ہے) عقل بدیہی شاہد ہے کہ بت ایسا نہیں کر سکتے بلکہ اللہ کے سوا کسی میں بھی اس کی قدرت نہیں۔

شیخ جلال الدینؒ محلی نے بیان کیا ہے کہ سورت کو ختم کرنے پر اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہنا مستحب ہے (یعنی پروردگار عالم) ہی کو یہ قدرت ہے کہ ناقابل حصول پانی اپنی رحمت سے آسانی کے ساتھ بندوں کو عطا فرماتا ہے)

فصل

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قرآن کی ایک سورت جس کی تیس آیات ہیں آدمی (یعنی اپنے پڑھنے والے) کی سفارش اتنی کرے گی کہ اس شخص کو بخش دیا جائے گا اور وہ سورت تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ ہے (احمد ابو داؤد ترمذی نسائی ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم حاکم نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد صحیح بھی قرار دیا ہے)

بغوی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ کتاب اللہ کی ایک سورت ہے جو صرف تیس آیات کی ہے وہ آدمی کے لئے سفارش کرے گی اور قیامت کے دن اس کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گی یہ سورت تَبٰرَکَ ہے۔

حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب تک الٓمّٓ تَنْزِیْلُ اور تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ پڑھ نہ لیتے تھے سوتے نہ تھے۔ (احمد ترمذی، دارمی، ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ حفاظت کرنے والی ہے وہ اللہ کے عذاب سے نجات دینے والی ہے۔ (ترمذی)

خالد بن معدان نے فرمایا مجھے الٓمٓ تَنۡزِیۡل اور اسی طرح تَبٰرَکَ الَّذِیۡ کے متعلق یہ اطلاع پہنچی ہے کہ ایک آدمی ان سورتوں کو پڑھا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھتا تھا اور تھا بڑا گناہ گار (قبر میں)اس سورت نے (پرندہ کی شکل میں آکر)اس پر اپنے پروں کا سایہ کرلیا اور عرض کیا الٰہی اس کو بخش دے یہ مجھے بہت پڑھتا تھا اللہ نے اس کی سفارش قبول فرمائی اور فرمایا اس شخص کے ہر گناہ کی جگہ ایک نیکی لکھ دو اور اس کا درجہ اونچا کردو۔

یہ بھی خالد کا قول ہے کہ قبر کے اندر یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی طرف سے جھگڑا کرتی ہے اور کہتی ہے الٰہی اگر میں تیری کتاب میں سے ہوں تو میری سفارش اس (قاری) کے متعلق قبول فرما اور اگر تیری کتاب میں سے نہیں ہوں تو مجھے کتاب سے مٹا دے یہ سورت (قبر میں) پرندہ کی طرح ہوگی اور اپنے بازو صاحب قبر پر پھیلا دے گی اور اس کی سفارش کرے گی اور قبر کے عذاب سے اس کو بچالے گی۔

طاؤس نے فرمایا دونوں غالباً الم تنزیل
اور تبارک الذی قرآن کی ہر سورت
سے بقدر ساٹھ نیکیوں کے
بڑھ کر ہیں۔ (دارمی)

(سورۃ ملک ختم ہوئی)

سورۃ القلم

یہ سورت مکی ہے اس میں ۵۲ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نٓ یہ حروف مقطعات میں سے ہے حروف مقطعات کی تشریح سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔
بعض علماء کا قول ہے کہ نون کا معنی ہے مچھلی۔ اور مراد یا عام مچھلی ہے یا بہموت (ایک مچھلی کا نام) جس پر زمین قائم ہے۔
یا نون کا معنی ہے دوات (اور یہی مراد بھی ہے) کیونکہ بعض مچھلیوں سے کالی سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ روشنائی بنائی جاتی ہے جس سے لکھا جاتا ہے۔
اس کی کتابت بصورت حرف نٓ کی جاتی ہے اور تلفظ سکون کے ساتھ (یعنی نون کیا جاتا ہے خواہ وصل کے ساتھ پڑھا جائے یا وقف کے ساتھ۔

وَالْقَلَمِ قلم کی قسم واوٗ قسمیہ ہے اَلْقَلَم سے مراد وہی قلم ہے جس سے لوح محفوظ کی تحریر لکھی گئی ہے۔ حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے اول اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے فرمایا لکھ قلم نے عرض کیا کیا لکھوں ارشاد فرمایا تقدیر کو لکھ چنانچہ قلم نے ہر وہ چیز لکھ دی جو گزر گئی اور آئندہ کبھی بھی ہونے والی ہے (ترمذی نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد غریب کہا ہے)
حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آسمان وزمین کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں (اندازے لکھ دیے تھے اور اس کا تخت (حکومت واقتدار) پانی پر تھا۔ (مسلم)
بغویؒ نے کہا (تقدیریں لکھنے والا) قلم نور کا تھا جس کا طول آسمان وزمین کی درمیانی مسافت کے برابر تھا۔
یہ بھی احتمال ہے کہ اَلْقَلَم سے عام قلم مراد ہو قلم کے فوائد بکثرت ہیں اس لئے اللہ نے اس کی قسم کھائی۔

وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱ اور اس چیز کی قسم جس کو وہ لکھتے ہیں (کون لکھتے ہیں کون لکھنے والے مراد ہیں) اگر قلم تقدیر مراد ہو تو لکھنے والے سے یہی مراد ہوگا (لیکن قلم تقدیر تو ایک ہے اور یَسْطُرُوْنَ جمع کا صیغہ ہے) تعظیماً قلم تقدیر کی طرف ضمیر جمع راجع کی (جیسے بڑے آدمی کے لئے تعظیماً جمع کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں) لیکن اگر عام قلم مراد ہو تو جنس قلم (بوجہ کثیر الافراد ہونے کے) کی طرف ضمیر جمع راجع ہوگی۔ تحریر کی نسبت آلہ تحریر کی طرف کی گئی (قلم آلہ تحریر ہے) کیونکہ قلم کو اہل علم کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ موخر الذکر صورت میں اہل قلم کی طرف بھی ضمیر لوٹ سکتی ہے۔ یا اعمالنامے لکھنے والے فرشتے مراد ہیں یا علماء مراد ہیں جو علوم دین لکھتے ہیں۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲ آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانہ نہیں ہیں بِنِعْمَةِ رَبِّكَ حال ہے یعنی فضل خدا کی موجودگی میں آپ دیوانہ نہیں ہیں نعمت (فضل) سے مراد ہے نبوت شرافت، کمال فہم وعظمت مرتبہ علوم اور دوسرے مکارم۔
بغویؒ نے لکھا ہے کہ کافر کہتے تھے یا ایها الذی نزل علیه الذکر انک لمجنون اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے حقیقت میں بلاشبہ تو دیوانہ ہے۔ کافروں کے اس قول کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ابن منذر نے بھی ابن

جریج کی روایت سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے رسالت کا دعویٰ کیا سب لوگوں کی مخالفت مول لی اس وقت آپ تنگدست بھی تھے اور کافروں کا غلبہ بھی تھا اس لئے کافروں نے بطور تعجب قول مذکور کہا تھا (کہ ایسی حالت میں ایسا دعویٰ کرنا دیوانہ ہی کا کام ہے) اور چونکہ یہ استبعاد عقلی ان کے خیال میں محکم اور مضبوط تھا اس لئے کلام کو تاکیدی حروف کے ساتھ بیان کیا (إِنَّ جو مفید تحقیق ہے لام جو مفید قسم و تاکید ہے ان کا انکار چونکہ شدید اور قوی تھا تو ان کے قول کے مقابلہ میں اللہ نے بھی اس آیت کو قسم کے ساتھ موکد کیا اور خبر (مجنون) پر باء کو داخل کر کے نفی کو محکم کر دیا۔

نعمت رب کی موجودگی کے ساتھ نفی جنون کو مقید کرنے سے نفی کی دلیل و برہان کا بھی ذکر ہو گیا کہ جب کسی کو فضل الٰہی یعنی علم عقل فہم اور دوسرے کمالات اس حد تک حاصل ہوں اس کو دیوانہ کہنا محض بے ہودگی ہے ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو گدھے سے بھی بڑھ کر احمق اور کودن ہو۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ جب حضرت حلیمہؓ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لئے گدھی پر سوار تھیں تو گدھی نے کعبہ کی طرف تین بار سجدہ کیا اور کہا کہ میری پشت پر افضل الانبیاء سید المرسلین خیر الاولین والآخرین حبیب رب العالمین سوار ہیں۔ مواہب لدنیہ میں اس روایت کو ایک طویل حدیث کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ کافر گدھے سے بھی زیادہ بے وقوف تھے۔

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا یعنی دکھ برداشت کرنے اور احکام رسالت پہنچانے کا آپ کے لئے بڑا اجر ہے۔ اَجْرًا میں تنوین عظمت اجر کو ظاہر کر رہی ہے۔ (بڑا ثواب)

غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ غیر منقطع (ثواب) یا ایسا ثواب جس کے لئے لوگوں کا احسان مند نہ ہونا پڑے یعنی محض خداداد اور احسان الٰہی۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ بلاشبہ آپ بڑے اخلاق کے مالک ہیں کیونکہ آپ ایسی (ایذا رساں توہین آگیں) باتیں برداشت کر لیتے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں برداشت کر سکتے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کے راستہ میں جو دکھ مجھے دیا گیا وہ کسی کو نہیں دیا گیا (ابو نعیم فی الحلیۃ بروایت حضرت انسؓ)

ابن عساکر نے حضرت جابرؓ کی روایت بھی اسی طرح نقل کی ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مشرکوں کے لئے بددعا کر دیجئے فرمایا مجھے لعنت گر بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ محض رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے (مسلم)

کافروں نے رسول اللہ ﷺ پر دیوانہ ہونے کی تہمت لگائی اور دیوانہ کسی اجر کا مستحق نہیں ہوتا یا اسکو بھلائی کا حق نہیں ہوتا بہر حال ان دونوں جملوں سے نفی جنون کی تاکید اور کافروں کے قول کی بہترین طریقہ سے تردید ہو گئی۔

حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا قول ہے کہ خلقِ عظیم سے مراد ہے دین عظیم یعنی دین اسلام اس سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ مجھے کوئی مذہب نہیں۔

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ خُلقِ عظیم آدابِ قرآنی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا خُلق قرآن تھا کیا تم قرآن (میں) نہیں پڑھتے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الخ (مسلم فی الصحیح والبخاری فی الادب المفرد) قتادہؒ نے فرمایا خُلقِ عظیم ہے اوامر الٰہیہ کا امتثال اور ممنوعات سے اجتناب یعنی آپ ﷺ اس اخلاق پر ہیں جن کا حکم اللہ نے قرآن مجید میں دیا ہے یہ بھی قتادہ کا قول ہے کہ خلق عظیم کا مجموعہ یہ ہے کہ پیش نظر اور اصل مقصد سواءِ (مرضی) خدا کے اور کچھ نہ ہو۔

فصل

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کا بیان

حضرت براءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت اور جسمانی لحاظ سے حسین ترین تھے نہ بے تکے دراز قامت تھے نہ کوتاہ قد۔

حضرت انسؓ نے فرمایا میں نے دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی لیکن حضور نے کبھی مجھے ہوں بھی نہیں فرمایا اگر میں نے کوئی کام کر لیا تو یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا اور نہیں کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ بڑے ہی خوش خلق تھے کوئی ریشم۔ کوئی سلک بلکہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم میں نے نہیں چھوئی نہ حضور کے پسینہ سے زیادہ خوشبودار کسی مشک اور عطر کو پایا۔ (مسلم و بخاری)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے آپ سے کچھ کام ہے ارشاد فرمایا اے عورت مدینہ کی جس گلی میں چاہے بیٹھ جا میں بھی تیرے پاس بیٹھ جاؤں گا چنانچہ حضور اس کے پاس (زمین پر) بیٹھ گئے اور اس نے اپنا کام پورا کر لیا۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ مدینہ کی باندی بھی حضور اقدس ﷺ کا دست مبارک پکڑ کر جہاں چاہتی لے جاتی تھی۔ (بخاری) حضرت انسؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اگر کوئی مصافحہ کرتا تو حضور دست مبارک اس کے ہاتھ سے اس وقت تک الگ نہ کرتے جب تک وہ خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کر لیتا نہ اپنا رخ اس کی طرف سے پھیرتے نہ حضور ﷺ کو کسی ہم نشین کے سامنے زانو آگے بڑھائے دیکھا گیا۔ (ترمذی) حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے راہ خدا میں جہاد کے بغیر کبھی اپنے ہاتھ سے (کسی) کے کوئی چیز نہیں ماری نہ کسی خادم کو مارا نہ عورت کو نہ کسی حق تلفی کرنے والے سے انتقام لیتے تھے ہاں اگر کوئی ضوابط الٰہیہ کی خلاف ورزی کرتا تھا تو اس کو اللہ کے واسطے حضور ﷺ سزا دیتے تھے۔ (مسلم)

حضرت انسؓ نے فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ پیدل جا رہا تھا۔ حضور اس وقت نجرانی چادر موٹی کناری کی پہنے تھے ایک دیہاتی آ پہنچا اور چادر پکڑ کر اتنی زور سے کھینچی کہ حضور کی گردن کے ایک طرف چادر کی کناری کا نشان پڑ گیا اس کے بعد کہنے لگا محمد ﷺ جو خدا کا مال تیرے پاس ہے اس میں سے مجھے بھی کچھ دینے کا حکم دیدے حضور والا نے اس کی طرف رخ پھیرا اور ہنس دیئے پھر کچھ عطا فرمانے کا حکم دیا۔ (مسلم و بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ حسین سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ (مسلم و بخاری) حضرت جابر کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی سوال کے جواب میں نہیں کبھی نہیں فرمایا۔ (مسلم و بخاری)

حضرت جبیر بن مطعم نے بیان کیا کہ حنین سے واپسی میں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا۔ (اثناء راہ میں) کچھ دیہاتی مانگنے کے لئے حضور سے چمٹ گئے یہاں تک کہ آپ ایک کیکر کے درخت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے دیہاتیوں نے حضور کی چادر جھپٹ لی۔ آپ کھڑے ان سے فرما رہے تھے مجھے میری چادر دیدو اگر میرے پاس ان سنگریزوں کے برابر بھی اونٹ ہوں گے تو میں تم کو بانٹ دوں گا تم مجھے نہ بخیل پاؤ گے نہ جھوٹا نہ کم حوصلہ (یا بزدل) (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نہ فحش گوئی کے عادی تھے نہ بناوٹی فحش الفاظ زبان سے نکالتے تھے نہ بازاروں میں چیختے چلاتے تھے نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ معاف کر دیتے تھے اور در گزر فرماتے تھے۔ حسن خلق کی فضیلت میں اس مبحث کی ناقابل احاطہ احادیث آئی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے (احمد) موطا میں ہے کہ مجھے حسن خلق کی تکمیلی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا ہے حضرت ابودرداءؓ راوی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مومن کی میزان میں سب سے وزنی چیز حسن اخلاق ہو گی اور فحش گو گالیاں

بکنے والے سے اللہ نفرت کرتا ہے (ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے اور ابوداؤدؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابیوں سے فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ جنت کے اندر لوگوں کو سب سے زیادہ تعداد میں کیا چیز لے جائے گی صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی جانتا ہے

فرمایا جنت کے اندر سب سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو لے جانے والی چیز تقویٰ اور حسن اخلاق ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے خود سنا حضور فرما رہے تھے کہ مومن حسن اخلاق کی وجہ سے قائم اللیل (رات کو ہمیشہ عبادت کرنے والا) اور صائم النہار (دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے والا) کا درجہ پالیتا ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے نزدیک سب سے زیادہ پیارے لوگوں میں سے وہ شخص ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔ (بخاری) صحیحین کی ایک دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے برگزیدہ لوگوں میں سے میرے نزدیک وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

بیہقی نے شعب الایمان میں ایک مزنی شخص کی روایت سے اور شرح السنہ میں حضرت اسامہ بن شریک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے اچھی چیز آدمی کو کیا دی گئی ہے فرمایا اچھا خلق۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا جب میں نے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تو رسول اللہ ﷺ نے سب سے آخر میں مجھے یہ نصیحت فرمائی کہ معاذؓ اپنے اخلاق لوگوں سے اچھے رکھنا۔ (رواہ مالک)

فَسَتُبْصِرُ سین تحقیق کے لئے ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔

وَيُبْصِرُونَ ﴿٥﴾ یعنی قیامت کے دن آپ بھی دیکھ لیں گے اور کافر بھی کہ

بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ ﴿٦﴾ بِاَيِّكُمْ میں باء زائد ہے اور مَفْتُوْن (اسم مفعول) بمعنی مجنون خبر ہے یعنی تم میں سے کون دیوانہ تھا۔ یا الْمَعْقُوْل اور مَجْلُوْد کی طرح اَلْمَفْتُوْن بھی مصدر ہے یعنی جنون اس صورت میں اَلْمَفْتُوْن مبتدا اور بِاَيِّكُمْ خبر مقدم ہو گی (یعنی تم میں سے کس کو جنون تھا) یا یہ مراد ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کس کو جنون تھا مومنوں کے فرقہ کو یا کافروں کے فرقہ کو مجنون کہنا کس فریق کو زیبا ہے۔

حاصل مطلب یہ نکلا کہ کافروں کو ہی جنون ہے کیونکہ عقل کا تقاضا ہے کہ دو اختیاری چیزوں میں سے ایک کو انتخاب کر لینے کا اگر کسی کو اختیار دیا جائے اور دو مصیبتوں میں سے کسی ایک مصیبت میں مبتلا ہونا لازم ہو تو جو چیز دونوں میں اچھی ہو اور جو مصیبت آسان ہو اس کو آدمی اختیار کرے مومن تو اس خدا سے لو لگائے ہوئے ہیں جو جامع کمالات ہے تمام عیوب سے پاک ہے نفع نقصان اسی کے دست قدرت میں ہے اسی کی مرضی کی طلب میں مومن اپنی پوری ہمت صرف کرتے ہیں اس کی ناراضگی پیدا کرنے والی چیزوں سے پرہیز رکھتے ہیں دنیا کی ذلیل ناپائیدار فانی نعمتوں کو اختیار نہیں کرتے اور کافروں کی نظر انتخاب اس کائنات پر مقصور ہے جو بغیر حکم خدا نہ نفع پہنچا سکتی ہے نہ ضرر بلکہ پتھروں کی پوجا کو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے اور اللہ واحد قہار کی عبادت کو چھوڑ دیا ہے اور آخرت کی دوامی نعمتوں کو ترک کر کے دنیا کی فوری لذتوں کو پسند کر رکھا ہے حالانکہ یہ لذتیں بھی اتنی ہی ملتی ہیں جتنی خدا چاہتا ہے۔ غرض دوزخ کو جنت پر انہوں نے ترجیح دے رکھی ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ هُوَ ضمیر فصل ہے بِمَنْ ضَلَّ کا تعلق اَعْلَمُ سے ہے یعنی اللہ بخوبی واقف ہے کہ کون اس کے راستے سے بھکا ہوا ہے پس حقیقت میں کافر ہی دیوانہ ہیں راہ حق سے بھک جانا دیوانہ ہونے کی نشانی ہے۔

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٧﴾ یعنی خدا ہی ان لوگوں سے واقف ہے جو کمال عقلی کی وجہ سے کامیاب ہیں اور

اللہ تعالیٰ تک پہنچے ہوئے ہیں۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۸﴾ فاء سببیت کے لئے ہے یعنی جب یہ بات کھل گئی کہ آپ ہدایت پر ہیں اور آپ کو جھوٹا قرار دینے والے بھٹکے ہوئے ہیں تو اب ان کے کہے پر نہ چلیے۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾ ودوا کا فاعل مُکَذِّبِیْنَ ہے لَوْ تمنائی ہے اِدھَان دَہن سے مشتق ہے بمعنی نرمی فَیُدْھِنُوْنَ میں فاء عطف تعقیبی کے لئے ہے یا سببیت کے لئے اول صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ مداہنت (مذہبی معاملات میں نرمی) فریقین کی طرف سے چاہتے ہیں لیکن اس بات کے خواستگار ہیں کہ پہلے آپ نرمی کریں پھر وہ کریں دوسری صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ وہ تمہاری طرف سے نرمی کے خواستگار ہیں اس طمع میں وہ خود بھی نرمی کرتے ہیں یعنی اگر ممانعت شرک میں تم ان کے ساتھ کچھ نرمی کرو یا بعض امور میں کبھی کبھی ان سے موافقت کرلو تو وہ بھی تم پر طعن کرنا اور بعض امور میں تمہاری مخالفت کرنا ترک کردیں گے۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے معاملہ میں نرمی کرنی حرام ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ عمومی نہی کے بعد خصوصی ممانعت فرمائی (پہلے تمام مکذبین کی اطاعت سے ممانعت کی تھی اب خصوصیت کے ساتھ حَلَّافٍ ہَمَّازٍ وغیرہ کی اطاعت سے بازداشت فرمائی) قتادہ نے فرمایا یہ آیت ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئی۔ منذر نے بروایت کلبی اور ابن ابی حاتم نے بروایت سدی بیان کیا کہ اس آیت کا نزول اخنس بن شریق کے متعلق ہوا بغوی نے عطاء کا بھی یہی قول نقل کیا ہے لیکن حسب نقل ابن ابی حاتم مجاہد قائل تھے کہ اس کا نزول اسود بن یغوث کے متعلق ہوا۔

ایک شبہ

كُلَّ حَلَّافٍ کا معنی ہے سب جھوٹی قسمیں کھانے والے بظاہر مطلب یہ ہوا کہ سب جھوٹی قسمیں کھانے والوں کی بات نہ مانو تو کیا بعض جھوٹی قسم کھانے والوں کی اطاعت جائز ہے۔

ازالہ

کل افرادی ہے اس سے عموم ممانعت کی تاکید ہوگئی مقام کا قرینہ یہی ہے یعنی کسی حَلَّاف کی اطاعت نہ کرو۔

حَلَّاف سے مراد ہے بکثرت جھوٹی قسمیں کھانے والا۔ سورہ بقرہ کی آیت وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ کی تفسیر میں تفصیل گزر چکی ہے۔

مسئلہ: زیادہ قسمیں کھانا مکروہ ہے۔

مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ حقیر بروزن فعیل مہانت بمعنی حقارت سے مشتق ہے مہانت کا اصل معنی ہے رائے اور فہم کی کمی۔

هَمَّازٍ عیب جو غیبت کرنے والا یا لوگوں کے عیوب کی طرف آنکھ اور ابرو سے اشارہ کرنے والا۔

مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ﴿۱۱﴾ چغلی کے طور پر باتیں بنانے والا۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ایمان راہ خدا میں صرف نیک کام غرض ہر چیز سے لوگوں کو روکنے والا۔

مُعْتَدٍ ظلم میں حد سے بڑھا ہوا۔

اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ بڑا گناہ گار

عُتُلٍّ قاموس میں ہے عُتُل کا معنی ہے بہت کھانے والا مغرور بد خلق اکھڑ۔

بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿۱۳﴾ بَعْدَ ذٰلِکَ کا تعلق زَنِیْم سے ہے بعد (یہاں قَبل کے مقابل نہیں ہے بلکہ) مع (ساتھ) کے معنی میں ہے یعنی مذکورہ بالا بری باتوں کے ساتھ ساتھ وہ زنیم بھی ہے۔ زَنِیْم کا معنی ہے ایسا شخص جو کسی قوم میں سے (بطور نسب) تو

نہیں ہو بلکہ اس کو شامل کر لیا گیا ہو زَنِیْم دعی کو بھی کہتے ہیں اور دعی وہ شخص ہے جس کو تم بیٹا بنا لو یا وہ شخص جو حرامی ہونے میں متہم ہو (قاموس) بیضاوی نے لکھا ہے کہ زَنِیْم کا لفظ زنمتی الشاۃ سے ماخوذ ہے بکری کے کان اور تھن اگر لٹکے ہوئے ہوں تو زنمتی الشاۃ کہلاتے ہیں ولید بن مغیرہ کی عمر جب ۱۸ سال ہو گئی تو اس کے باپ نے اس کے بیٹے ہونے کا اقرار کیا۔

اخنس بن شریق اصل میں ثقفی تھا لیکن اس کا شمار بنی زہرہ میں سے کیا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس آیت میں اللہ کی طرف سے بڑے بڑے الفاظ کا استعمال کیا گیا لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ کون شخص مراد ہے یہاں تک کہ جب لفظ زَنِیْم فرمایا تو تعیین معلوم ہو گئی اس کے گلے میں ایک لٹکاؤ تھا جس کی وجہ سے اس کی پہچان ہو جاتی ہے (شاید گلے کی کھال لٹکی ہوئی ہو یا گلے میں رسولی لٹک رہی ہو)

ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر آیت وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ نازل ہوئی تو ہم کو کسی کی خصوصی شناخت نہ ہو سکی لیکن اس کے بعد زنیم کا لفظ نازل ہوا تو ہم پہچان گئے بکری کے کانوں (یا تھنوں) کی طرح اس کے کانوں میں لٹکاؤ تھا۔

سعید بن جبیرؒ نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ شر میں ایسا ہی معروف تھا جس طرح بکری اپنے لٹکے ہوئے کانوں (اور تھنوں) سے پہچانی جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید زنیم ہونے کی صفت مذکورہ بالا قبائح سے زیادہ بڑی تھی اسی لئے وہ چند قبائح کے ذکر کے بعد زنیم کو ذکر کیا۔

حارث بن وہبؓ خزاعی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو نہ بتاؤں (کہ جنتی کون ہے اور دوزخی کون ہے) جنتی ہر وہ ضعیف آدمی ہے کہ اگر خدا کے بھروسہ پر وہ قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم سچی کر دے اور دوزخی ہے ہر بد خلق اکھڑ مغرور (بغوی۔ لیکن ابو داؤد اور طبرانی نے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۴﴾ ابن عامرؒ حمزہؒ، ابو بکرؒ اور یعقوب کی قرات میں ہمزہ استفہام بھی ہے یعنی ءَاَنْ كَانَ باقی لوگوں کی قرات حسب مذکور بغیر استفہام کے ہے ثانی قرات پر لام محذوف ہے لِاَنْ كَانَ تھا یعنی اس وجہ سے تم اس کا کہنا نہ مان لینا کہ وہ مالدار اور بیٹوں والا ہے۔ مال دولت والے کا کہنا ماننا عام لوگوں کا دستور ہی ہے۔ اول تقدیر پر استفہام انکاری ہے یعنی کیا تم اس کی بات اس لئے مان لو گے کہ وہ مالدار ہے اور بیٹوں والا ہے یا یوں کہا جائے کہ جملہ آئندہ کے مدلول سے اس کا تعلق ہے مطلب یہ ہو گا کہ اس نے کفر کیا اور قرآن کی تکذیب کی اس لئے کہ اس میں مالدار ہونے کا تو تقاضا تھا کہ شکر کرتا مگر اس نے اس کے برعکس ناشکری کی۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ جب اس کے سامنے اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پرانے لوگوں کے جھوٹے قصے لوگوں نے لکھ رکھے ہیں اَسَاطِیْر بے تکی باتیں (قاموس)

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾ یہ جملہ مستانفہ (الگ) ہے اس سے تہدید اور تخویف ہے خرطوم ہاتھی کی سونڈھ اور خنزیر کی تھوتھنی یہاں مراد ناک ہے اس شخص کو ہاتھی اور سور کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کی ناک کو ہاتھی کی سونڈھ یا خنزیر کی تھوتھنی قرار دیا۔ فراء کے نزدیک پورا چہرہ مراد ہے جزء بول کر کل مراد لے لیا جاتا ہے ابو العالیہ اور مجاہد نے کہا قیامت کے دن اس کا منہ کالا ہو جائے گا اس علامت سے اس کی شناخت ہو جائے گی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (مراد یہ ہے کہ) ہم اس کی ناک میں تلوار کی نکیل ڈالیں گے چنانچہ بدر کے دن ایسا ہی ہوا۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ یعنی قحط اور بھوک سے ہم نے اہل مکہ کی آزمائش کی جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ والوں کے لئے بددعا کی کہ الٰہی ان پر (زمانہ) یوسف کا ایسا قحط ڈال (تو اللہ نے ان کو قحط میں مبتلا کر دیا) یہاں تک کہ لوگ ہڈیاں اور مردار کھاگئے۔

كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اَلْجَنَّۃِ میں الف لام عہدی ہے (مراد ہے خاص باغ) یعنی ہم نے اہل مکہ کی ایسی

آزمائش کی جیسی ایک مخصوص باغ والوں کی تھی۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابن جریج بیان کیا کہ بدر کے دن ابو جہل نے (مسلمان کی تعداد کم دیکھ کر) کہا تھا ان کو پکڑ کر رسیوں میں باندھ لو قتل کسی کو نہ کرنا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم نے مکہ والوں کو مسلمانوں پر اتنی قوت عطا فرمائی جیسی اَصْحَابُ الْجَنَّةِ کو دی تھی۔

محمد بن مروان نے بروایت کلبی بحوالہ ابن صالح ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یمن میں صنعاء سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک نیک شخص نے ایک باغ لگایا تھا جس کو صروان کہا جاتا تھا اس شخص کا دستور تھا کہ درانتی کی زد سے جو پھل درختوں پر بچ رہتے تھے ان کو مسکینوں کے لئے چھوڑ دیتا تھا اسی طرح پھل توڑتے میں جو پھل نیچے بچھے ہوئے فرش سے باہر گرتے تھے وہ بھی مسکینوں کے ہوتے تھے باغ کے اندر کھیتی کی بھی یہی کیفیت تھی کٹتے وقت درانتی سے جو پودہ بچ رہتا وہ مسکینوں کا ہوتا تھا اور دائیں چلاتے میں جو حصہ ادھر ادھر منتشر ہو جاتا وہ بھی مساکین کا حق تھا اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے تین بیٹے وارث ہوئے انہوں نے آپس میں کہا کہ اس زمانہ میں مال تو کم ہے اور بچے زیادہ ہوگئے ہیں اس لئے باپ کی طرح ہم نہیں کرسکتے ایسا تو اس وقت کیا جاتا تھا جب مال زیادہ اور بچے کم تھے اب ہم ایسا نہیں کرسکتے چنانچہ باہم قسمیں کھالیں کہ ہم اب ایسا نہیں کریں گے۔

اِذْ اَقْسَمُوْا　　ہم نے اَصْحَابُ الْجَنَّةِ کو قحط میں مبتلا اس وقت کیا جب انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا۔

لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾　　کہ صبح ہوتے ہی مسکینوں کو اطلاع ہونے سے پہلے ہی ہم باغ کے پھل توڑ لیں گے۔

وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾　یعنی انہوں نے استثناء نہیں کیا تھا استثناء کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا انشاء اللہ کہنے کو استثناء قرار دینے کی یہ وجہ ہے کہ استثناء سے بھی بعض بعد والی چیزوں کو پہلے والی چیزوں سے الگ کرلیا جاتا ہے اور انشاء اللہ کہنے سے بھی اخراج ہی مقصود ہوتا ہے یا یہ وجہ ہے کہ افعل انشاء اللہ (اگر خدا نے چاہا تو میں ایسا کروں گا) اور لا افعل الا ان شاء اللہ (بغیر مشیت خدا کے میں ایسا نہیں کروں گا) دونوں کا مطلب ایک ہی ہے (اول قسم ہے دوسرا استثناء مطلب دونوں کا ایک ہی ہے) اس صورت میں اَقْسَمُوْا کے فاعل سے لَا يَسْتَثْنُوْنَ حال ہوگا۔ دوسرا معنی یہ کہ صبح ہوتے ہی وہ پھل توڑ لینے کی قسم کھا رہے تھے اور مسکینوں کا حصہ الگ نہیں کر رہے تھے جیسا ان کا باپ کیا کرتا تھا۔ اس صورت میں لَا يَسْتَثْنُوْنَ کا عطف لَيَصْرِمُنَّهَا پر ہوگا یا یہ علیحدہ مستانفہ جملہ ہے۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾　　یعنی جب وہ سو ہی رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے رات کو ایک مصیبت یعنی آگ کا چکر اس باغ پر آیا۔

فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾　　اور وہ اجڑی ہوئی کھیتی یا اجڑے ہوئے باغ کی طرح ہوگیا۔

صَرِیْم بروزن فعیل بمعنی مفعول وہ باغ جس کے پھل توڑ لئے گئے ہوں کوئی پھل باقی نہ رہا ہو۔

یا صَرِیْم سے مراد ہے رات یعنی وہ باغ سوختہ ہو کر رات کی طرح ہوگیا۔

یا دن مراد ہے یعنی وہ باغ بالکل سوکھ کر دن کی طرح سفید ہوگیا۔

(صرم کا معنی ہے قطع ہو جانا کٹ جانا) رات دن سے اور دن رات سے منقطع ہوتا ہے اسلئے ہر ایک کو صریم کہا جاتا ہے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس باغ سے ہر اچھائی اور خوبی منقطع ہوگئی یعنی اس میں کچھ نہیں رہا۔

ابن عباسؓ نے فرمایا بنی خزیمہ کے محاورہ میں صریم سیاہ راکھ کو کہتے ہیں یعنی وہ باغ سیاہ راکھ کی طرح ہوگیا۔

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾　　صبح ہوتے ہی انہوں نے باہم آوازیں دیں۔

اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ　　یہ تَنَادَوْا کی تفسیر ہے یعنی ایک نے دوسرے سے پکار کر کہا کہ تڑکے ہی تڑکے اپنی کھیتی پر چلو۔

عربی میں اُغْدُوْا کے بعد اِلٰی (طرف) ہونا چاہئے لیکن یہاں عَلٰی (پر) لایا گیا یا تو اس وجہ سے کہ اس جگہ غدو توجہ کے

معنی کو متضمن ہے یا غدو بمعنی استیلاء (کسی پر غلبہ پانا قادر ہونا) ہے مطلب یہ کہ اُغْدُوْا کے معنی یہاں صرف صبح کو نکل چلنے کے نہیں ہیں بلکہ یا کھیتی پر پہنچنے کے ارادہ سے نکلنے کے ہیں یا کھیتی پر تصرف کرنے کے لئے نکلنے کے ہیں) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُغْدُوْا (صیغۂ امر) غدا سے) فعل ناقص ہو اور عَلٰی حَرْثِکُمْ اس کی خبر ہو۔ (یعنی صبح کو اپنی کھیتی پر پہنچ جاؤ۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ اگر تم کھیتی کاٹنے والے ہو (یعنی اگر تم کاٹنا چاہتے ہو)

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ یَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ پس وہ چپکے چپکے کہتے ہوئے چلے خَفِیَ خَفَتَ اور خَفِهَ تینوں ہم معنی ہیں۔

اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّهَا الْیَوْمَ عَلَیْكُمْ مِّسْكِیْنٌ ﴿۲۴﴾ کہ آج تمہارے پاس باغ میں کوئی مسکین ہرگز داخل نہ ہو۔

لَا یَدْخُلَنَّ میں نہی موکد بنون ثقیلہ ہے مراد یہ ہے کہ کسی مسکین کو باغ میں ہرگز داخل نہ ہونے دینا۔ جیسے کہا جاتا ہے لَا اتینک ھھنا میں یہاں تیرے پاس ہرگز نہیں آؤں گا۔

وَّغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ﴿۲۵﴾ اِنْطَلَقُوْا پر عطف ہے اور عَلٰی حَرْدٍ کا تعلق قَادِرِیْنَ سے ہے حرد کا لغوی معنی ہے ارادہ کرنا روکنا غضبناک ہونا اسی لئے حسن بصری قتادہ اور ابو العالیہ نے کہا کہ یہاں حرد کا معنی ہے جدوجہد قرطبی مجاہد اور عکرمہ نے کہا وہ امر جس پر اتفاق رائے کر لیا تھا ابو عبیدہ نے کہا مسکینوں کو روکنے پر شعبی اور سفیان ثوری نے کہا مسکینوں پر غصہ کرنے پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ان کو اپنی نظر میں اپنے باغ اور باغ کے پھلوں پر قدرت حاصل تھی اسی قوت پر وہ صبح ہی نکل کھڑے ہوئے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ جب جا کر باغ کو سوختہ دیکھا تو بولے ہم راستہ بھٹک گئے یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ یا یہ مطلب کہ ہم نے خطا کی کہ مسکینوں کو روک دیا اور ان کا حصہ نہیں نکالا۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ (نہیں نہیں۔ باغ وہی ہے ہم بھٹکے نہیں) بلکہ ہم باغ کے پھلوں سے محروم ہو گئے۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ ان میں سے ایک متوسط عمر کے آدمی نے جو سب سے زیادہ انصاف پسند اور سمجھدار تھا کہا۔

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ استفہام تقریری ہے کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے انشاء اللہ کہنے کو تسبیح قرار دیا اس لئے کہ انشاء اللہ کہنے میں اللہ کی تعظیم اور اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کسی کو کسی بات پر قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ (یہی تسبیح کا مفہوم ہے)

ابو صالح نے کہا وہ لوگ انشاء اللہ کہنے کے موقع پر سبحان اللہ کہا کرتے تھے (اسی لئے انشاء اللہ کی جگہ تُسَبِّحُوْنَ کہا) یا یہ مطلب ہے کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اللہ کی نعمت کا شکر کیوں نہیں کرتے کہ اس نے تم کو یہ باغ دیا اور مسکینوں کو کیوں روکتے ہو (اس وقت تسبیح بمعنی شکر کے ہوگا) کیونکہ شکر کا معنی ہے نعمت کو دینے والے کی مرضی حاصل کرنے کے لئے صرف کرنا۔ یا تسبیح بمعنی استغفار ہے) تم اپنے اس فعل کی معافی کیوں نہیں مانگتے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ بولے ہمارا رب پاک ہے اس جملہ میں اس امر کا اقرار ہے کہ اللہ ظالم ہونے سے پاک ہے (وہ ظالم نہیں)

اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ اور اپنے ظالم ہونے کا اعتراف ہے کہ ہم نے ہی مسکینوں کا حق روک کر اپنے اوپر ظلم کیا۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مسکینوں کا حق روکنے پر باہم ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ یَتَلَاوَمُوْنَ اَقْبَلَ کے فاعل اور مفعول سے حال ہے جیسے بولا جاتا ہے لقیہ راکبین وہ اس سے ایسی حالت میں ملا کہ دونوں سوار تھے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝ کہنے لگے ہائے افسوس زیادتی ہماری ہی طرف سے ہوئی یعنی اللہ نے ہم کو نعمتیں عطا فرمائیں اور ہم نے اس کا شکر ادا نہیں کیا جیسا ہمارے باپ نے کیا تھا۔

عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اپنے کئے پر پشیمان ہو کر جب انہوں نے توبہ کی اور آئندہ شکر کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو کلام کا رخ اپنی طرف پھیر کر کہنے لگے قریب ہے کہ اس سوختہ باغ سے بہتر عوض ہمارا رب عطا فرمائے گا۔

اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝ ہمارا مرکز رغبت ہمارا رب ہی ہے الی انتہاء غبت کے لئے ہے یا رغبت معنی رجوع کو متضمن ہے یعنی ہم اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس جملہ میں امید کا سبب بیان کیا گیا ہے اللہ کی طرف رجوع کرنا انعام الٰہی حاصل کرنے کا سبب ہوتا ہے (یعنی امید انعام ہم کو اپنے رب سے اس لئے ہے کہ اسی کی طرف ہمارا رخ ہو گیا ہے اور جس کا رخ رب کی طرف ہو جاتا ہے پروردگار اس کو اپنی نعمت عطا فرماتا ہے) حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ جب ان لوگوں نے خالص دل سے توبہ کر لی اور اللہ کو ان کی سچائی معلوم ہو گئی تو اللہ نے سوختہ باغ کے عوض ان کو ایک اور باغ عطا فرمایا جس کو جنون کہا جاتا تھا اس باغ کے انگوروں کی یہ حالت تھی کہ ایک خوشہ خچر پر لادا جاتا تھا۔ (بغوی)

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ یعنی جیسا عذاب ہم نے اصحاب الجنۃ اور اہل مکہ پر نازل کیا ایسا ہی شکر نہ کرنے پر دنیا میں عذاب آتا ہے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ اور کفر معصیت ترک شکر اور زکوٰۃ نہ دینے کا اخروی عذاب دنیوی عذاب سے بہت سخت اور نا قابل زوال ہے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اگر وہ جانتے ہوتے تو جو حرکتیں کی ہیں نہ کرتے۔ یہ جملہ شرط ہے گزشتہ کلام کا مفہوم ہی جزا پر دلالت کر رہا ہے جدید جزاء کی ضرورت نہیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ اللہ کے پاس یعنی جوار قدس میں متقیوں کے لئے۔

جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ راحت کے باغ ہیں یعنی ایسے باغ ہیں جن کے اندر آسائش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

سابق آیت میں مجرموں کے لئے عذاب کی وعید تھی اس آیت میں متقیوں کے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

مشرکوں نے کہا تھا کہ بالفرض اگر روز آخرت ہوا تو جس طرح دنیا میں ہم کو نعمتیں ملی ہیں اسی طرح تم سے زیادہ یا تمہاری طرح ہم کو اس روز بھی نعمتیں دی جائیں گی۔ اس خیال کی تردید میں اللہ نے فرمایا۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ؕ استفہام انکاری ہے مسلمانوں کے برابر مجرموں کو قرار دینے کا انکار ہے جس سے مسلمانوں پر مجرموں کی فضیلت کا انکار بطریق اعلیٰ مستفاد ہوتا ہے۔ اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے اصل کلام یوں تھا کہ کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں پر فضیلت نہیں دیں گے اور کیا مسلمانوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے۔

مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ؕ تم جو یہ عجیب ترین بعید از عقل فیصلہ کر رہے ہو کیسے کر رہے ہو عقل کا تقاضا ہے کہ فرماں بردار کا حال نافرمان سے اچھا ہو۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝ؕ اَمْ منقطعہ بمعنی بَلْ ہے یعنی مجرم اور مطیع کی مساوات عقلاً ثابت نہیں تو کیا کوئی سمعی دلیل یعنی کتاب سماوی ایسی ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تم کو تمہاری دل پسند خاطر خواہ چیزیں آخرت میں ملیں گی۔ اِنَّ محل مفعول میں ہے اس لئے بالکسر نہ ہونا چاہئے بلکہ اَنَّ بالفتح ہونا چاہئے پس یا تو قول محذوف ہے یعنی تم اس کتاب میں یہ قول پڑھتے ہو یا لَمَا تَخَيَّرُوْنَ میں لام لانے کی وجہ سے بجائے اَنَّ کے اِنَّ فرمایا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام بطور استیناف ہو۔

اَمۡ لَكُمۡ اَيۡمَانٌ عَلَيۡنَا یعنی یا قسموں سے پختہ کئے ہوئے تمہارے عہد ہم پر لازم ہیں۔

بَالِغَةٌ انتہائی پختہ۔

اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ اس کا تعلق (بَالِغَةٌ سے نہیں ہے بلکہ) محذوف فعل سے ہے یعنی ایسے عہد جو قیامت تک ہم پر لازم رہیں اس کی ذمہ داری سے اس وقت تک سبکدوشی نہ ہو جب تک قیامت کے دن تمہارے فیصلہ کے مطابق فیصلہ نہ ہو جائے۔ یا بَالِغَة سے تعلق ہے یعنی قیامت تک پہنچنے والے عہد۔

اِنَّ لَكُمۡ لَمَا تَحۡكُمُوۡنَ ۝۳۹ لفظ اَیۡمَان سے قسم کا مفہوم پیدا ہوا تھا یہ جملہ اس کا جواب (یعنی محل مفعول میں) ہے یعنی کیا ہم نے قسم کھالی ہے کہ جو تم فیصلہ کرو گے وہی تم کو ضرور ملے گا۔

سَلۡهُمۡ اَيُّهُمۡ بِذٰلِكَ زَعِيۡمٌ ۝۴۰ ان سے دریافت کرو کہ اس دعوے کا مدعی اور مثبت کون ہے۔ اللہ نے ان آیات میں ان تمام عقلی نقلی دلائل کی نفی فرمادی جن سے ثبوت دعوی کا امکان ہو سکتا تھا نہ ان کو استحقاق ہے نہ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے نہ کوئی ایسا شخص ہے جو اس دعوی کو ثابت کر سکتا ہو کہ یہ اس کی تقلید کرتے ہوں جب مومنوں کے ساتھ کافروں کی مساوات کی نفی (ہر طرح) کر دی تو (یہ خیال ممکن تھا کہ اگرچہ خدا کافروں کو مومنوں کے برابر درجہ میں نہیں کرے گا لیکن خدا کے دوسرے شریک ایسا کر دیں گے اس امکانی خیال کو دفع کرنے کے لئے) آئندہ آیت میں وجود شرکاء کی ہی نفی فرمادی کہ جب اللہ کا کوئی شریک ہی نہیں تو اس کا تصرف کیسا۔

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكَآءُ ۚ فَلۡيَاۡتُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ یعنی کیا کافروں کو قیامت کے دن مومنوں کے ہم رتبہ بنادینے والے کچھ شرکاء الوہیت ہیں اگر ایسا ہے تو ان شرکاء کو پیش کریں اور ثابت کریں کہ علم قدرت ارادہ اور تکوین (تخلیق) میں وہ خدا کی طرح ہیں اس جگہ امر کا صیغہ (تکلیف بالمحال کے لئے نہیں بلکہ) کافروں کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے ہے اور فَلۡيَاۡتُوۡا میں فاء سببی ہے۔

اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ۝۴۱ اگر وہ اپنے دعوی میں سچے ہیں۔ گزشتہ کلام جزاء پر دلالت کر رہا ہے اس لئے اس جگہ جملہ شرطیہ کو جزاء کی ضرورت نہیں ہے۔

يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ ظرف (زمان) کا تعلق اُذۡكُرۡ محذوف سے ہے (یعنی اس روز کو یاد کرو جب پنڈلی کھولی جائے گی پنڈلی کے کشف سے مراد ہے میدان حشر میں نور الٰہی کی ایک مخصوص پرتواندازی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کیا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کو دیکھیں گے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں دوپہر کے وقت جبکہ ابر بھی نہ ہو کیا تم کو سورج کے دیکھنے میں کچھ اشتباہ ہوتا ہے یا چودھویں تاریخ کو جب ابر نہ ہو تم کو چاند دیکھنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا نہیں اے رسول خدا ارشاد فرمایا جیسے تم کو سورج اور چاند کو دیکھنے میں اشتباہ نہیں ہوتا ہے اسی طرح قیامت کے دن اللہ کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ قیامت کا دن ہو گا تو ایک اعلانچی اعلان کرے گا ہر گروہ اپنے اپنے معبود کے پیچھے چلا جائے حکم ہوتے ہی مورتیوں اور استھانوں کی پوجا کرنے والے دوزخ میں گرنے لگیں گے کوئی بغیر گرے نہ رہے گا۔ جب اللہ کی عبادت کرنے والوں کے سوا خواہ نیک ہوں یا بد (دوسری روایت میں ہے جب اہل کتاب کے سوا) کوئی باقی نہ رہے گا تو یہودیوں کو بلایا جائے گا اور دریافت کیا جائے گا تم کس کی عبادت کرتے تھے وہ کہیں گے اللہ کے بیٹے عزیز کی ارشاد ہو گا تم جھوٹے ہو اللہ نے تو اپنے لئے نہ بیوی بنائی نہ اولاد پھر فرمان ہو گا کیا چاہتے ہو وہ عرض کریں گے پروردگار ہم پیاسے ہیں ہم کو پانی پلا اشارہ ہو گا کیا تم کو دکھتا نہیں۔ جہنم اس وقت سراب کی طرح (پانی کا دھوکہ) ہو گا سب کو ہنکا کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ حقیقت میں جہنم (کی آگ اتنی تیز ہو گی کہ) ایک حصہ دوسرے کو کھا رہا ہو گا سب جا کر اس میں گر پڑیں گے پھر عیسائیوں کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کس کی عبادت کرتے تھے عرض کریں گے اللہ کے بیٹے مسیح کی ارشاد ہو گا جھوٹے ہو اس کے بعد حضور ﷺ نے وہی بیان فرمایا جو یہودیوں سے متعلق فرمایا

تھا۔
حاکم نے بروایت حضرت ابن مسعودؓ بیان کیا ہے اور اس کی تصحیح دار قطنی وغیرہ نے بھی کی ہے کہ اللہ کے سوا جو کوئی جس کی پوجا کرتا تھا خواہ سورج ہو یا چاند یا مورتیاں اس کے معبودوں کو مجسم بنا کر اس کے سامنے لایا جائے گا۔ جو عزیر کے پرستار تھے ان کے سامنے عزیر کے شیطان کو (بصورت عزیر) اور جو مسیح کے پرستار تھے ان کے سامنے مسیح کے شیطان کو (بشکل مسیح) لایا جائے گا اور سب لوگ اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ جہنم میں چلے جائیں گے۔

طبرانی، ابویعلی، بیہقی وغیرہ نے بروایت حضرت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ کسی فرشتہ کو عزیر کی شکل پر اور کسی فرشتہ کو مسیح کی شکل پر کر دیا جائے گا ایک کے پیچھے یہودی ہو جائیں گے اور دوسرے کے پیچھے عیسائی پھر یہ معبود دوزخ کی طرف ان کی قیادت کریں گے۔ آیت لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کا یہی مطلب ہے اب ہم صحیحین کی روایت (جو حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے) کی طرف لوٹتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا غرض جب اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہے گا جن میں نیک بھی ہوں گے اور بد بھی تو رب العالمین ان کے پاس تشریف فرما ہو گا اور ارشاد فرمائے گا ہر امت اپنے اپنے معبود کے پیچھے جا رہی ہے تم کیا دیکھ رہے ہو وہ عرض کریں گے پروردگار جب دنیا میں ہم کو ان کی بہت زیادہ حاجت تھی اس وقت بھی ان سے الگ رہے ان کے ساتھی نہ ہوئے (اب بھی ان سے الگ ہیں) اللہ فرمائے گا میں تمہارا رب ہوں وہ جواب دیں گے نعوذ باللہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک نہیں قرار دیتے یہ الفاظ دو یا تین بار کہیں گے یہاں تک کہ بعض لوگ پلٹ جانے ہی والے ہوں گے کہ اللہ فرمائے گا کیا کوئی نشانی ہے جس سے تم اپنے رب کو پہچان لو وہ عرض کریں گے جی ہاں اس وقت اللہ پنڈلی کھولے گا تو جو شخص خلوص دل سے دنیا میں سجدہ کرتا تھا اس کو سجدہ کرنے کی اجازت ملے گی اور جو شخص نفاق کے ساتھ یا دکھاوٹ کے لئے سجدہ کرتا تھا اس کی پشت کو اللہ ایک تختہ سا کر دے گا وہ سجدہ کرنا چاہے گا تو پشت کے بل گر پڑے گا۔ اس کے بعد جہنم پر پل لگایا جائے گا۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ جسر (پل) کیا ہو گا فرمایا پھسلوان دلدل جس پر آنکڑے لوہے کے کانٹے اور نجد میں پیدا ہونے والی خار دار گھاس یعنی سعدان کی طرح خمیدہ خار ہوں گے اس وقت شفاعت کی اجازت ہو جائے گی اور انبیاء کہیں گے الٰہی بچا الٰہی بچا۔ اہل ایمان جسر کے اوپر سے نگاہ اور ہوا اور پرندوں اور تیز گھوڑوں اور اونٹوں کی طرح (مختلف مراتب کے لحاظ سے) گزر جائیں گے کچھ صحیح سالم بچ جائیں گے کچھ خراش اور کھرونچ پا کر کچھ جہنم کی آگ میں گر پڑیں گے جب اہل ایمان دوزخ سے بچ جائیں گے تو قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ اپنے دوزخی بھائیوں کے لئے اللہ سے اتنا جھگڑا کریں گے کہ تم میں سے کوئی اپنے واضح حق کے لئے اس سے زیادہ نہیں جھگڑتا عرض کریں گے پروردگار! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے نمازیں پڑھتے تھے حج کرتے تھے ارشاد ہو گا شناخت کر کے ان کو نکال لو چونکہ ان کے چہرے دوزخ سے محفوظ ہوں گے اس لئے (شناخت کر کے) بہت لوگوں کو وہ دوزخ سے نکال لیں گے پھر عرض کریں گے پروردگار جن لوگوں کے متعلق تو نے اجازت دی تھی ان میں سے دوزخ کے اندر کوئی باقی نہیں رہا ارشاد ہو گا لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں دینار کی برابر خیر (ایمان اور نیک عمل کی نشانی) پاؤ اس کو نکال لو۔ یہ مومن بہتیرے آدمیوں کو نکال لیں گے اللہ فرمائے گا۔ پھر لوٹو اور جس کے دل میں آدھے دینار کے برابر خیر پاؤ اس کو نکال لو اس پر بہت لوگوں کو مومن نکال لیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھر لوٹو اور جس کے دل میں چیونٹی کے برابر خیر پاؤ اس کو بھی نکال لو حسب الحکم بہت مخلوق کو نکال لیں گے اور عرض کریں گے پروردگار دوزخ کے اندر اب ہم کو خیر نہیں ملتی۔ اللہ فرمائے گا ملائکہ شفاعت کر چکے انبیاء بھی شفاعت کر چکے۔ اہل ایمان نے بھی شفاعت کر لی اب سوائے ارحم الراحمین کے کوئی نہیں رہا چنانچہ اس کے بعد اللہ خود مٹھی بھر کر ان لوگوں کو دوزخ سے نکالے گا۔ جنہوں نے کبھی نیکی نہ کی ہو گی اور (جل کر) کوئلہ بن گئے ہوں گے جنت کے ایک دروازہ پر ایک دریا ہے جس کو زندگی کا دریا کہا جاتا ہے اس نہر حیاۃ میں ان کو ڈال دے گا نہر حیات سے وہ ایسے (تروتازہ) ہو کر نکلیں گے جیسے دانہ

سیلاب کی کیچڑ میں سے (پھوٹ کر) نکلتا ہے گویا وہ موتی ہوں گے مگر ان کی گردنوں پر مہریں لگی ہوں گی اہل جنت کہیں گے یہ ہیں رحمٰن کے آزاد کردہ جن کو بغیر کسی عمل اور سابق نیکی کے اللہ نے جنت میں داخل فرمایا ہے حکم ہو گا جو کچھ تم کو نظر آئے وہ سب تمہارا ہے اور اتنا ہی اور بھی۔

کشف ساق کا ذکر حاکم وغیرہ کی نقل کردہ اس حدیث میں بھی آیا ہے جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جو حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آئی ہے اس میں یہ لفظ ہیں کہ ان کے پاس اللہ ایسی شکل میں تشریف فرما ہو گا جس کو وہ پہچانتے نہ ہوں گے۔

لالکائی نے کتاب السنۃ میں اور آجری نے کتاب الرویۃ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کا دن ہو گا تو ہر قوم کے سامنے اس کا دنیوی معبود مجسم کر کے لایا جائے گا اور ہر قوم اپنے معبود کی طرف چلی جائے گی صرف اہل توحید رہ جائیں گے ان سے کہا جائے گا اور لوگ جا چکے (تم بھی جاؤ) وہ عرض کریں گے ہم جس رب کی دنیا میں عبادت کرتے تھے وہ نظر نہیں آتا (کس کے پاس جائیں) اللہ فرمائے گا کیا تم اسکو دیکھ کر پہچان لو گے اہل توحید جواب دیں گے جی ہاں پوچھا جائے گا جب تم نے اسکو دیکھا ہی نہیں تو کیسے پہچان لو گے عرض کریں گے (یہی اس کی شناخت ہے کہ) اس کی کوئی شکل نہیں اللہ ان کے لئے حجاب کھول دے گا اور وہ دیکھ کر سجدہ میں گر پڑیں گے لیکن کچھ لوگ (کھڑے) رہ جائیں گے جن کے پشت کے مہرے بیل کی پشت کے مہروں کی طرح ہو جائیں گے (جھک نہ سکیں گے) وہ سجدہ کرنا چاہیں گے مگر کر نہ سکیں گے اس کے بعد اللہ فرمائے گا سروں کو اٹھاؤ میں نے تم میں سے ہر شخص کے عوض (دوزخ کے اندر) یہودیوں اور عیسائیوں میں سے ایک شخص کر دیا (یعنی اگر تم مومن نہ ہوتے تو اس جگہ جاتے جہاں یہودی اور عیسائی داخل ہیں) ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی تجلیاں مختلف اقسام کی ہیں۔ ایک صورت کی پرتو اندازیاں ہیں جو عالم مثال میں ہوتی ہیں۔ حقیقت میں یہ دیدار الٰہی نہیں ہوتا جیسے رسول اللہ ﷺ نے خواب میں اپنے رب کو امرد نوجوان کی شکل میں دیکھا تھا جس کے بال گھونگھریالے اور پاؤں میں سنہری جوتیاں تھیں۔ اسی تجلی کو میدان حشر میں دیکھ کر کہنے والے کہیں گے نعوذ باللہ ہم اپنے رب کا کسی کو ساجھی نہیں مانتے۔ دوسری تجلی میدان حشر میں بغیر کسی شکل اور صورت کے ہو گی لیکن اس میں کسی قدر پرچھائیں کی آمیزش ہو گی شاید کشف ساق سے یہی تجلی مراد ہے جس کو اچھے برے مومن بلا ابر مہر نیمروز اور چودھویں کے چاند کی طرح دیکھیں گے اور کافروں کو یہ تجلی نصیب نہ ہو گی اللہ نے فرمایا ہے كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ کی عبادت کرنے والے نیک اور بد لوگوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہے گا تو رب العالمین تشریف فرما ہو کر کشف ساق کرے گا۔ ید (ہاتھ) اور وجہ (چہرہ) کی طرح لفظ ساق بھی متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقی مراد سے سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں پختہ علماء تو یہی کہتے ہیں کہ ہم (حقیقت کو جانے بغیر اس کو مانتے ہیں)۔

تیسری تجلی جنت میں ہو گی اس میں پرچھائیں کی آمیزش بھی نہیں ہو گی (لفظ زیادہ سے) اس آیت میں اسی کو بیان کیا گیا ہے اَلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ۔

وَيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ یعنی نیک اور بد اہل ایمان کو سجدہ کی دعوت دی جائے گی لیکن یہ سجدہ تکلیفی نہ ہو گا آخرت دار تکلیف نہیں ہے بلکہ طبعی دعوت ہو گی جب عظمت و جلال کے پردے اٹھ جائیں اور کوئی مانع نہ رہے تو حقیقت ممکن کا تقاضا ہے کہ واجب کے سامنے سربسجود ہو جائے۔

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ یعنی نافرمان (ریاکار) سجدہ نہ کر سکیں گے کیونکہ گناہوں کے بوجھ سے ان کی پشت ایک بے جوڑ تختہ بن چکی ہو گی لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ کی ضمیر فاعل کل اہل دعوت کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ بعض کی طرف لوٹتی ہے (یعنی ریاکار نافرمان مومن) جیسے وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ کے بعد وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں (ان) بعض مطلقات کی طرف هُنَّ کی ضمیر راجع ہے (جن کی عدت کامل نہ ہو گئی ہو) احادیث مذکورہ اسی پر دلالت کر رہی ہیں پس

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو نماز بالکل نہیں پڑھتے تھے یا جماعت کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے اور پڑھتے بھی تھے تو تقیہ کے طور پر جیسے رافضی وغیرہ بدعتی پڑھتے ہیں یا دکھاوٹ کے لئے پڑھتے تھے ان کے عمل میں خلوص نہ تھا۔

ایک سوال

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بعض طریقوں سے ثابت ہے کہ جب مومنوں کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہے گا اور مومنوں میں منافق بھی ہوں گے تو اللہ ان پر تشریف فرما ہوگا اس حدیث کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پنڈلی کھول دے گا اور تجلی فرمائے گا اور اس کی عظمت سے لوگ پہچانیں گے کہ وہ ان کا رب ہے تو منہ کے بل سجدہ میں گر پڑیں گے مگر ہر ایک منافق پشت کے بل گرے گا اور اللہ منافقوں کی پشت کو بیل کے کریوں کی طرح بنادے گا۔

جواب

بظاہر منافق سے مراد وہ شخص ہے جو اعمال اور فرعی عقائد کے لحاظ سے منافق ہو (یعنی جس کے اعمال کافرانہ ہوں اور اصل عقیدہ مومنانہ) اصول اعتقاد کے لحاظ سے منافق مراد نہیں ہے (یعنی جس کا اصل عقیدہ صحیح نہ ہو اور دکھاوٹ کے لئے اعمال مومنانہ ہوں) کیونکہ اصل اعتقاد کے لحاظ سے منافق تو بلاشبہ کافر ہیں اور دوزخ کے نچلے طبقہ میں ان کا مقام ہے اور جلوہ رب سے وہ محجوب ہوں گے دیدار الٰہی کا شرف ان کو کس طرح حاصل ہو سکتا ہے احادیث میں گناہ گاروں پر بھی لفظ منافق کا اطلاق کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت رہے گی جب تک اس کو ترک نہ کردے (چار باتیں یہ ہیں) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے) بات کرے تو جھوٹ بولے کوئی معاہدہ کرے تو عہد شکنی کرے اور جھگڑے کے وقت بیہودہ بکے (بخاری و مسلم) بروایت عبداللہ بن عمرؓ) لیکن مسلم نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ تین خصلتیں ہیں اس حدیث کے آخر میں ہے کہ خواہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور مسلمانی کا دعویٰ کرتا ہو اس روایت میں گزشتہ روایت کا آخری حصہ یعنی چوتھی خصلت مذکور نہیں ہے۔

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ (حقیقت میں) خشوع (عاجزی، پستی) ان لوگوں کی صفت ہے جو صاحب بصر (نظر) ہوں لیکن خشوع کا ظہور چونکہ نظر میں ہوگا اس لئے مجازاً ابصار کی طرف نسبت کردی گئی۔

تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ان کو ذلت لاحق ہوگی۔

وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ دنیا میں ان کو سجدہ کرنے کی دعوت دی جاتی تھی مگر اللہ کے حکم کے مطابق خلوص کے ساتھ وہ سجدہ نہیں کرتے تھے۔

وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۝۴۳ اس وقت تو وہ سالم تھے ان کی پشت سپاٹ تختہ نہ تھی (جھک سکتے تھے مگر سجدہ نہ کرتے تھے) وَقَدْ كَانُوْا سے سَالِمُوْنَ تک آخرت میں سجدہ نہ کرسکنے کی وجہ بیان کی ہے وَهُمْ سَالِمُوْنَ میں دوسرے يُدْعَوْنَ کے فاعل کی حالت کا اظہار ہے اور خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ اول يُدْعَوْنَ کے فاعل کے مختلف احوال ہیں۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ یہ جملہ معترضہ ہے الحدیث سے مراد قرآن مجید ہے اس جملہ میں کافروں کے لئے وعید اور رسول اللہ ﷺ کے لئے تسکین بخش حکم ہے یعنی اے پیغمبر آپ فکرمند نہ ہوں کافروں کا معاملہ میرے سپرد کردیں میں آپ کی طرف سے ان سے نمٹ لوں گا۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ہم کی ضمیر (جمع) مَنْ کی طرف معنوی اعتبار سے راجع ہے (یعنی مَنْ کا لفظ اگرچہ

مفرد ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جمع ہے اس لئے جمع کی ضمیر کا اس کی طرف رجوع صحیح ہے)
دَرْجٌ (مصدر) کاغذ یا کپڑے کو لپیٹنا لیکن اسم مفعول کے معنی میں مستعمل ہے یعنی لپٹا ہوا جس طرح لفظ طی سے موت مراد ہو جاتی ہے اسی طرح بطور استعارہ لفظ درج بھی موت کے لئے مستعمل ہے جوہری کا یہی قول ہے جوہری نے آیت کے ترجمہ میں کہا ہے کہ ہم خط کی طرح ان کو لپیٹ دیں گے یعنی غافل رکھیں گے۔
بعض نے کہا ہم ان کو زینہ بزینہ یعنی رفتہ رفتہ پکڑ لیں گے خلاصہ یہ کہ ہم ان کو آہستہ آہستہ عذاب میں گرفتار کریں گے۔

مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۴﴾ اس طرح سے کہ ان کو عذاب کے آنے کی کیفیت بھی معلوم نہ ہوگی۔

وَأُمْلِي لَهُمْ اور میں ان کو ڈھیل دوں گا۔ مہلت دوں گا۔

إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿۴۵﴾ میری تدبیر بڑی مضبوط ہے اس کو دفع نہیں کیا جا سکتا کَید کا معنی ہے مکر تدبیر دل کے اندر چھپے ہوئے ارادۂ بد کے خلاف اچھائی کا اظہار۔ اللہ کے کید کا معنی ہے انتقام بشکل انعام۔
جوہری نے کہا کہ بعض کے نزدیک اس آیت میں کید سے مراد عذاب ہے مگر صحیح یہ ہے کہ کید سے مراد ہے مہلت دینا، ڈھیل دینا یعنی دنیا میں جو نعمتیں ہم ان کو عطا کرتے ہیں یہ ان کے لئے ڈھیل ہے مسلمانوں پر ترجیح دینا مقصود نہیں ہے۔

فائدہ

اگر گناہ کرنے کے بعد دنیا ہی میں کوئی مصیبت بطور سزا آجائے تو گناہ کی معافی کی امید ہو سکتی ہے۔ لیکن ارتکاب معصیت کے بعد اگر نعمت کی افزونی ہو تو اندیشہ رکھنا چاہئے کہ یہ اللہ کی طرف سے کہیں ڈھیل ہو۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا کیا آپ ان سے تبلیغ احکام الٰہی کی کوئی اجرت مانگتے ہیں۔ ام منقطعہ بمعنی بَلْ ہے۔

فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿۴۶﴾ کہ وہ تاوان کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے ہوں اور ڈانڈ کو دفع کرنے کے لئے بے دلیل تمہاری طرف سے اعراض کر رہے ہوں۔ اس جملہ میں فاء سببی عاطفہ ہے۔

أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ یعنی لوح محفوظ یا امور غیبیہ

فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿۴۷﴾ یعنی کیا آپ ان سے اجرت مانگتے ہیں کہ وہ تاوان برداشت نہیں کر سکتے اور بے وجہ تم سے کتراتے ہیں یا ان کے پاس لوح محفوظ یا غیبی اطلاعات ہیں کہ وہاں سے اپنی منشاء کے احکام لکھ لیتے ہیں گزشتہ آیات میں اللہ نے دلیل عقلی اور نقلی اور تقلید کی نفی کی تھی تقلید عوام کے لئے باعث استدلال ہوتی ہے اس جگہ امور غیبیہ کے کشف اور الہام کی نفی کر دی کشف غیب اور الہام سے انبیاء اور ملائکہ کو علم حاصل ہوتا ہے بلکہ بعض اولیاء کو بھی لوح محفوظ اور امور غیبیہ کا کشف ہو جاتا ہے اور یہی ان کے علم کا ذریعہ ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ امور مذکورہ میں سے جب ان کے پاس کچھ نہیں تو ان کا فیصلہ محض بیہودہ اور بے حقیقت ہے۔

فَاصْبِرْ اے محمد ﷺ آپ ان کی ایذا رسانی پر صبر رکھئے کیونکہ جو کچھ یہ کہتے ہیں بے دلیل کہتے ہیں۔

لِحُكْمِ رَبِّكَ یعنی آپ تنگدل نہ ہوں جلدی نہ کریں اللہ نے جو ڈھیل ان کو دی ہے اور ڈھیل دینے کے بعد ان کی گرفت کرے گا اس فیصلہ خداوندی پر صبر رکھیں۔

وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ تنگدلی اور عجلت پسندی میں یونسؑ کی طرح نہ ہو جائیں۔
وہبؒ (بن منبہ) نے بیان کیا ہے کہ حضرت یونسؑ بن متی ایک نیک بندے تھے مگر طبیعت میں کچھ تنگی (عجلت پسندی) تھی جب ان پر نبوت کا بار ڈالا گیا تو ثقل محسوس کیا اور بار اٹھانے سے کسمسائے جیسے اونٹ کے بچہ پر جب بھاری بوجھ لادا جاتا ہے تو وہ پھینک کر بھاگ نکلتا ہے یہی وجہ تھی کہ اللہ نے اولوالعزم انبیاء (کی فہرست) سے یونسؑ کو خارج کر دیا اور رسول

اللہ ﷺ سے فرمایا کہ آپ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح برداشت کریں اور صاحب حوت (مچھلی والا یعنی یونسؑ بن متی) کی طرح نہ ہو جائیں حضرت یونسؑ کا قصہ ابن مسعودؓ، سعید بن جبیرؒ اور وہبؒ کے بیان کے موافق اس طرح ہوا کہ نینوی علاقہ موصل میں ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ لوگ آباد تھے ان کی ہدایت کے لئے اللہ نے یونسؑ کو بھیجا جب انہوں نے حکم نہ مانا تو یونسؑ نے ان کو اطلاع دی کہ تین روز میں صبح کے وقت تم پر عذاب آئے گا اہل نینوی نے آپس میں کہا کہ یونسؑ نے اللہ پر دروغ بندی تو نہیں کی ہے اچھا دیکھتے رہو اگر یونسؑ رات بھر ساتھ رہے تو سمجھ لو کچھ نہ ہوگا اور رات کو نہ رہے (کہیں نکل جائے تو سمجھ لو سچا ہے صبح کو عذاب آئے گا چنانچہ یونسؑ آدھی رات کو ہی نینوی سے نکل گئے اور صبح کو عذاب کا کچھ ظہور ہونے لگا سروں سے میل بھر اونچا کالا بادل بلکہ سخت دھواں چھا گیا اور پھر نیچے اتر کر شہر کو ڈھانپ لیا گھروں کی چھتیں تک کالی پڑ گئیں لوگوں نے یہ کیفیت دیکھی تو ہلاکت کا یقین ہو گیا یونسؑ کو تلاش کیا تو وہ نہ ملے مگر اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ کا ارادہ پیدا کیا سب مرد عورتیں بچے اور چوپائے شہر کے باہر میدان میں نکل کھڑے ہوئے کمبل کا لباس پہن لیا ماں کو بچہ سے اور چوپائے کو اس کے بچہ سے الگ کر دیا خلوص نیت کے ساتھ ایمان لے آئے توبہ کی۔ بارگاہ الٰہی میں گڑگڑائے تو اللہ نے ان پر رحم فرمایا ان کی دعا قبول کر لی آیا ہوا عذاب دور کر دیا یہ واقعہ دس محرم کا ہے ادھر حضرت یونسؑ بستی سے نکل کر نزول عذاب اور قوم کی بربادی کے منتظر تھے لیکن جب کچھ نظر نہ آیا اور ان کا قول غلط ثابت ہوا اور عذاب نازل نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی ان کے پاس موجود نہ تھی تو کہنے لگے اب میں جھوٹا ثابت ہو گیا قوم کے سامنے کیسے جاؤں گا یہ خیال کر کے چل دیے اور سمندر پر پہنچ گئے وہاں ایک کشتی پر کچھ لوگ سوار ہو رہے تھے حضرت کو دیکھ کر بے کرایہ سوار کر لیا لیکن کشتی سمندر میں پہنچ کر کھڑی ہو گئی نہ آگے بڑھتی تھی نہ پیچھے ہٹتی تھی لوگوں نے کہا آج اس میں کوئی نئی بات پیدا ہو گئی حضرت یونسؑ نے فرمایا میں ہوں مجھے اس کی بات معلوم ہے اس پر ایک گناہگار آدمی سوار ہے لوگوں نے پوچھا وہ کون ہے فرمایا میں ہوں مجھے سمندر میں پھینک دو کہنے لگے ہم خود آپ پر قربان ہو جائیں گے آپ کو نہیں پھینکیں گے بالاخر باہم تین بار قرعہ ڈالا اور حضرت یونسؑ کا نام نکلا کشتی کے قریب ایک مچھلی منہ کھولے حکم ربی کی منتظر تھی حضرت نے فرمایا خدا کی قسم تم سب ہلاک ہو جاؤ گے ورنہ مجھے سمندر میں پھینک دو مجبوراً لوگوں نے پھینک دیا فوراً مچھلی نے لے لیا اور لوگ کشتی لے کر چل دیئے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب کشتی کھڑی ہو گئی تو ملاحوں نے کہا یہاں کوئی گناہ گار آدمی یا بھاگا ہوا غلام کشتی میں ہے کشتی کا یہی طریقہ ہے اور قرعہ ڈالنے کا ہمارا رواج ہے۔ چنانچہ تین بار قرعہ ڈالا اور حضرت یونسؑ کا نام نکلا آپ خود پانی میں گر پڑے اور مچھلی نے آپ کو نگل لیا اور اس مچھلی کو ایک اور بڑی مچھلی نے نگل لیا۔ اللہ نے مچھلی کو پیام بھیجا کہ ہم نے یونسؑ کو تیرا رزق نہیں بنایا ہے بلکہ تیرے پیٹ کو اس کی پناہ گاہ اور مسجد بنایا ہے دوسری روایت میں پناہ گاہ کی بجائے قید خانہ کا لفظ آیا ہے۔

یہ بھی منقول ہے کہ قرعہ اندازی سے پہلے حضرت یونس علیہ السلام نے کھڑے ہو کر فرمایا میں ہی گناہ گار بھاگا ہوا (غلام) ہوں لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول جب تک ہم قرعہ نہ ڈال لیں آپ کو پانی میں نہیں پھینکیں گے لیکن جب آپ کے نام کا قرعہ آگیا تو آپ خود پانی میں گر پڑے۔

قصہ میں یہ بات بھی منقول ہے کہ سمندر کے کنارے جب آپ پہنچے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی اور دو لڑکے تھے جہاز آگیا اور آپ نے چڑھنے کا ارادہ کیا تو سوار ہونے کے لئے پہلے بیوی کو آگے بڑھایا لیکن جہاز اور آپ کے درمیان ایک لہر آگئی (اور بیوی کو بہا کر لے گئی) اور دوسری لہر نے آکر بڑے بیٹے کو بھی لے لیا اور چھوٹے بیٹے کو (جو کنارہ پر) تنہا تھا بھیڑیا لے گیا غرض دوسری کشتی میں آپ تنہا سوار ہوئے اور کشتی رک کر کھڑی ہو گئی۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مچھلی آپ کو نگل کر ساتویں زمین کے گڑھے میں لے گئی اس کے پیٹ کے اندر آپ چالیس رات رہے پھر پتھریوں کی تسبیح پڑھنے کی آواز سنی تو اندھیریوں کے اندر ہی پکار اٹھے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ آیت ذیل میں اسی نداء کا بیان ہے۔

اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ؕ﴿۴۸﴾ یعنی گناہ میں پڑ جانے اور تھکان ہو جانے کی وجہ سے رنجیدہ اور غضبناک

ہونے کی حالت میں اس نے (تسبیح کی) ندا کی۔

اِذْ کا تعلق اُذْکُرْ فعل محذوف سے ہے نہی (لاتکن) کے ساتھ نہیں ہے اللہ کو یونسؑ کا پکارنا تو اچھا فعل تھا اس کی ممانعت نہیں ہو سکتی مطلب یہ ہے کہ کافروں کے عذاب میں صاحب حوت کی طرح عجلت پسندی نہ کرو اور یاد کرو جب اس نے توبہ کے ساتھ غمگین ہونے کی حالت میں اللہ کو پکارا تھا کیونکہ صرف عجلت پسندی اور بے صبری کی وجہ سے اس کو غم کھانا پڑا۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ لَوْلَا امتناعیہ ہے اور تَدَارَکَ ماضی کا صیغہ اَدْرَکَ کا ہم معنی ہے (نِعْمَةٌ اس کا فاعل ہے اور نعمت اگرچہ مونث ہے اور تَدَارَکَ مذکر ہے مگر) فعل اور فاعل میں ہٗ کی وجہ سے فصل ہو گیا ہے اس لئے فعل کو مذکر لایا گیا یا تَدَارَکَ فعل مضارع منصوب ہے اصل میں تَتَدَارَکَ تھا تفاعل کی تاء کو حذف کر دیا گیا۔ اس وقت حال ماضی کی حکایت ہوگی۔ اور ان کی وجہ سے مضارع بمعنی مصدر ہو جائے گا (اول صورت میں ترجمہ ہو گا اگر نہ پہنچ گئی) ہوتی اس کو رب کی طرف سے نعمت اور دوسری صورت میں ترجمہ یوں ہو گا، اگر نہ ہو تا نعمت رب کا پہنچنا)

نِعْمَةٌ یعنی رحمت

مِّنْ رَّبِّهٖ صفت رحمت ہے یعنی اگر اس پر اللہ کی طرف سے رحمت نہ ہوتی اور توفیق توبہ نہ ملتی اور توبہ قبول نہ ہو جاتی تو۔

لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ ضرور پھینک دیا گیا ہوتا چٹیل میدان میں یعنی ایسی زمین میں جہاں درخت ہوتے نہ عمارتیں۔

وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ اور اس حال میں وہ مذموم ہوتا (اس کی مذمت کی جاتی) یعنی اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو اس کو چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا اور صبر نہ رکھنے اور قوم کو چھوڑ کر بغیر اذن خدا چلے جانے پر اس کی مذمت کی جاتی۔ ترک اولی اگرچہ واقع میں عصمت شکن گناہ نہیں ہے لیکن انبیاء کی شان بڑی ہوتی ہے ان کے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ترک اولی کو بھی ان کے لئے گناہ شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن رحمت خداوندی نے اس کو آلیا اس نے اللہ کو پکارا اور توبہ کی تو اس کو چٹیل میدان میں نکال کر پھینک دیا تو گیا پر اس وقت وہ قابل ذم نہ تھا بیمار ضرور تھا مگر تھا مرحوم اور قابل ستائش حالت میں جیسا کہ سورہ الصافات میں آیا ہے۔

عوفی وغیرہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول منقول ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ فلسطین میں رہتے تھے کسی بادشاہ نے ان پر حملہ کیا اور ۱۲ اسباط (قبائل) میں ساڑھے نو کو گرفتار کر لیا صرف ڈھائی سبط (قبائل) رہ گئے اللہ نے شعیا نبی کے پاس وحی بھیجی کہ شاہ حزقیا (بنی اسرائیل کا بادشاہ) سے جا کر کہو کہ (حملہ کرنے والے بادشاہ کے پاس) کسی قوی سنجیدہ آدمی کو بھیج دے میں ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دوں گا کہ وہ بنی اسرائیل کو رہا کر دیں اس زمانہ میں حزقیا کی حکومت میں پانچ انبیاء تھے بادشاہ نے حضرت یونسؑ کو بلا کر جانے کی درخواست کی۔ حضرت یونسؑ نے فرمایا کیا تم کو اللہ نے میرے بھیجنے کا حکم دیا ہے بادشاہ نے کہا نہیں۔ حضرت یونسؑ نے فرمایا اللہ نے مجھے نامزد کیا ہے بادشاہ نے کہا نہیں حضرت یونسؑ نے فرمایا تو پھر یہاں دوسرے طاقتور انبیاء موجود ہیں ان کو بھیجو لوگوں نے جب زیادہ اصرار کیا تو آپ ناراض ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بحر روم کے کنارہ پر جا کر جہاز میں سوار ہو گئے۔ الخ۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ اللہ نے پھر اس کو بزرگی عطا فرمادی اور دوبارہ اس کے پاس وحی بھیجی۔

فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ اور اس کو کامل اہل صلاح میں سے کر دیا۔ یعنی غیر اولی بات کہنے سے بھی محفوظ کر دیا۔

(یادداشت)

صوفی پر لازم ہے کہ مخلوق کی طرف سے جو دکھ پہنچے اس پر صبر کرے منکروں کے حق میں بددعا کرنی جائز نہیں منکرین نبی کے خلاف بددعا کرنے کی اللہ نے اجازت نہیں دی بلکہ صبر کرنے کا حکم دیا تو منکرین ولی کے خلاف بددعا کی اجازت کیسے

ہو سکتی ہے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بغوی نے بیان کیا ہے کہ کافروں نے رسول اللہ ﷺ کو نظر لگانی چاہی اور قریشیوں کی ایک جماعت نے آپ کی طرف دیکھ کر کہا ہم نے تو نہ ایسا شخص دیکھا نہ ایسی (پختہ) دلیلیں منقول ہے کہ قبیلہ بنی اسد کی نظر کی یہ کیفیت تھی کہ اگر ان میں سے کسی کے سامنے کوئی موٹی اونٹنی یا گائے گزر جاتی اور وہ اس کو دیکھ کر باندی سے کہتا اری جا ریہ ذرا ٹوکری اور درہم لے کر جانا اور اس کا گوشت لے آنا تو وہ جانور اسی جگہ گر کر فوراً مر جاتا تھا۔

کلبی نے بیان کیا ہے کہ عرب میں ایک آدمی تھا جب دو تین روز تک بھوکا رہ کر اپنے خیمہ میں لوٹ کر آتا اور ادھر سے اونٹ یا بکریاں گزرتیں اور وہ کہہ دیتا کہ آج ان سے خوبصورت ہم نے اونٹ اور بکریاں نہیں دیکھیں تو وہ کچھ ہی دور جانے پاتے تھے کہ ان میں سے چند (جانور) گر کر (مر) جاتے تھے کافروں نے اس شخص سے درخواست کی کہ رسول اللہ ﷺ کو نظر لگاوے لیکن اللہ نے اپنے پیغمبر کی حفاظت فرمائی اور مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔

مذکورہ آیت میں چونکہ خبر (یعنی لَيُزْلِقُوْنَكَ) پر لام ہے اس لئے اِنْ اِنَّ کا مخفف ہے۔

لَيُزْلِقُوْنَكَ يُزْلِقُوْنَ اِزْلَاق سے (فعل مضارع) ہے اور نافع کے نزدیک يَزْلِقُوْنَ زَلْقٌ (مجرد) سے مشتق ہے دونوں لغت ہم معنی (اور متعدی) ہیں زَلَقٌ اور ازلاق کا معنی ہے پار ہو جانا زلق السنتهم (ان کی زبانیں موثر ہو گئیں)

سدی نے نظر لگانے کے معنی بیان کئے ہیں اور کلبی نے پچھاڑ دینا (اور زمین پر گرا دینا) ترجمہ کیا ہے۔

بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ بِاَبْصَارِهِمْ کا تعلق يُزْلِقُوْنَ سے ہے حضرت جابرؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نظر آدمی کو قبر میں لے جاتی ہے اور اونٹ کو ہانڈی میں۔ (ابو نعیم فی الحلیہ) ابن عدی نے حضرت ابوذرؓ سے اسی طرح روایت کی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نظر حق ہے۔ احمد اور مسلم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نظر حق ہے اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو نظر آگے بڑھ جاتی اگر تم سے غسل کی درخواست کی جائے تو غسل کر لیا کرو (نظر لگانے والے کے غسل کا پانی اس شخص پر ڈالتے تھے جس پر اس کی نظر لگی ہوتی تھی)

حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے نظر حق ہے نظر کے وقت شیطان آموجود ہوتا ہے اور آدمی پر حسد کرتا ہے۔

عبیدؓ بن رفاعہ کی روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ جعفرؓ کے لڑکوں کو نظر لگ جاتی ہے آپ ان کے لئے کچھ افسون پڑھ دیجئے۔ فرمایا ہاں اگر قضاء (الٰہی) سے کوئی چیز سبقت کرتی تو نظر کرتی۔ (بغوی) ابن قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ آیت کی مراد یہ نہیں ہے کہ نظر لگانے والے کی طرح تم کو نظر بد لگانا چاہتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تم قرآن پڑھتے ہو تو انتہائی دشمنی اور بغض کی وجہ سے وہ ایسی تیز نظر سے تم کو دیکھتے ہیں کہ زمین پر گویا تم کو گرا دیں گے محاورہ میں بولا جاتا ہے نظرالی نظر ایکاد یصرعنی اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا کہ قریب تھا کہ مجھے زمین پر گرا دے۔ یکاد یصرعنی کی طرح یکاد یاکلنی (وہ مجھے نظر سے کھائے جاتا تھا) بھی آتا ہے۔ یہ محاورہ شدت عداوت سے کنایہ ہوتا ہے اس مطلب کی صحت پر یہ امر دلالت کر رہا ہے کہ بیان کو سماع قرآن سے مقید کیا ہے (کہ قرآن سنتے وقت وہ ایسا کرتے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سننا ان کو سخت ناگوار تھا اور قرات قرآن کے وقت وہ حضور کی طرف بغض (اور غضب) کی نظر سے دیکھتے تھے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ یعنی قرآن سنتے ہیں تو کہتے ہیں یہ پاگل ہے۔

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ اور قرآن نہیں ہے مگر جہان کے لئے نصیحت یعنی رسول اللہ ﷺ مجنون نہیں، قرآن دیوانوں کا کلام نہیں بلکہ ہمہ گیر نصیحت ہے جو سب سے زیادہ کامل العقل اور صحیح الفہم ہوگا اسی کی فکری رسائی

قرآن تک ہوسکتی ہے۔

میرے شیخ اور امام مولانا یعقوب کرخی نے فرمایا ہو سکتا ہے کہ ھُوَ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہو یعنی رسول اللہ ﷺ سارے جہان کے لئے پیام ہدایت دینے والے اور ناصح ہیں (ذِکْرٌ اگرچہ مصدر ہے۔ لیکن بطور مبالغہ بمعنی اسم فاعل ہے) جیسے زید عدل زید انصاف ہے یعنی اتنا انصاف کرنے والا ہے کہ گویا خود انصاف مجسم ہو گیا ہے۔ حضرت حنظلہؓ راوی ہیں کہ (راستہ میں) میری ملاقات حضرت ابو بکرؓ سے ہوئی انہوں نے پوچھا حنظلہ کیسے ہو میں نے جواب دیا حنظلہ منافق ہو گیا ابو بکر نے کہا سبحان اللہ یہ کیا کہہ رہے ہو میں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ہم کو جنت دوزخ کا بیان کر کے نصیحت فرماتے ہیں تو جنت دوزخ گویا نظر کے سامنے آجاتے ہیں جب وہاں سے ہٹ کر ہم باہر آتے ہیں اور اہل و عیال اور جائیدادوں میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں حضرت ابو بکرؓ نے کہا میں بھی ایسا ہی پاتا ہوں (میری بھی یہی حالت ہے) چنانچہ میں اور ابو بکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ حنظلہ منافق ہو گیا فرمایا کیا بات ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ جنت دوزخ کا ذکر ہمارے سامنے کرتے ہیں تو گویا دوزخ جنت ہماری نظر کے سامنے آجاتے ہیں لیکن یہاں سے نکل کر جب ہم بیوی بچوں اور جائیدادوں میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم اس حالت پر باقی رہو جو نصیحت کے وقت ہوتی ہے تو بستروں پر اور راستوں میں تم سے فرشتے مصافحہ کریں مگر حنظلہ وقت وقت ہے حضور نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔

نتیجہ

اولیاء اللہ کی علامت ہی یہ ہے کہ ان کے دیدار اور بیان سے اللہ کی یاد ہو جاتی ہے بعض مرفوع احادیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا اولیاء اللہ کون ہیں فرمایا جن کے دیکھنے سے اللہ کی یاد ہو یہ بھی روایت ہے کہ حضور پر نور صلوۃ اللہ و برکاتہ نے فرمایا اللہ کا ارشاد ہے کہ میرے اولیاء وہ بندے ہیں جن کی یاد میری یاد سے ہو جاتی ہے اور میری یاد ان کی یاد سے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ

حسن بصری نے فرمایا نظر بد لگنے کا علاج اس آیت
کی قرات ہے (یعنی کوئی شخص یہ آیت پڑھ کر
دم کر دے۔ یا یہ آیت پڑھے)
واللہ اعلم
بالصواب

سورۃ الحاقہ

مکی ہے اس میں ۵۲ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَآقَّةُ ① یعنی قیامت چونکہ قیامت حق ہے امر واقع ہے اسکے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے (اسلئے اس کو حَآقَّة کہا گیا) یا اس وجہ سے (حاقہ کہا گیا) کہ تمام امور کی حقیقت اس روز معلوم ہو جائے گی یا اس وجہ سے کہ اعمال کا بدلہ اس روز ضرور ملے گا۔ حق علیہ الشئی وہ چیز اس پر لازم ہو گئی اللہ نے فرمایا ہے حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عذاب کی بات لازم ہو گئی (موخر الذکر دونوں صورتوں میں) قیامت کو اَلْحَآقَّة کہنا مجازاً ہو گا۔

مَا الْحَآقَّةُ ② کیسی عظیم الشان قیامت (اصل کلام مَاهِیَ ہونا چاہئے کیسی ہے وہ لیکن) قیامت کی ہولناکی اور عظمت شان کو ظاہر کرنے کے لئے ضمیر کی جگہ اسم ظاہر مع استفہام لایا گیا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ استفہام انکاری ہے (کیا تم کو معلوم ہے کس چیز نے تم کو بتایا تم کو کیا معلوم)

مَا الْحَآقَّةُ ③ کیسی ہولناک ہے قیامت جملہ استفہامیہ قیامت کی ہولناکی کو ظاہر کر رہا ہے یعنی قیامت بڑی ہولناک چیز ہے اس کی حقیقت تم کو معلوم نہیں کوئی بھی اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم

وَعَادٌ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم۔

بِالْقَارِعَةِ ④ کھٹ کھٹا دینے والی ساعت یعنی قیامت جو ہر چیز کی توڑ پھوڑ شکست و ریخت اور انتشار و پراگندگی کی وجہ سے لوگوں کے کانوں پر ضرب لگائے گی۔ اس جگہ بھی ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ایسا مرادف لفظ لایا گیا جو شدت ہول میں زیادتی کو ظاہر کر رہا ہے یہ جملہ سابقہ جملوں کے ساتھ مل کر بتا رہا ہے کہ قیامت کو نہ ماننا اور اس کی تکذیب کرنا ہلاکت و تباہی کا موجب ہے۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ⑤ یہ جملہ كَذَّبَتْ پر معطوف ہے فاء سببی ہے اور اَمَّا سے مجمل کی تفصیل کی گئی ہے اصل کلام یوں تھا کہ ثمود و عاد نے قیامت کی تکذیب کی اس لئے تباہ کر دیئے گئے۔ ثمود تو طاغیہ کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

طَاغِيَة غیر معمولی چیخ ہر چیخ سے بالاتر قتادہ نے یہی فرمایا یہی صحیح بھی ہے صورت یہ ہوئی کہ حضرت جبرئیلؑ نے ایک اتنی بلند چیخ ماری کہ سب مر کر رہ گئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ آسمان کی طرف سے ایک ایسی چیخ پیدا ہوئی تھی جس میں ہر تڑک ہر کڑک اور ہر زمینی چیز کی آواز تھی جس سے سینوں کے اندر دل پارہ پارہ ہو گئے۔

بعض نے کہا کہ طَاغِيَة عَافِيَة کی طرح مصدر ہے طُغْيَان کا ہم معنی ہے یعنی ثمود اپنے طغیان (گناہوں میں حد سے آگے بڑھ جانے) کی وجہ سے ہلاک ہو گئے پیغمبر کی تکذیب کی اونٹنی کو قتل کیا وغیرہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ طَاغِيَة میں تاء مبالغہ کی ہے بڑا سرکش اس سے مراد ہے حضرت صالحؑ کی اونٹنی کا قاتل قذار بن سالف یہ بھی ایک قول ہے کہ (طَاغِيَة میں تاء تانیث ہے اور) اس سے مراد وہ جماعت ہے جس نے اونٹنی کے قتل پر اتفاق رائے

کر کے قذار کو اس فعل پر آمادہ کیا تھا یہی جماعت سب قوم کی تباہی کا سبب بنی۔

قصہ یوں ہوا کہ ثمود کی ہدایت کے لئے اللہ نے حضرت صالح کو مامور فرمایا حضرت صالح نے احکام الٰہی کی دعوت دی لوگوں نے انکار کیا اور درخواست کی کہ (بطور معجزہ) ایک دس ماہ کی حاملہ اونٹنی پتھر کی چٹان سے برآمد کرو اگر ایسا ہو گیا تو وہ ایمان لے آئیں گے حضرت صالح نے دعا کی آپ کی دعا سے ایک بڑی قد آور اونٹنی جس کی چوڑائی کا قطر ایک سو بیس ہاتھ تھا اور دس ماہ کی گابھن تھی پتھر کی چٹان سے برآمد ہوئی اور فوراً ہی ایک بچہ بیاہ گئی جو اسی کی طرح تھا لیکن لوگوں نے تب بھی آپ کی نبوت کا یقین نہیں کیا اور کہنے لگے یہ جادو ہے اللہ نے اس اونٹنی کو ان کے لئے عذاب بنا دیا اس خطہ میں پانی کم تھا ایک روز تمام پانی اونٹنی پی جاتی تھی اور ایک روز ان کے لئے چھوڑ دیتی تھی گھاس کی بھی یہی صورت تھی آخر ایک جماعت نے اونٹنی کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا اور سب سے بڑے بدبخت یعنی قذار بن سالف کو قتل پر معمور کر دیا سب نے اونٹنی کو قتل کر دیا اور اللہ سے سرکشی کرنے میں حد سے بڑھ گئے اور حضرت صالح علیہ السلام سے کہنے لگے اگر تو سچا ہے تو جس عذاب کی تو ہم کو دھمکی دیتا ہے اس کو لے آ۔ حضرت صالح نے فرمایا تین روز تک اپنے گھروں میں مزے اڑالو، پہلے روز تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ پھر چوتھے روز صبح کو تم پر عذاب آجائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا ایک چیخ نے ان ظالموں کو آپکڑا اور گھروں میں زمین پر چپکے رہ گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں بستی ہی نہ تھی۔

یہ تاویل یعنی طَاغِیَة کو مصدر کہنا یا جماعت مراد لینا یا صرف قذار مراد لینا اور تاء کو مبالغہ کے لئے قرار دینا آئندہ آیت کے مناسب نہیں کیونکہ آئندہ آیت میں فرمایا ہے فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ کہ عاد کو طوفانی ہوا سے ہلاک کیا گیا (یعنی ذریعہ ہلاکت بیان فرمایا ہے باعث ہلاکت نہیں فرمایا پس طاغیہ سے مراد بھی ذریعہ ہلاکت یعنی ہولناک چیخ ہونی چاہئے)

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ سخت ٹھنڈی یا سخت شورناک ہوا (قاموس) سے عاد کو ہلاک کیا گیا۔

عَاتِيَةٍ جو شدت اور ٹھنڈک میں حد سے زائد تھی قاموس میں ہے عَتیٰ (ماضی) تکبر کیا اور حد سے بڑھ گیا عاتی اسم فاعل۔

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ اللہ نے اپنی قدرت سے اس طوفان کو عاد پر مسلط کر دیا تھا۔ جملہ استینافیہ ہے یا ریح کی صفت ہے اس سے نجومیوں کے) اس خیال کو دفع کرنا مقصود ہے کہ حادثہ طوفان اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا عذاب نہ تھا بلکہ) آسمانی چکروں سے پیدا شدہ (معمولی نیچرل) حادثہ تھا۔

سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ سات رات اور آٹھ روز تک بدھ کے دن کی صبح سے آئندہ بدھ کی شام تک۔ وہب نے بیان کیا کہ یہ طوفان ان ایام میں آیا تھا جن کو عرب ایام عجوز پچھلی سردی کے دن کہتے ہیں ان دنوں میں سخت سردی اور تیز ہوائیں ہوتی ہیں۔ ان ایام کو عجوز (بوڑھی) کہنے کی یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ قوم عاد کی ایک بوڑھی عورت طوفان سے بچنے کے لئے ایک تہ خانہ میں گھس گئی تھی لیکن ہوا نے اسکو وہاں بھی جالیا یہ عذاب کے آٹھویں دن کا واقعہ تھا اس کے بعد عذاب ختم ہو گیا۔

حُسُوْمًا پیہم یہ حاسم کی جمع ہے حسام الکی بیماری کے مقام پر پیہم اس حد تک داغنا کہ مرض جاتا رہے۔ (مجاہد و قتادہ)

یا حُسُوْمًا کا معنی ہے منحوس دوسری آیت میں آیا ہے فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (اس وقت حسم سے مشتق ہوگا اور حسم کا معنی ہے بیخ کنی) یعنی ایسے دن رات جس میں ہر بھلائی کی بیخ کنی ہو گئی تھی (عطیہ)

یا کاٹ دینے والی جن کی وجہ سے ان کی نسل منقطع ہو گئی (زجاج اور نضر بن شمیل) یہ بھی ممکن ہے کہ حُسُوْمًا (جمع نہ ہو) مصدر ہو اور فعل مقدر کا مفعول مطلق یا علت فعل سابق (مفعول لہ) ہو (یعنی اللہ نے ایام طوفان کو ان کی بیخ کنی یا قطع نسل کے لئے مسلط فرمایا)

فَتَرَى حال ماضی کی حکایت ہے مخاطب عام ہے کوئی ہو۔

الْقَوْمَ یعنی عاد

فِيهَا (ان راتوں اور دنوں میں یا ان کے درمیان۔

صَرْعَىٰ زمین پر پڑے ہوئے صَرِیع کی جمع اور صَرِیع اسم مفعول کے معنی میں ہے اگر تری رویۃ قلب سے ہو (یعنی دل کی آنکھوں سے دیکھنا اور جاننا) تو صَرْعَىٰ تری کا دوسرا مفعول ہو گا ورنہ القوم کی حالت کا اظہار ہو گا۔

كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ اعجاز جڑیں۔ خَاوِيَة کھوکھلا۔

فَهَلْ تَرَىٰ استفہام تقریری ہے مخاطب کو اقرار پر آمادہ کیا ہے۔

لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ ۝۸ کیا تم کو عاد کی کوئی نشانی باقی دکھتی ہے۔

وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَن قَبْلَهُ یعنی فرعون اور فرعون سے پہلے کافر قومیں آئیں۔

وَالْمُؤْتَفِكَاتُ اور الٹی بستیاں یعنی قوم لوط کے دیہات جن کو الٹ دیا گیا تھا۔ یہ افک سے ماخوذ ہے افک کا معنی ہے الٹنا بستیوں سے مراد ہیں ان کے باشندے یا الٹ جانے والی قومیں یعنی قوم لوط مراد ہے۔

بِالْخَاطِئَةِ ۝۹ خطا اور گناہ یعنی شرک کی وجہ سے یا بد کرداری کی وجہ سے یا خطا اور گناہ کے کاموں کی وجہ سے۔

فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ یعنی فرعون نے حضرت موسیٰ کا فرمان نہ مانا اور ہر کافر امت نے اپنے اپنے پیغمبروں کی نافرمانی کی۔ یہ جَاءَ پر عطف تفسیری ہے۔

فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰ فاء سببی ہے أَخْذَةً مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہے یعنی فعل مذکور کی وجہ سے اللہ نے ان کی ایسی پکڑ کی جو شدت میں زائد تھی (بڑی سخت تھی)

إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ یعنی حضرت نوح کے زمانہ میں پانی حد سے گزر گیا اور ہر چیز سے اونچا ہو گیا۔

حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱ تو ہم نے تمہارے آباء واجداد کو نوح کی کشتی میں جو پانی میں چل رہی تھی سوار کر دیا اس وقت تم اپنے اسلاف اعلیٰ کی پشتوں میں تھے (تو گویا تم کو سوار کر دیا)

لِنَجْعَلَهَا تاکہ ہم اس کشتی کو یا پانی کے حد سے بڑھے ہوئے طوفان میں کشتی کے ذریعہ اہل ایمان کی نجات کو۔

لَكُمْ تَذْكِرَةً تمہارے لئے عبرت اور نصیحت بنادیں کیونکہ اس سے خالق کی قدرت حکمت رحمت اور وفور غضب کا عالم ہوتا ہے۔

وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ ۝۱۲ اور اس لئے بھی کہ یاد رکھنے والے اس کو یاد رکھیں سمجھیں اور غور کریں کان سننے اور یاد رکھنے کا ذریعہ ہے اس لئے یادداشت کا فاعل کان کو قرار دیا ورنہ حقیقت میں یاد رکھنے والا دل یا نفس ہے یا کان سے مراد ہیں کانوں والے یعنی اصحاب اُذن مضاف (اصحاب) کو حذف کر کے مضاف الیہ (اُذن) کو اس کے قائم مقام کر دیا (اول مجازی الاسناد ہے اور دوسرا مجاز لغوی یا مجازی فی الحذف)

وَاعِيَة میں تنوین تنکیر قلت پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ عبرت اندوز آدمی خواہ کم ہی ہوں مگر ایک جمہور کو نجات دلانے اور ان کی نسل کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ دل ظروف ہیں پس افضل ترین وہ دل ہے جو زیادہ یاد رکھنے والا ہو۔ (طبرانی)

جب قیامت کی ہولناکی اور قیامت کا انکار کرنے والوں کا نتیجہ پرزور طور پر بیان کر دیا تو آئندہ آیات میں قیامت کی تشریح فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا صور ایک سینگ ہو گا

جس میں پھونکا جائے گا۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ دارمی)

نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ جب صور میں ایک بار پھونک پھونکی جائے گی۔ اس سے مراد نفخہ بیہوشی ہے یعنی وہ نفخہ جس کی آواز سن کر ہر زندہ بیہوش ہو جائے گا۔ (اور مر جائے گا)

کتنی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تعداد میں علماء کا اختلاف ہے بعض کا قول ہے تین بار نفخہ صور ہوگا (۱) نفخہ فزع (جس کو سنکر سب گھبرا جائیں گے (۲) نفخہ صعق (جس کو سن کر سب بیہوش ہو جائیں گے اور مر جائیں گے) (۳) نفخہ بعث (جس کو سن کر جب اٹھیں گے)

اللہ نے نفخہ فزع کے متعلق فرمایا وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۤءَ اللّٰهُ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دَاخِرِيْنَ اور (نفخہ صعق کے متعلق) فرمایا وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۤءَ اللّٰهُ اور نفخہ بعث کے متعلق فرمایا) ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ یہ قول شیخ ابن عربی کا مختار ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ ایک طویل حدیث میں صراحتاً آیا ہے فینفخ فیہ ثلث نفخات الاولی نفخۃ الفزع والثانیۃ نفخۃ الصعق والثالثۃ نفخۃ القیام لرب العالمین ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں طبرانیؒ نے مطولات میں ابویعلی نے مسند میں اور بیہقیؒ نے البعث میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ صرف دوبار صور پھونکا جائے گا اور نفخہ فزع ہی نفخہ صعق ہے گھبراہٹ اور بے ہوشی لازم اور ملزوم ہیں لوگ صور کی آواز سن کر اتنے گھبرا جائیں گے کہ مر جائیں گے قرطبی نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ نفخہ فزع اور نفخہ صعق دونوں کے بیان میں اللہ نے بعض لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے (اور الا من شاء اللہ دونوں جگہ فرمایا ہے دونوں جگہ) استثناء کی یہ وحدت دلالت کر رہی ہے کہ نفخہ فزع ہی نفخہ صعق ہے اور اکثر احادیث میں بھی دو کا ہی ذکر آیا ہے اور دونوں کے درمیان چالیس برس کی مدت ظاہر کی ہے رہی حضرت ابوہریرہؓ والی طویل حدیث اس کی صحت میں کلام ہے اس کی صحت متفق علیہ نہیں ہے ابن عربیؒ اور قرطبی کے نزدیک صحیح ہے بیہقی اور عبدالحق کے نزدیک ضعیف ہے کیونکہ اس حدیث (کی روایت) کا مدار مدینہ کے قاضی اسماعیل بن رافع پر ہے اور اسماعیل (کے ثقہ ہونے) میں کلام کیا گیا ہے سیوطی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی رفتار عبارت میں کچھ نکارت (عدم ربط یا بے تعلقی) ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مختلف طریقہاء اسناد اور متعدد مقامات سے جمع کر کے حدیث کا ایک سیاق بنایا گیا ہے۔

اِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ میں جس زمانہ کو بیان کیا گیا ہے وہ (کوئی چھوٹا وقت نہ ہوگا بلکہ) ایک لمبی مدت ہوگی جس کی تعبیر الحَاقّه۔ القَارِعة۔ القِيَامَة۔ الوَاقِعة وغیرہ مختلف کثیر ناموں سے کی گئی ہے۔ اس مدت کا آغاز نفخہ اول سے ہوگا اور اختتام اس وقت ہوگا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں جا چکیں گے۔ ابن عساکر نے بحوالہ زیاد بن مخراق بیان کیا ہے کہ حجاج نے حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام عکرمہ سے دریافت کیا کہ قیامت کا دن دنیا کا دن ہوگا یا اس کا شمار آخرت میں ہوگا عکرمہؒ نے فرمایا اسکا ابتدائی حصہ دنیا کا ہوگا اور آخری حصہ آخرت کا۔ اس بناء پر زمانہ نفخ صور وہ بھی ہوگا جس میں پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا اور وہ بھی جب سب مر جائیں گے پھر جی اٹھیں گے اور ان کا حساب ہوگا اور آسمان پھٹ جائیں گے اور ستارے ٹوٹ کر پراگندہ ہو جائیں گے اور کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ میں چلے جائیں گے پس آیت مذکورہ میں زمان قیامت کے آغاز کو بیان کیا گیا ہے اور آیت فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ اور خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ الخ میں انتہاء قیامت کا اظہار ہے۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ زمین اور پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اٹھا لیا جائے گا۔

فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ اور یک دم سب کو توڑ پھوڑ دیا جائے گا۔ دَکّ کا معنی ہے کوٹنا ڈھانا۔ (قاموس) جوہری نے کہا اس کا اصل معنی ہے توڑ پھوڑ دینا بغوی نے یہی ذکر کیا ہے کہ جوہری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ دَکّ کا معنی ہے نرم زمین اللہ نے فرمایا دُكَّتِ الْجِبَالُ دَكًّا یعنی پہاڑوں کو نرم زمین کی طرح کر دیا جائے گا۔ حاصل یہ کہ زمین یکدم

ہموار ہو جائے گی اس میں کوئی نشیب فراز نظر نہیں آئے گا۔ بیہقی نے وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کی تفسیر میں حضرت ابی بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ زمین اور پہاڑ غبار ہو جائیں گے اور وہ غبار کفار کے چہروں پر چڑھ جائے گا۔ اہل ایمان کے چہروں پر نہیں پڑے گا۔ کفار ہی کے چہرے اس روز غبار آلود اور دھواں دار ہوں گے۔ آیت میں صرف شرط کا بیان ہے جزا محذوف ہے یعنی جب صور پھونکا جائے گا اور زمین و کوہ اپنی جگہ سے اٹھا کر توڑ پھوڑ دیئے جائیں گے تو اس وقت دنیا ختم ہو جائے گی اور قیامت آجائے گی۔

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١٥﴾ پس اس روز یعنی نفخ صور کے دن وہ انتظار کی گھڑی آجائے گی جس کا آنا قرآن اور حدیث کی رو سے لازم ہے یا یہ مطلب ہے کہ جن امور کا واقع ہونا ضروری اور لازمی ہے مثلاً حساب اور اعمال کا بدلہ وہ واقع ہو جائیں گے۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ اور آسمان پھٹ جائے گا اور کمزور ہو کر اس کی بندش ڈھیلی ہو جائے گی جو مضبوطی اور قوت اب ہے وہ اس میں نہیں رہے گی۔ فراء نے کہا آسمان کی کمزوری پھٹ جانے کی وجہ سے ہو گی کسی چیز میں شگاف پڑ جانے کو وَهْيٌ کہتے ہیں کہا جاتا ہے وَهِيَ وہ پھٹ گیا اور اس کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے (قاموس)

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا آسمان کے جو اطراف اور کنارے پھٹ جانے کے بعد باقی رہیں گے ان پر فرشتے ہوں گے مَلَكٌ سے فرشتوں کی جنس مراد ہے (کوئی خاص فرشتہ مراد نہیں ہے)

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ اور تمہارے رب کے عرش (تخت) کو اٹھائے ہوں گے تخت کی نسبت اللہ کی طرف تخت کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے ہے اور یہ وجہ بھی ہے کہ عرش خصوصی طور پر تجلی گاہ نور ہے۔

فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿١٧﴾ اپنے اوپر یا ان فرشتوں کے اوپر جو آسمان کے کناروں پر ہوں گے آٹھ ملائکہ (یعنی قیامت کے دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر یا اطراف آسمان پر مقیم ملائکہ کے اوپر اللہ کے عرش کو اٹھائے ہوں گے۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا قول نقل کیا ہے عباسؓ نے بیان کیا کہ میں بطحا میں ایک گروہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے ایک بادل گزرنے لگا لوگوں نے اس کی طرف دیکھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اس کو کیا کہتے ہو لوگوں نے جواب دیا سحاب (ابر) فرمایا اور مزن (بھی) لوگوں نے کہا مزن بھی (کہتے ہیں) فرمایا اور عنان بھی کہتے ہو لوگوں نے کہا عنان بھی (کہتے ہیں) فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ آسمان و زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے لوگوں نے کہا نہیں فرمایا دونوں کے درمیان فاصلہ اکہتر یا بہتر یا تہتر سال (کی راہ کا) ہے اور نچلے آسمان سے اوپر والا آسمان بھی ایسا ہی (یعنی اتنی ہی دور) ہے یہاں تک کہ آپ نے سات آسمان شمار کئے (اور فرمایا) پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کے زیریں اور بالائی (سطح) کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا ایک آسمان کا دوسرے آسمان سے ہے پھر سمندر کے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں اور کولھوں (سرینوں) کا فاصلہ دو آسمانوں کی درمیانی مسافت کے برابر ہے اس کے اوپر اللہ ہے۔ بغوی نے بھی یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے مگر زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ کی مقدار اسی طرح ہر دو آسمانوں کے درمیانی فاصلہ کی مقدار پانچ سو برس کی راہ بتائی ہے سمندر کے اعلیٰ و اسفل کا فاصلہ اور پہاڑی بکروں کے کھروں اور سرینوں کا درمیانی فاصلہ بھی اتنا ہی نقل کیا ہے۔ مسافت کا یہ اختلاف (شاید) چلنے والوں کے اختلاف کے لحاظ سے ہو۔ واللہ اعلم۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ حدیث میں آیا ہے عرش کو اٹھانے والے ملائکہ اب تو چار ہیں قیامت کے دن ان کی مدد کے لئے اللہ چار اور مقرر فرمادے گا۔ ان کی شکل بکروں جیسی ہے۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک کی صورت مرد کی دوسرے کی شیر کی تیسرے کی بیل کی اور چوتھے کی گدھ کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا قیامت کے دن عرش الٰہی کو آٹھ (ملائکہ) ملائکہ کی آٹھ جماعتیں اٹھائے ہوں گی جن کی گنتی سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ (تمام آدمیوں کو خطاب ہے) یعنی اے انسانو! اس روز حساب کے لئے اللہ کے سامنے تمہیں جانا ہوگا۔ یہ پیشی نفخہ بعث کے بعد ہوگی۔

لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾ تمہاری کوئی پوشیدہ حرکت بھی چھپی نہیں رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کی تین پیشیاں ہوں گی دو پیشیاں تو جھگڑا کرنے اور معذرتوں کے لئے ہوں گی اور تیسری پیشی کے وقت اعمالنامے ہاتھوں میں نمودار ہو جائیں گے کوئی دائیں ہاتھ میں لینے والا ہوگا کوئی بائیں ہاتھ میں۔ (ترمذی بروایت حضرت ابوہریرہؓ، وابن ماجہ بروایت حضرت ابو موسیٰ اشعری۔ و بیہقی بروایت حضرت ابن مسعودؓ۔

حکیم ترمذی نے یہ بھی کہا ہے کہ جھگڑا کرنے کے لئے پیشی دشمنوں کی ہوگی وہ رب کو نہیں پہچانیں گے اس لئے خیال کریں گے کہ رب سے جھگڑا کر کے ان کو نجات مل جائے گی اور بات بن جائے گی یہ سوچ کر وہ اللہ سے جھگڑیں گے اور معذرت کے لئے پیشی اللہ کی طرف سے ہوگی آدم اور دوسرے انبیاء کے سامنے اللہ دشمنوں کے خلاف اتمام حجت فرمادیگا اور (تمام معذرتوں کے بعد) اعداء کو دوزخ میں بھیج دے گا اور تیسری پیشی اہل ایمان کی ہوگی یہ نام کی تو پیشی ہوگی مگر اللہ تنہائی میں ان پر اس حد تک عتاب فرمائے گا کہ ان کو شرم آجائے پھر ان کی مغفرت فرمادے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ یہ تیسری پیشی کی تفصیل ہے اور دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ مومن کو دیا جائے گا۔

فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ یعنی جس کا اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا لو۔ ھاء اسم (بمعنی فعل) ہے یعنی لے اس کا استعمال واحد اور تثنیہ مذکر نیز واحد اور تثنیہ مونث کے لئے ہوتا ہے (یعنی لے تو اور لو تم دونوں لیکن جمع مذکر کے لئے ھائوم آتا ہے (لو تم سب مرد) اور جمع مونث کے لئے ھَاؤنّ آتا ہے (لو تم سب عورتو)

اِقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿۱۹﴾ پڑھو میرا اعمالنامہ کِتَابِیَہ اور مَالِیَہ اور سُلْطَانِیَہ میں ھاء سکتہ ہے وقف کی صورت میں باقی رہتی ہے اور وصل (بعد والے کلام کے ساتھ ملانا) کی حالت میں ساقط ہو جاتی ہے یہاں وقتی حالت مستحب ہے کیونکہ اَلْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ میں وصل کی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔

کِتَابِیَہ اِقْرَؤُا کا مفعول ہے اور ھَاؤُمُ کا مفعول محذوف ہے کیونکہ اِقْرَؤُا کِتَابِیَہ کے قریب مذکور ہے۔

اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ﴿۲۰﴾ یعنی بے شک میں تو جانتا تھا مجھے تو یقین تھا۔ (کہ مجھے میرے اعمال کا حساب پیش آئے گا) حساب کا یقین رکھنے کے بعد نیک اعمال کرنا لازم ہیں اس لئے حساب پر یقین ظاہر کرنے سے در پردہ اس کی مراد ہے نیک اعمال کرنا یعنی وہ کہے گا اسی لئے تو میں نے اچھے عمل کئے تھے مگر اظہار عجز کے طور پر صراحتاً وہ یہ بات نہیں کرے گا یہی اعتراف فروتنی اس امر کا باعث ہوگا کہ وہ یقین کو ظن سے تعبیر کرے گا اللہ علام الغیوب کے سامنے یقین کا دعویٰ کرنے سے اس کو اپنی ذات کا استحقار روکے گا۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ چونکہ علوم نظریہ وسوسوں سے خالی نہیں ہوتے اس لئے یقین کی تعبیر بلفظ ظن (غالب خیال) کرنے سے شاید اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ اعتقاد میں نفسانی وسوسوں سے خرابی نہیں ہو سکتی (عقیدہ نظری علم ہوتا ہے اور علم نظری میں وسوسہ پیدا ہونا لازم ہے لیکن وسوسہ مخل نہیں ہو سکتا)

ابن مبارک نے بروایت ابو عثمان نہدی بیان کیا کہ مومن کو اللہ کی طرف سے دوسروں سے چھپا کر اعمالنامہ دیا جائے گا اپنی بداعمالیوں کو پڑھ کر اس کا رنگ بدل جائے گا پھر نیکیوں کو پڑھے گا تو رنگ لوٹ آئے گا پھر جو اسکی نظر پڑے گی تو دیکھے گا کہ اس کی بداعمالیوں کو نیکیوں سے بدل دیا گیا ہے (برائیوں کی جگہ بھلائیاں لکھ دی گئیں) اس وقت وہ کہے گا لو میرا اعمالنامہ پڑھو۔

فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ﴿۲۱﴾ تو وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ رَاضِیَۃ (اسم فاعل) بمعنی مرضیہ (اسم مفعول) ہے یعنی پسندیدہ رضیت العیشۃ بصیغہ مجہول کہا جاتا ہے رضیت العیشۃ بصیغہ معروف نہیں بولا جاتا۔ بیضاوی نے راضیۃ کا ترجمہ کیا ہے پسندیدگی والی گویا صیغہ اسم فاعل پسندیدگی کی نسبت کو بتا رہا ہے یا رضاء

کی نسبت عِیْشَۃ کی طرف مجازی ہے (عیشہ کو پسند کیا جاتا ہے عیشہ بجائے خود پسند کرنے والی چیز نہیں پسندیدہ چیز ہوتی ہے۔ مجازی طور پر عیشہ کو پسند کرنے والا قرار دیا)

فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ﴿۲۲﴾ وہ خوشگوار زندگی ایک اونچے باغ میں ہوگی۔ اونچا باغ یعنی اللہ کے قرب میں اونچے مرتبہ والا باغ۔ یا بلند جگہ پر واقع کیونکہ جنت آسمان پر ہے اور یا اونچے درجات بلند عمارات اور بڑے بڑے درختوں والا باغ۔

درختوں کے اونچا ہونے سے خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کے پھل بھی بہت دور ہوں گے ان کو حاصل کرنا آسان نہ ہوگا اس لئے اللہ نے اس کے بعد فرمایا۔

قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ﴿۲۳﴾ ان کو یعنی ان کے پھلوں کو توڑنا ہم سے دور نہ ہوگا کھڑے بیٹھے لیٹے (ہر طرح ان کا حصول سہل ہوگا۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـٴًـۢا هَنِیْ ایسی چیز جس کے حصول میں نہ کچھ دشواری ہو نہ ناگواری کی تکلیف۔ اس جملہ سے پہلے قول محذوف ہے یعنی ان سے کہا جائے گا خوشگواری کے ساتھ بغیر کسی تکلیف کے کھاؤ پیو هُوَ ضمیر اگرچہ واحد کی ہے اور كُلُوْا اور اشْرَبُوْا جمع کے صیغے ہیں لیکن معنی کے لحاظ سے ہو جمع ہے اس لئے كُلُوْا اور اشْرَبُوْا کہنا صحیح ہے اس صورت میں یہ جملہ هُوَ کی خبر دوئم ہوگی اور ممکن ہے کہ جملہ مستانفہ ہو۔

بِمَآ اَسْلَفْتُمْ یعنی اپنے سابق نیک اعمال کے صلہ میں کھاؤ پیو سلف بمعنی متقدم (سابق)

فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ﴿۲۴﴾ یعنی دنیا کے اندر گزشتہ ایام میں خالی وہ زمانہ اور مکان جس کو کوئی بھرنے والا نہ ہو۔ خالی زمانہ جس میں اہل زمانہ باقی نہ رہے ہوں باقی نہ رہنے کے لئے گزر جانا لازم ہے اس لئے خالی کا معنی ہوگیا ماضی اللہ نے فرمایا ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اس سے پہلے پیغمبر گزر چکے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ اس سے مراد کافر ہے کافر کا بایاں ہاتھ پشت کے پیچھے کر کے اس میں اعمالنامہ دیا جائے گا (کذا اخرج البیہقی عن مجاہد) ابن سائب نے کہا بائیں ہاتھ کو موڑ کر پشت کے پیچھے کر کے اعمالنامہ دیا جائے گا یہ بھی کہا گیا ہے کہ کافر کا بایاں ہاتھ سینہ کے اندر سے کھینچ کر پشت کے پیچھے کر دیا جائے گا۔

فَیَقُوْلُ تو وہ اپنے اعمال بد اور ان کا برا انجام دیکھ کر کہے گا۔

یٰلَیْتَنِیْ منادی محذوف ہے یعنی اے قوم کاش مجھے۔

لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ﴿۲۵﴾ میرا اعمالنامہ نہ دیا جاتا۔

وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ﴿۲۶﴾ اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا کیا حساب ہے۔

مَا حِسَابِیَهْ جملہ استفہامیہ ہے اور لَمْ اَدْرِ کا مفعول ہے۔

یٰلَیْتَهَا یعنی اے کاش وہ تھی یا دنیوی زندگی کے بعد موت یا زندگی کے بعد عدم کی حالت۔

كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ﴿۲۷﴾ کام تمام کر دینے والی ہوتی، زندگی کو بالکل ختم کر دیتی۔ اس کے بعد مجھے زندہ ہی نہ کیا جاتا۔ قتادہ نے کہا دنیا میں اس کے لئے ناگوار ترین چیز موت تھی مگر قیامت کے دن وہ موت کی تمنا کرے گا اعمالنامہ نہ ملنے اور حساب نہ جاننے کی تمنا سے در پردہ مراد ہے دوبارہ زندہ نہ ہوتا اور یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ میں صراحت کے ساتھ عدم بعثت کی تمنا ہے اس لئے دونوں جملوں کا مضمون ایک ہی ہوا (ہاں اول در پردہ اظہار ہے اور دوسرا صراحتاً) اور دوسرا جملہ اول جملہ کی تاکید ہوگیا اسی وجہ سے حرف عاطف کو ذکر نہیں کیا گیا۔

مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَا نفی کے لئے ہے یا استفہام انکاری کے لئے میرے لئے کار آمد نہیں ہوا کیا مجھے کچھ مفید ہوا۔

مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾ وہ جو میرا تھا یعنی مال اولاد خدام۔

هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾ میری حکومت اور سلطنت مجھ سے جاتی رہی یا وہ حجتیں جاتی رہیں جو میں دنیا

میں پیش کرتا تھا۔

خُذُوْهُ اللہ جہنم کے دربانوں کو حکم دے گا اس کو گرفتار کرلو۔

فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ اور اس کے ہاتھ گردن سے باندھ دو جکڑ دو۔

ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ پھر بڑی دہکتی آگ کے اندر ہی اس کو جھونک دو۔ اَلْجَحِیْم (مفعول) کو فعل سے پہلے لانا مفید بے حصر ہے۔ جَحِیْم کا معنی ہے بڑی (دہکتی) آگ۔ اس جگہ اور اس کے بعد لفظ ثُمَّ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہر آئندہ مصیبت پچھلی مصیبت سے بہت زیادہ سخت ہوگی (اول گرفتاری اس کے بعد گردن سے ہاتھوں کی بندش ہوگی اس کے بعد جہنم میں داخلہ بہت سخت ہوگا اس کے بعد ایک زنجیر میں پرویا جانا اور بھی شدید ہوگا)

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ فَاسْلُکُوْہُ میں تحسین کلام کے لئے فاء کو زائد کیا گیا ہے عاطفہ نہیں ورنہ دو حرف عطف کا اجتماع لازم آئے گا۔ (ثُمّ اور فاء)

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے عوفی کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زنجیر کافر کے مقعد سے داخل کر کے ناک کے نتھنوں سے نکالی جائے گی (اس طرح اس کو زنجیر میں پرویا جائے گا) تاکہ وہ پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ ابن ابی حاتم نے ابن جریر کے طریقہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ زنجیر سرین سے داخل کی جائے گی اور منہ سے نکالی جائے گی اور جس طرح ٹڈی کو لکڑی میں پروتے ہیں اسی طرح زنجیر میں کافر کو پرو دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو بھونا جائے گا۔

نوف بکائی شامی کا قول ہے زنجیر ستر ذراع کی ہوگی اور ہر ذراع ستر باہہ کا اور ہر باہہ اتنی لمبی جتنی یہاں سے مکہ تک مسافت ہے اس بات کے وقت بکالیؒ کوفہ کے میدان میں تھے۔

ہناد اور ابن مبارک کا بیان ہے کہ سفیان نے فرمایا ہر ذراع ستر ذراع کا ہوگا حسن بصریؒ نے فرمایا اللہ جانے کون سا ذراع ہوگا۔

میں کہتا ہوں شاید دوزخ کے دربان فرشتوں کا ذراع مراد ہو یا جہنم کے اندر کافر کا ذراع اتنا بڑا ہو جائے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ کے اندر کافر کی داڑھ کوہ احد کی برابر اور اس کی کھال کی موٹائی تین روز کی راہ کے بقدر ہوگی (رواہ مسلم عن ابی ہریرہ مرفوعا) احمد ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابن عمر کی روایت بیان کی ہے اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس (زنجیر) کا اتنا گولا اگر آسمان سے چھوڑا جائے تو رات ہونے سے پہلے زمین پر پہنچ جائے گا باوجودیکہ آسمان و زمین کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے لیکن اگر وہ گولا زنجیر کے ایک سرے سے دوزخ میں لٹکایا جائے گا تو شبانہ روز چل کر چالیس برس میں دوزخ کی تہ یا قعر تک پہنچے گا ابن مبارک نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ اس زنجیر کی ایک کڑی دنیا کے سارے لوہے کے برابر ہوگی۔ ابو نعیم نے محمد بن مندر کا قول نقل کیا ہے کہ اگر دنیا کا تمام گزشتہ اور آئندہ لوہا جمع کیا جائے تو جہنم کی زنجیر کی ایک کڑی کے برابر نہیں ہوگا۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾ اس لئے کہ وہ عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ یہ عذاب مذکور کی علت کا بیان ہے لفظ عَظِیْم کے ذکر سے اس امر کی طرف ایماء ہے کہ اللہ ہی مستحق عظمت ہے اگر اللہ کے علاوہ کوئی کسی دوسرے کو مستحق عظمت قرار دے گا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بزرگی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار (یعنی میں بزرگی اور بڑائی کے پردوں میں پوشیدہ ہوں) اب جو شخص میرا کوئی لباس مجھ سے کھینچے گا میں اس کو آگ میں داخل کروں گا۔ (مسلم)

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾ یعنی مسکینوں کو خود دینا تو درکنار دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں ابھارتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ برانگیختہ کرنے کا تذکرہ کر کے یہ بات جتانی مقصود ہو کہ برانگیختہ نہ کرنے (اور ترغیب نہ دینے والے) کا جب یہ برا درجہ ہوگا تو خود نہ کرنے اور مسکین کو نہ دینے والے کا کیا درجہ ہوگا۔

آیت سے ثابت ہے کہ فروع اعمال پر بھی کافروں کا مواخذہ ہوگا۔ عدم ایمان اور عدم ترغیب کا خصوصیت کے ساتھ اس جگہ ذکر شاید اس لئے کیا گیا کہ بدترین (عقیدہ) کفر ہے اور بدترین (عمل) بخل۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ فاء سببی ہے اسی لئے آج یہاں (یعنی اس روز وہاں) اس کا کوئی رشتہ دار دل دکھانے والا نہ ہوگا۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ اور سوا غسلین کے اس کے لئے کوئی کھانے کی چیز نہ ہوگی۔ لفظ لازائد (برائے تاکید) ہے اور استثناء مفرغ ہے غسلین دوزخیوں کے زخموں کا دھوون۔ کچلہو، غسلین بروزن فعلین غسل (دھونا) سے ماخوذ ہے۔

ابن ابی حاتم نے بطریق عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ غسلین دوزخیوں کا کچ لہو ہوگا ضحاک اور ربیع کا قول ہے کہ غسلین ایک درخت ہوگا جس کو دوزخی کھائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے بطریق مجاہد بیان کیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا مجھے نہیں معلوم کہ غسلین کیا چیز ہوگی مگر میرا خیال ہے کہ غسلین ہی زقوم (تھوہر کا درخت) ہوگا۔

لَا يَأْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴿۳۷﴾ استثناء مفرغ ہے یعنی خطا کاروں کے سوا اس کو کوئی نہیں کھائے گا لفظ اَلْخَاطِئُوْنَ اس خطا (نادانستہ غلطی) سے ماخوذ نہیں جو (صحت درستی) کی ضد ہے بلکہ خطی الرجل (اس شخص نے قصداً گناہ کیا) سے ماخوذ ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ میں قسم نہیں کھاتا کیونکہ بات کھلی ہوئی ہے قسم کھا کر اس کو پختہ کرنے کی ضرورت نہیں (اس صورت میں لا نفی کا ہوگا) یا لا زائد ہے یعنی میں پختہ قسم کھاتا ہوں یا لا کا تعلق کلام محذوف سے ہے۔ یعنی کافر جو کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے قرآن کی نسبت خدا کی طرف غلط کی ہے یہ خود شاعر یا کاہن ہے اور حشر نشر نہ ہوگا یہ باتیں سچ نہیں ہیں میں قسم کھاتا ہوں (اس صورت میں بھی لا نفی کا ہوگا)

بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ ان چیزوں کی جو صفات خداوندی کا مظہر ہیں اور جن کو تم عقل یا چہرہ کی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔

وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اور ان صفات و ذات کی جن کی حقیقت مراتب نہ تم کو دانش و فہم سے دیکھتی ہے نہ آنکھوں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اول سے مراد ہیں اجسام اور دوسرے سے ارواح یا اول سے انسان اور دوسرے سے جن و ملائکہ یا اول سے ظاہری اور دوسرے سے باطنی نعمتیں۔ یا اول سے وہ علم مراد ہے جس کو اللہ نے ملائکہ اور جن وانس پر ظاہر کر دیا ہے اور دوسرے سے مراد اس کا خصوصی علم ہے جس سے اور کوئی واقف نہیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ کہ بلاشک یہ قرآن اللہ کی طرف سے ایک باعزت پیغامبر کا (زبانی) قول ہے اس کا خود ساختہ نہیں رسول کریم سے مراد رسول اللہ ﷺ یا جبرئیل ہیں۔

وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ کسی شاعر کا قول نہیں جیسا کہ تم کبھی کبھی دعوی کرتے ہو۔

قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ قلیلاً میں نصب مصدریت (یعنی مفعول مطلق) کی بناء پر ہے یا ظرفیت (مفعول فیہ) کی بنا پر اور ما سے تاکید قلت ہو رہی ہے بہت ہی کم یا بہت تھوڑے وقت میں ایمان لاتے ہو کیونکہ اس کی سچائی جب تم پر نمایاں ہو جاتی ہے تو مجبوراً کسی قدر تھوڑے وقت کے لئے اس کو سچا مان لیتے ہو (لیکن پھر عناد اور دشمنی کی وجہ سے انکار کرنے لگتے ہو) قلت ایمان چاہتی ہے کہ کثرت ایمان منفی ہو کیونکہ کثرت ایمان کی نفی عناد اور ضد پر مبنی ہے اور وہ لوگ عناد و ضد کی وجہ سے پورے مومن ہی نہ تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قلیل ایمان سے مراد نفی ایمان ہے یعنی بالکل ایمان نہیں رکھتے ہو جیسے اس شخص سے تم کہو جو تمہاری ملاقات کو نہیں آتا کہ آپ تو بالکل کم ہی ہم سے ملاقات کرتے ہیں یعنی نہیں کرتے۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ لا زائد ہے یعنی نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تم بہت کم غور کرتے ہو نفی شاعریت کے ساتھ قلت ایمان اور نفی کہانت کے

ساتھ قلت تدبر کاذکر اس وجہ سے کیا کہ قرآن کا شعر نہ ہونا ایک واضح امر تھا جس کے انکار کی سوائے عناد کے اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی لیکن الفاظ کاہن سے قرآن کا فرق غور طلب تھا جب تک رسول اللہ ﷺ کے احوال اطوار اور قرآن کے حقائق پر غور نہ کیا جائے واضح طور پر اس کو سمجھنا مشکل ہے۔

تَنْزِيْلٌ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی وہ قرآن اتارا ہوا ہے۔

مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾ اللہ کی طرف سے جبرئیلؑ کی زبانی۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا اگر ہماری وحی کے بغیر وہ ہم پر بناوٹ و دروغ اور افترابندی کرتا۔

بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ کسی قول کی بھی اَقَاوِیْل اقولہ کی جمع ہے قول سے مشتق ہے بروزن اضاحیک خود ساختہ افترائی اقوال کو اقاویل کہا جاتا ہے۔

لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ تو ہم دائیں ہاتھ سے اس کی گرفت کرلیتے یعنی اس کو ذلیل کرنے کے لئے اس کا دیاں ہاتھ پکڑ لیتے یا اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے موخر الذکر صورت میں منہ میں من زائد ہے یمین اللہ متشابہات میں سے ہے (جن کی صحیح مراد سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا) کسی نے اس کا معنی قوت اور قدرت بھی بیان کیا ہے کیونکہ دائیں ہاتھ میں (اصل) قوت ہوتی ہے حضرت ابن عباسؓ نے قوت اور قدرت ہی سے تفسیر کی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مِنْہُ میں مِنْ سببی ہو یعنی اس کے جھوٹ بنانے کی وجہ سے ہم اس کی گرفت کرلیتے۔

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ پھر اس کی زندگی کی رگ کاٹ دیتے۔ وَتِین دل میں ایک رگ ہے جس کے کٹنے سے زندگی منقطع ہو جاتی ہے۔

فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اول مِنْ بیانیہ ہے اور مِنْکُمْ حال ہے۔ مِنْ اَحَدٍ میں مِنْ زائد ہے تم میں سے کوئی بھی ہم کو۔

عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ قتل یا مقتول مفتری کی گرفت سے ہم کو روکنے والا نہیں۔ احد لفظاً مفرد اور معنًی جمع ہے اس لئے حَاجِزِین کو جمع لایا گیا۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ بلاشبہ قرآن اہل تقوی کے لئے ایک یادداشت ہے کیونکہ اہل تقوی کو ہی اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔

فائدہ

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ لِلْمُتَّقِیْنَ میں لام تخصیص کا ہے یعنی صرف متقیوں کے لئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت قرآن فناء نفس کے بعد موجب ترقی درجات ہے کیونکہ تقویٰ کا (کامل) تصور فناء نفس سے پہلے ممکن نہیں اور قرآن صرف اہل تقوی کے لئے تذکرہ ہے (اس سے نتیجہ نکلا کہ قرآن فناء نفس کے بعد ہی موجب ترقی ہے) فناء نفس سے پہلے تلاوت اگرچہ نیک کام ہے اور نیکوں کا عمل ہے مگر رذائل نفس سے اجتناب رکھنے والے اہل قربت کے لئے نیکی نہیں ہے۔

وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ ہم واقف ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ اس کو جھوٹا قرار دیتے ہیں تو ہم اس تکذیب اور عدم ذکر کی ان کو ضرور سزا دیں گے۔

وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ جب نصیحت اندوز اہل ایمان کے ثواب کو کافر دیکھیں گے اس وقت یہ قرآن ان کے لئے حسرت آفرین ہوگا۔

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ بلاشبہ قرآن حق الیقین ہے یقین کا معنی ہے زوال شک (قاموس) صحاح میں جوہری نے لکھا ہے کہ یقین علم کی صفت ہے معرفت سے اونچی۔ قرآن کو یقین کہنا مبالغہ ہے جیسے زید عدل زید انصاف ہے۔

یعنی قرآن یقینی ہے اور اتنا یقینی ہے کہ گویا عین یقین بن گیا۔ مطلب یہ کہ قرآن واضح ہے اس کے دلائل روشن ہیں اس میں کسی سمجھدار کو شبہ نہیں ہو سکتا ہر عقلمند کو اس کا یقین ہے۔

حق باطل کی ضد کو کہتے ہیں صاحب بحر نے کہا حق الیقین میں صفت کی موصوف کی جانب اضافت ہے اصل میں الیقین الحق تھا یعنی قرآن یقین حق ہے باطل یقین نہیں۔ باطل یقین جہل مرکب ہوتا ہے۔

ایک شبہ

یقین سے اس جگہ مراد وہی ہے جو اپنی روشنی اور دلائل کی چمک کی وجہ سے عقلمند آدمی کے لئے موجب یقین ہو اس صورت میں یقین عین حق ہے باطل (جہل مرکب) کو یہ لفظ شامل ہی نہیں ہے پھر حق کی یقین کی طرف اضافت بیکار ہے۔

ازالہ

بیشک بات یہی ہے لیکن حق کی یقین کی طرف اضافت تاکید اور زیادت توضیح کے لئے ہے (بیکار نہیں ہے) بغوی نے لکھا ہے کہ اضافت الی النفسہ ہے (یقین اور حق دونوں ایک ہیں) لیکن لفظ دو ہیں (اس لئے اضافت درست ہے)

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿۵۲﴾ یعنی اللہ کو کسی مفتری کی افتراء پر رضامند رہنے اور نامناسب اوصاف کے ساتھ موصوف ہونے سے پاک قرار دو اور اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کا شکر ادا کرو (مطلب یہ کہ سبح کا مفعول محذوف ہے اور اسم سے پہلے ذکر محذوف ہے یعنی عظمت والے اللہ کے نام کا ذکر کرو اور اس ذکر کے ساتھ اس کی پاکی کا اقرار کرو)

بعض نے کہا تسبیح سے نماز مراد ہے یعنی اللہ کی یاد اور اس کے حکم کے ذکر کے ساتھ نماز پڑھو۔ بعض کا قول ہے کہ باء زائد ہے اور لفظ اسم بھی زائد ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے رب عظیم کی پاکی بیان کرو۔

حضرت عقبہؓ بن عامر جہنی سے مروی ہے کہ جب آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اس کو اپنے رکوع میں (داخل) کرلو اور جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى نازل ہوئی تو فرمایا اس کو اپنے سجدہ میں (داخل) کرلو (ابوداؤد و ابن ماجہ)

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلی پڑھتے تھے اور جب آیت رحمت پر پہنچتے تو ٹھہر کر دعا کرتے اور آیت عذاب پر پہنچتے تو ٹھہر کر پناہ مانگتے (ترمذی ابوداؤد دارمی) ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے نسائی اور ابن ماجہ نے آیت رحمت اور آیت عذاب پر ٹھہرنے اور دعا کرنے اور پناہ مانگنے کا ذکر نہیں کیا) عون بن عبداللہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی رکوع کرے اور تین بار رکوع میں سبحان ربی العظیم کہہ لے تو اس کا رکوع پورا ہو گیا اور یہ کمترین (مقدار) ہے۔ اور جب سجدہ کرے اور سجدہ میں تین بار سبحان ربی الاعلی کہہ لے تو اس کا سجدہ پورا ہو گیا اور یہ قلیل ترین (تعداد) ہے۔ (ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ)

ترمذی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ عون نے حضرت ابن مسعود کو نہیں پایا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو لفظ ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں وزن میں بھاری ہیں رحمان کو محبوب ہیں (وہ دو لفظ یہ ہیں) سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم (بخاری و مسلم)

حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سبحان اللہ العظیم و بحمدہ کہتا ہے اس کے لئے جنت کے اندر ایک کھجور کا درخت بو دیا جاتا ہے۔ (ترمذی)

مسئلہ: جمہور کے نزدیک رکوع اور سجدہ میں تسبیح پڑھنی سنت ہے اور تکمیل کا ادنی درجہ تین بار ہے امام احمد ان تسبیحات

کو واجب کہتے ہیں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو اپنے رکوع میں (داخل کرلو) یہ امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہے اس کے علاوہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں بھی تکمیل رکوع کو اس سے وابستہ کیا گیا ہے جمہور امر کو ندب (استحباب) کے لئے قرار دیتے ہیں۔

قیام سے رکوع پھر رکوع سے قیام کے بعد سجود پھر سجدہ سے اٹھ کر جلسہ پھر جلسہ سے سجدہ پھر سجدہ کے بعد قیام غرض ہر رکن سے دوسرے رکن کی طرف انتقال کے وقت تکبیر کہنے میں بھی یہی اختلاف ہے: جمہور کے نزدیک سنت ہے اور امام احمد کے نزدیک واجب ہے اسی طرح قومہ میں سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنالک الحمد کہنا بھی مختلف فیہ ہے جمہور کے نزدیک سنت اور احمد کے نزدیک واجب ہے ہاں جلسہ کے اندر رب اغفرلی پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں اس کے وجوب کا کوئی قائل نہیں۔ واللہ اعلم۔

سورۃ المعارج

یہ سورت مکی ہے اس میں ۴۴ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سَاَلَ سَآئِلٌ ایک مانگنے والے نے درخواست کی۔ یہ مانگنے والا نضر بن حارث تھا۔ اس نے کہا تھا اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دکھ والا عذاب ہم پر لے آ۔ (ابن عباس حسب بیان نسائی و ابن ابی حاتم)

ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے بیان کیا کہ وہ (مطلوبہ) عذاب بروز بدر آیا۔ اول روایت کی بناء پر سوال سے مراد یہی دعا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سَاَلَ کا مفعول عذاب کو بواسطہ باء قرار دیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حسب قرأت نافع سَالَ الف کے ساتھ ہو سَاَلَ نہ ہو اس وقت سیلان (بہنا) سے مشتق ہوگا۔ سَائِل بہنے والا (یعنی نالا) مطلب یہ کہ عذاب سے وادی بہ نکلا مراد یہ کہ عذاب کا وقوع مستحق ہو گیا (عذاب یقینی آگیا) دنیا میں بصورت قتل بدر اور آخرت میں عذاب دوزخ بغوی نے کہا سائل جہنم میں ایک وادی (پہاڑی نالہ) ہے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی طرف اس قول کی نسبت کی جاتی ہے۔

ابن المنذر نے بیان کیا کہ حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا کس پر عذاب آئے گا اس پر اللہ نے نازل فرمایا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ اس تشریح کی بناء پر سوال (دعاء کے طور پر نہ ہوگا بلکہ) پوچھنے کے لئے ہوگا اور بعذاب میں باء بمعنی عَنْ ہوگی لیکن سوال چونکہ اہم چیز کو متضمن ہے اس لئے بجائے عَنْ کے باء ذکر کیا گیا (یعنی پوچھنے والے نے عذاب کے متعلق دریافت کیا)

بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝۱ واقع عذاب کی صفت ہے۔

لِّلْکٰفِرِیْنَ یہ عذاب کی دوسری صفت ہے یا واقع سے متعلق ہے اور اگر یہ سوال ہو کہ کن لوگوں پر عذاب واقع ہوگا تو سوال کا یہ جواب ہوگا (کہ کافروں پر واقع ہوگا) اور لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ عذاب کی صفت ہوگا یا جواب کے دائرہ میں آئے گا۔

لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝۲ مِّنَ اللّٰهِ چونکہ اللہ کا ارادہ عذاب سے متعلق ہو جائے گا اس لئے خدا کی طرف سے اس عذاب کو دفع کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

ذِی الْمَعَارِجِ ۝۳ اللہ کی صفت ہے یعنی ترقیات والا اللہ سعید بن جبیرؒ نے تشریح میں فرمایا درجات والا اللہ۔ میں کہتا ہوں درجات سے مراد ہیں۔ بے کیف قرب الٰہی کے وہ مراتب جن پر انبیاء ملائکہ اور اولیاء فائز ہوتے ہیں اور قبول کے وہ درجات جہاں تک پاکیزہ کلمات اور نیک اعمال کو بلندی نصیب ہوتی ہے۔ یا مراد ہیں دار الثواب میں ترقیات اور جنت میں مراتب

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے اندر سو درجات ہیں ہر درجہ کا دوسرے درجہ سے فصل (یعنی بلندی) اتنا ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان فردوس کا درجہ سب سے اونچا ہے اسی سے جنت کے چاروں دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں اس سے اوپر عرش ہے جب تم اللہ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کیا کرو۔ (ترمذی) حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے اس روایت میں ہے کہ دو درجات کے درمیان سو سال (کی راہ) کے بقدر فصل ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ

کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت والے باہم بالاخانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم مشرقی یا مغربی افق پر چمکدار ستاروں کو دیکھتے ہو کیونکہ ان کے آپس میں درجات کا تفاوت ہوگا صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس مرتبہ پر تو انبیاء کے علاوہ کوئی نہیں پہنچے گا۔

فرمایا کیوں نہیں پہنچے گا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبروں کی انہوں نے تصدیق کی (وہ ان مراتب پر فائز ہوں گے)۔ (مسلم و بخاری)

حضرت ابن مسعودؓ نے المعارج کی تفسیر السموات کی ہے (آسمانوں والا اللہ) کیونکہ فرشتے آسمانوں پر چڑھتے ہیں (اس لئے ہر آسمان ملائکہ کے چڑھنے کا زینہ ہو گیا) قتادہ نے انعامات ترجمہ کیا ہے (نعمتوں والا خدا)

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ یہ اَلْمَعَارِجِ کی صفت ہے اور رابط محذوف ہے اصل کلام تھا تَعْرُجُ فِيْهَا الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ روح سے مراد جبرئیل ہیں مرتبہ کی بزرگی یا تمام ملائکہ سے زیادہ عظمت جسمانی رکھنے کی وجہ سے ملائکہ سے الگ الروح کو ذکر کیا۔ میں کہتا ہوں یہ بھی احتمال ہے کہ الروح سے مراد روح انسانی ہو جس کا تعلق عالم امر سے ہے اس وقت عروج روح کے یہ معنی ہوں گے کہ دوری اور غفلت کی پستی سے نکل کر قرب و حضور کے مراتب کی طرف انبیاء اور اولیاء کی روحیں چڑھتی ہیں۔

اِلَيْهِ اللہ کی طرف یا اللہ کے عرش کی طرف۔

فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ اس کا تعلق فعل محذوف ہے جس پر لفظ واقع دلالت کر رہا ہے یعنی اس روز جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے ان پر عذاب واقع ہوگا۔ مراد روز قیامت بیہقی نے باسناد عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے یمان نے کہا قیامت کے دن پچاس منزلیں ہوں گی ہر منزل ہزار برس کی ہوگی۔

بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کنز والا اپنے کنز (جمع کیا ہوا سونا چاندی) کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں اس کنز کو تپا کر سلیاں بنا کر اس کے دونوں پہلوؤں اور پیشانی پر داغ لگائے جائیں گے یہ اس وقت تک ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا اس روز جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی فیصلہ کر دے، پھر اس کو جنت یا دوزخ کا راستہ بتادیا جائے گا اور جو لونٹوں والا لونٹوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا تو قیامت کے دن چٹیل میدان میں اس کو پچھاڑا جائے گا اور سب لونٹوں کی اس پر آمد و رفت ہوگی اونٹ کا کوئی بچہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ سب اپنے موزوں (قدموں) سے اس کو روندیں گے اور منہ سے کاٹیں گے۔ پہلی جماعت اس پر سے گزر جائے گی تو دوسری لوٹا کر لائی جائے گی (اور یہ پامالی) اس دن ہوگی جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہوگی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا فیصلہ کر دے گا اور جنت یا دوزخ کا راستہ بتادیا جائے گا اور جو بکریوں والا بکریوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا تو اس کو چٹیل میدان میں پچھاڑ کر (بکریوں کو اس پر گزارا جائے گا) ہر بکری موجود ہوگی کوئی سینگ مڑی یا منڈی یا سنگ ٹوٹی نہ ہوگی یہ بکریاں اس کو سینگوں سے ماریں گی اور کھروں سے روندیں گی۔ اسی طرح جیسا کہ لونٹوں کے بیان میں گزر گیا۔ پہلی جماعت گزر چکے گی تو پچھلی جماعت کو پھر (اس پر) لوٹا کر لایا جائے گا (اور یہ پامالی) اس روز ہوگی جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہوگی یہاں تک کہ اللہ بندوں کا فیصلہ کر دے گا اور جنت یا دوزخ کا راستہ بتادیا جائے گا۔

احمد ابو یعلی ابن حبان اور بیہقی نے حسن اسناد کے ساتھ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس روز کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہوگی کہ وہ دن کس قدر لمبا ہوگا فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ دن مومن کے لئے ہلکا ہوگا یہاں تک کہ دنیا میں جو فرض نماز پڑھتا تھا اتنے وقت سے بھی اس کے لئے آسان (یعنی کم) ہوگا۔ میں کہتا ہوں اس توجیہ کی بناء پر دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا ایک یہی آیت (جس میں پچاس ہزار برس کی مقدار بیان کی ہے) دوسری تنزیل السجدہ والی آیت يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ

اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (اس آیت میں ایک ہزار سال کی مقدار بیان کی ہے) کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مختلف امور کے متعلق حکم دیتا ہے اور جبرئیل اس حکم کو لے کر آسمان سے زمین تک آتے ہیں پھر چڑھ کر اللہ تک جاتے ہیں اس آمد و رفت میں دنیا کا ایک دن صرف ہوتا ہے حالانکہ مقدار مسافت ایک ہزار برس کی برابر طے ہو جاتی ہے کیونکہ آسمان سے زمین کا بعد پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے پانچ سو برس جانے اور پانچ سو برس آنے کے یعنی آمد و رفت کی اس مسافت کو اگر کوئی آدمی طے کرے تو ایک ہزار برس میں کرے گا مگر ملائکہ ایک دن میں بلکہ اس سے بھی کم مدت میں طے کر لیتے ہیں۔

آیت یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کا قول بسند ابو طلحہ بیہقی نے نقل کیا ہے کہ یہ دنیا میں ہوتا ہے ملائکہ ہزار برس کی مسافت ایک دن میں طے کر لیتے ہیں اور آیت فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ کے متعلق حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ قیامت کا دن ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے پچاس ہزار برس کا کر دے گا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ دونوں آیتوں میں قیامت کا دن ہی مراد ہے بعض کے لئے قیامت کا دن لمبا ہوگا بعض کے لئے چھوٹا یہاں تک کہ مومنوں کے لئے صلوٰۃ فرض سے بھی زیادہ آسان (یعنی کم) ہوگا۔

حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مرفوعاً اور موقوفاً بیان کی ہے کہ مومنوں کے لئے قیامت کا دن اتنا ہوگا جتنا ظہر و عصر کے درمیان ہوتا ہے اس قول پر تنزیل السجدۃ والی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے زمین تک نظم احکام (روزانہ) مدت ایام دنیا تک کرتا رہے گا پھر دنیا کے فنا ہونے اور ہر حاکم کا حکم اور ہر آمر کا امر ختم ہو جانے کے بعد ہر حکم اور نظم کا رجوع (براہ راست) قیامت کے دن اللہ ہی کی طرف ہو جائے گا اور قیامت کے دن کی مقدار ایک ہزار سال ہو گی۔

بعض لوگوں نے کہا کہ فی یوم دونوں آیتوں میں یعرج سے متعلق ہے اس صورت میں دونوں آیتوں کا تعارض اس طرح دور کیا جائے گا کہ سورۂ تنزیل کی آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ آسمان سے زمین تک تدبیر امر ایک دن میں ہوتی ہے حالانکہ یہ درمیانی سیر ایک ہزار برس کی برابر ہوتی ہے پانچ سو برس نزول (ملائکہ) کے اور پانچ سو برس چڑھنے کے اور اس سورت میں اس جگہ ساتویں زمین کی تہ سے لے کر ساتویں آسمان کے اوپر تک جتنی مسافت ہوتی ہے اس کو طے کرنے کی مدت بیان کی ہے یہ مسافت پچاس ہزار برس کی ہے۔ لیث نے مجاہد کا یہی قول نقل کیا ہے (بغوی) محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ اگر آدمی حسب معمول دنیا سے عرش تک جائے تو پچاس ہزار برس چلتا رہنا ہوگا۔

اسی وجہ سے صوفیہ نے کہا کہ صوفی کو فناء قلب کا مرتبہ اللہ کی کشش سے نبی ﷺ اور مشائخ کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے لیکن شیخ کی کشش کے بغیر اگر خود عبادت اور ریاضت سے اس مرتبہ پر پہنچنا چاہے گا تو پچاس ہزار برس میں پہنچے گا اور پچاس ہزار برس تک زندہ رہنا بلکہ دنیا کا باقی رہنا ہی تصور کی رسائی سے باہر ہے تو لا محالہ کسی شیخ کی وساطت اور الٰہی کشش کے بغیر معمولاً فنا قلب محال ہے ہاں غیر معمولی طور پر بغیر توسط شیخ کے براہ راست روحانی کشش جیسا کہ بعض اویسی فرقہ والوں کو ہو جاتی ہے ممکن ہے (مگر وہاں بھی توسط نبی کی ضرورت ہے)

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا۝ پس اے محمدؐ تکذیب کفار پر خوبی کے ساتھ صبر رکھو تمہاری طرف سے عجلت پسندی اضطراب اور بے صبری محسوس بھی نہ ہو۔ فاء سببی ہے اس کا تعلق سَاَلَ سے ہے۔ کافروں کی طرف سے سوال (درخواست عذاب) محض ضد اور استہزاء کی وجہ سے تھا اور اس سے حضور کبیدہ خاطر ہوتے تھے اس لئے حکم دیا کہ آپ ان کے سوال سے تنگدل نہ ہوں اور ان پر عذاب آنے کی جلدی نہ کریں۔

یا سَالَ (بروایت نافع سیلان سے) سے متعلق ہے اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ آپ صبر رکھیں عذاب ان کو بہالے جائے گا عذاب کا وقت قریب ہے۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾ کافر عذاب کو امکان سے بعید یا عقل سے دور جانتے ہیں ان کے خیال میں عذاب کا احتمال (اگر آتا بھی ہے تو) ضعیف ہوتا ہے۔

وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴿۷﴾ اور ہم عذاب کو قریب الوقوع دیکھ رہے ہیں کیونکہ جو چیز آنے والی (یقینی) ہو وہ قریب ہی ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ اَلْمُہل پگھلایا ہوا تانبایا کوئی اور دھات یا تیل کی تلچھٹ بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آسمان کے رنگ مختلف ہوں گے (کبھی) مُہل کی طرح (کبھی) سرخ تیل کی تلچھٹ کی طرح اور کمزور ہو کر پھٹ جائے گا۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ پہاڑ رنگ برنگ کے اون کی طرح ہو جائیں گے کیونکہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں جب ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑیں گے تو ایسا معلوم ہو گا کہ رنگین اون ہوا میں اڑ رہا ہے۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ ہر شخص اپنی مصیبت میں ایسا مبتلا ہو گا کہ کوئی اپنے گہرے دوست کو بھی نہیں پوچھے گا۔

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ط یہ حَمِیْمٌ کی صفت ہے یا الگ جملہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال سے مانع عدم حضور نہ ہو گا بلکہ نہ پوچھنے کی یہ وجہ ہو گی کہ ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہو گی۔ یا مشاہدہ حال کی وجہ سے سوال ہی (دماغ سے) غائب ہو جائے گا چہرہ کا اتار چڑھاؤ اور نیلا پیلا ہونا سوال کرنے ہی نہ دے گا (غرض یہ کہ گہرے دوست نظروں کے سامنے ہوں گے مگر ان کے احوال کی پرستش کوئی نہ کر سکے گا) بغوی نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام جن وانس نظروں کے سامنے ہوں گے باپ بھائی عزیز دوست سب کو آدمی آنکھوں کے سامنے دیکھے گا مگر اپنی مصیبت میں ایسا مشغول ہو گا کہ دوسرے کو پوچھ نہ سکے گا۔

بعض نے يُبَصَّرُوْنَهُمْ کا معنی يَعْتَرِفُوْنَهُمْ کہا ہے یعنی دوست دوستوں کو پہچانیں گے۔ مومن کی شناخت چہرہ کے گورے ہونے سے اور کافر کی پہچان اس کا منہ کالا ہونے سے ہو جائے گی۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ مجرم یعنی مشرک تمنا کرے گا کہ اپنی اولاد بیوی بھائی اور خاندان جس میں یہ پیدا ہوا ہے اور تمام جن وانس جو زمین پر آباد ہیں سب کو عذاب قیامت کے عوض دے کر رہائی پا جائے۔

یَوَدُّ یعنی آرزو کرے گا مجرم، مشرک، مطلب یہ ہے کہ مشرک اپنی مصیبت میں ایسا گرفتار ہو گا کہ عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے قریب ترین اعزاء اور محبوب ترین اشخاص کو اپنے عوض پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا عزیزوں اور دوستوں کی خبر گیری اور جستجو حال کا تو ذکر ہی کیا ہے اس مطلب کی بنا پر آیت لَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا کافروں کے ساتھ مخصوص ہو گی رہے مومن تو وہ اپنے دوستوں کی خبر گیری کریں گے اور ان کے لئے شفاعت بھی کریں گے بکثرت احادیث بطور تواتر معنوی اس مفہوم کو ثابت کرتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی اپنے واضح حق کے لئے اتنا نہیں جھگڑتا جتنا قیامت کے دن مومن اپنے دوزخی بھائیوں کی رہائی کے لئے اللہ سے جھگڑیں گے اور عرض کریں گے پروردگار یہ تو ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ الخ (متفق علیہ) حضرت ابو سعید خدری سے اسی معنی میں ایک طویل حدیث مروی ہے۔

صَاحِبَتِهٖ سے مراد ہے بیوی۔ فَصِیْلَتِهٖ وہ قبیلہ جس کا ایک جز منفصل آدمی خود ہوتا ہے اَلَّتِیْ تُؤْوِیْهِ سے یہ مراد ہے کہ وہ قبیلہ جو مصائب کے وقت پناہ دیتا تھا۔

مَنْ فِي الْاَرْضِ سے مراد ہیں جن وانس اور ساری مخلوق۔

ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا ط یعنی مذکورہ بالا تمام چیزوں کو اپنے عوض دیدینا اس کو عذاب سے بچالے ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ کَلَّا کا

لفظ مشرک کو تمنا سے روک دینے کے لئے آیا ہے۔

اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ اِنَّهَا میں ضمیر قصہ ہے یا اس نار کی طرف راجع ہے جو معنیٰ لفظ عذاب سے معلوم ہو رہی ہے یا ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر لفظ لَظٰى خالص بھڑک بغوی نے کہا کہ جہنم کے دوسرے درجہ کا نام لَظٰى ہے کیونکہ اس میں خالص التہاب اور بھڑک ہے۔

نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ شَوٰى دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں یعنی وہ آگ ہاتھوں اور پاؤں کو اکھاڑ کر جدا کر دینے والی ہو گی۔ یا شَوٰى شواۃ کی جمع ہے اور شوۃ کا معنی ہے سر کی کھال (مجاہد) یعنی سر کی کھال اتار دینے والی۔ یا ہڈیوں سے گوشت اتار دینے والی (ابراہیم بن مہاجر) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے پٹھوں کو کھینچ لینے والی ہو گی۔ کلبی نے کہا سارے دماغ کو کھا جائے گی اور پھر دماغ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا تھا۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ حق سے پشت پھیرنے والوں کو اور طاعت سے روگردانی کرنے والوں کو وہ آگ پکارے گی اور کہے گی اے منافق ادھر آ اے مشرک میرے پاس آ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کافروں اور منافقوں کو ان کے نام لے کر فصیح زبان سے پکارے گا اور اس طرح اچک لے گی جیسے پرندہ دانہ کو اچک لیتا ہے۔

وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اور اس کو پکارے گی جس نے مال کو جمع کیا اور ظروف میں بھر کر روک کر رکھا اور اس میں سے اللہ کا حق ادا نہیں کیا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ هَلُوْعٌ ناجائز چیزوں کی حرص کرنے والا۔ (سدی بروایت ابو صالح از ابن عباسؓ) سخت کنجوس (سعید بن جبیر) تھوڑدلا (عکرمہ) بے صبرا (قتادہ) تنگ دل (مقاتل) ہلع کا معنی ہے شدت حرص اور قلت صبر لیکن عطیہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگلی آیت (یعنی اِذَا مَسَّهُ سے مَنُوْعًا تک) هَلُوْعًا کی تشریح ہے۔

بہر حال انسان پیدائشی طور پر صفت هَلَعْ کے ساتھ متصف ہے اگر بالفعل متصف کہا جائے تو یہ آیت حال مقدرہ ہو گی اور اگر یہ کہا جائے کہ آدمی کے اندر خصلت هَلَعْ پیدا کی گئی ہے اور اس خصلت کا تقاضا ہے کہ انسان کی سرشت میں وہ ذلیل قوت موجود ہو جو اس خصلت کا سرچشمہ ہے تو اس صورت میں یہ آیت حال محققہ ہو گا بہر حال کلام سابق کی علت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ جب کوئی مصیبت آدمی کو چھو بھی جاتی ہے تو بے صبر ہو جاتا ہے اور ذرا مال کا کچھ لگاؤ ہو جاتا ہے تو روک کر رکھتا ہے نہ شکر کرتا ہے نہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر آدمی کو مال سے بھری ہوئی دو وادی مل جائیں تب بھی وہ تیسرے کا خواستگار ہوتا ہے آدمی کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی اور جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ بھی اس کی توبہ قبول فرماتا ہے (متفق علیہ) حضرت انسؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے مگر دو چیزیں اس کی جوان ہو جاتی ہیں مال کی حرص اور (درازی) عمر کی حرص (متفق علیہ)

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ سواء کامل مومنوں کے مصلی سے مراد ہے کامل مومن جیسے آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اِيْمَانَكُمْ میں ایمان سے مراد ہے نماز کیونکہ مومن کے مراتب میں چوٹی کا درجہ نماز ہی ہے۔ یہی مومن کی معراج اور دین کا ستون ہے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جن مراتب کا حصول آدمی کے لئے ممکن ہے ان میں سب سے اونچا مرتبہ نماز کا ہے۔

اَلْاِنْسَان میں لام جنسی یا استغراقی ہے لفظ انسان اگرچہ مفرد ہے مگر معنوی اعتبار سے جمع ہے اسی وجہ سے اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ میں اِلَّا استثنائیہ متصلہ آیا ہے۔

یا یوں مطلب قرار دیا ہے کہ مجرم حق و طاعت سے روگردانی کرتا اور پشت موڑتا ہے کیونکہ جنس انسان یا انسان کا ہر فرد

تخلیقی طور پر تھوڑدلا اور حریص واقع ہوا ہے ہاں وہ کامل ایماندار جن کے اندر ایسے اوصاف موجود ہیں جو نشان وہی کر رہے ہیں کہ وہ ہمہ تن اللہ کی طاعت میں ڈوبے رہتے ہیں۔ مخلوق پر مہربانی کرتے ہیں جزا سزا پر ان کا ایمان ہے عذاب کا خوف ہے حرص و ہوا کو شکست دے چکے ہیں دنیا کو آخرت پر ترجیح نہیں دیتے ایسے لوگوں کی سرشت حرص و بخل اور بے صبری پر نہیں ہوئی بلکہ ان کی تخلیق میں دکھ پر صبر اور سکھ پر شکر داخل ہے اور یہی صبر و شکر ان کو جنت میں لے جائے گا۔

مسلم نے بروایت حبیب بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے مگر یہ بات اس مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں کہ اگر اس کو سکھ پہنچتا ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ سکھ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے اور اگر اس کو دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ دکھ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔ اس تفسیر کی بنا پر یہ آیت (اپنے مفہوم کے لحاظ سے) ویسی ہی ہو گی جیسی آیت اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استثناء کو منقطع قرار دیا جائے اور الانسان کے الف لام کو عہدی کہا جائے اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جو مجرم روگردانی کرتا اور حق و طاعت سے پیٹھ موڑتا ہے وہی تخلیقاً ھَلُوْع ہوتا ہے لیکن وہ مومن جس کے اندر مذکورہ (ذیل) اوصاف ہوں اس کو تخلیقاً اعزاز جنت کا اہل بنایا گیا ہے۔ دونوں تفسیروں کی صورت میں آیت بہر حال یہ بتا رہی ہے کہ اصل خلقت کے اعتبار سے انسانوں کی اہلیت میں اختلاف ہے جیسا کہ حضرت مجددؒ صاحب نے فرمایا ہے کہ خصوصیات مومن کے مبادی (اصول) وہ تشخصات ہیں جو (اللہ کے) اسم ہادی کے افراد (اور مظاہر) ہیں اور خصوصیات کفار کے مبادی وہ تشخصات ہیں جو (اللہ کے) اسم مضل (گمراہ بنانے والا) کے افراد (اور مظاہر) ہیں (یعنی ہادی اور مضل اللہ کے دو اوصاف ہیں جن کے کچھ خصوصی پر تو اور مظاہر ہیں ان مظاہر کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی جزئیات اور افراد کلی کی ہوتی ہے یہی تشخصات اور افراد اس دنیا میں اپنا مصداق رکھتے ہیں اور خارج میں جس جس کے اندر ہدایت کرنے یا گمراہ بنانے کی قوت ہوتی ہے اس کا سرچشمہ اور مبدء صفات الٰہیہ (ہادی اور مضل) کے یہی مخصوص مظاہر اور افراد ہوتے ہیں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگ (مختلف) کانیں ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں تم میں سے جو جاہلیت میں بہتر (اعلیٰ) تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے کچھ (لوگ) جنت کے قابل پیدا کئے جب وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے اسی وقت ان کو جنت کے قابل بنا دیا تھا۔ اور کچھ لوگوں کو دوزخ کے قابل بنایا جب وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے اسی وقت ان کو دوزخ کے قابل بنا دیا تھا (مسلم) اس مبحث کی بہت زیادہ احادیث آئی ہیں۔[1]

الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ یعنی وہ نمازی جو نماز کے اندر ہمیشہ سجدہ کے مقام پر نظر رکھتے اور دل سے خدا کی طرف متوجہ رہتے ہیں اسی مضمون کو سورۂ مومنوں کی آیت اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ میں بیان فرمایا ہے اس توضیح پر آئندہ آیت وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ موجب تکرار مضمون نہیں (دونوں کا

---

[1] اگر تم سے کہا جائے کہ فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو صحیح مان لینا لیکن اگر کہا جائے کہ فلاں شخص نے اپنی سرشت اور فطرت کو چھوڑ دیا تو صحیح نہ ماننا۔ آدمی ساری عمر جنت والوں کے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جنت سے اسکا فاصلہ بالشت بھر رہ جاتا ہے آخر میں کوئی کام ایسا کر بیٹھتا ہے کہ ساری عمر کا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے تقدیر کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ دوزخی ہو جاتا ہے اسی طرح آدمی ساری عمر دوزخیوں کے جیسے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس سے دوزخ بالشت بھر دور رہ جاتی ہے آخر میں کوئی کام ایسا کر گزرتا ہے کہ ساری عمر کی غلط کاریاں دھل جاتی ہیں تقدیر کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے اس طرح کے مضمون کی احادیث بکثرت آئی ہیں بلکہ تقدیر خیر و شر پر ایمان جزء ایمان ہے پھر کیا تعلیم و تربیت بے کار ہے۔ تعلیم و تربیت سے اگرچہ تقدیر نہیں بدلتی تخلیق میں تغیر نہیں آتا فطرت نہیں پلٹتی لیکن سلسلہ اسباب کا تسلسل علت و معلول کا ربط اور تبلیغ و صحبت کا اثر بھی فطری ہے دواء اپنا اثر رکھتی ہے اگرچہ موت سے نہیں بچاتی عدل حقوق سے صلاح عالم اور ظلم وجود سے تباہی وابستہ ہے اگرچہ انصاف موجب بقاء اور ذریعہ دوام نہیں نہ ظلم سے نسل انسانی کا آج تک (باقی اگلے صفحہ)

مضمون جدا جدا ہے) کیونکہ اول الذکر آیت میں دوام سے مراد ہے دوام حضور جو نماز کے آداب ارکان اور شرائط کی نگہداشت سے حاصل ہوتا ہے۔ بغویؒ نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ ابوالخیر نے حضرت عقبہ بن عامر سے دریافت کیا کہ آیت الذین ھم علی صلوتہم دائمون کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں حضرت عقبہ نے فرمایا نہیں یہ مطلب نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ نماز میں دائیں بائیں اور پیچھے نہیں دیکھتے۔ احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور دارمیؒ نے حضرت ابوذرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز کے اندر بندہ جب تک ادھر ادھر نہیں دیکھتا اللہ برابر اس کی طرف متوجہ رہتا ہے جب بندہ ادھر ادھر التفات کرتا ہے تو اللہ بھی (اس کی طرف سے) پھر جاتا ہے بیہقی نے سنن کبیر میں حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا انسؓ اپنی نظر سجدہ کی جگہ رکھا کرو۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز میں ادھر ادھر دیکھنا تباہی ہے۔

فائدہ

حضور قلب حاصل کرنے اور وسوسوں کو دور کرنے میں سجدہ گاہ پر نظر قائم رکھنے کو بڑا اثر آفریں دخل ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ یعنی جن کے مال میں حق معین ہے جیسے زکوٰۃ اور مقررہ صدقات۔

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ مانگنے والے کا بھی اور نہ مانگنے والے کا بھی یعنی اس شخص کا بھی جو سوال کرے اور اس شخص کا بھی جو سوال نہ کرنے کی وجہ سے اکثر محروم رہتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ کیونکہ اگر یوم جزا کو واقعی طور پر کوئی سچ جانتا اور صحیح مانتا ہو تو پھر دکھ میں بے صبر نہ ہوگا بلکہ بامید ثواب صبر رکھے گا اور سکھ میں ناشکرا نہ ہوگا (معلوم ہوا کہ صبر و شکر کی جڑ یوم جزا کی تصدیق ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ یعنی ان کو عذاب سے ڈر اپنی جان کے لئے لگا رہتا ہے بیم و امید تصدیق و ایمان کا تقاضا ہے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ اللہ کا عذاب بے خطر چیز نہیں کیونکہ اس کو روکنے اور دفع کرنے کی کسی میں قدرت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ (الفروج جمع ہے) الفرج مفرد ہے اس کا معنی ہے مرد یا عورت کی شرم گاہ حفاظت شرم گاہ سے مراد ہے خواہش نفس کے موافق (مطلق العنانی کے ساتھ) استعمال نہ کرنا۔

اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ یعنی اپنی شرمگاہوں کو اپنی بیویوں کے علاوہ سب سے بچائے رکھتے ہیں یہ استثناء مفرغ ہے (لیکن استثناء مفرغ تو کلام منفی میں ہوتا ہے اور یہ کلام مثبت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر یہ کلام مثبت ہے حقیقت میں منفی

(گذشتہ سے پیوستہ) خاتمہ ہو سکا بات حقیقت میں یہی ہے کہ جب کسی چیز کی ترقی نقطہ عروج تک ہو جاتی ہے تو فطرت کا تقاضا ہے اور تقدیر خداوندی ہے کہ پھر وہ چیز پستی کی طرف مائل ہو ہر حرکت کی انتہا سکون پر اور ہر سکون کا اختتام حرکت سے ہوتا ہے رات کی تہ بر تہ تاریکی نور کا پیش خیمہ اور سورج کا انتہائی عروج زوال کا مقدمہ ہوتا ہے خیر و شر کا بھی تسلسل فطری ہے خیر کا آخری درجہ مبدء شر اور شر کا انتہائی نقطہ مقدمہ خیر ہے تعلیم و تربیت کا مقصود محض اعانت فطرت ہے خیر کو آخری نقطہ تک پہنچاتا ہے شر کو روئے زمین سے قطعاً محو کر دینا مقصود نہیں ہے نہ یہ ممکن ہے کہ کفر کی تاریکی اور گناہ ہونے کی ظلمت کو بالکل ختم کر دیا جائے اصل غرض نصرت خیر اور ہزیمت شر میں مدد کرنی ہے فطرت کو بدلنا مقصود نہیں نہ سرشت کی تبدیلی کا امکان ہے بھیڑیا آدمی نہیں ہو سکتا خواہ مسلم اول اسکو تعلیم دے۔ نہ آدمی بھیڑیا بن سکتا ہے خواہ سارے جہان کی طاغوتی طاقتیں بر سر اغواء آجائیں آدمی ماں کے پیٹ سے شقی یا سعید پیدا ہوتا ہے۔ سعادت و شقاوت فطری ہے مگر تعلیم و تربیت بھی مقتضائے فطرت ہے موجب سعادت و شقاوت نہیں محض سبب اور مددگار ہے۔

ہے) حفظ کے اندر نفی کا معنی ہے (یعنی وہ لوگ اپنی شرم گاہوں کو بیویوں کے علاوہ استعمال نہیں کرتے) عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ میں عَلٰی یا بمعنی مِنْ ہے اس وقت اسکا تعلق حَافِظُوْن سے ہوگا۔ جیسے احفظ علی عنان فرسی میں علی بمعنی من ہے۔
یا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ حال ہے اور عَلٰی (پر) اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی تمام احوال میں وہ اپنی شرمگاہوں کو بچائے رکھتے ہیں مگر حالت زوجیت وغیرہ میں نہیں بچاتے۔
اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ　(آدمی ذی عقل ہوتا ہے خواہ آزاد ہو یا غلام اور ذی عقل کے لئے عربی میں من آتا ہے ما نہیں آتا لیکن یہاں ما آیا ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر کی (دنیوی) سزا دینے کے لئے شریعت نے باندی غلام کو جانور قرار دیا ہے اسی لئے ان کی خرید و فروخت اور ان سے خدمت لینی جائز رکھی ہے۔
آیت میں مملوک سے مراد باندیاں ہیں غلام مراد نہیں ہیں اغلام غلام کے ساتھ بھی جائز نہیں ہم سورۂ بقر میں آیت وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى کی تفسیر کے ذیل لواطت کی حرمت قیاس اور احادیث سے ثابت کر چکے ہیں۔
سوال : اس آیت میں لفظ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ عام ہے غلاموں کو بھی شامل ہے اور باندیوں کو بھی تو صراحت قرآنی پر حدیث یا قیاس کو کس طرح ترجیح دی جاسکتی ہے (اور جس چیز کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے اس کو حدیث یا قیاس سے کس طرح حرام بنایا جاسکتا ہے)
جواب : باتفاق علماء آیت کا حکم عام نہیں ہے حالت حیض اور ایام ظہار میں اپنی بیویوں سے بھی قربت جائز نہیں نہ اس باندی سے صحبت جائز ہے جس سے رشتہ رضاعت (دودھ کی شرکت) ہو اس صورت میں اخبار آحاد اور قیاس سے تخصیص جائز ہے۔
کسی عورت کے لئے اپنے مملوک غلام سے قربت صنفی جائز نہیں کیونکہ لفظ عَلٰی بتا رہا ہے کہ مملوک مالک سے نیچے ہونا چاہئے اور یہ کہ مملوک کا مرتبہ مالک سے کم ہو اگر کوئی مالکہ غلام کو استعمال کرے گی تو یہ بات نہ ہوگی (فاعل منفعل سے اعلیٰ اور بالا ہوتا ہے) [1]
فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾　یہ مضمون استثناء کی علت کا بیان ہے بیوی اور باندی سے اپنی شرمگاہ کو محفوظ نہ رکھنا اور شرعی طور پر ان سے قربت کرنا بقاء نسل کی غرض سے جائز ہے۔
کلام کی رفتار بتا رہی ہے کہ اصل یہی ہے کہ مرد کی عورت سے صنفی قربت حرام ہے اس کا جواز چند شرائط سے وابستہ ہے۔ (مثلاً) نکاح ہو یا ملکیت۔ علاقہ جزئیت نہ ہو (یعنی نہ سلسلہ اولاد ہو نہ سلسلہ آباء و امہات) حیض و نفاس سے طہارت ہو۔ مقام تولید ہو (یعنی زنانہ شرمگاہ) مقام ناقابل تولید نہ ہو یعنی لواطت نہ کی جائے۔
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾　یعنی بیویوں اور باندیوں کے سوا (کسی اور سے یا غیر مقام میں) کرنے کے جو لوگ طلبگار ہوں گے وہی کامل طور پر حد (شرعی) سے تجاوز کرنے والے ہیں کیونکہ اللہ نے جو کچھ ان کے لئے حلال کیا تھا اس پر انہوں نے بس نہیں کیا بلکہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر کوئی شخص کسی (اجنبی) عورت کو دیکھ کر پسند کر لے تو اٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ بیوی کے پاس بھی ویسی ہی چیز ہے جیسی اس عورت کے پاس ہے۔ (دارمی بروایت حضرت ابن مسعودؓ)
مسئلہ : آیت دلالت کر رہی ہے کہ متعہ حرام ہے کیونکہ متعہ والی عورت زوجہ نہیں ہو جاتی جو لوگ متعہ کے حلال

---

[1] مصالح طبی اور عادت فطری کا تقاضا ہے کہ فاعل اعلیٰ اور بالا بقاء صحت۔ مردانہ اور زنانہ اعصاب کا ضعف سے بچاؤ فطرت حیوانی کا یہی دستور العمل ہے فحش پرست دشمنان صحت نے اپنی دماغی آوارگی اور نظری بے لگامی کے جو طریقے ہر ملک میں جاری کر رکھے ہیں ہر دانشمند شریف النفس انسان کی طبیعت ان کو قبول کرنے سے انکار کرتی اور معاشرت و سماج کے لئے تباہ کن سمجھتی ہے حضرت قاضی صاحبؒ نے دستور سماجی ضابطہ طبی اور شرافت اخلاقی کے زیر اثر فاعل کو اعلیٰ اور بالا قرار دیا ہے اور اسی پر دلالت آیت کی صراحت کی ہے۔

ہونے کے قائل ہیں وہ بھی متعہ کی وجہ سے استحقاق میراث کے قائل نہیں (اگر متعہ والی عورت بیوی ہو جاتی تو اس کو بیوی کی طرح میراث ہونی چاہئے تھی) بغوی نے اس آیت سے مشت زنی کی حرمت پر استدلال کیا ہے دوسرے علماء کا بھی یہی قول ہے (کہ مشت زنی حرام ہے) ابن جریج نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ مشت زنی مکروہ ہے عطاء نے یہ بھی فرمایا میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگوں کا حشر ایسی حالت میں ہوگا کہ ان کے ہاتھ حاملہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مشت زنی کرنے والے ہوں گے۔

سعید بن جبیر نے فرمایا ایک گروہ کو اللہ عذاب دے گا کیونکہ وہ اپنی شرمگاہوں سے کھیلتے ہوں گے میں کہتا ہوں اس سلسلہ میں حضرت انسؓ کی روایت کردہ ایک حدیث بھی آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ہاتھ سے نکاح کیا وہ ملعون ہے۔ ازوی نے یہ حدیث الضعفاء میں نقل کی ہے اور ابن جوزی نے اپنے مشہور جزئیہ میں حسن بن عرفہ کی اسناد سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ سات شخص ہیں جن کی طرف اللہ نظر (رحمت) نہ فرمائے گا ان میں سے ایک مشت زن کو قرار دیا ہے مگر اس روایت کی اسناد کمزور ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ یعنی وہ لوگ جو امانتوں کی حفاظت کرتے اور ان کے مالکوں کو پہنچادیتے ہیں کچھ امانتیں تو خدا اور بندہ کے درمیان ہیں جیسے نماز روزہ، غسل جنابت اور وہ تمام احکام جن کا تعلق محض حق اللہ سے ہے اور ان کو بجالانا واجب ہے ہر کمال وجود تمام لوازم حیات بیرونی اور اندرونی نعمتیں وغیرہ ان ساری چیزوں کے عطاء کی نسبت خدا کی طرف کرنی چاہئے یہ بات جاننا اور ماننا لازم ہے کہ یہ سب کچھ الٰہی عطیہ اور خداوندی امانت ہے جو عاریۃً اللہ نے ہم کو دی ہے ہم پیدائش کے وقت ایسے ہی تہی دست مفلس تھے جیسا ننگے کا کپڑا پہننے والا بذات خود برہنہ ہوتا ہے کپڑے کا مالک نہیں ہوتا بندہ کو یقین رکھنا چاہئے کہ بزرگی اور عظمت اللہ کا خصوصی لباس ہے کسی کے لئے جائز نہیں کہ اس لباس کی خدا سے کشائش کرے اگر نعمتیں مل جائیں تو (عنایت کا) شکر اور چھن جائیں تو صبر کرنا لازم ہے کچھ امانتیں بندوں کے آپس میں ہوتی ہیں جیسے ودیعت۔ سرمایہ (خواہ تجارتی ہو جیسے مضاربت اور ایجنسی میں ہوتا ہے یا بطور قرض ہو) اور عاریت (مستعار چیزیں) ان سب کی پوری ادائیگی انسان پر لازم ہے۔) دوسری شق ہے حفاظت عہد) یعنی اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں (عہد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بندوں نے ازل کے دن خدا سے کیا تھا اور اسکے علاوہ بھی بعض عہود الٰہیہ ہیں مثلاً اللہ نے اہل کتاب سے وعدہ لیا تھا کہ صفات رسول اللہ ﷺ کو کھول کر بیان کریں گے مخفی نہ رکھیں گے دوسری قسم انسانوں کے آپس کے وہ معاہدات ہیں جو باہمی معاملات اور معاشرت و سماج میں کئے جاتے ہیں ان سب کی نگہداشت واجب ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (عملی) منافق کی تین نشانیاں ہیں بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ اس حدیث کے وسط میں مسلم نے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں کہ خواہ روزہ نماز ادا کرتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعویدار بھی ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چار باتیں ہیں جس کے اندر یہ چاروں ہوں گی وہ (عملاً) خالص منافق ہوگا اور جس کے اندر ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی ایک بات رہے گی تاوقتیکہ اس کو ترک نہ کردے اگر اس کے پاس امانت رکھی جائے تو (اس میں) خیانت کرے بات کہے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جھگڑے کے وقت گالیاں بکے۔

ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے کہا حضور کے نبی ﷺ ہونے سے پہلے میں نے آپ سے کچھ خرید و فروخت کی آپ کو کچھ دینا میرے ذمہ باقی رہ گیا میں نے وعدہ کرلیا کہ (ابھی) اسی جگہ لاکر دیتا ہوں جانے کے بعد میں بھول گیا تین روز کے بعد وعدہ یاد ہوا اور میں لوٹ کر آیا تو دیکھا آپ اسی جگہ موجود ہیں (مجھے دیکھ کر) فرمایا تم نے مجھے دکھ دیا میں تین روز سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ۝ یعنی جو لوگ صداقت کے ساتھ شہادتیں ادا کرتے

ہیں نہ شہادت کو چھپاتے ہیں نہ بدلتے ہیں نہ اس سلسلے میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے سے ڈرتے ہیں خواہ شہادت کا تعلق محض حق خداوندی سے ہو جیسے شہادت توحید و رسالت اور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کے متعلق تورات کی شہادت کا اظہار اور رمضان کا چاند دیکھنے کی شہادت اور حدود خداوندی قائم کرنے کی شہادت وغیرہ یا حقوق عباد کے سلسلہ کی شہادت ہو جیسے باہمی لین دین وغیرہ کی شہادت پر شہادت میں عموم ہے کسی کے خلاف ہو خواہ اپنے اقرباء اور والدین بلکہ اپنی ذات ہی کے خلاف ہو۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ یعنی نماز کے اوقات ارکان سنن اور مستحبات کی نگہداشت کرتے ہیں کسی (ضروری رکن یا سنت یا وقت) کو فوت نہیں ہونے دیتے۔

نماز کا تذکرہ دو جگہ آیا ہے شروع میں اور (یہاں) آخر میں اور دونوں جگہ تذکرہ کا طریقہ جدا جدا ہے تکرار ذکر بتا رہی ہے کہ دوسرے ارکان اسلام کے مقابلہ میں نماز کو اہمیت حاصل ہے۔

اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی مذکورہ بالا صفات کے حامل جنتوں میں عزت یافتہ ہوں گے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَا میں فاء سببی اور ماسوالیہ تنبیہ و زجر کے لئے ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ کافروں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جمع ہو کر کلام مبارک سنتی تھی مگر استہزاء اور تکذیب کرتی تھی ان کو تنبیہ کرنے کے لئے اس آیت کا نزول ہوا اور اللہ نے فرمایا کہ کیا وجہ یہ لوگ آپ کے پاس بیٹھتے آپ کو دیکھتے (اور کلام سنتے) ہیں مگر فائدہ حاصل نہیں کرتے۔

مُهْطِعِيْنَ یعنی آپ کی طرف نظریں اٹھائے گردنیں بڑھائے تیزی کے ساتھ جھپٹتے ہوئے آتے ہیں۔ (بغوی)

صاحب قاموس نے لکھا ہے ھَطَعَ ھطوعا وھطعاً تیزی کے ساتھ کسی طرف رخ کر کے ڈرتا ہوا اور اپنی نظر کو کسی چیز پر جمائے ہوئے آیا اور کسی رکاوٹ کی پرواہ نہ کی۔ (یعنی ھطع ثلاثی مجرد کو باب فتح سے قرار دیا گیا ہے اور اسکا مصدر ھطوع اور ھطع ہے)

اور اَھطَعَ (ثلاثی مزید باب افعال جس سے مُھْطِعِیْنَ اسم فاعل بصیغہ جمع ہے) کا معنی گردن بڑھائی سر اٹھایا۔

عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ عِزِیْنَ جمع ہے عزۃ کی الگ الگ ٹولے (صحاح جوہری) قاموس میں ہے عزۃ بروزن عدہ آدمیوں کا گروہ

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ کافروں کی نظر میں قیامت آنی محال تھی اور وہ کہتے تھے کہ بالفرض اگر آ بھی گئی تو جس طرح ہم دنیا میں افضل (مالدار اور راحت آگیں زندگیوں والے ہیں اسی طرح قیامت میں بھی ہم اعلیٰ اور بالا ہوں گے کافروں کے اس خیال کا رد مذکورہ آیت میں کر دیا ہمزہ انکاری ہے یعنی بغیر ایمان اور عمل صالح کے کیا ان کو جنت میں داخل ہونے کی امید ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔

كَلَّا بے حقیقت اور بیہودہ امید سے (اس لفظ کے ذریعہ) باز داشت کی گئی ہے یعنی ان کو ہرگز ایسا بیہودہ خیال نہ رکھنا چاہئے۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ یہاں تخلیق اول کا ذکر کر کے تخلیق دوئم (یعنی حشر) پر استدلال ہے استحالہ حشر کے دعوے کا ابطال اور بغیر ایمان کے جنت میں داخل ہونے کی امید منقطع کرنے کی وجہ کا بیان ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو گندے نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے بنایا ان میں سے کوئی چیز اعزاز کی خواستگار ہے نہ عالم قدس میں داخلہ کے شایاں اس لئے جو شخص ایمان اور طاعت سے اپنے نفس کی (تخلیقی) کمی کو پورا نہ کرلے گا اور اللہ کے پسندیدہ اوصاف سے آراستہ نہ ہو جائے گا وہ جنت میں داخلے کے قابل نہ ہوگا۔

بغوی نے اپنی سند سے بروایت حضرت بشر بن حجاش بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز اپنی ہتھیلی پر تھوک کر اس

پر انگلی رکھی اور فرمایا اللہ ارشاد فرماتا ہے اے آدم کے بچہ کیا تو مجھے عاجز بنا سکتا ہے حالانکہ میں نے تجھے ایسی (حقیر) چیز سے بنایا یہاں تک کہ میں نے تیری تخلیق درست اور ساخت ہموار کر دی اور تو دو چادریں پہن کر چلنے لگا پھر تو نے (کمائی کر کے) مال جمع کیا اور روک کر رکھا آخر جب جان ہنسلی کی ہڈی میں آکر چلنے لگی تو اس وقت تو نے کہا (موت اور خدا کی ہمہ گیر قدرت) حق ہے اب حق (کے اقرار) کا وقت کہاں رہا یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس غرض سے تم کو پیدا کیا گیا ہے اس کو تم جانتے ہو اللہ نے خود فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ جن وانس کو ہم نے محض اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے لہٰذا جو شخص علم و عمل سے اپنے نفس کی تکمیل نہ کر پایا ہو وہ اہل کمال کے مراتب تک پہنچنے کی طمع کیسے رکھ سکتا ہے۔

فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ الْمَشَارِق اور الْمَغَارِب سے مراد ہیں ستاروں کے طلوع و غروب کے مقامات یا روزانہ چاند و سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے مقامات۔

إِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى أَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ یعنی ہم کو قدرت حاصل ہے کہ ان کو فنا کر کے ان سے بہتر مخلوق پیدا کر دیں یا اس بات پر قادر ہیں کہ محمد کی بات ماننے کے لئے تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو تم سے بہتر ہوں یعنی انصار۔

وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ یعنی اگر ہم ان کو ہلاک کرنا چاہیں تو کوئی ہم پر غالب نہیں آسکتا۔ لفظ رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ فرما کر اس پر استدلال فرمایا ہے کہ آسمانوں کی اور کائنات سماوی کی تخلیق پر اور سیاروں ستاروں کے روزانہ طلوع و غروب پر اللہ کو قدرت حاصل ہے اس لئے اللہ اس سے بھی عاجز نہیں ہو سکتا کہ ان کافروں کو ہلاک کر کے ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے جو ان سے بہتر ہوں۔

فَذَرْهُمْ یعنی جب آپ واقف ہیں کہ ہم ان کو ہلاک کر ڈالنے پر قابو رکھتے ہیں تو آپ ان کی پرواہ نہ کیجئے ہم ان کو ڈھیل دینا اور سخت ترین عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا کہ وہ اپنی دنیا میں گھستے اور کھیلتے رہیں۔

حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ اس روز تک جس میں عذاب ہونے کا ان کو خوف دلایا جا رہا ہے ڈھیل دو (وعید حشر سے مراد ہے وعید عذاب حشر کیونکہ قیامت کا دن مومنوں کے لئے وعید کا دن نہیں ہے)

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ یعنی جس طرح یہ بتوں کی طرف تیزی سے لپکتے ہیں کہ کون مورتی کو پہلے چھو لے اسی طرح قیامت کے دن قبروں سے نکل کر میدان حشر کی طرف یہ تیزی سے لپکیں گے تاکہ اپنے اعمال کے بدلہ کو دیکھ لیں۔ کلبی نے نُصُب کا ترجمہ علم کیا ہے یعنی جس طرح لشکری اپنے جھنڈوں کی طرف لپکتے ہیں اسی طرح یہ حشر کے دن محشر کی طرف لپکیں گے۔

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ نظریں نیچی ہوں گی ذلت ان پر چھائی ہوئی ہوگی۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

یہی وہ دن ہوگا جس کے عذاب کی وعید ان کو دنیا میں دی جاتی تھی اور وہ منکر تھے یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے یا از سر نو الگ جملہ ہے۔ واللہ اعلم۔

سورۂ نوح

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۸ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ آغاز کلام میں اِنَّ (تحقیقیہ) لانے سے واقعہ کی اہمیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے رسالت نوح کو صرف آپ کی قوم کے ساتھ مقید کرنا بتارہا ہے کہ آپ کی نبوت تمام آدمیوں کے لئے عمومی نہ تھی حضرت جابر کی روایت کردہ حدیث بھی اسی پر دلالت کررہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئیں ایک ماہ کی راہ کی مسافت سے میرا رعب (دشمنوں پر) ڈال کر میری مدد کی گئی تمام زمین کو میرے لئے مسجد اور طاہر قرار دیا گیا اس لئے میری امت کے کسی آدمی کو جہاں نماز کا وقت (تمام) آجائے وہیں پڑھ لے میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا مجھے شفاعت کا (حق) دیا گیا (گزشتہ) نبی خصوصیت کے ساتھ اپنی قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے تھے مجھے تمام لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث میں چھ خصوصیات کا ذکر ہے مگر شفاعت کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ ہیں کہ مجھے ساری مخلوق کے لئے بھیجا گیا ہے اور نبوت کو مجھ پر ختم کردیا گیا۔ (مسلم)

اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ ارسال کے اندر قول کا معنی پوشیدہ ہے (یہ کہنے کے لئے بھیجا) اس لئے اَنْ اَنْذِرْ قول مخفی کی تشریح ہے یہ بھی احتمال ہے کہ اَنْ مصدری ہو (اور قُلْنَا محذوف ہو) یعنی ہم نے نوح سے کہا کہ اپنی قوم کو عذاب سے ڈراؤ۔ اس جگہ اَنْ سے پہلے ب محذوف نہیں ہے یعنی تقدیر کلام بِاَنْ اَنْذِرْ قرار دینا غلط ہے اس سے کلام میں گڑبڑ پیدا ہوجائے گی کیونکہ یہاں (قَوْمَكَ میں) ضمیر خطاب ہے اور مذکورہ بالا فقرہ میں (قومہ) ضمیر غائب کے ساتھ ہے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱ یعنی اس سے پہلے کہ بصورت عدم ایمان دنیا میں ان پر طوفان کا عذاب اور آخرت میں دوزخ کا عذاب آئے تم اپنی قوم کو عذاب سے ڈراؤ۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ میں کھول کر بیان کرنے والا نذیر ہوں یعنی تم کو ڈراتا ہوں اور کھول کر بیان کرتا ہوں۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ کہ اللہ کی عبادت کرو اس سے تقویٰ رکھو کسی چیز کو (الوہیت اور عبادت میں) اس کا شریک نہ قرار دو۔

وَاَطِيْعُوْنِ ۝۳ اور توحید و طاعت الٰہی کی بابت جو کچھ میں حکم دے رہا ہوں اس کو مانو۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ایمان و اطاعت مغفرت کا سبب ہے اس لئے یہ جملہ امر مذکور کا جواب ہے یعنی اگر تم اطاعت کروگے تو اللہ تمہاری مغفرت کردے گا۔

حضرت عمروؓ بن عاص کا قول ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) دست مبارک پھیلایئے میں بیعت کرنی چاہتا ہوں حضور نے دلیاں ہاتھ پھیلا دیا مگر میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا فرمایا عمرو کیا بات ہے میں نے عرض کیا کچھ شرط رکھنی چاہتا ہوں۔ فرمایا شرط بیان کرو میں نے عرض کیا شرط بیعت یہ ہے کہ میرے گناہ بخش دیئے

جائیں فرمایا عمرو کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام گزشتہ گناہ ڈھا دیتا ہے اور ہجرت بھی پہلے گناہ گرا دیتی ہے اور حج بھی سابق کے گناہ ساقط کر دیتا ہے۔ (مسلم)

حضرت معاذؓ نے بیان کیا کہ میں (ایک سفر میں) رسول اللہ ﷺ کے پیچھے اونٹ پر سوار تھا۔ میرے اور حضور کے درمیان صرف کجاوہ کا پچھلا حصہ حائل تھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا معاذ کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا خدا پر کیا حق ہے میں نے عرض کیا اللہ اور اللہ کے رسول کو پورا علم ہے فرمایا اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور بندوں کا حق خدا پر یہ ہے کہ وہ غیر مشرک کو عذاب نہ دے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا لوگوں کو میں یہ خوشخبری نہ سنا دوں۔ فرمایا لوگوں کو یہ بشارت نہ دو ورنہ وہ (اسی پر) بھروسہ کر بیٹھیں گے (بخاری و مسلم) حضرت انسؓ سے بھی اسی قسم کا واقعہ منقول ہے حضرت معاذ نے (اخفاء حق کے) گناہ سے بچنے کے لئے مرنے کے وقت یہ حدیث بیان کی تھی۔ (مسلم و بخاری)

مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ　　مِنْ بیانیہ ہے (یعنی تمہارے گناہ بخش دے گا) یا تبعیضیہ ہے (یعنی تمہارے بعض گناہ معاف کر دے گا) مراد یہ ہے کہ اللہ وہ گناہ معاف کر دے گا جو محض حق خدا سے تعلق رکھتے ہیں (بندوں کے باہمی حق تلفیوں کو معاف نہیں کرے گا)

وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ　　یعنی ایمان واطاعت کی شرط پر اللہ تم کو معاف رکھے گا اور گناہوں کی سزا اس مدت تک تم کو نہ دے گا جو تمہارے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔

مسئلہ: قضاء کی دو قسمیں ہیں (۱) قضاء مبرم (قطعی ناقابل فسخ) (۲) معلق۔ معلق کی صورت مثلاً یہ ہے کہ اللہ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے کہ زید اگر اللہ کی اطاعت کرے گا تو اتنی مدت تک اس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے گا اور نافرمانی کرے گا تو اللہ اس پر طوفان مسلط کر دے گا۔

قضاء معلق کی تبدیل جائز ہے جب شرط مفقود ہو (تو حکم قضاء بھی نافذ نہ ہو گا) آیت يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ کا یہی مطلب ہے حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دعا کے سوا قضاء کو کوئی چیز نہیں لوٹاتی اور عمر میں زیادتی نیکی ہی سے ہوتی ہے (ترمذی) قضاء مبرم ناقابل تبدیل ہے آیت لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ سے یہی مراد ہے۔[1]

اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ　　اللہ کی مقرر کی ہوئی اجل جب مقررہ طریقہ سے آجاتی ہے تو اس کو ٹالا نہیں جا سکتا اس میں تاخیر کی جانی ممکن نہیں۔ مبرم میں تو کبھی تاخیر نہیں ہوتی اور معلق میں بھی اس وقت تاخیر ممکن

---

[1] قضاء مبرم اصلی اور حقیقی قضاء ہے قضاء معلق کو قضاء کہنا مجازاً ہے اس کا تعلق ارادہ انسانی سے ہے حقیقت میں یہ قضاء ہی نہیں ہے صرف معلق فیصلہ ہے ہاں فیصلہ کا جس شرط کے وقوع یا عدم وقوع سے تعلق ہے اس شرط کا واقع ہونا یا نہ واقع ہونا قضاء مبرم ہے مثلاً زید زہر کھائے گا تو ۲۴ گھنٹہ کے اندر مر جائے گا یہ قضاء معلق یا قضاء مشروط ہے لیکن زید کا زہر کھانا یا نہ کھانا مقدر ہو چکا ہے یہ تقدیر مبرم ہے تمام نتائج اور مسببات کی اسباب سے وابستگی اور اسباب و نتائج کی مسلسل زنجیر قضا معلق کی مظہر ہے دھوکہ کھا کر مادہ پرستوں نے انہی اسباب کو نتائج کا خالق اور موثر حقیقی سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ حقیقی ناقابل شکست وابستگی نہیں بلکہ اسباب ظاہرہ دوامی طور پر نتائج پیدا نہیں کرتے کبھی اسباب ظاہرہ موجود ہوتے ہیں اور نتیجہ مفقود ہوتا ہے ہاں ان اسباب کی حاکم اور حسب منشاء اثر انگیز اور نتیجہ آفریں بنانے والی قضا مبرم ہے عناصر کے جتنے طبعی خواص کہے جاتے ہیں ان کی حاکم قضاء مبرم ہے بیشک آگ کی خاصیت جلانا پانی کی خاصیت روانی اور ہوا کی خاصیت دوانی ہے۔ اور خالق کائنات نے ان کو یہ خصوصیات عطا کی ہیں لیکن یہ قضا مبرم نہیں قضاء معلق ہے جس میں تبدیلی ممکن ہے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ آگ نہ جلائے پانی رواں نہ ہو اور ہوا جامد ہو جائے انقلاب عنصری کے تو فلاسفر بھی قائل ہیں اور یہ تغیر ہے بھی بدیہی مگر اسلام قائل ہے کہ عناصر متاثرہ ہوں یا ان کی موثر طاقتیں ہوں قضا مبرم کے زیر حکم ہیں۔

نہیں جب اس کی شرط موجود ہو گئی ہو اس لئے اجل قطعی کے آنے سے پہلے مہلت اور فرصت کے اوقات میں طاعت کی طرف پیش قدمی کرنا لازم ہے ایسے گناہ نہ کرو جو موجب عذاب ہیں اور اجل معلق ان سے وابستہ ہے۔

سوال

اہل سنت کا مسلک ہے کہ اجل ایک ہے نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے یہاں تک کہ مقتول بھی اپنی اجل پر مرتا ہے رہی وہ حدیث جس میں نیکی کو زیادتی عمر کا سبب بتایا گیا ہے تو اس میں عمر کی زیادتی سے مراد ہے عمر کی برکت یعنی کثرت ثواب۔ اجل کی کمی بیشی کا قول تو معتزلہ فرقہ کے مذہب کے موافق ہے۔

جواب

معتزلہ تو تقدیر کے بالکل منکر ہیں قاتل کو مقتول کی موت کا خالق مانتے ہیں ہم نے قضاء کا مفہوم اہل سنت کے مسلک کے موافق بیان کیا ہے اہل سنت جو کہتے ہیں کہ اجل ایک ہے نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے اس سے مراد ہے قضاء مبرم جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتی مقتول اسی قضاء مبرم سے مرتا ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ لوح محفوظ میں مقتول کی موت حق ہو کہ اگر اس کو فلاں شخص قتل کر دے گا تو مر جائے گا ورنہ نہیں مرے گا لیکن لوح محفوظ میں قضاء مبرم کے طور پر یہ بھی درج ہو گا کہ فلاں وقت فلاں شخص فلاں شخص کو ضرور مار ڈالے گا اور اس کی زندگی کی کوئی شرط (سبب ذریعہ وغیرہ) باقی نہیں رہے گی۔ اس جواب کی تقدیر پر اس حدیث کی تاویل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو ابو خزامہ نے اپنے باپ کی وساطت سے بیان کی ہے ابو خزامہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم کچھ منتر دم کرتے ہیں اور دواء بھی کرتے ہیں اور دوسرے بچاؤ بھی اپنے لئے کرتے ہیں فرمایئے کہ کیا یہ فعل اللہ کی تقدیر کو کچھ بھی لوٹا سکتا ہے فرمایا یہ بھی تو اللہ ہی کی تقدیر سے ہے۔ (احمد ترمذی ابن ماجہ) یعنی اللہ نے مقدر کر دیا ہے کہ فلاں شخص علاج کرے گا تو اس کو شفا حاصل ہو گی۔

لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی اگر تم اہل علم ہو اور اپنے مصالح کو سمجھنے والے ہو (تو میری اطاعت کرو) اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ (قوم نوح کو اگرچہ مرنے میں کوئی شک نہ تھا لیکن) ان کا خواہشات نفسانی میں ڈوب جانا بتا رہا تھا کہ گویا ان کو مرنے میں شک ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت نوحؑ چالیس سال کی عمر میں پیغمبر ہوئے اور طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔ مقاتل نے وقت بعثت سو سال کی عمر بتائی ہے بعض نے پچاس برس اور بعض نے دو سو پچاس برس بھی کہا ہے حضرت نوحؑ کی عمر ایک ہزار چار سو پچاس برس ہوئی اور یہ بات تو نا قابل شک ہے کہ ساڑھے نو سو برس تک آپ قوم کو نصیحت کرتے رہے۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ قوم والے حضرت نوح کو اتنا مارتے تھے کہ اپنی دانست میں مردہ سمجھ کر نمدہ میں لپیٹ کر گھر میں ڈال آتے تھے لیکن آپ دوسرے روز پھر باہر تشریف لا کر لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ محمد بن اسحاق نے عبید بن عمر لیثی کا قول نقل کیا ہے کہ لوگ حضرت نوح کو پکڑ کر اتنا گلا گھونٹتے تھے کہ آپ بیہوش ہو جاتے تھے لیکن جب ہوش آتا تو دعا کرتے الٰہی میری قوم کو بخش دے یہ ناواقف ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بار بار گناہوں میں منہمک رہے اور قوم کی طرف سے حضرت نوح پر تکلیفیں شدید ترین ہونے لگیں تو آپ آئندہ نسل کے انتظار میں رہے (کہ شاید ان کی نسل ہدایت یاب ہو جائے) مگر جو نسل آتی تھی وہ اگلوں سے زیادہ خبیث ہوتی تھی سلف خلف سے کہہ مرتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہے ہمارے باپ دادا کے ساتھ بھی رہا ہے اس طرح کوئی آپ کی بات نہیں مانتا تھا بالآخر حضرت نوحؑ نے اللہ سے شکایت کی اور عرض کیا۔

قَالَ یہاں کلام میں اختصار کیا گیا ہے پورا کلام یوں تھا کہ نوحؑ نے تبلیغ کی قوم نے تکذیب کی نوح علیہ السلام

برابر دعوت دیتے رہے مگر قوم انکار پر اڑی رہی آخر نوح نے کہا۔

رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝ یعنی ہمیشہ

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝ دعاء زیادت فرار کا سبب تھی اس لئے دعا کو فرار میں اضافہ کرنے والا قرار دیا یعنی میری دعوت نے ایمان و طاعت سے بھاگنے میں اور اضافہ کر دیا (گویا زیادہ کرنے کی دعوت کی طرف نسبت مجازی ہے حقیقی فاعل تو خدا ہے مگر دعوت سبب ہے اور سبب کو فاعل قرار دینا مجازا ہوتا ہے) جیسے آیت فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا اور زَادَتْهُمْ رِجْسًا میں اسناد مجازی ہے۔

وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ یعنی جب بھی میں نے ان کو ایمان کی دعوت دی کہ ایمان کے ذریعہ سے تو ان کو معاف فرمادے۔

جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ تو انہوں نے میری دعوت کو سننے سے کان بند کر لئے۔

وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ اور کپڑے لوڑھ لئے تاکہ آنکھوں سے بھی نہ دیکھیں۔

وَاَصَرُّوْا اور کفر و معصیت پر جمے رہے۔

وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ اور سخت مغرور بن گئے۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ جِهَارًا کا نصب مفعول مطلق ہونے کی بناء پر ہے کیونکہ دعوت کی (دو قسمیں ہیں علی الاعلان اور پوشیدہ طور پر) ایک قسم جہری دعوت بھی ہے یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے (اور وہ مصدر مفعول مطلق ہے) اور جِهَار اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی میں نے اعلانیہ دعوت دی یا جِهَارًا حال ہے اور بمعنی اسم فاعل ہے یعنی اعلان کے ساتھ میں نے ان کو بلایا۔

ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ لفظ ثُمَّ (تراخی کے لئے آتا ہے یعنی ثم کے بعد والا فعل قبل والے فعل سے کچھ دیر بعد کو ہوتا ہے)۔ کا اس جگہ استعمال دعوت کے مختلف طریقوں پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ سری دعوت سے جہری دعوت زیادہ سخت ہوتی ہے اور صرف سری یا صرف جہری سے سری اور جہری دعوتوں کا مجموعہ زیادہ سخت ہوتا ہے اس طرح دعوت کی ہر (ترتیبی) صورت اول صورت سے بعد کو آتی ہے۔

فَقُلْتُ یہ دعوت کا بیان ہے بغوی نے لکھا ہے کہ قوم نوح جب حضرت نوحؑ کی تکذیب مدت دراز تک کرتی رہی تو اللہ نے بارش روک دی اور چالیس برس تک پیدائش نسل بند کر دی اس طرح ان کے مال اور چوپائے تباہ ہو گئے اس وقت حضرت نوح نے فرمایا۔

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ کفر و معصیت سے توبہ کر کے پچھلے گناہوں پر نادم ہو کر اپنے رب سے گناہوں کی مغفرت کے طلب گار ہو کیونکہ۔

اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ وہ توبہ کرنے والوں کے گناہ بہت زیادہ معاف کر دینے والا ہے۔

يُّرْسِلِ السَّمَآءَ یعنی بارش

عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ مِدْرَارًا (بکثرت بارش والا) بِالسَّمَآءَ سے حال ہے یہ مذکر کی صفت بھی ہو سکتا ہے اور مونث کی بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار معصیت نزول بارش حصول نعمت اور عموماً دفع معصیت کا سبب ہے یا خصوصیت کے ساتھ صرف اس معصیت کے دفع کا سبب ہے جس میں مبتلا ہونے کی وجہ گناہوں کی نحوست ہو جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا حال تھا اور اسی کی تائید آیت مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ سے ہوتی ہے لیکن اگر نزول معیبت ترقی درجات کا سبب ہو تو ایسی مصیبت استغفار سے دفع نہیں ہوتی جیسے حضرت ایوب علیہ السلام اور بعض دوسرے انبیاء کی مصیبتیں تھیں۔

حضرت سعدؓ کی روایت ہے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ کڑی مصیبت انبیاء کی ہوتی ہے انبیاء کے بعد ان لوگوں کو جو باقی لوگوں سے افضل ہوں۔ پھر ان لوگوں کی جو بقیہ سے افضل ہوں آدمی کی آزمائش اس کے دین کے مرتبہ کے موافق ہوتی ہے اگر وہ دین میں پختہ ہے تو اس کی آزمائش بھی کڑی ہوتی ہے اور اگر اس کے دین میں کچھ کمزوری ہے تو درجہ دینی کے موافق اس کی آزمائش ہوتی ہے صرف عہد کرنے سے بلاء نہیں ٹلتی جب تک گناہ کو چھوڑ نہ دے اور گناہ سے پاک ہو کر زمین پر چلنے نہ لگے۔ (احمد، بخاری، ترمذی، ابن ماجہ)

بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں کسی ام المومنین کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں سب سے کڑی مصیبت والا نبی ہوتا ہے یا صفی (یعنی ولی) حاکم نے متدرک میں اور ابن ماجہ نے اور عبدالرزاق نے حضرت ابو سعیدؓ وغیرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جتنے تم عطیہ ملنے سے خوش ہوتے ہو انبیاء مصیبت پر اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بارش نہ ہونا ایک عمومی مصیبت ہے جو عمومی گناہوں کی نحوست سے ہی آتی ہے معصیت عوام کے بغیر اس مصیبت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اس صورت میں استغفار عمومی بارش کا سبب قرار پائے گا۔ استسقاء میں استغفار کی مشروعیت اسی وجہ سے ہے مطرفؒ نے شعبیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک بار حضرت عمر لوگوں کو لے کر دعا بارش کے لئے شہر سے باہر نکلے لیکن صرف استغفار کے بعد لوٹ آئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا (یعنی نماز نہیں پڑھی) عرض کیا گیا ہم نے سنا تھا کہ آپ بارش کی دعا کریں گے (مگر آپ نے صرف استغفار پر اکتفا کیا) فرمایا میں نے بارش کی دعا ان سرچشموں (یا راستوں) سے کی جن سے آسمان کی بارش ہوتی ہے اس کے بعد آپ نے آیت اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا تلاوت کی۔

وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ عطاء نے کہا یعنی تمہارے مال و اولاد کو وہ بہت کر دے گا۔

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ باغات (یعنی تکذیب سے پہلے جیسے تمہارے باغ سرسبز تھے ویسے ہی کر دے گا۔

وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ یعنی تکذیب نوح سے پہلے جیسے تمہارے دریا (رواں اور لبریز) تھے ویسے ہی کر دے گا۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ مَا استفہامیہ ہے وقار عظمت توقیر سے اسم مصدر ہے حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کے نزدیک رجاء کا معنی ہے اعتقاد یعنی تم اپنے اعتقاد میں اللہ کی عظمت نہیں جانتے۔ رجاء (امید) تو ادنیٰ ظن کے تابع ہوتی ہے (یعنی کسی بات کے ہونے کا ذرا سا بھی گمان غالب ہو جاتا ہے تو اس کی امید ہو جاتی ہے) لیکن یہاں اعتقاد کو رجاء فرمایا یہ محض کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے ہے (یعنی خدا کی عظمت تمہارے عقیدہ میں تو بہر حال نہیں ہے اور عقیدہ کیا تمہارے ظن میں بھی نہیں ہے) کلبی نے آیت کا معنی بیان کیا تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے گویا کلبیؒ کے نزدیک رجاء اس جگہ بمعنی خوف ہے حسن بصری نے آیت کی تفسیر اس طرح کی تم اللہ کا حق نہیں پہچانتے اور اس کی نعمت کا شکر نہیں کرتے ابن کیسانؒ نے کہا تم کو اپنی عبادت میں اس بات کی امید نہیں کہ ہم جو خدا کی تعظیم کرتے ہیں خدا اس کا ثواب بھی دے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنی عبادت میں تم کو اس امر کی امید نہیں ہے کہ خدا تمہاری عبادت کی قدر دانی اور تمہارا اکرام کرے گا۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ یعنی متعدد بار تمہاری تخلیق مختلف حالات میں ہوئی (اور ہوگی) پہلے تم عنصری تخلیق میں تھے پھر مرکب غذائی کی تخلیق میں آئے پھر نطفہ پھر خون بستہ پھر لوتھڑا پھر ہڈیاں اور گوشت بنا پھر ایک جدید تخلیق کی یعنی روح پھونک کر انسان بنایا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ پھر تم کو موت آئے گی پھر اللہ تم کو قبر (عالم برزخ) میں لے جائے گا۔ پھر لوٹا کر دوبارہ زندہ کر دے گا پھر فرماں بردار کو ثواب دے کر اس کی عزت افزائی کرے گا اور نافرمان کو سزا دے گا۔ یہ اللہ کی وہ تخلیقی نشانیاں تھیں جو ہر شخص کی شخصیت سے تعلق رکھتی ہیں اس کے بعد آفاقی نشانیاں بیان کیں اور فرمایا۔

اَلَمْ تَرَوْا　　استفہام حقیقی نہیں مجازی بمعنی تعجب ہے۔

كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝　　طِبَاقًا یعنی ایک کے اوپر دوسرا اور دوسرے پر تیسرا وغیرہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور پہلے ذکر بھی ہو چکا ہے کہ ہر بالائی اور زیرین آسمان کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے۔

وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا　　تمام آسمانوں میں تو چاند نہیں ہے اس لئے فِیْهِنَّ کا معنی ہے رفی بَعْضِهِنَّ یعنی دنیا والے آسمان میں اللہ نے چاند پیدا کیا جیسے روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنی نجار کے گھروں میں (سب سے اول مدینہ میں رونق افروز ہونے کے وقت) اترے تھے یعنی بنی نجار کے مکانوں میں سے کسی ایک مکان میں بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا کہ چاند سورج کے رخ آسمانوں کی طرف ہیں اور ان کا نور آسمانوں میں ہی ہے لیکن ان کی (انعکاسی) کرنیں زمین کی طرف آتی ہیں حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔

وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝　　یعنی سورج کو چراغ کی طرح بنایا جس طرح چراغ کی روشنی سے ماحول کی تاریکی جاتی رہتی ہے اسی طرح سورج کی روشنی سے سامنے کا اندھیرا دور ہو جاتا ہے۔

شبہ

چراغ کی روشنی سورج کی روشنی سے کم ہوتی ہے پھر اعلی کو ادنی سے تشبیہ کیوں دی گئی۔

ازالہ

سننے والوں کے سامنے چراغ کے علاوہ کوئی روشن چیز ایسی نہیں کہ سورج کو اس سے تشبیہ دی جائے ان کے سامنے تو چراغ ہی ہے اس لئے چراغ سے تمثیل دی گئی۔

ایک آیت میں چاند کو نور قرار دیا اور دوسری آیت میں سورج کو چراغ شاید اس سے اس جانب اشارہ مقصود ہو کہ چاند کی روشنی سورج سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ نور چراغ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ　　اللہ نے تم کو اگایا ضمیر پر اکتفا کی بجائے (لفظ اللہ) اسم ظاہر ذکر فرمایا کیونکہ محبوب کا نام لذت آفریں ہوتا ہے۔ اگانے سے مراد ہے پیدا کرنا روئیدگی کا لفظ پیدائش کے لفظ سے زیادہ حدوث کے مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے اس لئے اَنْشَأَكُمْ کی بجائے اَنْۢبَتَكُمْ فرمایا۔

مِّنَ الْاَرْضِ　　زمین سے پیدا کیا یعنی آدم کو مٹی سے بنایا یا یہ کہ تم کو نطفہ سے پیدا کیا اور نطفہ کو غذا سے اور غذا زمین سے پیدا ہوتی ہے۔

نَبَاتًا ۝　　مصدر یا اسم مصدر ہے یا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے بطور دلالت التزامی فعل محذوف سمجھ میں آتا ہے اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا اور تم پیدا ہو گئے۔

ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا　　یعنی موت کے بعد تم کو قبروں میں لوٹا دے گا۔

وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝　　اور پھر تم کو قبروں سے نکالے گا یعنی تمہارا یقینی حشر کرے گا۔ اِخْرَاجًا مفعول مطلق تاکیدی ہے پہلے۔ اَنْۢبَتَكُمْ کی تاکید نَبَاتًا سے کی تھی یہاں يُخْرِجُكُمْ کی تاکید کے لئے اِخْرَاجًا فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تخلیق اول کی طرح حشر بھی یقینی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝　　زمین کو تمہارے لئے بستر بنایا تم اس پر لوٹتے ہو۔

لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝　　کشادہ راستے فِجَاجٌ فَجٌّ کی جمع ہے۔ مِنْهَا میں مِنْ لانے کی وجہ یہ ہے کہ

ع ۱

تَسْلُكُوْا کے اندر اتخاذ کا معنی پوشیدہ ہے یعنی تاکہ تم زمین سے کشادہ راستے اپنے چلنے کے لئے بنالو۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ یعنی میں نے ان کو جو حکم دیا وہ انہوں نے نہیں مانا۔ یہ جملہ گزشتہ آیت قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا کی معنوی تاکید ہے دونوں جملوں کا حاصل ایک ہی ہے دعوت سے بھاگنا کان بند کرلینا اور آنکھوں کو چھپالینا عین نافرمانی ہے یا کم از کم نافرمانی کا تقاضا ہے۔ لفظ قال کو مکرر لانے کی وجہ یہ ہے کہ اول قول کا ذکر اداء فرض تبلیغ کے بیان کے لئے تھا اور اس جگہ لفظ قال بد دعا کی تمہید ہے۔

وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ یعنی نچلے طبقہ نے اپنے ان سرداروں کا اتباع کیا جو اپنے مال پر مغرور اور کثرت اولاد پر نازاں ہیں اور مال و اولاد نے ان کی تباہی میں مزید اضافہ کر دیا ہے آخرت میں ان کا خسران اسی وجہ سے زیادہ ہو گا۔

وَمَكَرُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ پر اس کا عطف ہے مَنْ لفظاً مفرد ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جمع ہے یا اِتَّبَعُوْا پر عطف ہے۔

مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ کبارا صیغہ مبالغہ ہے کبیر سے بنا ہے بہت بامکر۔ سرداروں کی طرف سے مکر یہ تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت نوحؑ کو دکھ پہنچانے اور کفر کرنے پر ابھارتے تھے اور نچلے طبقہ کا مکر یہ تھا کہ وہ حضرت کو طرح طرح سے دکھ پہنچاتے تھے یہی ان کی تدبیر تھی جس کو مکر کہا گیا ہے۔

وَقَالُوْا یعنی انہوں نے آپس میں کہا۔

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ اپنے معبودوں کی پوجا ہرگز نہ چھوڑنا۔

وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ ان معبودوں کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ ان کے نام لئے ورنہ اٰلِهَتَكُمْ میں بطور عموم ان کا ذکر بھی آگیا تھا بغوی نے محمد بن کعب کا قول لکھا ہے کہ یہ تمام نام ان نیک لوگوں کے تھے جو حضرت نوح اور حضرت آدم کے درمیان گزرے تھے جب وہ مر گئے تو ان کی اتباع میں ان کے ساتھی ویسے ہی عبادت میں مشغول رہے جیسے پہلے تھے مگر ان کو عبادت کا ذریعہ بنالیا پھر شیطان نے ان کو بہکایا اور ترغیب دی کہ ان کی مورتیاں بنالیں۔ مورتیوں کے سامنے ہونے سے عبادت میں چستی پیدا ہو گی اور شوق بڑھے گا انہوں نے شیطانی اغواء کو مان لیا اور مورتیاں بنالیں پھر ان کے بعد دوسری نسل آئی تو شیطان نے ان سے کہا تمہارے باپ دادا ان مورتیوں کی پوجا کرتے تھے تم بھی کرو وہ بہکاوے میں آگئے مورتی پوجا کا آغاز اسی طرح ہو گیا پھر ان مورتیوں کے ہی مذکورہ بالا نام رکھ لئے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قوم نوح کے نیک لوگوں کے یہ اسماء تھے جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم سے کہا کہ جس جگہ یہ لوگ بیٹھتے تھے وہاں ان کے بت نصب کر دو اور وہی بتوں کے نام رکھ دو جو ان کے تھے لوگوں نے ایسا ہی کیا مگر کسی نے ان بتوں کی پوجا نہیں کی جب یہ طبقہ مر گیا تو بعد والوں نے ان کو معبود بنالیا حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ طوفان میں یہ مورتیاں ڈوب گئی تھیں اور مٹی کے اندر دب گئی تھیں مدت تک دفن رہیں آخر مکہ کے مشرکوں کے لئے شیطان نے ان کو برآمد کیا۔ یہ بھی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جو بت قوم نوح کے معبود تھے وہ آخر میں عرب میں آگئے۔ دومۃ الجندل میں وَدّ کی پرستش بنی کلب کرتے تھے سُواع بنی ہذیل کا بت تھا یغوث اول بنی مرہ کا بت تھا پھر مقام جرف میں بنی غطیف کا معبود ہو گیا اور سبا (واقع یمن) میں پہنچ گیا۔ یعوق بنی ہمدان کا بت تھا اور نسر حمیر کے قبیلہ میں خاندان ذی الکلاع کا۔

وَقَدْ اَضَلُّوْا یعنی بتوں نے یا قوم نوح کے سرداروں نے۔

كَثِیْرًا ۚ بہت لوگوں کو بھٹکا دیا بہکانے کی نسبت بتوں کی طرف مجازی ہے (بت گمراہی کا سبب ہیں گمراہ کرنے والے نہیں ہیں) ان کے ذریعہ سے شیطان نے گمراہ کیا تھا۔ جیسا آیت رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ میں گمراہ کرنے کی نسبت بتوں کی طرف مجازاً کی ہے۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ ظالمین سے مراد ہیں کافر۔

اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾ ضَلَال سے مراد ہے ہلاکت اور تباہی جیسے آیت اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ میں ضَلَال سے تباہی مراد ہے یاضلال سے مراد یہ ہے کہ مکر کی وجہ سے جو مقصد انہوں نے حاصل کرنا چاہا تھا اس کا راستہ ان کو نہیں ملا یا یہ مراد کہ وہ اپنے دنیوی منافع حاصل نہ کر سکے۔

مِمَّا خَطِیْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ مِمَّا میں مِنْ سببی اور ما زائد ہے جس کو تاکید اور اظہار عظمت کے لئے ذکر کیا گیا ہے (یعنی عظیم الشان گناہوں کی وجہ سے ہی) غرق کرنے سے مراد ہے طوفان میں غرق کرنا اور آگ سے مراد ہے عالم برزخ یعنی قبر کی آگ کیونکہ قبر یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے کوئی گڑھا۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوح عالم برزخ میں عذاب قبر میں مبتلا کر دی گئی کیونکہ فاء کا مفہوم ہے (فوراً) کسی فعل کا اول فعل کے بعد واقع ہو جانا اور اُدْخِلُوْا ماضی کا صیغہ ہے یعنی غرق کر دینے کے بعد فوراً ان کو آگ میں داخل کر دیا گیا۔

فرقہ معتزلہ اور دوسرے بدعتیوں کا اس سے اختلاف ہے۔ [1] انہوں نے اس آیت کی تاویل یہ کی ہے کہ آگ میں داخل کرنے اور پانی میں ڈبونے میں کچھ قابل اعتناء فرق نہیں تھا (گویا غرق کرنا ہی آگ میں داخل کرنا ہے) ڈوبنے کے بعد مستقبل میں آگ میں داخلہ یقینی ہے اسی لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا (گویا آگ میں داخلہ ہو چکا اور وہ جہنم میں پہنچ گئے) یا یہ کہ سبب کے بعد مسبب کا آنا لازم ہے اگرچہ اس وقت سبب (ڈبونا) موجود تھا مگر مسبب (یعنی جہنم میں داخلہ) یقینی تھا اس لئے مسبب کو سبب کے پیچھے بغیر تراخی اور تاخیر کے ذکر کر دیا۔

ہم کہتے ہیں یہ توجیہات مجازی ہیں اصل کلام میں حقیقت ہے خواہ مخواہ حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجاز کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں۔ اس کے علاوہ بے انتہا احادیث سے عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے اور اجماع سلف صالحین بھی اسی پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب بندہ کو قبر میں رکھ کر اس کے ساتھی لوٹ جاتے ہیں اور وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہوتا ہے تو دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور ایک فرشتہ محمد ﷺ کے متعلق پوچھتا ہے تو اس شخص کے متعلق کیا کہتا تھا اگر مردہ مومن ہے تو وہ جواب دیتا ہے میں شہادت دیتا تھا کہ یہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اس وقت مردہ سے کہا جاتا ہے اپنے آگ والے ٹھکانے کو دیکھ اللہ نے اس کے عوض تجھے جنت میں جگہ دیدی بندہ دونوں مقامات کو دیکھتا ہے لیکن اگر مردہ منافق یا کافر ہے تو اس سے وہی سوال کیا جاتا ہے اور وہ جواب میں کہتا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں جو بات لوگ کہتے تھے میں بھی کہہ دیتا تھا۔ اس جواب پر اس سے کہا جاتا ہے تو جانتا بھی نہ تھا اور تو نے پڑھا بھی نہ تھا پھر اس کو لوہے کے ہتھوڑوں سے ایسا مارا جاتا ہے کہ جن وانس کے علاوہ برابر والے (جانور وغیرہ) اس کی چیخیں سنتے ہیں۔ (بخاری ومسلم) حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو اور عذاب قبر سے اللہ کی پناہ نہ مانگی ہو۔ (بخاری ومسلم)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ آپ کی ڈاڑھی تر ہو جاتی کسی نے پوچھا حضرت آپ جنت دوزخ کے ذکر کے وقت تو نہیں روتے اور اس پر روتے ہیں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے اگر اس سے نجات پالی تو بعد والی (منزلیں) اس سے آسان ہیں اور اس سے نجات نہ ملی تو بعد کی منزلیں

[1] معتزلہ کہتے ہیں کہ جنت دوزخ کی تخلیق ابھی نہیں ہوئی لیکن آئندہ ضرور ہوگی مستقبل میں یقینی پیدا ہو جانے والی چیز کو بصورت ماضی ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کا یقینی الوقوع ہونا معلوم ہو جائے معتزلہ عذاب قبر کے بھی منکر ہیں ان کی نظر میں عذاب کی جگہ صرف دوزخ ہے۔ اشاعرہ عذاب قبر کے قائل ہیں تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صحیح احادیث میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غرق کرنے کے بعد فوراً قوم نوح کو آگ میں داخل کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ روز قیامت سے پہلے بغیر تفصیلی حساب کے دوزخ میں داخل ہونا خلاف روایت ہے اس لئے آگ سے دوزخ مراد نہیں ہو سکتی اس کے علاوہ بر قول معتزلہ دوزخ کی ابھی تخلیق ہی نہیں ہوئی اس میں داخل کئے جانے کا معنی یہ کیا ہو سکتا ہے لامحالہ آگ سے عذاب قبر ہی مراد ہوگا۔

اس سے سخت ہوں گی۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر کے اندر کافر پر ننانوے سانپ مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو قیامت بپا ہونے تک اس کو ڈستے اور کاٹتے رہیں گے اگر ایک سانپ زمین پر پھونک مار دے تو سبزہ پیدا نہ ہو۔ (دارمی و ترمذی) ترمذی میں ننانوے کی جگہ ستر ہے۔

آیت مذکورہ میں نَارًا کی تنوین عظمت نار کو ظاہر کر رہی ہے یا تنکیر کے لئے ہے یعنی جس آگ میں قوم نوح کو داخل کیا گیا وہ دوزخ کی آگ سے غیر تھی۔

فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ﴿٢٥﴾ جب مجموع کا مجموع سے مقابلہ ہوتا ہے تو ایک کے مقابل ایک کا ہونا ضروری ہے (مثلاً لوگوں نے کپڑے پہن لئے یعنی ہر ایک نے ایک کپڑا لیا اپنا کپڑا) یعنی کسی نے کسی کو اپنا مددگار نہ پایا۔ اس جملہ میں اس بات پر تعریض ہے کہ جن معبودوں کو انہوں نے پکڑ رکھا تھا وہ ان کی مدد نہ کر سکے۔

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ الارض میں لام عہدی ہے مخصوص زمین یعنی قوم کی زمین مطلب یہ ہے کہ اس قوم کو زمین پر نہ چھوڑ۔

مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ دَیَّارًا رہنے والا یہ نکرہ ہے جو فعل منفی کے بعد آیا ہے اس لئے مفید عموم ہے یعنی کسی رہنے والے کو نہ چھوڑ۔ دَیَّار کی اصل دیوار تھی جیسے سید کی اصل سیود ہے اگر یہ لفظ اصل میں دوار ہوتا تو ادغام کے بعد دوّار ہونا چاہیے۔

إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ یہ بد دعا کی وجہ ہے۔

يُضِلُّوا گمراہ کر دیں گے یعنی گمراہ کر دینا چاہیں گے[1]۔

عِبَادَكَ یعنی تیرے مومن بندوں کو (کافر تو گمراہ تھے ہی ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا)

وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ محمد بن کعب (قرظی) مقاتل اور ربیع کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نے یہ بد دعا اس وقت کی جب اللہ نے ہر مومن روح کو قوم نوح کے مردوں کی پشت اور عورتوں کے پیٹ سے پیدا کر دیا اور چالیس سال یا نوے سال تک تمام مردوں کا مادہ تولید خشک اور بے ثمر ہو گیا تو اللہ نے نوح کو خبر دی کہ آئندہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے اور ان کی اولاد بھی مومن نہ ہوگی۔ عذاب کے وقت کوئی بچہ نہ تھا کیونکہ اللہ نے فرمایا وَقَوْمَ نُوحٍ لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ قوم نوحؑ نے جب پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا اور ظاہر ہے کہ بچہ تکذیب کر نہیں سکتا (اگر بچہ کسی کی تکذیب کرے بھی تو نا قابل عذاب ہے) اسی سے استدلال کیا جاتا ہے کہ طوفان ساری زمین پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف قوم نوح کی زمین پر آیا تھا کیونکہ (مختلف ممالک کے رہنے والوں کا تو کوئی قصور نہ تھا اور نزول عذاب بغیر تکذیب کے ممکن نہیں)

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ حضرت نوح کے باپ کا نام لمک بن متوشلخ اور ماں کا نام سمجار بنت انوش تھا اور دونوں مومن تھے (پیغمبر کسی کافر کے لئے دعاء مغفرت نہیں کر سکتا)

وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ بیت سے مراد ہے گھر اور بقول ضحاک مسجد اور بعض کے نزدیک کشتی۔

مُؤْمِنًا اس قید کے لگانے سے ابلیس (دعاء مغفرت سے) خارج ہو گیا کشتی میں وہ بھی آگیا تھا مگر کافر تھا۔

وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ قیامت تک آنے والے تمام مومن مرد اور عورتیں اس میں داخل ہیں۔

وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ الظّٰلِمِیْنَ سے مراد ہیں کافر۔

إِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ یعنی ہلاکت۔ اللہ نے حضرت نوحؑ کی دعا قبول فرمائی اور اس قوم کے تمام کافر تباہ کر دیئے گئے۔

[1] اہل سنت کا قول ہے کہ گمراہ کرنے والا اور ہدایت دینے والا محض خدا ہے کوئی سوا خدا کے کسی کو نہ گمراہ کر سکتا ہے نہ ہدایت یاب کر سکتا ہے اور يُضِلُّوا کا لفظ بظاہر اس کے خلاف ہے اس لئے حضرت مفسر نے فرمایا کہ گمراہ کرنے سے مراد ہے گمراہ کرنے کا ارادہ کرنا۔

سورة الجن

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۸ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ نفرٌ تین سے دس تک کی جماعت۔ روایت میں آیا ہے کہ نصیبین کے نو جن تھے یا سات تھے جن دوسرے حیوانوں کی طرح جسم بھی رکھتے ہیں اور جان بھی ان کو انسانوں کی طرح عقل بھی حاصل ہے مگر انسانوں کی نظر سے چھپے ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان کو جن کہا جاتا ہے۔ جَنٌّ چھپانا جِنٌّ پوشیدہ) جن کو آگ سے بنایا گیا ہے جیسے آدم کو مٹی سے۔ آیت میں آیا ہے وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ جنات میں توالد و تناسل ہوتا ہے ان میں نر بھی ہوتے ہیں اور مادہ بھی ظاہر یہ ہے کہ شیاطین جنات ہی کی ایک قسم ہے۔ ملائکہ مذکر مونث (نر و مادہ) نہیں ہوتے جنات شیاطین اور ملائکہ کا وجود شرعاً ثابت ہے۔ فلسفی کسی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے (یونانی) فلاسفہ جن دس عقول کے قائل ہیں وہ اسلامی ملائکہ نہیں ہیں۔[1] کیونکہ فلاسفہ کی نظر میں عقول عشرہ غیر جسمانی ہیں اور اسلام جن ملائکہ کا قائل ہے ان کے جسم بھی ہیں اور روحیں بھی۔

آیت کی رفتار سے بطور اقتضاء ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنات کو نہیں دیکھا تھا کسی وقت حضور قرات

---

[1] مَلَائِكَة مَلَک کی جمع ہے مَلَک کا لفظ مَلاک سے بنا ہے یا اَلوکۃ سے مَلاک کا معنی ہے دار و مدار اور الوکۃ کا معنی ہے پیام رسانی شرعی منصوصات سے ثابت ہے کہ کائنات کے انتظام پر اللہ نے ملائکہ کو مقرر کر دیا ہے ملائکہ ارض اس زمین کا انتظام کرتے ہیں اور ملائکہ آسمان علویات سماویہ کا بارش کا ہر قطرہ ایک فرشتہ لے کر اترتا ہے گویا نظم کائنات کا مدار ملائکہ پر ہے مگر ملائکہ خود مختار نہیں اللہ کے زیر حکم ہیں کچھ ملائکہ حامل عرش ہیں اور کچھ تسبیح رکوع سجود تہلیل اور تکبیر میں غرق ہیں لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ذرہ کائنات کو حرکت یا سکون کا حکم اللہ کی طرف سے پہنچتا ہے کوئی ذرہ بھی بلا حکم حرکت نہیں کر سکتا نہ ساکن رہ سکتا ہے اور براہ راست حکم الٰہی کو برداشت کرنے کی قابلیت نہ ہر ذرہ میں ہے نہ ہر انسان میں اس لئے جو حکم خداوندی کسی ذرہ کو پہنچتا ہے یا انسان کو وہ فرشتہ کی وساطت سے ہوتا ہے الا ماشاء اللہ پس ملائکہ اللہ کا پیام اس کائنات کو پہنچانے والے بھی ہوئے۔ یہ اسلامی نظریہ ہے لیکن یونان کے دماغ زدہ فلسفی کہتے تھے کہ واجب تعالیٰ نے صرف عقل اول کو پیدا کیا یا نمودار کیا یا یوں کہو کہ ارادہ الٰہیہ کو عقل اول کے اظہار میں بھی کوئی دخل نہیں بلکہ شعاع اول کی طرح ذات واجب سے عقل اول نمودار ہوئی جو مادہ سے مجرد تھی مگر ذات کے اعتبار سے واجب کی محتاج تھی اسی لئے اس کو ممکن کہا جاتا ہے پس واجب سے عقل اول نمودار ہوئی اور عقل اول سے عقل دوئم اور فلک اول کا ظہور ہوا پھر عقل دوم سے عقل سوئم اور فلک دوئم کا ظہور ہوا اور اسی طرح ترتیب وار نویں عقل سے دسویں عقل اور نویں آسمان کی پیدائش ہوئی اور آخر میں دسویں عقل (جس کو مبدء فیاض اور عقل فعال بھی کہا جاتا ہے) نے عالم اجسام عنصریہ بنایا۔ فلاسفہ کی نظر میں ہر جسم مادی ہوتا ہے اور مادہ کی دو قسمیں ہیں فلکی اور عنصری لہٰذا افلاک بھی مادی ہیں اور عناصر بھی اور عناصر کے مرکبات بھی۔ مگر عقول غیر مادی ہیں نہ ان کا مادہ فلکی ہے نہ عنصری اس لئے غیر جسمانی ہیں لیکن اہل اسلام کی نظر میں مادہ کا حصر صرف فلکی اور عنصری میں نہیں بلکہ مادہ نوری بھی ہوتا ہے اور نور بذات خود بے رنگ اور بے شکل ہوتا ہے مگر مختلف الوان اشکال کو قبول کر سکتا ہے فرشتوں کی تخلیق اسی نوری مادہ سے ہوئی اور ان کے اجسام نوری ہیں جو مختلف اشکال میں بدلتے رہتے ہیں۔ ہاں توالد و تناسل کے لئے جسم عنصری ہونا ضروری ہے اور فرشتوں کے اجسام عنصری نہیں اس لئے ان میں توالد و تناسل نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قرآن کر رہے تھے اتفاقاً جنات بھی آگئے اور انہوں نے قرأت سن لی۔ اس واقعہ کی اطلاع وحی کے ذریعے سے اللہ نے اپنے رسول کو دیدی اور قصہ بیان کر دیا۔ بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنات کے سامنے نہ قرآن پڑھا نہ ان کو دیکھا (بلکہ واقعہ یہ ہوا کہ بازار عکاظ کو جانے کے ارادہ سے صحابہؓ کے ساتھ آپ (مکہ سے) چلے تھے اس وقت شیطانوں سے آسمان کی خبریں روک دی گئی تھیں اور (خبر لینے کے لئے آسمان کی طرف چڑھنے والے) شیطانوں کو انگاروں سے مارا جاتا تھا۔ جنات نے (آپس میں) کہا اس کی تو کوئی خاص وجہ ضرور ہے (کوئی نئی بات ضرور پیدا ہوئی ہے) مشرق مغرب میں جاکر دیکھو نئی بات کیا ہوئی ہے یہ طے کر کے جنات تلاش کرنے چل دیئے اور ایک گروہ تہامہ کی طرف بھی آگیا یہی گروہ رسول اللہ ﷺ کی طرف مڑ گیا آپ اس وقت نخلہ میں ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے جنات نے قرآن سنا تو متوجہ ہو کر سننے لگے اور بولے بخدا یہی تمہارے اور آسمانی خبروں کے درمیان رکاوٹ پیدا ہوئی ہے چنانچہ واپس جاکر اپنی قوم سے انہوں نے کہا قوم والو ہم نے عجیب قرآن سنا الخ۔

اسی قول کو اللہ نے آیت قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ الخ میں بیان فرمایا۔ اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ جب ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ تنہا طائف کو چل نکلے مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کے خلاف قبیلہ ثقیف سے کچھ امداد اور طاقت حاصل کریں محمد بن اسحاق نے بروایت یزید بن زیاد محمد بن کعب قرظی کا قول بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طائف میں پہنچ کر ثقیف کے کچھ لوگوں کے پاس جانے کا ارادہ کیا وہ لوگ بنی ثقیف کے سردار اور امراء تھے یہ تینوں عمیر کے بیٹے اور آپس میں بھائی بھائی تھے ان کے نام تھے عبد یالیل مسعود اور حبیب اس وقت ان کے پاس ایک قریش کی عورت بھی تھی جو قبیلہ بنی جمح کی شاخ میں سے تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس جاکر بیٹھے اور جس کام کے لئے ان کے پاس گئے تھے یعنی اسلام کے سلسلہ میں طلب امداد اور قوم والوں کے خلاف نصرت کی خواہش اس کے متعلق ان سے گفتگو کی ایک بولا اگر خدا نے تجھے پیغمبر بنایا ہو تو میں غلاف کعبہ کے کپڑے بنا کر پہنوں دوسرے نے کہا کیا اللہ کو تیرے سوا کوئی اور پیغمبر بنانے کے لئے نہیں ملا تیسرا کہنے لگا خدا کی قسم میں تجھ سے بات نہیں کروں گا جیسا تو کہہ رہا ہے اگر واقعی تو اللہ کا پیغمبر ہے تب تو تیرا مرتبہ میری طرف سے جواب دینے سے بہت بڑا ہے اور اگر تو خدا پر دروغ بندی کر رہا ہے تو تجھ سے کلام کرنا میرے لئے مناسب ہی نہیں ہے یہ جواب سن کر رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور قبیلہ ثقیف کی ہر بھلائی سے ناامید ہو گئے اور فرمایا جو کچھ تم نے سلوک کیا کیا لیکن اب میری طرف سے (اس درخواست کے) واقعہ کو ظاہر نہ کرنا۔ حضور پر نور ﷺ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس واقعہ کی اطلاع قوم والوں کو پہنچ جائے اور اس سے ان کی بے باکی اور بڑھ جائے ثقیف والوں نے اس بات کی بھی تعمیل نہیں کی بلکہ قبیلہ کے بے عقل لوگوں اور غلاموں کو بھڑکایا وہ حضور کو گالیاں دینے اور چیخنے لگے یہاں تک کہ عتبہ اور شیبہ کے باغ میں پناہ گیر ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس وقت باغ میں عتبہ اور شیبہ موجود تھے جن لوگوں نے حضور کا پیچھا کیا تھا وہ سب لوٹ گئے آپ انگور کے درختوں کے گھنے سایہ میں جاکر بیٹھ گئے ربیعہ اور شیبہ اس واقعہ کو دیکھ رہے تھے اور ثقیف کے احمقوں سے جو دکھ حضور نے پایا تھا وہ بھی ان کے سامنے ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ملاقات اس جمحی عورت سے بھی ہوئی تھی اور حضور نے اس سے فرمایا تھا۔ تیرے دیوروں (خسرالی رشتہ داروں) سے ہم کو کیسا دکھ پہنچا غرض اطمینان حاصل ہونے کے بعد آپ نے دعا کی الٰہی میں اپنی قوت کی کمزوری تدبیر کی کمی اور لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کا تجھ سے شکوہ کرتا ہوں تو ارحم الراحمین ہے تو کمزوروں کا رب ہے تو میرا بھی رب ہے تو مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے کیا کسی ایسے اجنبی کے سپرد کر رہا ہے جو میرے ساتھ ترش روئی سے پیش آتا ہے یا کسی دشمن کے سپرد کر رہا ہے جس کے ہاتھ میں تو نے میرے معاملات کر دیئے ہیں اگر مجھ پر تیرا غضب نہ ہو تو (ان مصائب کی) مجھے پرواہ نہیں لیکن تیری طرف سے میرے لئے عافیت کی تو بہت گنجائش ہے میں تیری ذات کے نور کی جس سے تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے ٹھیک ہونے کا اسی پر مدار ہے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کہیں تیرا غضب مجھ پر نازل ہو جائے یا تیری ناراضگی مجھ پر اتر پڑے جب تک تو ہی راضی نہ ہو جائے تیری ناراضگی اور تیری مدد کے بغیر نہ طاقت ہے نہ قوت۔

ربیعہ کے دونوں بیٹوں (یعنی شیبہ اور عتبہ) نے یہ حالت دیکھی تو ان کے جذبہ رحم میں حرکت پیدا ہوئی اپنے عیسائی غلام کو جس کا نام عداس تھا بلا کر کہا ایک رکابی میں انگور کا یہ خوشہ رکھ کر لے جا کر اس شخص کو کھانے کے لئے دیدے عداس نے حکم کی تعمیل کی اور انگور لا کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دیئے وہ رکھ چکا تو رسول اللہ ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانے لگے عداس چہرہ مبارک کی طرف دیکھتا رہا اور کہنے لگا اس شہر کے رہنے والے تو ایسی بات نہیں کہتے ہیں (یعنی بسم اللہ نہیں پڑھتے ہیں) حضور نے فرمایا تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا مذہب کیا ہے۔ عداس نے جواب دیا میں عیسائی ہوں اور نینوا کا باشندہ ہوں حضور نے فرمایا کیا مرد صالح یونس بن متی کی بستی کے رہنے والے ہو عداس نے کہا آپ یونس بن متی کو کیا جانیں حضور نے فرمایا وہ میرا بھائی تھا نبی تھا۔ میں بھی نبی ہوں یہ سن کر عداس جھک گیا اور حضور کے سر اور دست وپا مبارک کو چومنے لگا ادھر ربیعہ کے بیٹوں نے آپس میں کہا اس شخص نے تمہارے غلام کو بگاڑ دیا جب عداس واپس آیا تو شیبہ اور عتبہ نے اس سے کہا ارے عداس تجھے کیا ہو گیا تھا تو اس شخص کا سر اور ہاتھ پاؤں کیوں چوم رہا تھا عداس نے کہا میرے آقا اس شخص سے بہتر روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔ مجھے اس نے ایسی بات کی اطلاع دی جس کو سوائے نبی کے کوئی نہیں جانتا انہوں نے کہا ارے عداس کہیں یہ شخص تجھے تیرے مذہب سے نہ پھیر دے تیرا مذہب اس کے مذہب سے بہتر ہے غرض بنی ثقیف کے واقعہ سے ناامید ہو کر رسول اللہ ﷺ طائف سے مکہ لوٹے اثنائے راہ میں بمقام نخلہ وسط رات میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ نصیبین کے کچھ جن ادھر سے گزرے اور انہوں نے قرآن مجید سنا۔ جب حضور اکرم ﷺ نماز پڑھ چکے تو جنات نے واپس جا کر اپنی قوم کو اطلاع دی خود بھی ایمان لے آئے اور دعوت پر لبیک کہی اور قوم کو بھی جا کر ڈرلیا جنات کے اس واقعہ کا بیان آیات مذکورۃ الصدر میں اللہ نے کیا ہے۔

کتاب الصفوہ میں ابن جوزیؒ نے اپنی سند سے حضرت سہلؒ بن عبداللہ کا قول نقل کیا ہے سہل نے بیان کیا میں اطراف وزاعا میں تھا وہاں میں نے ایک شہر سنگین دیکھا (یعنی سنگستان کے اندر آبادی تھی۔ پتھروں کو کھود کر ان میں مکان تراش لئے تھے) شہر کے وسط میں پتھر کا ایک محل تھا جہاں جنات رہتے تھے محل میں ایک گراں ڈیل بوڑھا آدمی کعبہ کی طرف منہ کئے نماز پڑھ رہا تھا لیکن جو اونی جبہ وہ پہنے تھا وہ بالکل نیا تھا مجھے اس کے گراں ڈیل ہونے سے اتنا تعجب نہیں ہوا جتنا جبہ کی صفائی کو دیکھ کر ہوا میں نے اس کو سلام کیا اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا سہل بدنی استعمال سے کپڑے پرانے نہیں ہوتے۔ کپڑوں کو بوسیدہ کرنے والی چیز گناہوں کی بدبو اور حرام غذا ہے یہ جبہ سات سو برس سے میں پہنے ہیں اسی کو پہنے ہوئے میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کی تھی اور دونوں پر ایمان لایا تھا میں نے کہا آپ کون ہیں اس نے جواب دیا میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے سلسلے میں آیت قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ نازل ہوئی تھی۔

ایک گروہ (علماء) کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ جنات کو اسلام کی دعوت دیں اور اللہ کے عذاب سے ڈرائیں اور ان کو قرآن سنائیں چنانچہ نینوا سے جنات کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجی گئی جب وہ جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں سے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آج رات کو جنات کو قرآن سناؤں تم میں سے کون میرے ساتھ چلے گا سب نے سن کر سر جھکا لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر ساتھ لے جانے کی خواہش کی تو عبداللہ بن مسعودؓ ساتھ ہو لئے حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ میرے سوا اور کوئی ساتھ نہیں گیا ہم چل دیئے بالاء مکہ میں پہنچ کر رسول اللہ ﷺ ایک گھاٹی میں داخل ہو گئے جس کا نام شعب الحجون تھا اور میرے گرداگرد ایک لکیر (حصار) کھینچ کر حکم دیا کہ اس کے اندر بیٹھے رہنا جب تک میں نہ بلاؤں باہر نہ نکلنا یہ حکم دے کر چل دیئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کر دیا میں نے دیکھا کہ گدھوں کی طرح کچھ (جانور) تیزی کے ساتھ اترتے آرہے ہیں اسی کے ساتھ مجھے سخت شور غل بھی سنائی دیا مجھے حضور ﷺ کے متعلق فکر ہوئی پھر بکثرت پرچھائیاں حضور اکرم ﷺ کے آس پاس چھا گئیں اور حضور ﷺ سے میری آڑ ہو گئی کہ آپ کی آواز بھی مجھے سنائی نہ دیتی تھی کچھ دیر کے بعد بادل کے ٹکڑوں کی طرح ٹکڑیاں بنا کر جانا شروع ہو گئے اور فجر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ فارغ ہو کر

میرے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا کیا تم سوئے میں نے عرض کیا نہیں یارسول اللہ ﷺ خدا کی قسم (میں نہیں سویا) کئی مرتبہ میرا ارادہ ہوا کہ لوگوں کو مدد کے لئے پکاروں مگر لاٹھی کھٹکھٹا کر میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا بیٹھ جاؤ (تو مجھے کچھ اطمینان ہوا) فرمایا اگر تم (حصار سے) باہر نکل آتے تو ڈر تھا کہ ان میں سے کوئی تم پر جھپٹا مار دیتا۔

پھر فرمایا تم نے کچھ دیکھا میں نے عرض کیا جی ہاں کچھ کالے رنگ کے آدمی سفید پوش دیکھے تھے فرمایا وہ نصیبین کے جنات تھے مجھ سے کھانے کی چیزیں مانگ رہے تھے میں نے ان کے لئے موٹی ہڈیاں اور گوبر اور مینگنیاں مقرر کردیں انہوں نے کہا ان کو تو آدمی گندہ کردیتے ہیں چنانچہ حضور نے ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے کی ممانعت فرمادی۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ان کو اس سے کیا ملے گا فرمایا کھانے کے وقت ان کو ہر ہڈی پر گوشت اور ہر گوبر میں وہ دانے ملیں گے جن کو کھا کر گوبر بنتا ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے سخت شوروغل سنائی دیا تھا فرمایا ایک جن کو قتل کردیا گیا تھا اس کے قتل کے سلسلہ میں ان کے باہم جھگڑا تھا ایک دوسرے کو قاتل قرار دے رہا تھا انہوں نے مجھ سے فیصلہ کی اپیل کی میں نے ان کا صحیح فیصلہ کردیا اس کے بعد قضاء حاجت کے لئے رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور کچھ دیر کے بعد آکر فرمایا کیا تمہارے ساتھ پانی ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ میرے ساتھ لوٹا تو ہے لیکن اس میں کچھ آب کھجور ہے حضور نے اسی کو طلب فرمالیا۔ میں نے حضور کے ہاتھوں پر آب کھجور ڈالا آپ نے وضو کیا اور فرمایا کھجوریں پاکیزہ اور پانی بالکل پاک۔

مسلم نے بروایت علیؒ بن محمد باسناد اسماعیل بن ابراہیم بحوالہ داؤدؒ عامر کا قول نقل کیا ہے عامر نے کہا کہ میں نے علقمہ سے دریافت کیا کہ لیلۃ الجن میں کیا حضرت ابن مسعودؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود تھے علقمہؒ نے کہا میں نے حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ حضرات میں سے کوئی لیلۃ الجن میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ ابن مسعود نے فرمایا ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمرکاب تھے ایک رات رسول اللہ ﷺ غائب ہوگئے کہ ہم نے وادیوں کے اندر اور گھاٹیوں میں جستجو کی مگر کہیں نہیں ملے ہم نے کہا کیا کوئی اڑا کر لے گیا یا کسی نے ناگہاں شہید کردیا۔ غرض وہ رات سب کے لئے بدترین رات گزری (آخر میں جب حضور تشریف لائے تو) فرمایا جنات کی طرف سے بلانے والا آیا تھا میں اس کے ساتھ گیا تھا اور جاکر ان کو قرآن سنایا پھر حضور ﷺ ہم کو ساتھ لے کر گئے اور جنات کے پسماندہ نشانات اور ان کی آگ کی علامات دکھائیں۔

شعبی کا قول ہے کہ وہ جنات جزیرہ کے تھے اور حضور سے انہوں نے کھانے کی چیز کے متعلق سوال کیا تھا حضور ﷺ نے ان سے فرمایا جس ہڈی پر بسم اللہ پڑھ لی گئی ہو اور تمہارے ہاتھ پڑ جائے یا اس پر کچھ گوشت لگا ہو یا چوپایوں کے چارہ کھانے کے بعد ان کی مینگنیاں ہوں (یعنی لید نہ ہو) وہ تمہارے لئے خوراک ہے اسی لئے سرکار نے ارشاد فرمایا تھا کہ ان دونوں چیزوں سے استنجانہ کیا کرو یہ تمہارے بھائی جنات کی خوراک ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے جاٹ قوم کے کچھ لوگوں کو دیکھ کر فرمایا یہ لیلۃ الجن والے جنات سے بہت زیادہ مشابہ ہیں میں کہتا ہوں کہ جب رسول اللہ ﷺ بازار عکاظ کے ارادہ سے جا رہے تھے اور طائف سے واپس ہوئے تھے اس وقت پہلی مرتبہ جنات نے قرآن سنا تھا اور آیت قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ میں اللہ نے اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے رہا لیلۃ الجن کا واقعہ جو حضرت ابن مسعودؓ نے بیان کیا ہے وہ اس کے بعد کا ہے۔

بغویؒ نے سورۂ احقاف کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کر کے بیان کیا کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ سے یہ مراد ہے کہ نخلہ میں جب جنات قرآن سن کر اپنی قوم کے پاس گئے اور ان کو تبلیغ کی تو ستر جنات کی ایک جماعت تبلیغی دعوت پر لبیک کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بطحاء میں آکر حضور سے ملی۔ حضور ﷺ پرنور نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا اور امرونہی فرمایا۔

خفاجی نے ذکر کیا ہے کہ جنات کی آمد چھ بار ہوئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت جن وانس سب کے لئے تھی مقاتل کا قول ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے کسی نبی کی بعثت جن وانس (دونوں کے لئے) نہیں ہوئی واللہ اعلم۔

فَقَالُوْٓا یعنی جنات کی جماعت جب لوٹ کر اپنی قوم کے پاس گئی تو اس نے کہا۔
اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱ کہ ہم نے نرالا قرآن سنا جو مخلوق کے کلام سے بالکل الگ ہے عَجَب مصدر ہے (قرآن عجیب ہے عَجَب نہیں) اس کو عجب کہنے سے یہ مراد ہے کہ قرآن بالکل نرالا ہے۔
یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ یہ قرآن کا وصف ہے اَلرُّشد سے مراد ہے حق وصواب یعنی توحید اور وہ احکام صحیحہ جو بتقاضاء عقل وبرہان ثابت ہیں۔
فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ یعنی ہم قرآن پر ایمان لے آئے۔
وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝۲ اب کبھی عبادت میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے کیونکہ اللہ نے اس کی ممانعت فرمادی ہے۔
وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا اَنَّهٗ میں ضمیر شان کی ہے یا رَبّ کی طرف لوٹتی ہے جَدُّ کے معنی ہیں بزرگی اور عظمت مجاہد عکرمہ اور قتادہ کا یہی قول ہے حضرت انسؓ کا قول ہے کان الرجل اذاقرء بقرہ وال عمران جدفینا یعنی جب کوئی آدمی سورۂ بقر اور آل عمران پڑھ لیتا ہے تو ہم میں اس کا مرتبہ بڑھ جاتا تھا۔ اس قول سے بھی تفسیر مجاہد کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن سدیؒ نے جَدُّ کا معنی امر اور حسنؒ نے غنا (بے نیازی) اور حضرت ابن عباسؓ نے قدرت اور ضحاکؒ نے فعل اور قرطبیؒ نے نعتیں اور اخفشؒ نے حکومت واقتدار بیان کیا ہے۔
جَدُّهٗ کی جگہ جَدُّ رَبِّنَا کہنے سے ربوبیت کا صراحتاً اظہار مقصود ہے کیونکہ ربوبیت الٰہی کا تقاضا ہے کہ اللہ کی عظمت وشان مربوب (مخلوق) سے بلند وبرتر ہو۔
مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝۳ یہ دوسری خبر ہے مگر پہلی خبر کی تاکید اور توضیح کی طرح ہے (پہلی خبر میں تھا کہ رب کی شان وعظمت برتر ہے اس آیت میں ہے کہ اس نے نہ بیوی اپنے لئے اختیار کی نہ اولاد) یعنی بیوی بچے ہونا مخلوق کے مناسب ہے اللہ کی شان اس سے بالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سن کر ان کو تنبیہ ہوگئی تھی کہ عبادت میں شرک کرنے اور اللہ کے بیوی بچے ہونے کا انکار عقیدہ سابقہ غلط تھا۔
وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا سَفِیۡہُ سے مراد ہے نادان اور بر قول قتادہ و مجاہد ابلیس اور بر قول بعض سرکش جنات۔
عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴ یعنی ایسی بات جو شان الٰہی سے بہت بعید ہے شَطَطْ کے معنی ہے فیصلہ کی کجی اور حق سے دوری یا مراد ہے حد سے آگے بڑھنا۔ قاموس میں ہے شط علیه فی حکم یعنی فیصلہ میں ظلم کیا یا فیصلہ میں کجی اختیار کی اور شط فی سعلة یعنی اندازہ مقررہ اور حد سے آگے بڑھ گیا اور حق سے دور ہو گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ نادان لوگ اللہ کے متعلق ایسی بات کہتے تھے جو غلط اور حق سے دور تھی یعنی اللہ کے بیوی بچے مانتے تھے۔
وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵ یعنی ہم پہلے خیال کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ پر دروغ بندی نہیں کر رہے ہیں (اور واقعی خدا کی بیوی بھی ہے اور اولاد بھی) حقیقت میں یہ بعض نادانوں کی پیروی کرنے کی ایک معذرت ہے کہ اس وقت ہمارا خیال ہی یہ تھا کہ یہ لوگ خدا کے متعلق غلط بات نہیں کہہ رہے ہیں۔ کَذِب (جھوٹ بولنا) بولنے کی ایک قسم ہے اس وقت کَذِب مصدر ہوگا یا جھوٹی بات اس وقت کَذِبًا مفعول ہوگا یا مفعول محذوف کی صفت یعنی قَوۡلًا کَذِبًا مجموعہ آیات کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم قرآن پر ایمان لے آئے یعنی قرآن کے ذریعہ سے ہم کو یقین ہو گیا کہ ہمارے نادانون کا قول غلط اور صداقت سے دور تھا اور ہمارا جو خیال تھا کہ جن (خدا کے متعلق) جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں یہ خیال باطل تھا۔

ایک شبہ

حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے جنات آسمان کی طرف جاکر پوشیدہ مقامات سے فرشتوں کا کلام اور ان کی تسبیح تہلیل کی آوازیں سنتے تھے پھر کیوں اپنی نوع کے احمقوں کی بات کو صحیح مانتے اور سچا جانتے تھے اور ملائکہ کا کلام سن کر بھی اللہ کی توحید پر یمان نہیں لاتے تھے (ملائکہ کا کلام سننا تو روزانہ کا معمول تھا) اور قرآن ایک مرتبہ سنا اور ایک بار سنتے ہی مان لیا (روزانہ کلام ملائکہ سننا ایمان آفریں نہ ہوا اور قرآن ایک بار سننا ایمان بخش ہو گیا اس کی کیا وجہ۔

ازالہ شبہ

ایمان ایک عطیہ الٰہیہ ہے عطاء خداوندی کے بغیر اس کا حصول ممکن نہیں۔ ہادی مطلق کی ہدایت ہی سے دل میں ایمانی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ وجدانی تاثر (ہر شخص کے لئے براہ راست ممکن نہیں) کسی ایسے ذریعہ کا محتاج ہے جس کے دو رخ ہوں ایک رخ باطنی معنوی دوسرا رخ ظاہری صوری۔ اول رخ کی مناسبت اور ربط اللہ سے ہو اور دوسرے رخ کی مناسبت مخلوق سے وہ اپنی استعداد قوی اور قابلیت کاملہ کی وجہ سے بارگاہ قدس سے فیضان قبول کرلے کیونکہ صفات الٰہیہ اس کی معنوی مربی اور مبدء تمیز ہیں پس اس کا معنوی رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے اور اسی جانب سے اس کا باطنی رخ نور چین ہوتا ہے اور چونکہ اس کا زیریں حصہ ظاہری رخ مخلوق کی طرف ہوتا ہے اور اس مرتبہ نزول میں بھی وہ کامل ہوتا ہے اس لئے مبدء اعلیٰ (بارگاہ الٰہیہ) سے وہ نور چینی کر کے زیریں (یعنی مخلوق کی جانب) نور پاشی کرتا ہے یہ گروہ انبیاء کا ہے جو اللہ اور مخلوق کے درمیان ذریعہ فیض پاشی ہے ملائکہ کو اللہ کے ساتھ معنوی مناسبت حاصل ہے (یعنی اپنی ذاتی نورانیت کی وجہ سے ذات الٰہی سے انکار ربط اور تعلق انبیاء کی طرح ہے) لیکن ان کے سارے کمالات صعودی ہیں (یعنی ان کا ایک ہی رخ ہے وہ خالص نورانیت ہیں) انبیاء کی طرح نزولی کمالات ان کو حاصل نہیں (یعنی ان کے اندر ظلمت جسمانی نہیں اس لئے جسمانیت کے کمال سے وہ بے بہرہ ہیں مادی مخلوق سے ان کو کوئی مناسبت اور مشابہت حاصل نہیں) یہی وجہ ہے کہ جنات باوجود ملائکہ کے کلام سننے کے ہدایت یاب نہ ہو سکے نہ ان کے اندر تاثر ایمانی پیدا ہوا بلکہ گمراہ بیوقوف جنات کے کلام سے متاثر ہوئے جنات کو جنات سے مناسبت تامہ حاصل تھی۔

سوال

نوحؑ، موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء (علیہم السلام) تو دونوں رخوں کے حامل تھے اللہ کے ساتھ بھی ان کا ربط کامل تھا اور مخلوق کے ساتھ بھی پوری مناسبت تھی۔ پھر جنات ان کی ہدایت سے متاثر کیوں نہیں ہوئے اور کیوں دوسرے انبیاء کی بعثت جنات کے لئے نہیں کی گئی۔

جواب

دوسرے انبیاءؑ کمال نزولی کے آخری درجہ پر فائز نہیں تھے اور سید الانبیاء نزولی اور عروجی تمام کمالات کے جامع تھے (آپ کا اعلیٰ رخ ملائکہ کی نورانیت سے زیادہ روشن اور اسفل رخ تمام خلقی کمالات کو حاوی تھا) تمام درجات عروج و نزول پر آپ ؐ فائز تھے اسی لئے آپ کی بعثت نہ صرف تمام انسانوں کے لئے بلکہ تمام جن و انس کے لئے ہوئی اور آپ کی ہدایت کی روشنی سے سارا جہان ہوش خرد سے جگمگا گیا ہاں جن کی عقل و بصیرت اور گوش ہوش پر مہر لگ چکی تھی اور جن کی چشم خرد غلاف پوش تھی ان کے اندر قبول حق کی صلاحیت ہی نہ تھی وہ ہدایت نبوت سے محروم رہے اللہ نے ان کو فطری ہدایت ہی نہ دی۔ جب فطری ہدایت ہی سے وہ بے بہرہ رہے تو پھر کس طرح کوئی ان کو ہدایت کر سکتا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔

شیخ اکبر نے فرمایا تھا کہ نوحؑ کی دعوت لوگوں نے نہیں مانی کیونکہ وہ دعوت فرقانی تھی (یعنی دعوت نوحؑ کو ان کے ساتھ

پوری مناسبت حاصل نہ تھی ان کی طبیعت اور نوح کی دعوت میں عدم مناسبت تھی نوح کو کمال تنزلی حاصل نہ تھا ان کے آئینہ نبوت کی پشت پر کمال تخلیقی کا پورا مصالحہ چسپاں نہ تھا اس لئے نور الٰہی اور وحی کی روشنی ان کے آئینہ پر جب پڑی تو پار ہو گئی اور منعکس ہو کر کافروں کے قلوب کو متاثر نہ کر سکی) اور محمد کی دعوت پر لوگوں نے لبیک کہی کیونکہ یہ دعوت قرآنی تھی (یعنی کمال اعلیٰ اور کمال ادنیٰ دونوں مقارن تھے آپ ﷺ کو خالق سے بھی مناسبت تامہ حاصل تھی اور مخلوق سے بھی ربط کامل تھا اعلیٰ کو ادنیٰ سے مربوط کرنا آپ جانتے تھے کمالات عروجی و نزولی دونوں حاصل تھے۔ آئینہ کا ایک رخ روشن تھا تو کامل روشن اور دوسرے رخ پر بشریت خلقیہ کا مصالحہ چسپاں تھا تو کامل طور پر چسپاں تھا بالائی رخ سے جو شعاعیں آئینہ نبوت پر پڑتی تھیں وہ آئینہ سے پار نہیں نکل سکتی تھیں بلکہ آئینہ قلب میں سموجاتی تھیں اور پھر الٹ کر دوسرے لوگوں کے قلوب پر پڑتی تھیں جس کی وجہ سے وہ بھی روشن ہو جاتے تھے گویا آپ کو کمال نبوت تو دوسرے انبیاء کی طرح حاصل تھا ہی اور وصف رسالت (شعاعوں کی عکس ریزی) میں آپ ﷺ سب پر فائق تھے آپ کو خالق اور مخلوق دونوں سے مقارنت کاملہ حاصل تھی اور مخلوق کو خالق کے مقارن بنانا اور دونوں کو مربوط کرنا بھی آتا تھا) [1]

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ابن منذر ابن ابی

[1] حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں جو انسان کو ظلوم وجہول فرمایا ہے یہ انسان کی تنقیص نہیں بلکہ وصف امتیازی ہے اس کی کامل توضیح کا تو یہ مقام نہیں ہم اس کی مختصر تشریح جو حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ کے اس جگہ کے بیان سے مناسبت رکھتی ہے بیان کرتے ہیں۔

ملائکہ خالص نور ہیں ان میں مادیت نام کو بھی نہیں۔ مادیت لوازم مادیت اور متعلقات مادیت سے پاک ہیں۔ وہ خالص روشنی ہیں جس کے اندر مطلق تاریکی نہیں اور محض علم ہیں یعنی ان کا علم وہبی ہے نادانی اور جہالت سے برتر ہیں یعنی ان کا علم اکتسابی نہیں نہ ترتیب مقدمات کا محتاج ہے نہ ان کے علم میں نظریت ہے نہ پردہ فکریت نور قدس کی شعاعیں ان پر پڑتی ہیں وہ ان کو روشن کر دیتی ہیں اور چونکہ وہ خود شفاف ہیں اس لئے علم خداوندی کی شعاعیں چھنکر پار ہو جاتی ہیں وہ نورانیت قدسیہ کو روک کر نہ اپنے اندر سمو سکتے ہیں نہ عکس پاشی کر کے دوسروں کو روشن کر سکتے ہیں نور قدسی ملائکہ کے اندر سے گزر کر خود بخود مادی مخلوق تک پہنچتا ہے گویا ملائکہ کا علم اضطراری ہے غیر اختیاری وہبی ہے۔ غیر اکتسابی۔ غیر فکری۔ غیر ارادی۔ کسی مادی مخلوق سے ان کی تخلیقی مناسبت نہیں اور تخلیقی مناسبت کے فقدان کی وجہ سے کوئی مخلوق ان سے نور چینی اور فیض اندوز نہیں ہو سکتی۔ انسان روحانی اور ادراکی قوت کے علاوہ مادی کثیف قوتوں کا بھی حامل ہے آئینہ بشریت ایک طرف سے نہایت شفاف اور ملائکہ کی طرح روشن ہے نور قدس اس پر جلوہ افگن ہوتا ہے تو اس کو جگمگا دیتا ہے لیکن اس کا دوسرا مادی رخ نہایت کثیف مادیت سے آلودہ تاریک (ظلوم) اور نادان (جہول) ہے اول رخ صعودی اور معنوی ہے دوسرا رخ نزولی اور صوری۔ اول رخ کے صاف ہونے کی وجہ سے وہ نور چین ہے فیض اندوز ہے ضیاء آگیں ہے لیکن مادیت کا پچھلا رخ چونکہ کثیف ہے اس لئے ملائکہ کی طرح اس کی خلقت میں شفافیت نہیں کہ آفتاب الوہیت کی کرنیں اس کے پار نکل جائیں اور رک نہ سکیں۔ یہ کثافت پشت ہی اس کے لئے باعث شرف اور وجہ فضیلت ہے اسی مادی تاریکی کی وجہ سے وہ نور بیز نہیں ہوتا بلکہ نور چین ہو کر نور اندوز بنتا اور انعکاسی شعاعوں سے دوسروں کو منور کرتا ہے پس جس انسان کے دونوں رخ کامل ہوں گے اس کو بارگاہ قدس سے معنوی مناسبت (یعنی نور چینی کی قابلیت) اور مادی مخلوق سے صوری مناسبت کامل طور پر ہو گی اور اس میں صلاحیت ہو گی کہ بالائی رخ سے امانت الٰہیہ (ہدایت اوامر نواہی معرفت) کو حاصل کر کے اپنے اوپر اٹھائے خود اپنی ذات کو روشن کرے اور پھر روشنی (یعنی معرفت اور پیام الٰہی) کو اپنے اندر سمو کر دوسروں پر عکس پاشی کرے اور دوسری مخلوق (جن وانس) اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھائے۔ بالائی رخ کی روشنی اور ضیاء چینی میں تو تمام انبیاء برابر ہیں مگر بشریت کاملہ کا تقاضا ہے کہ زیریں رخ بھی کامل ہو تاکہ نور معرفت وہدایت کو اپنے اندر سمو کر دوسروں پر عکس پاشی کی جا سکے رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاء کو یہ زیریں کمال حاصل نہ تھا اس لئے وہ نور پاشی کامل طور پر نہیں کر سکتے تھے ان کو کمال عروجی تو حاصل تھا مگر کمال نزولی پورا حاصل نہ تھا روحانیت تو کامل تھی مگر مادیت کامل نہ تھی گویا کمال نبوت تو حاصل تھا مگر مناسبت صوری میں نقص ہونے کی وجہ سے وصف رسالت کامل طور پر حاصل نہ تھا اسی لئے ان کی بعثت صرف اپنی قوم یا اپنے (باقی آئندہ صفحہ)

حاتم اور ابن ابی الشیخ نے کردم بن السائب انصاری کا قول نقل کیا ہے کردم نے کہا کہ میں اپنے باپ کے ساتھ کسی کام سے مدینہ کو جانے کے لئے نکلا (وادی میں پہنچ کر رات ہو گئی اور) رات گزارنے کے لئے بکریوں کے ایک چرواہے کے پاس ٹھہرنا پڑا آدھی رات ہوئی تو ایک بھیڑیا بکری کے بچہ کو اٹھا کر لے گیا چرواہا دوڑا اور پکارا اے وادی کے مالک یہ تیری پناہ میں تھا فوراً کسی منادی نے جو ہم کو نظر نہ آتا تھا پکارا بھیڑیے اس کو چھوڑ دے بکری کا بچہ فوراً دوڑتا ہوا آ گیا اور بکریوں میں داخل ہو گیا کہیں اس کے خراش بھی نہیں لگی تھی۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب شروع شروع رسول اللہ ﷺ کا ذکر سننے میں آیا تھا۔ اس پر اللہ نے اپنے رسول پر آیت وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ الخ نازل فرمائی۔

ابن سعدؒ نے بروایت ابور جاء عطاردی بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں، میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا اور ان کے ضروری کام پورے کرتا تھا جب حضور کی بعثت ہو گئی تو ہم بھاگ کر (اپنے قبیلے سے) نکلے اور ایک بیابان پر پہنچ کر ہم کو شام ہو گئی۔ ہمارے قبیلہ کے شیخ کا طریقہ تھا کہ اگر (سفر میں) کہیں اس طرح شام ہو جاتی (اور جنگل میں رات بسر کرنی پڑتی) تو وہ کہتا تھا ہم آج اس جنگل کے سردار جن کی پناہ پکڑتے ہیں۔ چنانچہ حسب معمول یہی الفاظ اس نے کہے (غیب سے) جواب دیا گیا اس پناہ کا راستہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار ہے (اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں) چنانچہ ہم واپس آکر اسلام میں داخل ہو گئے ابور جاء نے کہا میرے خیال میں آیت وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ میرے ہی ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی۔

جزاء سفی نے کتاب ہواتف الجن میں اپنی سند سے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ قبیلہ تمیم کا ایک شخص تھا جس کا نام تھا رافع بن عمیر اس نے اپنے آغاز اسلام کا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ ایک رات میں عالج کے ریگستان میں جا رہا تھا جب نیند سے بے قابو ہو گیا تو اونٹنی کو ٹھہرا کر اتر کر ایک جگہ پڑاؤ کیا اور سو گیا لیکن سونے سے پہلے میں نے کہا کہ اس وادی کے جن سردار کی میں پناہ پکڑتا ہوں۔ خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں چھوٹا نیزہ ہے اور وہ میری اونٹنی کے گلے میں بھالا مارنا چاہتا ہے میں گھبرا کر بیدار ہوا اور ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہیں آیا خیال کیا یہ بیہودہ خواب ہے۔ دوبارہ پھر غافل ہو کر سو گیا پھر بھی ایسا ہی خواب دیکھا اور بیدار ہو کر اونٹنی کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہ دیا البتہ اونٹنی لرز رہی تھی پھر سو گیا اور ویسا ہی خواب دیکھا۔ بیدار ہوا تو اونٹنی کو بے قرار پایا ادھر ادھر دیکھا تو خواب والے آدمی کی طرح ایک جوان ہاتھ میں چھوٹا نیزہ لئے نظر آیا اور ایک بوڑھا آدمی جوان کا ہاتھ پکڑے اونٹنی سے اس کو روک رہا تھا وہ دونوں اسی کشاکش میں تھے کہ تین نیل گائے نمودار ہوئیں بوڑھے نے جوان سے کہا اٹھ اور اس پناہ گیر آدمی کی اونٹنی کے عوض ان میں سے جس کو چاہے پکڑ لے وہ جوان اٹھا اور ایک بڑے نیل گائے کو پکڑ لیا اور واپس چلا گیا۔ میں نے بوڑھے کی طرف رخ کیا تو اس نے کہا اے شخص جب تو کسی وادی میں فروکش ہو اور وہاں تجھے کسی دہشت کا خطرہ ہو تو یوں کہا کر میں اس اللہ کی جو محمد کا رب ہے اس وادی کے خطرہ سے پناہ مانگتا ہوں کسی جن کی پناہ نہ مانگنا ان کا کام اب تباہ ہو گیا میں نے پوچھا یہ محمد کون ہیں بوڑھے نے کہا عرب کے رہنے والے ایک نبی ہیں نہ مشرقی ہیں نہ مغربی دوشنبہ کے دن ان کی بعثت ہوئی ہے میں نے پوچھا ان کا مقام سکونت کہاں ہے۔ اس نے کہا نخلستان والا یثرب جب صبح چمکی تو میں اونٹنی پر سوار ہو کر تیز تیز چل کر مدینہ پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھتے ہی بغیر میرے ذکر کئے میری سرگزشت بیان فرما دی اور مجھے اسلام کی دعوت دی میں مسلمان ہو گیا۔

سعید بن جبیرؒ کہتے تھے ہم خیال کرتے تھے کہ یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق آیت وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ نازل ہوئی۔

فَزَادُوْهُمْ یعنی جب آدمیوں نے جنات کے سرداروں کی پناہ مانگی تو انہوں نے ان کے اندر گمراہی بڑھا دی۔

(گزشتہ سے پیوستہ) ملک کے لئے ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کو دونوں کمال حاصل تھے اس لئے آپ کی بعثت نہ صرف تمام انسانوں کے لئے ہوئی بلکہ جنات کے لئے بھی ہوئی۔

رَهَقًا ۙ　یعنی گناہ (ابن عباسؓ) یا سرکشی، مجاہدؒ یا گمراہی، مقاتلؒ یا شر حسنؒ بصری یا غرور ابراہیمؒ کیونکہ آدمیوں نے جب جنات کی پناہ پکڑی تو ان کے اندر غرور بڑھ گیا وہ کہنے لگے کہ اب ہم جنات کے بھی سردار ہو گئے اور انسانوں کے بھی۔ یا یہ مطلب ہے کہ جنات نے انسانوں کی گمراہی اس طرح بڑھادی کہ انسانوں کو گمراہ کیا۔ مجبورا آدمیوں نے (راہ طلبی کے لئے) جنات کی پناہ مانگی (اس سے مزید گمراہ ہو گئے) لغت میں۔ رَهَقٌ

کا معنی ہے کسی چیز پر چھاجانا (یا ارتکاب کرنا) اس جگہ ممنوعات اور گناہ مراد ہے۔

آیت مذکورہ میں جنات کی طرف سے اعتراف ہے کہ ہمارا عقیدہ پہلے غلط تھا۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ　یعنی اے گروہ جنات جیسے تمہارا خیال تھا کہ اللہ کسی کو دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ تمہارے اس خیال کی طرح آدمیوں کا بھی خیال تھا۔ اگر اِنَّهُمْ بکسر ہمزہ پڑھا جائے تو یہ جنات کا قول ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے عقیدہ آدمیوں کا بھی خراب تھا وہ بھی قیامت اور حشر کے قائل نہ تھے۔ لیکن نزول قرآن کے بعد وہ غیب پر ایمان لے آئے۔ لہٰذا تم بھی آدمیوں کی طرح حشر نشر پر ایمان لے آؤ۔ لیکن اگر اَنَّهُمْ بفتح ہمزہ پڑھا جائے تو حاصل مطلب یہ ہوگا کہ اے قریش مکہ تمہارے خیال کی طرح جنات کا بھی خیال تھا کہ حشر نشر نہیں ہوگا لیکن جب قرآن نازل ہوا اور جنات نے اس کو سنا تو قیامت کے قائل ہو گئے لہٰذا تم بھی قیامت پر ایمان لے آؤ جس طرح وہ ایمان لے آئے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ　یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد ہم نے سماء کو چھونا چاہا۔ بظاہر السماء سے مراد ابر ہے کیونکہ ہر بالائی چیز کو سماء کہہ دیا جاتا ہے اس تاویل پر حضرت عائشہؓ کی حدیث دلالت کر رہی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے خود حضور پر نور ﷺ سے سنا کہ ملائکہ عنان یعنی بادل میں اترتے ہیں اور کسی ایسے امر کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا فیصلہ آسمان پر ہو چکا ہوتا ہے شیطان چوری سے اس کو سن لیتے ہیں اور کاہنوں کے پاس پہنچ کر ان کو بتادیتے ہیں کاہن اس ایک بات میں اپنی طرف سے جھوٹ ملادیتے ہیں۔ بخاری

ایک شبہ

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ السماء سے حقیقی آسمان مراد ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب آسمان پر اللہ کسی بات کا حکم دیتا ہے تو عجز و انقیاد کے طور پر فرشتے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں (اور ایک گنگناہٹ پیدا ہوتی ہے) جیسے کسی پتھر کی چٹان پر زنجیر لگنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کلام ختم ہو جاتا ہے تو فرشتے باہم پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا دوسرے جواب دیتے ہیں جو کچھ فرمایا حق ہے اللہ بزرگ و برتر ہے اس بات کو چوری سے سننے والے سن لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے ہر اوپر والا نیچے والے کو پہنچادیتا ہے یہاں تک کہ سب سے آخر والا کاہن یا ساحر کی زبان پر اس بات کو ڈال دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ جھوٹ ملادیتا ہے۔ کبھی نیچے والے (شیطان) تک اس قول کو پہنچانے سے پہلے ہی انگارا بالائی شیطان کو آپکڑتا ہے (اور اس طرح راز محفوظ رہتا ہے) بخاری۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے کہ پروردگار جب کسی بات کا حکم جاری کرتا ہے تو عرش کو اٹھانے والے ملائکہ سبحان اللہ کہتے ہیں (غلغلۂ تسبیح بلند کرتے ہیں) پھر ان سے متصل آسمان والے سبحان اللہ کہتے ہیں یہاں تک کہ اس نچلے آسمان والوں تک تسبیح کی نوبت آتی ہے۔ عرش کو اٹھانے والے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا دوسرے بتاتے ہیں۔ اس طرح آسمانوں والے باہم پوچھتے اور جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بات اس آسمان تک پہنچ جاتی ہے اور شیطان کچھ چوری سے سن پاتے ہیں اور اپنے دوستوں (کاہنوں ساحروں) پر لاکر مار دیتے ہیں اب اگر وہ لوگ ویسا ہی بیان کر دیں جیسی وہ ہوتی ہے تو وہ بات ٹھیک ہوتی ہے لیکن وہ تو اس میں مبالغہ کرتے ہیں اور کچھ بڑھا دیتے ہیں۔ مسلم

جواب

ان دونوں حدیثوں میں بلکہ ان کے ہم معنی جو دوسری حدیثیں آئی ہیں کسی میں بھی یہ نہیں آیا کہ آسمان دنیا سے شیطان چرالاتے ہیں بلکہ شاید یہ معنی ہے کہ آسمان دنیا تک وہ بات پہنچتی ہے پھر دنیوی آسمان والے (ملائکہ) بادل تک اترتے ہیں اور اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں یہاں جنات اس کو جھپٹ لیتے ہیں۔ ابر سے نیچے شیاطین مسلسل قطار در قطار ہوتے ہیں اور اوپر والا نیچے والے سے وہ بات کہہ دیتا ہے اور ایسے وقت میں کوئی ٹوٹنے والا تارا اس پر انگارے کی طرح آپڑتا ہے۔ واللہ اعلم۔

فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ﴿۸﴾ حَرَس نگراں، چوکیدار یہ خدم کی طرح اسم جمع ہے۔ شُهُب شہاب کی جمع ہے یعنی تاروں سے ٹوٹ کر نکلنے والا آگ کا شعلہ۔ مطلب یہ کہ ہم نے سماء کو قوی نگرانوں سے یعنی ان ملائکہ سے جو آسمان تک پہنچنے سے روکتے ہیں اور ٹوٹنے والے شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔

وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ ہم اس سے پہلے آسمان یعنی ابر میں ان جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے جو چوکیداروں اور شہابوں سے خالی ہوتی تھیں اور اس قابل ہوتی تھیں کہ تاک لگا کر وہاں سنا جاسکے۔

فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ لیکن اب بعثت کے بعد جو سنتا ہے وہ اپنی تاک میں کسی شہاب کو پاتا ہے اور شعلۂ باری اس کو سننے سے روک دیتی ہے۔ یا شہاب سے مراد ہے شہاب والے (ملائکہ) اور رصد جمع ہے راصد کا مطلب یہ کہ وہ شہاب والے ملائکہ کو تاک میں پاتا ہے جنات کے حق میں رسول اللہ ﷺ کا یہ معجزہ تھا اسی وجہ سے وہ ایمان لائے تھے۔

وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اور اس سے پہلے ہم واقف نہ تھے کہ

اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾ امر خداوندی کو محفوظ بنا کر زمین والوں کی برائی مقصود ہے یا اللہ نے ان کو ہدایت یاب بنانا چاہا ہے لیکن اب جبکہ ہم نے قرآن سن لیا اور ہم کو اسی چیز نے آسمان کی خبریں حاصل کرنے سے روک دیا تاکہ (آسمانی خبروں کا بیان) رسول اللہ ﷺ کے لئے معجزہ ہو جائے جس کو پانے اور ظاہر کرنے سے کاہن عاجز ہو جائیں تو اب کھل گیا کہ اللہ کو اہل عالم کی ہدایت یابی مقصود ہے۔ مذکورہ بالا تینوں جملوں میں قرآن کی صداقت اور رسول اللہ ﷺ کی حقانیت پر استدلال ہے۔

اچھائی ہو یا برائی خیر ہو یا شر سب اللہ کے ارادہ سے ہوتی ہے اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہے لیکن ادب کا تقاضا تھا کہ ارادہ شر کی نسبت صراحتاً خدا کی طرف نہ کی جائے اور ارادہ خیر کا فاعل صراحتاً اللہ کو قرار دیا جائے اسی لئے شر کے ساتھ لفظ اُرِيْدَ بصیغہ مجہول اور خیر کے ساتھ اَرَادَ بصیغہ معروف ذکر کیا۔

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ اَلصّٰلِحُوْنَ سے مراد ہیں وہ جنات جو گزشتہ انبیاء اور آسمانی کتابوں پر خصوصیات تورات پر ایمان رکھتے تھے۔

وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ یعنی ہم مختلف مسلکوں والے تھے یا راستوں کی طرح مختلف الاحوال تھے۔

قِدَدًا ﴿۱۱﴾ متفرق مختلف قِدَد قِدّة کی جمع ہے قدة کا معنی ہے ٹکڑا۔ یہ جملہ گزشتہ جملہ یعنی مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ کی تاکید ہے۔ حسن بصریؒ اور مہدیؒ کا قول ہے کہ جنات تمہاری طرح ہیں ان میں قدریہ بھی ہیں اور مرجیہ بھی اور رافضی وغیرہ بھی۔ ١.ہ جنات نے جو آپس میں کہا تھا اِنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ یہ حقیقت میں آگے آنے والے قول کی تمہید ہے آگے آتا ہے اِنَّا

قدریہ فرقہ قائل ہے کہ ہم اپنے اعمال کے خود خالق ہیں خدا خالق شر نہیں۔ مرجیہ فرقہ کا عقیدہ ہے کہ اگر ایمان اور توحید صحیح ہو تو پھر کوئی گناہ موجب مواخذ نہیں کسی نیک عمل کی ضرورت نہیں۔ ہر خطا کا معاف ہونا ضروری ہے بعض علماء نے حنفیہ کو بھی مرجیہ میں داخل کیا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ حنفیہ کے عقیدہ اور مرجیہ کے خیال میں بڑا فرق ہے حنفیہ کہتے ہیں کہ کوئی مشرک مغفور نہیں اور کوئی مشرک جنت سے محروم نہیں خواہ معافی کے بعد یا عذاب پانے کے بعد گویا بد اعمال مومن کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے عذاب دے چاہے بخش دے۔

ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ الخ اور اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰی الخ ان دونوں کی تمہید اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ ہے مطلب یہ کہ توحید بعث پر ایمان ہماری طرف سے کوئی انوکھی بات نہیں۔ پہلے جنات بھی مختلف مسالک پر تھے کچھ صالح تھے کچھ غیر صالح اور گزشتہ زمانہ میں اگرچہ ہم خفیف العقل لوگوں کے پیچھے چلتے تھے اور حدود صداقت سے ہٹی ہوئی باتیں کہتے تھے مگر جب قرآن سن لیا تو ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہم خدا پر غالب نہیں آسکتے اب ہم نے ہدایت کی بات سن لی اور اس کو اسی طرح مان لیا جیسے ہمارے بعض اسلاف نے مان لیا تھا۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ فِی الْاَرْضِ یعنی ہم نے جان لیا اور قرآن میں جو اللہ نے تعلیم دی اور ہدایت کی ہے اس سے ہم کو یقین ہو گیا کہ اگر زمین پر خدا ہم کو خراب کر دینا چاہے تو ہم اس کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے۔

وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ اور اگر اس سے بھاگنا چاہیں تو زمین سے آسمان کی طرف بھاگ کر بھی اس کے پنجہ سے نہیں بچ سکتے۔

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓی اٰمَنَّا بِهٖ اَلْهُدٰی سے مراد ہے قرآن کیونکہ قرآن موجب ہدایت ہے یعنی قرآن سن کر ہم ایمان لے آئے پس اے گروہ جن تم ہماری قوم ہو تم بھی ایمان لے آؤ۔

فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فاء سببی ہے مَنْ شرط کے لئے ہے اور آئندہ کلام اس کی جزا ہے۔

فَلَا يَخَافُ مبتدا محذوف کی خبر ہے (اسی لئے مرفوع ہے مجزوم نہیں ہے)

بَخْسًا ثواب کی کمی۔

وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ ذلت چھا جانا یعنی جو اپنے رب پر ایمان رکھے گا اس کو نہ ثواب میں کمی ہونے کا اندیشہ ہو گا نہ ذلت چھا جانے کا یا یہ مطلب ہے کہ مومن اپنی طاعت کے نقص اور بے جا حرکات کے ارتکاب کی سزا سے بے خوف نہیں ہوتا قرآن پر ایمان رکھنے کا تقاضا ہے کہ اس کا اندیشہ لگا رہے۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ یعنی نیک لوگ۔

وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ یعنی کج رو حق سے پھرے ہوئے۔ اگر کسی شخص نے انصاف کیا ہو تو کہتے ہیں اقسط الرجل (باب افعال سے) اور اگر ظلم کیا ہو تو کہتے ہیں قسط (ثلاثی مجرد سے) اس کا اسم فاعل قَاسِطٌ (ظالم) ہے۔ اس آیت کا مضمون گزشتہ آیت وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ میں بھی آیا ہے لیکن غرض دونوں جگہ جدا جدا ہے یہاں مقصود ہے دونوں فریقوں کے حال کی تفصیل اور گزشتہ آیت میں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ ایمان کوئی انوکھی چیز نہیں کہ پہلے نہ ہوئی ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ قرآن سننے والے جن کچھ مسلمان ہو گئے ہوں کچھ نہ ہوئے ہوں اور یہ قول ان مسلمانوں کا ہو جب وہ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر گئے تو یہ بات کہی۔

فَمَنْ اَسْلَمَ یعنی اللہ اور رسول پر جو لوگ ایمان لے آئے۔

فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ تو انہوں نے کامیابی کے راستہ پر چلنے کا ارادہ کیا۔

وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ یعنی ان سے جہنم کی آگ جلائی جائے گی جیسے لکڑی سے معمولی آگ روشن کی جاتی ہے۔ ساتوں جملے یعنی وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ سے وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ تک اگر بفتح اَنَّ پڑھے جائیں تو تاویل طلب ہوں گے ان کو اقوال جنات بغیر تاویل کے نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اگر ہر جگہ اِنَّ بالکسر پڑھا جائے تو جنات کے اقوال ہونے میں کوئی کدورت نہ ہو گی۔

مسئلہ: کافر جنات کو آگ کا عذاب ہو گا اس پر تمام آئمہ کا اتفاق ہے آیت وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا سے یہی معلوم ہو رہا ہے رہی مومن جنات کے ثواب کی بحث تو یہ اختلافی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جنات کے لئے ثواب صرف یہ ہے کہ وہ دوزخ سے محفوظ رہیں گے آیت يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ اسی کی تشریح ہے۔ (اے قوم اللہ کی طرف بلانے والے کی آواز پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لے آؤ

اللہ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور دکھ کے عذاب سے تم کو محفوظ رکھے گا)

بغوی نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اسی طرف گئے ہیں۔ سفیانؒ نے لیث کا قول نقل کیا ہے کہ جنات کے لئے ثواب صرف یہ ہوگا کہ ان کو دوزخ سے محفوظ رکھا جائے گا پھر ان کو بہائم (چوپایوں) کی طرح مٹی کر دیا جائے گا۔ ابو الزیاد کا قول ہے کہ جب اللہ انسانوں کا فیصلہ کرے گا تو مومن جنات سے کہا جائے گا مٹی ہو جاؤ وہ مٹی ہو جائیں گے یہ دیکھ کر کافر کہے گا کاش میں بھی مٹی ہو جاتا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس مسئلہ میں توقف کیا ہے (کچھ صراحت نہیں کی کہ مومن جنات کے ثواب کی کیا صورت ہوگی) کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس بات کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی مبہم رکھو اللہ نے کافر جنات کے عذاب کا تو ذکر کیا ہے مگر فرمان بردار جنات کے ثواب کا کچھ تذکرہ نہیں فرمایا صرف اتنا فرمایا کہ ان کو دوزخ سے محفوظ رکھا جائے گا کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ انسانوں کی طرح جنات کے لئے بھی نیکی کا ثواب اور بدی کا عذاب ہوگا۔ امام مالک اور ابن ابی لیلیٰ اسی قول کی طرف گئے ہیں۔

جریرؒ نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ جنات جنت میں داخل ہوں گے اور (وہاں) کھائیں گے پئیں گے ابو الشیخ نے ایک حدیث بیان کی ہے اور نقاش نے اس کو اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جنات جنت میں داخل ہوں گے۔ ابو الشیخ سے پوچھا گیا کیا جنت کی نعمتوں سے بھی بہرہ اندوز ہوں گے شیخ نے جواب دیا اللہ جنات کے دل میں تسبیح اور ذکر بطور الہام پیدا کردے گا وہ اس تسبیح اور ذکر میں وہ لذت محسوس کریں گے جو جنت کی نعمتوں سے انسانوں کو حاصل ہوگی۔ گویا ابو الشیخ نے مومن جنات کو ملائکہ کی صف میں داخل کر دیا۔ ابن المنذر نے کہا میں نے حمزہ بن حبیبؒ سے پوچھا کیا جنات کو ثواب ملے گا حمزہ نے کہا ہاں اور یہ آیت پڑھی لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ پس انسی حوریں انسانوں کے لئے ہوں گی اور جنی حوریں جنات کے لئے (یعنی انسانوں کے مناسب حوریں انسانوں کے لئے اور جنات کے مناسب حوریں جنات کے لئے)

ابو الشیخ نے باسناد ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مخلوق کے تین گروہ ہوں گے ایک گروہ پورا جنت میں ہے۔ دوسرا گروہ دوزخ میں اول گروہ ملائکہ کا ہے اور دوسرا گروہ شیطانوں کا۔ تیسرا گروہ (کچھ) جنت میں ہوگا اور کچھ دوزخ میں یہ جنات اور انسانوں کا گروہ ہوگا ان کے لئے عذاب بھی ہے اور ثواب بھی۔

ابن وہب سے پوچھا گیا کیا جنات کے لئے عذاب ثواب ہے جواب دیا ہاں اللہ نے فرمایا ہے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا (یعنی جن ہوں یا انس اپنے اپنے اعمال کے مطابق ہر ایک لئے درجات ہیں)

عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ مومن جن جنت کے آس پاس میدانوں میں ہوں گے جنت کے اندر نہیں ہوں گے۔

ثواب جنات کے قائل کہتے ہیں کہ اللہ نے بغیر کسی تخصیص کے فرمایا ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا اس کے علاوہ دوسری عمومی آیات ہیں۔ پھر سورہ رحمٰن میں جن وانس دونوں کو خطاب فرمایا ہے (مثلاً) وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ حنفیہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ عمومی خطابات سے مراد ہیں تمام انسانوں کے لئے خطابات جن ان خطابات میں داخل نہیں۔ اہل عرف ان خطابات سے صرف انسانوں کے لئے عمومی خطاب ہی سمجھتے ہیں۔ رہی سورہ رحمٰن کی آیت فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ تو اس میں جن وانس دونوں کو خطاب ہے مگر اللہ کی عمومی نعمتوں کی تکذیب پر توبیخ مقصود ہے خصوصیت کے ساتھ اس نعمت کے انکار پر زجر مقصود نہیں جو اس سے پہلے والی آیت میں ذکر کی گئی ہے کیونکہ یہ توبیخی آیت بعض ایسی آیات کے بعد بھی ذکر کی گئی ہے جو انعامی نہیں بلکہ عقابی ہیں مثلاً يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِنْ نَارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ يُعْرَفُ

الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ اور عمومی نعمتوں میں سے کچھ نعمتیں ایسی بھی ہیں جو صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں جنات کو حاصل نہیں مگر اس خصوصی نعمت کے تذکرہ کے بعد خطاب دونوں کو کیا گیا ہے جیسے وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (سمندروں میں کوہ نما جہازوں کا رواں کرنا صرف انسانوں پر احسان خداوندی ہے جنات کو جہازوں سے کوئی فائدہ نہیں مگر خطاب زجری اس کے بعد دونوں کو کیا گیا ہے) پس اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جنت کی نعمتیں انسان کے لئے مخصوص ہوں اور عام نعمتوں کی تکذیب و ناشکری پر خطاب توبیخی دونوں کے لئے ہو۔

میرے نزدیک جمہور کا قول صحیح ہے امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کا بھی یہی خیال ہے صاحبینؒ کا قول ہے کہ ثواب جنات کے قائل اپنے قول کی دلیل اور ثبوت رکھتے ہیں اس لئے ان کی بات مانی جائے گی اور امام اعظمؒ کے نزدیک فقدان دلیل ہے اس لئے وہ توقف کے قائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابن عباسؓ عمر بن عبدالعزیز اور دوسرے صحابہؓ و تابعین کے اقوال مرفوع کے حکم میں ہیں (اگرچہ مرفوع نہیں ہیں اور بیہقی نے تو حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایماندار جنات کے لئے ثواب اور غیر مومن جنات کے لئے) عذاب ہوگا۔ ہم نے ثواب کی کیفیت پوچھی تو فرمایا وہ اعراف پر ہوں گے جنت میں نہیں ہوں گے ہم نے دریافت کیا اعراف کیا ہے فرمایا جنت سے باہر جس میں دریا رواں ہوں گے اور درخت اور پھل ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا اس جملہ کا عطف اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ پر ہے مطلب یہ ہوگا کہ میرے پاس اس بات کی بھی وحی ہے کہ اگر جن و انس قائم رہیں گے۔

عَلَى الطَّرِيْقَةِ اللہ کے پسندیدہ راستہ یعنی دین اسلام اور اس فطرت پر جس پر اللہ نے سب لوگوں کی تخلیق کی ہے (یعنی انسانی خود ساختہ رنگ آمیزی سے بچے رہیں گے۔

لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ تو ہم ان کو کثیر پانی سے سیراب کریں گے مقاتل نے بیان کیا کہ سات برس تک خشک سالی میں جب وہ لوگ مبتلا رہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آب کثیر سے مراد ہے وسیع رزق کیونکہ پانی حصول رزق کا سبب ہے (سبب بول کر مسبب بطور مجاز مراد لیا گیا) جس طرح رزق سے بارش اس آیت میں مراد ہے وَمَا اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ (آسمان سے غلہ نہیں بلکہ پانی اترتا ہے جو زمین کی سرسبزی کا ذریعہ ہے) مراد یہ ہے کہ اگر وہ دین فطرت پر قائم رہے تو ہم ان کو بکثرت مال اور آرام کی زندگی عطا کریں گے اس آیت کا مفہوم وہی ہے جو آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ کا ہے اور اسی مضمون کو آیت وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ میں بیان کیا گیا ہے۔

لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ یعنی اس سیرابی یا عطاء فراخی کی غرض تھی ان کی آزمائش ہم کو ان کا امتحان لینا مقصود تھا کہ (ہماری نعمت کا وہ) کس طرح شکر ادا کرتے ہیں۔ سعید بن مسیب عطا بن ابی رباح ضحاک قتادہ مقاتل اور حسن بصریؒ نے آیت مندرجہ کی یہی تفسیر کی ہے لیکن ربیع بن انس زید بن اسلم کلبی اور ابن کیسان نے اس طرح تشریح مطلب کی ہے کہ اگر وہ کفر پر قائم رہیں گے تو ہم ان کو بکثرت مال عطا کریں گے تاکہ بطور سزا ان کو فتنہ میں ڈال دیں اور اتنی ڈھیل دیں کہ وہ فتنہ میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جائیں جیسے دوسری آیت میں آیا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ جب وہ نصیحت کو بھول گئے تو ہم نے ان کے لئے ہر شئے کے دروازے کھول دیئے۔ یہ مطلب درست نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ کفر وسعت رزق اور خوش عیشی کا موجب ہو حالانکہ آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ الخ اور وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا الخ میں اس کے خلاف صراحت ہے (ان دونوں آیات میں تو استقامت و ایمان کو وسعت رزق کا موجب قرار دیا ہے پھر کفر موجب کشائش

کیسے ہو سکتا ہے) ایک اور آیت ہے وَلَوْ لَا أَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ سَقْفًا مِّنْ فِضَّةٍ الخ (اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ کافروں کے مکان چاندی کے نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ اگر ان کے مکان چاندی کے کر دیئے جاتے تو کفر کو موجب فراخی سمجھ کر سب لوگ ایک امت (کافر) بن جاتے کیونکہ لفظ لولا کا تقاضا ہے کہ امتناع اول (شرط) کی وجہ سے امتناع جملہ دوم (جزا) ہو اس تمام انسانوں کا ایک جیسا گروہ نہ ہونا بتا رہا ہے کہ کفر موجب فراخی نہیں ہے اگر سب کو ایک جیسا گروہ مقصود ہوتا تو کفر کو موجب دولت بنا دیا جاتا) رہی آیت فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا الخ (جس سے بظاہر نسیان نصیحت کشائش رزق کا ذریعہ معلوم ہوتا ہے) تو یہ گزشتہ واقعہ کی حکایت ہے (ایک واقعہ ہوا تھا جس کو خدا نے بیان کر دیا) عموم پر اس کی دلالت نہیں ورنہ ناقابل نسخ تعارض آیات لازم آئے گا۔ مزید یہ کہ اہل مکہ کے واقعات اول تفسیر کی تائید اور دوسری تفسیر کی تردید کر رہے ہیں ابو جہل اور مکہ کے دوسرے کفار جب ایمان نہ لائے تو ہفت سال قحط میں مبتلا کر دیئے گئے اور ایسا کال پڑا کہ لوگ گوبر کھانے لگے اور آخر بدترین حال میں جنگ بدر میں مارے گئے لیکن وہ ایماندار جو دین الٰہی پر قائم رہے اللہ نے ان کو قیصر و کسریٰ کی حکومتیں عطا فرمائیں۔ اس کے علاوہ تفسیر اول کے صحیح ہونے پر یہ امر بھی دلالت کر رہا ہے کہ آیت مذکورہ کے مقابلہ میں فرمایا ہے۔

وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾ اس آیت میں ذکر سے روگردانی کرنے والوں کے لئے عذاب کو لازم قرار دیا ہے اس کا اقتضاء ہے کہ جو لوگ اعراض نہیں کرنے والے ہیں یعنی شریعت الٰہیہ پر استقامت رکھنے والے ان کے لئے اس کے خلاف حکم ہو یعنی ان کو حسن زندگانی عطا کیا جائے کلام خداوندی میں اس طرح کے تقابل بیان کا معمول ہی ہے۔

عَذَابًا صَعَدًا سخت عذاب اونچے درجہ کا دکھ۔ عذاب سے مراد عذاب دنیا ہے یا عذاب قبر یا عذاب آخرت بظاہر اول (احتمال) اس جگہ مراد ہے کیونکہ خوش عیشی کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے اسی طرح آیت وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى میں (اگرچہ تینوں احتمال ہیں لیکن تنگ زندگی سے دنیا میں تنگی معاش مراد ہے کیونکہ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى کا اس پر عطف کیا گیا ہے (اور عطف میں اصل یہی ہے کہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغایرت ہو جب نَحْشُرُهٗ میں قیامت کے عذاب کا بیان ہے تو اس سے پہلے تنگی معاش سے دنیوی زندگی کی تلخی مراد ہونی چاہئے) جس طرح آیت مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ میں حیات طیبہ سے مراد دنیوی خوش عیشی ہے (کیونکہ ولنجزینہم اجرھم الخ سے اجر آخرت مراد ہے اور تقابل کا اقتضاء ہے کہ پہلے والے جملہ میں دنیوی فراخی مراد ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مال تھوڑا ہو یا بہت اگر تقویٰ نہ ہو تو ایسے مال میں کوئی بھلائی نہیں یہی زندگی کی تنگی ہے جو لوگ حق سے روگرداں ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی مالدار اور کیسی ہی فراخدست ہوں لیکن ان کی زندگی تنگ ہی ہوتی ہے کیونکہ ان کو خیال ہوتا ہے کہ (موجودہ مال صرف ہو گیا تو) اس کی جگہ دوسرا مال ان کو نہیں ملے گا اللہ کے متعلق اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگیاں تنگ ہی گزرتی ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا قناعت ان سے چھین لی جاتی ہے اس لئے ان کو سیری حاصل ہی نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے دنیاداروں سے قناعت چھین لی جاتی ہے وہ ہمیشہ کمائی کی دھن میں لگے رہتے ہیں کماتے ہیں اور مال کا چوکیدارا کرتے ہیں اور ہر وقت مال کے ضائع ہونے کا ان کو اندیشہ لگا رہتا ہے باہمی بغض و حسد کی یہی بنیاد ہے دشمنوں اور حاسدوں کی کثرت ان کو چین نہیں لینے دیتی یہ ہی عَذَابٌ أَلِيْمٌ اور تنگی حیات ہے وہ نہیں جانتے کہ صوفیہ کی زندگی کیسی خوشگوار گزرتی ہے ذکر الٰہی سے اطمینان قلب اور کشائش صدر کا حصول تھوڑے پر قناعت دنیا سے استغناء مخلوق پر مہربانی ان کے خصوصی اوصاف ہوتے ہیں۔ مصائب سے بھی خوش ہوتے ہیں اور شکر کرتے ہیں کیونکہ ان کو تکالیف سے گناہوں کا کفارہ اور حسن ثواب کے حصول کی امید ہوتی ہے فراخی حال اور آسائش کا تو ذکر ہی کیا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے دنیا اور آخرت کی راحت عطا فرماتا ہے۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ اس جملہ کا عطف اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا پر ہے یعنی جملہ دوسری وحی کے یہ بھی وحی آئی ہے کہ مسجدیں یعنی وہ مقامات جو نماز کے لئے بنائے جاتے ہیں اللہ کے لئے مخصوص ہیں (اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک قرار دینے کے لئے نہیں ہیں)

فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ قتادہ نے کہا کہ یہودی اور عیسائی عبادت خانوں میں جا کر عبادت الٰہی میں دوسروں کو شریک کرتے تھے اس پر اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مسجدوں میں جائیں تو اپنی دعائیں خالص خدا ہی سے کریں۔ مساجد سے مراد ہیں تمام مسجدیں جن کو (شرک وغیرہ سے) پاک رکھنے کا اللہ نے حکم دیا تھا اور فرمایا تھا طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ الخ رسول اللہ ﷺ نے بھی حکم دیا تھا کہ اپنے بچوں کو پاگلوں کو خدا کے (فرضی جھوٹے) شریکوں کو خرید و فروخت کو آپس کے جھگڑوں کو چیخ پکار کر حدود (قصاص۔ سنگساری سزا تازیانہ وغیرہ) کو اور تلواروں کو بے نیام رکھنے کو ہماری مسجدوں سے الگ رکھو مسجدوں کے دروازوں پر لوٹے رکھو اور جمعہ میں مسجدوں کے اندر خوشبو سلگاؤ۔ یہ حدیث ابن ماجہؒ نے بروایت واصلہ مرفوعاً نقل کی ہے ابوداؤد اور ترمذی نے بسلسلہ عمرو بن شعیبؒ نقل کیا ہے کہ عمرؓ کے دادا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے اندر بلند آواز سے شعر خوانی کی اور خرید و فروخت کی اور جمعہ کے دن نماز سے پہلے حلقہ بنا کر بیٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس گناہ کا اتار یہ ہے کہ تھوک کو مٹی میں دبا دیا جائے (اگر زمین خام ہو) بخاری و مسلم۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کے نیک کام میرے سامنے لائے جائیں گے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص مسجد سے کوڑا نکال کر باہر پھینک دے گا (تو وہ بھی میری پیشی میں لایا جائے گا) ابوداؤد اور ترمذی۔ یہ بھی فرمایا اگر کوئی شخص کسی کو اپنی گم شدہ اونٹنی کو مسجد میں ڈھونڈھتے سنے تو کہے اللہ تیری اونٹنی واپس نہ کرے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں بنائی جاتی ہیں مسلم بروایت ابوہریرہؓ ترمذی اور دارمی نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس میں یہ الفاظ زیادہ بیان کئے ہیں کہ اگر تم کسی کو مسجد کے اندر خرید و فروخت کرتے دیکھو تو کہہ دو کہ خدا تجھے تجارت میں نفع نہ دے۔

حسن بصریؒ نے کہا اَلْمَسَاجِدَ سے مراد تمام مقامات ہیں کیونکہ اس امت کے لئے تمام زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ کسی جگہ کسی کو اللہ کا ساجھی نہ قرار دو اور اللہ کی موجودگی میں کسی دوسرے سے دعا نہ کرو۔

ابن ابی حاتمؒ نے بسلسلہ ابو صالح ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جنات نے عرض کیا (یا رسول اللہ) کیا ہم کو اجازت ہے کہ ہم آپ کے ساتھ آپ کی مسجد میں نماز میں حاضر ہو جایا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریرؒ نے حضرت جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جنات نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا ہم مسجد میں کیسے حاضر ہوں یا یہ عرض کیا کہ ہم نماز میں کیسے حاضر ہوں کیونکہ ہم آپ سے بہت دور رہتے ہیں اس پر یہ آیت اتری۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ مسجد سے مراد ہیں اعضاء سجود (ہاتھ پاؤں زانو، پیشانی) مطلب یہ ہے کہ یہ اعضاء اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں ان سے دوسروں کے لئے سجدہ نہ کرو۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سات ہڈیوں سے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے پیشانی۔ دونوں ہاتھ۔ دونوں زانو۔ دونوں قدموں کے سرے اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ (نماز میں) کپڑوں کو سمیٹا جائے نہ بالوں کو۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یعنی رسول اللہ ﷺ بجائے رسول یا نبی ﷺ کے عبد اللہ کہنے کی وجہ اس جگہ محض تواضع ہے کیونکہ یہ کلام (اگرچہ خدا کا ہے مگر) ایسے موقع پر واقع ہے کہ گویا رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے متعلق فرمایا۔ پھر لفظ عبد اللہ میں قیام (نماز) کی وجہ بھی در پردہ بتادی گئی۔ (کہ عبدیت کا تقاضا نماز ہے نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہونے کی وجہ ہی عبدیت ہے) حضرت مجدد قدس سرہ نے فرمایا عبدیت کمال (بشری) کا سب سے اونچا درجہ ہے۔

يَدْعُوْهُ دعا سے مراد ہے عبادت۔

كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ ع ہشام کی قرات میں لُبَدًا اور باقی قاریوں کے نزدیک لِبَدًا مروی ہے بہر حال

یہ لِبْدَۃٌ کی جمع ہے لبد کا اصل معنی ہے ایسی جماعتیں جن میں سے کچھ لوگ اوپر ہوں کچھ نیچے (ٹھٹ کے ٹھٹ) حسن قتادہ اور ابن زید نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ توحید کی دعوت دینے کے لئے جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا تو جن وانس سب کے سب دعوت توحید کو باطل کرنے کے لئے اکٹھے ہو گئے اور اللہ کے نور کو اپنی پھونک سے بجھانا چاہتے تھے مگر اللہ کا فیصلہ تھا کہ وہ اپنا نور پورا (پھیلا کر) رہے گا اور تمام دشمنوں کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کو کامیابی عطا فرمائے گا۔

ہو سکتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہو کہ جب نخلہ میں رسول اللہ ﷺ عبادت کرنے اور قرآن پڑھنے کھڑے ہوئے تو قرآن سننے کے شوق میں جنات حضور ﷺ کے پاس ہجوم لے کر آئے اور ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ⑳ قُلْ بصیغہ امر عاصم حمزہ اور ابو جعفر کی قرات میں ہے باقی اہل قرات نے قَالَ بصیغہ ماضی پڑھا ہے یعنی اللہ کے بندہ نے کہا تم میرے کام کو تباہ کرنے کے لئے کیوں جمع ہوئے ہو میں تو صرف توحید رب کی طرف بلا رہا ہوں یا یہ مطلب ہے کہ جب جنات اس کا کلام سننے کے لئے شوق کے ساتھ جمع ہوئے تو اس نے کہا میں صرف اپنے رب کو پکار رہا ہوں تم بھی میری دعا کی طرح رب ہی سے دعا کرو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ۔

مقاتل نے بیان کیا کہ مکہ کے کافروں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا تم نے حرکت بہت بڑی کی ہے اب اس سے باز آجاؤ تو ہم تم کو اپنی پناہ میں لے لیں گے اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ㉑ یعنی تمہارا نقصان نفع یا گمراہی اور ہدایت میرے قبضہ میں نہیں ہے بصورت اول رَشَد بمعنی نفع اور بصورت دوئم ضَرّ بمعنی گمراہی ہے بہر صورت ایک اسم کا اصلی معنی اور دوسرے کا مجازی معنی مراد ہو گا خواہ سبب بول کر مسبب مراد ہو یا مسبب کا اطلاق سبب پر ہو اس اطلاق سے دونوں معنی پر تنبیہ ہو جائے گی (کہ جس طرح انسان کے قابو میں گمراہی اور ہدایت نہیں ہے اسی طرح نفع نقصان بھی اس کی قدرت سے باہر ہے

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۙ ㉒

مُلْتَحَدٌ جائے پناہ جس کی طرف رجوع کیا جائے دونوں جملے ایک محذوف سوال کے جواب میں واقع ہوئے ہیں گویا رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تھا کہ جو کفار میرے کام کو تباہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جب وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر تو پیغمبر ہے تو ہم پر عذاب لے آ۔ یا کفار کہتے ہیں اب اس کام سے باز آجا ہم تجھے اپنی پناہ میں لیتے ہیں تو میں ان کے جواب میں کیا کہوں۔ (اس جواب کو بتانے کے لئے اللہ نے یہ دونوں جملے نازل فرمائے) یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا جملہ سوال محذوف کا جواب ہو گویا رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے دیدار اور ملاقات کا جنات کی طرف سے اشتیاق ملاحظہ کیا تو سوال کیا کہ میں ان سے کیا کہوں وجہ یہ تھی کہ سب کا انتہائی شوق کے زیر اثر ہجوم کر آنا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو نقصان نفع کا مالک خیال کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلا جملہ رسول اللہ ﷺ کی عاجزی کو ظاہر کرنے کے لئے اور دوسرا جملہ ان کے مضمون کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ ابن جریر نے حضرمی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جنات کے کسی سردار نے اپنے گروہ سے کہا تھا کہ محمد ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم ان کو پناہ عطا کریں اس لئے میں ان کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں اس پر آیت قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ الخ نازل ہوئی۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ استثناء کا تعلق لَآ اَمْلِكُ سے ہے اور درمیانی کلام نفی قدرت کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ حقیقت میں تبلیغ حکم بھی ہدایت اور نفع رسانی ہے اور تبلیغ نبی کا فرض ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کرنا اور نفع پہنچانا نبی کے قبضہ میں ہے اس لئے تبلیغ حکم کو لَآ اَمْلِكُ کی عمومی نفی سے مستثنیٰ کر لیا) مطلب یہ ہے کہ مجھ میں نقصان کو دور کرنے اور فائدہ پہنچانے کی اور کچھ طاقت نہیں صرف تبلیغ احکام اور پیام رسانی میری طاقت میں ہے یا استثناء کا تعلق اَحَدٌ یا مُلْتَحَدًا سے ہے یعنی اللہ کے عذاب سے مجھے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ اس کے سوا میرے لئے کوئی پناہ گاہ ہے ہاں وہ تبلیغ و پیام رسانی جو میرا فرض ہے وہی مجھے اللہ کے عذاب سے بچالے گا اور اگر میں نے اس فرض کو ادا نہیں کیا تو اللہ مجھے عذاب دے گا۔ حسنؒ اور مقاتلؒ نے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ میں نہ خیر کا مالک ہوں نہ شر کا نہ ہدایت کا ہاں تبلیغ

احکام اور پیام رسانی کا فرض خدا کی طرف سے مجھ پر ہے (مطلب یہ ہے کہ اِلَّا استثنائیہ نہیں ہے بلکہ لٰکِنْ کے معنی میں ہے)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِلَّا اصل میں اِنْ لَا تھا اِنْ شرطیہ اور لَا نافیہ ہے اور جزا محذوف ہے یعنی اگر میں اللہ کا حکم اور پیام نہ پہنچاؤں تو اس کے عذاب سے مجھے کوئی نہیں بچائے گا۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی توحید کے معاملہ میں جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور رسول پر ایمان نہیں لائے گا۔

فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ تو جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہے گا جہنم اسی کے لئے ہے۔ لفظ مَنْ کی رعایت سے يَّعْصِ اور لَهٗ کی مفرد ضمیریں لائی گئیں اور معنی کے لحاظ سے لفظ خٰلِدِيْنَ بصورت جمع ذکر کیا گیا۔

اور مَنْ يَّعْصِ کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہے پورا کلام اس طرح تھا کہ میرے اختیار میں صرف تبلیغ احکام ہے میں حکم پہنچا رہا ہوں جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ہدایت یاب ہوگا جو نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے دوامی جہنم ہے۔

اگر کفار کے اجتماع سے ابطال امر رسالت کے لئے کافروں کا اجتماع مراد لیا جائے تو حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا (جو آگے رہا ہے) يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا کی غایت ہوگی یعنی (ابطال امر رسالت کے لئے کافروں کا اجتماع اس وقت تک ہے جب تک انہوں نے عذاب کو نہیں دیکھا ہے جب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو یہ اجتماع ختم ہو جائے گا) اور اگر اجتماع سے مراد جذبہ اشتیاق کے تحت جنات کا اجتماع ہو تو حتی کا تعلق کلام محذوف سے ہوگا جس پر کفار کی حالت دلالت کر رہی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ضعیف سمجھ کر آپ کی نافرمانی کرتے تھے اصل کلام یوں تھا کہ یہ لوگ برابر رسول کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور آپ کو ضعیف سمجھتے رہیں گے یہاں تک کہ عذاب کو دیکھیں گے۔

حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ سے مراد یا دنیوی عذاب ہے جیسے بدر کا واقعہ (اور اس میں کفار کا قتل) یا قیامت مراد ہے یعنی ساعت موت کیونکہ جو مر گیا اس کی قیامت آگئی اور قیامت کے دن جہنم کو دیکھا جائے گا (پس جو مر گیا اس نے جہنم کو دیکھ لیا)

فَسَيَعْلَمُوْنَ جب عذاب آپڑے گا اس وقت ان کو معلوم ہوگا۔

مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝ کہ مددگاروں کے لحاظ سے کون کمزور ہے اور تعداد کس کی کم ہے ان کی یا رسول اللہ ﷺ کی۔ یہ پورا سوالیہ جملہ فَسَيَعْلَمُوْنَ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

قُلْ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو۔

اِنْ اَدْرِيْۤ میں نہیں جانتا کہ

اَقَرِيْبٌ بعض کافروں نے وعید عذاب کے پورا ہونے کی طلب کی اور کہا یہ دعوۂ عذاب کب پورا ہوگا تو یہ آیت نازل ہوئی قَرِيْبٌ خبر مقدم اور مَا تُوْعَدُوْنَ مبتدا موخر ہے یا قریب مبتدا از قسم ثانی اور مَا تُوْعَدُوْنَ اس کا فاعل ہے۔

مَّا تُوْعَدُوْنَ یعنی (دنیوی) عذاب یا قیامت۔

اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْۤ اَمَدًا ۝ اَمَد بمعنی انتہا اور مقرر وقت جس سے سواء خدا کے کوئی واقف نہیں۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ یہ رَبِّیْ کی صفت ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی وہی عالم الغیب ہے اسکے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ غیب سے مراد ہے وہ چیز جو ابھی تک نہیں آئی جیسے معاد کی خبریں۔ یا وہ چیز جو موجود ہونے کے بعد معدوم ہو گئی جیسے آغاز آفرینش کی اطلاعات اور وہ گزشتہ واقعات جو صفحات تاریخ پر بھی موجود نہیں یا غیب سے مراد ہیں اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جو بندوں کو معلوم نہیں اور کسی دلیل سے بھی ان کا پتہ نہیں ملتا۔ لیکن جن صفات و اسماء پر برہان قائم اور دلیل موجود ہے جیسے اللہ کی ہستی ان کا ناقابل زوال ہونا اس کا واحد ہونا اس کے اندر صفات کمال کا موجود ہونا اور صفات نقص و زوال سے اس کا پاک ہونا تو یہ چیزیں عالم شہادت کی ہو گئیں ان کا شمار غیب میں نہیں ہے کیونکہ ان کے دلائل موجود ہیں اسی طرح حدوث عالم کا

مسئلہ بھی غیبی مسئلہ نہیں بلکہ عالم شہادت کا ہے کیونکہ عالم کا تغیر پذیر ہونا محسوس ہے اور تغیر حدوث پر دلالت کر رہا ہے ان تمام اقسام غیب کا علم اللہ کی توفیق سے ممکن ہے۔

کچھ چیزیں بعض افراد کے اعتبار سے غیب ہوتی ہیں اور بعض کے لحاظ سے نہیں ہوتیں مثلاً حیات کے احوال اور دور کی چیزوں کا علم انسانوں کے لئے غیب ہے جنات کے لئے شہادت ہے اسی لئے حضرت سلیمان کے زمانہ میں) کچھ لوگ خیال کرتے تھے کہ جن غیب سے واقف ہوتے ہیں حالانکہ جنات صرف شہادت کو جانتے تھے (جو چیز انسانوں کے لئے غیب تھی وہ جنات کے سامنے حاضر تھی اس لئے جنات کو غیب کا نہیں بلکہ حاضر کا علم تھا) اللہ نے حضرت سلیمان کے قصہ میں (جنات کے عالم الغیب ہونے کی تردید میں) فرمایا فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ یا جیسے زمین والوں کے لئے آسمان کے احوال مشرق والوں کے لئے مغرب کے احوال اور مغرب والوں کے لئے مشرق کے احوال غیب ہیں اس قسم کا علم غیب کبھی وحی والہام سے حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی درمیانی پردے اٹھ جانے اور وسطی حجابات کے شفاف ہو جانے کی وجہ سے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا میں حجر میں موجود تھا اور قریش مجھ سے سیر شب (معراج) کی کیفیت پوچھ رہے تھے انہوں نے مجھ سے بیت المقدس کی بعض ایسی باتیں پوچھیں جو مجھے ٹھیک یاد نہ تھیں اس وقت مجھے ایسی پریشانی ہوئی کہ ویسی پریشانی کبھی نہیں ہوئی تھی پھر اللہ نے میری نگاہ سے حجاب اٹھا دیا اب جو کچھ وہ مجھ سے پوچھتے تھے میں ان کو بتا دیتا تھا۔

بیہقی نے بروایت ابو عمرؓ بیان کیا کہ حضرت عمرؓ نے ایک لشکر بھیجا اور ساریہ نام کے ایک شخص کو اس کا کمانڈر مقرر کیا ایک روز حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے دوران خطبہ میں بلند آواز سے پکارنے لگے اے ساریہ پہاڑ (کی طرف دیکھ)

ابو داؤدؒ نے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نجاشی کی وفات کے بعد ہم آپس میں تذکرہ کرتے تھے کہ ان کی قبر پر پیہم ایک نور نظر آتا ہے حجابات اٹھنے کے بعد یہ علم بھی علم غیب نہیں رہتا بلکہ علم الشہادہ ہو جاتا ہے اگرچہ معجزہ اور کرامت کے طور پر ہی اس کا حصول ہوتا ہے۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ یعنی وہ اپنے غیب پر کسی مخلوق کو مطلع نہیں فرماتا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مگر جن کو وہ پسند کر لیتا ہے ان کو واقف کر دیتا ہے تاکہ یہ علم ان کا معجزہ ہو جائے اور وہ فرمانبرداروں کو بشارت دے سکیں اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرائیں۔

مِنْ رَّسُوْلٍ رسول کا لفظ عام ہے انسان ہو یا فرشتہ دونوں اس میں داخل ہیں۔ لفظ رسول انبیاء کو بھی شامل ہے تمام انبیاء تبلیغ احکام کے لئے خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ صرف ایسے نبی کو رسول کہنا جس کو جدید شریعت اور کتاب دے کر بھیجا گیا ہو محض اصطلاح ہے (باعتبار حقیقت ولغت ہر نبی رسول ہوتا ہے) بعض علماء کا قول ہے کہ بطور عموم مجاز اولیاء کو بھی لفظ رسول شامل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ دارمی بروایت کثیر بن قیسؓ، ابن النجاری بروایت انسؓ و ابن عدی، بروایت علیؓ موخر الذکر دونوں راویوں کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا علماء زمین کے چراغ اور انبیاء (علیہم السلام کے جانشین ہیں یا یہ فرمایا کہ علماء میرے وارث اور انبیاء (علیہم السلام) کے وارث ہیں۔

ابن عقیل نے بروایت انسؓ یہ الفاظ نقل کئے کہ علماء اس وقت تک پیغمبروں کی طرف سے امین ہیں جب تک بادشاہ کے ساتھ نہ مل جائیں اور دنیا میں نہ گھس جائیں۔

اہل السنت والجماعت قائل ہیں کہ اولیاء کی کرامتیں (حقیقت میں) ان کے پیغمبر ہی کا معجزہ ہوتی ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں ہی پیام رساں بنا کر بھیجا ہے اور چونکہ حضور خاتم النبیین ﷺ کو تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے (اور تمام انسان آپ کی قوم قرار پائی) اس لئے جو علماء اولیاء

آپ کے پیرو ہوئے قلل سنت کے نزدیک وہ آپ ہی کی زبان ہوئے تاکہ حصر درست ہو جائے اور لسان قومہ میں اضافت کا عموم صحیح قرار پائے (پس علماء امت اور اولیاء اسلام سے جو کرامتیں ظاہر ہوئیں وہ حضور ﷺ کا ہی معجزہ ہوا) اب اگر لفظ رسول اولیاء کو شامل مانا جائے اور اولیاء کو بطور کرامت علم غیب حاصل ہو جائے تو کوئی خرابی نہیں (گویا اولیاء کو علم غیب رسول مرتضیٰ کا علم غیب ہوا اور رسول مرتضیٰ کے لئے علم غیب کا عطاء ہونا آیت سے ثابت ہے) لیکن اگر اولیاء کو لفظ رسول شامل نہ بھی ہو تو اولیاء کو جو علم غیب حاصل ہوتا ہے وہ حکم آیت کا ناقص نہیں ہے کیونکہ اولیاء کو جو علم غیب الہام وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے وہ قطعی یقینی نہیں ہوتا ظنی ہوتا ہے (جس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے) اسی لئے صوفیہ کا قول ہے کہ صوفیہ کے مکاشفات کا کتاب وسنت (قرآن وحدیث) سے مقابلہ کرنا ضروری ہے اگر قرآن وحدیث کے موافق ہوں تو قبول کئے جائیں کیونکہ قطعی کے موافق کا بھی قطعی ہونا ضروری ہے اگر مخالف ہوں تو قبول نہ کئے جائیں۔ یہ بھی صوفیہ کا قول ہے کہ جس چیز کو شریعت نے رد کر دیا وہ گمراہی ہے اور اگر شریعت اس چیز میں خاموش ہو تو اس کو قبول کر لیا جائے گا مگر (وہ چیز یقینی نہیں قرار پائے گی) غلطی کا احتمال اس میں باقی رہے گا۔ اور آیت میں علم غیب سے مراد وہ علم ہے جو یقینی اور قطعی ہو۔

ہماری اس توضیح سے زمخشری صاحب کشاف کا وہ اعتراض دفع ہو گیا جس کی بناء اعتزال پر ہے کہ اس آیت سے کرامات اولیاء کا بے حقیقت ہونا ثابت ہوتا ہے (کیونکہ آیت سے عطاء علم غیب صرف رسولوں کے لئے مستفاد ہوتا ہے) جن اولیاء کی طرف کرامتوں کی نسبت کی جاتی ہے وہ یقیناً پیغمبر نہیں ہوتے۔ ان بدعتیوں کی تکذیب کے لئے مندرجہ ذیل آیات کافی ہیں۔ (جن میں ایسے لوگوں کو علوم غیب عطا کرنے کا تذکرہ ہے جو انبیاء نہ تھے) مثلاً اللہ نے فرمایا۔

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ موسیٰ کو دودھ پلا اگر اس کے متعلق تجھے کچھ خطرہ ہو تو اس کو دریا میں پھینک دینا اور کچھ اندیشہ و رنج نہ کرنا ہم ضرور اس کو دوبارہ تیرے پاس لوٹا دیں گے اور پیغمبروں میں سے بنائیں گے (یہ سب آئندہ کی باتیں حضرت موسیٰ کی والدہ کو الہام کی گئیں باوجودیکہ وہ پیغمبر نہ تھیں)

ایک اور آیت ہے (جس میں حضرت مریم کا تذکرہ ہے اور مریم پیغمبر نہیں تھیں) فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا اَنْ لَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِيْ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا فرشتے نے نیچی جانب سے مریم کو پکارا کہ تو رنجیدہ نہ ہو تیرے خدا نے تیرے نیچے نہر جاری کر دی اور درخت کھجور کے تنہ کو ہلا (باوجود خشک ہونے کے) اس سے تازہ کھجوریں گریں گی کھجوریں کھا پانی پی بچہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اب اگر تجھے کوئی آدمی دکھائی دے تو اس سے بات نہ کر اور اشارہ سے بتا دے کہ میں نے آج اللہ کی نذر کا روزہ رکھا ہے اس لئے کسی شخص سے آج بات نہیں کروں گی۔

ایک اور آیت میں فرمایا وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

تنبیہ

اولیاء کے جس علم کو ہم نے ظنی کہا ہے اس سے مراد علم حصولی ہے جو کبھی الہام سے حاصل ہوتا ہے خواہ بتوسط ملائکہ ہو یا براہ راست اور کبھی درمیانی حجابات اٹھ جانے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسے ساریہ والی حدیث میں حضرت عمرؓ کا قول ہم نقل کر چکے ہیں اسی قسم میں اس انکشاف کو داخل قرار دیا گیا ہے جو بعض اولیاء کو کسی کسی وقت لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے اور وہ قضاء مبرم و معلق کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی کشف علمی خواب یا مراقبہ کی حالت میں عالم مثال کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے حضرت انسؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صالح خواب نبوت کا چھیالیسواں جز ہے۔ بخاری و مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سواء مبشرات کے نبوت کا اور کوئی حصہ باقی نہیں رہا صحابہ نے عرض کیا مبشرات کیا۔ فرمایا صالح خواب بخاری۔ علم کے ان تمام اقسام میں انبیاء کے علاوہ غلطی واقع ہو سکتی ہے کیونکہ الہام میں شیطان گڑبڑ کر سکتا ہے آدمی کے دل کے دو خانے ہیں ایک فرشتہ کا دوسرا شیطان کا کبھی کشف شیطانی ملکی چکارے کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے کیونکہ وہم دخل انداز ہو جاتا ہے یا شیطان کشف اور عالم مثال کے مطالعہ میں دھوکہ دیدیتا ہے حضرت ابو قتادہ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا نیک خواب اللہ کی طرف سے اور بد خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ بخاری و مسلم۔

محمد بن سیرین کا قول ہے کہ خواب تین ہوتے ہیں۔ (۱) نفس کا تخیل (۲) شیطان کی طرف سے ڈراوا۔ (۳) اللہ کی طرف سے بشارت (متفق علیہ) کبھی خواب کی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔ کشف اولیاء میں اگرچہ غلطی کا امکان ہوتا ہے مگر غلطی کا وقوع بہت ہی نادر ہے کیونکہ اولیاء انبیاء سے مشابہت رکھتے ہیں (فرق یہ ہے کہ) انبیاء ہمیشہ معصوم ہیں اور اولیاء اکثر (خطاء علمی سے) محفوظ ہوتے ہیں۔

رہا اولیاء کا علم حضوری بلکہ حضوری سے بھی زیادہ کاشف جس کو علم لدنی کہا جاتا ہے اور جس کا تعلق اللہ کی ذات و صفات سے ہوتا ہے تو اس میں خطا کا امکان نہیں ہوتا ہے وہ وجدانی اور قطعی ہوتا ہے بلکہ اس علم کا درجہ عام قطعی علوم سے اونچا ہوتا ہے ہر شخص کو اپنی ذات کا علم حضوری وجدانی ہوتا ہے کیونکہ خود ہی عالم ہے اور خود ہی معلوم (اپنی ذات) کو جاننے کے لئے کسی تصور کی ضرورت نہیں پڑتی اور اللہ کی ذات سے تعلق رکھنے والا صوفی کا وجدانی علم اس سے بھی بالاتر ہوتا ہے اللہ تو آدمی سے اتنا قریب ہے کہ وہ خود بھی اپنی ذات سے اتنا قرب نہیں رکھتا اللہ نے فرمایا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ یعنی ہم تم سے اتنا قرب رکھتے ہیں کہ تم خود اپنے سے اتنا قرب نہیں رکھتے مگر اے عوامی نظر رکھنے والو ہم تم کو نظر نہیں آتے۔ پس یہ لدنی علم اولیاء کو پیغمبروں کے توسل سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ پیغمبر تک پہنچنے کے درمیانی وسائل کتنے ہی زیادہ ہوں۔

ایک شبہ

آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ الخ میں روئے خطاب سب آدمیوں کی طرف ہے اور اس عمومی خطاب کا تقاضا ہے کہ سب لوگوں کو اللہ کی ذات کا حضوری علم بلکہ حضوری سے بالاتر علم حاصل ہو جائے۔

ازالہ

علم زندگی کے تابع ہے بغیر حیٰوۃ کے علم کا امکان نہیں اور سورۂ ملک کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ زندگی کی چار قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم کی زندگی وہ ہے جو اپنے ساتھ معرفت کو لاتی ہے یہ زندگی ذاتی اور صفاتی تجلی سے وابستہ ہے اسی زندگی کو حاصل کرنے کے لئے کسی علم اور تصوف کی ضرورت ہوتی ہے (یعنی عوام کو حیات معرفت آفریں حاصل نہیں)

سوال

اگر صوفیہ کا علم حضوری وجدانی قطعی ہے اور اس میں غلطی کا امکان نہیں تو پھر اقوال صوفیہ میں تعارض کیوں ہوتا ہے اور کیوں صوفیہ علم حضوری میں خطا کرتے ہیں تعارض اقوال کے لئے تو مثبت منفی دو علموں میں سے کسی ایک کا غلط ہونا لازم ہے کوئی توحید وجودی کا قائل ہے اور کوئی توحید شہودی کا (اور ظاہر ہے کہ یہ علم وجدانی اور قطعی ہے پھر شہودی اور وجودی کا فرق کیوں ہے اور ایک غلط کیوں ہے

جواب

علم حضوری کو بیان کرنے کے لئے الفاظ وضع ہی نہیں کئے گئے اس لئے الفاظ کے ذریعہ اس کی تصویر کشی میں اختلاف

ہو جاتا ہے چیز ایک ہی ہے بیان مختلف ہیں اختلاف علم حضوری میں نہیں بلکہ علم حضوری کو جاننے میں ہے اس لئے خطا اگر ہوتی ہے تو علم حضوری میں نہیں ہوتی بلکہ علم حضوری کے بیان میں ہوتی ہے۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے۔

گفتگو کفر و دیں آخر بیک جامی کشد خواب یک خواب ست باشد مختلف تعبیر ہا

اس شعر میں کفر سے مراد ہے کفر طریقت اور دین سے مراد ہے شریعت اور کفر طریقت کا نام ہے توحید وجودی۔

خلاصہ مقام یہ ہے کہ خالق و مخلوق کا باہمی تعلق وہ ہے جو کسی دو چیزوں میں نہیں ہے کیونکہ کوئی شئے کسی شئے کی خالق نہیں خالق صرف خدا ہے پس کسی چیز کی کسی چیز سے ایسی نسبت نہیں جو خالق کی مخلوق سے ہے۔ نقش کی نقاش سے اور لکڑی کے پیالہ کی صناع سے بھی نسبت ہے مگر دیسی نہیں جو مخلوق کی خالق سے ہے۔ نقش کا مادہ رنگ اور لکڑی کے پیالہ کا مادہ لکڑی ہے اور نقاش نہ رنگ کا خالق ہے نہ صناع لکڑی کا۔ بلکہ دونوں مادے خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں پھر فعل نقاش و صناع کے بعد صورت نقشیہ اور ہیت قدحیہ بھی خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے کوئی نقاش و صناع اس ہیت کا بھی خالق نہیں (بلکہ آلہ تخلیق اور ایجاد ہیت کی درمیانی کڑی ہے خالق ہر صورت کا بھی خدا ہی ہے) بلکہ صناع و نقاش کا عمل بھی خدا ہی کا پیدا کردہ ہے خواہ معتزلہ اس کو تسلیم نہ کریں (اور انسانی اعمال کا خالق انسان کو قرار دیں) مگر حقیقت یہی ہے کہ کوئی صناع (خالق نہیں) بعض افعال کا کاسب ہے اور دو خارجی یا ذہنی چیزوں میں نسبت یا عینیت کی ہوتی ہے یا غیریت کی یا ظلیت کی یا کچھ اور (مثلاً انسان اور حیوان ناطق دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں حقیقت میں دونوں ایک ہیں اور انسان پتھر سے غیر ہے اور فوٹو کی نسبت انسان سے ظلیت اور عکسیت کی ہے) اور خالق و مخلوق کے درمیان جو نسبت ہے وہ ان سب سے الگ ہے اس کو بیان کرنے سے ہر لفظ قاصر ہے کوئی لفظ اس کو ظاہر کرنے کے لئے کسی زبان میں بنا ہی نہیں پس اگر ہم کہتے ہیں کہ خالق مخلوق کا عین نہیں تو خیال کیا جاتا ہے کہ جب عین نہیں تو ضرور غیر ہو گا یا مخلوق کی اس سے نسبت ظلیت کی ہوگی حالانکہ ایسا بھی نہیں ہے یا اگر ہم کہیں کہ مخلوق خالق سے غیر نہیں تو چونکہ سلب غیریت اور عینیت میں لزوم ہے اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ جب مخلوق غیر خالق نہیں تو ضرور عین خالق ہوگی حالانکہ یہ بھی غلط ہے اسی طرح نفی عینیت سے وجود ظلیت پر استدلال کیا جاتا ہے حالانکہ مخلوق کی نسبت ظلیت کی بھی نہیں ہے مگر غیر نہ ہونا یعنی عین ہونا یا عین نہ ہونا یعنی غیر ہونا یا ظل ہونا صرف لفظی تعارض رکھتا ہے علم حضوری میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ تعارض مخلوق اور خالق کے درمیان جو نسبت ہے اس کو ظاہر کرنے سے ہر تعبیر اور ہر کلام قاصر ہے بس سب سے اعلیٰ تعبیر یہ ہے کہ یوں کہا جائے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ اور ہر علم حصولی کی اصل غرض اسی علم لدنی کا حصول ہے علم حصولی ظنی اصل مقصود نہیں یہ تو ظنی ہے اور ظن کوئی اہمیت نہیں رکھتا ظن سے واقعی قطعی علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے بذات خود علم حصولی مقصود نہیں۔

شبہ

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علم اولیاء علم انبیاء میں داخل ہے یا ظنی ہونے کی وجہ سے آیت کا حکم اس کو شامل ہی نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کہانت نجوم اور طب ایسے علوم ہیں جن کی بعض اوقات صداقت تجربہ سے ثابت ہوتی ہے (پھر کیا ان علوم کو قطعی علم غیب کہا جائے گا باوجودیکہ ان علوم کے جاننے والوں کو انبیاء نہیں کہا جاتا نہ وہ انبیاء ہوتے ہیں) بخاری نے بروایت ابو الناظور حاکم ایلیا کی بیان کردہ حدیث نقل کی ہے حاکم ایلیا مسلمان ہو چکا تھا اس کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں ہر قل ایلیا میں آیا تھا تو ایک روز صبح کو کچھ پریشان تھا کسی سردار نے پوچھا آج آپ کی حالت ہم غیر پاتے ہیں کیا وجہ ہے ہر قل نجومی تھا سوال کے جواب میں بولا آج رات جب میں نے نجوم کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ختنہ کرنے والی قوم کا بادشاہ بر آمد ہو گیا ہے۔ ہر قل نے اپنے اس مطالعہ کی اطلاع اپنے کسی دوسرے ساتھی کو بھی لکھ بھیجی جو ہر قل کی ہی طرح ماہر نجوم تھا اس کے خط سے بھی ہر قل کی رائے کی تائید ہو گئی اور اس نے لکھ دیا کہ نبی ﷺ بر آمد ہو گیا اور وہ واقعی نبی ﷺ ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ کاہنوں اور نجومیوں نے فرعون کو اطلاع دیدی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا اور فرعون کی حکومت کا زوال اسی کے ہاتھ سے ہوگا یہی وجہ تھی کہ فرعون بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرلو دیتا تھا اور لڑکیوں کو قتل نہ کراتا تھا۔ طبیب بھی مرض کی کیفیت اور مریض کو شفاء دینے والی دواء اور جڑی بوٹیوں کے خواص سے واقف ہوتے ہیں اور ان کا یہ علم کبھی قطعی ہوتا ہے۔

ازالہ

کاہن کی دی ہوئی خبر اگر صحیح نکلتی ہے تو وہی ہوتی ہے جو ملائکہ کی باہمی گفتگو سے چوری کے ساتھ جنات سن کر کاہن سے آکر کہہ دیتے ہیں اور ملائکہ بہر حال اللہ کے رسول ہیں مگر کاہن اور شیطان اس ایک سچی بات میں بکثرت جھوٹ کی آمیزش کردیتے ہیں اسی لئے شریعت نے کاہنوں کی تصدیق کی ممانعت فرمائی ہے حضور اقدس ﷺ کی بعثت کے بعد جنات کو چوری چھپے سننے ہی کی یا تو بالکل یا غالباً ممانعت ہوگئی اس لئے اب کہانت بے حقیقت ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کاہنوں کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا وہ کبھی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو سچی ہوتی ہے اور وہ بات (خدا کی طرف سے) حق ہوتی ہے جس کو کوئی جن لے جھپٹتا ہے اور مرغی کی ٹھونگ کی طرح اپنے دوست (کاہن) کے کان میں کٹ کٹ کردیتا ہے وہ سو سے زیادہ جھوٹ اس میں ملادیتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

رہا علم نجوم اور فن طب تو ان کی بنیاد تجربہ پر ہے اور تجربہ علم غیب نہیں علم شہادت ہے اور یہ امر زیادہ واضح ہے کہ دواؤں کی خاصیت و طبیعت کی شناخت اور ستاروں کے خواص یعنی سعادت و نحوست وغیرہ کی پہچان غرض یہ کہ علم طب اور علم نجوم دونوں علوم انبیاء سے حاصل کردہ چکارے ہیں نبوت کے چراغ کی کرنیں ہیں۔ روایت کا سلسلہ تو معدوم ہوگیا کتابوں میں ان کا وجود باقی رہ گیا اور لوگوں نے تجربہ کی شہادت پر ان دونوں علموں میں اکتفا کرلیا اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ وَقَالَ إِنِّيْ سَقِيْمٌ ابراہیمؑ نے ستاروں پر غور کی نظر ڈالی اور کہا میں بیمار ہوں یعنی عنقریب بیمار ہونے والا ہوں۔

بغوی نے سورۂ سبا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ بیت المقدس کے محراب میں جب حضرت سلیمانؑ ہوتے تھے تو روزانہ ایک درخت وہاں اگتا تھا آپ پوچھتے تھے تیرا کیا نام ہے وہ اپنا نام بتاتا تھا۔ پھر آپ دریافت کرتے تھے تو کس کام کے لئے ہے وہ جواب دیتا تھا ایسے ایسے کام کے لئے پھر آپ اس کو کاٹ دینے کا حکم دے دیتے تھے اگر وہ بوئے جانے کے قابل ہوتا تو اس کا پودا بودیا جاتا تھا اور اگر کوئی دواء ہوتی تھی تو اس کو (نام اور خاصیت کے ساتھ) لکھ لیا جاتا تھا آخر خروبہ بوٹی پیدا ہوئی آپ نے اس کا نام پوچھا اس نے خروبہ بتایا آپ نے پوچھا تو کس کام کے لئے ہے اس نے جواب دیا آپ کی مسجد کی ویرانی کے لئے یہ قصہ امام محمد غزالیؒ نے اپنی کتاب منقذ من الضلال میں ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ علم طب اور نجوم یقینی علوم نہیں کیونکہ دواؤں اور ستاروں کی تاثیر (بذات خود کچھ نہیں) ایک عادی امر ہے اللہ کا معمول ہے کہ دواؤں کو استعمال کرنے اور ستاروں کے طلوع ہونے کے بعد اللہ کچھ تاثیریں پیدا کردیتا ہے لیکن بہت مرتبہ وہ تاثیریں نمودار نہیں بھی ہوتیں یہ تو اللہ کی مشیت ہے جیسا چاہتا ہے کردیتا ہے۔ (دواء کا استعمال یا ستارہ کا طلوع بذات خود یقینی طور پر اثر آفریں نہیں) اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی نجوم کا قائل ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ کا معمول یہ ہے کہ اس ستارہ کے طلوع کے بعد اللہ یہ اثر پیدا کردیتا ہے تو ایسا عقیدہ رکھنے والا کافر نہیں ہوجاتا یہ بات تو ایسی ہی ہے جیسے کسی کا عقیدہ ہو کہ دواء پینے سے اللہ شفاء عطا کرتا اور زہر پینے سے موت مسلط کردیتا ہے وہاں جس شخص کا عقیدہ ہو کہ ستاروں کے طلوع غروب سے براہ راست کسی اثر کی پیدائش وابستہ ہے اور ستاروں کا طلوع غروب واقعات کا موجد اور علت تامہ ہے) تو ایسا عقیدہ رکھنے والا کافر ہوجائے گا جیسے دواء کو شفاء کی علت تامہ سمجھنے والا کافر

ہو جائے گا۔

حضرت زیدؓ بن خالدؓ جہنی نے فرمایا کہ ایک روز حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز ہم کو پڑھائی رات کو بارش ہو چکی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا کیا تم واقف ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو ہی بخوبی علم ہے (حضور نے فرمایا) اللہ نے ارشاد فرمایا میرے بندوں میں سے کچھ لوگ مومن رہے اور کچھ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا اللہ کے فضل و رحمت سے ہم پر بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان رکھنے اور ستاروں (کی تاثیر حقیقی کے) منکر ہوئے اور جنہوں نے کہا کہ فلاں فلاں ستاروں کے طلوع کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی وہ میرے منکر اور ستاروں کے عقیدت مند ہوئے۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر عقیدہ والا کافر ہے اور اول عقیدہ والا کافر نہیں۔ مگر فن نجوم میں مشغول ہونا ہے مطلقاً مکروہ کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے علم نجوم سے اقتباس کیا اس نے سحر کی ایک شاخ سے اقتباس کیا اس نے (بظاہر علم میں) زیادتی کی اور (حقیقت میں) کچھ زیادتی نہیں کی یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے احمد ابو داؤد اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے۔

اسی طرح علم خطوط و نقاط (علم رمل) بھی تعلیم انبیاء کا خوشہ چیں ہے مگر مفید ظن ہے قطعی نہیں ہے باقی بد شگونی بالکل بے حقیقت ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن حکم نے بیان کیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم جاہلیت کے زمانہ میں کچھ کیا کرتے تھے (مثلاً) کاہنوں کے پاس جاتے تھے (اب کیا حکم ہے) فرمایا کاہنوں کے پاس نہ جاؤ۔ میں نے عرض کیا ہم بد شگونی لیتے تھے فرمایا یہ تمہارا ذاتی تاثر ہوتا ہے اب یہ (شگون) تم کو (کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے) نہ روکے میں نے عرض کیا ہم میں سے کچھ لوگ لکیریں کھینچتے ہیں (اور اس طرح آئندہ کی خبر معلوم کرنا چاہتے ہیں) فرمایا ایک پیغمبر خط کشی (فن رمل کا عمل) کیا کرتے تھے اب جس کی کھینچی ہوئی لکیر اس کے موافق ہو جاتی ہے تو وہی ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

اسی طرح علم سحر بھی آسمان سے اترا تھا لیکن (اس کو کرنا) کفر ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ سورۂ بقر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

سوال

کبھی ان کافروں کو بھی غیب کی اطلاع ہو جاتی ہے جو سادھو بن کر بھوکے رہتے اور ریاضت کرتے ہیں۔

جواب

علم غیب کی اصل بنیاد کشف حجابات یا مطالعہ عالم مثال ہے لیکن درمیانی حجابات کیسے ہٹتے ہیں یا عالم مثال کا مطالعہ کس طرح ہو جاتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔)

(۱) صوفی جب شریعت کا اتباع کرتا ہے اور سنت پر چلتا ہے تو اس کے ظاہری اور باطنی حواس روشن ہو جاتے ہیں یہی روشنی اس کے لئے علم غیب کا ذریعہ ہوتی ہے اسی کو فراست مومن کہا گیا ہے۔

(۲) بھوکا رہ کر ریاضت اور نفس کشی کر کے بھی بعض اوقات درمیانی حجابات اٹھ جاتے ہیں اور مثالی شکلیں (یعنی غیر مادی عالم بالا کی تصویریں) نظر کے سامنے آجاتی ہیں مگر حقیقت میں یہ علم غیب نہیں ہوتا علم بالشہادۃ ہوتا ہے (جس چیز کا علم ہو جاتا ہے وہ یا اس کی مثالی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے) پھر یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ جب اولیاء کا علم کشفی و مثالی ظنی ہوتا ہے (یقینی نہیں ہوتا) اور اس میں غلطی کا امکان ہوتا ہے تو پھر ان شیطان کے چیلوں کے علم کی کیا وقعت ہے جن کو بہکانے کے لئے شیطان ان پر فریب القا کرتا ہے۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا نہ کر سکتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آیت میں علم غیب سے مراد ہے ظہور قطعی جو شیطان کی دخل اندازی سے بالکل پاک ہو اس کا ثبوت آئندہ آیت میں فرمایا ہے۔

فَإِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ رسول کے آگے پیچھے
یعنی ہر طرف اللہ کچھ نگراں چوکیدار مقرر کر دیتا ہے۔ رَصَد جمع ہے رَاصِد کی یعنی نگہداشت کرنے والے ملائکہ جو اس بات کی نگرانی رکھتے ہیں کہ کوئی شیطان چوری سے نہ سن لے یا وحی کے اندر کسی غیر وحی کو شامل نہ کر دے۔
مقاتل وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب اللہ کسی پیغمبر کو مبعوث فرماتا تھا تو ابلیس فرشتہ کی شکل میں نمودار ہو کر اس پیغمبر کو (کچھ اپنی طرف سے) اطلاع دیدیا کرتا تھا اس کی روک کے لئے اللہ نے کچھ فرشتے مامور کر دیئے جو شیطانوں کو مار بھگاتے تھے اور حامل وحی فرشتہ کے پاس بھی نہیں آنے دیتے تھے اب اگر شیطان فرشتہ کی شکل میں اس پیغمبر کے پاس آتا تھا تو یہ ملائکہ پیغمبر سے کہہ دیتے تھے یہ شیطان ہے اس سے احتیاط رکھو اور اگر اصل فرشتہ آتا تھا تو بتا دیتے تھے۔ یہ اللہ کا فرستادہ ہے آیت مذکورہ کے ہم معنی ایک اور آیت ہے فرمایا ہے لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ۔
لِّيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ تاکہ اللہ جان لے (یوں تو اللہ کو ہر چیز کا علم پہلے سے ہے یہاں) جاننے سے مراد ہے عملی تعلق کا کسی موجود کے ساتھ ظاہر ہو جانا یہی مراد آیت لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ میں بھی ہے۔ شیاطین سے حفاظت کرنے کے لئے ملائکہ کو مامور کرنے کی یہ علت ہے مطلب یہ ہے کہ حفاظت وحی کے بعد اللہ کو معلوم ہو جائے کہ پیغمبروں نے اپنے رب کے پیام بلا کم و بیش پہنچا دیئے حاصل کلام یہ کہ پیغمبر اللہ کے پیام کو بغیر تبدیل تغیر اور آمیزش کے پہنچا سکیں اسی غرض کے لئے اللہ نے حفاظت وحی کے لئے فرشتوں کو مقرر کر دیا ہے۔
بعض لوگوں نے لِيَعْلَمَ کا فاعل رسول کو قرار دیا ہے مطلب یہ کہ رسول کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اور اس کے دوسرے پیغمبر بھائیوں نے صحیح صحیح اللہ کے پیغام پہنچا دیئے اور شیطان اس میں کوئی مداخلت نہ کر سکا نہ اس کو بگاڑ سکا نہ اس میں آمیزش کر سکا۔ یا أَبْلَغُوا کا فاعل ملائکہ ہے مطلب یہ کہ پیغمبر کو معلوم ہو جائے کہ ملائکہ نے اللہ کا پیام صحیح سالم بغیر شیطان کی دخل اندازی کے مجھ تک پہنچا دیا۔
وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ یعنی پیغمبروں کو جو علم دیا گیا ہے اللہ اس کو محیط ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔
وَأَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ اللہ نے ہر چیز کا عددی احاطہ کر رکھا ہے پہاڑوں کے وزن کی تعداد، دریاؤں کے ناپ کی تعداد۔
بارش کے قطروں کی تعداد درختوں کے پتوں کی تعداد غرض ان تمام چیزوں کی تعداد جو رات کے اندھیرے یا دن کی روشنی میں ہوں اللہ کو معلوم ہے۔ واللہ اعلم سورۂ جن ختم ہوئی بحمد اللہ۔

ع ۲ ۱۲

سورۃ المزمل

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۰ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ (مُزَّمِّل اسم فاعل ہے اس کا مصدر تَزَمُّل ہے) تزمل کی تاء کو زاء میں ادغام کر دیا گیا اس کا معنی ہے کپڑوں میں لپٹ جانا تزمل ثیابہ اس نے اپنے اوپر کپڑے لپیٹ لئے۔ مدثر کے بھی یہی معنی اور یہی اصل ہے تبلیغ رسالت سے پہلے ابتداء وحی میں رسول اللہ ﷺ کو اسی خطاب سے مخاطب کیا گیا اس وقت دہشت کے مارے حضور ﷺ کپڑے لپیٹے ہوئے تھے اس زمانہ کے بعد پھر نبی اور رسول فرما کر خطاب کیا گیا۔

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ توقف وحی کے متعلق بیان فرما رہے تھے کہ میں پیدل جا رہا تھا اچانک ایک آواز سنی اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو حراء میں میرے پاس آیا تھا کرسی پر بیٹھا آسمان وزمین کے درمیان (معلق) موجود تھا مجھے اس سے اتنا ڈر لگا کہ قریب تھا زمین پر گر جاؤں گھر لوٹ کر آیا تو میں نے گھر والوں سے کہا مجھے کپڑے اڑھاؤ۔ اس وقت اللہ نے یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ آیت فَاهْجُرْ تک نازل فرمائی پھر وحی گرما گرم ہوگئی اور پے در پے آنے لگی۔ متفق علیہ

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت کردہ طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پاس جا کر فرمایا مجھے کپڑے اڑھاؤ۔ مجھے کپڑے اڑھاؤ گھر والوں نے کپڑے اڑھا دیئے۔ یہاں تک کہ آپ کی دہشت جاتی رہی ہم اس حدیث کو سورۂ اقراء میں ذکر کریں گے۔ بزار اور طبرانی نے ضعیف سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا مشورہ گھر (چوپال) میں قریش نے جمع ہو کر کہا اس شخص کا کوئی خاص نام رکھ دو کہ لوگ اس نام کو لے کر مکہ سے باہر نکلیں اور وہ نام اطراف ملک میں مشہور ہو جائے) لوگوں نے کہا اس کو کاہن کہو دوسرے کہنے لگے یہ کاہن تو نہیں ہے کہنے لگے دیوانہ کہہ دو۔ دوسروں نے کہا یہ دیوانہ بھی نہیں ہے کہنے لگے ساحر کہو۔ بولے ساحر بھی نہیں ہے رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع پہنچی تو آپ ﷺ کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئے اس وقت جبرئیل (علیہ السلام) آئے اور یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ اور یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کہا۔

قُمِ یعنی نماز پڑھ قیام سے نماز مراد ہے جزء بول کر کل مراد لیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیام رکن صلوٰۃ ہے یہی اجماعی فیصلہ ہے۔

الَّیْلَ رات بھر۔ اَللَّیْل ظرف زمان ہے حرف جر (فی) کا حذف بتا رہا ہے کہ پوری رات مراد ہے جیسے بولا جاتا ہے صمت شھرا میں نے پورے مہینہ کے روزے رکھے لیکن صمت فی الشھر کا یہ معنی نہیں ہے۔ میں نے مہینہ میں روزے رکھے یعنی مہینہ کے بعض حصوں میں۔

اِلَّا قَلِیْلًا ۝۲ اس استثناء کی وجہ سے قیام کا حکم رات کے کچھ حصہ میں باقی رہ گیا۔ لیکن استثناء مبہم ہے جس کی وجہ سے اس بات میں بھی ابہام رہ گیا کہ رات کے کتنے حصہ میں قیام کا حکم باقی ہے اس ابہام کو دور کرنے کے لئے فرمایا۔

نِّصْفَهٗٓ یہ اَللَّیْل سے بدل ہے جب کہ لیل سے قلیل کا استثناء کر لیا گیا ہو تو گویا بدل کل ہے (بدل بعض نہیں حالانکہ نصف لیل کل لیل کا جزء ہے مگر استثناء کے بعد لیل سے مراد کل لیل نہیں جز لیل مراد ہے اور وہ جزء باقی بعینہ نصف لیل ہے اس لئے بدل کل ہو گیا) کیونکہ قاعدہ ہے کہ استثناء کے بعد جو حصہ باقی رہتا ہے وہ منطوق کے حکم میں ہوتا ہے (پس استثناء کے بعد کل لیل باقی نہیں بلکہ جز لیل باقی رہا اور اسی جز سے نصفہ بدل ہے پس) اصل کلام یوں ہوا کہ رات کے بعض حصہ

میں نماز پڑھو یعنی آدھی رات۔

بعض اہل تفسیر نے نصفہ کو قلیل کا بدل اور بیان قرار دیا ہے۔ مستثنیٰ کی تعیین نصفہ کہنے سے ہو گئی اور استثناء کے بعد جو حصہ باقی رہ گیا اس کا ابہام دور ہو گیا (یعنی آدھی رات حکم قیام سے مستثنیٰ ہے لامحالہ آدھی باقی رہی) حاصل دونوں کا ایک ہی ہے لفظ قلیل کا نصف پر اطلاق اس لئے کیا گیا کہ کل کے مقابلہ میں نصف قلیل ہی ہوتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نصف رات میں نماز نہ پڑھنا یعنی سونا معمولاً سونے سے کم ہی ہوتا ہے کیونکہ اللہ نے رات آرام کے لئے بنائی ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب آدھی رات تہجد کی نماز کے لئے ہو گئی اور دوسرے نصف میں مختلف مشاغل بھی ہوئے مغرب اور عشاء کی نمازیں کھانا پینا قضائے حاجت وغیرہ تو سونے کے لئے آدھی رات سے کم حصہ باقی رہا۔

بعض لوگوں نے نصفہ کو اللیل سے بدل قرار دیا ہے اور استثناء اس نصف سے مانا ہے گویا اصل کلام یوں تھا قم نصف اللیل الا قلیلا آدھی رات نماز پڑھو مگر آدھی رات میں سے بھی کچھ حصہ مستثنیٰ ہے۔ اس صورت میں لفظ نصف کے ذکر سے پہلے استثناء لازم آئے گا۔ اسکے علاوہ یہ بھی قباحت ہو گی کہ نصف کا لفظ چونکہ اللیل سے بدل بعض ہو گا اور بدل بعض قصر میں استثناء کی طرح ہوتا ہے تو قصر استثنائی کا قصر بدل سے مقدم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ بیان کے بعد بھی کلام مجمل رہے گا۔

اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿۳﴾ قم پر عطف ہے یعنی وہ نصف جو استثناء کے بعد باقی رہتا ہے اس میں سے کچھ اور کم کر لو اس وقت نصف النصف یعنی چہارم حصہ سے کچھ زیادہ قیام ہو گا۔

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ یا نصف سے جتنا چاہو زیادہ کر لو۔ اس آیت میں جس قیام کا حکم دیا گیا ہے وہ چوتھائی شب سے زیادہ ہوا خواہ گھڑی بھر ہی کی زیادتی ہو۔ ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں قیام کا حکم وجوبی ہے کیونکہ امر کا اصل تقاضا وجوب ہے۔ اس جگہ بغوی کے کلام کا جو حضرت عائشہؓ وغیرہ کی حدیث سے مستفاد ہے۔ مقتضی یہ ہے کہ اس آیت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت پر پہلے قیام شب واجب تھا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ بغوی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابہؓ قیام شب کرتے تھے لیکن کسی کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ تہائی رات کب ہوئی اور نصف کب ہوئی اور دو تہائی کب ہوئی۔ اس طرح ساری رات قیام میں گزرتی تھی تاکہ کہیں واجب مقدار فوت نہ ہو جائے۔ یہ بات صحابہؓ پر بہت شاق گزرتی تھی یہاں تک کہ ان کے پاؤں پر ورم آ گیا تھا آخر میں اللہ نے رحم فرمایا حکم میں تخفیف فرما دی اور آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ سے حکم کو منسوخ کر دیا اب قیام سنت رہ گیا (وجوب ساقط ہو گیا)

سعید بن ہشام کا بیان ہے میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا ام المومنین مجھے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق بتائیے۔ فرمایا کیا تو قرآن نہیں پڑھتا میں نے عرض کیا پڑھتا کیوں نہیں ہوں فرمایا تو رسول اللہ ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ میں نے عرض کیا رسول اللہ ﷺ کے قیام شب کے متعلق فرمائیے۔ فرمایا کیا تو يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ نہیں پڑھتا میں نے عرض کیا پڑھتا کیوں نہیں ہوں فرمایا اس سورت کے شروع میں اللہ نے قیام فرض کر دیا تھا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ سال بھر تک رات کو قیام کرتے رہے یہاں تک کہ پاؤں سوجھ گئے۔ سورت کی آخری آیات کو بارہ مہینے تک اللہ نے آسمان پر روکے رکھا پھر سورت کے آخر میں تخفیف نازل فرما دی اس کے بعد قیام شب نفل ہو گیا۔ ابوداؤدؒ، نسائیؒ، بغوی اور حاکم و ابن جریر نے اسی طرح کی روایت حضرت ابن عباسؓ کی نقل کی ہے۔

مقاتلؒ اور ابن کیسانؒ کا بیان ہے کہ یہ واقعہ (یعنی فرضیت قیام شب) پنجگانہ نماز کے فرض ہونے سے پہلے کا ہے جو مکہ میں تھا جب پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو فرضیت قیام منسوخ ہو گئی۔

میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ فرضیت قیام رسول اللہ ﷺ کی ذات کیساتھ مخصوص تھی کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ اللہ جانتا ہے کہ تم دو تہائی رات سے کم اور آدھی رات اور تہائی رات نماز پڑھتے ہو اور تمہارے ساتھیوں کا ایک گروہ بھی نماز پڑھتا ہے اس آیت میں مِنَ الَّذِيْنَ کا

مِنْ تبعیضیہ ہے جو بتارہا ہے کہ بعض صحابیؓ نماز شب پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے (اگر عمومی فرض ہوتا تو سب پڑھتے۔

سوال

اگر فرضیت قیام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہوتی تو مندرجہ ذیل آیت میں امت سے بار کم کرنے کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے۔ (جب امت پر فرض ہی نہ تھا کہ تو تخفیف فرض کے معنی ہی کیا ہوسکتے ہیں)

اللہ نے (حکم تخفیف کے سلسلہ میں) فرمایا عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اللہ کو معلوم ہے کہ آئندہ تم میں سے کچھ لوگ بیمار ہوں گے کچھ فضل خدا (روزی) کی طلب میں سفر کریں گے کچھ راہ خدا میں جہاد کریں گے۔ اس آیت کا تقاضا ہے کہ امت کی حالت اور ضعف کے پیش نظر حکم میں تخفیف کی گئی ہے۔

جواب

فرض تو رسول اللہ ﷺ پر ہی تھا لیکن تخفیف امت کے ضعف کو دیکھ کر کی گئی کیونکہ جس عمل پر رسول اللہ ﷺ نے مداومت کی ہو (خواہ بر طریق وجوب یا بطور نفل) اس کا اتباع سنت ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ امت اس پر عمل کرے مگر بر طریق وجوب نہیں (کہ اس کو ترک کرنے والا مستحق عذاب ہو جائے) بلکہ اس طور پر کہ ترک کرنے والے کو صرف ملامت کی جائے اللہ نے فرمایا ہے وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ بعض لوگوں کا قول ہے کہ مسنون صرف وہی چیز ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے بطور نفل مداومت کی ہو نفل کے ساتھ اس تعریف کو مقید کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ صوم وصال سے احتراز ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ےۃ کے روزے رکھے اور مداومت کی لیکن امت کے لئے ےۃ کا روزہ رکھنا مسنون نہیں)

علماء کا یہ قول غلط ہے کیونکہ اصل چیز رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور اتباع ہے خواہ حضور نے وہ کام بطور وجوب کیا ہو یا بطور نفل ہاں یہ ضروری ہے کہ امت کے حق میں وہ عمل حرام یا مکروہ تحریمی نہ ہو۔ جیسے ےۃ کا روزہ یا ایک وقت میں چار عورتوں سے زائد سے نکاح (یہ دونوں کام رسول اللہ ﷺ نے کئے مگر امت کے لئے جائز نہیں) مداومت رسول کو نفل مداومت کے ساتھ مشروط کرنا بے اصل بات ہے۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ اس کا عطف قُمِ الَّيْلَ پر ہے بعض لوگوں نے کہا کہ بالاتفاق ترتیل قرآن مستحب ہے اور جب اس کا عطف قیام کے حکم پر ہے تو اس عطف کا تقاضا ہے کہ قیام بھی مستحب ہو (واجب نہ ہو) مگر یہ استدلال غلط ہے (کیونکہ اول تو امر کا امر پر عطف نہیں چاہتا کہ دونوں وجوبی یا استحبابی ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر وجوب یا استحباب میں شرکت بھی عطف کی وجہ سے ضروری قرار دی جائے تب بھی مسئلہ برعکس ہونا چاہئے معطوف حکم معطوف علیہ میں ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اعراب اور نوعیت اعراب اول کی ہو وہ دوسرے کی ہونی چاہئے وجوب واستحباب میں اس کو کیا دخل ہے اور بالفرض شرکت وجوب واستحباب ہی ضروری ہو تو اول واجب ہے اس لئے دوسرے کو بھی واجب ہونا چاہئے نہ یہ کہ دوسرا مستحب ہے اس لئے اول کو بھی مستحب ہونا چاہئے اول اصل ہے اور دوسرا اس کی فرع۔ فرع کا حکم اصل کا حکم ہوتا ہے نہ یہ کہ اصل کا حکم فرع کے حکم کے موافق ہو)

حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا پڑھ اور ترقی کر اور ترتیل کر۔ تیری منزل اس آخری آیت کے پاس ہے جو تو پڑھتا تھا۔ احمد ترمذی ابوداؤد نسائی۔

ترتیل کا معنی ہے سہولت اور راستی کے ساتھ زبان سے لفظ کو نکالنا۔ صراح وقاموس۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ قرآن کو کھول کر بیان کر حسن بصریؒ سے بھی یہی مطلب منقول ہے مجاہدؒ

نے کہا ترتیل کا معنی ہے ایسی قرات جس میں ارسال ہو۔ قتادہؒ نے کہا حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی قرات کیسی تھی فرمایا کھینچ کر تھی پھر آپ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی قرات اللہ اور الرحمن اور الرحیم کی کھینچ کر کی۔ بخاری۔

میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لام کے بعد اور الرحمٰن کی میم کے بعد الف کا اظہار ایک حرکت کی برابر کیا اور الرحیم میں وقف کی حالت میں دو حرکتوں کی برابر ہی جائز ہے اور وصل کی حالت میں تو بالاجماع الرحیم میں بھی ایک ہی حرکت کے برابر مد کیا جائے گا۔ حضرت ام سلمہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی قرات دریافت کی گئی تو آپؐ نے قرات نبوی ﷺ کی تشریح کرتے ہوئے ایک ایک حرف کھول کر پڑھا یعنی فرمایا کہ ایک ایک حرف علیحدہ علیحدہ پڑھتے تھے (تمام حروف الگ الگ سمجھ میں آجاتے تھے) ترمذی ابوداؤ۔ نسائی یہ بھی حضرت ام سلمہؓ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ قرات توڑ دیتے تھے۔ (یعنی) الحمد للہ رب العالمین پڑھ کر ٹھہراؤ کرتے تھے پھر الرحمٰن الرحیم پڑھ کر ٹھہراؤ کرتے تھے۔ ترمذی۔ میں کہتا ہوں ترتیل کے اندر خوش آوازی سے قرآن پڑھنا بھی شامل ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے اللہ کسی چیز کی طرف اتنا متوجہ نہیں ہوتا جتنا نبی ﷺ کی خوش آوازی سے قرآن پڑھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے (ہم نے اذن کا ترجمہ متوجہ ہونا کیا لفظی ترجمہ ہے کان لگانا) بخاری و مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی دوسری روایت میں ہے اللہ اتنی (سننے میں) توجہ کسی چیز کی طرف نہیں کرتا جتنی اس خوش آواز نبی ﷺ کی طرف کرتا ہے جو بلند آواز سے قرآن پڑھ رہا ہو۔ بخاری و مسلم۔

یہ بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جو قرآن کی قرات میں تغنی نہ کرے وہ ہم سے غیر متعلق ہے۔ بخاری۔ تغنی سے مراد گانا نہیں ہے۔ یہ تو حرام ہے بلکہ خوش آوازی سے پڑھنا مراد ہے بعض روایات میں خوش آوازی سے پڑھنے کی صراحت بھی آئی ہے۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قرآن کو عرب کے لہجوں اور آوازوں میں پڑھو۔ اہل عشق اور یہود و نصاریٰ کی لے سے پرہیز رکھو میرے بعد کچھ لوگ آئیں گے جو قرآن میں گٹ کری لگائیں گے جیسے گانے اور نوحہ کرنے میں گنکری کی جاتی ہے قرآن ان کے حلق سے آگے نہیں بڑھے گا۔ ان کے دل اور ان کی اس کیفیت کو پسند کرنے والوں کے دل فتنہ زدہ ہوں گے۔ بیہقی فی شعب الایمان۔

فائدہ

قرآن کے نصیحت آفریں الفاظ و معانی پر غور کرنا عذاب کی آیت پڑھ کر ڈرنا اور ثواب کی آیت پڑھ کر امیدوار ہونا وغیرہ وغیرہ ترتیل کے فوائد ہیں۔

بغویؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کو نہ بکھیرو نہ شعروں کی طرح گاؤ اس کے عجائب پر ٹھہراؤ کرو اس سے دلوں کو ہلا دو اور سورت کو آخر تک ختم کرنا ہی تمہارا اصل مقصود نہ ہو۔

حضرت حذیفہؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز شب پڑھی آپ ﷺ جب بھی جنت کے ذکر والی آیت پر پہنچے تو ضرور ٹھہر کر اللہ سے جنت کی درخواست کی اور جب بھی دوزخ کے ذکر والی آیت پر پہنچے تو ٹھہر کر دوزخ سے پناہ مانگی۔

حضرت عبید ملکی صحابیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے قرآن والو قرآن کو سرہانہ نہ بناؤ اور اوقات شب و روز میں اس کی تلاوت کرو اور جیسا حق ہے ویسی تلاوت کرو۔ قرآن کو پھیلاؤ۔ قرآن کو خوش آوازی سے پڑھو قرآن کے مضامین پر غور کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو اس کی قرات جلدی جلدی نہ کرو۔ اس کی (تلاوت کا بھی) ثواب ہے۔ بیہقی۔

حضرت سہل بن عبد ساعدی نے فرمایا ہم قرآن پڑھ رہے تھے اچانک حضور اقدس ﷺ برآمد ہوئے اور فرمایا اللہ کی کتاب ایک ہے تم میں علماء بھی ہیں اور تم میں کالے گورے بھی ہیں قرآن پڑھو۔ اس زمانہ سے پہلے پڑھو جب کہ کچھ لوگ ایسے آئیں گے کہ قرآن پڑھیں گے اور ایسے درست حروف ادا کریں گے جیسے تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے مگر قرآن ان کے حلق سے

آگے نہیں بڑھے گا وہ فوری اجر قرآن کے طالب ہوں گے اجر قرآن میں تاجیل نہیں کریں گے (یعنی ثواب آخرت کے طالب نہیں ہوں گے)

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ بعض کا قول ہے کہ قَوْلًا ثَقِیْلًا سے مراد ہے نماز شب کا حکم کیونکہ نماز شب نفس کے لئے بہت گراں ہے اس تفسیر پر یہ جملہ سابق جملہ کی تاکید اور ضمیمہ ہے اور سَنُلْقِیْ میں سین استقبال کے لئے نہیں ہے صرف تاکید کے لئے ہے۔ بعض کے نزدیک قرآن مراد ہے محمد بن کعب نے کہا منافقوں پر قرآن بھاری ہوتا ہے میں کہتا ہوں اس صورت میں یہ قول كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ کی طرح ہوگا۔ مشرکوں پر وہ امر گراں ہے جس کی تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔ حسن بن فضل کا قول ہے کہ میزان میں بھاری ہوگا۔ میں کہتا ہوں اسی کی مثل وہ حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے، کہ دو کلمے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں میزان میں بھاری ہوں گے رحمٰن کو پیارے ہیں یعنی سبحان الله وبحمده سبحان الله العظیم بخاری و مسلم۔

مقاتل نے کہا قرآن ثقیل ہے اس لئے کہ اس میں امر نہی اور حدود ہیں۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے ابو العالیہ نے کہا وعدہ اور وعید کی وجہ سے ثقیل ہے ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ قرآن میں سخت اوامر و نواہی ہیں وعدہ ثواب اور وعید عذاب ہے اور قیامت کا تذکرہ ہے اور جن لوگوں کو ان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے ان کے لئے یہ بار ہیں خصوصاً رسول اللہ ﷺ پر تو اس کا بار مزید ہے آپ خود بھی اس بار کو اٹھانے پر مامور ہیں اور امت سے اٹھوانے پر بھی۔ اسی لئے حضور نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والی (سورتوں) نے بوڑھا کر دیا۔ یہ حدیث عتبہ بن عامر اور ابو حجیفہ کی روایت سے طبرانی نے نقل کی ہے حضور ﷺ کی مراد یہ ہے کہ اس میں اللہ نے حکم دیا ہے فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ تم بھی حسب الحکم استقامت رکھو اور تمہارے ساتھ جو لوگ مومن ہیں وہ بھی استقامت رکھیں۔ (اس دوہرے حکم نے رسول اللہ ﷺ کو بوڑھا کر دیا) یا یہ مراد ہے کہ اس میں قیامت کا اور گزشتہ اقوام پر عذاب آنے کا ذکر ہے۔ (اس ہیبت نے حضور کو بوڑھا کر دیا) آخر الذکر مطلب کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حاکم نے ابو بکرؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ حضور نے فرمایا مجھے سورۂ ہود اور الواقعہ اور المرسلات اور عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔ ترمذی بروایت حضرت ابن عباسؓ اور حاکم بروایت حضرت ابو بکر اور ابن مردویہ بروایت حضرت سعد۔ اسی قسم کی روایت حضرت انس سے بھی آئی ہے جس کو عبد اللہ ابن احمد نے بیان کیا ہے اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بوڑھا کر دیا کیونکہ ان میں قیامت کا تذکرہ اور قوموں کے واقعات کا بیان ہے۔

بعض لوگوں نے کہا غور کرنے والے کے لئے قرآن ثقیل ہے کیونکہ غور کرنے کے لئے اس کو مزید باطنی تصفیہ اور فکری تجرید کی ضرورت ہوتی ہے قرآن کے معانی کا استحکام اور متانت اس کی طالب ہے یہ توجیہ گزشتہ اور آئندہ (آیات) کے مناسب ہے اس لئے کہ غور کرنے اور سمجھنے کے لئے ترتیل ہے اور رات کو اٹھنا دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کے لئے بہت سخت ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ صوفی کے باطن کے لئے قرآن ثقیل ہے کیونکہ مخلوق کے دل پر خالق بزرگ و برتر جلوہ پاش ہوتا ہے۔ فراء کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے فراء نے کہا قرآن ثقیل ہے خفیف اور لچر نہیں ہمارے رب کا کلام ہے۔

ہمارے شیخ اجل مرشد کامل نے فرمایا کہ حقیقت کا انکشاف سالک کے باطن کے لئے بڑا وزنی ہوتا ہے اسی لئے اللہ نے فرمایا اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا میں کہتا ہوں اس معرفت کی تائید آیت لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ سے ہوتی ہے اور یہی معنی ہے اس قول کا کہ قرآن کو قبول کرنا ثقیل ہے۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب وحی اترتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے اور چہرہ مبارک فق ہو جاتا تھا ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضور بھی سر جھکا لیتے تھے اور صحابہؓ بھی جب کیفیت وحی زائل ہو جاتی تو سر

اٹھاتے تھے۔
صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حارث بن ہشام نے خدمت مبارک میں عرض کیا یارسول اللہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے۔ فرمایا کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ زیادہ تکلیف رساں ہوتی ہے کیفیت وحی دور ہوتی ہے تو میں اس کو محفوظ رکھ چکا ہوتا ہوں۔ کبھی فرشتہ آدمی کی شکل میں آکر کلام کرتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد رکھتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا میں نے خود دیکھا کہ آپ پر وحی اتر رہی تھی سخت سردی کا دن تھا جب وحی منقطع ہوئی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔ (متفق علیہ)
یہ بھی احتمال ہے کہ ثقیل کا معنی یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا رخ پہلے اللہ کی طرف تھا توجہ الی اللہ میں (ہمہ تن) مشغول تھے غار حراء کی تنہائی میں شاشب عبادت کرتے تھے اسی حالت میں حکم ہوا قُمْ فَاَنْذِرْ اور اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ اب دعوت تبلیغ ہدایت اور تکمیل کے لئے مخلوق کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا اور یہ امر دشوار اٹھانا پڑا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ گھر والوں کی طرف جانا اور اس کے لئے توشہ لینا پھر لوٹ کر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے پاس جانا اور غذا حاصل کرنا یہ امر ثقیل تھا۔ کذافی الصحیحین فی حدیث عائشہ دوسروں کو ہدایت کرنا اور کامل بنانا اگرچہ خود کمال حاصل کرنے اور خلوت میں رہنے سے مخلوق کی طرف رخ کرنا اور اس کو ہدایت کرنا ادنی ہے (مگر حقیقت اس کے خلاف ہے) اسی لئے کہا گیا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے (کیونکہ ولی کا رخ خدا کی طرف اور نبی کا رخ مخلوق کی ہدایت کی طرف ہوتا ہے)
اس قول کی مراد یہ ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے کیونکہ ولایت میں اللہ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور نبوت میں مخلوق کی طرف۔ مگر حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے یہ قول تحقیق پر مبنی نہیں ہے ولایت کا درجہ (کسی کا ہو ولی کا ہو یا نبی کا) نبوت کے درجے سے ادنی ہے نبوت بہر حال ولایت سے افضل ہے کیونکہ صوفیہ کی نظر میں نبوت نام ہے سیر ذات کا اور ولایت نام ہے سیر صفات کا اور دونوں میں بڑا فرق ہے اصطلاح صوفیہ میں خدا کی طرف رخ کرنے کو عروج اور مخلوق کی طرف متوجہ ہونے کو نزول کہتے ہیں دونوں سیروں میں صوفی کو دونوں مقام پیش آتے ہیں مقام ولایت میں اترنے والے کی توجہ خواہ مخلوق کی طرف ہو مگر عروج کی انتہا تک چونکہ اس کی رسائی نہیں ہوتی اس لئے کمال کی طلب میں اس کا رخ اوپر کے مراتب کی طرف ہوتا ہے اور مقام نبوت پر پہنچ جانے والا کمال کو پہنچ چکا ہوتا ہے اور کمال عروج تک پہنچ جانے کے بعد ہی اس کا نزول (خلق) کی طرف ہوتا ہے اس لئے وہ بالکل مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ دوسروں کو حسب حکم خداوندی کامل بنادے خواہ یہ عمل اس کی طبیعت اور مراد کے خلاف ہی ہو لہٰذا اس کا درجہ افضل اور اکمل ہوتا ہے اور جب تک یہ دوسری زندگی (یعنی تبلیغ وارشاد کی زندگی) باقی رہتی ہے یہ جہاد باقی رہتا ہے (کہ نبی کی طبیعت یکسو ہو کر اللہ کی طرف مکمل توجہ رکھنی چاہتی ہے اور حکم خداوندی اس کو تبلیغ وارشاد کے لئے مخلوق کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور رکھتا ہے) آخر اس تبلیغی زندگی سے فارغ ہو کر نبی رفیق اعلیٰ سے مل جاتا ہے اور اس وقت بالکل مراتب عالیہ کی طرف اس کا رخ ہو جاتا ہے اور دونوں قسم کے مراتب اس کو نصیب ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنی زندگی کی تکمیل کا ثواب دوسرا ان لوگوں کے ہدایت یاب ہونے کا ثواب جو نبی کی رہنمائی سے راہ راست پر چلے۔
غرض یہ کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ کا جملہ یا سابق جملہ کا ضمیمہ اور تاکید ہے یا قیام شب کی حکمت بیان کرنے کے لئے مستقل جملہ ہے کیونکہ قیام شب سے نفس کی ریاضت ہوتی ہے اور طبیعت کی مخالفت کی مشق ہوتی ہے یا یہ کہ نماز بجائے خود رسول اللہ ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک تھی۔ احمد نسائی اور بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ نماز میں میرے لئے خنکی چشم بنادی گئی ہے۔ ابوداؤدؒ نے ایک خزاعی صحابیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے (حضرت بلالؓ سے) فرمایا بلالؓ نماز کی اقامت کہہ کر ہم کو سکھ پہنچاؤ۔ گویا مخلوق کی طرف متوجہ ہونے کا جو بار رسول پر پڑتا تھا اس کی تلافی تہجد سے ہو جاتی تھی یا یوں کہا جائے کہ نبی ﷺ کے تہجد کا اثر براہ راست نفوس امت پر پڑتا ہے پس قیام شب سے امت کے نفوس کو

متاثر کرنا مقصود ہے تاکہ امت والے جب نبی ﷺ کے قول کو سنیں تو مان لیں جیسے دعوت نبی ﷺ کو سن کر جنات نے مانا تھا۔ یا یہ کہا جائے کہ (قیامت کے دن) مقام شفاعت میں قیام کرنے سے قیام شب کو خاص تعلق ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ازہری نے کہا نَاشِئَۃ بروزن فَاعِلَۃ عَافِیَۃ کی طرح مصدر ہے یعنی رات کو کھڑا ہونا حضرت عائشہؓ نے فرمایا سونے کے بعد رات کو (نماز کے لئے) اٹھنا اس صورت میں نَاشِئَۃُ اللَّیْلِ اور تہجد کا ایک ہی معنی ہوگا۔ ابن کیسان نے کہا آخر شب میں اٹھنا نَاشِئَةَ الَّيْلِ ہے سعید بن جبیر نے کہا حبشی زبان میں نشاء کا معنی ہے قام (اٹھا کھڑا ہوا) اس لئے رات کی جس ساعت میں قیام ہو وہ ناشئۃ ہے ابن زید کا بھی یہی قول ہے عکرمہؒ نے اول شب میں قیام کو ناشئۃ کہا ہے۔

بغوی نے حضرت امام زین العابدینؒ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت امام حسینؓ مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھتے تھے اور فرماتے تھے یہ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ہے۔ عکرمہؒ اور امام حسینؓ کے اقوال بظاہر اس مقام کے مناسب نہیں (یعنی اس جگہ مراد نہیں ہیں) کیونکہ رسول اللہ ﷺ پچھلی رات کے قیام پر مامور تھے حسنؒ نے کہا عشاء کے بعد ہر نماز نَاشِئَۃ ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ ناشئۃ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اسم فاعل (اٹھنے والا) ہی یہاں مراد ہے یعنی خوابگاہ سے عبادت کے لئے اٹھنے والا نفس۔ یہ اسم فاعل نشاء من مکانہ سے بنا ہے (فلاں شخص اپنی جگہ سے اٹھ گیا یعنی) رات کی تمام ساعتوں میں اٹھا۔ رات کی ہر ساعت بھی نَاشِئَۃ ہے کیونکہ ہر ساعت آغاز نشوء کا وقت ہے (گویا اس وقت ناشیہ بمعنی ظرف ہوگا) اسی سے ہے نشات السحابہ و بدت بادل اٹھا اور نمودار ہوا پس جو واقعہ رات کو پیدا ہوا اور نمودار ہو وہ ناشی ہے اور ناشی کی جمع ناشئۃ ہے۔ ابن ملیکہ نے بیان کیا میں نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن زبیر سے ناشئہ کے معنی دریافت کئے دونوں نے فرمایا پوری رات ناشئہ ہے اس تقدیر پر ناشئہ کی لیل کی طرف اضافت بیانیہ ہوگی۔

هِيَ اَشَدُّ وَطْـًٔا ابن عامر اور ابو عمر کی قرأت میں وِطَاءً ہے وِطَاءً کا معنی ہے موافقت یعنی قیام شب کے اوقات میں قلب کی موافقت زبان سے خوب ہوتی ہے (زبان سے تلاوت اور قلب میں حضور ہوتا ہے) دن میں قلب کی طرف سے زبان کی موافقت رات کی برابر نہیں ہوتی جمہور کی قرأت میں وَطْأً ہے وَطْأً کا معنی ہے بار یعنی دن کی نماز سے رات کی نماز کا زیادہ بار پڑتا ہے کیونکہ رات سونے اور آرام کرنے کے لئے ہوتی ہے اسی (ثقل کے) معنی میں ہے یہ حدیث اللھم اشدد وطاتک علی مضر اے اللہ اپنی طرف سے قبائل مضر پر سخت دکھ مسلط فرما۔ آدمی جب ثقیل ترین عبادت کا عادی ہو جاتا ہے تو باقی احکام تکلیفیہ کی برداشت اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے اور جو کام نفس پر زیادہ گراں گزرتا ہو اور زیادہ وزن ڈالتا ہو بشرطیکہ اس میں حدود سنت سے تجاوز نہ ہو وہ میزان کے پلڑہ کو بھاری کرنے والا اور نفس کو زیادہ متاثر بنانے والا ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اول رات کی نماز زیادہ بار ڈالنے والی ہوتی تھی مراد یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے فرض کی ہوئی نماز شب (اگر اول رات میں پڑھ لی جائے تو اس کا) احصاء ہو جاتا ہے (ناغہ نہیں ہو سکتی) کیونکہ جب آدمی سو جاتا ہے تو معلوم نہیں کس وقت بیدار ہو۔ قتادہ نے آیت کا ترجمہ کیا ہے نیکی میں جمانے والی اور قرأت کو محفوظ رکھنے والی ہے۔ اور فراء نے کہا رات کو اٹھنا نماز شب کی تیاری کو پختہ کرنے والا ہے اور دن کی نماز سے نمازی کے لئے زیادہ سہل ہے کیونکہ دن کام کاج کے لئے ہے اور رات خلوت و عبادت کے لئے۔ یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے کہ رات کو اٹھنا بہت زیادہ چستی پیدا کرنے والا ہے کیونکہ جس چیز کا بار نفس پر زیادہ پڑتا ہے صوفی کے لئے اسی میں زیادہ لذت ہوتی ہے۔ ابن زید نے کہا دن کے مقابلہ میں رات کا وقت زیادہ فارغ البالی کا ہوتا ہے رات کے وقت نہ ضروریات زندگی پیش آتی ہیں نہ دوسری رکاوٹیں۔ حسنؒ نے کہا نیکی میں خوب جمانے والا اور شیطان سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ رات میں سکون ہوتا ہے آوازیں خاموش ہوتی ہیں اس لئے قیام شب میں قرأت نہایت درست اور الفاظ کی ادائیگی خوب ہوتی ہے۔

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ؕ اَلسَّبۡحُ تیزی سے جانا۔ پانی میں تیرنے کو سباحت اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ دن میں ضروری کاموں کی تکمیل تبلیغ اور دعوت دین کے لئے آپ کو ادھر ادھر جانا پڑتا ہے اور ان امور میں آپ مشغول رہتے ہیں رات فراغت کا وقت ہوتا ہے اس لئے آپ کو رات کو نماز پڑھنی چاہئے گویا یہ جملہ گزشتہ حکم کی علت ہے۔

نماز شب کے فضائل کا بیان

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا ہے تو ہمارا رب نچلے آسمان پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کوئی ہے کہ مجھ سے دعا کرے اور میں قبول کروں کوئی ہے کہ مجھ سے مانگے اور میں عطا کروں کوئی ہے کہ مجھ سے مغفرت کا طالب ہو اور میں اس کے گناہ معاف کر دوں۔ بخاری و مسلم۔ مسلم کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ پھر اللہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتا ہے کوئی ایسی ہستی کو قرض دینے والا ہے جو نہ مفلس ہے نہ حق تلفی کرنے والا۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے رات میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اگر ٹھیک اس ساعت میں کوئی مسلمان دنیا اور آخرت کی بھلائی کا خدا سے خواستگار ہوتا ہے تو اللہ اس کو ضرور ہی عطا فرماتا ہے۔ مسلم

حضرت عبداللہؓ بن عمرو ابن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نماز داؤدؑ کی نماز تھی اور سب سے زیادہ پسندیدہ روزہ داؤدؑ کا روزہ تھا۔ داؤدؑ آدھی رات سو جاتے تھے پھر اٹھ کر ایک تہائی رات میں نماز پڑھتے تھے پھر رات کے چھٹے حصہ میں سو رہتے تھے۔ ایک دن روزہ رکھتے تھے ایک دن ناغہ کرتے تھے۔ بخاری و مسلم۔

حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ نماز شب کا التزام کرو یہ تم سے پہلے گزرے ہوئے صالحین کا طریقہ ہے۔ رب کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے گناہوں کو ساقط کرنے والا اور خطاؤں سے روکنے والا ہے۔ ترمذی

حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمیوں کی حالت دیکھ کر اللہ ہنستا ہے (یعنی پسند فرماتا ہے) ایک وہ آدمی جو رات کو اٹھ کر نماز پڑھتا ہے ایک وہ جماعت جو نماز میں ہمہ تن مشغول رہتی ہے اور ایک وہ جماعت جو جہاد میں منہمک ہوتی ہے۔

شرح السنۃ للبغوی۔

حضرت عمرو بن عینہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ بندہ سے رب کا قرب رات کے آخری حصہ میں ہوتا ہے اگر تم سے ہو سکے کہ اس وقت اللہ کی یاد کرنے والوں میں سے ہو جاؤ تو ہو جاؤ۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حاملین قرآن (قرآن کے حافظ و عالم) اور راتوں والے (راتوں کو نماز پڑھنے والے) میری امت میں سب سے افضل ہیں۔ بغوی فی شعب الایمان۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ قُمِ الَّيۡلَ پر عطف ہے ذِکرِ رَبّ سے مراد ہے شبانہ روز برابر ذکر میں مشغول رہنا کہ نہ کسی وقت سستی پیدا ہو نہ غفلت لیکن ایسا ذکر زبان سے تو ہو نہیں سکتا زبان اور دوسرے اعضاء سے تسبیح حمد نماز اور قرات وغیرہ جو کچھ کیا جاتا ہے کسی وقت اس میں نیت کی سستی آ ہی جاتی ہے لا محالہ قلبی ذکر مراد ہے حقیقت میں قلبی ذکر ہی ذکر ہے کیونکہ یاد نام ہے غفلت کو دور کر دینے کا جیسا کہ حدیث ذکر الله في الغافلين بمنزلة الصابر في الغارمين میں ذکر کا غفلت سے مقابلہ کرنا بتا رہا ہے غفلت کے مقابل ذکر کو لانے کا اقتضاء ہی یہ ہے کہ ذکر غفلت کو دور کرنے کا نام ہے دل کی غفلت کی حالت میں نہ کوئی نماز قابل اعتبار ہے نہ تسبیح نہ قرات جو نمازی نماز کی طرف سے غافل ہیں ان کے لئے تباہی ہے۔

ہم نے ذکر سے دوام ذکر اس لئے مراد لیا ہے کہ وَاذْكُرْ کا عطف قُمِ الَّيۡلَ پر ہے اور عطف معنی کی مغائرت چاہتا ہے

مطلق ذکر تو قیام شب میں بھی ہوتا ہے اور ترتیل قرآن کے ذیل میں بھی اس لئے وَاذْکُرْ میں دوام ذکر مراد ہونے سے کلام نئے معنی کے لئے مفید ہو جائے گا محض تاکید معنی سے اضافۂ معنوی اولی ہے بعض لوگوں کے نزدیک ذکر رب سے مراد یہ ہے کہ تلاوت قرآن بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرو۔

مسئلہ: نماز سے باہر اگر سورہ فاتحہ پڑھی جائے یا کوئی دوسری سورت ابتدائً شروع کی جائے یعنی سابق سورت سے ملا کر نہ پڑھی جائے بلکہ تلاوت کا آغاز ہی کسی سورت سے کیا جائے تو دونوں صورتوں میں شروع میں بسم اللہ پڑھنی باجماع علماء مسنون ہے ہاں اگر دو سورتیں (ایک کے بعد دوسری) پڑھی جائیں تو دوسری سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ابن کثیر قالون اور عاصم سورۂ انفال و برأت کو چھوڑ کر ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنے کے قائل ہیں خواہ کوئی سورت پہلی سورت سے ملا کر پڑھی جائے یا ابتدائً پڑھی جائے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں انفال اور برات پر بسم اللہ نہ پڑھنا اجماعی مسئلہ ہے۔ باقی آئمہ قرات دو سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہیں پڑھتے۔ ان میں سے حمزہؒ کے ساتھی تو اول سورت کے آخری لفظ کو دوسری سورت کے شروع لفظ سے ملا کر پڑھتے ہیں اور ورش و ابو عمرو ابن عامر اول سورت کے ختم پر سکتہ کرتے ہیں مگر قطع نہیں کرتے۔

لیکن کسی سورت کو اگر درمیان سے شروع کیا جائے تو سب ائمہ کے اقوال میں بسم اللہ سے شروع کرنے یا بسم اللہ کو نہ پڑھنے کا قاری کو اختیار ہے۔

یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب نماز سے باہر تلاوت کی جائے نماز کے اندر قرات کی حالت اس سے الگ ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک سورۂ فاتحہ بلکہ ہر سورت کی ابتدائی آیت بسم اللہ ہے اس لئے سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ پڑھنی واجب ہے اور دوسری سورتوں کے ساتھ مسنون ہے پھر (قرات سورت کی طرح) بسم اللہ بھی جہر کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

باقی تینوں اماموں کے نزدیک بسم اللہ کسی سورت کا ابتدائی جز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ قائل ہیں کہ بسم اللہ قرآن مجید کی آیت تو ہے مگر دو صورتوں کو جدا جدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے لہذا پڑھی نہ جائے امام مالکؒ قائل ہیں کہ بسم اللہ قطعاً نماز میں نہ پڑھی جائے نہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ نہ کسی دوسری سورت کے ساتھ۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک صرف سورہ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ چپکے چپکے پڑھنی مسنون ہے دوسری سورتوں کے ساتھ بالکل نہ پڑھی جائے ایک روایت میں امام محمدؒ کا قول آیا ہے کہ ہر سورت کے ساتھ چپکے چپکے بسم اللہ پڑھنی مستحب ہے ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ بسم اللہ نہ سورہ فاتحہ کا جزو ہے نہ کسی دوسری سورت کا اور نماز میں جہر کے ساتھ اس کو پڑھنا تو نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے نہ خلفاء اربعہؓ سے۔ شافعیہ نے بسم اللہ کو جہر کے ساتھ پڑھنے کے متعلق نو حدیثیں ذکر کی ہیں جن کو دار قطنی اور خطیب نے نقل کیا ہے اور ابن جوزی نے سب حدیثوں کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ دار قطنی کا قول ہے کہ بسم اللہ کو جہر کے ساتھ پڑھنے کی جو حدیث بھی رسول اللہ ﷺ سے نقل کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے صحابہؓ کے بالجہر پڑھنے کی کچھ روایتیں صحیح ہیں کچھ ضعیف۔

ابو داؤد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہر کے ساتھ پڑھتے تھے (اس زمانہ میں) مسیلمہ کو رحمٰن یمامہ کہا جاتا تھا مکہ والوں نے (جب بسم اللہ میں لفظ رحمٰن سنا تو) کہنے لگے محمد یمامہ کے معبود کو پکارتے ہیں اس پر اللہ نے اپنے رسول کو پوشیدہ پڑھنے کا حکم دے دیا اور آپ وقت وفات تک بسم اللہ کو پوشیدہ ہی پڑھتے رہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ حضرات خلفائے اربعہ حضرت ابن مسعود حضرت عمار بن یاسر حضرت عبد اللہ بن مغفل حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور عالی مرتبہ تابعین مثلاً حسن بصریؒ، شعبیؒ، سعید بن جبیر ابراہیم نخعی قتادہ عمر بن عبد العزیز اعمش اور ثوری وغیرہ ان حضرات میں سے کسی سے بالجہر پڑھنا ثابت نہیں بلکہ جہر نہ کرنا ثابت ہے البتہ معاویہؓ عطا طاؤس اور مجاہد سے بسم اللہ کی جہری قرات منقول ہے کذا ذکر ابن الجوزی۔

وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ اور ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف رخ کرلو۔

تبتیل باب تفعیل کا مصدر ہے تعلق کاٹ دینا۔ بجائے تَبَتُّل (باب تفعل کا مصدر اور تَبَتَّل کا مفعول مطلق) کے آیات کے فواصل کی رعایت سے باب تفعیل کا مصدر ذکر کیا اس کے علاوہ اس طرف اشارہ بھی ہے کہ تَبَتُّل (کٹ جانا) اکثر کبھی ہوتا ہے جو گہری نظر اور کوشش کا محتاج ہے اس لئے پہلے تَبتّل (کاٹ دینا) کا فعل ہوتا ہے پھر تبتل (کٹ جانا) اسی لئے تبتل کی تفسیر میں حسن بصریؒ نے اجتھد (کوشش کر) کہا ہے ابن زید نے کہا دنیا اور مافیہا کو چھوڑ کر ان چیزوں کی طلب کرنا جو خدائے تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں تبتل ہے گویا یوں فرمایا کہ رب کے سوا اپنے دل کا رشتہ ہر چیز سے توڑ لو اور اللہ ہی کی طرف ہو جاؤ۔

تبتّل سے مراد یہ نہیں ہے کہ لوگوں سے ملنا چھوڑ دو اور حقوق عباد کی ادائیگی میں کوتاہی کرو اور جس تعلق ور شتہ داری کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو کاٹ دو اسلام میں سادھوپن تو قطعاً نہیں ہے۔ تم پر اپنے نفس کا بھی حق ہے اور بیوی بچوں کا بھی حق ہے اور مہمان کا بھی حق ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ حسی اور علمی تعلقات سے دل کی وابستگی نہ رکھو صوفیہ کا قول ہے کہ ہم جس راستہ کو قطع کرنے کے درپے ہیں۔ اس کی دو منزلیں ہیں پہلی منزل ہے مخلوق سے کٹ جانے کی اور دوسری منزل ہے حق سے جڑ جانے کی ایک دوسرے کے لئے لازم ہے اسی لئے اللہ نے دونوں کے درمیان واؤ عاطفہ جو جمعیت پر دلالت کرتا ہے ذکر کیا ہے اور پہلے وصول حق کو وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرما کر ذکر کیا پھر تبتل (مخلوق سے انقطاع) کو بیان کیا کیونکہ مخلوق سے کٹ جانے کی اصل غرض ہی حق سے جڑ جانا ہے (لہٰذا مقصود اصلی کو پہلے ذکر کیا)

ہم نے ذکر اللہ کی تعبیر وصول حق سے اس لئے کی کہ جس یاد میں سستی کا گزر نہ ہو اور غفلت ادھر ہو کر نہ گزرے وہ علم حضوری ہوگا۔ علم حصولی کا تصور وہاں بداہۃً ممکن نہیں کیونکہ علم حضوری اسی کو تو کہتے ہیں جس میں عالم کے سامنے خود معلوم حاضر ہو (اس کی صورت حاصل نہ ہو) جب معلوم خود پیش نظر رہے تو یہ ہی دوام حضور ہے یہ ہی وصول و اتصال ہے اسی کو اتحاد اور بقاء کہتے ہیں الفاظ مختلف ہیں مطلب سب کا ایک ہے متقدمین اسی کو اخلاص کہتے تھے حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا تھا اللہ کے لئے کامل اخلاص اختیار کرو۔

رہی یہ بات کہ بجائے وَاذْكُرْ رَبَّكَ کے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرمایا لفظ اسم کو بڑھایا اس کی وجہ یہ ہے کہ تبتّل جس کو فنا بھی کہا جاتا ہے اسماء و صفات کے علم کا نام ہے ذات سے تعلق رکھنے والے علم کا نام تبتّل نہیں ہے علم الذات تو وراء الوراء یعنی حجابات سے بھی پرے ہے (دنیا سے کٹ جانے والے کی رسائی ذات تک نہیں صرف صفات تک ہوتی ہے ذات نامعلوم الحقیقت ہے)

یہ بھی امکان ہے کہ ذکر سے مراد ہو وہ ذکر لسانی جس کی موافقت دل سے ہو رہی ہو اور دوام ذکر سے مراد ہو دوام عرفی یعنی بشری طاقت کے موافق بکثرت ذکر کرنا یہ کثرت ذکر تبتل تک پہنچا دیتی ہے انقطاع از خلق تک پہنچنے کا یہ ذریعہ ہے بشرطیکہ براہ راست توفیق شامل حال ہو جیسے انبیاء اور بعض اولیاء کے لئے ہوتی ہے۔ یا شیخ کی کشش (کے بعد توفیق الٰہی مددگار) ہو اس تقدیر پر تبتل پر ذکر کا مقدم ہونا طبعی ہے) ذریعہ کو نتیجہ پر تقدم ہوتا ہی ہے ذکر ذریعہ ہے اور تبتل نتیجہ)

مذکورہ تفسیر کی صورت میں وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں اسم ذات کی تکرار کی طرف اشارہ ہوگا اور رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ میں (بشرطیکہ رب کو جُد کے ساتھ ربک کی صفت قرار دیا جائے) تمام ممکنات کو اللہ کا محیط ہونا اور لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ میں نفی و اثبات کا بیان ہوگا۔ یہ دونوں چیزیں کمال ولایت حاصل کرنے والوں کے طریقہ کی بنیاد ہیں۔ اس وقت قُمِ اللَّيْلَ اور رَتِّلِ الْقُرْآنَ اور وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ تینوں الگ الگ احکام ہوں گے اس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چاروں امور یعنی نماز تلاوت قرآن اور ذکر اسم ذات اور ذکر نفی و اثبات قرب کے درجات اور مراتب حاصل ہونے کی بناء ہیں لیکن اول الذکر دونوں چیزیں آخری حد پر پہنچنے والوں کے لئے ہیں اور آخری دونوں امور ابتدائی مدارج طے کرنے والوں کے لئے اور چونکہ آیات مذکورہ میں اول ترین مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں اور انتہائی کمال تک پہنچنے والوں میں آپ ﷺ کا درجہ سب سے اونچا ہے اس لئے جو دو امور

اہل انتہا کے لئے مخصوص ہیں ان کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ اگر رفع کے ساتھ رَبُّ کو پڑھا جائے جو ابن کثیر نافع ابو عمرؓ اور حفصؒ کی قرات ہے تو خبر ہو گی مبتدا محذوف ہو گا یا مبتدا ہو گا اور خبر محذوف ہو گی اور رب کو زیر کے ساتھ پڑھا جائے جیسا کہ باقی اہل قرات کے نزدیک ہے تو ربک سے بدل ہو گا یا حرف قسم محذوف ہو گا اور لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ جواب قسم ہو گا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ فَاتَّخِذْهُ میں فاء سببی ہے یعنی اللہ کی الوہیت منفرد ہ اس کے کارساز ہونے کی علت ہے جب اللہ ساری مخلوق کا رب ہے اور الوہیت میں منفرد ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ تمام معاملات اسی کے سپرد کر دیئے جائیں۔

تعلیم تبتل سے دماغ میں ایک وہم پیدا ہو سکتا ہے تھا کہ ہر انسان دوسرے کے تعاون کا محتاج ہے تمدن کے بغیر معاشیات اور ضروریات حیات کی فراہمی کا نظام ابتر ہو جائے گا پھر تبتل اور مخلوق سے قطع تعلق کی صورت میں نظام معاشی کیسے چلے گا۔ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے فرمایا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ الخ یعنی سارے سنسار کا مالک و حاکم اللہ ہے تمام انسان انسانوں کی بستیاں تمام آدمیوں کے افعال اعمال منافع اور دل اسی کے دست قدرت میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اس کے سوا نہ کوئی حاکم اعلیٰ ہے نہ معبود برحق نہ اس کی اجازت اور مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے لہٰذا اسی کے سپرد اپنے تمام معاملات کر دو اسی کو اپنا ذمہ دار کارساز مانو۔ وہی سب سے اچھا کارساز ہے اس کی ذمہ داری کے بعد تم کو کسی دوسرے کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت عمرؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم خدا پر پورا توکل کر لو جیسا توکل کا حق ہے تو جس طرح وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے تمکو بھی دے گا پرندے صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

یہ بھی حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا روح القدس (یعنی جبرئیل) نے میری روح میں یہ بات پھونک دی ہے کہ کوئی شخص اپنا رزق پورا کئے بغیر نہیں مرتا۔ لہٰذا تم اللہ سے تقویٰ رکھو اور اچھے راستہ سے رزق کی طلب کرو۔ یہ حدیث بیہقی نے شعب الایمان میں اور بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کی ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ترک دنیا یہ نہیں ہے کہ حلال کو حرام بنا دیا جائے اور مال کو برباد کر دیا جائے بلکہ زہد یہ ہے کہ تم کو اپنے ہاتھوں میں موجود چیز پر خدا کے ہاتھ میں موجود رہنے والی چیز سے زیادہ اعتماد نہ ہو (یعنی اپنے جمع شدہ مال پر جیسا بھروسہ ہوتا ہے ویسا ہی بھروسہ مال نہ ہونے کی صورت میں اللہ کی رزاقی کا ہو) اور اگر کوئی مصیبت تم پر آپڑے تو اس کے ثواب کی (اتنے وثوق کے ساتھ) تم کو رغبت ہو کہ تم اس دکھ کے زائل نہ ہونے کی رغبت کرنے لگو۔ (ترمذی)

ہمارے شیخ اعظم امام برحق حضرت مولانا یعقوب کرخی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آغاز سورت سے اس آیت تک مختلف مقامات سلوک کی طرف اشارہ ہے رات کی خلوت تلاوت ذکر نفی ماسوا اور توکل باللہ سلوک کے مختلف مدارج ہیں لیکن مقامات سلوک میں سب سے اونچا درجہ جفاء اعداء پر صبر رکھنے کا ہے اسی کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ کیا اور فرمایا۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ یعنی کافر جو خرافات بکتے ہیں تمکو کاہن، شاعر، مجنون وغیرہ کہتے ہیں اس پر تم صبر کرو۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ ان سے کنارہ کش رہو بدلا نہ لو ان کے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دو۔ اس

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اور لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ میں صفات کا بیان ہے احاطہ ربوبیت و مالکیت اللہ کے علم و قدرت کی ہمہ گیری پر دلالت کر رہا ہے اور لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ میں الوہیت غیر کی نفی اور اللہ ہی کیلئے حاکمیت و معبودیت کا اثبات ہے جب صوفی یہ دونوں مراتب صفات طے کر لیتا ہے اور افعال و صفات کا اسکو علم ہو جاتا ہے تو اسم ذات کا ذکر کرتا ہے پہلے غیر اللہ کی الوہیت کی نفی اور اللہ ہی کی الوہیت کا اثبات کرتا تھا اب اس کو اللہ کے سوا کوئی ہستی ہی نظر نہیں آتی جو جاذب نظر و توجہ ہو سکے اسلئے اسم ذات کا ذکر کرتا ہے اور آخر تمام کائنات سے اس کی قلبی وابستگی ختم ہو جاتی ہے ہر شئے سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے آخری معراج اس کو حاصل ہو جاتی ہے وہ واصل بحق ہو جاتا ہے اور ہمہ تن توجہ الی اللہ میں ڈوب جاتا ہے۔ واللہ اعلم

آیت کا حکم آیت قتال سے منسوخ ہے۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ اور ان مالدار عیش پرست تکذیب کرنے والوں کو میرے ہی حوالے کردو میں تمہاری طرف سے ان کو سزا دینے کے لئے کافی ہوں۔ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اُولِی النَّعْمَۃِ سے مراد قریش کے سردار ہیں اور وَالْمُكَذِّبِينَ میں واؤ عاطفہ نہیں بلکہ مع کے معنی میں ہے۔

وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ﴿١١﴾ اور انکو کچھ مہلت یا کچھ زمانہ کے لئے ڈھیل دیدو یعنی اس وقت تک کہ یہ خود ہی مر جائیں یا اللہ ان سے لڑنے کا حکم نازل فرمادے اور اہل ایمان کے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے۔

مقاتلؒ بن حبان نے کہا اس آیت کا نزول مقتولین بدر کے بارے میں ہوا۔ کچھ ہی مدت گزری تھی کہ وہ بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔

إِنَّ لَدَيْنَا یہ حکم سابق کی علت ہے۔

أَنكَالًا نِکْل کی جمع بھاری قید بیڑی۔ بیہقیؒ نے حسنؒ بصری کا قول نقل کیا ہے کہ اَنکَال سے آگ کی بیڑیاں ہوں گی۔

وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ یعنی ایسا کھانا جس سے پھندہ لگے گا نہ اندر اترے گا نہ باہر نکلے گا۔ ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے اس کو آگ کی صفات میں شمار کیا ہے لیکن حضرت ابن عباس کے نزدیک اس سے زقوم (تھوہر) کا درخت مراد ہے عبداللہ بن احمد نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضریع (سینڈھ یا تھوہر) دوزخ کے اندر کانٹوں (یا خار دار جھاڑی) کی طرح ایک چیز ہوگی جو ایلوے سے زیادہ تلخ مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم ہوگی جب دوزخی کو کھلائی جائے گی تو نہ پیٹ میں جائے گی نہ منہ تک لوٹ کر آئے گی بیچ میں اٹکی ہوئی رہے گی نہ فربہی پیدا کرے گی نہ بھوک کو دفع کرے گا۔

وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾ ابن ابی الدنیا نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ دوزخیوں پر آگ کے سانپ اور بچھو گریں گے اگر ان میں سے ایک سانپ مشرق میں پھونک مارے تو مغرب والے جل جائیں اور اگر ان میں سے ایک بچھو دنیا والوں کو کاٹ لے تو سوختہ ہو جائیں وہ سانپ اور بچھو دوزخیوں پر گریں گے اور ان کے گوشت و پوست کے درمیان داخل ہوں گے حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخیوں میں سب سے آسان عذاب ابو طالب پر ہوگا۔ اس کو آگ کے دو چپل پہنائے جائیں گے جن سے اس کا بھیجا کھولے گا۔

مسلم نے بروایت حضرت نعمانؓ بن بشیر بیان کیا ہے کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب اس شخص کا ہوگا جس کے دونوں چپل اور (چپلوں کے) تسمے آگ کے ہوں گے جن کی وجہ سے ہانڈی کے ابال کی طرح اس کا دماغ کھولے گا وہ خیال کرے گا کہ اس پر سب سے سخت عذاب ہے حالانکہ اس پر سب سے ہلکا عذاب ہوگا۔ حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ یوم ظرف زمان ہے (جس میں کسی فعل کا وقوع ہوتا ہے) اس سے پہلے لَدَيْنَا أَنكَالًا وَّجَحِيمًا میں فعل کا معنی موجود ہے۔

ایک شبہ

بظاہر زمین اور پہاڑوں میں زلزلہ نفخہ اول سے پہلے آئے گا اور کافروں کو قید و بند اور دوزخ کا عذاب حشر کے بعد ہوگا پھر کافروں کا عذاب نفخہ اول سے پہلے یعنی زلزلہ کے دن کیسے ہوگا۔

ازالہ

قیامت کا دن کسی محدود مقدار کا نام نہیں بلکہ نفخہ اول کے پہلے سے اس وقت تک کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں

پہنچ جائیں قیامت ہی کا دن کہلاتا ہے۔

وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿۱۴﴾ اس کا عطف تَرْجُفُ پر ہے ابن حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کَثِيبًا مَّهِيلًا کا ترجمہ کیا ہے ریگ سیال یعنی ایسا ریت کہ اگر اس کا کوئی حصہ تم اٹھالو تو اس کی جگہ دوسرا (فورا) آجائے یہ قول کلبی کا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ اہل مکہ کو خطاب ہے۔

رَسُوْلًا اس کلام میں نیرنگی ہے پہلے خطاب کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف تھا اور عَلٰى مَا يَقُوْلُ میں کافروں کا ذکر بصیغہ غائب کیا تھا یہاں خطاب کافروں سے ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر بصورت غائب ہے۔ اس کلام سے سابق کلام کی تاکید بھی ہوتی ہے کیونکہ پہلے فرمایا تھا اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا اور یہاں فرمایا اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا دونوں آیتوں کا مضمون ایک ہی طرح کا ہے۔

شَاهِدًا عَلَيْكُمْ تمہارے قبول یا انکار کی شہادت دینے والا۔

كَمَآ اَرْسَلْنَآ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی تمہارے پاس رسول کو بھیجنا ایسا ہی ہے جیسا فرعون کے پاس رسول کو بھیجنا تھا۔ (مطلب یہ کہ روانگی میں مساوات اور مشابہت ہے اگرچہ رسولوں میں بڑا فرق مراتب ہے)

اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام

فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ الرسول سے مراد حضرت موسیٰؑ ہیں۔

فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ سخت بھاری پکڑ طعام وبیل ثقیل کھانا جو ہضم پر بار ہو۔ وابل بڑی بارش۔ اللہ نے فرعون کو سمندر میں غرق کر کے آگ میں داخل کیا اگر تم اپنے رسول کی نافرمانی کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا (یعنی تباہ کیا جائے گا پھر جہنم میں داخل کیا جائے گا)

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ اے اہل مکہ اگر اپنے رسول کا انکار کرو گے تو کس طرح بچو گے۔

يَوْمًا اس دن کے عذاب سے يَوْمًا کا تعلق تَتَّقُوْنَ سے ہے اور يَوْمًا مضاف الیہ تھا لفظ عذاب مضاف تھا مضاف کو حذف کرنے کے بعد مضاف الیہ کو اس کی جگہ کر دیا اور اسی کا اعراب دے دیا یہ بھی احتمال ہے کہ يَوْمًا کا تعلق كَفَرْتُمْ سے ہو اور تَتَّقُوْنَ کا مفعول محذوف ہو مطلب یہ ہوگا کہ اگر روز قیامت کا انکار کرو گے تو عذاب سے کیسے بچو گے۔ اگر یوما کو كَفَرْتُمْ سے متعلق قرار دیا جائے گا تو يَوْمًا کی تاویل بیوم سے کرنی ہوگی (یعنی مجرور کو بحذف حرف جر منصوب بنانا پڑے گا کیونکہ کفر بغیر حرف جر کے مفعول کی طرف متعدی نہیں ہوتا)

يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾ شِيْبٌ اَشْيَبُ کی جمع ہے جیسے بیض ابیض کی جمع ہے۔ یہ جملہ يَوْمًا کی صفت ہے اور يَجْعَلُ کا فاعل بھی يَوْمًا ہی ہے لیکن جعل کی نسبت يَوْمًا کی طرف مجازی ہے (حقیقت میں اس روز بچوں کو بوڑھا بنانے والا تو خدا ہے لیکن روز قیامت کو بچوں کو بوڑھا بنا دینے والا قرار دینا بطور مبالغہ ہے) جیسے صام نہارہ میں روزہ رکھنے کی نسبت نہار کی طرف مجازی (مبالغہ کیلئے) ہے اصل کلام یوں تھا یوما یجعل اللہ فیہ الولدان شیبا جس روز کہ اللہ بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔

یعنی شدت ہیبت اور طول مدت کی وجہ سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ اس قول کی بناء یا تو مفروضہ عمومی پر ہے (یعنی عام طور پر فرض کر لیا گیا ہے کہ شدت ہیبت سے بال سفید ہو جاتے ہیں اور انتہائی غم بوڑھا کر دیتا ہے اسی کلیہ پر کلام کی بنا ہے) یا بطور تمثیل و تشبیہ ہے (کہ جیسے زیادہ افکار کی وجہ سے بچوں کی ابھرتی ہوئی قوت ضعیف ہو جاتی ہے اور پیری جلد آجاتی ہے ایسی ہی قیامت کے مصائب بڑے بڑے طاقتور اور بلند عزم رکھنے والوں کو ضعیف کر دیں گے)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ (قیامت کے دن) فرمائے گا آدم حضرت آدم جواب دیں گے حاضر ہوں دست بستہ حاضر ہوں ہر بھلائی تیرے ہی ہاتھوں میں ہے اللہ فرمائے گا دوزخ کا حصہ الگ کر لو۔ آدم عرض

کریں گے دوزخ کا حصہ کتنا۔ اللہ فرمائے گا نو سو ننانوے فی ہزار اس وقت (ایسا ہول ہوگا کہ) بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حمل والی کو اسقاط ہو جائے گا۔ (یا بچے بوڑھے ہو جائیں اور ہر حمل والی کو اسقاط ہو جائے اور تم لوگوں کو نشہ میں خیال کرو گے حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے وہ ایک (نجات یافتہ) کون ہوگا فرمایا خوش ہو تم میں سے ایک (دوزخی) اور یاجوج ماجوج میں سے ہزار ہوں گے پھر فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت کا چہارم حصہ ہو گے ہم نے یہ سن کر اللہ اکبر کہا حضور نے فرمایا مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت میں ایک تہائی ہو گے ہم نے یہ سن کر تکبیر کہی حضور ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت میں آدھے ہو گے ہم نے تکبیر کہی فرمایا تم (دوزخی) لوگوں میں ایسے ہو گے جیسے سفید بیل کی کھال پر ایک سیاہ بال یا سیاہ بیل کی کھال میں ایک سفید بال۔ (بخاری و مسلم)

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ یعنی آسمان اپنی عظمت اور مضبوطی کے باوجود اس روز کی شدت کی وجہ سے پھٹ جائے گا دوسری چیزوں کا تو ذکر ہی کیا ہے مُنْفَطِرٌ مذکر ہے السماء کی خبر ہے اور سماء مونث ہے اور مبتدا خبر میں تذکیر و تانیث کے اعتبار سے یکسانی ہونی چاہئے۔ یہاں السماء کو سقف قرار دے کر اس کی خبر کو مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ لفظ سقف مذکر ہے یا یوں کہو کہ مُنْفَطِرٌ سے پہلے لفظ شیٔ محذوف ہے یعنی آسمان پھٹ جانے والی چیز ہوگی۔

كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ وَعْدُهٗ میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے یعنی اللہ کا عذاب کے متعلق کیا ہوا وعدہ ضرور پورا ہوگا اور ضمیر مفعول محذوف ہے۔ یا اضافت مفعول کی طرف ہے اور ضمیر کا رجوع یوم کی طرف ہے۔ بہر حال یہ جملہ یَوْمًا کی صفت ثالثہ ہے اور ان دونوں جملوں کا اول جملہ پر عطف بغیر حرف عطف کے ہوگا جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ میں خَلَقَ الْاِنْسَانَ اور عَلَّمَهُ الْبَيَانَ کا عطف عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ پر بغیر عطف کے ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ یہ آیات جن کا القاء ہم تم پر کر رہے ہیں۔

تَذْكِرَةٌ ۚ یادداشت ہیں مبدء اور معاد کی یاد دلانے والی اللہ تک اللہ کی جود انعام رضا اور ہدایت تک پہنچنے کا راستہ بتانے والی ہیں۔

فَمَنْ شَآءَ جو نصیحت قبول کرنا اور رب کے راستہ پر جانا چاہے۔

اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ وہ اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ پکڑ لے فَمَنْ شَآءَ میں فاء سببی ہے یعنی یہ تذکرہ ہی اللہ تک پہنچانے کا راستہ ہے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا قرب ہم سے ہماری اپنی جانوں سے بھی زیادہ ہے مگر ہماری غفلت اور اللہ کی عظمت و بزرگی کا پردہ حائل ہے انہی حجابوں کی طرف ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کیا ہے فرمایا ہے اللہ کے ستر ہزار حجاب نور اور تاریکی کے ہیں عظمت و کبریاء کے حجابات تو نورانی ہیں اللہ نے فرمایا ہے بزرگی میری چادر ہے اور عظمت میری رداء (یعنی بزرگی و برتری میرا لباس ہے جو بندوں سے مجھے چھپائے ہوئے ہے) اور بندوں کی غفلت کے حجابات تاریکی کے پردے ہیں اگر اللہ ان پردوں کو دور کر دے تو اس کے چہرے کے جلوے تمام چیزوں کو جلا ڈالیں جہاں تک اس کے بصر کی رسائی ہو (اور چشم الٰہی کی رسائی سے تو کوئی چیز باہر نہیں لامحالہ ہر چیز سوختہ ہو جائے گی) پردوں کو دور کرنے کی سہولت صرف یادداشت سے ہوتی ہے۔ یادداشت سے غفلت دور ہو جاتی ہے اور مرتبہ معیت پر فائز ہونے کی وجہ سے استحقاق محبت پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی اپنے محبوب کے ساتھ ہوتا ہے محبت محب کو محبوب تک پہنچا دیتی ہے عظمت و بزرگی کے پردے بھی اس کو نہیں روکتے۔ جلوہائے چہرہ کا سوختہ کر دینا۔ فناء اور بقاء سے کنایہ ہے خواہ یہ علمی مرتبہ میں ہی ہو (ظاہرا جسمانی سوختگی نہ ہو) بعض علماء نے کہا کہ پورے کلام کا مضمون تحیر ہے (یعنی وہ دن حیران کن ہوگا) اور مجازاً اس سے مقصود ڈرانا ہے۔

ع ۱۹ / ۱۲

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ

کا معنی ہے اقرب (تقریباً) ابن کثیر اور قراء کوفہ نے نِصْفَہٗ وَثُلُثَہٗ پڑھا ہے اس وقت اس کا عطف ادنیٰ پر ہوگا یعنی آپ دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں باقی قراء نے نِصْفِہٖ وَثُلُثِہٖ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس وقت ثُلُثَیِ پر عطف ہوگا یعنی آپ دو تہائی اور نصف اور ایک ثلث رات کے قریب قیام کرتے ہیں۔

اس قرات سے ثابت ہوتا ہے کہ تہائی رات سے کم اور چوتھائی رات سے زیادہ قیام بھی ہوتا تھا چوتھائی رات سے زیادہ کی قید ہم نے اس لئے لگائی کہ آیت اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا کی تفسیر میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ قیام چوتھائی رات سے زیادہ ہو۔

وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ　　یعنی آپ کے طریقہ کی اقتداء میں آپ کے صحابہؓ کی ایک جماعت بھی ایسا ہی قیام کرتی ہے۔

بغویؒ نے تفسیر میں کہا ہے یعنی سب مومن جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ یہ تفسیر بہت بعید از فہم ہے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تو مومن ہی تھے کافر کب تھے اللہ نے فرمایا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اور مِنَ الَّذِيْنَ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی قیام کرنے والے بعض تھے سب کے سب نہ تھے معلوم ہوا کہ بعض صحابہ مراد ہیں۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ　　اس کا عطف رَبَّکَ پر ہے بجائے ضمیر کے اسم ظاہر (لفظ اللہ) کو ذکر کیا یعنی اللہ ہی مقدار شب و روز سے واقف ہے تم ان کی واقعی مقدار سے ناواقف ہو (اس وقت گھڑی اور کوئی دوسرا وقت شناسی کا آلہ نہیں تھا)

بیضاوی نے لکھا لفظ اللہ کو شروع میں لانا اور پھر خبر کو فعل کی صورت میں ذکر کرنا اور اس طرح جملہ اسمیہ بنانا جس کی خبر جملہ فعلیہ ہے) بتا رہا ہے کہ مقادیر اوقات سے واقفیت اللہ کے لئے مخصوص ہے یہ قول مسلک عبدالقاہر و زمخشری کے موافق ہے سکاکی اس کا قائل نہیں۔

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ　　اللہ واقف ہے کہ تم اوقات کا صحیح اندازہ نہیں کرو گے اور تجدید ساعات نہ کر سکو گے۔ اسی لئے اللہ نے پنج گانہ نمازوں کے اوقات کی تعیین کے لئے ظاہری چیزوں کا اعتبار کیا۔ سورج کا طلوع غروب زوال سایہ کی مقدار اور شفق کا غروب یہ ظاہری امور ہیں جن سے اوقات نماز وابستہ ہیں۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ　　یعنی اللہ نے سختی سے تخفیف کی طرف رجوع کر لیا اور مذکورہ مقدار کو ساقط کر دیا تاکہ امت کے لئے آپ کی اقتداء دشوار نہ رہے۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ　　فاء سببی ہے مطلب یہ ہے کہ جتنی نماز بسہولت رات کو پڑھ سکو پڑھو۔ قرات کے لفظ سے نماز مراد ہے جز بول کر کل مراد لے لیا جاتا ہے ابتدائی آیت میں قیام بول کر نماز مراد لی تھی۔ اس آیت کا اقتضاء ہے کہ قرات کو رکن صلوٰۃ کہا جائے جیسے مذکورہ سابق آیات کا اقتضاء تھا کہ قیام کو رکن صلوٰۃ کہا جائے۔ قیام اور قرات کے رکن صلوٰۃ ہونے پر اجماع ہے۔ اس آیت سے قیام محدود (جس کا ذکر اوپر آیات میں گزر چکا ہے) منسوخ ہو گیا۔ لیکن مطلق نماز شب واجب رہی پھر پنجگانہ نمازوں کی فرضیت کے بعد نماز تہجد کی فرضیت بالکل منسوخ ہو گئی اور تہجد بصورت نفل باقی رہا حضرت عائشہؓ حضرت ابن عباسؓ مقاتل اور ابن کیسانؒ کے اقوال اسی پر دلالت کر رہے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر ابتداء میں تہجد کی نماز کو رسول اللہ ﷺ پر اور امت پر فرض قرار دیا جائے پھر منسوخ ہو جانے کا قول اختیار کیا جائے تو امت کے حق میں بالاجماع تہجد کی فرضیت منسوخ ہو گی۔ لیکن کیا رسول اللہ ﷺ سے بھی قیام شب منسوخ ہو گیا۔ خواہ یوں کہا جائے کہ پہلے صرف رسول اللہ ﷺ پر فرض تھا اور آیت فَاقْرَءُوْا کے نزول کے بعد حضور ﷺ سے فرضیت ساقط ہو گئی یا یوں کہو حضور ﷺ پر اور تمام امت پر تہجد پہلے فرض تھا پھر اس آیت کے نزول کے بعد سب سے فرضیت ساقط کر دی گئی بہر حال رسول اللہ ﷺ پر تہجد فرض نہ رہنا اختلافی مسئلہ ہے کوئی قائل ہے کہ حضور ﷺ سے تہجد کی فرضیت ساقط نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ پر آخر عمر

تک تہجد کی نماز فرض رہی کوئی کہتا ہے فرضیت حضور سے بھی جاتی رہی اور سب کے لئے تہجد کی نماز نفل ہو گئی میرے نزدیک موخر الذکر صحیح اور مختار ہے اس پر آیت وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ دلالت کر رہی ہے اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تہجد کے نفل ہونے کی صراحت ہے۔ اگر کوئی کہے کہ نافلہ کا معنی ہے زائد یعنی امت سے زیادہ تم پر چھٹا فرض تہجد کی نماز کا ہے میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مطلب ہوتا تو لَكَ (تمہارے لئے) کی جگہ عَلَيْكَ (تم پر) کہا جاتا کیونکہ وجوب کے بعد لَكَ نہیں آتا عَلَيْكَ آتا ہے (یعنی تم پر یہ زائد واجب ہے اگر سوال کیا جائے کہ پھر نفل ہونے کی تخصیص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی کیا ہے تہجد تو سب کے لئے نفل ہے میں کہوں گا کہ خصوصیت رسول اللہ ﷺ کی وجہ وہ قول ہے جو مجاہدؒ حسن بصری اور ابوامامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں اس کو خصوصیت کے ساتھ نافلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے لئے تہجد کی نماز ترقی درجات کا سبب تھی اور دوسروں کے حق میں اس کی نفلیت کا یہ معنی ہے کہ اکثر گناہوں کا کفارہ اس کی وجہ سے ان کے لئے ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت مغیرہ کی روایت کردہ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے تہجد کی نماز بصورت نفل باقی رکھی گئی تھی۔ حضرت مغیرہ کی روایت میں ہے حضور ﷺ نے اس قدر قیام شب کیا کہ دونوں پاؤں پر ورم آگیا عرض کیا گیا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آپ کی تو اگلی پچھلی لغزشیں اللہ معاف کر چکا ہے فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ مجھ پر فرض ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر کی حالت میں اونٹنی پر سوار ہی نماز شب پڑھتے تھے جس میں (رکوع سجود) اشارہ سے کرتے تھے اونٹنی کا رخ جدھر بھی ہوتا اسی رخ پر آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے) سوائے فرائض کے (آپ فرائض سوار ہونے کی حالت میں نہیں پڑھتے تھے) ہاں وتر سواری کی حالت میں پڑھ لیتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

مسئلہ

تہجد کی نماز سنت موکدہ ہے یا مستحب۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے بعض علماء کا قول ہے کہ ہمارے لئے مستحب ہے اور رسول اللہ ﷺ پر وقت وفات تک فرض تھی قولی دلیل مفید استحباب ہوتی ہے اور فعلی مداومت بطور نفل نہ تھی اور سنت وہی فعل ہوتا ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے مداومت بطور نفل کی ہو (نہ کہ بطور وجوب) لہٰذا تہجد کا استحباب باقی رہا۔

میرے نزدیک صلوٰۃ تہجد سنن ہدیٰ میں سے ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اس پر مداومت ہمارے نزدیک بطور نفل تھی اور بطور وجوب بھی مداومت اگر مان لی جائے تب بھی کوئی حرج نہیں رسول اللہ ﷺ کی کسی عمل پر مداومت خواہ بطور وجوب ہو یا بطور نفل جس طرح بھی ہو اس عمل کے مسنون ہونے پر دلالت کرتی ہے بشرطیکہ دوسروں کو اس سے روک نہ دیا گیا ہو جیسے صوم وصال (پے کے روزے) سے روک دیا گیا (اس لئے صوم وصال باوجود رسول اللہ ﷺ کی مداومت کے امت کے لئے مسنون نہیں رہا)

تہجد کے سنت موکدہ ہونے پر حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث دلالت کر رہی ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ایک آدمی کا رسول اللہ ﷺ کے سامنے تذکرہ آیا کہ وہ صبح تک سوتا رہتا ہے (تہجد کی) نماز کو نہیں اٹھتا فرمایا وہ ایسا آدمی ہے کہ اس کے کان میں یا فرمایا اس کے دونوں کانوں میں شیطان پیشاب کر دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم) مستحب کا ترک مستحق ملامت و عتاب نہیں بناتا (اور حضور ﷺ نے ملامت فرمائی معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز مستحب نہیں سنت موکدہ ہے)

آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کی تفسیر میں بعض علماء نے کہا کہ اس سے مراد ہے پانچوں نمازوں میں قرآن کی قرات۔ اور حسن بصریؒ نے مغرب و عشاء میں قرات مراد لی ہے بغوی نے قیس بن حازم کا قول نقل کیا ہے قیسؒ نے کہا میں نے بصرہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پیچھے نماز پڑھی آپ نے پہلی رکعت میں الحمد اور سورۂ بقرہ کی پہلی آیت پڑھی اور دوسری رکعت

میں الحمد کے بعد سورۂ بقر کی دوسری آیت پڑھی پھر رکوع کر دیا اور نماز سے فارغ ہو کر ہماری طرف رخ کر کے فرمایا اللہ فرماتا ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ممکن ہے آیت کا یہ مطلب ہو کہ نفس قرآن پڑھو جیسے بھی آسان ہو۔

مسئلہ: مقدار قرات کتنی واجب ہے جس کے بغیر نماز درست نہیں یہ مسئلہ اختلافی ہے ایک روایت میں امام اعظمؒ کا قول یہ ہے کہ جتنی قرات رکن صلوٰۃ ہے اور جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی وہ کم از کم اتنا حصہ ہے جس پر لفظ قرآن کا اطلاق کیا جاسکتا ہو یعنی کسی انسان کے کلام کے مشابہ نہ ہو اس روایت کا تقاضا ہے کہ ایک آیت سے کم کی قرات بھی جواز صلوٰۃ کے لئے کافی ہے قدوری نے اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔

امامؒ اعظم کا قول دوسری روایت میں یہ منقول ہے اور یہی امام احمد کا بھی مسلک ہے کہ ایک آیت سے کم پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی اس روایت کو صاحبؒ ہدایہ نے اختیار کیا ہے۔ امام اعظمؒ سے تیسری روایت یہ ہے کہ چھوٹی تین آیات جیسے سورۂ کوثر کی اور بڑی ایک آیت جو تین آیات کے برابر ہو پڑھنا لازم ہے اتنی قرات کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی قول ہے لیکن اسی کے ساتھ امام اعظمؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد ﷺ کا یہ بھی قول ہے کہ سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک سورت (تین آیات یا ایک بڑی آیت) کی مقدار پڑھنی واجب ہے اگر سہواً ترک ہو گئی تو سجدہ سہو واجب ہے اگر سجدہ نہ کیا اور قصداً چھوڑ دیا تو گنہگار ہو گا نماز کا اعادہ واجب ہے مگر فرض نہیں۔

امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہی درست نہیں اور سورۂ فاتحہ کے ساتھ کسی سورت کو ملانا مسنون ہے واجب نہیں ان ائمہ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے فاتحہ کتاب نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں۔ بخاری و مسلم۔ اس حدیث کے راوی حضرت عبادہؓ ہیں۔

دار قطنی کی روایت میں ہے کہ جس نے فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھی اس کی نماز جائز نہیں۔ دار قطنی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ ابن خزیمہ اور اور ابن حبان نے انہی الفاظ میں یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ راوی نے کہا اگر میں امام کے پیچھے ہوں تو میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا دل میں پڑھ لیا کر۔

مسلمؒ اور امام احمدؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) نہیں پڑھی تو نماز ناقص ہے ناقص ہے ناتمام ہے (راوی کہتا ہے) میں نے کہا ابو ہریرہؓ میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں ابو ہریرہ نے جواب دیا اے فارسی دل میں پڑھ لیا کر۔ حاکم نے بطریق اشہب از ابو عتبہ بروایت از محمد بن ربیع از عبادہ بن صامت مرفوعاً نقل کیا ہے کہ ام القرآن دوسری (سورت) کا تو بدل ہے لیکن کوئی دوسری (سورت) ام القرآن کا بدل نہیں۔

ہم نے حدیث فاتحۃ الکتاب کو جو مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف راویوں کے حوالے سے نقل کیا ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کا معنی جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ بغیر فاتحۃ الکتاب کے نماز کامل نہیں ہوتی (مگر ہو جاتی ہے اور فرض ساقط ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد مسجد کے ہمسایہ کی نماز بغیر مسجد کے نہیں ہوتی یعنی کامل نہیں ہوتی یہ توضیح حدیث غلط ہے کیونکہ دوسرے الفاظ سے جو یہ حدیث مروی ہے وہاں یہ تاویل نہیں چلتی۔ اس کے علاوہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب میں بفاتحۃ الکتاب جار مجرور فعل محذوف کے متعلق ہے اور جار مجرور جو کلام میں خبر واقع ہو اس کا تعلق کسی فعل عام سے (بشر طیکہ کسی فعل خاص کا قرینہ موجبہ نہ ہو) ضروری ہے اب لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب یعنی نماز بغیر فاتحۃ الکتاب کے نہیں ہوتی اور نہ ہونے کا معنی شرعی یہ ہے کہ اس کا شرعی وجود نہیں ہوتا اور صحیح نہیں ہوتی لہٰذا حدیث کا معنی اس طرح ہوا کہ بغیر فاتحہ کے نماز صحیح نہیں ہوتی۔ البتہ حدیث لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد میں نفی کمال ہے یعنی مسجد کے ہمسایہ کی بغیر مسجد کے نماز کامل نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جار مجرور خبر نہیں ہے بلکہ خبر محذوف ہے اسی لئے نفی کمال پر اجماع منعقد ہے ایک اور حدیث قدسی ہے جس میں سورۂ فاتحہ کی تقسیم کی گئی ہے اور فرمایا ہے قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین الخ یہ

حدیث بھی دلالت کررہی ہے کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی۔

امام اعظمؒ نے اس حدیث کو بھی لیا ہے اور ایک اور حدیث کو بھی لیا ہے جس کو مسلم ابوداؤد اور ابن حبان نے روایت کیا ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب فصا عدًا جس نے فاتحۃ الکتاب اور اس سے زیادہ کی قرات نہ کی اس کی نماز نہیں۔ اسی لئے بعض روایات میں آیا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک سورۂ فاتحہ کی قرات اور اس کے ساتھ کوئی صورت ملانی واجب ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جس نے ہر رکعت میں الحمد اور کوئی سورت نہیں پڑھی خواہ فرض نماز ہو یا فرض نہ ہو تو اس کی نماز نہیں۔ (اس حدیث کی سند ضعیف ہے) ابو داؤد نے بطریق ہمام از قتادہ از ابو بصرہ از ابو سعیدؓ بیان کیا حضرت ابو سعیدؓ نے کہا ہم کو رسول اللہ ﷺ نے فاتحۃ الکتاب کو اور جو کچھ آسان ہو اس کو پڑھنے کا حکم دیا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فاتحہ کو رکن صلوٰۃ نہیں کہتے کہ بغیر فاتحہ کی قرات کے نماز ہی جائز نہ ہو کیونکہ اس معاملہ میں آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کے عموم پر عمل کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ قرآن پر خبر واحد سے زیادتی (یعنی بطور فرضیت) جائز نہیں مگر موجب عمل ہے اس لئے ہم فاتحہ اور ضم سورت دونوں کو واجب کہتے ہیں۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ قرات فاتحہ اور ضم سورت دونوں نماز کے ارکان ہیں دونوں کے بغیر نماز جائز نہیں آیات فاقروا سے رکنیت فاتحہ کی نفی پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس آیت کی تفسیر ظاہری طور پر یہی ہے کہ قرات سے مراد پوری نماز شب ہے اور فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے قیام شب (فرضیت) میں تخفیف کردی اب جتنی نماز بسہولت پڑھ سکتے ہو پڑھو۔ مقدار قرات کا اس آیت میں بیان ہی نہیں ہے آیت کو پنجگانہ نماز کی قرات سے متعلق قرار دینا ایک ضعیف احتمال ہے اور احتمال ضعیف وجوب کی دلیل نہیں بن سکتا ایسی ضعیف تشریح کو اس قطعی حکم کا مرتبہ دینا جس پر خبر واحد سے زیادتی جائز نہیں کس طرح درست ہو سکتا ہے حدیث کو ساری امت نے قبول کیا ہے جمہور اسلامیہ کا اس پر عملی اجماع ہے مسلسل نقل متواتر المعنی ہے کہ نہ رسول اللہ ﷺ نے نہ سلف خلف میں سے کسی دوسرے شخص نے سورۂ فاتحہ کے بغیر کبھی نماز پڑھی ایسی متواتر المعنی خبر اور ایسی اجماعی نقل سے تو کتاب پر زیادتی بالاجماع صحیح ہے مزید یہ کہ نماز (اپنی ہیئت اور حقیقت کے لحاظ سے) مجمل ہے اور احادیث احاد مجمل کا بیان کر سکتی ہیں اور ارکان صلوٰۃ کی تفصیل کر سکتی ہیں دیکھو حنفیہ آخری قعدہ کو فرض کہتے ہیں اور دلیل میں حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کو پیش کرتے ہیں جس میں وارد ہے کہ جب تم یہ کہہ چکو یا یہ کر چکو تو تمہاری نماز پوری ہو گئی اب چاہو اٹھ جاؤ چاہو بیٹھے رہو حنفیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تکمیل صلوٰۃ کو دو باتوں میں سے ایک کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اس لئے احد الامرین فرض ہے۔ یہ حدیث اخبار آحاد میں سے ہے اس کے باوجود حنفیہ نے اس سے قعدۂ آخری کی فرضیت پر استدلال کیا ہے۔

حنفیہ نے رکنیت فاتحہ کی نفی پر ابو ہریرہؓ والی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جب تم نماز کو کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر جتنا قرآن میسر ہو پڑھو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے مطلق قرات کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب تعیین فاتحہ پر دلالت کر رہی ہے لہٰذا مطلق کا مقید پر حمل کیا جائے گا اور دونوں حدیثوں پر عمل کیا جائے گا اور فاتحہ کو صلوٰۃ کا رکن قرار دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث حضرت رفاعہؓ بن رافع کے طریق سے ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب نماز کو کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر ام القرآن (فاتحہ) پڑھو پھر جو کچھ چاہو پڑھو۔ (امام احمد نے اس روایت کو بیان کیا ہے اور دار قطنی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں پھر اللہ اکبر کہے اور ثنا کرے پھر ام القرآن پڑھے اور جس چیز کو پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے اور جو کچھ باآسانی پڑھ سکے پڑھے الخ۔

مسئلہ: مقتدی پر قرات و فاتحہ واجب ہے یا نہیں امام شافعی کے نزدیک منفرد اور امام کی طرح مقتدی پر بھی قرات

فاتحہ واجب ہے حضرت عمرؓ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت معاذؓ سے اسی طرح منقول ہے امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور احمد کے نزدیک واجب نہیں۔ امام اعظمؒ کے نزدیک تو مقتدی کے لئے قرات فاتحہ مطلقاً مکروہ ہے امام مالکؒ جہری نمازوں میں مکروہ کہتے ہیں امام احمد کا قول ہے کہ سری نماز میں مقتدی کیلئے قرات فاتحہ مستحب ہے اور جہری میں بھی اس وقت مستحب ہے جب امام کسی آیت پر سکتہ کرے امام کی قرات کی حالت میں مکروہ ہے۔ زہری امام مالک اور ابن مبارک سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ حضرت عروہ بن زبیر اور ابوالقاسم بن محمد سے بھی یہی روایت ہے۔

قرات امام کے وقت مقتدی سے قرات فاتحہ کا سقوط اس حدیث سے ثابت ہے جس کے راوی حضرت جابرؓ ہیں کہ حضور ﷺ اقدس نے فرمایا جس (نمازی) کے لئے امام ہو تو امام کی قرات اس کی قرات ہے۔ رواہ احمد والدار قطنی من طریق جابرا لجعفی۔ دار قطنی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے ابن جوزی کا بیان ہے کہ ثوری اور شعبہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ دار قطنی نے اس حدیث کو ایک اور سند سے جس میں لیث راوی ہے نقل کیا ہے لیکن ابن علیہ نے لیث کو ضعیف کہا ہے امام احمد نے یحیٰ بن سلام کے طریق سے حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ جس نماز میں ام الکتاب نہ پڑھی جائے وہ ناتمام ہے مگر اگر امام کے پیچھے ہو (تو ناتمام نہیں) دار قطنی نے یحیٰ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی نے یحیٰ کو ضعیف قرار دیا ہو۔ دار قطنی بیہقی اور ابن عدی نے کہا صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ حفاظ احادیث جیسے سفیان بن عیینہ سفیان ثوری ابوالاحوص شعبہ اسرائیل شریک ابن خلد والانی جریر عبدالحمید زائدہ اور زہیر نے اس حدیث کو بروایت موسیٰ بن عائشہ بحوالہ عبداللہ بن شداد رسول اللہ سے مرسل نقل کیا ہے ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے اور ابن جوزی نے تو اس کے اتصال کی تضعیف کا ہی انکار کیا ہے پھر امام ابو حنیفہؒ نے تو اس سند سے اس کو بیان کیا ہے جو شیخین کی شرط پر بھی صحیح ہے دیکھو امام محمدؒ نے موطا میں لکھا ہے اخبرنا ابو حنیفة حدثنا ابو الحسن موسیٰ بن ابی عائشة عن عبداللہ بن شداد عن جابر عن النبي صلی اللہ علیه وسلم۔ احمد بن منیع نے مسند میں ایسی سند کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے جو شرط مسلم کے موافق ہے قال احمد اخبرنا اسحق الازرق حدثنا سفیان و شریک عن موسی ابن ابی عائشة عن عبداللہ بن شداد عن جابر

اس مبحث کے سلسلہ کی کچھ اور احادیث بھی ہیں جو ضعیف ہیں بخوف طوالت ہم نے ان کو ترک کر دیا۔

ایک شبہ: آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا حکم ہر نمازی کے لئے عام ہے پھر امام اعظمؒ کے ضابطہ کے مطابق اخبار آحاد سے اس حکم کی تخصیص نہیں ہو سکتی۔

جواب: اجماعاً آیت عام مخصوص البعض ہے یعنی وہ شخص جس نے امام کو رکوع میں آکر پایا اس حکم سے بالاجماع الگ ہے اس کے بعد مقتدی کی تخصیص بھی جائز ہے۔

سری نماز میں قرات فاتحہ کے مستحب ہونے کی دلیل حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر قرات جہر کے ساتھ کی جائے تو تم میں سے کوئی قرآن کا کوئی حصہ نہ پڑھے سوائے ام القرآن کے۔

اس حدیث کو دار قطنی نے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ اس حدیث میں جہری نماز میں قرات سے مقتدی کو منع فرمایا ہے جہری کی خصوصیت چاہتی ہے کہ سری میں قرات فاتحہ مستحب ہو۔ پھر ام القرآن کا استثناء چاہتا ہے کہ اس کی قرات امام کے مختلف ٹھہراؤ کی حالت میں کی جائے تاکہ تمام احادیث پر بھی عمل ہو جائے اور آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کی بھی تعمیل ہو جائے۔ صحابہؓ کی ایک جماعت سے قرات خلف الامام کا ترک منقول ہے۔ امام مالکؒ نے موطا میں بروایت نافع بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرات فاتحہ نہیں کرتے تھے۔

طحاویؒ نے حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت جابرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ امام کے پیچھے نماز کے کسی حصہ میں قرات (فاتحہ) نہ کرو۔

امام محمدؒ نے موطا میں لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے امام کے پیچھے قرات کا مسئلہ پوچھا گیا فرمایا خاموشی کے ساتھ متوجہ رہو کیونکہ نماز میں (قرات سے) روکنے والی چیز موجود ہے اور امام تمہارے لئے کافی ہے۔ محمد بن سعدؒ نے کہا جو امام کے پیچھے قرات کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے منہ میں انگارے بھرے ہوں۔ عبد الرزاق نے ایسی ہی روایت نقل کی ہے مگر اس میں انگاروں کی جگہ پتھر کا لفظ ہے محمدؒ نے بروایت داؤد بن قیس از عملان بیان کیا کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا جو امام کے پیچھے پڑھتا ہے کاش اس کے منہ میں پتھر ہوں۔

ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں حضرت جابرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ امام جہر کے ساتھ پڑھے یا پوشیدہ اس کے پیچھے قرات نہ کی جائے۔ ان اقوال سے مطلق قرات کی کراہت (امام کے پیچھے) ثابت ہوتی ہے نماز جہری ہو یا سری۔

جہری نماز میں ترک قرات اس آیت کا بھی مقتضا ہے اللہ نے فرمایا ہے وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا تھا اِذَا قُرِئَ فَانْصِتُوْا قرأت کی جائے تو خاموشی کے ساتھ متوجہ رہو۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہؒ نے بیان کیا ہے۔ آیت مذکورہ کی تفسیر ہم انشاء اللہ عنقریب کریں گے۔

مسئلہ: کیا فرض و نفل کی ہر رکعت میں قرات واجب ہے۔ امام شافعی امام احمد اور امام مالک کے نزدیک ہر رکعت میں علی الاطلاق واجب ہے کیونکہ رکوع سجود کے حکم کی طرح قرات کا بھی حکم ہے صرف امام مالک کا ایک روایت میں یہ قول آیا ہے کہ اگر تین یا چار رکعتوں والی فرض نماز کی ایک رکعت میں قرات ترک کردی تو سجدہ سہو کی طرف یہ عمل کھینچ کرلے جائے گا (یعنی سجدہ سہو واجب ہوگا اور ترک قرات کی تلافی سجدہ سہو سے ہو جائے گی) امام ابو حنیفہؒ وتروں کی ہر رکعت میں وجوب قرات کے قائل ہیں مگر اس حد تک نہیں کہ ترک قرات سے سجدہ سہو واجب ہو جائے۔ امام ابو حنیفہؒ نفل میں جو ہر رکعت کے اندر وجوب قرات کے قائل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نفل کا ہر دوگانہ مستقل نماز ہے ہاں فرض کے اندر صرف دو رکعتوں میں قرات واجب ہے قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ صرف ایک رکعت میں قرات کو واجب کہا جاتا کیونکہ امر تکرار (تعمیل) کا مقتضی نہیں ہوتا لیکن جب (دو رکعتوں میں) ہم قرات اور مقدار قرات کے قائل ہیں تو ان کے ساتھ آخری رکعت یا آخری رکعتوں کو اس حکم میں شریک نہیں کیا جاسکتا۔

امام ابو حنیفہؒ کے اس قول کا مدار یہ امر ہے کہ آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ کو پنج گانہ نمازوں کی قرات کے متعلق قرار دیا جائے مگر یہ بات قابل تسلیم نہیں (وجہ پہلے گزر چکی) جمہور کے قول کا ثبوت مختلف احادیث سے ہوتا ہے مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے مسجد میں داخل ہو کر نماز پڑھی رسول اللہ ﷺ اس وقت مسجد کے اندر ہی تشریف فرما تھے نماز پڑھ کر وہ شخص خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور سلام کیا حضور اقدس ﷺ نے سلام کا جواب دینے کے بعد فرمایا لوٹ کر جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی (وہ لوٹ کر گیا نماز پڑھی پھر آیا پھر واپسی کا اور نماز پڑھنے کا حکم ہوا وہ پھر گیا اور نماز پڑھی اور حاضر ہوا) اس طرح اس نے تین بار کیا آخر میں عرض کیا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے میں اس کے علاوہ (یا اس سے زیادہ) اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا مجھے سکھا دیجئے ارشاد فرمایا جب نماز کو کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو پھر جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھو پھر رکوع کرو جب اطمینان سے رکوع کرلو تو سر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو پھر سجدہ کرو اطمینان سے سجدہ کر چکو تو سر اٹھاؤ اور ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاؤ پھر تمام نماز میں اسی طرح کرو متفق علیہ۔ اسی حدیث کی طرح رفاعہ رزقی نے بھی بیان کیا ہے جس کو احمد ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابو قتادہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر اور عصر کی اول دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں (اور) پڑھتے تھے اور آخری دو رکعتوں میں (صرف) سورۂ فاتحہ اور فجر و ظہر کی پہلی رکعت (دوسری رکعت سے) لمبی پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

ان احادیث کو جب حدیث صلوا کما رأیتمونی اصلی جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھو اسی طرح نماز پڑھو کے

ساتھ دیکھا جاتا ہے تو یہ حدیثیں مجمل کتاب کا بیان ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا ہر نماز میں قرآن ہے فرمایا ہاں یہ سن کر ایک انصاری بولا یہ واجب ہو گئی اگر شبہ کیا جائے کہ یہ تمام احادیث آحاد ہیں اور خبر واحد سے قرآن پر زیادتی جائز نہیں تو ہم جواب دیں گے کہ اصول فقہ کے اس ضابطہ کو ماننے کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب قرآن کی (کسی خاص حکم پر) دلالت قطعی (نا قابل تاویل) ہو اور آیت فاقرؤا تو مختلف تاویلات کا احتمال رکھتی ہے اور جس قرات کا نماز کے لئے حکم دیا گیا ہے وہ مجمل ہے احادیث آحاد اس کا بیان ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

عَلِمَ اَنۡ سَیَکُوۡنُ مِنۡکُمۡ مَّرۡضٰی ۙ عَلِمَ کا فاعل اللہ ہے اور اَنۡ مخففہ ہے اور فَاقۡرَءُوۡا کا تکرار تاکید کے لئے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسرا فَاقۡرَءُوۡا پہلے فَاقۡرَءُوۡا کی تاکید نہیں ہے بلکہ جو نئی مصلحت مقتضی تخفیف تھی اس کے بیان کے لئے ہے اسی لئے حکم کو اس پر متفرع کیا ہے۔

وَ اٰخَرُوۡنَ یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یعنی کچھ اور لوگ تجارت تحصیل علم اور حج کے لئے سفر کریں گے۔

یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ ۙ فضل اللہ سے مراد ہے تجارتی نفع اور علم اور ثواب۔

وَ اٰخَرُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۫ۖ اور کچھ لوگ جہاد کریں گے غرض یہ تمام لوگ (بیمار طالب تجارت، طالب علم، حج کو جانے والے اور جہاد کے لئے نکلنے والے) قیام شب کی سنت کو ادا نہیں کر سکیں گے بغوی نے بروایت ابراہیم بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا جو آدمی مسلمانوں کے کسی شہر میں (کسی ملک سے) کچھ مال (فروخت کرنے کیلئے) بامید ثواب تکلیفیں اٹھا کر لائے اور اسی روز کے نرخ پر فروخت کر دے وہ اللہ کے ہاں شہیدوں کا ہم پلہ ہو گا پھر حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت تلاوت کی وَاٰخَرُوۡنَ یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ وَ اٰخَرُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ۔[1]

فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ ۙ یعنی جس قدر قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھو۔

شبہ: لفظ ما عام ہے اس کے عموم کا تقاضا ہے کہ جتنا قرآن با آسانی پڑھا جا سکے سب پڑھا جائے کیونکہ لفظ ما سب کو شامل ہے۔

جواب: کلام کی رفتار بتا رہی ہے کہ جتنا قرآن با آسانی پڑھا جانا ممکن ہو اس سب کی قرات مراد نہیں ہے بلکہ اس کے حصوں میں سے جو حصہ پڑھ لیا جائے گا تعمیل حکم (بقدر کفایت) ہو جائے گی۔

مسئلہ: قرات میں توسط مستحب ہے افراط تفریط دونوں نامناسب ہیں ہمیشہ ہی اعتدال کے ساتھ پڑھنا چاہئے ایسا نہ کرنا چاہئے کہ کبھی تو بہت زیادہ حد سے بڑھ کر پڑھ لیا اور کبھی ترک کر دیا۔ قرات کی درمیانی مقدار ایک سو پچاس آیات اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار آیات ہیں تاکہ ایک ہفتہ میں قرآن ختم ہو جائے۔

طبرانی نے بروایت حضرت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ (یعنی) سو آیات ابن کثیر نے کہا یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔

بغوی نے اپنی سند سے بروایت حضرت انس بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جس نے ایک دن رات میں پچاس آیات پڑھ لیں اس کا شمار غافلوں میں نہیں ہو گا اور جس نے سو آیات کی

---

[1] حضرت مولفؒ نے فضل کی تشریح تجارتی نفع علم اور ثواب تین الفاظ سے (غالبا بطور تعمیم) کی ہے اور حضرت ابن مسعود نے جس موقع پر آیت کی تلاوت کی اس کا سیاق بتا رہا ہے کہ فضل سے مراد تجارتی نفع اور غیر ملکوں سے مسلمانوں کے ملک میں ضرورت کی چیزیں لانا اور معمولی نرخ پر فروخت کر کے ان سے نفع اور ثواب حاصل کرنا ہے۔ شاید حضرت ابن مسعود نے اس موقع پر آیت کی تلاوت اپنے قول کے ثبوت میں فرمائی ہو فضل خدا میں تجارتی نفع کو داخل کرنا مقصود ہو تجارتی نفع میں فضل کا حصر مقصود نہیں۔

قرات کی اس کو عبادت گزاروں میں لکھا جائے گا اور جس نے دو سو آیات کی تلاوت کی قیامت کے دن قرآن مجید حجت میں اس پر غالب نہیں ہوگا اور جس نے پانچ سو آیات پڑھیں اس کے لئے ثواب کا ڈھیر لکھا جائے گا۔

دارمی نے حسن بصریؒ کی روایت مرسلاً لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایک رات میں سو آیات پڑھ لیں اس رات قرآن اس سے جھگڑا نہیں کرے گا اور جس نے پانچ سو سے ایک ہزار آیات تک قرات کی اس کے لئے ثواب کا ایک ڈھیر لکھا جائے گا صحابہ نے عرض کیا ڈھیر کیا فرمایا بارہ ہزار درجے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت لکھی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہر مہینہ میں (ایک) قرآن پڑھا کرو میں نے عرض کیا میں (اس سے زیادہ) طاقت (اپنے اندر) پاتا ہوں فرمایا تو بیس رات میں (ایک ختم کیا کرو) میں نے عرض کیا میں (اس سے بھی زیادہ) قوت پاتا ہوں فرمایا تو سات رات میں (ایک بار ختم کر لیا کرو) اور اس سے زیادہ نہ کرو۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی نظر میں سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر مداومت (پابندی) کی جائے خواہ عمل تھوڑا ہی ہو۔ یہ بھی حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جتنی طاقت ہو اتنا عمل اختیار کرو کیونکہ (زیادہ کرنے سے) تم اکتا جاؤ گے اور خدا نہیں اکتائے گا۔ صحیحین میں حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چستی رہنے تک نماز پڑھو سستی آجائے تو بیٹھ جاؤ

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو نماز پڑھنے میں اونگھ آنے لگے تو اس کو سو جانا چاہئے تاکہ نیند کا غلبہ جاتا رہے کیونکہ اونگھتے میں نماز پڑھے گا تو اس کو معلوم نہ ہوگا (کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے) شاید وہ استغفار (کرنا چاہتا ہو) اور خود اپنے کو گالیاں دینے لگے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز سے مراد فرض نماز ہے۔ اس جملہ کا عطف فَاقْرَءُوْا پر ہے اور واؤ جمعیت کیلئے ہے (اور معطوف معطوف علیہ سے غیر ہوتا ہے اس لئے) عطف کا تقاضا ہے کہ تہجد کی نماز پنجگانہ نمازوں سے منسوخ نہ قرار دی جائے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قیام شب کا حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں۔

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ یعنی فرض نماز ادا کرو۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ط حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد ہے زکوٰۃ کے علاوہ دوسرا صرف خیر جیسے رشتہ داروں سے سلوک مہمان نوازی۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اس سے عام اطاعت الٰہیہ مراد ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ کو اچھے طور پر ادا کرنا مراد ہو لفظ قرضاً حسناً اس امر پر دلالت کر رہا ہے۔ لفظ حسناً میں معاوضہ دینے کے وعدہ کی طرف طبائع کو مائل کرنا مقصود ہے۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ خیر سے مراد ہے بدنی عبادت یا پھر وہ بھلائی جس میں شرط تقدیم متحقق ہو۔

تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ھُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ط یعنی جو بھلائی پہلے ہی سے (صحت و زندگی کی حالت میں) کر بھیجو گے وہ اس بھلائی سے بہتر اور عظیم الاجر ہے جس کے متعلق مرتے وقت وصیت کر دیا وارثوں کے پاس دنیوی مال و متاع چھوڑ کر مرو۔

خَیْرًا تَجِدُوْہُ کا دوسرا مفعول ہے اور ھُوَ ضمیر شان ہے جو معرفہ کے حکم میں ہے۔ حضرت عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کس کو اپنا مال (یعنی اپنے کام آنے والا مال) وارث کے مال (وارث کے کام آنے والے مال) سے زیادہ مرغوب ہے صحابہؓ نے عرض کیا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو فرمایا سمجھ لو کیا کہہ رہے ہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تو یہی جانتے ہیں فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں جس کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے۔ فرمایا تمہارا مال وہ ہے جو پہلے بھیج دیا ہو اور وارث کا مال وہ

ہے جو پیچھے چھوڑ دیا ہو۔ بغوی۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ آدمی اپنی نیکیوں پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرلے بلکہ نیکی کے ساتھ استغفار بھی کرتا رہے کیونکہ آدمی کی کوئی اطاعت قصور سے خالی نہیں ہوتی پھر بندہ سے کتنی ہی بڑی نیکی سرزد ہو بارگاہ خداوندی کے شایان شان نہیں ہوتی جب تک اس کے ساتھ اپنی عاجزی قصور اور حقارت کا اقرار شامل نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ اللہ تمہارے قصوروں کو معاف کرنے والا اور تم پر رحم فرمانے والا ہے تھوڑے عمل کا بھی بڑا ثواب عطا فرماتا ہے۔

ع ۲ / ۱۴

سورۂ مدثر

یہ سورت مکی ہے اس میں ۵۶ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یحییٰ بن کثیرؒ کا بیان ہے میں نے ابو سلمہؓ بن عبدالرحمٰنؒ سے پوچھا کہ سب سے پہلے قرآن کا کونسا حصہ نازل ہوا ابو سلمہؓ نے کہا المدثر میں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّکَ سب سے پہلے نازل ہوئی ابو سلمہ نے جواب دیا کہ میں نے حضرت جابرؓ سے پوچھا تھا اور جو تم نے مجھ سے کہا میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا، انہوں نے جواب دیا تھا کہ میں وہی بیان کررہا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا تھا حضور ﷺ نے فرمایا تھا میں حراء میں ایک مہینہ گوشہ نشین رہا جب مہینہ پورا کر لیا تو اتر کر آیا (راستہ میں) مجھے نداء آئی میں نے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا اوپر سر اٹھایا تو کچھ نظر آیا میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس پہنچا اور (ان سے) کہا مجھے کپڑا اڑھاؤ مجھے کپڑا اڑھاؤ اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو اس کے بعد فوراً نازل ہوا یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ وَ ثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ اور یہ واقعہ فرضیت نماز سے پہلے کا ہے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

صحیح یہ ہے کہ اقرء کا نزول المدثر سے پہلے ہوا ہم اِقْرَءْ کے شان نزول کے بیان کے موقع پر اس کا ذکر کریں گے اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو شیخین نے بیان کی ہے کہ حضرت جابرؓ نے کہا میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فترۃ الوحی [1] کے متعلق بیان فرمارہے تھے ارشاد فرمایا تھا راستہ چلتے میں میں نے اوپر سے ایک آواز سنی نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا نظر آیا مجھے اس سے اتنا ڈر لگا کہ زمین کی طرف جھک گیا اور گھر آکر بیوی سے کہا مجھے کپڑا اڑھاؤ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ وَ ثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ نازل فرمائی پھر وحی گرما گرم اور پیہم آنے لگی۔ یہ روایت صاف بتارہی ہے کہ سورۃ المدثر کا نزول فترۃ الوحی کے بعد ہوا اور فرشتہ کو اس سے پہلے حرا میں دیکھ چکے تھے۔

طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے قریش کی دعوت کی ، لوگ کھانا کھا چکے تو کہنے لگے آپ لوگ اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے متعلق کیا کہتے ہیں ایک بولا وہ ساحر ہے دوسرا بولا ساحر نہیں ہے کسی نے کہا وہ کاہن ہے دوسرے نے کہا وہ کاہن نہیں ہے کسی نے کہا شاعر ہے دوسرا بولا شاعر بھی نہیں ہے ایک شخص کہنے لگا (اس کا کلام تو) اثر آفریں جادو ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو قریش کے ان خیالات کی اطلاع پہنچی تو آپ کو رنج ہوا اور کپڑا اوڑھ کر اوپر کو سر اٹھایا اس وقت اللہ نے نازل فرمایا یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۔ فَاصْبِرْ تک۔

یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ اپنے بستر سے کھڑے ہو جاؤ یا عزم اور حوصلہ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔

فَاَنْذِرْ ۝۲ سب لوگوں کو اس عذاب سے ڈراؤ جو مشرکوں کے لئے ہے۔ اس جملہ میں مفعول کا حذف تعمیم کیلئے ہے (یعنی اگر کوئی خاص مفعول ذکر کیا جاتا تو شبہ ہوتا کہ صرف اسی شخص کو ڈرانا مقصود ہے حالانکہ اللہ کے عذاب سے ہر شخص کو ڈرانا مقصود ہے اس لئے کسی خاص مفعول کا ذکر نہیں کیا)

[1] فترۃ الوحی ۔ انقطاع وحی کا زمانہ۔ غار حرا میں نزول وحی ہوا۔ پھر کچھ مدت تک مزید وحی نہیں آئی۔ قلب مبارک میں بے چینی بڑھتی گئی شوق میں اضافہ ہوتا گیا آخر المدثر فاہجر تک نازل ہوئی۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾ اس جگہ اور اس کے بعد آنے والے جملوں میں (یعنی فَطَهِّرْ اور فَاهْجُرْ میں) فاء جزائیہ ہے اصل کلام یوں تھا کہ کچھ بھی ہو کسی حال میں ہو اپنے رب کی بڑائی کا اظہار کرو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ربک فعل محذوف کا مفعول ہو اور فکبّر اس کی تاکید ہو اور اس سے استمرار تکبیر مقصود ہو۔ (یعنی پیہم اللہ کی بڑائی کا اظہار کرو)۔

تکبیر کا معنی ہے حدوث اور ہر زوال و نقصان کی علامات سے اللہ کو برتر قرار دینا۔ وجوب وجود اور الوہیت و عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنانا کسی ممکن سے کسی طرح ذات اوصاف اور افعال میں اس کو مشابہ نہ ماننا صرف اسی کے اندر اوصاف کمال تسلیم کرنا اور دوسروں کے اوصاف کو ناقص اوصاف جاننا۔ عقیدہ تکبیر ہر شخص پر سب سے اول لازم ہے تمام فرائض سے زیادہ اہم ہے نہ اس کی خلاف ورزی قابل معافی ہے نہ کسی سے یہ واجب ساقط ہو سکتا ہے حکم شرع سے پہلے محض عقل کی نظر میں بھی یہ عقیدہ واجب تھا اور ہے مگر عقل (بطور خود) اس کی تفصیل کو جاننے سے قاصر ہے (اس لئے ہدایت شرع کی ضرورت ہوئی یعنی یہ عقیدہ خلاف عقل نہیں مگر شریعت کے اظہار کے بغیر اس کی تفصیل کی حدود میں عقل کی رسائی نہیں)

مسئلہ: فقہاء نے اسی آیت کی وجہ سے نماز میں تکبیر تحریمہ کو فرض کہا ہے اور ثبوت میں اسی آیت کو پیش کیا ہے امام ابو حنیفہؒ اور امام محمد ؒ قائل ہیں کہ بجائے اللہ اکبر کے جو لفظ بھی مفید تعظیم ہو اس سے نماز کا انعقاد ہو جائے گا جیسے اللہ اجل۔ اللہ اعظم۔ لا الہ الا اللہ۔ الرحمن اکبر وغیرہ آغاز صلوٰۃ کی صحت صرف اللہ اکبر کہنے پر ہی موقوف نہیں ہے کیونکہ حکم ہے اللہ کی بڑائی یعنی عظمت کو ظاہر کرنے اور اس کا اقرار کرنے کا امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ اگر اللہ اکبر اچھی طرح کہہ سکتا ہو (معذور نہ ہو) تو پھر اللہ اکبر کے سوا کوئی دوسرا لفظ کافی نہیں۔ اللہ اکبر اور اللہ الکبیر کہنا تینوں اماموں کے نزدیک درست ہے ثناء کے موقع پر الف لام بولنا زیادہ بلیغ ہے (حصر پر دلالت کر رہا ہے) اور اللہ کے اوصاف کے لئے افعل التفضیل (یعنی الاکبر) اور فعیل (یعنی الکبیر) دونوں برابر ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اللہ اکبر اور اللہ الاکبر کے علاوہ تحریمہ کے موقع پر تمام الفاظ غیر صحیح ہیں امام مالک اور امام احمد صرف اللہ اکبر کے جواز کے قائل ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ یہ آیت تکبیر تحریمہ کے متعلق ہی نہیں ہے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ یہ آیت قرآن سب سے پہلے (یعنی اقراء کے بعد) نازل ہوئی اور یہ واقعہ فرضیت نماز سے پہلے کا ہے (اس لئے نماز کی تکبیر تحریمہ اس جگہ مراد نہیں) اگر کہا جائے کہ نماز سے باہر تکبیر کہنا تو واجب نہیں اور رَبَّكَ فَكَبِّرْ میں امر وجوب کے لئے ہے اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کی تکبیر تحریمہ ہی اس آیت میں مراد ہے۔

یہ قول قابل تسلیم نہیں کیونکہ نماز سے باہر بھی تکبیر فرض ہے تکبیر نام ہے اعتراف توحید کا اور اعتراف توحید انسان کا اول ترین فرض ہے اس کا سقوط ممکن ہی نہیں۔ تکبیر تحریمہ کے سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ نماز مجمل ہے (قرآن میں اس کی ہیئت ترتیب تعدد وغیرہ کی تفصیل نہیں) رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کا بیان ہے اور عمل رسول اللہ ﷺ سے بتواتر ثابت ہے کہ آپ تحریمہ کیلئے اللہ اکبر ہی کہتے تھے اس کے علاوہ نہ حضور ﷺ اقدس سے کوئی روایت ہے نہ کسی صحابیؓ کا کوئی عمل منقول ہے کہ حضور ﷺ نے یا کسی صحابی نے ان الفاظ کے علاوہ کسی دوسرے لفظ سے نماز شروع کی ہو بلکہ حدیث رفاعہ بعض سلسلوں سے اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کسی شخص کی نماز اس وقت تک قبول نہیں فرماتا جب تک وہ پورا پورا وضو کر کے قبلہ رو نہ ہو اور اللہ اکبر نہ کہے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿۴﴾ اپنے کپڑوں کو پاک کرو یعنی اپنے نفس کو گناہوں سے پاک کر لو۔ قتادہ۔ مجاہد۔ ابراہیم۔ ضحاک۔ شعبی۔ زہری۔ عکرمہ نے کہا حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کا معنی پوچھا گیا فرمایا گناہ اور گندگی کی حالت میں لباس نہ پہنو پھر فرمایا کیا تو نے غیلان بن سلمہ ثقفی کا شعر سنا ہے۔

وانی بحمد اللہ لا ثوب فاجر لبست ولا من غذرۃ اتقنع

اللہ کا شکر ہے کہ میں نے فسق کا لباس نہیں پہنا اور نہ گندگی کی حالت میں چادر اوڑھی۔

حضرت ابی بن کعبؓ کا بھی یہی قول ہے۔ ضحاکؒ نے کہا اپنے اعمال کو ٹھیک کر لو۔ سدی نے کہا نیک اعمال آدمی کو پاک کپڑوں والا اور بد کردار آدمی کو ناپاک کپڑوں والا کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا اپنے دل اور گھر کو پاک کر لو۔ حسن بصریؒ نے کہا اپنے اخلاق کو اچھا بناؤ۔ ابن سیرین اور ابن زید نے کہا آیت میں کپڑوں کو پاک رکھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ مشرک اپنے کپڑے پاک نہیں رکھتے تھے۔ طاؤس نے کہا اپنے کپڑوں کو طویل نہ کرو کپڑوں کا لمبا نہ ہونا ان کی تطہیر (کا سبب) ہے۔

میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ کپڑوں کو پاک رکھنے کا حکم تو عبارت النص اور الفاظ سے واجب ہی ہے اور بدن کو پاک کرنے کا حکم دلالت النص سے بدرجہ اولیٰ معلوم ہو رہا ہے۔ بنسبت کپڑے کے بدن کا مرتبہ اونچا ہے اور بدن کو خدا سے زیادہ قرب حاصل ہے تو جب اللہ تعالیٰ کپڑوں کی ناپاکی کو پسند نہیں فرماتا تو بدن کی ناپاکی کو کیسے پسند فرما سکتا ہے اور اس سے بھی اہم نفس اور قلب کی طہارت ہے۔ قلب کو بدن سے بھی زیادہ اللہ کا قرب حاصل ہے بیشک اللہ توبہ شعار اور پاکیزہ لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔

مسئلہ: فقہاء نے اس آیت سے نماز کے لئے کپڑوں کی اور جگہ کی اور بدن کی طہارت نجاست حقیقیہ سے ضروری قرار دی ہے۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس آیت سے (صرف) نماز کے لئے طہارت کی شرط لگانا درست نہیں بلکہ تینوں اقسام کی طہارت کے وجوب پر اجماع ہے اور اجماع کی علت یہ ہے کہ جب جسمانی ناپاکیوں سے پاک رہنے کا حکم ناقابل نسخ آیت سے ثابت ہے تو اخلاقی (اور فکری) نجاستوں سے پاک رہنے کا وجوب بطریق اولیٰ ثابت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے آیت وضوء میں فرمایا ہے مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ایک اور آیت میں (حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو خطاب کر کے) فرمایا طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ دو قبروں کی طرف سے گزرے اور فرمایا ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے لیکن کسی بڑی بات کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا ہے ایک تو پیشاب سے آڑ نہیں کرتا تھا اور مسلم کی روایت میں ہے ایک پیشاب سے پاک نہیں رہتا تھا اور دوسرا چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔ (متفق علیہ) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

مجاہدؒ، عکرمہؒ، قتادہؒ، زہریؒ، ابن زیدؒ اور ابو سلمہؒ نے کہا رجز سے مراد ہیں بت یعنی بتوں کو چھوڑ دو ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا گناہ کو چھوڑ دو۔ ابو العالیہ اور ربیع نے کہا رُجز کے معنی ہے بت اور رِجز کا معنی ہے نجاست اور گناہ۔ ضحاک نے کہا شرک مراد ہے اور کلبی کے نزدیک عذاب یعنی ایسے عقائد و اعمال ترک کر دو جو موجب عذاب ہیں۔

وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ۝ یعنی اس غرض کے لئے لوگوں کو اپنا مال نہ دو کہ تم کو اس سے زیادہ دیا جائے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہی قول اختیار کیا ہے۔ قتادہؒ نے کہا کسی کو مال دنیوی بدلہ کے لالچ میں نہ دو بلکہ محض اللہ واسطے دو۔

کہا گیا ہے کہ یہ ممانعت تنزیہی ہے (وجوبی نہیں) ضحاک و مجاہد کا قول ہے کہ یہ حکم (وجوبی) صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے تھا۔ ضحاک نے یہ بھی کہا سود (حصول مال بلا عوض) دو قسم کے ہیں ایک حلال۔ دوسرا حرام۔ حلال سود۔ تحفے ہدیے ہیں اور حرام سود (عرفی شرعی) سود ہے۔ حسن بصریؒ نے اس طرح تشریح کی اپنے اعمال کو کثیر سمجھ کر اللہ پر اپنے اعمال کا احسان نہ رکھو۔ یہ بھی حسن بصریؒ نے فرمایا اپنے اعمال کو اپنی نظر میں زیادہ نہ سمجھو اللہ کی دی ہوئی نعمت کے مقابلے میں وہ کم ہی ہیں۔ مجاہد کا قول خصیف کی روایت سے آیا ہے کہ منین کا معنی ہے ضعیف۔ مطلب یہ ہے کہ کثرت خیر کی طلب میں کمزور نہ ہو۔ ابن زید نے کہا نبوت کا لوگوں پر احسان نہ رکھو کہ ان سے دنیوی مال اس کے عوض طلب کرنے لگو۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اگر اہل حاجت کو کچھ دو تو اپنے عطیہ کو بڑا سمجھ کر ان پر احسان نہ دھرو۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ یعنی اللہ کی خوشنودی اور ثواب کی طلب میں اس کی اطاعت، حکم ممانعت اور مصائب پر صبر رکھو۔ اصل کلام تھا اُصْبِرْ لِرَبِّکَ فَاصْبِرْ حکم صبر کی تکرار تاکید کے لئے ہے یا اقسام صبر کے گوناگوں ہونے کے زیر اثر۔ مجاہد نے کہا تم کو جو دکھ دیا جائے اس پر صبر کرو۔ ابن زید نے کہا تم پر عرب و عجم کے مقابلے کا بار عظیم پڑا ہے اس بار کو

اٹھانے پر صبر رکھو۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ قضاء خداوندی پر اللہ کے لئے صابر رہو۔

فَاِذَا نُقِرَ جب پھونکا جائے گا۔

فِی النَّاقُوْرِ ﴿۸﴾ صور۔ یہ لفظ نقر سے بنا ہے نقر کا معنی ہے آواز پیدا کرنا اصل معنی ہے کسی چیز کو اتنا کھٹکھٹانا کہ آخر اس میں سوراخ ہو جائے پرندہ کی چونچ کو منقار اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔ صحاح جوہری۔ ابوالشیخ ابن حبان نے کتاب العظیمۃ میں وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے سفید موتی سے جو بلور کی طرح چمکدار تھا صور کو بنایا پھر عرش کو حکم دیا کہ صور کو پکڑ لے۔ صور عرش سے معلق ہو گیا پھر کُنْ فرمایا تو اسرافیلؑ کو صور لے لینے کا حکم دیا۔ اسرافیل نے صور لے لیا صور میں ہر پیدا شدہ روح کی تعداد کے مطابق سوراخ ہیں کسی ایک سوراخ سے دو روحیں بر آمد نہیں ہوں گی صور کے وسط میں آسمان و زمین کے چکر کی طرح ایک گول سوراخ ہے جس پر اسرافیل اپنا منہ رکھے ہوئے ہیں پھر اللہ نے اسرافیل کو حکم دیا کہ نفخ اور صیحہ کی خدمت میں نے تیرے سپرد کی۔ اسرافیل عرش کے اگلے حصے میں داخل ہو گیا سیدھا قدم عرش کے نیچے اور بایاں قدم عرش کے اندر رکھے ہوئے اللہ کے حکم کے انتظار میں ہے۔ احمد اور ترمذی نے بسند قوی حضرت زیدؓ بن ارقم کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کس طرح آرام پاؤں صور والا تو صور منہ میں لئے پیشانی جھکائے کانوں کو حکم خدا کی طرف متوجہ کئے موجود ہے کہ کب اس کو (صور پھونکنے کا) حکم دیا جاتا ہے۔ یہ بات صحابہ پر سخت دشوار ہو گئی (کہ جب رسول اللہ ﷺ کو چین نہیں تو ہم کو بدرجہ اولیٰ مضطرب رہنا چاہئے ہم کہاں اور رسول کہاں) حضور ﷺ نے فرمایا حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھو احمد اور حاکم نے اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے روایت کی ہے اس روایت میں نعم الوکیل کے بعد علی اللہ توکلنا۔ زائد ہے۔

فَاِذَا نُقِرَ میں فاء سببی ہے گویا یہ مطلب ہوا کہ کافروں کے دکھ پر صبر رکھو ان کے سامنے ایک سخت ترین زمانہ آرہا ہے جس میں تم کو اپنے صبر کا اچھا نتیجہ ملے گا۔

فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ﴿۹﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ یعنی اس روز کافروں کے لئے امر دشوار ہو گا۔ ذلک سے صور پھونکنے کے وقت کی طرف اشارہ ہے۔ ذٰلِکَ مبتدا ہے یَوْمٌ عَسِیْرٌ خبر ہے یَوْمَئِذٍ اس سے بدل ہے۔

غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿۱۰﴾ یہ عَسِیْرٌ کی تاکید ہے اس لفظ سے معلوم ہوا کہ کافروں کے لئے اس روز کی دشواری ناقص نہ ہو گی کہ بعض وجوہ کے لحاظ سے دشواری ہو اور بعض وجوہ کے اعتبار سے آسانی ہو۔ نہیں مکمل دشواری ہو گی بالکل آسانی نہ ہو گی۔ اس میں اشارہ ہے کہ مومنوں کے لئے وہ دن آسان ہو گا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جب آیت حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ ان آیات کو پڑھتے مسجد میں کھڑے ہوئے ولید بن مغیرہ پاس ہی موجود تھا اور قرات سن رہا تھا حضور اقدس ﷺ کو اس کے سننے کا احساس ہوا تو آپ نے دوبارہ ان آیات کو پڑھا ولید ان آیات کو سن کر اپنی قوم بنی مخزوم کی مجلس میں گیا اور کہنے لگا خدا کی قسم ابھی میں نے محمد ﷺ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسان کا کلام ہے نہ جن کا۔ اس میں عجیب چاشنی اور رونق ہے اس (درخت) کی چوٹی ثمر آفریں اور نچلا حصہ خوشہ دار ہے وہ غالب آئے گا مغلوب نہ ہو گا یہ کہہ کر وہ اپنے گھر چلا گیا قریش کہنے لگے خدا کی قسم ولید صابی (بے دین) ہو گیا واللہ تمام قریش والے بے دین ہو جائیں گے۔ ولید کو ریحانۂ قریش کہا جاتا تھا ابو جہل بولا تمہاری یہ مصیبت میں خود حل کر دوں گا یہ کہہ کر ابو جہل ولید کے پاس گیا اور غمگین شکل کے ساتھ اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا ولید نے کہا میرے بھتیجے آج تم مجھے غمگین نظر آتے ہو کیا وجہ ہے ابو جہل بولا رنجیدہ نہ ہونے کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے قریش خیمہ میں جمع ہو کر آپ کے بڑھاپے کے باوجود آپ پر تہمت لگا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے محمد ﷺ کے کلام کو سچا کر دکھایا آپ ابن کبشہ اور بن ابی قحافہ کے پاس اس لئے جاتے ہیں کہ ان کے پس خوردہ کھانا کچھ آپ کو مل جائے ولید یہ سن کر طیش میں آگیا اور بولا کیا قریش کو معلوم نہیں کہ میں بڑا مالدار اور کثیر الاولاد ہوں محمد ﷺ اور اس کے ساتھیوں کا

پیٹ تو خود ہی بھرا ہوا نہیں ان کے پاس پس خوردہ کہاں سے آیا پھر ابو جہل کے ساتھ اٹھ کر قوم کے جلسہ میں آیا اور بولا کیا تمہارا خیال ہے کہ محمد ﷺ مجنون ہے کیا کبھی کسی نے دیوانوں کی طرح بات کہتے اس کو دیکھا ہے حاضرین نے جواب دیا بخدا نہیں ولید نے کہا کیا تمہارا خیال ہے کہ محمد ﷺ کاہن ہے کیا کبھی کہانت کرتے تم نے اس کو دیکھا ہے لوگوں نے کہا خدا گواہ ہے۔ نہیں دیکھا۔ ولید نے کہا کیا تم کہتے ہو محمد ﷺ بڑا جھوٹا ہے کیا کبھی تمہارے تجربہ میں اس کا جھوٹ آیا ہے لوگوں نے کہا بخدا نہیں۔ سچائی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو نبوت سے پہلے امین کہا جاتا تھا۔ پھر قریش نے ولید سے کہا تو آخر وہ کیا ہے ولید نے دل ہی دل میں کچھ غور کیا پھر نظر اٹھائی اور منہ بگاڑ کر بولا بس وہ جادوگر ہے اور کچھ نہیں۔ تم نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے کلام سے میاں بیوی باپ اولاد اور بھائیوں میں جدائی پیدا کر دیتا ہے حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ قصہ نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے بغوی نے کہا اس وقت مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے دوسری سند سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿۱۱﴾ واؤ بمعنی مَعَ ہے یعنی تم اس کی پروانہ کرو مجھے اس کے لئے چھوڑ دو میں تمہاری طرف سے اس کے لئے کافی ہوں۔

یا یہ مطلب کہ میں نے تنہا خود بغیر کسی شریک کے اس کو پیدا کیا ہے۔ یا یہ مطلب کہ میں نے اس کو اکیلا تنہا پیدا کیا اس وقت نہ اس کے پاس مال تھا نہ اولاد۔

یا یہ مطلب یہ میں نے اس کو شرارت میں یکتا پیدا کیا اول صورت میں وَحِيدًا ذَرْنِي کے مفعول کا حال ہوگا۔ دوسری صورت میں خَلَقْتُ کے فاعل کا حال ہوگا۔ تیسری اور چوتھی صورت میں خَلَقْتُ کا مفعول محذوف ہوگا یعنی خَلَقْتُهُ اور اسی مفعول کی ضمیر سے وَحِيدًا حال ہوگا۔

وحید وہ شخص ہوتا ہے جس کا نسب کسی باپ سے نہ ملتا ہو وحید بھی حرامی تھا۔ بغوی نے بیان کیا ولید کا خطاب قوم میں وحید تھا اللہ نے بھی بطور استہزاء و استخفاف اس کو وحید فرمایا۔

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ﴿۱۲﴾ مَمْدُوْد بمعنی وسیع کثیر۔ یعنی نمو اور ترقی کی وجہ سے اس میں پھیلاؤ ہو گیا ہے جیسے کھیتی مویشی اور تجارت۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا اس کے پاس ہزار دینار تھے۔ قتادہ نے کہا چار ہزار دینار۔ سفیان نے کہا ہزار در ہزار (دس لاکھ) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نو ہزار مثقال چاندی۔ مقاتل نے کہا طائف میں ولید کا ایک باغ تھا جس کے پھل ختم ہی نہیں ہوتے تھے نہ سردی کے موسم میں نہ گرمی میں۔ عطا کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان ولید کے بہت اونٹ گھوڑے اور بکریاں تھیں۔ بہت چشمے اور باندی غلام بھی اس کی ملکیت میں تھے۔

وَبَنِينَ شُهُودًا ﴿۱۳﴾ یعنی وہ بیٹے جو مکہ میں مقیم ہیں معاشی تلاش میں ان کو سفر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ولید کے دس بیٹے تھے اور بر قول مقاتل سات تھے۔ ولید بن ولید، خالد، عمارہ، ہشام، عاص، قیس، عبد الشمس ان میں سے خالد، ہشام اور عمارہ مسلمان ہو گئے تھے۔

وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ﴿۱۴﴾ یعنی میں نے اس کی ریاست اور جاہ و حشمت کا سامان درست کیا۔ ریاست اور پیشوائی کے استحقاق میں یکتا بنایا یہاں تک کہ اس کو ریحانۂ قریش کہا جانے لگا یا یہ مطلب کہ اس کی عمر طویل کی طول عمر کے اسباب عطا کئے۔

ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿۱۵﴾ پھر اس کو یہ امید لگی ہوئی ہے کہ میں اس کے مال و اولاد میں مزید بیشی عطا کروں گا۔

كَلَّا یہ حرف ردع (بازداشت) ہے یعنی اس کی ناشکری کی وجہ سے ہرگز ایسا نہیں کروں گا بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد ولید کے مال و اولاد میں برابر کمی آتی رہی اور اسی تنزل کی حالت میں وہ مر گیا۔

إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿۱۶﴾ وہ ہماری آیات کا معاند ہے وہ وحی کا منکر ہے اور آیات کو جادو قرار دیتا ہے۔

یہ جملہ گزشتہ باز داشت کی علت ہے کیونکہ ناشکری اور آیات الٰہیہ کی مخالفت سے نعمت کا زوال اور ترقی کی روک ہو جاتی ہے۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ میں اس پر سخت عذاب ڈھانک دوں گا۔ صَعُود ایسا سخت عذاب جو ہر عذاب سے بڑھ کر ہو سب پر غالب ہو۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ آیت سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا کی تشریح میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دوزخ میں آگ کا ایک پہاڑ ہے ولید کو اس پر چڑھنے کا حکم ہو گا جب وہ اپنا ہاتھ اس پر رکھے گا تو ہاتھ پگھل جائے گا اور جب اٹھا لے گا تو دوبارہ پھر اصلی حالت پر ہو جائے گا اور جب اس پر قدم رکھے گا تو قدم پگھل جائے گا پھر جب قدم کو اٹھالے گا تو قدم پھر اصلی حالت پر ہو جائے گا۔ بغوی۔

بغوی نے حضرت عمر کی روایت سے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے احمد، ترمذی ابن حبان اور حاکم نے بھی یہ روایت کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دوزخ کے اندر ایک پہاڑ ہو گا ستر سال تک اس پر چڑھے گا پھر لڑک کر نیچے گر جائے گا اور ہمیشہ اسی طرح کرتا رہے گا۔

کلبی نے کہا صعود دوزخ میں ایک چکنی چٹان ہے ولید کو اس پر چڑھنے کا حکم دیا جائے گا اوپر سے لوہے کی زنجیروں سے اس کو کھینچا جائے گا اور نیچے سے لوہے کے ہتوڑوں سے مارا جائے گا اس طرح وہ چالیس برس تک چڑھتا رہے گا جب چوٹی پر پہنچے گا تو پھر نیچے گرا دیا جائے گا اور پھر چڑھنے کا حکم ہو گا اور آگے سے کھینچا جائے گا پیچھے سے مارا جائے گا۔ اس کی یہ حالت ہمیشہ رہے گی۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ قرآن پر نکتہ چینی کرنے کے لئے اس نے اپنے خیال میں غور کیا۔

وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ اور اندازہ لگایا کہ قرآن کے متعلق کیا کہے۔ یہ جملہ ولید کے عناد کا بیان اور استحقاق عذاب کی علت ہے۔

فَقُتِلَ اس پر لعنت ہو اور بقول زہری اس پر عذاب ہو۔

كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ کیفَ کا استفہام انکاری اور زجری ہے اس کے اندازہ لگانے پر اظہار تعجب اور استہزاء ہے (یعنی اللہ سوال نہیں کر رہا ہے اس کو سب کچھ معلوم ہے سوالِ استفہامی وہ کرتا ہے جس کو وہ شے معلوم نہ ہو)

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ یہ جملہ تاکید ہے اور لفظ ثم ترقی کو ظاہر کر رہا ہے۔

ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ نَظَرَ کا عطف فَكَّرَ اور قَدَّرَ پر ہے یعنی سوچا غور کیا دل میں کچھ اندازہ کیا پھر دیر کے بعد سورۂ فاتحہ پر پیہم غور کیا۔

ثُمَّ عَبَسَ جب نکتہ چینی کی کوئی چیز نہیں ملی اور سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے تو منہ بگاڑ لیا۔ یا رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھا اور دشمنی سے تیوری پر بل ڈال لئے۔

وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ یہ عبس کی تاکید ہے یعنی ترشرو ہوا۔ تیوری بگاڑی۔

ثُمَّ اَدْبَرَ پھر رخ موڑا۔

وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ اور مغرور بن گیا۔

فَقَالَ یعنی جب یہ الفاظ اس کے دل میں آئے تو فوراً بغیر توقف کے بول اٹھا۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ یہ صرف منقول جادو ہے جو دوسروں سے منقول ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾ یہ پہلے جملے کی تاکید ہے اس لئے حرف عاطف نہیں لایا گیا۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ سقر جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ جملہ استفہامیہ سقر کی عظمت شان کو ظاہر کر رہا ہے۔

لَا تُبْقِيْ جو چیز اس میں ڈال دی جائے اس کو باقی نہیں چھوڑتا۔

وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ اور بغیر ہلاک کئے نہیں رہتا۔ مجاہد نے دونوں جملوں کے تشریحی معنی اس طرح بیان کئے کہ سقر کسی کو

زندہ نہیں چھوڑتا اور نہ اس کے اندر کوئی چیز مردہ رہتی ہے جب دوزخی اس کے اندر جل جائے گا تو از سر نو ان کی بدنی ساخت درست ہو جائے گی۔ ضحاک نے کہا ہر چیز کی تیزی (ایک حد پر پہنچ کر) سست ہو جاتی ہے مگر سقر کی تیزی دھیمی نہ پڑے گی۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ وہ کھال کو بگاڑ دینے والی ہے سفیدی کو سیاہی سے بدل دینے والی ہے حضرت ابن عباسؓ اور زید بن سلم نے تفسیر کی وہ جلد کو جلا دینے والی ہے لَوَّاحَةٌ کا ترجمہ لائحۃ بھی کیا گیا ہے یعنی وہ لوگوں کے سامنے نمایاں اور ظاہر ہوگی حسن اور ابن کیسان نے کہا وہ سامنے دکھتی ہوگی کہ آنکھوں دیکھے لوگ اس میں اتریں گے اسی کی طرح معنی ہے آیت وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ کا۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ دوزخ پر انیس ملائکہ مسلط ہوں گے یہ سب دوزخ کے دربان ہوں گے ایک مالک اور باقی اٹھارہ دوسرے فرشتے۔ ابن مبارک اور بیہقی میں سے کسی نے ابوالعوام کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں سے ہر فرشتے کے دونوں مونڈھوں کے درمیان اتنا لمبا چوڑا فاصلہ ہوگا۔ ابن وہبؒ نے بروایت زید بن اسلم بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں سے ہر ایک کے دونوں مونڈھوں کے درمیان ایک سال کی راہ کے بقدر فاصلہ ہوگا۔ رحم ان (کے دلوں) سے نکال لیا گیا ہے ہر فرشتہ ستر ہزار کو اٹھا کر دوزخ میں جہاں چاہے گا پھینک دے گا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ و ضحاک کا قول نقل کیا ہے اور بیہقی نے بھی ابن اسحاق کی روایت سے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو جہل نے قریش سے کہا تم پر تمہاری مائیں روئیں کیا تمہارے دس دس آدمیوں میں بھی یہ طاقت نہیں کہ ایک ایک دربان کو پکڑ لیں ابن کبشہ تو بیان کر رہا تھا کہ دوزخ کے صرف انیس دربان ہیں تم تو بڑے طاقتور بہادر ہو۔ ابوالاسد بن کلدہ جمحی بولا سترہ کے لئے تو میں کافی ہوں دس کو پشت سے اور سات کو پیٹ سے باندھ لوں گا رہے دو ان کو تم پکڑ لینا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ بیہقی نے سدی کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ نازل ہوئی تو ایک قریشی شخص نے جس کو ابوالاسدین کہا جاتا تھا کہا اے گروہ قریش تم کو ان انیس سے خوفزدہ نہ ہونا چاہئے میں دس کو اپنے سیدھے مونڈھے سے اور نو کو بائیں مونڈھے سے دھکے دے کر تم سے دور کر دوں گا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً یعنی ہم نے دوزخ کے دربان صرف فرشتے مقرر کئے ہیں وہ آدمی نہیں ہیں کہ یہ کافر ان کو دفع کر سکیں۔

وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا یعنی دوزخ کے دربانوں کی قلت تعداد کو ہم نے کافروں کی گمراہی اور کفر کا سبب بنایا قلت تعداد کا انہوں نے مذاق اڑایا اور ان کے مقابلے میں غرور کیا اور اپنے خیال میں تمام کافروں کو اس قلیل تعداد کا عذاب دینا بعید از عقل سمجھا اور نتیجہ میں بیہودہ گفتگو کی اس ساری گمراہی کا سبب دربانوں کی تعداد کی قلت ہوئی۔

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ کلام کی رفتار بتا رہی ہے کہ اس فعل کا تعلق فعل محذوف سے ہے مفہوم کلام یہ ہے کہ ہم نے آپ کو دربانوں کی تعداد کی قلت کی اطلاع اس غرض کے زیر اثر دی کہ اہل کتاب آپ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کا یقین کر لیں کیونکہ یہ تعداد ملائکہ اس تعداد کے موافق ہے جس کی صراحت توراۃ و انجیل میں کی گئی ہے۔

وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا اور اہل ایمان کی ایمانی کیفیت میں اضافہ ہو اس وجہ سے بھی کہ ان کا اس تعداد پر ایمان ہوگا اور اس لئے بھی کہ اہل کتاب اس کی تصدیق کریں گے اور اس تصدیق سے مومنوں کے وثوق میں مزید زیادتی ہوگی۔

وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ یہ عطف تفسیری ہے استیقان و زیادت ایمان کی تاکید ہے۔ شک نہ ہونے سے مراد ہے دربانوں کی تعداد میں شک نہ ہونا ابن ابی حاتم نے اور بیہقی نے بعض میں ذکر کیا ہے کہ حضرت براء بن عازب نے فرمایا کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے چند صحابیوں سے جہنم کے دربانوں کے متعلق سوال کیا

وہ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو اسی وقت آیت عَلَیْہَا تِسْعَۃَ عَشَرَ نازل ہوئی اور اس آیت کا نزول اہل کتاب کے لئے یقین بخش اور اہل ایمان کے ایمان کو بڑھانے والا ہوا۔

وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مرض سے مراد ہے شک یا نفاق۔ آیت مکی ہے اور مکہ میں اس وقت کوئی منافق نہیں تھا اس لئے ہجرت کے بعد مدینہ میں منافقوں کی طرف سے جو بات پیش آنے والی تھی اس کے متعلق یہ پیش گوئی ہے۔

وَّالْکٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا یعنی یہ کلام ایسا ہی عجیب ہے جیسے کوئی کہاوت عجیب ہوتی ہے یہ بھی آیت کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ منافقوں اور کافروں نے جب تعداد مذکور کو بعید از عقل قرار دیا تو سمجھے کہ (یہ کلام حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ) بطور مثل ہے۔

کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ لفظ کَذٰلِکَ کا تعلق مابعد سے ہے یعنی جس طرح دربانوں کی تعداد کا ذکر کر کے اللہ نے کچھ لوگوں کو گمراہ اور کچھ کو ہدایت یاب کیا اسی طرح اللہ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کو گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو ہدایت یاب بنانا چاہتا ہے اس کو ہدایت کر دیتا ہے۔

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ یعنی جنودِ رب کی حقیقت اور اندازۂ قوت سے سواء خدا کے کوئی واقف نہیں۔ تعداد سے ناواقفیت مراد نہیں تعداد تو بتادی کہ انیس ملائکہ ہیں اس میں کمی بیشی نہیں۔ مقاتل نے کہا یہ ابو جہل کے قول کا جواب ہے ابو جہل نے کہا تھا کہ محمد ﷺ کے مددگار صرف انیس (ملائکہ) ہیں عطا نے بیان کیا کہ جن فرشتوں کو اللہ نے دوزخیوں کے عذاب کے لئے پیدا کیا ہے ان کی تعداد سے سوا خدا کے کوئی اور واقف نہیں مراد یہ ہے کہ دربان تو انیس ہی ہیں مگر ان کے مددگار اور معاون کتنے ہیں ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ہناد نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ جس شخص کو دوزخ میں لے جانے کا حکم ہوگا اس کے لئے ایک لاکھ فرشتے (پکڑنے کو) آگے بڑھیں گے قرطبی نے لکھا ہے کہ تسعة عشر سے سردار مراد ہیں کل ملائکۂ جہنم کتنے ہوں گے اس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

وَمَا هِیَ دوزخ یا ملائکۂ جہنم کی تعداد یا سورت

اِلَّا ذِکْرٰی لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ انسانوں کے لئے محض یادداشت اور نصیحت ہے۔

کَلَّا منکروں کے لئے اس لفظ سے بازداشت کی گئی ہے یا منکروں کے نصیحت پذیر ہونے کا انکار ہے اگرچہ واقع میں یہ پیام نصیحت ہے۔

وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ نافع حفص حمزہ اور یعقوب کی قرات میں اِذْ اَدْبَرَ ہے (ادبر ماضی ادبار مصدر۔ باب افعال) باقی قاریوں کی قرات میں اِذَا دَبَرَ ہے (دبر ماضی ثلاثی مجرد) دَبَرَ اور اَدْبَرَ دونوں ہم معنی ہیں جیسے قبل اور اقبل دبر اللیل اور ادبر اللیل پشت پھیر کر رات چلی گئی۔ ابو عمرو نے بیان کیا کہ یہ قریش کا محاورہ ہے۔ قطرب نے کہا دبر بمعنی اقبل ہے۔ عرب کہتے ہیں دبرنی فلاں فلاں شخص میرے پیچھے آگیا رات بھی دن کے پیچھے آتی ہے (اس لئے دبر کے معنی ہوئے جب رات دن کے پیچھے آئے)

وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ یعنی جب صبح روشن ہو جائے۔

اِنَّهَا لَاِحْدَی الْکُبَرِ ﴿۳۵﴾ سقر بڑی بلاؤں میں سے ایک بلاء ہے، بڑی بلائیں بہت ہیں ان میں سے ایک سقر بھی ہے جہنم لظی حطمہ سعیر جحیم ہاویہ سقر سب بڑی بلائیں ہیں (متعدد دوزخ ہیں) یہ جملہ جواب قسم ہے یا کلا کی علت کا بیان ہے اور درمیان میں قسموں کا ذکر تاکید کے لئے ہے۔

نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ نذیر بمعنی انذار مصدر ہے (باعتبار ڈرانے کے) یا حال ہے جملہ سابقہ کے مدلول کا یعنی سقر بڑی خوف آفریں چیز ہے (اس وقت نذیر بمعنی منذر یعنی مصدر بمعنی اسم فاعل ہوگا) حسن نے کہا سقر سے بڑھ کر کسی

ع ۱۵

دوسری مصیبت سے (قرآن میں) نہیں ڈرایا گیا۔ خلیل نے کہا نذیر، نکیر کی طرح مصدر ہے اور مونث (سقر) سے حال ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ نذیر بمعنی مُنذِر، مَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ الخ کی ضمیر فاعل متکلم سے حال ہے یعنی ہم ڈرانے والے ہیں۔ بعض لوگوں نے تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا یَآ اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ نَذِیْرَ الِلْبَشَرِ فَاَنْذِرْ (یعنی اے چادر پوش لوگوں کو (عذاب خداوندی سے) ڈراتا ہوا اٹھ اور ڈرا۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ یعنی دونوں فریقوں کے لئے نذیر ہے ایک وہ فریق جو خیر و اطاعت میں آگے بڑھنا چاہتا ہے دوسرا وہ فریق جو شر اور گناہ میں پڑا رہنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ، مبتدا ہو اور مَنْ شَآءَ مِنْكُمْ خبر مقدم ہو اس وقت آیت کا مفہوم زجر و توبیخ ہوگا۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ یعنی گناہ۔ بداعمالیاں۔

رَهِیْنَةٌ ﴿۳۸﴾ یہ شتیمۃ کی طرح مصدر ہے۔ صیغہ صفت (بروزن فعیلۃ) بمعنی اسم مفعول نہیں ہے۔ کیونکہ جو وزن فعیل بمعنی مفعول ہوتا ہے اس میں مذکر مونث برابر ہوتے ہیں مونث کے لئے تانیث کی تاء زیادہ نہیں کی جاتی اس لئے اگر صیغہ صفت بمعنی اسم مفعول ہو تو رَهِیْنَةٌ کی بجائے رھین ہونا چاہئے مطلب یہ کہ ہر شخص اپنی بداعمالی کی وجہ سے دوزخ میں ہمیشہ کے لئے محبوس ہوگا بداعمالی کی وجہ سے یعنی کفر کی وجہ سے۔

اِلَّآ اَصْحٰبَ الْیَمِیْنِ ﴿۳۹﴾ سواء اہل ایمان کے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ اصحاب الیمین سے مراد ہیں وہ لوگ جن کے اعمال نامے دائیں ہاتھوں میں دیئے جائیں گے۔ ابن مبارک نے ایک اسدی شخص کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب سے فرمایا کیا آخرت کے متعلق کوئی بات (تمہارے پاس) ہے کعب نے کہا جی ہاں امیر المومنین قیامت کا دن ہوگا تو لوح محفوظ رکھ دی جائے گی ہر شخص اپنے اپنے عمل کو دیکھ لے گا پھر اعمالنامے لا کر عرش کے چاروں طرف بکھیر دیئے جائیں گے پھر مومن کو بلا کر اس کا اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اس پر غور کرے گا۔

مقاتل نے کہا اصحاب الیمین وہ جنتی ہوں گے جو روز میثاق میں حضرت آدم کے دائیں طرف تھے اور اللہ نے ان کے متعلق فرمایا تھا ھو لاء للجنة ولا ابالی حضرت ابن عباسؓ کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ اصحاب الیمین وہ لوگ ہوں گے جن کے نفوس مبارک ہیں۔ ان تمام اقوال کا نتیجہ ایک ہی ہے کہ اصحاب الیمین سے مومن مراد ہیں اہل ایمان کو ہی دوامی عذاب نہ ہوگا یا بقدر گناہ سزا پانے کے بعد مغفرت ہو جائے گی یا شفاعت کی وجہ سے معافی ہو جائے گی یا محض رحمت الٰہی سے بغیر شفاعت کے عذاب سے محفوظ رہیں گے حسن بصری نے کہا کہ اصحاب الیمین سے مراد مخلص اہل ایمان ہیں۔

قاسم نے آیت کی تفسیر اس طرح کی کہ ہر شخص سے اس کے اچھے برے عمل کا مواخذہ ہوگا اپنے اعمال پر اعتماد رکھنے والا ہر شخص۔ مرہون ہے۔ ہاں جو فضل الٰہی پر اعتماد رکھتا ہے اس سے مواخذہ نہ ہوگا (گویا فضل الٰہی پر اعتماد رکھنے والے اصحاب یمین ہیں)

ان دونوں قولوں کا حاصل یہ ہے کہ ہر شخص سے اس کے اعمال کا مواخذہ ہوگا اگرچہ بعض کی پکڑ سخت نہ ہو مگر کامل مسلمانوں سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اصحاب الیمین سے کامل ایمان والے مراد لینے کی کوئی دلیل نہیں۔

سعد بن منصورؒ اور ابن حاتم نے نیز حکیم نے نوادر الاصول میں حضرت علیؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ اصحاب الیمین سے مراد مسلمانوں کے خورد سال بچے ہیں (جو طفولیت میں مر گئے) حکیم نے اس روایت میں اتنی بیشی کی ہے کہ انھوں نے کوئی عمل نہیں کیا اور نہ وہ اپنے اعمال کے ہاتھوں میں رہن ہوئے۔

ابوظبیانؒ نے حضرت ابن عباس کا ایک قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں لیکن جب تک اس روایت کی صحت ثابت نہ ہو نہیں کہا جا سکتا کہ اصحاب الیمین سے ملائکہ (یا اطفال مسلمین) مراد ہیں۔

فِیْ جَنّٰتٍ ﴿ؕ﴾ وہ جنتوں میں ہوں گے۔

يَتَسَاءَلُونَ ﴿۴۰﴾ باہم سوال کرینگے یعنی سب ملکر دوسروں سے پوچھیں گے۔ باب تفاعل کا استعمال اس لئے کیا گیا کہ سوال کرنے میں سب شریک ہوں گے۔

عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۴۱﴾ مجرموں کی حالت کے متعلق سوال کریں گے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿۴۲﴾ یہ سوال اور اس کا آئندہ جواب اس واقعہ کا بیان ہے جو سائل مسؤل اور مجرموں کے درمیان ہوگا مسؤل مجرموں سے کیا پوچھیں گے مجرم کیا جواب دیں گے اور سوال کرنے والے دوسروں سے کیا دریافت کریں گے کس کی حالت دریافت کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلام میں اختصار ہو اصل کلام اس طرح تھا کہ اہل جنت کچھ لوگوں سے مجرموں کی حالت پوچھیں گے اور وہ مجرموں سے سوال کریں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَنِ الْمُجْرِمِينَ میں عن زائد ہے اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ اہل جنت مجرموں سے دریافت کریں گے۔

قَالُوا مجرم جواب دیں گے۔

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿۴۳﴾ ہم فرض نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿۴۴﴾ اور جو چیز مسکین کو دینی واجب تھی ہم اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے۔

آیت بتارہی ہے کہ آخرت میں فروع اعمال پر گرفت کرنے کیلئے کافروں سے خطاب کیا جائیگا البتہ دنیا میں کفار فروع اعمال کے مخاطب اس لئے نہیں ہیں کہ خطاب بالا عمال کی شرط یعنی ایمان مفقود ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کفار اعمال پر مکلف نہیں ہیں کیونکہ کفر کا تقاضا تو شدت تکلیف ہے، تخفیف تکلیف مقتضاء کفر کے خلاف ہے۔ ہاں اسلام لانے سے گزشتہ حقوق اللہ نماز روزہ اور مختلف سزائیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ حالت کفر میں کافر اللہ کی جو حق تلفیاں کرتا ہے مسلمان ہونے کے بعد ان کا مواخذہ نہ ہوگا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام پہلے کے گناہوں کو نابود کر دیتا ہے الخ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿۴۵﴾ اور جس لہو و باطل میں اللہ نے گھسنے کی ممانعت فرمادی تھی ہم اس میں گھستے تھے۔

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۴۶﴾ یعنی ان تمام جرائم کے بعد (سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ) ہم روز جزا کو غلط جانتے تھے تَكْذِيبِ يَوْمِ الدِّينِ کو تمام جرائم کے بعد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا جرم ہے۔

حَتَّى أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿۴۷﴾ الْيَقِين سے مراد ہے موت۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿۴۸﴾ بالفرض اگر سب سفارشی بھی ملکر ان کی سفارش کریں تو سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ اس جملہ کی وابستگی یا تو كُلُّ نَفْسٍ رَهِينَةٌ سے ہے یا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ سے۔ یہ آیت بطور مفہوم مخالف بتارہی ہے کہ اہل ایمان کے لئے خواہ وہ فاسق (مرتکب کبیرہ) ہوں شفاعت سودمند ہوگی۔

اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں حضرت ام حبیبہؓ یا حضرت ام سلمہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم عائشہؓ کے گھر تھے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا جس مسلمان کے تین خورد سال بچے جوانی کو پہنچنے سے پہلے مر جائیں گے ان کو قیامت کے دن لاکر جنت کے دروازے پر کھڑا کیا جائے گا اور جنت کے اندر داخل ہونے کا حکم دیا جائے گا وہ کہیں گے کہ اگر ہمارے ماں باپ داخل ہوں تو (تو ہم بھی داخل ہوں گے بغیر ان کے ہم اندر نہیں جائیں گے) آخر دوسری یا تیسری بار حکم دیا جائے گا اور کہا جائے گا جنت میں تم بھی جاؤ اور تمہارے باپ بھی۔ آیت فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ سے یہی مراد ہے (یعنی شافعین سے مراد خورد سال اطفال ہیں اور شفاعت سے مراد ان کی شفاعت ہے)

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ملائکہ اور انبیاء اور شہید اور نیک بندے اور تمام اہل ایمان شفاعت کریں گے پھر دوزخ کے اندر سوائے چار (قسم کے آدمیوں کے) اور کوئی نہیں رہے گا اس کے بعد آپ نے آیت قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ۔ يَوْمِ الدِّينِ تک تلاوت کی (یعنی اس آیت میں جن چار اقسام کا بیان ہے وہی دوزخ میں رہیں گے)

حضرت عمران بن حصین نے فرمایا شفاعت مفید ہو گی مگر ان لوگوں کے لئے سود مند نہ ہو گی جن کا تذکرہ تم (آیات مذکورہ میں) سنتے ہو حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عمران کا قول بتارہا ہے کہ نماز کو ترک کرنے والے زکوٰۃ نہ دینے والے لہو اور باطل میں گھسنے والے خواہ مومن ہی ہوں مگر شفاعت سے بھی ان کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ان دونوں بزرگوں کے قول کی بناء اسی آیت پر ہے کیونکہ اس آیت میں فاء سببی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوصاف اربعہ جن کا ذکر آیت میں آیا ہے شفاعت کے غیر مفید ہونے کے موجب ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ عدم افادہ شفاعت کا ترتب اوصاف اربعہ کے مجموعہ پر ہے جن میں ایک وصف تکذیب قیامت بھی ہے تو افادۂ شفاعت سے مانع یہ اوصاف بحیثیت مجموعہ ہیں (ایک ایک انفرادی وصف افادہ شفاعت سے مانع نہیں)

ہر مومن کے لئے شفاعت کے جواز پر اجماع ہے دوزخ میں داخل ہونے کے قابل بعض مومن شفاعت کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہی نہیں ہونگے اور داخل ہو چکے ہوں گے تو نکال لئے جائیں گے۔ معتزلہ، خوارج اور ان جیسے دوسرے بدعتی شفاعت کے منکر ہیں حالانکہ احادیث شفاعت متواتر المعنی ہیں تمام احادیث کو ذکر کرنا تو موجب طوالت ہے ہم بعض احادیث بیان کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا آخر میرا رب ندا دے گا محمد ﷺ کیا تو اب خوش ہو گیا۔ میں عرض کروں گا جی ہاں! میرے رب میں راضی ہوں۔ بزار، طبرانی، ابو نعیم، حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کبیرہ گناہوں والے امتیوں کے لئے میری شفاعت ہے۔ ترمذی، ابن حبان، حاکم، احمد، ابوداؤد، ایسی ہی روایت حضرت ابن عباسؓ کی بھی طبرانیؒ نے لکھی ہے اور خطیب نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت کعبؓ بن عجرہ کی روایات بھی اسی طرح کی درج کی ہیں۔

حضرت عثمان بن عفانؓ نے مرفوعاً بیان کیا کہ (قیامت کے دن) عالم اور عابد کو لایا جائے گا عابد سے کہا جائے گا جنت میں چلا جا اور عالم سے کہا جائے گا تو شفاعت کرنے کے لئے ٹھہر ارہ۔ اصبہانی، یہ بھی حضرت عثمان غنیؓ کی مرفوع روایت ہے کہ میری امت کے بدکردار (بھی) اچھے لوگ ہیں عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے فرمایا میری امت کے بدکردار لوگوں کو میری شفاعت سے اللہ جنت میں داخل فرمائے گا اور نیکوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ کی طرف سے جنت میں داخلہ ملے گا۔ طبرانی وابو نعیم۔ حضرت ابن عمرؓ کی موقوف روایت ہے کہ عالم سے کہا جائے گا اپنے شاگردوں کی شفاعت کر خواہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہو جائے۔ دیلمی۔ حضرت ابو درداء کی مرفوع روایت ہے کہ شہید اپنے ستر گھر والوں کی شفاعت کرے گا۔ ابوداؤد

حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگ قطار در قطار کھڑے ہوں گے پھر ایک جنتی آدمی ایک دوزخی کی طرف سے گزرے گا دوزخی اس سے کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ ایک روز تو نے مجھ سے پینے کے لئے کچھ مانگا تھا اور میں نے تجھے شربت پلایا تھا یہ سن کر جنتی اس دوزخی کی سفارش کرے گا پھر وہ (شفاعت یافتہ دوزخی یا وہی جنتی) ایک اور دوزخی شخص کی طرف سے گزرے گا اور موخر الذکر اول الذکر شخص سے کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میں نے تجھے پاک پانی دیا تھا یہ سن کر وہ اس دوزخی کی شفاعت کرے گا پھر وہ (نجات یافتہ نمبر دوئم یا اول الذکر جنتی) ایک اور دوزخی کی طرف سے گزرے گا اور دوزخی اس سے کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ تو فلاں کام کو جارہا تھا اور میں نے تیرا وہ کام کر دیا تھا یہ سن کر وہ شخص اس دوزخی کی شفاعت کرے گا۔

مسئلہ: شفاعت کس کو نصیب نہ ہو گی حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے (عقیدہ) شفاعت کی تکذیب کی اس کو شفاعت نصیب نہیں ہو گی اور جس نے (حوض کوثر) کی تکذیب کی اس کو حوض سے کچھ حصہ نہیں ملے گا۔ اس روایت کے راوی سعید بن منصور ہیں۔

حضرت زید بن ارقم اور کچھ اوپر دس صحابیوں سے حضور اقدس ﷺ کا یہ فرمان مروی ہے کہ قیامت کے دن میری شفاعت حق ہے جس کا شفاعت پر ایمان نہ ہوگا وہ شفاعت کا مستحق بھی نہیں ہوگا۔ ابن منیع۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری شفاعت (ہر مومن کے لئے) مباح ہے سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے میرے صحابہؓ کو گالیاں دیں۔ ابو نعیم فی الحلیۃ۔

حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کے دو قسم کے لوگوں کو میری شفاعت نہیں حاصل ہوگی۔ (۱) مرجیہ (۲) قدریہ۔ ابو نعیم۔

مسئلہ: احادیث میں آیا ہے کہ بعض گناہ شفاعت سے محروم رکھنے والے ہیں حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عرب سے کھوٹ کی (دغا دی فریب کیا) اس کو میری شفاعت حاصل نہ ہوگی۔ بیہقی نے اس کو جید سند سے روایت کیا ہے۔

حضرت معقل بن یسار کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آدمیوں کو قیامت کے دن میری شفاعت نصیب نہ ہوگی (۱) بڑا ظالم لوگوں کی بڑی حق تلفیاں کرنے والا (۲) دنیا میں بہت زیادہ گھسنے والا دین سے نکل جانے والا۔ بیہقی اور طبرانی نے اس کو عمدہ سند سے بیان کیا ہے۔

حضرت ابو درداءؓ وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپس کے جھگڑے چھوڑ دو قیامت کے دن میں جھگڑالو کی شفاعت نہیں کروں گا۔ طبرانی۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ اَلتَّذْکِرَۃُ سے مراد صرف قرآن ہے یا وہ تمام یادداشتیں جن میں قرآن بھی شامل ہے۔ استفہام انکاری ہے یعنی دنیا میں ان کا حال ایسا کیوں ہے جو عذاب آخرت تک پہنچانے والا ہے۔

كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ مُسْتَنْفِرَۃٌ بکسر فاء بھاگنے والے نَفَرَ اور اِسْتَنْفَرَ دونوں ہم معنی ہیں جیسے عجب اور استعجب۔ مُسْتَنْفَرَۃٌ بفتح فاء خوفزدہ بدکے ہوئے۔ دونوں طرح مروی ہے۔

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ قَسْوَرَۃٌ بروزن فَعْوَلَۃٌ قسر سے مشتق ہے اور قسر کا معنی ہے قہر۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا قَسْوَرَۃٌ سے مراد ہیں شیر۔ عطا اور کلبی کا بھی یہی قول ہے مجاہد قتادہ اور ضحاک کے نزدیک تیر انداز (شکاری) مراد ہیں۔ قَسْوَرَۃٌ کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا۔ عطا کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول بھی یہی منقول ہے۔ زید بن اسلم نے کہا طاقتور اور ہر موٹے قوی کو عرب قَسْوَرَۃٌ کہتے ہیں۔ ابو المتوکل نے کہا لوگوں کے شور شغب کو قَسْوَرَۃٌ کہتے ہیں۔

عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ قَسْوَرَۃٌ شکاری کے جال کو کہتے ہیں۔ سعید بن جبیر نے شکاری ترجمہ کیا ہے۔ ابن المنذر نے سدی کی روایت سے بیان کیا کہ کافروں نے کہا اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک کے سرہانے صبح کو ایک پروانہ لکھا ہوا ملنا چاہئے جس میں دوزخ سے امان اور حفاظت کی تحریر ہو۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ اس جگہ بَلْ ابتدائیہ ہے اور محض انتقال مضمون کے لئے لایا گیا ہے کلام سابق سے اعراض مقصود نہیں۔ اہل تفسیر نے بیان کیا ہے کہ کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ (اگر تم سچے ہو تو) ہم میں سے ہر شخص کے سرہانے صبح کو ایک کھلی چٹھی برآمد ہونا چاہئے جس میں لکھا ہو کہ آپ خدا کے رسول ہیں آپ کے کہنے پر عمل کرنا ضروری ہے مُنَشَّرَۃً اور مَنْشُوْرَۃٌ ہم معنی ہیں۔

كَلَّا وضوح امر کے بعد طلب معجزات سے یہ بازداشت ہے۔

بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ بَلْ ابتدائیہ ہے کلا سے کلام کا رخ پھیر دینے کے لئے نہیں ہے یعنی ان کو آخرت کا خوف نہیں اسی لئے تذکرہ (قرآن) سے انہوں نے منہ پھیر لیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بَلْ اضراب کے لئے ہو رفتار

کلام بتا رہی ہے کہ اصل کلام اس طرح تھا اگر ان کو کھلے پروانے بھی دے دیئے جائیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان کو معجزہ کی طلب اس غرض کے لئے نہیں ہے کہ معاملہ مبہم ہے (نبوت کی صداقت ان پر واضح نہیں ہے) معاملہ تو ان پر کھلا ہوا ہے اب جو معجزہ کے طلب گار ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو آخرت کا اندیشہ ہی نہیں ہے۔

تنبیہ: خوف آخرت ایک وہبی امر ہے صداقت رسول واضح ہو جانے کے بعد بھی ضروری نہیں کہ کافر مان ہی لے اور روز قیامت کا اس کو خوف ہو جائے۔

کَلَّآ یقیناً۔ یا کلمہ ردع ہے بے باکی پر ایک بازداشت ہے یا گزشتہ کلا کی تاکید ہے۔

اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ یعنی قرآن یاد داشت ہے اللہ کی ذات اور جمالی جلالی صفات اور رحمت و عذاب کا اس میں ذکر ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ جو نصیحت پذیر ہونا چاہے وہ اس کو یاد رکھے فاء سببی ہے نصیحت پذیری کو انسانی مشیت سے وابستہ کرنا بظاہر لفظ تو تخییر ہے (یعنی انسان کو نصیحت پذیر ہونے کا اختیار دیا گیا ہے) لیکن معنوی حیثیت سے یہ زجر ہے۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ یعنی وہ کسی وقت نصیحت پذیر نہیں ہو سکتے مگر اسی وقت جبکہ خدا ان کی مشیت اور نصیحت پذیری کا ارادہ کرے۔ یہ آیت صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ انسانی اعمال اللہ کی مشیت و ارادہ سے وابستہ ہیں۔

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى یعنی اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے عذاب سے خوف کیا جائے جس کی صورت صرف یہ ہے کہ اسکے احکام کی مخالفت سے اجتناب کیا جائے۔

وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ اللہ مغفرت کا اہل ہے یعنی مومن بندوں کے گناہ معاف کر دینے کا مالک ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى کے سلسلہ میں فرمایا تمہارے رب نے فرمایا کہ میں اسی قابل ہوں کہ میرا شریک قرار دینے سے اجتناب کیا جائے اور کسی کو میرا سا جھی نہ بنایا جائے اور میں اس بات کا اہل ہوں کہ جو تقویٰ رکھے اور کسی کو میرا شریک نہ بنائے میں اس کی بخشش کر دوں۔ احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

سورة القيامة

یہ سورت مکی ہے اس میں چالیس آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۝۱ قنبل اور بزی کی قرات میں لَاُقۡسِمُ آیا ہے اس وقت لام تاکید کا اور اقسم فعل قسم ہوگا۔ جمہور کی قرات لَآ اُقۡسِمُ ہے لا زائد ہے۔

وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲ اس میں بھی لَا زائد ہے صرف قسم کا مفہوم مراد ہے (نفی قسم مراد نہیں) قسم کا جواب (جس امر کو قسم کھا کر ظاہر کیا گیا ہے) محذوف ہے آئندہ کلام اس کا قرینہ ہے یعنی ضرور تمہارا حشر ہوگا ضرور تمہارا احساب ہوگا۔ ضرور ہر شخص کو اس کے اچھے برے عمل کا بدلہ ملے گا۔ ابو بکرؓ بن عیاش نے کہا لا تاکید قسم کیلئے ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ فعل قسم پر لا تاکید قسم کے لئے لانا کلام عرب میں بکثرت ہے۔ میں کہتا ہوں فعل قسم پر نفی لانے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آئندہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بالکل واضح نا قابل انکار ہے۔ قسم کھا کر مؤکد کرنے کی اس کو ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ عقل و فہم رکھنے والے واقف ہیں کہ کچھ لوگ اس دنیا میں اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والے ہیں۔ خلق خدا پر ظلم کرنے والے اور رشتہ داروں سے تعلق توڑنے والے اور ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرنے والے ہیں جن کی خرابی اور برائی ہر دانشمند کی نظر میں یقینی ہے لیکن ان تمام معصیت کوشیوں کے باوجود وہ خوش عیش اور آسودہ حال ہیں اور ان کے خلاف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بڑے شکر گزار ہر حال میں خدا کے حکم پر راضی اور مخلوق پر مہربان ہیں مگر ہر وقت دکھ اور مصیبت میں ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا جزا کے لئے کوئی اور مقام ہے ورنہ برے کی اچھے پر اور مذموم کی محمود پر ترجیح لازم آئے گی اور یہ ناممکن ہے اللہ کی شان اس سے اعلیٰ اور بالا ہے۔

اَلنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ میں لام جنسی ہے ہر نفس مراد ہے (کافر ہو یا مومن نیک ہو یا بد) فراء نے کہا ہر شخص نیک ہو یا بد قیامت کے دن اپنے کو ملامت کرے گا اگر اس نے اچھے کام کئے ہوں گے تو نفس سے کہے گا اس سے زیادہ نیکی تو نے کیوں نہیں کی اور بدی کی ہوگی تو کہے گا برے کام تو نے کیوں کئے۔ حسن نے کہا نفس لوامہ سے مراد مومن کا نفس ہے۔ مومن دنیا میں ہر طعام کلام پر اپنے نفس کو ملامت کرتا رہتا ہے لیکن کافر نہ اپنے نفس سے حساب فہمی کرتا ہے نہ اس کو برا کہتا ہے۔ مقاتل نے کہا اس سے کافر مراد ہے۔ ہر کافر قیامت کے دن اپنے نفس کو برا کہے گا کہ دنیا میں حقوق اللہ کی ادائگی میں اس نے قصور کیوں کیا۔ بعض لوگوں نے کہا اس سے مراد شخص جو کہتا ہے کہ اگر میں ایسا کر لیتا تو ایسا ہو جاتا یا نہ کرتا تو ایسا نہیں ہوتا۔ غرض وہ حکم خداوندی پر راضی نہیں رہتا جو چاہتا ہے کہتا ہے اللہ کی مشیت اور تقدیر پر خوش نہیں رہتا۔

صوفیہ کہتے ہیں نفس بدی کا حکم دیتا ہے لیکن اگر آدمی کوشش کر کے ذکر الٰہی کرے اور اللہ کی طرف سے کشش بھی اس کی مددگار ہو تو اپنے نفس کی برائیاں اس پر کھل جاتی ہیں وہ اپنے نفس کو ماسوی اللہ میں مشغول پاتا ہے اور مخلوق سے کامل طور پر تعلق منقطع کر لینے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی تو اس وقت خود اپنے کو ملامت کرتا ہے اس مرتبہ میں پہنچ کر نفس کو نفس لوامہ کہا جاتا ہے لیکن جب اس کو فنافی اللہ اور بقاء باللہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ماسوائے اللہ کے تعلق سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے اور ذکر الٰہی سے ہی اس کو اطمینان نصیب ہو جاتا ہے تو اس مرتبہ پر اس نفس کو نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ استفہام انکاری توبیخی ہے۔ اَلۡاِنۡسَان سے مراد ہے جنس انسان جس میں وہ شخص بھی داخل ہے جو منکر بعث و حشر تھا۔ یا الف لام عہدی ہے اور کوئی معین شخص مراد ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت عدی بن ربیعہ کے حق میں نازل ہوئی۔ عدی خاندان زہرہ کا حلیف اور اخنس بن شریق ثقفی کا داماد تھا۔ عدی اور اخنس ہی کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے دعا کی الٰہی مجھے میرے برے ہمسایہ سے محفوظ رکھ۔

بات یہ ہوئی کہ عدی نے خدمت ﷺ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا محمد ﷺ مجھے بتاؤ قیامت کب ہو گی۔ اس کے کیا احوال ہوں گے حضور ﷺ نے اس کو قیامت کی کیفیت بتائی تو کہنے لگا اگر میں قیامت کو دیکھ بھی لوں تب بھی تمہاری بات کی تصدیق نہیں کروں گا اور نہ تمہیں سچا جانوں گا کیا خدا ہڈیوں کو پھر اکٹھا کر دے گا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اس کی ہڈیوں کو بوسیدہ فرسودہ اور پراگندہ ہونے کے بعد ہم اکٹھا نہیں کریں گے اس سے مراد ہے دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیونکہ ہڈیاں جان کا قالب ہیں۔ دوبارہ زندگی انہی کے اجتماع پر متفرع ہو گی۔

بَلٰى کیوں نہیں۔ یعنی اللہ ہڈیوں کو ضرور اکٹھا کر کے انسان کو زندہ کرے گا۔

قٰدِرِيۡنَ فاعل مقدر سے حال ہے اور اس سے مراد ہے مزید قدرت کا اظہار یعنی ایسی چیزوں پر قدرت کا اظہار جو انکاری چیزوں سے زیادہ اہم ہیں (یعنی ہڈیاں جمع کرنے پر تو خدا کو قدرت ہے ہی پورا پورا جوڑنے پر بھی اس کو قدرت حاصل ہے) جیسے کہا جاتا ہے کہ کیا تیرا خیال ہے کہ ہم کو تجھ پر قابو حاصل نہیں ہم تجھ پر بھی قابو رکھتے ہیں اور تجھ سے زیادہ طاقت والوں پر بھی۔ آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہم ہڈیاں جمع کریں گے ان کو اکٹھا کرنے پر ہم کو قدرت ہے اور

عَلٰۤى اَنۡ نُّسَوِّىَ بَنَانَهٗ ۝۴ اس کے پور پور جوڑنے پر بھی ہم قادر ہیں۔ بَنَان سے مراد ہیں انگلیاں یا انگلیوں کے پورے انگلیوں کے پورے اور ان کی ہڈیاں تو چھوٹی اور باریک ہوتی ہیں جب ان کو ہم جوڑ دیں گے تو بڑی ہڈیوں کو جوڑنے پر قدرت تو بدرجہ اولیٰ ہم کو حاصل ہے۔ بَلۡ يُرِيۡدُ الۡاِنۡسَانُ

بَلۡ عاطفہ ہے يَحۡسَبُ پر عطف ہے (استفہام کے تحت ہے) اس کو سوالیہ بھی کہا جا سکتا ہے اور تحقیقیہ بھی کیونکہ سابق سائل یا سوال سے اعراض (اور دوسری بات کو بیان کرنے کی طرف میلان ہونا) درست ہے (یعنی یہ دوسرا انسان پہلے انسان سے غیر ہو گا تو سائل اول سے اضراب ہو جائے گا اور اگر سائل وہی ہو مگر اس کے سوال سے اعراض ہو تو سوال سے اضراب اور دوسرے مسئلے کا بیان ہو گا)

لِيَفۡجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ مجاہد حسن بصری عکرمہ اور سدی نے اس طرح تفسیری معنی بیان کئے کہ ہر شخص واقف ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی ہڈیاں جوڑنے پر قادر ہے مگر وہ آنے والے زمانہ (یعنی قیامت) کا انکار کرنا چاہتا ہے اس لئے کفر پر قائم رہتا ہے نہ کفر کو چھوڑتا ہے نہ توبہ کرتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا آدمی گناہ میں جلدی کرتا ہے اور توبہ کو ٹالتا رہتا ہے کہتا ہے میں پھر نیکی کر لوں گا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسی بداعمالی کی حالت میں اس کو موت آ جاتی ہے۔ ضحاک نے کہا اس سے مراد امیدیں باندھنا ہیں آدمی کہتا ہے میں زندہ رہوں گا اور اتنا مال منال حاصل کروں گا موت کی یاد اس کو نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباسؓ اور ابن زید نے فرمایا يَفۡجُرَ سے مراد ہے يُكَذِّبُ اور اَمَامَهٗ سے مراد ہے قیامت یعنی آگے آنے والے روز قیامت وحشر اور حساب کو وہ جھوٹا قرار دیتا ہے۔ لغت میں فجور کا معنی ہے میلان فاجر کو فاجر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حق سے وہ مڑ جاتا ہے۔

يَسۡـَٔلُ یہ سوال بطور استہزاء کے ہوتا ہے اور قیامت کو بعید از عقل قرار دیتے ہوئے وہ دریافت کرتا ہے۔

اَيَّانَ يَوۡمُ الۡقِيٰمَةِ ۝۶ کب ہو گا قیامت کا دن یعنی نہیں ہو گا۔

فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ ۝۷ بَرَقَ بفتح راء (نافع) بکسر راء (جمہور) دونوں لفظ لغت میں آتے ہیں۔ قاموس میں

ہے بَرِقَ فَرِحَ اور نَصَرَ کی طرح ہے۔ بَرْقًا اور بروقًا مصدر ہیں متحیر ہو گیا یا دہشت زدہ ہو گیا کہ دیکھ ہی نہ سکا۔ فراء اور خلیل نے کہا برق بکسر راء کا معنی ہے مُتَحَیِّر ہو گیا گھبرا گیا وہ عجیب چیزیں دیکھیں جن کی دنیا میں تکذیب کرتا تھا۔

بروق بصر اور تحیر نظر سے مراد کس وقت کی حیرگی ہے بعض کا قول ہے کہ موت کے وقت کا تحیر مراد ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ واقعہ قیامت کا بیان ہے کیونکہ اس کے بعد شمس و قمر کا اجتماع بیان کیا گیا ہے اور یہ اجتماع قیامت کے دن ہوگا لہٰذا بروق نظر سے بھی مراد وہی تحیر ہے جو قیامت کے دن ہوگا۔

وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ چاند بے نور ہو جائے گا اس کی روشنی زائل ہو جائے گی۔

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ یعنی دونوں سیاہ اور بے نور ہو جائیں گے۔ دونوں کے اجتماع کا مطلب بعض لوگوں نے بیان کیا کہ دونوں مغرب سے نکلیں گے (جہت طلوع میں اشتراک ہوگا) اور خسوف سے بطور استعارہ بے نور ہونا مراد ہے۔ عطا بن یسار نے کہا قیامت کے دن دونوں کو اکٹھا کر کے سمندر میں پھینک دیا جائے گا اور سمندر آگ بن جائے گا۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ بے نور ہو جانے میں دونوں کا اشتراک ہو جائیگا یہی دونوں کا اجتماع ہے۔ جمل میں ہے کہ بروق بصر بعض کے نزدیک موت کے وقت ہوتا ہے اسی کی تشریح خسوف قمر ہے کہ آنکھوں کی روشنی جاتی رہے گی اور اجتماع شمس و قمر کا معنی یہ ہے کہ حاسۂ نظر کے پیچھے روح بھی جاتی رہے گی یا یہ مراد کہ عالم بالا کے اس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں سے نور عقل حاصل ہوتا ہے۔ شمس مؤنث ہے جمع فعل مذکر ہے لیکن چونکہ فاعل ظاہر ہے اس لئے فعل کو مذکر لایا گیا یا یہ وجہ ہے کہ قمر مذکر ہے قمر کا عطف شمس پر ہے معطوف کی حالت کا لحاظ رکھا گیا اور معطوف علیہ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اِذَا ظرف فیہ ہے بَرِقَ اور خَسَفَ اور جُمِعَ تینوں افعال ایک وقت خاص پر دلالت کر رہے ہیں اور یہ وقت آئندہ فعل (یعنی یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ) کا زمانہ وقوع ہے۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝

الانسان سے مراد ہے کافر۔ اَیْنَ الْمَفَرُّ یَقُوْلُ کا مفعول یعنی کافر کا مقولہ ہے۔

كَلَّا یہ طلب مفر سے بازداشت ہے جس کا بیان آگے آتا ہے۔

لَا وَزَرَ ۝ کوئی پناہ گاہ اور بچاؤ کی جگہ نہ ہوگی۔ اس سے مراد ہے پہاڑ کیونکہ (اس زمانے میں) لوگ پہاڑوں پر (دشمنوں سے) پناہ لیتے تھے وَزَر وِزْرٌ سے بنا ہے وِزْرٌ کا معنی ہے بوجھ۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ۨالْمُسْتَقَرُّ ۝ مُسْتَقَرُّ جاء رجوع لوٹنے کی جگہ۔ یعنی اللہ کی مشیت اور حکم کی طرف ان کو لوٹنا ہوگا۔ اللہ کا حکم ہی ان کی قرار گاہ ہوگا۔

یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مَا قَدَّمَ سے مراد ہیں وہ اچھے برے عمل جو مرنے سے پہلے انسان کرتا ہے اور مَا اَخَّرَ سے مراد ہیں وہ اچھے برے طریقے جن کی بنیاد ڈال کر دنیا میں چھوڑ آتا ہے قتادہ نے کہا آگے کرنے سے مراد ہے اللہ کی اطاعت کرنا اور پیچھے ڈال دینے سے مراد ہے اطاعت کو ضائع کر دینا۔ مجاہد نے کہا مقدم و موخر عمل سے مراد ہے اول عمل اور اخیر عمل۔ زید بن اسلم نے کہا اول سے مراد وہ مال ہے جو (راہ خدا میں) اپنے فائدے کے لئے انسان خرچ کر دیتا ہے اور دوسرے سے مراد ہے وہ مال جو وارثوں کے لئے پیچھے چھوڑ آتا ہے بعض نے کہا کہ مَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی امور کو آخرت کے کاموں پر ترجیح دی ہو یا اس کے خلاف کیا ہو دونوں کی اطلاع قیامت کے دن اس کو دے دی جائے گی۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ یعنی دنیوی زندگی کے اعمال فقط یاد دلانے سے ہی اس کو دکھ جائیں گے وہ ضرور دیکھ لے گا اطلاع دینے کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔ بَصِیْرَةٌ میں تاء مبالغہ کی ہے (خوب دیکھنے والا) یہی مفہوم ہے آیت کَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ حَسِیْبًا کا ابوالعالیہ اور عطا کا بھی قول ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بَصِیْرَةٌ کا موصوف محذوف ہو (اور اس میں تاء مبالغہ کی نہ ہو) یعنی انسان اپنے نفس کی حالت دیکھنے

کے لئے خود چشم نگراں ہوگا۔

یا بَصِیْرَۃٌ کا معنی ہے ثبوت اور حجت یعنی انسان خود اپنے نفس کے خلاف شاہد اور ثبوت ہوگا بصیرت بمعنی حجت آیت قَدْ جَآءَ کُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ میں بھی آیا ہے یہ بھی احتمال ہے کہ بصیرہ سے مراد ہو وہ موکل فرشتہ جو ثبوت میں پیش ہوگا۔

مقاتل اور کلبی نے کہا معنی اس طرح ہے کہ انسان کے نفس پر کچھ نگراں ہیں جو نگرانی کرتے رہتے ہیں اور قیامت کے دن اس کے اعمال کی شہادت دیں گے یہ نگراں ہیں آنکھ کان اور ہاتھ پاؤں اس وقت بصیرہ میں تاء قیاسی ہوگی (مبالغہ کی نہ ہوگی) کیونکہ بصیرہ سے مراد ہیں اعضائے انسانی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حرف جر محذوف ہو یعنی انسان اپنے جوارح اور اعضاء کے ذریعہ سے اپنے نفس کا شاہد ہے جیسے آیت اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَکُمْ میں حرف جر محذوف ہے اصل کلام تھا لِاَوْلَادِکُمْ۔

وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾ مَعَاذِيْرَۃ معذار کی جمع ہے یعنی لوگ پردہ کو معذار کہتے ہیں ضحاک اور سدی نے اسی لئے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ انسان خواہ اپنے اعمال کو چھپانے کے لئے پردے چھوڑ کر اور دروازے بند کر کے کوئی کام کرے سود مند نہ ہوگا اس کا نفس خود اس کے خلاف شہادت دے گا جو فرشتہ موکل ہے وہ بھی شاہد ہوگا اور اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کا حاضر ناظر ہی ہے۔

مجاہد قتادہ اور سعید بن جبیر نے اس طرح مطلب بیان کیا کہ انسان کے اعضاء اور ملائکہ اس کے اعمال پر شہادت دیں گے خواہ انسان کچھ ہی عذر پیش کرے اور کتنا ہی جھگڑے لیکن کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ دوسری آیت لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُھُمْ کا بھی یہی مطلب ہے۔

فراء نے کہا انسان خواہ معذرت پیش کرے مگر اس کے نفس کی طرف سے خود اس کو جھوٹا قرار دینے والی چیزیں ہوں گے۔ آیت وَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ میں القاء قول کا بھی یہی معنی ہے۔ ان اقوال کی بناء پر مَعَاذِیر جو معذار کی جمع ہے معذرت کے معنی میں ہوگا۔ مَعَاذِیر کو اگر معذرت کی جمع کہا جائے گا تو خلاف قیاس ہوگا جیسے مناکیر منکر کی جمع غیر قیاسی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مَعَاذِیر اور مناکیر اسم جمع ہیں معذرۃ کی جمع مَعَاذِیر ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب جبرئیل وحی لے کر آتے تھے تو رسول اللہ ﷺ آیات وحی کو یاد رکھنے کے لئے (جبرئیل کی قرات کے وقت میں ہی) اپنی زبان اور لبوں کو (چپکے چپکے) حرکت دیتے تھے اور یہ عمل حضور پر سخت گزرتا تھا جس کے آثار نمایاں ہوتے تھے اس پر اللہ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔ (صحیحین)

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ یعنی قرآن کو جلدی جلدی یاد کر لینے کے لئے تکمیل وحی سے پہلے تم اپنی زبان نہ ہلایا کرو۔ بقول ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ نازل شدہ آیات کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے اس لئے (دوران نزول میں ہی چپکے چپکے) لبوں کو حرکت دیتے رہتے تھے۔ (صحیحین)

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ قرآن کو تمہارے سینہ میں جمع کر دینا تو ہمارے ذمہ ہے۔

وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ اور قرآن کو تمہاری زبان سے رواں کرانا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ جب ہم قرآن پڑھ چکیں یعنی جبرئیل پڑھ چکیں چونکہ اللہ کے حکم سے جبرئیل پڑھتے تھے اور وہ قاصد تھے اس لئے مجازاً جبرئیل کی قرات کو اپنی قرات قرار دیا۔

فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ تو ہماری قرات کے بعد تم پڑھو اس کا اتباع کرو تاکہ تمہارے ذہن میں جم جائے۔

شاگرد کے لئے بھی لازم ہے کہ شیخ کی قرات کے بعد خود پڑھے ساتھ ساتھ نہ پڑھتا جائے تاکہ قرات اور یادداشت میں دشواری، پراگندگی اور ٹکراؤ نہ ہو۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ قرآن کا اظہار اس کے بعد ہمارے ذمہ ہے یعنی اگر معانی قرآن میں کچھ اشکال ہو

تو اس کی مراد کو ظاہر کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بعض آیات محکم ہیں (واضح المراد) لیکن آیت مذکورہ کی روشنی میں کسی آیت کا رسول اللہ ﷺ کے لئے متشابہ ہونا اور مراد کی اطلاع آپ کو نہ ہونا درست نہیں ورنہ کلام بے سود ہوگا اور آیت مندرجہ بالا میں جو وعدہ کیا گیا ہے اس کی بھی مخالفت لازم آئے گی۔ آیت لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ کی تفسیر میں ہم اس کی توضیح کر چکے ہیں۔

آیت ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ میں لفظ ثُمَّ۔ بتا رہا ہے کہ خطاب کے وقت اگر مطلب واضح نہ کیا جائے اور کچھ مدت کے بعد مراد واضح کر دی جائے تو جائز ہے لیکن وقت ضرورت سے تاخیر جائز نہیں۔ جملہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ معترضہ ہے جیسے کسی سے بات کرتے وقت اگر مخاطب بھی بولنے لگے تو متکلم اس سے کہتا ہے ذرا خاموش رہو میری بات نہ کاٹو پوری بات سنو پھر تم کو بولنے کا حق ہے یہ درمیانی کلام بطور ہدایت بول کر متکلم پھر اصل مدعا پر کلام کرنا شروع کر دیتا ہے۔

كَلَّا اسی طرح درمیانی جملہ بطور ہدایت بول کر اللہ نے پھر اصل کلام کی طرف رجوع فرمایا۔ کلا سے بازداشت کی گئی خواہ انکار حشر پر یا فجور پر یا بے کار عذر پیش کرنے پر۔

بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ تُحِبُّوْنَ میں خطاب اسی انسان کو ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور چونکہ اس سے مراد جنس انسان تھی اس لئے خطاب بصیغہ جمع کیا گیا۔ اَلْعَاجِلَةَ سے مراد ہے دنیا اور خواہشات دنیا۔ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ یُحِبُّوْنَ اور یَذَرُوْنَ بصیغہ غائب بھی قرات میں آیا ہے اور ضمیر انسان مذکور کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اس بات سے تو ناواقف نہیں کہ اللہ دوبارہ حشر و تخلیق پر قادر ہے اور قیامت کے دن کوئی معذرت نفع بخش نہ ہوگی بات یہ ہے کہ دنیا کی محبت کی وجہ سے خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ہوا و ہوس نے ان کی آنکھوں کو اندھا اور دلوں کو نابینا کر دیا ہے اس لئے وہ آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہیں اس کے بعد احوال آخرت کو بیان فرمایا۔

وُجُوْهٌ یہ مبتداء ہے یا تو مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا یعنی اہل قرب کے چہرے یا صفت محذوف ہے یعنی بہت چہرے۔

(مطلب یہ کہ وُجُوْهٌ نکرہ ہے جب تک اس میں کوئی تخصیص نہ ہو مبتدا نہیں ہو سکتا اس لئے یا مضاف الیہ کو محذوف مانا جائے گا یا صفت مخصص کو)

یا یوں کہا جائے کہ وُجُوْهٌ سے وُجُوْهٌ مِنْهُمْ مراد ہے یعنی انسانوں میں کچھ چہرے ہوں گے (اس وقت وجوہ خبر ہوگا اور مِنْهُمْ مبتدا یا مِنْهُمْ ظرف اور وجوہ اس کا فاعل)

یَّوْمَىٕذٍ اس روز یعنی بروقت بصر کے روز یا آخرت کے روز۔

نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ تر و تازہ خوبصورت شگفتہ

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ اِلٰى رَبِّهَا کا تعلق نَاظِرَةٌ سے ہے یعنی آنکھوں سے اپنے رب کی طرف دیکھیں گے لیکن بغیر کسی جہت اور کیفیت اور بعد مسافت کے یہ جائز نہیں کہ غائب کو حاضر پر قیاس کیا جائے (اور کہا جائے کہ دیکھنا تو بغیر جہت اور سمت کے ناممکن ہے پھر آنکھ میں اور اس چیز میں جس کو دیکھا جا رہا ہو ایک محدود فاصلہ بھی ہونا چاہیئے نہ بہت قرب ہو نہ انتہائی دوری۔ پھر جس چیز کو دیکھا جائے اس کی کوئی خاص کیفیت بھی ہو ان شرائط کے بغیر دیکھنا ناممکن ہے اور خدا کی کوئی جہت نہیں وہ مکانی نہیں وہ ہر کیفیت اور مکانی قرب و بعد سے پاک ہے اس کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ حاضر پر غائب کا قیاس ہے ایسا نہ کرنا چاہیئے یہ شرطیں اس وقت دیکھنے کی ہیں اور غیر اللہ کو دیکھنے کی ہیں خدا کو دیکھنا اور وہ بھی آخرت میں دیکھنا اپنی نوعیت جدا رکھتا ہے)

آجری اور بیہقی نے کتاب الرویۃ میں الگ الگ طریق سند سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ نَاضِرَةٌ کا معنی ہے خوبصورت اور اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کا معنی ہے اپنے خالق کی طرف نظر کرنے والے حسنؒ بصری وغیرہ سے یہی تشریح منقول ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ادنیٰ درجہ کا جنتی وہ ہوگا جو اپنے باغوں کو بیویوں کو سامان آسائش کو خدمت گاروں کو اور مسہریوں کو ایک ہزار سال کی راہ کے بقدر دیکھا کرے گا اور اللہ کے ہاں سب سے معزز وہ جنتی ہوگا جو صبح شام اللہ کا دیدار کرے گا پھر حضور ﷺ نے آیت وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ تلاوت فرمائی۔ احمد، ترندی، دار قطنی، لالکائی، آجری وغیرہ۔ آجری کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ ادنیٰ جنتی وہ ہوگا جو اپنے ملک میں دو ہزار برس کی راہ کے بقدر (مسافت جنت) دیکھے گا اور آخر ترین حصہ کو بھی اسی طرح دیکھے گا جیسے قریب ترین حصہ کو دیکھے گا۔

باب رویت میں حضرت انس کی روایت کردہ حدیث بھی آئی ہے جس کو بزار طبرانی بیہقی اور ابو یعلی نے پورا پورا نقل کیا ہے۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ جمعہ کے روز جنت میں دیدار الٰہی دیکھنے کی مزید نعمت حاصل ہوگی اسی لئے یوم جمعہ کو یوم مزید کہا جائے گا۔ بزار و اصفہانی وغیرہ۔

آجری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جنتی ہر جمعہ کو اپنے رب کو دیکھیں گے۔ حسن بصری سے مرسلا مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی ہر جمعہ کو اپنے رب کی طرف دیکھیں گے۔ اس حدیث کی تخریج یحییٰ بن سلام نے کی ہے۔ حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے فرمایا میں جس کی دو پیاری آنکھیں لے لوں گا اس کا بدلہ (یہ ہوگا کہ) وہ میرے گھر (جنت) میں اترے گا اور میرے چہرے کی طرف دیکھے گا۔ طبرانی وغیرہ۔

حضرت جریر بجلیؓ نے فرمایا ہم خدمت گرامی میں بیٹھے ہوئے تھے حضور نے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا بلا شبہ تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جیسے چودھویں کے اس چاند کو دیکھ رہے ہو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی جہاں تک ہو سکے طلوع و غروب سے پہلے کی نمازوں کی پابندی کرو (ہم نے اس حدیث کے لفظ لا تغلبوا کا مرادی ترجمہ پابندی سے کیا ہے لفظی ترجمہ ہے تم مغلوب نہ ہو)۔ صحیحین

لالکائی نے حضرت حذیفہؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث منقول ہے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے الٰہی میں مرنے کے بعد خنک زندگی اور تیرے دیدار کی لذت اور تیری ملاقات کے شوق کی تجھ سے درخواست کرتا ہوں جس میں نہ ضرر رساں دکھ ہو نہ گمراہ کن فتنہ۔ لالکائی۔

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت میں ہے تم مرنے سے پہلے اپنے رب کو ہرگز نہیں دیکھو گے دار قطنی۔ لالکائی نے یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ اللہ نے (موسیٰ سے) کہا موسیٰ مجھے کوئی زندہ مرے بغیر نہیں دیکھے گا اور نہ خشک اور نہ کوئی تر۔ مجھے صرف جنتی دیکھیں گے (جنت میں) ان کی آنکھیں مردہ نہیں ہوں گی اور نہ ان کے جسم کہنہ ہوں گے۔

آیت فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا کی تشریح میں حضرت علیؓ نے فرمایا جو شخص اپنے خالق کی طرف دیکھنا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو خالق کا شریک نہ بنائے۔ بیہقی۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت کہ تفسیر اور آیت لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ کی تشریح اور آیت لَدَيْنَا مَزِيْدٌ کی توضیح اور ان کے علاوہ بعض دوسری آیات کی تعبیر رویۃ اللہ سے کرنا نقلا ثابت ہے رسول اللہ ﷺ سے بھی اور صحابہؓ سے بھی اور تابعین سے بھی اس تفسیر کی اتنی احادیث مروی ہیں جو اصحاب حدیث کے نزدیک حد تواتر کو پہنچتی ہیں۔ سیوطی وغیرہ نے اسی طرح بیان کیا ہے اس جگہ ہم نے جس قدر ذکر کر دیا وہ کافی ہے اس قسم کی جو آیت جہاں آئے گی ہم اس کی تفسیر میں اس کے متعلقات پر انشاء اللہ روشنی ڈالیں گے۔

اللہ کی رویت پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ معتزلہ اور خوارج وغیرہ رویت الٰہی کو ناممکن قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس کو دیکھا جائے وہ جسم ہو کثیف ہو (یعنی شفاف نہ ہو) اور اس پر پردہ نہ ہو اور دیکھنے والی آنکھ سے

اس کی مسافت متوسط ہو نہ زیادہ دور ہو نہ بہت قریب۔ (ان کا یہ بھی خیال ہے کہ) دیکھنے والے کی آنکھ سے شعاع کا نکل کر مرئی تک پہنچنا چاہتا ہے کہ مرئی کسی جہت میں ہو پس اگر خدا کو مرئی کہا جائیگا تو اس کا کسی جہت میں ہونا لازم ہوگا۔ یہ تو امتناع رویت پر ان کی عقلی دلیل تھی) نقلی دلیل میں وہ آیت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کو پیش کرتے ہیں (اللہ کو نگاہیں نہیں پا سکتیں) رہی آیت مندرجہ بالا تو اس کے سلسلے میں وہ ناظرۃ کو منتظرہ کے معنی میں لیتے ہیں یعنی کچھ لوگ اس روز اللہ کے حکم اور انعام کے منتظر ہوں گے۔ مگر یہ تاویل عربی لغت کے خلاف ہے انتظار کے بعد (مفعول پر) لام آتا ہے اِلیٰ نہیں آتا اور آنکھ سے نظر کے بعد (مفعول پر) اِلیٰ آتا ہے (اور آیت میں اِلیٰ رَبِّھَا ہے لِرَبِّھَا نہیں ہے)

اہل سنت کہتے ہیں کہ دیکھنے کے لئے مرئی کا موجود ہونا ہی کافی ہے اور دیکھنے والے کا وجود حیوۃ علم اور نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے (اگر مرئی موجود ہو اور دیکھنے والے میں یہ شرائط بھی موجود ہوں تو رؤیت ہو جاتی ہے) مرئی کی رؤیت کے لئے ان باتوں کے علاوہ دوسری شرطوں کا پایا جانا اس وقت ضروری ہے جب وہ چیز مادی ہو (اور خدا مادی نہیں) حاضر پر غائب کو قیاس کرنا درست نہیں۔ دیکھو اللہ اپنی ساری مخلوق کو دیکھتا ہے مخلوق مادی ہو یا غیر مادی نہ وہاں کوئی مسافت اور فاصلہ ہوتا ہے نہ شعاع آنکھ سے نکلتی ہے وہ بہر حال سمیع و بصیر ہے پھر رسول اللہ کی صراحت کے بعد رویت الٰہی کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ رہی آیت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ تو اس میں ادراک کی نفی کی گئی ہے اور کسی چیز کو ادراک کرنے کا تقاضا ہے کہ اس چیز کو گھیر لیا جائے اور اس کی حقیقت کا علم ہو جائے (گویا لاتدرک کا معنی ہے لاتحیط) اور خدا کو کسی نظر کا احاطہ کر لینا ناممکن ہی ہے ہاں علم حضوری بالکنہ یعنی معلوم کی حقیقت کا عالم کے سامنے حاضر ہو جانا محال نہیں ہے مگر اللہ احاطہ نظری سے برتر ہے واللہ اعلم۔

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنتی اللہ کو ہمیشہ پیہم دیکھیں گے کبھی رویت منقطع نہ ہوگی جیسے چہروں کی شگفتگی اور تازگی کبھی ختم نہ ہوگی کیونکہ جملہ اسمیہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے البتہ احادیث میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کو اللہ کا دیدار ہر جمعہ میں ہوگا اور بعض کو ہر جمعہ یعنی ہر ہفتہ میں دوبار ہوگا۔ ابن ابی الدینا نے حضرت ابو امامہ کی روایت اسی طرح نقل کی ہے اور بعض لوگوں کو عید کی مقدار کے برابر دیدار ہوگا یعنی سال میں دوبار۔ یحییٰ بن سلام نے ابو بکر بن عبد اللہ المزنی کی روایت اسی طرح بیان کی ہے۔ اور بعض کو روزانہ دوبار صبح اور شام دیدار ہوگا۔ ابن عمرؓ کی روایت میں ایسا ہی آیا ہے۔ جملہ اسمیہ مفید دوام ضرور ہے مگر اس سے غیر معین جماعت کے لئے دوام رویت ثابت ہوتا ہے ہر شخص کے لئے دوام رویت ثابت نہیں ہوتا لامحالہ مومنوں میں کسی خاص جماعت کی تخصیص کرنی ہوگی جس کو ہمیشہ نعمت دیدار حاصل رہے گی یعنی مقربین کی جماعت پس (وجوہ میں تنوین محذوف مضاف الیہ کے قائم مقام ہوگی اور) اصل کلام یوں ہوگا کہ مقربوں کے چہرے اس روز شاداب و شگفتہ اور اپنے رب کی طرف ہمیشہ دیکھتے رہیں گے۔

ابو نعیمؒ نے ابو یزید بسطامیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کے کچھ خاص بندے ایسے ہیں کہ اگر جنت میں اللہ ان سے اپنے دیدار کو آڑ میں کر لے گا تو وہ اسی طرح فریاد کریں گے جس طرح دوزخی دوزخ سے نکلنے کے لئے فریاد کریں گے۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ رویت الٰہی سے فیضیاب ہونے والوں کے نامحدود اور ان گنت درجات ہوں گے اور احادیث میں ان کے مراتب کو پورا پورا بیان کرنا مقصود نہیں ہے حدیث میں جو آیا ہے اکرمھم علی اللہ من ینظر الی وجھہ غدوۃ و عشیۃ (اللہ کے ہاں سب سے معززہ شخص ہوگا جس کو صبح و شام دیدار الٰہی ہوگا) اس سے مراد یہ ہے کہ صبح شام نعمت دیدار سے سرفراز ہونے والا معزز ترین گروہ میں شامل ہوگا یہ مقصد نہیں کہ سب سے زیادہ باعزت ہوگا اس سے زیادہ کسی کی عزت ہی نہیں ہوگی (یعنی اکرمھم میں تفضیل نفسی ہے تفضیل اضافی نہیں کہ سب سے زیادہ معزز ہونے کا مفہوم پیدا ہو)

نعمت رویت سے ہمیشہ اور ہر وقت فیضیاب ہونے والے انبیاء ہوں گے یا پھر وہ اہل قربت ہوں گے جو ذات مقدس سے باوجودیکہ وہ تمام کیفیات اور اعتبارات سے پاک ہے۔ وصل رکھتے ہیں یہ وہی لوگ ہوں گے جن کو ذات کی تجلی دوامی طور پر حاصل تھی۔ بجلی کے جھپکنے کی طرح ان پر جلوہ ذات پر تو افگن نہیں تھا (کہ ایک آن میں چمک پڑی اور جاتی رہی) مگر قابلیت نہ

ہونے کی وجہ سے اس دنیا میں ان کو دیدار میسر نہ تھا لامحالہ آخرت میں میسر ہوگا جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ابو نعیم نے حلیہ میں حدیث نقل کی ہے۔ مانع زائل ہو گیا تو آخرت میں دوامی دیدار حاصل ہونا ہی چاہئے ورنہ پیچھے کو لوٹنا اور ترقی کی بجائے تنزل ہونا لازم آئے گا۔ (دنیا میں جب دوامی جلوہ ذات حاصل تھا اور دنیوی زندگی رویت سے مانع تھی اس لئے رویت حاصل نہ تھی اور آخرت میں دنیوی زندگی نہ ہوگی مانع زائل ہو چکا ہوگا اس لئے دوامی رویت حاصل ہونا چاہئے دوامی جلوہ ذات سے ترقی کر کے دوامی رؤیت تک پہنچنا چاہئے اگر دوامی رویت حاصل نہ ہوگی بلکہ کبھی کبھی حاصل ہوگی تو یہ ترقی نہ ہوئی تنزل ہوا جلوہ ذات کی دوامی پرتو افگنی جو دنیا میں حاصل تھی وہ بھی آخرت میں میسر نہ آئی اور دیدار کی نعمت بھی ہر وقت نصیب نہ ہوئی) ہاں جس شخص کو دنیا میں دوامی تجلی ذات اور بارگاہ قدس میں ہمہ وقت حضور میسر نہ تھا (کبھی کبھی نصیب ہو جاتا تھا) تو حسب مرتبہ کبھی کبھی رویت بھی نصیب ہوگی مثلاً اگر تجلی ذات کی پرتو افگنی برتی تھی تو آخرت میں اس کو دیدار بھی روزانہ دو مرتبہ یا چند مرتبہ حاصل ہوگا اور جس کو حصہ تجلی اس سے بھی کم ملا تھا اس کو ہر جمعہ میں یا ہر سال میں ایک بار دیدار نصیب ہوگا۔

فائدہ: حضرت یعقوبؑ کے دل میں حضرت یوسفؑ کی محبت رچی ہوئی تھی باوجود یہ کہ اہل قرب کے دل غیر اللہ کی محبت سے خالی ہوتے ہیں اس کا کیا راز تھا۔ شیخ سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات جلد سوئم کے مکتوبات ۱۰۰ میں اس کی تنقیح فرمائی ہے۔ فرمایا ہے کہ

ہر شخص کے تعین (تشخص) کا مبداء اللہ کے ناموں میں سے کوئی نام ہوتا ہے (کسی کا مبداء اسم رحمٰن ہے کسی کا اسم صمد کسی کا قہار۔ غرض وجود مطلق نے کسی وصف خاص کے ساتھ جب ظہور کیا اور تعینی جامہ پہنا تو مخلوق ظاہر ہوئی پس ہر شخص کا تعین اور تشخص اللہ کے کسی نہ کسی اسم وصفی کا مظہر ہے) اب اس شخص کی جنت اسی اسم وصفی کے ظہور کا نام ہے جو اس شخص کے تعین کا مبداء ہے اور اس اسم وصفی کا ظہور اور جلوہ پاشی درختوں، دریاؤں اعلیٰ مکانوں اور حور وغلماں کی شکل میں ہوتی ہے اس انکشاف حقیقت کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ جنت پاکیزہ مٹی والی اور شیریں ہوگی یعنی اس کے دریا شیریں ہوں گے اور اس کے پودے یہی (کلمات) ہیں یعنی سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اس کے بعد مجدد صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ وہ درخت اور دریا (جو اسم وصفی کے مظہر ہیں اور جن کا نام جنت ہے) کبھی بلور کی طرح شفاف ہو جائیں گے اور ان کے ذریعے سے بے کیف رویت الٰہی کی نعمت حاصل ہوگی پھر کچھ وقت کے بعد ان کی شفافیت جاتی رہے گی اور اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئیں گے اور خود ان سے مومن دل بہلائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا (کبھی جنت بذات خود مومن کے دل کا بہلاوا ہوگی اور کبھی رویت خداوندی کا آئینہ)

اس سے آگے مجدد صاحب نے فرمایا جس طرح دنیا میں صوفی کو کبھی اسماء وصفات کے پردوں سے (چھن کر) تجلی ذات حاصل ہوتی ہے اور کبھی یہ پردے بھی اٹھ جاتے ہیں اور تڑپتی بجلی کی طرح جلوہ ذات ضوء افگن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آخرت میں دیدار الٰہی ہوگا، ہر جنتی کا ذات خداوندی سے تعلق اس اسم وصفی کے اعتبار سے ہوگا جو جنت کا مبداء ہے اور جس کا ظہور جنت کی صورت میں ہوگا (کبھی جنت کی نعمتیں دیدار الٰہی کا آئینہ ہوں گی اور کبھی لوٹ کر اپنی اصلی حالت پر آجائیں گی) رویت الٰہی کی جنت میں جلوہ پاشی اس تڑپتی بجلی کی طرح ہوگی جو تھوڑی دیر کے لئے چمکتی ہے اور پھر چھپ جاتی ہے لیکن اس کی نورانیت اور برکت جنت کی نعمتوں اور درختوں کی شکل میں باقی رہے گی۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ نے جو رویت کی یہ تشریح کی ہے وہ عام مومنوں کے لئے ہوگی خواص کے لئے تو دنیا میں تجلی ذات کی ضوء افگنی دوامی ہوتی ہے آخرت میں دیدار بھی دوامی ہوگا۔

ایک شبہ: اہل تفسیر نے بیان کیا ہے کہ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں الیٰ کی تقدیم مفید حصر ہے اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جب اللہ چاہے گا تو جنتی دیدار الٰہی میں غرق ہو جائیں گے دیدار کے وقت کسی اور طرف نہیں دیکھیں گے اس کی تائید حضرت جابرؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت والے اپنی راحتوں میں ہوں گے کہ اچانک اوپر سے

ایک نور چمکے گا جنتی سر اٹھا کر دیکھیں گے تو پروردگار ان کے اوپر سے جلوہ افگن ہو گا اور فرمائے گا اے جنت والو تم پر سلام ہو آیت سلام قولا من رب الرحیم کا یہی مفہوم ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر اللہ ان کی طرف اور وہ اللہ کی طرف دیکھیں گے جب تک خدا کی طرف دیکھیں گے کسی دوسری طرف توجہ نہیں کریں گے یہاں تک کہ اللہ ان سے حجاب فرمالے گا۔ مگر اس کی نورانیت اور برکت ان کے مکانوں میں باقی رہے گی۔ ابن ماجہ ، ابن ابی الدنیا، دار قطنی ،اب سوال یہ ہے کہ اگر بعض لوگوں کو دوامی دیدار ہو گا تو حصر کا کیا معنی اور کسی نعمت کی طرف دیدار کے وقت توجہ نہ کرنے کی کیا توجیہ ممکن ہے۔

جواب : جار مجرور (الی ربہا) کی تقدیم حصر کے لئے قابل تسلیم نہیں بلکہ فواصل آیات کی رعایت سے جار مجرور کو مقدم کیا گیا ہے ممکن ہے دوامی دیدار سے فیضیاب ہونے والوں کے لئے جنت کی کسی دوسری نعمت کی طرف توجہ رویت دیدار میں مخل نہ ہو بلکہ جنت کی نعمتیں ان کے لئے آئینہ دیدار کا کام دینے والی ہوں اور اس طرح ان کو ہمیشہ ہمیشہ دیدار کی نعمت حاصل ہوتی رہے۔ ایسے لوگوں کو دو رویتیں نصیب ہوں گی۔ رویت حاجب اور جنت کی نعمتوں کے ذریعہ سے رویت اور ان دونوں رویتوں کے حاصل ہونے کے دوران میں وہ اصل نعمتوں کو بھی دیکھتے ہوں گے اور ان کے لطف اندوز بھی ہوتے ہوں گے ایک حالت دوسری حالت سے ان کو غافل نہیں بنائے گی ،رہے دوسرے عام جنتی ان کو جنت کی نعمتوں کی طرف توجہ رویت دیدار سے روک دے گی اور رویت دیدار کسی دوسری نعمت جنت کی طرف متوجہ نہیں ہونے دے گی کیونکہ ان میں استعداد کی کمی ہو گی۔

یا جواب اس طرح دیا جائے گا

آیت میں رویت کا حصر صرف اسی شخص کے لئے ہے جس کو نعمت دیدار میسر ہو اور حدیث جابرؓ میں عام جنتیوں کے حال کا بیان ہے۔

شبہ : ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نعمتوں کی طرف توجہ رویت میں مخل نہ ہو گی لیکن نعمت دیدار کے میسر ہونے کی موجودگی میں کسی دوسری نعمت کی طرف توجہ کا جواز ہی کس طرح ہو سکتا ہے۔

ازالہ : جنت کی نعمتیں اللہ اسماء وصفی کی مظاہر ہیں (آئینہ کی طرح) رویت دیدار کے ہوتے ہوئے نعمتوں کی طرف التفات ناممکن نہیں۔

فائدہ : بعض ائمہ کے کلام میں آیا ہے کہ رویت الٰہیہ صرف مومن انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے فرشتوں کو دیدار الٰہی نہیں ہو گا لیکن بیہقی نے اس کے خلاف صراحت کی ہے اور اپنے قول کے ثبوت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت کردہ حدیث پیش کی ہے کہ اللہ نے اپنی عبادت کے لئے مختلف ملائکہ کو (مختلف شکل میں عبادتوں میں منہمک) پیدا کیا ہے کچھ فرشتے اپنی پیدائش کے دن سے صف بستہ قیام میں ہیں اور قیامت تک قیام میں رہیں گے جب قیامت کا دن ہو گا تو پروردگار ان پر جلوہ افگن ہو گا اور فرشتے اس کے مبارک چہرے کی طرف دیکھیں گے اور عرض کریں گے ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا اسی قسم کی حدیث دوسری سند سے عدی بن ارطاف کی وساطت سے ایک اور صحابی سے منقول ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہر شخص کو نعمت دیدار اس کے مبدء تعین کے موافق حاصل ہو گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مومنوں پر ملائکہ کو فضیلت حاصل ہے کیونکہ تشخصات انسانی کے مبادی پر تشخصات ملائکہ کے مبادی کو فضیلت ہے حضرت مجدد صاحب کی یہی تحقیق ہے۔ لیکن ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ خاص خاص انسانوں کو نعمت دیدار دوامی طور پر بغیر کسی انقطاع کے حاصل ہوتی رہے گی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواص ملائکہ پر خواص بشر کو فضیلت حاصل ہے۔ کتب عقائد میں اس کی تفصیل کر دی گئی ہے۔

وَوُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ﴿۲۴﴾ اور کافروں کے چہرے یا بعض چہرے (اول صورت میں تنوین مضاف الیہ

کے عوض ہے اور دوسری صورت میں تنوین تکثیر ہے) سخت بدرونق بگڑے ہوئے ہوں گے۔

تَظُنُّ یعنی مذکورہ چہروں والے یقین کرلیں گے۔

اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ فَاقِرَۃ ایسی سخت مصیبت جو پشت کے مہروں پر ضرب لگائے ابن زید کے نزدیک اس سے مراد ہے جہنم میں داخلہ اور کلبی کے نزدیک دیدار سے محرومی۔

كَلَّآ یہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے سے باز داشت ہے گویا یوں کہا گیا۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے سے باز رہو موت کو یاد کرو موت کے وقت دنیا ختم ہو جائے گی اور غیر فانی آخرت سامنے آئے گی۔

اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ جب ہنسلی کی ہڈی تک سانس پہنچ جائے گی سیاق کلام بتارہا ہے کہ بطور کنایہ یہ بَلَغَتِ کا فاعل محذوف نفس ہے۔

اِذَا شرطیہ ہے اور اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ٍالْمَسَاقُ جزاء ہے یا ظرفیہ ہے (یعنی ہنسلی تک سانس پہنچنے کے وقت) اور ظرف کا تعلق ایک محذوف فعل سے ہے جس پر لفظ مساق دلالت کررہا ہے یعنی تم کو رب کی طرف ہنکا کر اس وقت لے جایا جائے گا جب سانس گلے میں اٹکی ہو گی۔

اَلتَّرَاقِيَ (الترقوۃ کی جمع ہے) گلے کے زیریں حصے میں ایک گڑھا ہوتا ہے اس کے دائیں بائیں (دو ٹیڑھی) ہڈیاں ہوتی ہیں انہی کو تراقی کہا جاتا ہے ہنسلی تک سانس پہنچنے سے مراد ہوتی ہے موت کے قریب پہنچ جانا۔

وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ قتادہ نے کہا مراد یہ ہے کہ حاضرین یا مردہ کہتا ہے کہ اس پر کوئی افسوں دم کردے کہ یہ موت سے بچ جائے۔ سلیمان تیمی اور مقاتل بن سلیمان نے کہا موت کے فرشتے کہتے ہیں کہ اس کی روح کو لے کر کون چڑھے گا۔ رحمت کے فرشتے یا عذاب کے فرشتے۔ راقی (اسم فاعل) رقی سے مشتق ہے۔

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ اور مرنے والا یقین کرلیتا ہے کہ اب دنیا اور مرغوبات دنیا کا فراق ہے یعنی موت ان سب کو چھوڑ دینے کا سبب ہے۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ یعنی ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ رہی ہو گی اور آدمی میں ان کو ہلانے کی طاقت نہیں ہو گی۔ شعبی اور حسن بصری وغیرہ نے یہی تفسیر کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (ساق سے مراد ہے امر دنیا اور آخرت یعنی) امر دنیا امر آخرت کے ساتھ لپٹا ہو گا دنیا کا آخری اور آخرت کا اول ترین دن ہو گا اور مرنے والے پر دوہری شدت ہو گی دنیا کو چھوڑنے کی اور آخرت کے سامنے آنے کی۔

ضحاک نے کہا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس کے جنازہ کی تیاری کرتے ہوتے ہیں اور فرشتے اس کی روح کی تیاری میں لگے ہوتے ہیں۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ٍالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ یعنی اس روز اللہ ہی کی طرف مرنے والے کا رجوع ہوتا ہے اللہ ہی جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے کسی اور کی طرف مردہ کی واپسی نہیں ہوتی۔

ع ۱۷

فَلَا صَدَّقَ اس نے رسول یا قرآن کی تصدیق نہیں کی یا مال کی زکوٰۃ نہیں دی

وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ اور اللہ کی فرض کردہ نماز ادا نہیں کی۔ فَلَا صَدَّقَ کا عطف اَيَحْسَبُ کے مضمون پر ہے کیونکہ استفہام سے مراد ہے زجر اور کسی چیز پر زجر کرنے کا تقاضا ہے کہ وہ چیز واقع ہو چکی ہو (اسی لئے اس پر زجر کی جاتی ہے) تو گویا مطلب اس طرح ہو گا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں نہیں جوڑیں گے اور اس کو قیامت کے دن زندہ کرکے نہیں اٹھائیں گے اسی لئے نہ وہ تصدیق کرتا ہے نہ نماز پڑھتا ہے صَدَّقَ اور صَلّٰى کی ضمیریں الانسان کی طرف راجع ہیں کلام کی رفتار بتارہی ہے کہ آیت میں عدی بن ربیعہ مراد ہے لیکن بغوی کے نزدیک ابو جہل مراد ہے (یہ تعیین شخصی اس وقت ہو گی جب الانسان کے لام کو عہدی قرار دیا جائے) لیکن لام جنسی ہو تو عدی اور ابو جہل (اور ان جیسے سب انسان) الانسان میں داخل ہو جائیں گے۔

وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ بلکہ رسول اللہ ﷺ کو جھوٹا قرار دیا اور آپ پر ایمان لانے سے منہ پھیر لیا۔

ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ يَتَمَطّٰى کا معنی ہے تیز چلتا ہوا، قاموس میں ہے مطی فی سیرہ فلاں شخص تیز چال سے چلا اور کوشش سے چلا۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے وہ پشت دراز کرتا ہے (یعنی اینٹھتا چلتا ہے) بعض لوگوں نے کہا تمطّٰی کی اصل یتمطط تھی تین ہم جنس حرفوں کے اجتماع کی وجہ سے تیسری طاء کو یاء سے بدل دیا مطا کا معنی ہے دراز کرنا پھیلانا۔ بہرحال اس جگہ یتمطّٰی سے مراد ہے (اکڑتا ہے اینٹھتا چلتا ہے) اتراتا چلتا ہے گردن اکڑا کر پشت دراز کر کے چلنا اترانے کی علامت ہے۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ جملہ بد دعائیہ ہے تیری تباہی ہو یا تہدید و تخویف ہے (تیری تباہی ہو گی) گزشتہ کلام میں یتمطّٰی تک اَلْاِنْسَان کا ذکر بصیغہ غائب تھا اس جملے میں طرز کلام میں نیرنگی اختیار کی اور خطاب کی ضمیر استعمال کی۔

ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ جملہ کی تکرار مفید تاکید ہے یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے جملے میں دنیوی تباہی اور اس جملے میں آخرت کی تباہی مراد ہو۔ یعنی قتل پھٹکار بدنامی اور دنیوی سزا کی صورت میں تیری تباہی ہو گی اور مرنے کے وقت بھی بھی تیری تباہی ہو گی اور جب تجھے قبر سے اٹھایا جائے گا اس وقت بھی تیری تباہی ہو گی اور جہنم میں داخل ہونے کے وقت بھی تیری تباہی ہو گی (اول اور دوسرا اَوْلٰى دنیوی تباہی کے لئے ہے یعنی زندگی میں اور مرتے وقت تباہی ہو گی اور تیسرا اور چوتھا اَوْلٰى آخرت کی تباہی کے لئے ہے یعنی حشر کے وقت اور جہنم میں داخلے کے وقت تباہی ہو گی)

ایک اور آیت میں حضرت یحییٰ کے متعلق فرمایا تھا وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا اس آیت میں (عدی یا ابو جہل یا مغرور کافر کے متعلق) دنیوی اور اخروی تباہی کی صراحت فرمائی تو اس کلام کا مفہوم اس کلام کے مفہوم کے برعکس ہے جو حضرت یحییٰؑ کے متعلق فرمایا تھا (ایک میں سلامتی کی بشارت ہے اور دوسرے میں تباہی کی خبر)

اس تقدیر پر اَوْلٰى اصل میں اویل تھا اور اویل ویل سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے (بڑی تباہی) جیسے ادنی کی اصل ادون تھی اور ادون دون سے اسم تفضیل ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَوْلٰى لَکَ میں لام زائد ہے (اور اولی ماضی کا صیغہ ہے) یعنی اولاک اللہ ماتکرھہ اللہ تجھے وہ چیزیں دے گا جو تجھے ناگوار ہوں گی جیسے ردف لکم لام زائد ہے بعض لوگوں نے اولی لک کی اصل اولی لک الھلاک قرار دی ہے (یعنی لک مفعول نہیں ہے کہ لام کو زائد ماننا پڑے بلکہ الھلاک مفعول محذوف ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ال یول سے فعل (متعدی ماضی) ہے بعض لوگ اس کو اسم فعل کہتے ہیں (لیکن بمعنی ماضی) یعنی وہ مصیبت جو تجھے گوارا نہیں تجھ سے قریب ہو گئی۔ قاموس میں ہے اَوْلٰى لَکَ تہدید اور دھمکی ہے یعنی ہلاکت تیرے قریب آ گئی اس صورت میں اولی ولی سے مشتق ہو گا اور ولی کا معنی ہے قرب۔

قتادہ کا قول ہے کہ ہم سے بیان کیا گیا جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے بطحا میں ابو جہل کے پورے کپڑے تھام کر فرمایا اَوْلٰى لَکَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَکَ فَاَوْلٰى ابو جہل نے کہا محمد کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو خدا کی قسم نہ تم میرا کچھ کر سکتے ہو نہ تمہارا رب میں مکہ کے پہاڑوں کے درمیان چلنے والوں میں سب سے طاقت ور ہوں لیکن بدر کا دن ہوا تو اللہ نے بدترین طور پر اس کو ہلاک کیا اور بہت بری طرح وہ مارا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر امت کا ایک فرعون ہوتا ہے اس امت کا فرعون ابو جہل ہے۔

ابن جریرؒ نے عوفی کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ نازل ہوئی تو ابو جہل نے قریش سے کہا تمہاری مائیں تم پر روئیں ابو کبشہ کا بیٹا تم سے کہہ رہا ہے کہ دوزخ کے دربانوں کی تعداد انیس ہے تم بڑے پہلوان ہو کیا تم میں سے دس دس آدمی بھی ایک ایک دربان کو پکڑ لینے سے عاجز ہیں۔ اس پر اللہ نے اپنے پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ ابو جہل کے پاس جاؤ اور اس سے کہو اَوْلٰى لَکَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَکَ فَاَوْلٰى

نسائی نے بیان کیا کہ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا کہ اَوْلٰى لَکَ فَاَوْلٰى رسول اللہ ﷺ نے

خود اپنی طرف سے فرمایا تھایا اللہ نے ایسا کہنے کا آپ کو حکم دیا تھا حضرت ابن عباس نے جواب دیا پہلے حضورؐ نے خود اپنی طرف سے فرمایا تھا پھر اللہ نے آیت نازل فرمائی۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ اس کو یوں ہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا نہ کسی کام کو کرنے کا حکم دیا جائے گا نہ کسی فعل سے منع کیا جائے گا نہ اس کا حشر ہوگا نہ جزا سزا۔ انکار حشر کا تو اقتضاء ہے کہ آدمی کو آزاد چھوڑ دیا جائے حالانکہ انسانی پیدائش کے غرض ہی پابندی امر و نہی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ دوسری جگہ فرمایا قُلْ لَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً انسان حشر کا کیسے انکار کرتا ہے اور کس طرح دوبارہ جی اٹھنے کو ناممکن قرار دیتا ہے کیا وہ منی کی ایک بوند نہ تھا جو رحم میں ٹپکائی جاتی ہے پھر نطفہ ہونے کے چالیس روز بعد خون کا لوتھڑا ہوا پھر اتنے ہی دنوں میں بوٹی بنا پھر ہڈیاں بنیں پھر ان کو گوشت پہنایا۔

فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ پھر اللہ نے اس کے اندر روح پھونک کر اس کو پیدا کیا اور اس کی ساخت کو بغیر کسی نقصان کے درست کیا۔

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اور اسی منی سے جو علقہ پھر مضغہ پھر ہڈیاں اور گوشت کی شکل اختیار کر چکی ہے دو صنفیں اللہ نے بنائیں نر اور مادہ کبھی دونوں رحم کے اندر جمع ہوتی ہیں کبھی ایک ہوتی ہے دوسری نہیں ہوتی۔ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

کیا وہ خدا جو مذکورہ بالا عمل انجام دیتا ہے اور عدم سے وجود میں لاتا ہے مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ حشر جسمانی سے زیادہ تعجب آفریں قدرت کا مشاہدہ ہوتے ہوئے حشر کا انکار کرنا انتہائی حماقت اور عناد پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے جو شخص (سورۃ التین) پڑھے اور آخر سورت اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ پر ختم کرے تو اس کو کہنا چاہئے بَلٰى وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ (کیوں نہیں۔ میں اس کی شہادت دینے والوں میں سے ہوں) اور جو شخص لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ پڑھے اور سورت کو اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى پر ختم کرے تو اس کو کہنا چاہئے بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ اور جو شخص والمرسلات پڑھے اور فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ پر پہنچے تو کہے۔ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔

موسیٰ بن عائشہؒ نے کہا ایک شخص اپنے مکان کی چھت پر نماز پڑھا کرتا تھا جب آیت اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى پر پہنچتا تو کہتا سُبْحَانَكَ بَلٰى لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح سنا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں حدیثیں ابو داؤد نے نقل کی ہیں۔

(سورۃ القیامۃ ختم ہوئی بعونہ ومنہ تعالیٰ)

سورۃ الدہر

یہ سورت مکی ......اور بقول قتادہ و مجاہد مدنی ہے اس میں ۳۱ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هَلْ أَتٰى استفہام تقریری ہے (قَدْ کے معنی میں هَلْ استعمال کیا گیا ہے) بیشک آچکا ہے گزر چکا ہے۔
عَلَى الْإِنْسَانِ اَلْاِنْسَانِ سے عام انسان مراد ہے یا حضرت آدم علیہ السلام۔
حِيْنٌ زمانہ کا ایک محدود ٹکڑا (معین حصہ) حِیْن ہے۔ بیضاوی۔

قاموس میں ہے حین مبہم وقت جس کا اطلاق ہر زمانہ پر ہوتا ہے لمبی مدت ہو یا چھوٹی بعض کا قول ہے کہ حین چالیس سال یا ساٹھ سال یا ایک ماہ یا دو ماہ کے لئے مخصوص ہے۔

مِّنَ الدَّهْرِ اَلدَّھْر غیر محدود مدت۔ قاموس میں ہے دھر طویل زمانہ یا ایک ہزار برس میں کہتا ہوں یہی حضرت آدم کی عمر کی مدت تھی۔ صحاح میں ہے کہ دہر اصل میں عالم کی کل عمر۔ آغاز آفرینش سے آخر اختتام تک ہے اور آیت هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (مِنَ الدَّہْر) اسی معنی پر محمول ہے پھر (عرف عام میں) بڑی طویل مدت کو دہر کہا جانے لگا۔ دہر فلاں یعنی فلاں شخص کی مدت زندگی۔

لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ① یہ الانسان کی حالت کا بیان ہے یعنی اس وقت انسان کا نہ ذکر کیا جاتا تھا نہ اس کو کوئی پہچانتا تھا نہ اس کا نام معلوم تھا نہ مقصد۔ یا یہ جملہ حین کی صفت ہے اور (موصوف کی طرف راجع ہونے والی) ضمیر محذوف ہے۔ یعنی ایسا وقت تھا کہ اس وقت میں انسان کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بہر حال کلام کا اقتضاء یہ بھی ہے کہ انسان اس وقت مذکور نہ تھا بلکہ فراموش کردہ (یعنی متروک الذکر) تھا اسی لئے اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اگر الانسان سے مراد آدم ہوں تو حین سے مراد ہوگا وہ وقت جب گارے سے اللہ نے ان کی مورتی بنا کر مکہ اور طائف کے درمیان چالیس برس تک بغیر روح کے ڈال رکھی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا پھر (پتلا بنانے سے) ایک سو بیس برس کے بعد اللہ نے آدمؑ کو (زندہ) بنایا اور اگر الانسان سے عام انسان مراد ہو تو حین سے مراد ہوگی وہ چار ماہ کی مدت جس میں نطفہ علقہ اور مضغہ کی صورت میں انسان ہوتا ہے اور وہ چھ ماہ جو کم سے کم حمل کی مدت ہے یا دو سال جو زیادہ سے زیادہ حمل کی مدت ہے بعض لوگوں نے بیش از بیش مدت حمل سات سال بتائی ہے بہر صورت اس تشریح میں کچھ سہل انکاری سے کام لیا گیا ہے کیونکہ مذکورہ اوقات انسان پر نہیں گزرتے بلکہ گارے پر (گزرے) یا نطفہ اور علقہ وغیرہ پر گزرتے ہیں اور کلام چاہتا ہے کہ اس وقت انسان ہو کیونکہ انسان کے لئے دوسرے اوصاف کے ثبوت سے پہلے اس کا انسان ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ حین سے مراد وہ دور لیا جائے جب کہ انسان اعیان ثابتہ (حقائق کونیہ یا درجہ تقرر) کے مرتبہ میں تھا۔ اعیان ثابتہ کا مرتبہ صرف صوفیاء نے پہچانا ہے۔ ہمارے قول کی تائید حین کی تنوین سے بھی ہوتی ہے جس کے معنی تکثیر کے ہیں یعنی بہت بڑا وقت گزرا کہ آدمی کچھ.........نہ تھا۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک شخص کو یہی آیت لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا پڑھتے سنا تو فرمایا کہ کاش یہ (حالت) پوری ہوئی ہوتی آپ کا مقصد یہ تھا کہ کاش انسان ہمیشہ اسی ناقابل ذکر دور میں باقی رہتا حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول صوفیہ کی تشریح کے زیادہ قریب ہے اور سابق تفسیر سے زیادہ میل نہیں کھاتا۔ صوفیہ نے اس آیت کی ایک اور دقیق تشریح کی ہے کہتے ہیں کہ انسان پر یعنی صوفی پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ ناقابل ذکر چیز ہوتا ہے پہلے انسان اور صفات انسانی سے متصف

ہونے کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا جاتا تھا لیکن مرنے سے پہلے مر جانے اور فناء کامل کے درجہ میں پہنچ جانے کی وجہ سے وہ اپنی دانست میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں رہتا۔

حضرت مجدد صاحبؒ نے فرمایا تھا بیشک اے میرے رب انسان پر ایک ایسا وقت گزرا کہ وہ قابل ذکر چیز نہ تھا نہ اس کی ذات تھی نہ نشان نہ شہود نہ وجود پھر اس دور کے بعد اگر تو چاہتا ہے تو وہ تیری ہی حیات سے زندہ اور تیری ہی بقاء سے باقی اور تیرے ہی اخلاق سے موصوف بالخلق ہو جاتا ہے بلکہ تیری مہربانی اور تیری قدرت سے وہ عین فناء کی حالت میں بھی باقی بن جاتا ہے اور عین بقاء کی حالت میں تجھ سے الگ نہیں ہوتا۔

حضرت مجدد صاحبؒ کا مذکورہ بالا قول پھر اگر تو چاہتا ہے تو.......... وہ ہو جاتا ہے گویا حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ کی تفسیر ہے مِنَ الدَّهْرِ میں مِنْ ابتدائیہ ہے اور الدہر کا شمار اللہ کے ناموں میں کیا جاتا ہے۔ صاحب قاموس نے یہی لکھا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے مجھے ابن آدم دکھ دیتا ہے دہر کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ میں ہی دہر ہوں میرے ہی ہاتھوں میں ہر امر ہے رات دن کی لوٹ پلٹ میں ہی کرتا ہوں (گویا اللہ کی طرف سے انسان پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ نا قابل ذکر ہو جاتا ہے)

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ اگر انسان سے مراد آدم ہو تو اس جگہ اولاد آدم مراد ہو گی۔ ورنہ مطلقاً آدمی کوئی ہو (علاوہ حضرت آدم علیہ السلام کے)

مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ اَمْشَاج جمع ہے مشیج یا مشج مفرد ہے یہ لفظ مشج الشی سے ماخوذ ہے۔ مشج مخلوط کر دیا۔ اَمْشَاج کو نطفہ کی صفت اس لئے بنایا کہ نطفہ میں مرد اور عورت کا پانی مخلوط ہوتا ہے اور ہر نطفہ اجزاء خواص اور رقت و قوام کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔

بعض نے کہا اَمْشَاج مفرد ہے اس کا معنی ہے مخلوطہ یعنی عورت اور مرد کے پانی کا مخلوط مجموعہ اس صورت میں امشاج بروزن اعشاء ہوگا۔

برمۃ اعشار دس آدمیوں سے اٹھنے کے قابل پتھر کی دیگ۔ قتادہ نے کہا امشاج کا معنی ہے اطوار (اور مضاف محذوف ہے) یعنی مختلف طور والا نطفہ کیونکہ نطفہ ہی علقہ بنتا ہے پھر مضغہ بنتا ہے پھر تکمیل تخلیق تک (مختلف اطوار سے گزرتا ہے)

نَّبْتَلِيْهِ یہ اَلْاِنْسَان کی حالت کا اظہار ہے لفظ اِبْتَلا (آزمائش) مجازاً مراد ہے حال کی تبدیل اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال۔ یا حال مقدرہ ہے یعنی ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے اس کی آزمائش کا اندازہ کرتے ہوئے بنایا۔

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اسی لئے ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا تاکہ دلائل کو سننے اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے کی اس میں استطاعت ہو۔ امتحان اصل علت ہے اور سمیع بصیر بنانا مثل نتیجہ کے ہے اسی لئے فاء عاطفہ اس پر داخل کی گئی اور خَلَقْنَا پر عطف کیا گیا۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ ہم نے اس کے لئے راستہ کھول دیا یعنی پیغمبر بھیج کر کتابیں اتار کر اور (نفسی و آفاقی) دلائل قائم کر کے اللہ کے قرب اللہ کی خوشنودی اور اللہ کی جنت تک پہنچنے کا راستہ انسان کے لئے کھول دیا۔ ہدایت سے اس جگہ مراد ہے راستہ دکھانا، مقصود تک پہنچانا مراد نہیں ہے اس کے برخلاف آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں مقصد تک پہنچانا مراد ہے۔

اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ شَاكِرًا اور كَفُوْرًا هَدَيْنٰهُ کی ضمیر۔ ہ۔ سے حال ہیں یعنی انسان یا ہماری ہدایت کا شکر گزار ہوگا اور اس کو قبول کریگا یا کفران نعمت اور ناشکری کرے گا۔ دونوں باتوں میں ایک ضرور ہو گی۔ بعض لوگوں نے اَلسَّبِيْلَ سے حال قرار دیا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا یا شکر کا راستہ یا ناشکری کا راستہ۔ راستہ کو شاکر یا کافر کہنا مجازی طور پر ہے اس تردید (یا شکر یا کفر) کا تعلق ہدایت سے نہیں ہے۔ راستے تو دونوں دکھائے شکر کی حالت بھی بتائی اور نا

شکری کی بھی۔ (ایسا نہیں کہ کسی کو ایک اور کسی کو دوسری دکھائی ہو) بلکہ تردید کا تعلق راستہ سے ہے راستہ یا شکر کا ہے یا ناشکری کا۔

بعض لوگوں نے تردید کا تعلق ہدایت سے سمجھ کر شبہ کیا تھا کہ حق کے راستے کو حق دکھانا اور باطل کے راستہ کو باطل بتانا باہم لازم و ملزوم ہے اس صورت میں تردید کا تصور ہی نہیں ہو سکتا تردید کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ ہم نے شکر اور ناشکری دونوں میں سے ایک راستہ بتادیا دوسرا نہیں بتایا حق کا راستہ بتادیا اور انسان اس پر چل نکلا یا باطل کا راستہ دکھادیا اور انسان اس پر چل دیا اس توضیح پر لازم آئے گا کہ بعض انسانوں کی تقدیری تخلیق باطل راستہ پر چلنے پر ہوئی ہے۔

ہم نے جو اَلسَّبِیْلَ سے شَاکِرًا اور کَفُوْرًا کو حال قرار دیا ہے اس پر مذکورہ بالا سوال وارد نہیں ہوتا (کیونکہ اللہ نے انسان کو راستے تو دونوں دکھائے لیکن راستے کی دو قسمیں ہیں یا شکر کا یا ناشکری کا)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کلام شرطیہ ہے اما مرکب ہے ان (شرطیہ) اور ما (زائد) سے۔ اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ انسان اگر شاکر ہو یا کافر بہر حال ہم نے اس کو راستہ دکھادیا اور کوئی عذر اس کے لئے باقی نہیں رکھا۔

کافر (اسم فاعل۔ ناشکرا) کی جگہ کفور (مبالغہ۔ بڑا ناشکرا) استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر شکر گزار (کامل شکر گزار نہیں ہوتا) کسی نہ کسی قسم کی ناشکری اس میں ضرور پائی جاتی ہے تو اب اس کے مقابل بڑا ناشکرا ہو سکتا ہے اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ مستانفہ ہے ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ نے جب انسان کو پیدا کردیا اور اس کو سمیع بصیر بنادیا تو پھر انسان نے کیا کیا اور خدا نے اس کے ساتھ کیا کیا اس موہومی سوال کو دور کرنے کے لئے اِنَّا هَدَيْنٰهُ فرمایا۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا۝ زنجیریں ہاتھوں میں طوق گردنوں میں اور بہت بھڑکتی ہوئی آگ کافروں کے لئے ہم نے تیار کر رکھی ہے۔ یہ پورا جملہ اور اس کے بعد والا جملہ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ الخ جملے مستانفہ ہیں شکر گزاروں اور ناشکروں کو کیا ملے گا یہ ایک سوال پیدا ہوتا تھا اس کا جواب ان جملوں میں دے دیا۔ کافروں کا ذکر تو شاکروں کے بعد کیا تھا۔ مگر ان کی سزا کا تذکرہ مومنوں کی جزا سے پہلے کیا کیونکہ عذاب سے تخویف نصیحت پذیری کے لئے (بشارت سے) زیادہ مفید ہوتی ہے پھر اہل ایمان کے تذکرے سے کلام کا آغاز اور انہی کے ذکر پر کلام کا خاتمہ یوں بھی بہت اچھا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ ابرار برّ کی جمع ہے جیسے ارباب رب کی یا بار کی جمع ہے جیسے اشہاد، شاہد کی ابرار سے مراد ہیں وہ اہل ایمان جو اپنے ایمان میں سچے اور اپنے رب کے فرمان بردار ہیں۔ برّ مصدر ہے بر کا معنی ہے اچھا سلوک اور خیر، اطاعت سچائی، اور بھلائی میں وسعت قاموس۔ یہ تمام اوصاف مومنوں کے ہیں۔

مِنْ كَاْسٍ جوہری نے صحاح میں کہا کاس شربت (پانی وغیرہ) سے بھرے ہوئے برتن کو کہا جاتا ہے اور شربت کے خالی برتن کو بھی کاس کہتے ہیں۔ دونوں طرح اس لفظ کا استعمال ہے کاس خال بھی کہا جاتا ہے اور شربت کاسا اور شربت کاسا طیبۃ بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے پیالہ پیا یعنی شربت سے بھرا ہوا میں نے پاکیزہ پیالہ پیا یعنی پاکیزہ شربت۔

قاموس میں ہے کاس پینے کا برتن یا پینے کا برتن بشرطیکہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو پینے کی چیز کوئی ہو کوئی تخصیص نہیں نہ شراب کی نہ شہد کی نہ دودھ کی نہ پانی کی۔ شاید آیت میں برتن مراد ہے اور مِنْ ابتدائیہ ہے یعنی ابرار پینے کی چیزیں پینے کے برتن میں پائیں گے۔ شراب شہد دودھ پانی کچھ بھی ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پینے کی چیز مراد ہو خواہ حقیقتاً یا بطور مجاز جیسے ظرف بول کر مظروف مراد ہوتا ہے جری النہر میں نہر سے پانی مراد ہوتا ہے اس وقت مِنْ كَاْسٍ میں مِنْ زائد ہو گا یا تبعیضیہ (کچھ شربت) یا بیانیہ (کیا پئیں گے شربت) یہ بھی ممکن ہے کہ مشروب سے بھرا ہوا برتن مراد ہو اور مِنْ ابتدائیہ ہو۔

كَانَ مِزَاجُهَا مزاج ملائی جانے والی چیز ضمیر کاس کی طرف راجع ہے ملائی جانے والی چیز کاس کے ساتھ حقیقتاً مخلوط ہو گی اگر کاس بمعنی مشروب ہو یا مجازاً مخلوط ہو گی اگر کاس سے برتن مراد ہو یعنی برتن کے اندر والے مشروب کے

ساتھ ملی ہوئی چیز۔ جیسے اذا نزل السماء بارض قوم رعینا۔ یعنی کسی قوم کی زمین پر جب مینہ برستا ہے تو ہم اس کو یعنی اس سے پیدا ہونے والی گھاس کو چراتے ہیں۔ کَافُوْرًا ۝

قتادہ نے کہا اہل جنت کے لئے کافور (شربت میں) ملایا جائے گا اور مشک کی مہر لگائی جائے گی۔ عکرمہ نے کہا چکھنے میں اس کی خوشبو کافور کی طرح ہو گی جیسے آیت حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا میں نارا (آگ کی طرح) مراد ہے (یعنی عکرمہ کے نزدیک کافور شربت میں آمیختہ نہ ہو گا بلکہ کَافُوْرًا منصوب بحذف حروف جر ہے یعنی کافور کی طرح پیتے وقت خوشبو ہو گی) کلبی نے کہا جنت کے ایک چشمہ کا نام کافور ہے جیسے آیت وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ آئی ہے تسنیم ایک چشمہ کا نام ہے۔

عَیْنًا یہ کافور سے بدل ہے بشرطیکہ کافور کو چشمہ کا نام قرار دیا جائے یا مِنْ كَاْسٍ کے محل (مفعول) سے بدل ہے اور مضاف محذوف ہے مراد یہ ہے کہ جنتی جام پئیں گے یعنی چشمہ کا پانی۔ یا اختصاص کی وجہ سے عَیْنًا منصوب ہے یا کوئی فعل مدح محذوف ہے اس کا مفعول ہے یا کوئی ایسا فعل محذوف ہے جس کی تفسیر آئندہ فعل کر رہا ہے۔

یَّشْرَبُ بِهَا بِهَا مفعول ہے باء زائد ہے اس کو پائیں گے۔ یا یَشْرَبُ لذت کے معنی کو متضمن ہے اور یلتذ کے مفعول پر باء آتی ہے اس لئے یَشْرَبُ کے مفعول پر بھی باء لائی گئی یا ممزوجا محذوف ہے بِهَا اس سے متعلق ہے یا باء مِنْ ابتدائیہ کے معنی میں ہے اس سے پئیں گے۔

عِبَادُ اللّٰهِ اللہ کے پرستار جنہوں کے خالص اطاعت کے ساتھ اللہ کی عبادت کی۔

یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ۝ یعنی اللہ کے پرستار جنت کے اندر اپنے مکانوں اور محلات میں جہاں چاہیں گے آسانی کے ساتھ اس چشمہ (کی شاخ) بہا کرلے جائیں گے۔ عبداللہ بن احمد نے کتاب الزہد میں ابن شوذب کا قول نقل کیا ہے کہ اہل جنت کے پاس سونے کی ٹہنیاں ہوں گی ان ٹہنیوں کے ذریعہ سے چشمہ کا پانی جہاں چاہیں گے لے جائیں گے پانی ان کے حکم کا تابع ہو گا۔

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ یہ جملہ مستانفہ ہے (گویا یہ) جواب ہے ایک فرضی سوال کا کہ ابرار کو ایسا ثواب کیوں ملے گا یا ابرار کے کیا اوصاف ہیں اس صورت میں یہ ابرار کی تعریف ہو جائے گی کہ وہ فرائض ادا کرتے ہیں۔ اللہ سے ڈرتے ہیں ممنوعات سے پرہیز رکھتے ہیں بندوں پر رحم کرتے ہیں اور مرضی مولیٰ کی طلب میں خلوص کے ساتھ نیکیاں کرتے ہیں یہ ابرار کے اوصاف ہیں اور یہ مرتبہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس کو فنا کر دیا گیا ہو اور بری خصلتیں دور ہو گئی ہوں۔ رہے اہل قرب تو ان کے اوصاف ان سے بھی اونچے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یُوْفُوْنَ سے کلام سابق کی علت بیان کی گئی ہو ابرار پر بہشت میں انعامات مذکورہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں وہ نذر پوری کرتے تھے۔ الخ نذر کا لغوی معنی ہے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا۔ صحاح اور جب ابرار غیر واجب (مستحب) امور کو اپنے اوپر واجب کرتے اور ان کو ادا کرتے ہیں تو نماز روزہ زکوٰۃ حج عمرہ جہاد اور دوسرے فرائض الٰہیہ کو تو بدرجہ اولیٰ ادا کرتے ہی ہیں۔ شاید قتادہ کے قول کا یہی مطلب ہے۔ قتادہ نے آیت کی تشریح میں کہا تھا کہ اللہ نے جو فرائض ان پر مقرر فرمائے ہیں نماز زکوٰۃ حج عمرہ وغیرہ ان کو وہ ادا کرتے ہیں۔

فصل

وجوب کا بیان

جب نذر کا معنی ہے غیر واجب کو اپنے اوپر واجب بنا لینا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذر کے انعقاد کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں (۱) جس چیز کی نذر مانی جائے وہ اطاعت ہو (معصیت نہ ہو) اگر اطاعت نہ ہو گی تو اس قابل نہ ہو گی کہ اس کو واجب

بنایا جائے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے نذر وہی ہوتی ہے جو خالص مرضی مولیٰ کی طلب کے لئے ہو۔ یہ حدیث امام احمدؒ نے حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت سے بیان کی ہے (۲) پہلے سے اللہ کی طرف سے واجب کردہ نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دو شرطیں اور بھی ہیں۔

(۱) وہ عبادت مقصودہ ہو (اس لئے عبادت غیر مقصودہ جیسے وضوء، طہارت جسم للصلوۃ کی نذر صحیح نہیں (۲) اس قسم کا کوئی دوسرا واجب اللہ کی طرف سے موجود ہو۔ جمہور کے نزدیک یہ دونوں شرطیں ضروری نہیں۔ دیکھو اعتکاف کی نذر کے درست ہونے پر اجماع ہے باوجود یہ کہ اعتکاف خود عبادت مقصودہ نہیں ہے بلکہ اس کا عبادت ہونا نماز کے انتظار کے لئے ہے بجائے خود یہ عبادت نہیں (مسجد میں مقیم رہنا بجائے خود کوئی عبادت نہیں) پھر کسی قسم کا دوسرا اعتکاف اللہ کی طرف سے واجب بھی نہیں۔ (امام صاحبؒ کی قائم کردہ دونوں شرطیں اعتکاف نذر میں مفقود ہیں) اسی لئے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ نذر کی وجہ سے اس عبادت کا وجوب ہو جاتا ہے جو پہلے (اللہ کی طرف سے) واجب نہ تھی جیسے مریض کی عیادت، جنازہ کے ساتھ جانا۔ سلام علیک، وجوب نذر کی تعمیم پر حضرت عائشہؓ کی حدیث دلالت کر رہی ہے فرمایا جس نے اللہ کی اطاعت کی منت مانی اس کو اطاعت کرنی چاہئے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی اس کو نافرمانی نہ کرنی چاہئے۔ (بخاری)

طحاوی نے اس روایت میں اتنی بیشی نقل کی ہے کہ (نافرمانی کرنے کی نذر پوری نہ کرے بلکہ) کفارہ قسم ادا کرے ابن عطا نے کہا طحاوی کی روایت میں جو یہ بیشی ہے اس کے مرفوع ہونے میں شک ہے (معلوم نہیں حضور ﷺ نے یہ زائد الفاظ فرمائے تھے یا راوی کی طرف سے بیشی ہے

مسئلہ

اگر کسی نے نذر اطاعت کی مگر نذر کو بعض (غیر ضروری) شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیا تو نذر کا ایفاء واجب ہو جائے گا اور شرطیں لغو قرار پائیں گی (ان کی تکمیل واجب نہ ہو گی) جیسے کسی نے نذر مانی کہ کسی خاص جگہ نماز پڑھوں گا یا روزہ میں کھڑا رہوں گا۔

اس صورت میں ادائے صوم و صلوۃ واجب ہو گی اور ہر حال میں یہ نذر پوری ہو جائے گی۔ اس پر اجماع ہے۔

لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک اگر مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی ہو تو کسی دوسری مسجد میں پڑھنے سے نذر پوری نہو گی اور اگر مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) یا مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو مسجد حرام میں پڑھنے سے نذر پوری ہو جائے گی۔ غرض کم فضیلت والی مسجد میں نماز پڑھنے سے اس نماز کی نذر پوری نہ ہو گی جو زیادہ فضیلت والی مسجد میں لازم کی گئی ہو۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہر صورت میں ہر جگہ نماز پڑھنے سے نذر پوری ہو جائے گی۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ آپ ﷺ کو فتح مکہ نصیب فرمادیگا تو میں بیت المقدس میں نماز پڑھوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی جگہ پڑھ لو اس شخص نے دوسری بار یا تیسری بار وہی گزارش کی آخر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تم جانوں تمہارا حال (یعنی تم کو اختیار ہے جو چاہو کرو یہاں پڑھو یا وہاں۔ واللہ اعلم) ابو داؤد۔ دارمی۔

اسی حدیث کی بناء پر امام صاحب نے شرط مکانی کو لغو قرار دیا ہے امام ابو یوسف اور امام شافعی نے فرمایا کہ تینوں مساجد میں سے کسی ایک مسجد کی شرط لگانے میں ثواب کی کثرت (ملحوظ) ہوتی ہے اور مقصود طاعت ہے لہذا یہ شرط لغو نہ ہو گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اس مسجد میں نماز علاوہ مسجد حرام کے دوسری مسجدوں میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔ بخاری و مسلم۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور نے فرمایا آدمی کی اپنے گھر میں نماز ایک نماز کا اجر رکھتی ہے اور محلہ کی

مسجد میں پچیس نمازوں کا اور جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کا اور مسجد اقصیٰ میں ہزار نمازوں کا اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کا اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا۔ ابن ماجہ۔

(یہ تفضیلی درجات) فرض نمازوں کیلئے ہیں نوافل کا یہ حکم نہیں ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا علاوہ فرض کے (باقی دوسری) نماز آدمی کیلئے اپنے گھر میں میری مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔

علاوہ طاعت کے دوسری شرائط کے لغو ہونے پر حضرت ابن عباس کی حدیث دلالت کر رہی ہے ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ خطبہ دے رہے تھے دفعتہً ایک شخص دھوپ میں کھڑا نظر آیا اسکے متعلق کیفیت دریافت فرمائی ابواسرائیل نے عرض کیا اس نے منت مانی ہے کہ نہ بیٹھے گا نہ سایہ میں جائیگا نہ بات کرے گا اور اسی طرح روزہ پورا کریگا۔ فرمایا اس کو حکم دو بات کرے سایہ میں جائے بیٹھ جائے اور روزہ پورا کرے۔ ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، بخاری کی روایت میں دھوپ کا ذکر نہیں ہے۔ امام مالکؒ نے اس حدیث کو موطا میں مرسل ذکر کیا ہے اس روایت میں ہے اس کو حکم دو کہ طاعت خداوندی کو پورا کرے اور جو معصیت ہے اس کو ترک کر دے۔ امام مالک نے بیان کیا ہم کو یہ بات نہیں پہنچی کہ حضور ﷺ نے کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا ہو امام شافعیؒ نے بھی یہ حدیث بیان کی جس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے کفارہ کا حکم نہیں دیا البتہ بیہقی نے بوساطت محمد بن کریب حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے اس میں کفارہ کا حکم ہے مگر محمد بن کریب ضعیف الروایۃ ہے۔

مسئلہ: اگر واجب نذر ادا نہ کر سکے تو قضا واجب ہے نذر کی مثل ادا کرے خواہ مثل حقیقی ہو یا حکمی جیسے نماز نذر کے عوض نماز صوم نذر کے عوض صوم۔ اور شیخ فانی (پیر ضعیف) ہر صوم نذر کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اگر کسی نے پیدل حج کرنے کی منت مانی اور کسی عذر کی وجہ سے سوار ہو گیا تو جمہور کے نزدیک اس کو ایک جانور کی قربانی پیش کرنی چاہئے صحیح روایت سے امام ابو حنیفہ کا بھی یہی مسلک ثابت ہے اصل روایت میں امام صاحبؒ کا قول یہ آیا تھا کہ پیدل حج کی نذر ماننے والے پر پیدل جانا واجب ہی نہیں ہے اس لئے اگر سوار ہو جائے تو قربانی واجب نہیں کیونکہ عقبہ بن عامر جہنی کی روایت ہے حضرت عقبہؓ نے کہا میری بہن نے برہنہ سر ننگے پاؤں پیدل کعبہ کو جانے کی منت مانی رسول اللہ ﷺ اس کی طرف تشریف لائے اور فرمایا اس کی کیا کیفیت ہے لوگوں نے عرض کیا اس نے ننگے سر ننگے پاؤں پیدل کعبہ کو جانے کی نذر مانی ہے فرمایا اسکو حکم دو سوار ہو جائے اور سر ڈھانک لے۔ بخاری و مسلم۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے رسول اللہ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اپنے دو لڑکوں کے درمیان دونوں کے سہارے سے جارہا ہے وجہ دریافت فرمائی جواب ملا اس نے پیادہ جانے کی نذر مانی ہے فرمایا اللہ کو اس کو عذاب دینے کی کوئی ضرورت نہیں پھر حضور اکرم ﷺ نے اس کو سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ متفق علیہ۔ ہم (جمہور کی طرف سے) کہتے ہیں کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت کو ابوداؤد نے جید سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ میری بہن نے کعبہ تک پیادہ جانے کی منت مانی تھی مگر رسول اللہ ﷺ نے اس کو سوار ہونے اور ایک قربانی کرنے کا حکم دیا۔

ابوداؤدؒ ہی میں زید بن عباسؓ کی روایت سے یہ الفاظ آئے ہیں کہ عقبہ بن عامر کی بہن نے نذر مانی تھی کہ پیدل حج کو جائے گی اور اس میں اس کی طاقت نہیں تھی تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا یقیناً اللہ کو تیری بہن کے پیدل چلنے کی پرواہ نہیں وہ سوار ہو جائے اور ایک اونٹ کی قربانی دے۔ طحاویؒ نے بھی اسی طرح حضرت عقبہ بن عامر کی روایت اچھی سند کے ساتھ نقل کی ہے ان تصریحات سے ظاہر ہو گیا کہ صحیحین کی روایات میں اختصار ہے۔ ہماری نقل کردہ روایات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قربانی کیلئے اونٹ ہی مخصوص ہے۔ عبد الرزاق نے صحیح سند کے ساتھ حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ جس نے کعبہ کو پیدل جانے کی منت مانی ہو تو اس کو پیدل چلنا چاہئے اگر تھک جائے تو سوار ہو جائے اور اونٹ کی قربانی دے حضرت ابن عمرؓ حضرت

ابن عباسؓ قتادہ اور حسن بصری کے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔
مسئلہ: اگر کسی نے گناہ کی نذر مانی یا ایسے امر مباح کی منت مانی جو طاعت نہیں ہو سکتا تو اس کو پورا کرنا واجب نہیں بالاجماع وہ نذر درست نہو گی امام اعظمؒ کے نزدیک کلام لغو ہو جائیگا اور جمہور کے نزدیک نذر نہیں ہو گی لیکن کلام بھی لغو نہو گا بلکہ قسم کے حکم میں آجائیگی جہاں تک ہو سکے صحیح العقل کے کلام کو لغویت سے محفوظ رکھا جائے۔ نذر کے لفظوں میں چونکہ پختہ تاکید ہوتی ہے اللہ کا نام ذکر کیا جاتا ہے اس لئے کلام لفظاً قسم بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور معنی بھی وہ قسم ہو سکتا ہے کیونکہ جس چیز کی منت کو واجب بنایا ہے لامحالہ اس کی ضد کو حرام قرار دیا ہے۔ لہذا جمہور کے نزدیک اس قسم کو توڑنا اور نذر معصیت کی صورت میں کفارہ (قسم) دینا واجب ہے مگر نذر مباح کی صورت میں اختیار ہے کہ نذر کو پورا کرے یا توڑ کر کفارہ ادا کرے جمہور کے قول کو ثابت کرنے والی مختلف احادیث ہیں ایک حدیث حضرت عقبہؓ بن عامر والی ہے کہ کفارہ نذر (وہی ہے جو) کفارہ قسم ہے۔ مسلم

حضرت عمران بن حصینؓ کی حدیث مرفوع ہے کہ معصیت خدا کی کوئی نذر (جائز) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ نسائی، حاکم، بیہقی۔ اس روایت کا مدار محمد بن زبیر حنظلی پر ہے اور یہ راوی قوی نہیں۔ حافظ بن حجر نے کہا یہ حدیث دوسرے طریقوں سے بھی منقول ہے جن کی اسناد صحیح ہے مگر یہ معلول امام احمد اور اصحاب السنن اور بیہقیؒ نے بوساطت زہریؒ از ابو سلمہؒ از ابو ہریرہؓ بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے مگر یہ سلسلہ منقطع ہے ابو سلمہؓ نے ابو ہریرہؓ سے سماعت نہیں کی۔ اصحاب السنن نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی نقل کی۔ لیکن اس سلسلہ میں سلیمان بن ارقم ہے جو متروک ہے۔ دار قطنی نے حضرت عائشہؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جس نے معصیت خدا کی منت اپنے اوپر لازم کی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اس سند میں غالب بن عبداللہ متروک ہے۔ ابوداؤد نے کریب کی وساطت سے جو حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے اس کی اسناد حسن ہے لیکن نووی نے لکھا ہے کہ معصیت خدا کی کوئی نذر (درست) نہیں اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ باتفاق علماء حدیث یہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ نے کہا کہ طحاوی نے اس حدیث کو صحیح مانا ہے اور ابو علی بن سکن نے بھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے معین نذر مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے گناہ کی منت مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے ایسی منت مانی جس کو ادا کرنے کی اس میں طاقت نہیں اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے قابل برداشت نذر مانی تو اس کو پورا کرے۔ ابوداؤد، ابن ماجہ۔ حضرت ثابت بن ضحاک کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی خاص مقام پر، ایک روایت میں اس مقام کا نام بوانہ آیا ہے، اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی رسول اللہ ﷺ نے اس سے (دریافت) فرمایا کیا جاہلیت کے دور میں وہاں کسی بت کی پوجا ہوتی تھی لوگوں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا کیا جاہلیت والوں کا کوئی خوشی کا میلہ لگتا تھا۔ لوگوں نے جواب دیا نہیں فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ ابوداؤد۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ عمرو بن شعیبؒ نے اپنے باپ پردادا کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے اور اسی کی طرح ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس کی روایت بھی لکھی ہے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایسی چیز کی نذر مانی ہو جو نہ طاعت ہے نہ معصیت تو اس کو پورا کرنا جائز ہے عمرو بن شعیبؒ کے باپ نے دادا کے حوالے سے بیان کیا کہ ایک عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں نے منت مانی تھی کہ آپ ﷺ کے سر پر دف بجاؤں گی۔ اس کی مراد یہ تھی کہ آپ کی تشریف آوری پر (آپ کے سامنے دف بجاؤنگی) حضور ﷺ نے فرمایا اپنی منت پوری کرلے۔ یہ حدیث ابوداؤد نے نقل کی ہے شاید یہ واقعہ دف بجانے کی حرمت سے پہلے کا تھا۔
نذر معلق بالشرط، بوقت تحقق شرط، نذر قطعی کی حکم میں ہے ظاہر روایت میں امام اعظمؒ کا یہی قول ہے اور ابو یوسفؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے۔ امام مالکؒ بھی اسی کے قائل ہیں مگر انھوں نے (ایک صورت میں اس کے خلاف) کہا ہے کہ اگر کسی نے نذر مشروط کی صورت میں کل مال خیرات کرنے کی منت مانی اور شرط واقع ہو گئی تو (کل مال خیرات کرنا ضروری نہیں صرف ایک تہائی مال خیرات کرنا لازم ہے باقی جو صورت بھی ہو ہر حالت میں جو

منت مانی ہے اس کو پورا کرنا ضروری ہے)

ایک روایت میں آیا ہے کہ امام اعظمؒ نے قول مذکور سے رجوع کر لیا تھا اور فرمایا تھا کہ نذر معلق اگر پوری کرے تو خیر ورنہ کفارہ قسم ادا کرنا کافی ہے یہی امام محمد کا قول ہے۔ صاحب ہدایہ اور دوسرے محققین حنفیہ نے کہا ہے کہ کفارہ قسم امام صاحب کے نزدیک اس شرط کے وقت کافی ہو گا جس شرط کا تحقق وہ چاہتا نہ ہو مثلاً یوں کہے کہ اگر میں گھر کے اندر جاؤں یا فلاں شخص سے بات کروں یا فلاں کام کروں تو مجھ پر حج یا ایک سال کے روزے لازم ہیں۔ اس نذر کو نذر خارج کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر شرط ایسی ہے جس کا وقوع وہ خود چاہتا ہے (اور وہ شرط واقع ہو گئی) تو نذر پوری کرنی لازم ہے مثلاً یوں کہا کہ اگر فلاں غائب شخص آجائے یا میرا دشمن مر جائے یا میرا فلاں کام ہو جائے یا میری بیوی کے لڑکا پیدا ہو تو مجھ پر یہ چیز لازم ہے تو اس صورت میں لا محالہ اس پر وہی چیز ادا کرنی لازم ہو گی جو اس نے مانی ہے۔ اس نذر کا نام نذر تبرع ہے۔ اسی تفصیل کے امام احمد بھی قائل ہیں اور ظاہر ترین روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی قول آیا ہے۔ امام شافعی کا ایک تیسرا قول بھی ایک روایت میں آیا ہے جو ایک روایت میں امام احمد کی طرف بھی منسوب ہے کہ نذر خارج میں کفارہ قسم ہی واجب ہے مانی ہوئی منت ادا کرنی جائز نہیں۔

سعید بن مسیب نے بیان کیا کہ دو انصاری بھائی کسی میراث کے مشترکاً وارث ہوئے ایک نے دوسرے سے تقسیم کی خواہش کی اس نے جواب دیا اگر تو نے دوبارہ تقسیم کیلئے کہا تو میرا کل مال کعبہ کے منافع کیلئے ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کعبہ کو تیرے مال کی ضرورت نہیں۔ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر اور اپنے بھائی سے کلام کر۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے حضور ﷺ فرما رہے تھے کہ تم پر نہ کوئی قسم پڑیگی نہ نذر (اگر) خدا کی نافرمانی یا قطع رشتہ داری یا ایسی چیز کے متعلق ہو جس کے تم مالک نہ ہو۔ ابو داؤد

مسئلہ: جس نے خارج از طاقت عبادت کی نذر مانی تو کفارہ دینا جائز ہے امام اعظم کے نزدیک کفارہ لازم نہ ہو گا صرف اللہ سے استغفار کرے۔

ہماری دلیل حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث ہے جو اوپر گزر چکی کہ جس نے خارج از طاقت چیز کی منت مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ حضرت عقبہ کی بہن کے قصہ میں بھی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تیری بہن کے پیدل چلنے کی سخت تھکان سے خدا کو کچھ فائدہ نہیں۔ وہ سوار ہو جائے اور سوار ہو کر حج کو جائے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔ ابو داؤد۔ عبد اللہ بن مالکؓ نے کہا کہ حضرت عقبہ بن عامر نے بیان کیا کہ میری بہن نے برہنہ سر پیدل چل کر حج کو جانے کی منت مانی تھی اس کا تذکرہ حضور کے سامنے آیا ارشاد فرمایا اپنی بہن سے کہدے کہ سر پر اوڑھنی اوڑھے سوار ہو اور تین روزے رکھے۔ ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، طحاوی۔

اختلاف احادیث کو دور کرنے کی توجیہ یہ ہے کہ شاید حضور ﷺ نے کفارہ کا حکم اس وقت دیا جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ عورت نذر پوری کرنے سے عاجز ہے واللہ اعلم۔

وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ یعنی اس کی برائی صحاح میں ہے شر وہ چیز ہے جس سے روگردانی کی جاتی ہے (یعنی قابل نفرت چیز)

مُسْتَطِيرًا ⑦ بہت زیادہ پھیلی ہوئی۔ استطار الحریق آگ بہت پھیل گئی استطار الفجر صبح کی روشنی خوب پھیل گئی۔ مقاتل نے کہا روز قیامت کا شر آسمانوں میں پھیلے گا تو آسمان پھٹ جائیں گے۔ ستارے جھڑ جائیں گے چاند سورج بے نور ہو جائیں گے ملائکہ پر خوف طاری ہو جائیگا اور زمین پر شر پھیلے گا تو پہاڑ خاک ہو کر اڑ جائیں گے پانی خشک ہو جائیگا۔ روئے زمین پر جو پہاڑی یا عمارت ہو گی ٹوٹ پھوٹ جائیگی۔ اس آیت میں مومنوں کے عقیدہ کی خوبی اور گناہوں سے پرہیز رکھنے کا اظہار ہے جس طرح آیت يُوفُونَ بِالنَّذْرِ میں اہل ایمان کی ادائیگی فرض کا اظہار تھا۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ اس میں اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ مومن اللہ کے بندوں پر مہربانی کرتے ہیں

رضائے مولیٰ کے حصول کیلئے خلوص کے ساتھ نفل (غیر لازم) نیکیاں کرتے ہیں۔

عَلٰی حُبِّهٖ اللہ کی محبت میں یا کھانے کی محبت اور حاجت کے باوجود۔

مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا۝۸ ابن منذرؒ نے ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اہل اسلام کو قید نہیں کرتے تھے (اس لئے آیت میں مسلمان قیدی مراد نہیں) بلکہ اس آیت کا نزول ان مشرکوں کے سلسلہ میں ہوا تھا جن کو مسلمان قید کرلیا کرتے تھے رسول اللہ ﷺ ان مشرک قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتے تھے۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے لیکن مجاہد اور سعید بن جبیرؒ کا قول ہے کہ اسیراً سے مراد مسلمان قیدی ہے۔ اول الذکر قول زیادہ واضح ہے بعض کے نزدیک اسیر سے مراد ہے باندی غلام بعض کے نزدیک عورت مراد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو ضعیفوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو مملوک اور عورت۔ رواہ ابن عساکر۔

ابو عمرو نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نماز اور اپنے مملوک کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ رواہ الخطیب۔ بخاری نے ادب میں حضرت علی۔ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ اپنے مملوکوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔

بغویؒ کی روایت میں ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو وہ تمہارے پاس قیدی ہیں بغوی نے لکھا ہے اس آیت کی شان نزول کے متعلق علماء میں اختلاف ہے مقاتل کا بیان ہے کہ اس کا نزول ایک انصاری کے متعلق ہوا تھا جس نے ایک ہی دن میں مسکین کو بھی کھانا کھلایا تھا اور یتیم کو بھی اور قیدی کو بھی۔

مجاہد اور عطا نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں ہوا۔ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کی مزدوری کر کے کچھ جو حاصل کئے اور ان میں سے ایک تہائی پیس کر گھر والوں کے کھانے کیلئے کچھ کھانا تیار کیا جونہی کھانا پک کر تیار ہوا ایک مسکین نے آکر سوال کیا گھر والوں نے وہ کھانا اس کو دے دیا دوبارہ پھر ایک تہائی جو پکائے گئے کھانا پک کر تیار ہوا تو ایک یتیم نے آکر سوال کیا گھر والوں نے وہ کھانا اس کو کھلا دیا تیسری بار باقی جو کو پکایا اور پک کر تیار ہوا تو ایک مشرک قیدی آگیا اور سوال کیا گھر والوں نے وہ کھانا اس کو دیدیا اور سب اس روز بھوکے رہے۔

ثعلبیؒ نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ (ایک بار) حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بیمار ہوگئے رسول اللہ ﷺ عیادت کیلئے تشریف لے گئے اور (حضرت علیؓ سے) فرمایا ابو الحسن اگر تم اپنے بچوں (کی صحت کی) نذر مان لو (تو بہتر ہے) حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت فضہؓ نے نذر مان لی کہ اگر ان دونوں کو صحت ہوگئی تو ہم تین روزے رکھیں گے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی خادمہ کا نام فضہ تھا۔ چنانچہ دونوں صحت یاب ہوگئے مگر اس روز ان حضرات کے پاس کچھ کھانے کو نہیں تھا حضرت علیؓ نے شمعون خیبری (یہودی) سے تین صاع (تقریباً بارہ سیر) جو قرض لئے حضرت فاطمہؓ نے ایک صاع جو کا آٹا پیسا اور پانچ روٹیاں پکا کر گھر والوں کے سامنے روزہ افطار نے کیلئے رکھ دیں اتنے میں ایک مسکین آکر کھڑا ہوگیا گھر والوں نے اس کو اپنے اوپر ترجیح دی اور روٹیاں اس کو دیدیں خود پانی کے سوا کچھ نہیں چکھا اور رات یونہی گزار دی اور صبح کو روزے رکھ لئے شام ہوئی تو گزشتہ دن کی طرح کھانا پکا کر سامنے رکھا ہی تھا کہ ایک یتیم آگیا سب کھانا اس کو دیدیا اور رات یونہی فاقہ سے گزار دی اور صبح کو روزے رکھ لئے شام کو پھر کھانا پکا کر سامنے رکھا ہی تھا کہ تیسری مرتبہ ایک قیدی آکھڑا ہوا اور گھر والوں نے حسب سابق اس کے ساتھ برتاؤ کیا اس پر جبرئیلؑ یہ سورت لے کر نازل ہوئے اور کہا محمد یہ لو اللہ نے تمہارے اہل بیت کے معاملہ میں تم کو مبارکباد دی ہے۔ حکیم ترمذی نے کہا یہ مفصل حدیث سوائے بے وقوف اور جاہل کے کسی کیلئے تسکین بخش نہیں۔ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اس کا موضوع ہونا ناقابل شک ہے۔ سیوطی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ سورت مکی ہے اور حضرت فاطمہؓ سے حضرت علی کا نکاح ہجرت سے دو سال بعد ہوا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ اعتراض تو مقاتل اور مجاہد و عطا کے قول پر بھی ہوتا ہے کیونکہ کسی انصاری کے حق میں اگر آیت کا نزول قرار دیا جائے تو آیت کا مدنی ہونا ضروری ہے اسی طرح حضرت علیؓ کا کسی یہودی کی مزدوری کر کے کچھ جو حاصل کرنا بھی مدینہ ہی میں ہو سکتا ہے مکہ میں یہودی

ہی نہیں تھے بلکہ نفس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مدنی ہو کیونکہ قیدی مدینہ میں ہی تھے مکہ میں تو نہ جہاد تھا نہ کسی مشرک قیدی کا وجود پس ظاہر ہے کہ اس سورت کا کچھ حصہ مدنی ہے خواہ بعض حصہ مکی ہو۔ اگر کل سورت کو مکی قرار دیا جائے تو آیت میں پیش گوئی ہو گی اور ہجرت کے بعد مسلمانوں کو پیش آنے والے واقعہ کی اطلاع بطور اخبار غیب کے قرار دی جائے گی۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ يُطْعِمُونَ کی ضمیر کی حالت کا اظہار ہے یعنی وہ اس قول کو کہنے کی حالت میں کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ قول یا تو واقعی وہ زبان سے کہتے ہی تھے یا زبان حال گویا تھی۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا ان لوگوں نے اپنی زبانوں سے یہ الفاظ نہیں کہے تھے مگر ان کی دل کی حالت سے اللہ واقف تھا (اور دل سے ضرور انہوں نے یہ بات کہی تھی) اس قلبی قول ہی کی اللہ نے تعریف فرمائی ہے۔

لِوَجْهِ اللّٰهِ لفظ وجہ زائد ہے مراد ہے اللہ واسطے اللہ کی خوشنودی اور ثواب کی طلب میں۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً جسمانی اور مالی بدلہ

وَّلَا شُكُوْرًا ۝ شکُور، دخول، جروح قبول سب مصدر ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ خیرات کا کچھ مال کسی کے گھر بھیجتی تھیں پھر واپسی کے بعد قاصد سے پوچھتی تھیں ان گھر والوں نے کیا کہا اگر قاصد کہتا کہ آپ کیلئے دعا کی تھی تو ام المومنین بھی ان کو ویسی ہی دعا دیتی تھیں تاکہ خیرات خالص اللہ واسطے باقی رہے (یعنی اجر آخرت کیلئے باقی رہے۔ دنیوی کوئی اجر اس سے حاصل نہ ہو یہاں تک کہ اس کے عوض کلمہ دعائیہ بھی نہ ملے)

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا اَطْعَامُ کی پہلی علت لِوَجْهِ اللّٰهِ تھی اور یہ دوسری علت ہے گویا حرف عطف اور حرف جر کو حذف کر کے لِوَجْهِ اللّٰهِ پر عطف کر دیا گیا ہے اصل کلام یوں تھا نُطْعِمُكُمْ طَمَعًا وَ خَوْفًا مِنَ اللّٰهِ یعنی اللہ کی خوشنودی اور ثواب کی طلب میں اور اللہ کے عذاب و غضب کے خوف سے ہم تم کو کھانا کھلاتے ہیں۔ مِنْ رَّبِّنَا کا معنی ہے من عذاب ربنا یعنی ہم اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ اس دن کے عذاب سے جو عَبُوس اور قَمْطَرِیر ہوگا عبوس ترشرو تیوری پر بل ڈالے ہوئے آدمی۔ یہ یوم کی صفت مجازاً ہے جیسے نهاره صائم اس کا دن روزہ دار ہے یعنی وہ دن میں روزہ دار ہے (پس دن کے تیوری پر بل پڑنے کا معنی ہوا کہ اس دن غم و رنج کی وجہ سے سب لوگ ترش رو ہوں گے) قمطریر سخت ترشرو۔ کلبی کا یہی قول ہے۔ اخفش نے کہا سب سے زیادہ سخت اور طویل دن۔ قاموس میں ہے قمطریر کا معنی ہے شدید اقمطر شدید ہو گیا اقمطر نسفه اس نے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ فابیٰ ہے یعنی ابراء چونکہ اللہ سے ڈرتے اور عذاب آفریں اعمال سے بچتے تھے اس لئے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا۔ واقعہ اگرچہ مستقبل سے تعلق رکھتا ہے (آئندہ ہوگا) مگر یقینی الوقوع ہے اس لئے مستقبل کی تعبیر ماضی کے صیغہ سے کر دی (گویا ایسا ہو گیا)۔

شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ شر سے مراد مکروہات

وَلَقّٰىهُمْ اور بجائے ترشروئی (اور بدنمائی) کے ان کو عطا فرمائیگا

نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ چہرہ کا حسن اور دل کی خوشی

وَجَزٰىهُمْ اللہ خود ان کو جزا دیگا دوسرے سے جزا نہیں طلب کی جائے گی۔

بِمَا صَبَرُوْا ان کے صبر رکھنے کی۔ یعنی اللہ کی اطاعت پر اور گناہوں سے پرہیز رکھنے پر اور مسکین کو کھانا کھلانے کے وقت اپنی بھوک پر اور جہاد میں شہید ہونے پر اور خیرات دیتے وقت خود دکھ اٹھانے پر صبر رکھنے کے بدلے میں اللہ ان کو عطا فرمائے گا۔

جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ جنت جس میں وہ داخل ہوں گے اور ریشمی لباس جو ان کو پہنایا جائے گا۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ مُتَّكِئِينَ حال ہے یعنی جنت کے اندر مسہریوں پر دہ تکیے لگائے ہوں گے۔ اَرَائِک پردہ والی مسہریاں حضرت ابن عباس نے فرمایا صرف پلنگ بغیر پردے اور چھتری کے اور صرف چھتری پردہ بغیر پلنگ کے اَرَائِک نہیں کہلاتا پلنگ مع چھتری اور پردہ کے ہو تو اَرَائِک کہلاتا ہے۔ بیہقی

لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ قاموس میں ہے۔ زَمْھَرِیر چاند کی سخت سردی از مہرت الکواکب ستارے چمکنے لگے۔ زَمْهَرِیْر سے مراد یا سخت سردی اور شمس سے مراد گرمی ہے یعنی جنت کے اندر نہ گرمی ہو گی نہ سردی بلکہ ہمیشہ معتدل ہوا رہے گی۔

ابن مبارک نے بیان کیا اور عبداللہ بن احمد نے بھی زوائد میں تخریج کی ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا جنت سکون بخش ہے نہ اس میں گرمی ہے نہ سردی۔ یا زمہریر سے مراد ہے چاند یا چمکتے ستارے اس وقت یہ مطلب ہو گا کہ جنت خود روشن ہے نور رب سے منور ہے اس کو نہ سورج کی ضرورت ہے نہ چاند کی۔ شعیب بن جیجان نے بیان کیا میں ابو العالیہ ریاحی کے ساتھ سورج نکلنے سے پہلے باہر نکلا ابو العالیہ نے فرمایا جنت کی اسی طرح نسبت کی جاتی ہے پھر آیت وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ پڑھی۔ بیہقی۔

میں کہتا ہوں کہ ابو العالیہ کی مراد نور صبح سے جنت کی تشبیہ دینا نہیں ہے صبح کا نور تو ضعیف ہوتا ہے جس میں تاریکی مخلوط ہوتی ہے بلکہ اس امر میں تشبیہ دینی مقصود ہے کہ (جس طرح) صبح کی روشنی پھیلتی جاتی ہے منقطع نہیں ہوتی (اسی طرح جنت کی روشنی روبترقی ہو گی منقطع نہیں ہو گی) [۱]

وَدَانِيَةً یعنی قریب۔ اس کا عطف مُتَّكِئِينَ پر ہے یا لَا يَرَوْنَ کے محل پر یعنی وہ قریب ہی دیکھیں گے یا جَنَّةً پر عطف ہے اور موصوف محذوف ہے یعنی ایک اور جنت اللہ عطا فرمائے گا جس کے سائے قریب ہوں گے (گویا دو جنتیں عطا فرمائی جائیں گی) جیسا کہ ایک اور آیت میں آیا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ لیکن یہ موخر الذکر تاویل ضعیف ہے کیونکہ اس توجیہ کا اقتضاء ہے کہ پہلی جنت کے سائے قریب نہوں تقسیم شرکت کے منافی ہے۔

عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا یعنی ان سے جنت کے سائے قریب ہوں گے۔

وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾ ذُلِّلَتْ، ظِلَالُهَا سے حال ہے یا دَانِيَةً پر معطوف ہے جیسے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا میں جعل کا عطف خالق پر ہے یا دَانِیَۃً کے ذوالحال سے حال ہے اور ذوالحال کی طرف راجع ہونے والی ضمیر محذوف ہے یعنی ذُلِّلَتْ لَهُمْ۔ قُطُوْف سے مراد ہیں پھل یعنی جنت کے پھل بڑے سہل الحصول ہوں گے اہل جنت جس طرح چاہیں گے توڑیں گے کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ حضرت براء بن عازب نے فرمایا کہ جنتی جنت کے پھل جس طرح چاہیں گے (توڑ کر) کھائیں گے کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر۔ بیہقی اور سعید بن منصور۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ اَكْوَاب بغیر دستے کے آفتابے۔ ہناد نے مجاہد کا یہی قول نقل کیا ہے۔

كَانَتْ قَوَارِيْرَا ﴿۱۵﴾ کَانَتْ اگر فعل تام ہو گا تو قَوَارِيْرًا کو حال کہا جائیگا یعنی وہ کوزے بنے ہوئے ہیں اور مثل بلور کے ہیں اور کَانَتْ کو اگر فعل ناقص کہا جائے تو قواریر اس کی خبر ہو گا یعنی وہ کوزے صفائی میں بلوری جام کی طرح ہیں ابن جریر نے بسند عوفی حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ چاندی کے برتن ہیں جن کی صفائی شیشوں کی طرح ہے۔ سعید بن مسعود بن عبدالرزاق نے اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ اگر دنیا کی چاندی لے کر تم اس کا باریک ورق مکھی کے پر کی طرح بھی بنالو تب بھی دوسری طرف کا پانی اس میں سے نظر نہیں آئیگا۔ لیکن جنت کی برتن کی سفیدی مثل چاندی کے اور صفائی شیشوں کی طرح ہو گی۔

---

[۱] ممکن ہے نور صبح سے تشبیہ انبساط کے علاوہ اس وجہ سے بھی ہو کہ صبح کی روشنی میں نہ تکلیف دہ سردی ہوتی ہے نہ ناگوار گرمی بلکہ ایک خوشگوار فرحت آفریں اہتزازی کیفیت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

قَوَارِيْرَا۟ اول قَوَارِيْرَ سے بدل ہے۔ ابن ابی حاتم کی دوسری روایت ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جنت میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ تم کو دنیا میں اس کے مشابہ چیز نہیں دی گئی ہو جنت کے قَوَارِيْرَ فضة کے مشابہ دنیوی قواریر ہیں۔ کلبی کا قول ہے کہ اللہ نے ہر قوم کے بلوری برتن انہی کے ملک کی مٹی سے پیدا کئے اور جنت کی زمین چاندی کی ہے اس لئے وہاں کی چاندی کے بلوری برتن ہوں گے جن سے اہل جنت پئیں گے۔

مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا﴿۱۶﴾ یعنی اہل جنت کی سیرابی کے اندازہ کے مطابق پلانے والے خادم (غلمان) کوزوں کی مقدار مقرر کرلیں گے نہ سیرابی کی ضرورت سے مقدار زیادہ ہوگی نہ کم۔

فریابی نے حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے شیخ اجل مولانا یعقوب کرخیؒ نے فرمایا شاید اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ ارواح میں معرفت الٰہی کی جتنی استعداد ہوگی اسی کی مقدار کے موافق کوزوں کی مقدار ہوگی۔ ہناد نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ تقدیر اکواب کا یہ معنی ہے کہ وہ نہ اتنے لبریز ہوں گے کہ چھلک جائیں نہ کناروں سے کم۔ یا یہ مطلب ہے کہ اہل جنت خود اپنے دلوں میں ایک اندازہ مقرر کرلیں گے اور ان کے اندازہ کے موافق کوزے ان کے سامنے آئیں گے یا یہ معنی کہ نیک اعمال کے اندازہ کے موافق کوزے ان کو ملیں گے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا يُطَافُ عَلَيْهِمْ پر عطف ہے كَاْسًا سے مراد یا حقیقۃً مشروب ہے یا کاس بول کر مشروب مجازاً مراد لیا گیا ہے جیسے جری النہر نہر جاری ہوگئی یعنی پانی۔

كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا﴿۱۷﴾ یہ کاس کی صفت ہے۔ سونٹھ کی آمیزش والی شراب۔ عرب کے ذوق کیلئے بہت لذیذ ہوتی تھی اللہ نے بھی (انہی کے ذوق کے اعتبار سے) وعدہ فرمایا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے جنت کی جن چیزوں کا تذکرہ قرآن میں کیا ہے اور جو نام ذکر کئے ہیں ان کی مثال دنیا میں نہیں۔ بعض کا قول ہے کہ زنجبیل جنت کے ایک چشمے کا نام ہے جس کے پانی میں سونٹھ کا مزہ ہوگا۔ قتادہ نے کہا جنتی چشمہ کا پانی اہل قربت کو بغیر آمیزش کے ملے گا اور باقی اہل جنت کو آمیزش کے بعد۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ نے كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا بھی فرمایا اور كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا بھی فرمایا یہ اختلاف پینے والوں کی طبعی خواہش کے پیش نظر ہوگا گرم مزاج والوں کو مشروب کی خنکی پسند ہوتی ہے ان کو ایسی شراب مرغوب ہوتی ہے جس میں کافور کی آمیزش ہو اور سرد مزاج والوں کو گرم مشروب پسند ہوتا ہے اس لئے ان کو ایسا مشروب مرغوب ہوتا ہے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو ہر شخص کی رغبت خاطر جدا جدا ہے۔

عَيْنًا فِيْهَا اگر زنجبیل کو چشمہ کا نام کہا جائے تو عَيْنًا اس سے بدل ہوگا ورنہ کاسا سے بدل ہوگا اور مضاف محذوف ہوگا یعنی مشروعین۔

تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا﴿۱۸﴾ اس چشمہ کا نام سَلْسَبِيْل ہے۔ جو مشروب آسانی کے ساتھ حلق میں اتر جائے اور خوشگوار ہو وہ سَلْسَبِيْل ہے۔ سلسل سلسالا سَلْسَبِيْلًا (آسانی اور خوشگواری کے ساتھ حلق میں اتر گیا) بعض لوگوں کا قول ہے کہ سلسبیل میں باء زائد ہے (اصل لفظ میں سلسیل یعنی پانچ حرف ہیں) زجاج نے سلسبیل کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اہل جنت اس (چشمہ) کو جدھر چاہیں گے بہا کرلے جائیں گے وہ ان کی مرضی کا تابع ہوگا اس لئے اس کو سلسبیل کہا گیا ہے۔ مقاتل اور ابو العالیہ نے کہا کہ وہ چشمہ اہل جنت کے راستے میں اور ان کے گھروں میں رواں ہوگا۔ زیر عرش سے جنت عدن کے اندر سے پھوٹ کر نکلے گا اور جنت والوں تک پہنچے گا۔ جنت کی شراب میں کافور کی خنکی سونٹھ کا مزہ اور مشک کی خوشبو ہوگی۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ وِلْدَانٌ غلمان جن کو اہل جنت کی خدمت کیلئے اللہ پیدا کرے گا یا کافروں کے نابالغ بچے جن کو اہل جنت کا خادم بنایا جائے گا۔

مُّخَلَّدُوْنَ ۚ یعنی نہ مریں گے نہ بوڑھے ہوں گے۔

اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ⑲ غلمان اہل جنت کی خدمت کیلئے منتشر ہوں گے اور منتشر موتیوں کی طرح دکھائی دیں گے۔ غلمان کی صف بندی وجہ شبہ نہیں ورنہ پروئے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ابن مبارک اور ہناد اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ لونی جنتی وہ ہوگا جس کی خدمت میں ایک ہزار خادم لگے ہوں گے اور ہر خادم کا کام دوسرے خادم کے کام سے جدا ہوگا۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ سب سے کم درجہ کے جنتی کے سر کے پیچھے دس ہزار خادم (خدمت کیلئے) کھڑے ہوں گے۔ ابن ابی الدینا نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ سب سے کم مرتبہ والا جنتی وہ ہوگا جس کے پاس خدمت کیلئے صبح و شام پانچ ہزار خادم آئیں گے اور ہر خادم کے پاس (کھلانے پلانے کیلئے) ایسا برتن ہوگا جو دوسرے خادم کے پاس نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ابن المنذرؒ نے بروایت عکرمہ بیان کیا کہ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کی ٹہنیوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور پہلو پر نشان پڑ گئے تھے یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ رو دیئے۔ ارشاد فرمایا کیوں روتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کسریٰ اور اس کی حکومت، ہرمز اور اس کی حکومت، شاہ حبشہ اور اس کی حکومت کا ذکر کیا اور عرض کیا آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور کھجور کی ٹہنیوں کی چٹائی پر تشریف فرما ہیں۔ فرمایا کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ ان کیلئے دنیا ہے اور ہمارے لئے آخرت۔ اس پر اللہ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَاِذَا رَاَيْتَ رَاَيْتَ فعل متعدی قائم مقام لازم کے ہے فعل محذوف ہے۔

ثَمَّ وہاں یعنی جنت میں۔ یہ رَاَيْتَ کا ظرف مکان ہے۔

رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ⑳ (نعیما میں تنوین تکثیر ہے یعنی) بڑی راحت، حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ کم ترین مرتبہ والا جنتی وہ ہوگا جو اپنے باغات کو بیویوں کو خادموں کو اور تختوں (مسہریوں) کو ہزار برس (اور ایک روایت میں ہے دو ہزار برس) کی راہ کی مسافت سے دیکھے گا اور اس کو (اپنی آخری حدود کا) آخری کنارہ اسی طرح نظر آئے گا جس طرح قریب ترین حصہ نظر آئیگا۔ مُلْكًا كَبِيْرًا کی تشریح میں کہا گیا ہے۔ لازوال حکومت ہوگی۔ فرشتے آکر سلام کریں گے اور باریابی کی اجازت کے خواستگار ہوں گے جنت کے اندر اہل جنت کو وہ سب کچھ ملے گا جو ان کی خواہش ہوگی۔ رب جلیل کو بھی دیکھیں گے۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ ثِيَابُ مبتداء ہے یا خبر ہے یا عالیہم کا فاعل ہے لفظ سُنْدُس معرب ہے:

ایک قسم کا باریک ریشمی دیبا ہوتا ہے۔ (قاموس)

خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ز موٹی ریشمی دریائی، استبرہ کا معرب ہے یا زربفت یا دیبا (دریائی) کی طرح کوئی ریشمی دبیز کپڑا ہوتا ہے۔ قاموس۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جنتیوں کے کپڑوں کے متعلق ارشاد فرمایئے کیا وہ کوئی پیدا ہونے والی چیز ہے جس کی تخلیق کی جائے گی یا بننے والی چیز ہے جس کو بنایا جائیگا فرمایا نہیں وہ ایسی چیز ہے جو جنت سے پھوٹ کر نکلے گی وہ جنت کا ایک پھل ہے۔ رواہ النسائی والبزار والبیہقی بسند جید۔ حضرت جابرؓ کا قول مروی ہے کہ جنت میں ایک درخت سے سندس پیدا ہوگا جس سے اہل جنت کے کپڑے (تیار) ہوں گے رواہ البزار والطبرانی وابو یعلی بسند صحیح۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس (مرد) نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہ پہنے گا۔ نسائی اور حاکم نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہے اس میں اتنا زائد ہے کہ جس نے دنیا میں شراب پی وہ آخرت میں نہیں پیے گا اور جس نے سونے چاندی کے برتنوں میں دنیا میں کچھ کھایا پیا وہ آخرت میں سونے چاندی کے برتنوں میں پینے سے محروم رہے گا

صحیحین میں حضرت عمرؓ کی روایت کی طرح حضرت انسؓ اور حضرت زبیر سے بھی حدیث مروی ہے اور حضرت ابو سعید خدری سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے مگر اس روایت میں اتنا زائد ہے اگر وہ جنت میں داخل ہو بھی جائے گا تو ریشم تب بھی نہیں پہنے گا ابو داؤد نے صحیح سند سے اس کو بیان کیا ہے نسائی ابن حبان اور حاکم بھی اس کے ناقل ہیں۔

وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ یہ یَطُوْفُ عَلَیْہِمْ پر معطوف ہے یا عَالِیَہُمْ کی ضمیر سے حال ہے اور قَدْ محذوف ہے۔ اَسَاوِرَ سے پہلے حرف جر محذوف ہے۔ من فضۃ میں مِنْ بیانیہ ہے یعنی اہل جنت کو چاندی کے کنگنوں سے آراستہ کیا جائے گا۔ دوسری آیت میں اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ آیا ہے۔ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ ان دونوں آیات میں تعارض نہیں ہے ہو سکتا ہے دو قسم کے پہنائے جائیں یا ایک کے بعد دوسرے پہنائے جائیں یا کسی کو کوئی اور کسی کو کوئی پہنائے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اساور کو خادموں کی حالت کا بیان قرار دیا جائے اس وقت خادموں کے کنگن چاندی کے ہوں گے اور اہل جنت کے سونے کے اور ایک کنگن چاندی کا دوسرا موتیوں گا۔

ابو الشیخ نے العظمۃ میں کعب احبار کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کا ایک فرشتہ اہل جنت کیلئے زیور آغاز فرینش سے بنا رہا ہے اور قیامت بپا ہونے تک بناتا رہے گا اور اہل جنت کا کوئی ایک زیور بھی نمودار ہو جائے تو سورج کی روشنی (پر غالب آجائے) جاتی رہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کے (ہاتھ کے) زیور وہاں تک پہنچیں گے جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا (یا پہنچتا ہے) نسائی اور حاکم نے حضرت عقبہ بن عامر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے اگر تم جنت کا زیور اور ریشمی لباس پسند کرتے ہو تو دنیا میں اس کو نہ پہنو۔

وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ تمام گندگیوں سے اور ہاتھوں کے چھونے سے پاک۔ ابو قلابہ اور ابراہیم کا قول ہے کہ جنت کی شراب اہل جنت کے بدن میں ناپاک پیشاب نہیں بن جائے گی بلکہ پسینہ بن جائے گی جس کی خوشبو مشک کی طرح ہو گی اس کی صورت یہ ہو گی کہ پہلے کھانا دیا جائے گا پھر شراب طہور دی جائیگی شراب پینے سے ان کے پیٹ پاک ہو جائیں گے اور جو کچھ کھایا ہو گا وہ پسنہ بن کر جلد بدن سے خارج ہو جائیگا جس کی خوشبو خالص مشک جیسی ہو گی (پسینہ آنے کے بعد) پھر کھانے کی خواہش لوٹ آئیگی۔

مقاتل نے کہا جنت کے دروازہ پر پانی کے ایک چشمہ کا نام طہور ہے جو شخص اس کا پانی پئے گا اللہ اس کے دل سے ہر طرح کا کینہ اور حسد نکال دے گا۔

بیضاوی نے کہا ان اقوال سے بہتر وہ قول ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ یہاں شراب کی ایک اور خاص قسم مراد ہے جو دونوں مذکورہ اقسام سے اعلیٰ ہے اسی کو عطا فرمانے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے اور اسی کو طہور فرمایا ہے کیونکہ اس کو پینے والا تمام حسی لذتوں کی طرف میلان اور غیر اللہ کی رغبت سے پاک ہو جاتا ہے صرف جمال ذات کا معائنہ کرتا اور دیدار الٰہی سے لذت اندوز ہوتا ہے یہ درجہ ثواب ابرار کا آخری درجہ اور صدیقین کے ثواب کا ابتدائی مرتبہ اور مبداء ہے۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ فرشتے اہل جنت کو شراب پیش کریں گے مگر وہ قبول کرنے سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے درمیانی وسائل سے تو ہم مدت دراز سے لیتے ہی رہے ہیں (اب تو براہ راست لیں گے) اچانک غیب سے بغیر ہاتھوں کی وساطت کے پیالے منہ سے لگ جائیں گے۔ اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابن ابی الدنیا نے جید سند کے ساتھ نقل کی ہے کہ حضرت ابو امامہ نے فرمایا جنتی آدمی شراب کی خواہش کرے گا شراب فوراً اس کے ہاتھ میں آجائیگی وہ پی لیگا پینے کے بعد پیالہ لوٹ کر اپنی جگہ چلا جائیگا شیخ یعقوب کرخی نے فرمایا کہ سابقین مقربین کو زیریں عرش سے بغیر کسی درمیانی ذریعہ کے شراب ملیگی اور درمیانی درجہ والوں کو یعنی ابرار کو فرشتے دینگے باقی اہل جنت کو یعنی ان لوگوں کو جو گناہوں کی بخشش کے بعد یا سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخل ہوئے ہوں گے غلمان شراب پیش کریں گے۔ میں کہتا ہوں ان آیات میں تو ابرار کے احوال کا

تذکرہ ہے اس لئے ممکن ہے کہ کبھی ان کے غلمان کے ذریعہ سے کبھی ملائکہ کے ذریعہ سے اور کبھی بغیر کسی ذریعہ کے شراب دی جائے البتہ اہل قربت کو اکثر بغیر واسطہ کے دیجائیگی۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً یہ راحت تمہارے اعمال کے عوض ہے۔

وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ مشکور کا معنی مقبول پسندیدہ۔ ستائش کے لائق۔ قابل ثواب۔ اللہ کی طرف سے یہ قول گویا ان کے حسن اعمال کا شکریہ ہوگا کیونکہ وہ یتیموں اور مسکینوں سے شکریہ کے طالب نہیں تھے۔ میں کہتا ہوں اللہ نے اپنی مہربانی سے جنت کی نعمتوں کو ابرار کے اعمال کی جزا قرار دیا ورنہ آدمی کا کون سا عمل اس قابل ہو سکتا ہے کہ اسکی جزا جنت ہو (یعنی کوئی نیکی جنت کا مستحق نہیں بنا سکتی نہ خدا م پر لازم ہے کہ وہ نیکوں کو جنت عطا فرمائے بلکہ اس نے اپنی مہربانی سے نیکی کے عوض جنت دینے کا وعدہ فرمالیا ہے)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ حضرت ابن عباس نے فرمایا مراد یہ ہے کہ آیت آیت کر کے قرآن نازل کیا ایک دم مجموعہ نازل نہیں کیا۔ نَحْنُ مسند الیہ (مبتدا) ہے نَزَّلْنَا خبر فعلی ہے جملہ کو ان سے شروع کیا ہے نَزَّلْنَا خود جمع متکلم ہے لیکن نَحْنُ کا اس پر اضافہ کر کے فاعل کی طرف فعل کی اسناد کو مکرر کر دیا یہ طرز کلام کلام کو بہت موکد کر دیتا ہے اس میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تفریق کے ساتھ قرآن کو نازل کرنے ہی میں حکمت اور مصلحت ہے (یکدم مجموعہ نازل کرنے سے وہ مصلحت اور فائدہ حاصل نہیں ہوتا) پھر فعل کی نسبت اپنی طرف مکرر کرنے سے اختصاص کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے (کہ ہم نے ہی نازل کیا کسی دوسرے نے نہیں یہ فعل ہمارا ہی ہے) اور حکیم کا فعل پر از حکمت ہوتا ہے (خدا حکیم ہے اس کا یہ فعل حکمت سے خالی نہیں)

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فاء سببی ہے (ف سے پہلے کا کلام بعد والے کلام کا سبب ہے) یعنی جب تم نے نیکوں اور بدوں کا حال اور سزا جزا کی تاخیر کا سبب جان لیا تو کافروں کی طرف سے پہنچنے والے دکھ پر صبر کرو ان کو عذاب دینے کی جلدی نہ کرو کافروں پر تمہارے فتحیاب ہونے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس سے رنجیدہ نہ ہو اور جب تم جانتے ہو کہ قرآن خدا ہی نے نازل فرمایا ہے تو اس کے تشریعی احکام پر صبر رکھو۔

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ یعنی فتحیابی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے تنگدل ہو کر کافروں میں سے کسی اٰثِمٌ یا کَفُوْرٌ کے کہنے پر نہ چلو۔ اٰثِمٌ سے مراد وہ گناہ گار جو گناہ کی طرف چلانے والا ہے خواہ وہ گناہ کفر نہو۔ کفور سے مراد وہ کافر جو کفر کی طرف بلانے والا ہے۔

ایک شبہ

(آیت مذکورہ کے مضمون سے سطحی نظر رکھنے والے کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اٰثِمٌ یا کفور کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے یعنی اختیار دیا گیا ہے کہ اٰثم کی اطاعت مت کرو یا کفور کی اطاعت مت کرو دونوں میں سے کسی ایک کی اطاعت مت کرو یعنی ایک کا کہنا مت مانو دوسرے کا مانو)

ازالہ

اٰثِمًا اور كَفُوْرًا دونوں نکرہ ہیں جو نفی (لَا تُطِعْ) کے زیر عمل ہیں اس لئے ممانعت میں عموم مستفاد ہو رہا ہے یعنی کوئی گناہ کی دعوت دے یا کفر کی یا دونوں کی تم کسی کی اطاعت نہ کرو۔ اگر بجائے اَوْ کے آیت میں واؤ ہوتا تو یہ مطلب ہو جاتا کہ اس شخص کی اطاعت نہ کرو جو تم کو اثم اور کفر دونوں کی دعوت دیتا ہو۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تنہا اثم یا صرف کفر کی دعوت دینے والے کی اطاعت نہ کرو۔

آیت کا اقتضاء

آیت سے اقتضاء ثابت ہے کہ اگر کوئی کافر کسی ایسے امر کی دعوت دے جو نہ گناہ ہو نہ کفر تو اسکی اطاعت جائز ہے۔
بعض اہل تفسیر نے کہا کہ آیت میں اَوْ بمعنی واؤ ہے اور آثم و کفور دونوں سے مراد ابو جہل ہے واقعہ یہ ہوا کہ جب نماز فرض ہوئی تو ابو جہل نے حضور کو نماز سے روکا اور کہا اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اس کی گردن توڑ دوں گا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ رواہ عبد الرزاق وابن المنذر وابن جریر عن قتادہ۔
مقاتل نے کہا کہ آثم سے مراد ہے عتبہ بن ربیعہ اور کفور سے مراد ہے ولید بن مغیرہ۔ دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اگر عورتوں کے اور مال کیلئے کر رہے ہو تو اس سے باز آجاؤ عتبہؓ نے کہا میں تم سے اپنی بیٹی کا نکاح بغیر مہر کے کر دوں گا اور ولید نے کہا میں تم کو تمہاری پسند کے موافق مال دے دوں گا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ذکر سے مراد ہے نماز۔ ذکر نماز کا جزو ہے اور جز بول کر (مجازاً) کل مراد لے لیا جاتا ہے (بشرطیکہ جزء اہم ہو) تکبیرہ تحریمہ نماز کا رکن ہے (اس لئے اہم جز ہے) یا یوں کہا جائے کہ نماز کا ہر عمل اور ہر قول ذکر ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس نماز میں کوئی حصہ انسانی کلام کا نہیں یہ صرف تسبیح تکبیر اور قرات قرآن ہے۔ رواہ مسلم من حدیث معاویۃ بن الحکم۔

بُكْرَةً دن کا شروع حصہ۔ اس سے مراد فجر کی نماز ہے۔

وَأَصِيلًا ﴿۲۵﴾ دن کا پچھلا حصہ۔ اس سے مراد ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ سجدہ سے مراد نماز ہے اور اس سے مغرب اور عشاء کی نمازیں مراد ہیں چونکہ رات کی نمازوں میں تکلیف زیادہ برداشت کرنی ہوتی ہے اس لئے مِنَ اللَّيْلِ کو فَاسْجُدْ سے پہلے ذکر کیا۔ فَاسْجُدْ میں فاء زائد ہے اور امّا شرطیہ مقدر ہے اصل کلام یوں تھا وَاَمَّا مِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ۔

وَسَبِّحْهُ لَيْلًا تسبیح سے مراد ہے نماز یعنی نماز شب۔

طَوِيلًا ﴿۲۶﴾ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی تَسْبِيحًا طَوِيلًا اس سے مراد ہے آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ مکہ کے کافر، دار عاجلہ یعنی دنیا کو چاہتے ہیں۔

وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ اور اپنے آگے یا پس پشت چھوڑ دیتے ہیں۔

يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿۲۷﴾ بھاری دن یعنی سخت دن۔ ثقیل اصل میں سخت دشوار کام ہوتا ہے مجازاً ان کو ثقیل کہہ دیا گیا (یعنی اس روز امر اتنا بھاری ہوگا کہ گویا وہ دن بھاری ہو جائے گا) اِنَّ هٰؤُلَاءِ يُحِبُّوْنَ الخ پورا جملہ ممانعت اطاعت کی علت ہے۔
مطلب یہ کہ کفار مکہ تو خطاکار ہیں یہ جو کچھ کرتے ہیں دنیا کیلئے کرتے ہیں ان کو آخرت کی پرواہ نہیں اسلئے تم ان کے کہنے پر نہ چلو۔

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ ہم نے ہی ان کی بناوٹ کر اور جوڑ جوڑ کی بندش مضبوط کی ہے۔
وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿۲۸﴾ اور ہم جب چاہیں گے ان جیسی بناوٹ اور بندش مفاصل والے دوسرے لوگ ان کی جگہ لے آئیں گے۔
تَبْدِيلًا مفعول مطلق تاکید کیلئے ہے وَاِذَا شِئْنَا جملہ شرطیہ ہے اس کا عطف شَدَدْنَا پر ہے اور نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ یعنی اس پورے کلام سے کافروں کی مذمت کا اظہار مقصود ہے کہ انہوں نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے مقابلے میں ناشکری کی۔ تخلیق اور طاقت بخشی کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اسلئے کیا کہ تمام نعمتوں کی بنیاد یہی ہے۔ اِذَا شِئْنَا کے جملہ سے رسول اللہ

ﷺ کو اذیت کفار پر تسکین بخشی مقصود ہے اور کافروں کو تباہی اور ہلاکت کی دھمکی ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو قائم کر دینے کی وعید آمیز اطلاع ہے چنانچہ بدر کی لڑائی میں ان کو ہلاک بھی کر دیا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ اِذَا اس جگہ بمعنی اِنْ (محض فرض کیلئے) ہے یعنی اگر اللہ چاہے گا تو تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا لیکن اس کی مشیت نہیں ہوئی (اس لئے اس نے عام طور سے کفار مکہ کو تباہ نہیں کیا)

اِنَّ هٰذِهٖ یہ سورت یا یہ آیات۔

تَذْكِرَةٌ نصیحت اور یادداشت ہیں جو اللہ تک پہنچنے کا راستہ اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ بتاتی ہیں۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ اب جو اللہ کی قربت اور اس کے راستے پر چلنا چاہے وہ رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرے یعنی اس کی طاعت کرے ہمیشہ اس کی یاد کرے اور دل سے خلوص رکھے اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ یعنی اے لوگو! یا اے کافرو! تمہاری مشیت راہ خدا پر چلنے کے متعلق ہو یا کسی اور چیز کے متعلق کسی وقت بھی اس کا وجود نہیں ہو سکتا مگر اسی وقت تمہاری مشیت کا وجود ہو گا جب خدا کی مشیت تمہاری مشیت کے وجود کی ہو (یعنی تمہاری مشیت خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی تمہاری مشیت کی ہستی اور تخلیق اللہ کی مشیت پر موقوف ہے)

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام بنی آدم کے دل ایک دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے اس کو پھیر دیتا ہے اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا اے اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنی طاعت پر موڑ دے۔ (مسلم)

چونکہ مومنوں کو ہدایت یاب کرنے کی اللہ کی مشیت تھی اس لئے اس کی مشیت کے موافق اہل ایمان نے اس کی راہ اختیار کی اور کافروں کو ہدایت یاب کرنے کی اس کی مرضی نہ تھی اس لئے اس نے کافروں کو راہ حق پر چلانا نہ چاہا۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا اللہ ہر شخص کی اہلیت سے خوب واقف ہے اس لئے ہر شخص کو وہی دیتا ہے جس کا وہ اہل ہوتا ہے۔ یہ آیت چاہتی ہے کہ انسانوں میں خیر و شر کی قابلیت پہلے سے ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تعین مومن کا مبداء اللہ کا اسم ہادی ہے اور تعین کافر کا مبداء اللہ کا اسم مضل۔

حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ اللہ حکیم ہے تقاضائے حکمت کے مطابق اس کی مشیت ہوتی ہے۔

يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِىْ رَحْمَتِهٖ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنی جنت میں داخل کرتا ہے رحمت سے مراد ہے جنت کیونکہ آخرت میں جنت ہی محل رحمت ہے۔ رحمت میں داخل کرنے کی مشیت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ دل میں ایمان اور یقین ڈال دیتا ہے اور سر میں اپنی محبت پیدا کر دیتا ہے اور طاعت کی توفیق دے دیتا ہے اور اطاعت پر قائم رکھتا ہے اور کفر و معصیت سے نفرت پیدا کر دیتا ہے۔

وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾ الظالمین فعل محذوف کا مفعول ہے اس کا عطف يُدْخِلُ پر ہے اور دونوں جملوں سے مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے مضمون کی تاکید ہوتی ہے۔

واللہ اعلم

سورۃ الدھر ختم ہوئی بعونہ تعالیٰ

سورۃ المرسلات

یہ سورت مکی ہے اس میں پچاس آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ مقاتل کے نزدیک ان پانچوں سے مراد ملائکہ ہیں۔
المرسلات وہ ملائکہ جن کو امر و نہی (احکام تشریعی) لے کر بھیجا جاتا ہے۔ مسروق نے حضرت ابن مسعود کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ اس مطلب پر عُرْفًا مفعول لہ ہوگا (یعنی ارسال کی علت) یہ بھی احتمال ہے کہ عُرْفًا حال ہو اس وقت عُرْفًا کا معنی ہوگا پیہم۔ اس کا ماخذ عرف الفرس (گھوڑا پیہم دوڑا) ہوگا مراد یہ کہ ان ملائکہ کی قسم جن کو پیہم احکام دے کر بھیجا جاتا ہے۔ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا اور وہ عصر تک حکم کی تعمیل میں تیزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ عصف الریاح آندھی چلنا وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا اور اللہ کے احکام کو زمین پر پھیلاتے ہیں مراد یہ کہ اللہ کی طرف سے کتابیں اتارتے اور پھیلاتے ہیں اور ان احکام کے ذریعے سے ان مردہ نفوس کو جو جہالت کی وجہ سے مرچکے ہوتے ہیں زندہ کر دیتے ہیں۔ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا اور حق و باطل میں تفریق کر دیتے ہیں۔ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا اور انبیاء کے دلوں میں وحی کا القاء کرتے ہیں یا مومنوں کے دلوں میں ذکر خدا سے یقین پیدا کرتے ہیں۔

مجاہد و قتادہ نے کہا (پوری آیت میں) ہوائیں مراد ہیں اَلْمُرْسِلٰتِ عُرْفًا یعنی ان ہواؤں کی قسم جو پیہم چلائی جاتی ہیں۔ بعض اقوال میں عُرْفًا کا معنی کثیر بھی آیا ہے (یعنی وہ ہوائیں جو بکثرت چلائی جاتی ہیں) اَلْعٰصِفٰتِ عَصْفًا تیز چلنے والیاں۔ اَلنّٰشِرٰتِ بادلوں کو فضا میں اٹھا کر لانے والیاں اَلْفٰرِقٰتِ فَرْقًا بادلوں کو دبا کر نچوڑنے والیاں یا بارش کے بعد ابر کو پراگندہ کر دینے والیاں فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا دلوں میں یاد خدا پیدا کرنے والیاں ہوشمند جب ہوا کی رفتار دیکھتا ہے اور اس کے اٹھان کا مشاہدہ کرتا ہے تو اللہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کے کمال قدرت کا اعتراف کرتا ہے لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد بارش کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔ اسی طرح ہوائیں ذکر الٰہی کا سبب بن جاتی ہیں۔
یہ بھی احتمال ہے کہ آیات قرآن مراد ہوں آیات قرآن ہر امر معروف کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجی گئیں۔ اَلْعٰصِفٰتِ گزشتہ کتابوں اور ملتوں کو ان آیات نے منسوخ کر دیا گویا اڑا دیا۔ اَلنّٰشِرٰتِ مشرق اور مغرب میں ہدایت کے آثار پھیلائے۔ اَلْفٰرِقٰتِ حق و باطل میں امتیاز کر دیا۔ اَلْمُلْقِيٰتِ اللہ کی یاد کل جہان میں پیدا کر دی۔
یا نفوس انبیاء مراد ہیں جن کو مخلوق کی ہدایت رہنمائی اور احکام پہنچانے کیلئے بھیجا گیا۔ اَلْعٰصِفٰتِ نفوس انبیاء نے امتثال مامورات اور اجتناب ممنوعات میں جلدی کی اَلنّٰشِرٰتِ اور ہدایت کو پھیلایا اَلْفٰرِقٰتِ اور حق کو باطل سے جدا کیا۔ فَالْمُلْقِيٰتِ اور اللہ کی یاد امت کے دلوں میں اور زبانوں پر پیدا کر دی۔
عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾ یہ دونوں لفظ ذال کے سکون کے ساتھ مصدر ہیں عُذْرٌ بمعنی معذرت اور نُذْرٌ بمعنی انذار ڈرانا اور ذال کے ضمہ کے ساتھ جمع کے صیغے ہیں عُذُرٌ عذیر کی جمع اور نُذُرٌ نذیر کی جمع۔ عذیر اور نذیر یا تو بمعنی مصدر ہیں اول بمعنی معذرت اور دوئم بمعنی انذار یا بمعنی فاعل ہیں عذیر بمعنی عاذر۔ عذر پیش کرنے والا اور نذیر بمعنی منذر ڈرانے والا۔ اگر مصدر

کہا جائے تو (ارسال۔ عصف نشر فرق اور) القاء ذکر کی علت اور غرض کا بیان ہوگا یعنی مذکورہ (پانچوں) فعل اس غرض کی وجہ سے ہوتے ہیں کہ اہل ایمان اپنے گناہوں کو مٹانے کا عذر پیش کریں اور اہل کفر کو خوف پیدا ہو۔ اگر مذکورہ بالا آیات میں المرسلات وغیرہ سے ہوائیں مراد ہوں تو (ان کا مسلمانوں کیلئے درس معذرت ہونا تو ظاہر ہے البتہ) کافروں کیلئے سبب خوف بننے کی یہ صورت ہو گی کہ کافر ستاروں کی وجہ سے بارش ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اس لئے بارش لانے والی ہوائیں اس بداعتقادی کی وجہ سے ان کیلئے پیام عذاب ہوتی ہیں اگر ذکر سے وحی مراد ہو تو عُذْرًا اَوْ نُذْرًا کا نصب بدلیت کی وجہ سے ہوگا اور آیات قرآن مراد ہوں تو دونوں حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہوں گے۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ یہ جواب قسم ہے یعنی جس قیامت یا پاداش عمل کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور آئیگی بلاشک آئے گی۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ جب ستارے سیاہ کر دیئے جائیں گے ان کو بے نور کر دیا جائے گا۔ یہ جملہ شرطیہ ہے جواب محذوف ہے تو اس روز اہل جنت اور اہل دوزخ کو جدا جدا کر دیا جائے گا۔

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ جب آسمان پھاڑ دیئے جائیں گے ان میں شگاف ہو جائیں گے۔

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝ اور پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ دیا جائیگا۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝ ابو عمر کی روایت میں وُقِّتَتْ آیا ہے اُقِّتَتْ کی اصل بھی وُقِّتَتْ تھی یعنی پیغمبروں کو اپنی اپنی امتوں پر شہادت دینے اور یکجا ہونے کیلئے ظاہر کیا جائے گا (اور قبروں سے باہر لایا جائے گا)

لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ لِاَیِّ یَوْمٍ کا تعلق اُجِّلَتْ سے ہے یہ استفہام (نا معلوم چیز کو معلوم کرنے کیلئے نہیں ہے بلکہ) مجازا تعجب اور روز قیامت کی ہولناکی ظاہر کرنے کیلئے ہے۔ یعنی مذکورہ حوادث میں تاخیر کیوں ہے اور ان کے واقع ہونے کا کونسا وقت مقرر کیا گیا ہے۔

لِیَوْمِ الْفَصْلِ ۝ لِاَیِّ یَوْمٍ سے بدل ہے یعنی حوادث مذکورہ کی تاخیر و تاجیل فیصلہ کے دن کے لئے ہے۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ ۝ فعل تعجب اظہار تعجب کے لئے ہے یہ تعجب بالائے تعجب یوم الفصل کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ یَوْمُ الْفَصْلِ عظیم الشان چیز ہے تم کو اس کی حقیقت معلوم نہیں نہ اس کی مثل کوئی دن تم نے دیکھا۔

وَیْلٌ ویل مصدر ہے اصل میں اس کا معنی ہے تباہی اور خرابی پیدا ہو جانا یہ جملہ فعلیہ تھا، اور ویلا مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب تھا اور فعل محذوف تھا مفعول کی بجائے ویل کو بصورت مبتدا مرفوع لایا گیا تاکہ تباہی اور خرابی کے دوام پر دلالت ہو جائے (کیونکہ فعل سے عدول کر کے جملۂ اسمیہ کو ذکر کرنا ثبات و دوام فعل پر دلالت کرتا ہے) یہ جملہ بددعائیہ ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ویل جہنم میں ایک وادی ہے کافر اس کے اندر چالیس برس تک تلی تک پہنچے بغیر لڑکتا چلا جائے گا۔ احمد، ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم، بیہقی، ابن ابی الدنیا، ہناد، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ویل جہنم کے اندر ایک وادی ہے جس میں دوزخیوں کا کچ لہو بہتا ہوگا۔ اللہ نے مکذبین کے لئے اس کو مقرر فرمایا ہے۔ بیہقی۔ وابن منذر۔ حضرت نعمان بن بشیر کی روایت سے بھی ابن ابی حاتم نے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ عطا بن یسار نے فرمایا ویل جہنم کے کچ لہو سے بھری ہوئی ایک وادی ہے اگر پہاڑ بھی اس میں چھوڑ دیئے جائیں تو اس کی گرمی سے پگھل جائیں۔ بیہقی، ابن جریر، ابن مبارک۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ویل دوزخ میں ایک پہاڑ ہے۔ ابن جریر بزار نے ضعیف سند سے بروایت حضرت سعید بن ابی وقاص بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخ میں ایک پتھر ہے جس کو ویل کہا جاتا ہے

اس پر اہل عرافت (علم غیب کا مدعی اور غیب کی خبریں دینے والا ایک خاص گروہ عرب میں اہل عرافت کہلاتا تھا گویا عرافت ایک قسم کی کہانت تھی) چڑھیں گے اتریں گے۔

يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٥﴾ مذکورہ بالا حوادث کے دن ان لوگوں کے لئے ویل ہوگا جو روز فیصلہ کی تکذیب کرتے ہیں۔

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦﴾ کیا ہم نے عذاب سے گزشتہ زمانہ میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں کو ہلاک نہیں کر دیا جیسے قوم نوح، عاد، ثمود، وغیرہ یہ استفہام تقریری ہے (یعنی ضرور ہلاک کر دیا)

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ﴿١٧﴾ اَلْاٰخِرِيْنَ سے مراد ہیں مکہ کے کافر جو تکذیب انبیاء کے راستہ پر کفار سلف کی طرح چلتے تھے۔ یعنی پھر ان کفار سلف کے پیچھے ان دوسرے کافروں کو چلائیں گے (ان کو بھی ان کی طرح عذاب سے ہلاک کریں گے)

كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿١٨﴾ یعنی مجرموں کا ہم اسی طرح ستیاناس کر دیتے ہیں۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٩﴾ اللہ کی وعید کی تکذیب کرنے والوں کے لئے اس روز ویل ہے۔

أَلَمْ نَخْلُقكُّم مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ﴿٢٠﴾ استفہام تقریری ہے۔ مَّهِيْن سے مراد ہے۔ حقیر گندہ۔ یعنی نطفہ۔

فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿٢١﴾ قابل استقرار گڑھا یعنی رحم۔ اس جملہ کا عطف اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ کے مضمون پر ہے اور فَجَعَلْنَاهُ میں ف تفسیری ہے تعقیبی نہیں ہے (یعنی جملہ سابق کی تفصیل اور تشریح اس جملہ میں ہے ایسا نہیں ہے کہ فعل تخلیق کے بعد رحم میں استقرار نطفہ ہوتا ہے) اور اگر ف کو تعقیب کے لئے کہا جائے تو دونوں جملوں کی ترتیب معکوس ہو گی (یعنی استقرار نطفہ پہلے پھر تخلیق)

إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢٢﴾ یعنی ہم نے اس کو رحم میں رکھا۔ اتنے وقت تک جس کی مقدار عرفاً (عام لوگوں کو) معلوم ہے کم سے کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال۔ یا معلوم سے مراد ہے اللہ کو معلوم ہونا یعنی اس وقت تک اس کو رحم میں رکھا جس کی مقدار اللہ کو معلوم ہے

فَقَدَرْنَا ۖ نافع اور کسائی کی روایت میں فَقَدَّرْنَا ہے۔ یعنی ہم نے ماں کے پیٹ میں رہنے کا وقت پیدائش کا پیدا ہونے کے بعد اعمال زندگی مدت زندگی اور رزق کا اور آخرت میں نیک بخت اور بدنصیب ہونے کا ایک اندازہ مقرر کر دیا۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں ہر ایک کا تخلیقی قوام ماں کے پیٹ کے اندر چالیس روز تک بصورت نطفہ رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت میں بستہ خون ہوتا ہے پھر اتنی ہی مدت میں گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے پھر اللہ اس کے پاس فرشتہ کو چار باتوں کے لئے بھیجتا ہے فرشتہ اس کا آئندہ عمل اور مدت زندگی اور رزق اور شقی یا سعید ہونا لکھتا ہے پھر اس میں جان پھونکتا ہے پس قسم ہے خدا کی جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں کہ تم میں سے بعض لوگ جنت والوں کے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے مگر لکھا ہوا غالب آتا ہے اور وہ دوزخیوں کا عمل کرتے ہیں اور دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔ بخاری و مسلم، نافع اور کسائی کے علاوہ دوسروں نے فَقَدَرْنَا پڑھا ہے یعنی ہم اس کو ہست کرنے نیست کرنے اور دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہیں۔

فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ﴿٢٣﴾ یعنی ہر چیز پر ہم اچھے قادر ہیں۔ ممکن ہے کہ قادر بمعنی مُقَدِّر ہو (یعنی ہم اچھا اندازہ کرنے والے ہیں)۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٤﴾ ہماری قدرت کی تکذیب کرنے والوں کے لئے یعنی کافروں کے لئے وَیل ہے یا ہماری تقدیر کا انکار کرنے والوں کے لئے وَیل ہے۔ تقدیر کا منکر (اسلام میں) فرقہ قدریہ ہے جو امت اسلامیہ کا مجوسی ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ كِفَاتٌ یا صیغہ صفت ہے یعنی سمیٹنے والا جمع کرنے والا یا مصدر ہے اور

زمین کو کفات بطور مبالغہ کہا ہے یا کَافِت کی جمع ہے جیسے صیام صائم کی جمع ہے یا کفت کی جمع ہے اور کفت کا معنی ہے پورا کرنا۔ اگر کفات کو جمع کہا جائے تو زمین کو کفات قرار دینا زمین کے ٹکڑوں کے لحاظ سے ہوگا یعنی زمین کے قطعات کفات ہیں۔

اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا﴿۲۶﴾ مفعول محذوف ہے یعنی زندہ اور بے جان انسانوں کو۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ کفات کو صفت کا صیغہ قرار دیا جائے ورنہ فعل محذوف ہوگا یعنی زمین جمع رکھتی اور سمیٹتی ہے کچھ لوگوں کو اپنی سطح پر جو اپنے گھروں میں اور مکانوں میں ہوتے ہیں اور کچھ مردوں کو اپنے اندر۔ فراء نے کہا مفعول ہو (الناس) چونکہ معلوم تھا اس لئے حذف کر دیا گیا یہ بھی احتمال ہے کہ اَحْيَاءً اور اَمْوَاتًا مفعول ہو۔ ان دونوں کی تنوین ان کی عظمت شان پر دلالت کر رہی ہے۔ اور اگر تنوین تبعیض کے لئے ہو تو نکرہ لانے کی یہ وجہ ہوگی کہ زندہ مردہ انسان، دوسرے زندہ مردہ حیوانوں میں سے بعض ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اَحْيَاءً وَّاَمْوَاتًا نَجْعَلِ کا مفعول دوم ہو اور کِفَاتًا ان کی حالت کا بیان ہو ذوالحال کے نکرہ ہونے کی وجہ سے حال کو مقدم کر دیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلْاَرْض یا کِفَاتًا سے اَحْيَاءً و اَمْوَاتًا حال ہوں اس وقت اَحْيَاءً سے مراد ہوگی زمین سے پیدا ہونے والی چیز اور اَمْوَاتًا سے مراد ہوگی وہ چیز جس کا نمو نشو زمین سے نہیں ہوتا۔

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ زمین میں ہم نے اونچے پہاڑ بنائے جو زمین سے ابھرے ہوئے ہیں۔

وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا﴿۲۷﴾ صاف شیریں پانی۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴿۲۸﴾ ان نعمتوں کی تکذیب کرنے والوں کے لئے اس روز ویل ہے مقاتل نے کہا امور مذکور حشر و قیامت سے زیادہ عجیب ہیں۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴿۲۹﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے ایک فرضی سوال کا جواب ہے سوال ہو سکتا ہے کہ اس روز ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ اس کا جواب دیا ان سے کہا جائے گا کہ دنیا میں آتش جہنم کے تم قائل نہ تھے اب اس کی طرف چلو۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ﴿۳۰﴾ یہ اول کلام کی تاکید یا اس سے بدل ہے اہل تفسیر نے کہا کہ ظل سے مراد ہے جہنم کا دھواں۔ بیضاوی وغیرہ نے کہا بڑا دھواں جو اونچا اٹھتا اور پھیلتا ہوتا ہے۔ دخان جہنم کی تین شاخیں قرار دینے کی کچھ وجوہ بیضاوی وغیرہ نے لکھی ہیں جو ہم کو پسند نہیں ہمارے نزدیک تین شاخیں بنانے کی پسندیدہ وجہ یہ ہے کہ جہنم میں صرف تین قسم کے آدمی داخل ہوں گے (۱) وہ کافر جنہوں نے صریح الفاظ کے ساتھ پیغمبروں کی تکذیب کی جیسے کفار نے کہا تھا اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۲) وہ بدعتی جن کے اقوال ظاہر نصوص قطعیہ کے خلاف ہیں اور وہ اجماع کے خلاف نصوص کی غلط تاویلیں کرتے ہیں ان کے کلام سے آیات کا انکار اور پیغمبروں کی تکذیب اقتضاء ثابت ہوتی ہے جیسے مجسمہ، قدریہ، رافضی، خارجی اور مرجیہ کے فرقے۔ مثلاً مجسمہ آیت وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ کی تکذیب کرتے ہیں اور ان تمام آیات کو نہیں مانتے جن میں اعمال کے تولنے کا یا پل صراط وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اور رافضی و خارجی ان متواتر المعنی احادیث کے منکر ہیں جو حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی مدح میں آئی ہیں۔ (۳) نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے والے (مسلمان) جو صغیرہ کبیرہ گناہ کرتے اور فرائض کو ترک کرتے ہیں۔ یہی تینوں امور دخان جہنم کی تثلیث کے اسباب بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بغوی نے کہا بعض علماء کا قول ہے کہ دوزخ سے ایک گردن بر آمد ہوگی جو تین شاخوں پر تقسیم ہو جائے گی (۱) نور ہوگا جو مومنوں کے سروں پر آکر ٹھیر جائے گا (۲) دخان ہوگا جو منافقوں کے سر پر آکر ٹھیر جائے گا (۳) بھڑکتے شعلے ہوں گے جو کافروں کے سروں پر آکر ٹھیر جائیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ قول ضرور مرفوع ہوگا کیونکہ صرف رائے کو اس کا ادراک نہیں

ہو سکتا اس قول کی تشریح یہ ہے کہ آتش جہنم کی سہ گانہ اقسام میں پہلی قسم نور ہو گی اس کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ دوسری دونوں قسموں سے کم تاریک ہو گا ورنہ دوزخ کی آگ میں نور ہونے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہزار برس تک دوزخ کی آگ بھڑکائی گئی یہاں تک کے وہ سرخ ہو گئی پھر ہزار برس تک بھڑکائی گئی یہاں تک کہ وہ سیاہ ہو گئی اب وہ سیاہ تاریک ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ترمذی اور بیہقی نے بیان کی ہے۔ دخان جہنم کی یہی ہلکی ظلمت والی قسم گناہ گار مسلمانوں کے سروں کے اوپر آکر ٹھیر جائے گی۔ دوسری قسم دخان ہے اس میں آتشی اجزاء کی کثرت اور تاریکی کی شدت ہو گی یہ منافقوں کے سروں پر آکر ٹھہر جائے گی اس جگہ منافقوں سے مراد ہیں وہ بدعتی جو ایمان کا تو دعویٰ رکھتے ہیں مگر کفر اور تکذیب انبیاء ان کے قول کے لئے لازم ہے۔ وہ منافق مراد نہیں ہیں جو زبانوں سے ایمان کے قائل ہیں اور دلوں میں ان کے ایمان نہیں ہے بظاہر مومن بباطن کافر۔ یہ تو اعلانیہ کفر کرنے والوں سے بھی زیادہ سخت ہیں اور ان کی جگہ تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہے۔ تیسری قسم بھڑکتے شعلوں کی ہو گی اس قسم میں سوزش اور التہاب خالص ہو گا یہ کافروں کے سروں پر آکر ٹھیر جائیں گے۔ بدعتیوں کو منافق کہنے کی وجہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کی جا چکی ہے اور اللہ نے جو منافقوں کی مثال دی ہے اس کی بدعتیوں پر مطابقت کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آیت میں ظل سے مراد خود جہنم کی آگ ہے آگ کے تاریک اور سیاہ ہونے کی وجہ سے مجازاً اس کو ظل کہہ دیا کیونکہ سایہ میں کچھ تاریکی ہوتی ہی ہے۔ پس تین شاخوں والی آگ کی طرف چلنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس آتش جہنم کی طرف چلو جس میں پہنچانے والے تین راستے ہیں (۱) انبیاء کی صراحۃ تکذیب (۲) انبیاء کی لزومی تکذیب (اول کفر التزامی اور دوسرا کفر لزومی ہے) (۳) گناہوں کا ارتکاب آیت میں کافروں کے لئے امر استہزائی ہے جیسے آیات ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ میں اور بَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ میں خطاب استہزائی ہے۔

لَا ظَلِيْلٍ یہ ظل کی صفت ہے یعنی وہ سایہ عرش اور جنت کے سایوں کی طرح (فرحت بخش) نہیں۔

وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ وہ جہنم کے شعلوں کو دفع نہیں کرے گا۔ یا تو یہ جملہ محذوف موصوف کی صفت ہے یعنی وَلَا ظِلَّ يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ یا ظليل پر اس کا عطف ہے جیسے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ پر وَجَعَلَ اللَّيْلَ کا عطف۔ اس وقت یہ ظل مذکور کی تیسری صفت ہو گی۔ بہر حال ظل کے لفظ سے وہم پیدا ہوتا تھا کہ شاید وہ گرمی سے کچھ محفوظ رکھ لے اور دوزخ کی لپٹ سے بچالے اس وہم کا ازالہ اس آیت سے ہو گیا۔

اِنَّهَا یہ ضمیر ظل کی طرف راجع ہے بشرطیکہ ظل سے مراد نار جہنم ہو ورنہ اس کا مرجع مذکور نہیں مگر رفتار کلام سے معلوم ہو رہا ہے یعنی جہنم۔

تَرْمِيْ بِشَرَرٍ چنگاریاں پھینکے گی۔ دوزخ کی لپٹ کو دور نہ کرنے کی وجہ کا بیان ہے۔ شَرَر شررۃ کی جمع ہے۔ چنگاریاں۔

كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ ہر چنگاری قصر کی طرح بڑی ہو گی۔ قصر پتھر کا مکان یا ایک گاؤں۔ یا قلعہ۔ قاموس۔ اس صورت میں قصر مفرد ہو گا۔ بعض نے اس کو قصرۃ کی جمع کہا ہے اور قصرۃ کا معنی ہے کھجور کے درخت کی جڑ یا موٹا درخت۔

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ جمالات، جِمَالٌ کی جمع ہے اور جمال جمل کی۔

صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ صُفر اَصفر کی جمع ہے چنگاریوں میں آگ ہو گی اس لئے زرد ہوں گی۔ بعض علماء نے صفر کا ترجمہ سود یعنی سیاہ کیا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جہنم کی آگ کی چنگاریاں تار کول کی طرح سیاہ ہوں گی اونٹ کے رنگ کی سیاہی زردی مائل ہوتی ہے اس لئے عرب اونٹ کے رنگ کو صُفر کہتے ہیں قصر کے ساتھ تشبیہ مقدار کی بڑائی میں تھی اور جمالات صُفر کے ساتھ تشبیہ رنگ۔ کثرت تسلسل باہم اختلاط اور سرعت حرکت میں ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ دوزخ اور عذاب کی تکذیب کرنے والوں کے لئے اس روز ویل ہو گی۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی کافر کوئی ایسا کلام نہ کر سکیں گے جو ان کے لئے مفید ہو یا دہشت اور حیرت کی

وجہ سے بالکل نہ بول سکیں گے لیکن یہ نہ بول سکنا بعض مقامات میں ہوگا بعض مقامات میں کافر بولیں گے۔

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ لَا يَنْطِقُوْنَ پر عطف ہے یعنی عذر پیش کرنے کی ان کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ معذرت کر سکیں۔ فَيَعْتَذِرُوْنَ کا عطف لَا يُؤْذَنُ پر ہے یعنی نہ ان کو اجازت ملے گی نہ وہ معذرت ہی کریں گے۔ فَيَعْتَذِرُوْنَ۔ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ کی نفی کا جواب نہیں ہے یعنی عدم معذرت کی وجہ عدم اذن نہیں ورنہ یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ چونکہ ان کو معذرت پیش کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اس لئے معذرت پیش نہ کر سکیں گے حقیقت میں ان کے پاس عذر ہوگا کہ اگر اس کو اجازت مل جائے تو پیش کر سکے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾ جو لوگ اللہ کے انعامات اور احسانات کے منکر ہیں اور اپنے منعم و محسن سے روگرداں ہیں ان کے لئے اس روز ویل ہوگی۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ یعنی اہل جنت اور اہل جہنم کے الگ الگ کر دینے کا یہ دن ہے۔

جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ یہ ہٰذا کی دوسری خبر ہے یا یَوْمَ الْفَصْلِ سے حال ہے اور ضمیر محذوف ہے یعنی اس دن میں ہم نے تم کو جمع کیا الخ یا یَوْمُ الْفَصْلِ ہونے کی علت ہے یعنی یہ فیصلہ کا دن اس وجہ سے ہے کہ ہم نے تم سب کو جمع کیا ہے یا فصل کی تاکید اور بیان ہے۔

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾ اگر عذاب کو دفع کرنے کی تمہارے پاس کوئی تدبیر ہو تو اب کرو جیسے دنیا میں اہل ایمان کے مقابلہ میں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا تم میں سے دس دس آدمی بھی ایک ایک کارندہ جہنم کو پکڑ لینے سے عاجز ہے۔ كِيْدُوْنِ میں یاء محذوف ہے امر صرف زجر اور تعجیز کے لئے ہے (یعنی مخاطب کا عجز ظاہر کرنا مقصود ہے)

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾ عذاب کی تکذیب کرنے والوں کے لئے اس روز ویل ہوگی کیونکہ عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی کوئی تدبیر ان کو نصیب نہیں ہوگی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ المتقین سے مراد ہے شرک سے بچنے والے یا عموماً گناہوں سے اجتناب رکھنے والے۔ اپنے اپنے فرق مراتب کے لحاظ سے۔

فِيْ ظِلٰلٍ سایوں میں ہوں گے (سایہ کا حقیقی معنی مراد نہیں) جنت میں سورج ہی نہ ہوگا سایہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ سایہ سے کنایۃً مراد ہے جنت کے درختوں کا گھنا ہونا جیسے طویل النجاد (لمبے پرتلہ والا) دراز قد آدمی کو کہتے ہیں خواہ اس کے پاس پرتلہ نہ ہو۔

وَّعُيُوْنٍ ﴿٤١﴾ اور جاری چشمے۔ جو ایسے پانی کے ہوں گے جو کبھی خراب ہونے والا نہ ہوگا۔ اور ایسے دودھ کے ہوں گے جو کبھی بدمزہ نہ ہوگا اور ایسی شراب کے ہوں گے جو پینے والوں کے لئے سراسر لذت ہوگی (تلخ نہ ہوگی) اور صاف شدہ شہد کے ہوں گے۔

وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٤٢﴾ اور طرح طرح کے پھل جن کا مزہ حسب اشتہاء ہوگا يَشْتَهُوْنَ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کے اندر کھانے پینے کی چیزوں کا مزہ کھانے والوں کی اشتہات کے موافق ہوگا دنیوی پھلوں کی حالت اس کے خلاف ہے ان کا مزہ وہی ہے جو سب کے لئے یکساں ہوتا ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا فِیْ ظِلَالٍ کے متعلق (مُسْتَقِرُّوْنَ) محذوف کی ضمیر مرفوع سے حال ہے یعنی وہ جنت کے گھنے درختوں کے اندر ایسی حالت میں ہوں گے کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پیو۔ یا جملہ معترضہ ہے یعنی ان سے یہ الفاظ کہے جائیں گے۔

هَنِيْٓئًا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی کھاؤ پیو خوشگوار کھانا پینا یا حال ہے یعنی خوشگواری کے ساتھ کھاؤ۔ ھنآءٌ وہ چیز ہے جس کے حصول میں مشقت نہ ہو اور نتیجہ میں برائی نہ ہو۔

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ اپنے اعمال کے عوض (عمل قلب کا ہو جیسے) ایمانیات پر عقیدہ (یا اعضاء جسمانی کا

ہو جیسے) تمام اطاعات بدنیہ۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ الخ پورا جملہ مستانفہ ہے مُکَذِّبِیْنَ کی حالت سننے کے بعد سننے والا غیر مُکَذِّبِیْنَ کے احوال پوچھ سکتا تھا اس کا جواب اس جملہ میں دے دیا گیا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٤٤﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ کا مفعول ہے نَجْزِیْ جملہ فعلیہ اِنَّ کی خبر ہے اِنَّ سے جو جملہ اسمیہ بنتا ہے وہ سابق کی تاکید ہے کیونکہ مُحْسِنِیْنَ سے مراد بھی متقی ہی ہیں یوں احسان میں تقوی سے زیادہ خصوصیت ہے کیونکہ احسان کا معنی ہے اللہ کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا خدا کو دیکھ رہا ہے اگر عبادت کرنے والے کو خدا نظر نہیں آتا تو خدا بہر حال اس کو دیکھتا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے احسان کا یہی معنی بیان فرمایا تھا۔ رواہ الشیخان۔

مگر احسان کا یہ معنی آیت میں مراد نہیں ہے ورنہ اعلیٰ کی تشبیہ ادنیٰ سے لازم آئے گی (اور آیت کا مطلب یہ نکلے گا کہ ہم متقیوں کی طرح محسنوں کو ثواب دیتے ہیں) آیت میں مرتبہ احسان حاصل کرنے کی در پردہ ترغیب ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ جنت کی تکذیب کرنے والوں کے لئے اس روز ویل ہوگی جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا یہ علیحدہ کلام ہے دنیا میں تکذیب کرنے والوں کو تہدیدی (زجر آمیز) امر ہے قلیلا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی تھوڑا کھانا یا ظرف محذوف کی صفت ہے۔ تھوڑے زمانہ تک کھانا۔ یعنی جب تک دنیا میں زندہ ہو کھا لو آخر مرنے پر یہ سلسلہ منقطع ہو ہی جائے گا۔

اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿٤٦﴾ تم بلاشبہ مجرم ہو یہ جملہ تہدید سابق کی علت ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٧﴾ مُکَذِّبِیْنَ کے لئے اس روز ویل ہوگی۔ تھوڑے سے مزہ کے لئے عذاب الیم برداشت کرنے کو وہ تیار ہو گئے۔ ابن منذرؒ نے مجاہدؒ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی ثقیف کے نمائندوں کو ایمان لانے اور نماز پڑھنے کا حکم دیا انہوں نے جواب دیا مگر ہم تَجْبِیَہ نہیں کریں گے کیونکہ یہ گالی ہے یعنی بڑی ذلت ہے۔ تَجْبِیَہ کا معنی ہے گھٹنوں یا زمین پر ہاتھ رکھنا یا سرنگوں ہونا (قاموس) اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿٤٨﴾ اس شان نزول کی بناء پر اس جملہ میں کافروں کی مذمت کی گئی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا عطف مجرموں پر ہو اور تفنن عبارت کے لئے خطاب سے غیبت کی طرف انتقال کیا گیا ہو اس وقت حاصل مطلب یہ ہوگا کہ تم مجرم ہو تم کو نماز کے لئے بلایا جاتا ہے تو رکوع نہیں کرتے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اَلْمُكَذِّبِیْنَ کے مفہوم پر عطف ہو یعنی ان لوگوں کے لئے ویل ہے جنہوں نے تکذیب کی اور ان کو نماز کو بلایا گیا تو نماز نہیں پڑھی۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٩﴾ اوامر و نواہی کی تکذیب کرنے والوں کے لئے ویل ہوگی۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٠﴾ یعنی قرآن کے بعد کس بات کو مانیں گے استفہام انکاری ہے یعنی وہ قرآن جس کے اندر طرح طرح کا لفظی اور معنوی اعجاز ہے جس میں کھلے ہوئے دلائل اور روشن براہین ہیں جب اس پر ان کا ایمان نہیں تو پھر کسی دوسری دلیل کو یہ نہیں مانیں گے۔

جیسا سورۃ الانسان میں اکثر مہربانی آمیز مضامین کا اظہار ہے ویسا ہی اس سورت میں تخویف و تہدید (ڈراوا دھمکی) کا مضمون ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے سورۂ ہود اور الْوَاقِعَۃ اور الْمُرْسَلٰت اور عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔ حاکمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور ابن مردویہؒ نے حضرت سعدؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سورت المرسلات ختم ہوئی بعونہ تعالیٰ

ع ٢ ١٠ ٢٢

سورة النباء

یہ سورت مکی ہے اس میں چالیس آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَمَّ عَمَّ اصل میں عَنْ مَا تھا۔ مَا استفہامیہ اگر حرف جر کے بعد آتا ہے تو الف کو حذف کر دیا جاتا ہے (اور مَا کو مَ پڑھا جاتا ہے) جیسے لِمَ - فِیْمَ - عَمَّ - بِمَ اس حذف کے دو سبب ہیں۔

(۱) کثرت استعمال (۲) ما استفہامیہ کا ما موصولہ سے فرق۔

(عن ما کے الف کو حذف کر دینے کے بعد نون کو میم میں ادغام کر دیا جاتا ہے اور پھر) ع کو م کے ساتھ ملا کر عَمَّ لکھا ہوتا ہے کیونکہ حذف نون کے بعد ع تنہا رہ جاتا ہے اسی طرح ما کا الف حذف ہو کر م رہ جاتا ہے۔

اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اس لئے اس کے کلام میں استفہام سوالیہ نہیں ہوتا بلکہ جس چیز کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اس کی عظمت اور ہولناکی کو ظاہر کرنا مراد ہوتا ہے۔

یَتَسَآءَلُوْنَ ① کیسی عظیم الشان ہولناک چیز کے متعلق اہل مکہ باہم سوال کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کو جب توحید کی دعوت دی اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کی خبر بیان کی اور قرآن پڑھ کر سنایا تو وہ باہم پوچھنے اور کہنے لگے کہ کیسے ہیبت ناک واقعہ کی خبر محمد ﷺ دیتے ہیں۔ بغوی۔ اسی طرح ابن جریر اور ابن حاتم نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اور مسلمانوں سے قیامت کے متعلق بطور استہزاء دریافت کرتے ہیں (اس وقت یَتَسَآءَلُوْنَ بمعنی یَسْئَلُوْنَ کے ہوگا) جیسے یتداعون یدعون کے معنی میں ہے اور سوال بطور استہزاء ہوگا۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ② وہ عظیم خبر کے متعلق پوچھتے ہیں۔ عَمَّ کا تعلق یا مذکور یَتَسَآءَلُوْنَ سے ہے یا محذوف یَتَسَآءَلُوْنَ سے۔ بر تقدیر اول عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کا تعلق فعل (یتساءلون) محذوف سے ہوگا اور فعل محذوف وہی ہوگا جس کی تشریح فعل مذکورہ (یعنی یتساءلون مذکور) کر رہا ہے۔ (ترجمہ اس طرح ہوگا وہ کس قدر ہولناک چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ نباء عظیم کے متعلق پوچھتے ہیں) اس وقت دوسرا جملہ (یعنی یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ) لفظاً پہلے جملہ (یعنی عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ) کا جواب ہوگا اور معنوی اعتبار سے مسئول عنہ یعنی قیامت کی عظمت کا بیان ہوگا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا جملہ بھی استفہامیہ ہو اور حرف استفہام محذوف ہو اس صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید اور مسئول عنہ کی عظمت و ہولناکی کا مکرر اظہار ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ کیسی ہولناک چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں کیسی نباء عظیم کو پوچھتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرا استفہام (پہلے استفہام کی تاکید نہ ہو بلکہ) انکاری ہو یعنی نباء عظیم کے متعلق پوچھنا زیبا نہیں۔ سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اس کی حالت تو کھلی ہوئی ہے اس کی شدت وضوح ناقابل سوال ہے اس کو تو مان لینا ہی ضروری ہے۔ مجاہد اور اکثر علماء کے نزدیک نباء عظیم سے مراد قرآن ہے کیونکہ اللہ نے قرآن کو نباء عظیم فرمایا ہے ارشاد ہوا ہے قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ۔ قتادہ کے نزدیک حشر مراد ہے یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حشر کی خبر دینا (بجائے خود) نباء عظیم ہو۔

الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ③ اَلَّذِیْ بعد کو آنے والے صلہ سے مل کر نباء کی صفت ہے۔

یتساء لون کی ضمیر کی طرح ھم ضمیر جمع بھی کفار مکہ کی طرف راجع ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ سوال کو استہزائی یا انکاری قرار دیا جائے۔ اس حالت میں نباء عظیم کے متعلق کفار مکہ کے مختلف ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کچھ لوگ نباء عظیم کی صداقت کے قطعی منکر ہیں اور کچھ تردد میں پڑے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یَتَسَآءَلُوْنَ اور ھُمْ کی ضمیریں اہل مکہ کی طرف راجع ہو جائیں اہل مکہ میں کچھ مومن تھے کچھ کافر۔ نَبَاِ عَظِیْم کے متعلق سوال کرنے والے دونوں گروہ تھے ایک گروہ تصدیق کرتا تھا لیکن زیادتی یقین اور انکشاف حالات کے لئے سوال کرتا تھا دوسرا گروہ منکر تھا اور محض استہزاء کے لئے سوال کرتا تھا۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ کَلَّا سے اختلاف مذکور کورد کا گیا ہے کیونکہ اختلاف کی بناء انکار پر تھی خواہ کل اہل مکہ منکر تھے (اور قطعیت و تردد میں ایک دوسرے سے مختلف تھا) یا بعض منکر تھے اور بعض نہ تھے۔ یعنی ان کو اختلاف نہ کرنا چاہئے کافروں اور منکروں کو اس کو حقانیت عنقریب (دنیا میں) اور قبر میں معلوم ہو جائے گی۔

ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵ پھر قیامت کے دن ان کو صداقت معلوم ہو گی۔ تکرار جملہ مبالغہ کے لئے ہے اور اس سے عذاب کی دھمکی دو مرتبہ ہو گئی ایک بار قبر کے عذاب کی اور دوسری بار قیامت کے دن کی۔ لفظ ثم بتا رہا ہے کہ قیامت کے عذاب کی وعید قبر کی وعید سے زیادہ پر سطوت ہے۔

آئندہ آیات میں اللہ نے اپنی مصنوعات کا ذکر کر کے اپنی توحید پر قدرت حشر پر اور اپنی عطا کی ہوئی نعمتوں کے وجوب شکر پر استدلال کیا ہے تاکہ توحید و عبادت کے داعی کی دعوت کو لوگ مانیں اور اس کا اتباع کریں فرمایا۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝۶ کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا یہ استہام تقریری ہے یعنی استفہام کی غرض یہ ہے کہ مخاطب کو اقرار و عبادت پر آمادہ کیا جائے یا استفہام انکاری ہے اور انکار نفی مفید ثبوت ہے (مطلب یہ کہ کیا ہم نے نہیں بنایا) یعنی زمین کو فرش بنایا۔

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۷ اور کیا ہم نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں نہیں بنایا تاکہ زمین میں ارتعاشی جنبش نہ ہو۔

وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝۸ اور ہم نے تم کو مرد عورت الگ الگ صنف پیدا کیا۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ اور ہم نے نیند کو تمہارا اعمال (بیداری) کو قطع کر دینے والی چیز بنایا تاکہ تمہارے جسمانی اعضاء کو آرام مل جائے۔ سَبْتٌ کا معنی ہے قطع کرنا۔[1]

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ اور ہم نے رات کو لباس بنایا (یعنی ہمہ پوش) رات کی تاریکی ہر چیز کو چھپا لیتی ہے دیکھنا نا ممکن ہو جاتا ہے تمام آوازوں میں سکون پیدا ہو جاتا ہے اور سونے والے آرام پاتے ہیں۔

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ اور ہم نے دن کو حصول معاش کا سبب بنایا۔ اللہ نے اپنی مہربانی سے بندوں کو جو رزق تقسیم کیا ہے بندے اس کو حاصل کرنے کے لئے عموماً دن میں محنت کرتے ہیں۔ ضروریات زندگی اور لوازم بقاء حیٰوۃ کو حاصل کرنے کے لئے دن میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں۔

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲ اور تمہارے اوپر ہم نے سات مضبوط یعنی آسمان بنائے جن پر گردش زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

---

[1] تمام اعضاء جسم اور دماغی قوتیں بیداری میں بیرونی کاموں میں مشغول رہتی ہیں اس مسلسل حرکت کی وجہ سے تمام اعصاب تھک جاتے ہیں اور انسان کی غریزی طاقت تحلیل ہوتی ہے اس تحلیل کو روکنے تھکاوٹ کو دور کرنے اور اعضاء کو آرام پہنچانے کے لئے اللہ نے نیند مقرر کر دی ہے نیند کی حالت میں انسان کی بیرونی حرکات ختم ہو جاتی ہیں اور اعضاء کو آرام کا موقع ملتا ہے اور اندرونی طاقت محفوظ رہتی ہے اور دوران خون اعتدال پر آجاتا ہے۔ لیکن اندرونی آلات ہضم و بقاء ہر وقت کام کرتے ہیں ان میں نیند سے سکون نہیں آتا۔

وَّجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿١٣﴾ اور ہم نے روشن چراغ پیدا کیا جَعَلۡنَا کا اول مفعول محذوف ہے یعنی سورج کو ہم نے روشن چراغ بنایا۔ وَهَّاجًا کا معنی ہے جگمگاتا بھڑکتا ہوا مقاتل نے کہا وَهّج کا معنی ہے ایسی روشنی جس میں گرمی بھی ہو اللہ نے سورج میں نور بھی پیدا کیا اور گرمی بھی۔

وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿١٤﴾ اور ہم نے بادلوں کو نچوڑنے والی ہواؤں سے یا بادلوں سے مسلسل برسنے والا پانی برسایا۔ اَلۡمُعۡصِرَاتِ وہ ہوائیں جو بادلوں سے پانی نچوڑتی ہیں مجاہد مقاتل اور کلبی کا یہی قول ہے عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔ لیکن ابوالعالیہ اور ضحاک نے کہا المعصرات سے مراد بادل ہیں۔ والی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے یہی مروی ہے۔ فراء نے کہا معصرات وہ بادل ہیں جو بارش سے بھرے ہوں برسنے والے ہوں مگر ابھی برسے نہ ہوں جیسے المراة المعصرة وہ عورت جس کے حیض کا زمانہ آگیا ہو اور ابھی حیض جاری نہ ہوا ہو ابن کیسان نے کہا المعصرات برسنے والے بادل۔ وفیه تعصرون کے محاورہ سے یہ لفظ ماخوذ ہے۔ حسن بصری۔ سعید بن جبیر زید بن اسلم اور مقاتل بن حبان کے نزدیک المعصرات سے آسمان مراد ہیں (۱) مجاہد کے قول پر مِنَ الۡمُعۡصِرَاتِ میں مِنۡ سببیہ ہوگا (یعنی پانی بادلوں سے برستا ہے اور ہوائیں بادل اٹھا کر لاتی ہیں) باقی اقوال پر مِنۡ ابتدائیہ ہوگا (بادلوں سے یا آسمان سے پانی برستا ہے) ثَجَّاجًا کا ترجمہ مجاہد نے کیا خوب برسنے والا۔ قتادہ نے کہا مسلسل برسنے والا ابن زید نے کہا۔ بکثرت۔ مآل سب کا ایک ہی ہے۔

لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿١٥﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿١٦﴾ تاکہ ہم اس سے یعنی اس پانی سے غلہ اور گھاس اور باغ پیدا کر دیں۔ آدمیوں کے لئے غلہ جیسے گیہوں جو اور جانوروں کے کھانے کے لئے گھاس۔ اَلۡفَافٌ گھنے درخت باہم لپٹے ہوئے۔ یہ لف کی جمع ہے جیسے جذع کی جمع اجذاع یا لفیف کی جمع قرار دیا جائے گا تو یہ صیغہ جمع الجمع کا ہوگا، کیونکہ لف لفافة کی جمع ہے اگر درخت گھنے ہوں تو ان کو الفاف کہا جاتا ہے جنة الفاف بولا جاتا ہے۔

جب ثابت ہو گیا کہ جو ان چیزوں کو ابتداء عدم سے وجود میں لا سکتا ہے وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور اس عظیم الشان سنسار کی ہستی بغیر اس کے کہ اس کا خالق حکیم ہو ممکن نہیں اور کائنات میں سے کسی چیز کا وجود بے کار اور منافی حکمت نہیں ہے (اور لامحالہ اس کائنات سے فائدہ اندوزی کی باز پرس انسان سے ہونی چاہئے) تو سننے والے کو شوق پیدا ہوا کہ فیصلہ کا وقت اور اس کی تفصیل معلوم کرے اس لئے گزشتہ کلام سے پیدا ہونے والے سوال کے جواب میں فرمایا۔

اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا ﴿١٧﴾ یعنی حق کو باطل سے جدا کرنے کا دن اللہ کے علم یا حکم میں عذاب و ثواب کی ایک مقرر میعاد اور معین وقت ہے یا اوقات دنیوی کے ختم ہونے کی حد ہے یا مخلوق کے ختم ہونے کی۔

يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ جس روز صور پھونکی جائے گی۔ یہ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ سے بدل یا عطف بیان ہے یا مِيۡقَاتًا سے بدل ہے یا كَانَ کی دوسری خبر ہے۔ مسدد کی باسناد صحیح روایت ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا صور سینگ کی شکل کی ہوگی جس میں پھونکا جائے۔ حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔ سورۃ الحاقہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ وہب کا قول ہے کہ صور کی ساخت سفید موتی کی ہوگی جس میں چمک شیشہ کی طرح ہوگی ہر زوج کی تعداد کے برابر اس میں سوراخ ہوں گے۔ سورۃ المدثر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ﴿١٨﴾ یعنی صور پھونکتے ہی تم قبروں سے نکل کر جماعت در جماعت ہو کر حساب کے مقام پر آؤ گے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا ہم سے سچے نبی ﷺ نے سچ فرمایا کہ قیامت کے دن حشر کے موقعہ پر لوگوں کے تین گروہ ہوں گے ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو کھانے سے سیر لباس پوش اور سواریوں پر سوار ہوں گے دوسرا گروہ پیادہ دوڑتا ہوگا۔ تیسرے گروہ کو منہ کے بل گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ نسائی۔ حاکم۔ بیہقی۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت يَوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ تلاوت کرنے کے بعد فرمایا۔

وقت حشر میری امت کے دس گروہ ہوں گے ایک قطار کی صورتیں بندروں کی طرح ہوں گی یہ قدریہ ہوں گے۔ ایک قطار سوروں کی شکل پر ہوگی یہ مرجئہ ہوں گے ایک قطار سوروں اور کتوں جیسی ہوگی یہ حروریہ ہوں گے ایک گروہ کی صورت گدھوں کی طرح ہوگی یہ رافضی ہوں گے۔ ایک گروہ کی شکل چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ہوگی یہ متکبروں کا گروہ ہوگا ایک قطار چوپایوں کی شکل کی ہوگی یہ سود خور ہوں گے ایک گروہ درندوں کی صورت کا ہوگا یہ زندیق ہوں گے ایک گروہ کا حشر منہ کے بل ہوگا یہ مصور اور دوسروں کی عیب چینی کرنے والے اور دوسروں پر طنز و طعن کرنے والے ہوں گے ایک گروہ ناز و ادا سے ٹہلنے والوں کا ہوگا یہ لوگ مقرب ہوں گے ایک گروہ وہ ہوگا جو شکم سیر ہوگا یہ دائیں طرف والے ہوں گے ابن عساکر نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے یہ حدیث منکر ہے اس کی اسناد میں کچھ مجہول راوی ہیں۔

خطیب نے (السراج المنیر میں) ان الفاظ کے ساتھ حدیث کو نقل کیا ہے میری امت کی دس اصناف کا حشر دس گروہوں کی صورت میں ہوگا بعض کی صورت بندروں کی ہوں گی یہ چغل خور ہوں گے بعض سوروں کی شکل پر ہوں گے یہ حرام خور ہوں گے بعض سرنگوں ہوں گے ٹانگیں اوپر چہرے اور آنکھیں نیچے ان کو اسی طرح گھسیٹا جائے گا یہ سود خور ہوں گے کچھ لوگ نابینا ہوں گے ادھر ادھر سرگرداں ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو فیصلہ میں ظلم کرتے تھے بعض گونگے بہرے اور بے عقل ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے اعمال پر مغرور تھے بعض لوگوں کی زبانیں سینہ پر لٹکتی ہوں گی اور ان کے منہ سے لہو پیپ بہتا ہوگا جس سے مجمع میں تعفن پیدا ہوگا۔ یہ وہ علماء اور واعظ ہوں گے جن کا کردار گفتار کے خلاف تھا بعض لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے یہ پڑوسیوں کو دکھ دینے والے لوگ ہوں گے بعض لوگوں کو آتشی تختوں پر صلیب دی گئی ہوگی یہ وہ لوگ ہوں گے جو حاکم سے جا کر لوگوں کی چغلیاں کھاتے تھے۔ بعض لوگوں کی بدبو مردار سے زیادہ سڑی ہوئی ہوگی یہ وہ لوگ ہوں گے جو نفسانی خواہشات اور لذات میں مزے اڑاتے تھے اور اللہ کے مالی حق کو اپنے مالوں کے ساتھ روکے رکھتے تھے (زکوٰۃ عشر وغیرہ ادا نہیں کرتے تھے) بعض لوگوں کو تار کول کی لمبی چادریں پہنائی جائیں گی یہ رعونت فخر اور غرور کرنے والے ہوں گے۔ حضرت براء بن عازب نے بھی بروایت حضرت معاذ ایسی ہی حدیث بیان کی جس کو ثعلبی نے نقل کیا ہے۔[1]

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ آسمان کو شگافتہ کر دیا جائے گا اس میں دروازے ہو جائیں گے۔

اَبْوَابًا میں مضاف محذوف ہے یعنی آسمان دروازوں والا ہو جائے گا یا بطور مبالغہ آسمان کو ابواب قرار دیا یعنی آسمان میں اتنے زیادہ شگاف ہو جائیں گے کہ پورا آسمان دروازے ہی دروازے بن جائے گا۔

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اور پہاڑوں کو زمین سے اٹھا کر فضاء میں ذروں کی طرح

---

[1] گویا مقاتل سے دو روایتیں آئی ہیں ایک روایت کے اعتبار سے مقاتل مجاہد کے ساتھ ہیں اور دوسری روایت کے لحاظ سے حسن بصریؒ کے ساتھ۔

[2] ابن عساکرؒ کی روایت کردہ حدیث میں بعض فرقوں کے نام آئے ہیں، ہم ان کی مجمل خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ اول قدریہ یہ گروہ اپنے اعمال کا خالق خود انسان کو کہتا ہے۔ خدا کو خالق اعمال نہیں جانتا۔ دوسرا مرجئہ ہے یہ گروہ قائل ہے کہ اگر ایمان صحیح ہے تو پھر اعمال کی بدی ضرر رساں نہ ہوگی تمام ممنوعات تصدیق قلبی کی موجودگی میں معاف ہیں گویا اس کے نزدیک اعمال کی کوئی اہمیت نہیں بنیادی عقیدہ کی درستگی ضروری ہے۔ حروریہ خارجیوں کا ایک گروہ تھا مقام حروراء میں جنھوں نے لشکر کشی کی تھی اس گروہ کے نزدیک اعمال ایمان کے اجزاء تقویمی ہیں صغیرہ گناہ کرنے کے بعد بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے یہ لوگ حضرت علیؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کو کافر کہتے ہیں اور ان حضرات پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ رافضیہ گروہ کا مسلک خارجیہ کے خلاف ہے ان کے نزدیک صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بلکہ چند صحابہؓ کو چھوڑ کر تمام صحابہ ایماندار نہ تھے خلافت جو حضرت علیؓ کا حق تھا انہوں نے غصب کر لیا تھا اجماع حجت نہیں خلافت اور امامت خداداد ہے نص خدا یا نص پیغمبر یا نص امام پر اس کا مدار ہے۔ جس طرح نبوت پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح امامت کی تصدیق بھی ضروری ہے وغیرہ۔

پھیلا دیا جائے گا اور پہاڑ بے حقیقت ہو جائیں گے۔ اصل لغت میں سرب کا معنی ہے جانا۔ صحاح جوہری۔ بیابان میں جو ریت چمکتی ہے اس کو سراب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دیکھنے میں پانی کو لے کر آتی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ پہاڑ بے حقیقت ہو جائیں گے ان کے اجزاء ریزہ ریزہ ہو کر پراگندہ ہو جائیں گے۔

جب آیت فتاتون افواجا میں تمام لوگوں کا حساب فہمی کے لئے محشر میں آناذکر کیا گیا تو سننے والے کو ان کے تفصیلی احوال جاننے کا شوق پیدا ہوا اس لئے آئندہ آیت میں سب سے پہلے طاغینؔ کا ذکر کیا کیونکہ عموماً انسانی ذہن بشارت سے زیادہ تخویف سے اثر پذیر ہوتا ہے اس لئے فرمایا۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطَّاغِيْنَ — رَصَد گھات لگانے کی تیاری۔ اور گھات کا مقام۔

مطلب یہ ہے کہ جہنم کے پل پر عذاب اور رحمت کے فرشتے گزرنے والوں کی تاک میں لگے رہیں گے عذاب کے فرشتے تو کافروں کی گھات میں رہیں گے کہ ان کو پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیں اور عذاب دیں اور رحمت کے فرشتے ایمان والوں کی تاک میں ہوں گے کہ پل صراط سے گزرتے وقت مومنوں کو جہنم کی لپٹ اور پل پر (دو طرفہ) لگے ہوئے آنکڑوں سے محفوظ رکھیں اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم سب لوگوں کی گزرگاہ ہوگی تمام آدمی اس پر سے گزریں گے جیسا کہ آیت وان منکم الا واردھا میں آیا ہے اس صورت میں مِرْصَاد کا معنی ہوگا گھات کا راستہ۔ یا مِرْصَاد کا مفہوم التزامی ہوگا راستہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرصاد سے مراد ہے کافروں کے لئے تیار کیا ہوا۔ ارصدت الشیئی میں نے وہ چیز تیار کر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرصاد مبالغہ کا صیغہ ہو۔ یعنی کافروں کو تاکنے اور ان کی گھات لگانے میں بڑی کوشش کرنے والا تا کہ کوئی کافر بچ کر نکل نہ جائے۔ بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ فرمار ہے تھے صراط تلوار کی دھار کی طرح بہت تیز (اور باریک) ہوگی اور ملائکہ ایماندار مردوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہوں گے جبرئیل میری کمر پکڑے ہوں گے اور میں کہتا ہوں گا الٰہی بچا الٰہی بچا اور پھسل کر گرنے والے اور گرنے والیاں بہت ہوں گے۔ ابن مبارکؒ، بیہقیؒ اور ابن ابی الدنیاؒ نے حضرت عبید بن عمیرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم پر صراط تلوار کی دھار کی طرح ہوگی اس کے دو طرفہ آنکڑے اور کانٹے ہوں گے (آنکڑوں کے ذریعہ سے) لوگوں کو اچک لیا جائے گا۔

قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (صرف ایک) ایک آنکڑے سے قبائل مضر و ربیعہ سے بھی زیادہ لوگ پکڑ لئے جائیں گے اور ملائکہ اس کے کنارہ پر کھڑے کہتے ہوں گے الٰہی بچا الٰہی بچا۔ بیہقیؒ نے عبید بن عمیرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ صراط تلوار کی دھار کی طرح (باریک اور تیز) ہوگی اور پھسلواں لغزش گاہ ہوگی ملائکہ اور انبیاء کھڑے کہہ رہے ہوں گے الٰہی بچا، الٰہی بچا اور کچھ فرشتے کافروں کو آنکڑوں سے پکڑ رہے ہوں گے۔ بیہقی نے بروایت مقسم حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے پل پر سات جگہ لوگوں کو روکا جائے گا پہلی جگہ بندہ سے لا الہ الا اللہ کی شہادت پوچھی جائے گی اگر اس نے شہادت پوری دی ہوگی تو دوسرے مقام تک گزر جائے گا وہاں اس سے نماز کی باز پرس ہوگی اگر اس نے نماز بھی ٹھیک ادا کی ہوگی تو تیسرے مقام تک گزر جائے گا وہاں زکوۃ کی پرسش ہوگی اگر زکوۃ بھی پوری دی ہوگی تو چوتھے مقام تک گزر جائے گا وہاں روزہ کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی اگر روزے ٹھیک ادا کئے ہوں گے تو پانچویں مقام تک چلا جائے گا وہاں حج کے متعلق سوال کیا جائے گا اور اگر ٹھیک طور پر حج ادا کیا ہوگا تو چھٹے مقام تک چلا جائے گا وہاں عمرہ پوچھا جائے گا اگر یہ بھی کر چکا ہوگا تو ساتویں مقام تک پہنچ جائے گا۔ وہاں بندوں کے حقوق کے متعلق دریافت کیا جائے گا اگر اس مقام سے بھی نکل گیا تو خیر ورنہ کہا جائے گا دیکھو اس کے پاس کچھ نوافل ہیں۔ نوافل سے اس کے فرض اعمال کو پورا کر دیا جائے گا اور سب امور سے فارغ ہو جائے گا تو اس کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

اَلطَّاغِیْ (اَلطَّاغِیْنَ کا واحد) گناہوں میں حد سے بڑھ جانے والا۔ آدمی طغیان کی حد میں صرف اس وقت داخل ہوتا ہے جب کفر و انکار پر اس کو یقین ہو جائے اگر صریحاً (کہہ کر) کفر پر یقین ہوگا تو اس کو کافر کہا جائے گا اور اگر اس کے عقیدہ

پر کفر لازم آتا ہو اور عقیدہ کا تقاضا کفر ہو تو وہ بدعتی رافضی یا قدریہ یا مرجیہ ہوتا ہے۔

مَاٰبًا﴿۲۲﴾ (جائے رجوع واپسی کا مقام) یہ کَانَتْ کی دوسری خبر ہے (یعنی جہنم طاغیوں کا ٹھکانا ہے)

لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا﴿۲۳﴾ طاغی دوزخ میں صدیوں تک رہیں گے۔ اَحْقَابٌ حَقَبٌ کی جمع ہے ایک حقب اسی (۸۰) برس کا ہوگا اور ہر سال بارہ مہینہ کا اور ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن اس دنیا کے ہزار برس کا۔ بقول بغویؒ یہ تفصیل حضرت علیؓ سے اور بقول ہناد حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے۔ مجاہد نے کہا الاحقاب ۴۳ حقبہ کا ہر حقبہ ستر (۷۰) خریف کا ہر خریف سات سو سال کا ہر سال ۳۶۰ دن کا اور ہر دن دنیا کے ہزار برس کا۔ مقاتل بن حبان نے کہا ایک حقب سترہ ہزار برس کا ہوگا۔

ایک شبہ

احقاب کی مدت کچھ بھی بیان کی جائے بہر حال متناہی ہوگی اور آیات محکمات بتا رہی ہیں کہ کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اللہ نے فرمایا ہے وَفِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اسی پر اجماع بھی ہے۔ سدی نے مرہ بن عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر دوزخیوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کو دنیا کے سنگریزوں کی شمار کے برابر دوزخ میں رہنا ہے تو ان کو اس سے خوشی ہوگی اور اگر جنتیوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کو دنیا کے سنگریزوں کے شمار کے برابر جنت میں رہنا ہے تو اس سے ان کو رنج ہوگا (پس یہ حدیث بھی دلالت کر رہی ہے کہ دوزخیوں کے لئے دوزخ ابدی اور لازوال ہے)

ازالہ

اہل تفسیر نے مذکورہ شبہ کو دور کرنے کے لئے ان آیات کی تاویل کی ہے۔ کسی نے کہا یہ آیت منسوخ ہے اس کی ناسخ آیت فَلَنْ نَّزِیْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ہے کیونکہ زیادتی عذاب کی خبر سے عذاب کی تناہی ختم ہو گئی اور خلود کا مفہوم حاصل ہو گیا۔ میں کہتا ہوں آیت اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ الخ خبر ہے اور خبر میں نسخ کا احتمال ہی نہیں ہوتا (حکم منسوخ ہوتا ہے خبر منسوخ نہیں ہوتی) حسن بصریؒ نے یہ تاویل کی کہ اللہ نے دوزخیوں کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی بلکہ لٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا فرمایا اور احقاب کا سلسلہ غیر متناہی ہے پس خدا کی قسم جب ایک حقب گزر جائے گا تو دوسرا حقب آجائے گا اور یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا احقاب کی کوئی منقطعہ مدت نہ ہوگی۔ اسی قول کی روشنی میں بیضاوی نے احقابا کی تشریح میں دھور امتتابعۃ کہا ہے اور صراحت کی ہے کہ اس آیت میں دوزخ سے نکل آنے پر کوئی قولی دلالت نہیں اگرچہ بطور مفہوم انقطاع مدت سمجھا جاتا ہے مگر منطوق صریحی عدم انقطاع پر دلالت کرتا ہے جیسے خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا فرمایا اور مفہوم منطوق کا مزاحم نہیں بن سکتا (منطوق کے مقابلہ میں مفہوم محض ناقابل اعتبار ہے) میں کہتا ہوں بلا شبہ مفہوم منطوق کا مزاحم نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ہم کافروں کے لئے خلود عذاب کے قائل ہیں اور اسی بناء پر اجماع بھی اسی پر ہے اور یہی وجہ ہے کہ آیت اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ الخ کی تاویل کرنے کی ضرورت پڑی مگر اس کی یہ تاویل تو بڑی کمزور ہے کہ احقاب سے مراد غیر متناہی احقاب اور پیہم غیر منقطع مدتیں ہیں کیونکہ احقاب کا لفظ جب اسی لئے لایا گیا ہے کہ خلاف مراد کا وہم جاتا رہے اور کوئی شخص عدم خلود نہ سمجھنے لگے تو یہ فائدہ لفظ اَیَّامًا سے بھی حاصل ہو سکتا تھا جب کہ اَیَّامًا سے غیر متناہی ایام مراد لئے جائیں (جیسے احقاب غیر متناہی خلود پر دلالت کرتے ہیں ایسے ہی ایام غیر متناہی بھی عدم انقطاع مدت پر دلالت کرتے ہیں) اگر لٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَیَّامًا کہا جاتا تو کبھی بھی ذہن کا تبادر مفہوم خلود کی جانب نہیں ہوتا بلکہ مفہوم خروج کی جانب ہوتا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ احقابا کہنے سے مفہوم خروج کی جانب ذہن کا تبادر نہ ہو اور خلود کی جانب ہو۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَحْقَابًا حقب کی جمع ہے اور مفعول فیہ نہیں بلکہ حال ہے حقب الرجل اس آدمی کا رزق رک گیا وہ رزق سے محروم ہو گیا حقب العالم دنیا میں بارش نہیں ہوئی اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ طاغین دوزخ کے اندر ایسی

حالت میں رہیں گے کہ کچھ کھانے کی چیز کھانے کو نہیں ملے گی آئندہ آیت لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡهَا بَرۡدًا وَّلَا شَرَابًا اسی کی تشریح ہے۔

میں کہتا ہوں یہ تفسیر ان آثار کے خلاف ہے جو حضرت علیؓ اور دوسرے اکابر سے مروی ہیں اور چونکہ تشریح مرادی میں رائے کو کوئی دخل نہیں اس سے اس سلسلہ میں جو اقوال صحابہ مروی ہیں وہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں اور یہ کہنا پڑے گا کہ ضرور ان صحابہ نے حضور ﷺ سے ایسا ہی سنا تھا۔

لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡهَا بَرۡدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِیۡمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ یہ لَابِثِیۡنَ سے حال یا اَحۡقَابًا کی صفت ہے یا اَحۡقَابًا لَا یَذُوۡقُوۡنَ کا مفعول فیہ (زمانہ فعل) ہے یعنی اس حالت پر وہ دوزخ میں رہیں گے اور لاتعداد برسوں تک سوائے حمیم اور غساق کے اور کچھ نہ چکھیں گے گویا عدم ذوق کے ساتھ ان کی دوزخ کے اندر سکونت حقب در حقب ہوگی اور ان احقاب کے گزر جانے کے بعد کیا ہوگا تو شاید وہ مزید شدید ترین عذاب میں احقاب عدم ذوق گزرنے کے بعد مبتلا کر دیئے جائیں ظاہر یہ ہے کہ لَا یَذُوۡقُوۡنَ حال مرادف ہے لَابِثِیۡنَ حال اول ہے اور یہ اس سے حال ہے۔

میرے نزدیک صحیح توجیہ یہ ہے کہ مذکورہ شبہ کا مبنیٰ صرف یہ ہے کہ اَلطّٰغِیۡنَ سے صرف کفار مراد لئے گئے ہیں بدعتیوں کو اس لفظ کے تحت داخل نہیں کیا گیا اس لئے شبہ کو دفع کرنے کے لئے اتنی دور از کار توجیہات کرنی پڑیں ہم اَلطّٰغِیۡنَ کے لفظ کو اہل بدعت پر محمول کرتے ہیں (جن کے عقائد پر کفر لازم آتا ہے وہ خود مدعی اسلام ہیں اس لئے ان کا حکم کافروں جیسا نہیں نہ ان کا عذاب دائمی ہے بلکہ ان کے عذاب کی مدت بہت لمبی ہے جس کی تعبیر لفظ احقابا سے کی ہے) اب آیات میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا (آیات محکمات میں کافروں کے لئے دوامی عذاب کی صراحت ہے اور اس آیت میں اہل بدعت کے لئے عذاب طویل کی نص) میرے اس قول کی تائید بزار کی نقل کردہ روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت ابن عمرؓ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم کوئی بھی دوزخ سے نہ نکلے گا تاوقتیکہ احقاب تک اس میں نہ رہ چکا ہو حقب کچھ اوپر اسّی (۸۰) سال کا ہوگا اور ہر سال تمہاری گنتی کے ۳۶۰ دن کا۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ مدت مذکور گزرنے کے بعد طاغین دوزخ سے نکل آئیں گے۔

اَلۡحَمِیۡم بہت ہی گرم پانی۔ حدیث میں آیا ہے کہ لوہے کے چمٹوں سے پکڑ کر سخت گرم پانی ان کو پیش کیا جائے گا۔ جب وہ پانی ان کے منہ کے قریب آئے گا تو چہرے بھن جائیں گے اور پیٹوں میں اترے گا تو پیٹ کے اندرونی احشاء پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ ترمذی و بیہقی بروایت حضرت ابو درداءؓ۔

اَلۡغَسَّاق کیا ہے ہناد نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ غساق (انتہائی سرد) جس کی شدت برودت کی وجہ سے دوزخی اس کو پی نہ سکیں گے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جس طرح آگ گرمی کی وجہ سے جلاتی ہے۔ غساق سردی کی وجہ سے ان کو سوختہ کردے گا۔ مقاتل نے کہا غساق وہ چیز ہے جس کی سردی آخری حد کو پہنچی ہوئی ہو ہناد نے ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں پینے کی چیزوں سے گرم ترین پانی کا استثناء کیا گیا ہے اور سردے غساق کا ہناد کی روایت ہے کہ عطیہ کے نزدیک غساق کا معنی ہے دوزخیوں کا بہتا ہوا لہو۔ ابراہیم نخعی اور ابی رزین کا بھی یہی قول مروی ہے اس قول پر لفظ غساق غسقت کا مصدر ہوگا اس کا معنی ہوگا بہنا غسقت بہہ گیا۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ غساق جہنم میں ایک چشمہ ہے جس میں سانپ بچھو ہر زہریلے جانور کا زہر بہکر جمع ہوگا اور آدمی کو لاکر اس میں ایک ہی مرتبہ غوطہ دیا جائے گا تو کھال ہڈیوں سے گر جائے گی جلد اور گوشت ٹخنوں پر آگرے گا اور وہ اپنے گوشت کو اس طرح کھینچتا پھرے گا جیسے آدمی اپنے وسیع کپڑے کو کھینچتا ہے۔ بہرحال ان تمام اقوال پر اگر غساق کو سرد قرار دیا جائے تو اس کا استثناء بردسے ہوگا ورنہ حمیم و غساق دونوں کا استثناء شَرَابًا سے ہے اس وقت برد سے مراد ہوگا۔ برد جہنم جو حرارت نار سے جدا چیز ہوگی یا برد سے مراد ہے نیند یہ بھی کہا گیا ہے کہ استثناء منقطع ہے (مستثنیٰ منہ محذوف ہے) اور شراب سے مراد ہے وہ پینے کی چیز جس سے پیاس کو

تسکین ہو۔ بیضاوی نے لکھا کہ آیات کے آخری سروں کی رعایت سے غَسَّاقًا کو حَمِيمًا کے بعد ذکر کیا۔

جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ جزاءً افعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور وِفَاقًا بمعنی وافق ہے (اگر اس کو صیغہ صفت قرار دیا جائے) یا بمعنی موافق ہے (اگر اس کو باب مفاعلت کا مصدر کہا جائے) یعنی ان کو ایسا بدلا دیا جائے گا جو ان کے اعمال اور بیہودگیوں کے موافق ہوگا۔ مقاتل نے کہا (وِفَاقًا کا یہ مطلب ہے کہ عذاب گناہ کے مطابق ہوگا اور شرک سے بڑھ کوئی گناہ نہیں (لہذا جزاءً وِفاقًا کا معنی ہوا سخت ترین عذاب) یہ اس تقدیر پر ہوگا کہ الطاغین سے کفار مراد ہوں جیسی کہ دوسرے علماء نے تفسیر کی ہے پس اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ الخ پورا جملہ جزاء پر ہی دلالت کر رہا ہے کسی دوسرے معنی کا اس میں احتمال ہی نہیں ہے اس کے بعد جَزَاءً وِفَاقًا مفہوم جملہ کی تاکید ہوگی اور یہ تاکید لنفسہ ہوئی جیسے کوئی کہے له علي الف درهم اعترافا اس کے مجھ پر ہزار درہم ہیں میں اس کا پختہ اقرار کرتا ہوں (له علي الف درهم کا مفہوم سواء اعتراف قرض کے اور کچھ نہیں اس کے بعد اعترافا کہنا محض مفہوم سابق کی تاکید ہے اور کچھ نہیں۔ اسی طرح اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ یعنی غساقا تک پورا جملہ سوائے سزا کے اور کوئی مفہوم نہیں رکھتا پھر اس کے بعد جَزَاءً وِفَاقًا کا فائدہ سوائے مفہوم سابق کی تاکید کے اور کچھ نہیں ہاں ہماری رائے کے موافق اگر الطاغین سے مراد اہل بدعت ہوں تو جَزَاءً وِفَاقًا پہلے جملہ کی تاکید نفسی نہ ہوگی بلکہ تاکید لغیرہ ہو جائے گی اور نئے معنی کا فائدہ دے گی اور تاسیس (نئے معنی کی افادیت) تاکید محض سے اولی ہوتی ہے مطلب یہ ہوگا کہ اہل بدعت کے عقائد جس قدر حق سے دور ہوں گے اسی کے موافق ان کے عذاب کی نوعیت اور کیفیت ہوگی اور جہنم کے اندر بعض کا قیام زیادہ ہوگا بعض کا کم بعض کا عذاب شدید تر ہوگا بعض کا ان سے خفیف اور یہ قیام جہنم اور عذاب (زیادہ سے زیادہ) احقاب کی میعاد تک پہنچے گا اور کم سے کم ایک حقب ہوگا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ اس لئے کہ ان کو حساب کا اندیشہ نہ تھا نہ ان کو حساب کا یقین تھا۔ یہ کلام گزشتہ سزا کی علت ہے کافروں کو تو حشر حساب اور سزا جزا کا یقین ہی نہیں ہوتا رہا ہے بدعتی تو ان میں سے بعض گروہوں کے اندر یہ صفت (انکار حساب) موجود ہے جیسے مرجئہ نہ حساب کا عقیدہ رکھتے نہ سزا کا اور رافضی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے شیعہ (تبع) اور دوستوں کو کسی صغیر کبیرہ گناہ کا عذاب نہ ہوگا۔

وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ اور ہماری آیات کی وہ پوری پوری تکذیب کرتے تھے۔ تمام بدعتیوں میں یہ وصف موجود ہے جیسا کہ ہم المُرسَلات میں ذکر کر چکے ہیں دیکھو رافضی تمام مناقب صحابہؓ کے منکر ہیں اور سب کو مرتد یا منافق قرار دیتے ہیں ہاں تین صحابیوں کو اس حکم (ارتداد و نفاق) سے مستثنیٰ کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ اور دوسرے خلفاء کے ہاتھ میں جب اقتدار اعلیٰ آیا تو انہوں نے زمین پر فساد بپا کر دیا۔ ان کا یہ بھی گمان ہے کہ صحابہؓ کا دور بدترین دور تھا اور صحابہؓ کی جماعت بدترین جماعت تھی حالانکہ (صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اور اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ الخ اور (اصحاب حدیبیہ کے متعلق فرمایا) لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اور اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ اور ان کے علاوہ بکثرت آیات ہیں (جن میں صحابہؓ کی مدح ہے)

كِذَّابًا مصدر ہے تکذیب کا ہم معنی۔ یہ استعمال عمومی ہے۔ یا كِذَّابًا باب مفاعلت کا مصدر ہے بمعنی مکاذبۃ یعنی وہ کافروں کی نظر میں جھوٹے ہیں اور ان کی نظر میں مسلمان جھوٹے ہیں یا كِذَّابًا مبالغہ کا صیغہ ہے مطلب یہ کہ وہ دوسرے کذابوں کی طرح بڑے جھوٹے ہیں۔

مسئلہ: ہماری تفسیر کے موافق آیت سے اہل بدعت کے عذاب پر روشنی پڑتی ہے رہے مسلمان اہل کبائر تو ان کے قیام جہنم کی انتہائی مدت میعاد دنیا کے برابر ہوگی یعنی سات ہزار برس اور ان کو حمیم نہیں پلایا جائے گا نہ اس طرح کا کوئی دوسرا عذاب ہوگا۔ ابن ابی حاتم اور ابن شاہین نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام امتوں کے مومن

اہل کبائر اگر بغیر توبہ کے مرگئے تو ان میں سے جو لوگ جہنم میں داخل ہوں گے ان کی آنکھیں نیلی نہ ہوں گی چہرے کالے نہ ہوں گے۔ شیطانوں کے ساتھ زنجیروں سے ان کو باندھا نہ جائے گا نہ ان کے گلے میں زنجیروں کے طوق ڈالے جائیں گے نہ ان کو حمیم پلایا جائے گا۔ نہ ان کو قطران کا لباس پہنایا جائے گا اللہ نے ان کے اجسام کے لئے دوام جہنم حرام کر دیا ہے اور سجدہ کی وجہ سے ان کے چہروں کو آگ پر حرام کر دیا ان میں سے بعض لوگوں کو آگ صرف قدموں تک ہی پکڑے گی بعض کو صرف ایڑیوں تک بعض کو کمر تک بعض کو گلے تک گناہوں اور عملوں کی مقدار کے بقدر آگ گرفت کرنے گی بعض اس میں سال بھر رہ کر نکل آئیں گے سب سے لمبی مدت قیام جہنم کی ان کے لئے دنیا کی عمر کے برابر ہو گی یعنی ابتداء آفرینش دنیا سے لے کر فناء دنیا تک (جتنی مدت ہو گی اتنی ہی ان کے جہنم میں رہنے کی مدت ہو گی) الحدیث۔

حاکم نے نوادر الاصول میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ ان کو گرزوں سے نہیں مارا جائے گا اور طبقہ جہنم میں نہیں پھینکا جائے گا ان میں سے کچھ لوگ ایک ساعت جہنم میں رہ کر نکل آئیں گے کچھ ایک دن رہ کر نکل آئیں گے۔ کچھ سال بھر رہیں گے ان کی سب سے لمبی مدت قیام اتنی ہو گی جتنی دنیا کے روز آفرینش سے فناء دنیا تک ہو گی اور یہ سات ہزار (برس کی) ہو گی۔ میں کہتا ہوں حدیث میں سال سے مراد یہی دنیوی سال ہے کیونکہ اسی سے ان کا قیام جہنم مدت دنیا کے مساوی ہو گا۔ بعض روایت میں یہ بھی مرفوعاً آیا ہے جس کے راوی ابن سعید ہیں کہ بعض ایماندار اہل کبائر کو گناہوں کی سزا میں آگ دکھ پہنچائے گی اور اللہ ان پر موت طاری کر دے گا لیکن جب اذن شفاعت ہو گی اور ان کی معافی ہو جائے گی تو اللہ ان کو پھر زندہ کر دے گا۔ مگر کافروں کی حالت اس کے خلاف ہو گی وہ دوزخ کے اندر نہ مریں گے نہ جئیں گے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ یہ فعل محذوف کا مفعول ہے جس کی تشریح آئندہ فعل میں کی گئی ہے یعنی طاغیوں کے ہر عمل اور ہر بیہودگی کو ہم نے گھیر لیا ہے (احاطہ عددی کر لیا ہے)

أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿٢٩﴾ كِتَابًا یا تمیز ہے یا حال ہے اور کتاب مصدر بمعنی مکتوب ہے یا مفعول مطلق ہے جیسے ضربتہم سوطا میں نے ان کو ضرب تازیانہ لگائی یعنی میں نے ان کے ہر عمل کو اس طرح احصاء کر لیا ہے جیسے تحریر احصاء کر لیتی ہے یا كِتَابًا فعل محذوف کا مفعول ہے یعنی ہم نے ان کے اعمال کو احاطہ کر لیا ہے اور لوح محفوظ میں یا کرام کاتبین کے اعمالناموں میں لکھ رکھا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے میرے نزدیک وفاقا کی علت ہے جیسے إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا۔ جَزَاءً کی علت ہے مطلب یہ ہو گا کہ ہم ان کو اس لئے سزا دیں گے کہ وہ حساب کا انکار اور تکذیب کرتے تھے اور یہ سزا ان کے اعمال کے موافق ہو گی کیونکہ ان کے اعمال اور بیہودگیاں ہم نے لکھی ہیں کوئی چیز بغیر لکھے نہیں رہی اسی کے مطابق ان کو سزا ملے گی۔

فَذُوقُوا فاء سببی ہے اور بطور التفات (کلام کے رخ کو موڑنا) الطاغین کو خطاب ہے یعنی چونکہ ہم نے ان کے اعمال کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس لئے ان سے کہیں گے کہ عذاب کا مزہ چکھو۔

فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ اے طاغیو جب تک تم دوزخ میں ہو ہم تمہارا عذاب بڑھاتے ہی رہیں گے۔ ابن ابی حاتم ابن مردویہ اور ابن ابی ہریرہ اسلمیؓ نے مرفوعاً اور طبرانی و بیہقی نے بعث میں موقوفاً لکھا ہے (کہ حضور ﷺ نے فرمایا) دوزخیوں کے حق میں یہ آیت قرآن کی تمام آیات سے زیادہ سخت ہے واللہ اعلم۔

جب اللہ نے طاغین کا ذکر فرما دیا تو اب متقیوں کا بیان شروع کیا اور فرمایا۔

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَكَأْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾

متقیوں کے لئے بڑی کامیابی ہو گی چمنستان اور انگور اور نوجوان نوخیز شباب ہمجولی لڑکیاں اور چھلکتے جام ہوں گے۔

مَفَازًا (مصدر) کامیابی اور دوزخ سے نجات یا (اسم ظرف) مقام کامیابی۔ كَوَاعِبَ نوخیز شباب لڑکیاں۔ یہ کاعب کی جمع ہے۔

اَتْرَابًا ہم جولی ہم سن دِهَاقًا لبریز حضرت ابن عباسؓ۔ حسن بصریؒ۔ قتادہ۔ یا پے درپے۔ سعید بن جبیر۔ یا صاف۔ عکرمہ۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ یہ جملہ متقین کی ضمیر سے حال ہے اور فِیْهَا کی ضمیر مَفَازًا کی طرف راجع ہے کیونکہ مفازا سے مراد ہے حدائق اور جنتیں۔ یا کاسا کی صفت ہے اور فِیْهَا کی ضمیر کاسا کی طرف راجع ہے یعنی دنیوی شراب پینے کے وقت جس طرح لغو اور بیہودہ باتیں سنی جاتی ہیں اس طرح جنت کی شراب پینے کے وقت نہیں سنی جائیں گی۔ لغو بیہودہ بات۔ کِذّٰبًا بمعنی تکذیب یعنی کوئی کسی کی تکذیب نہیں کرے گا۔ جنت میں کذب کا وجود ہی نہیں ہو گا۔ کسائی کی قرات میں کِذَابًا بلا تشدید ہے اس صورت میں یہ مصدر ہو گا بعض کا قول ہے کہ کذاب بمعنی کذب ہے۔ بعض علماء نے کِذَاب کو کِذّاب کا ہم معنی کہا ہے۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً جَزَآءً اور عَطَآءً دونوں مصدر ہیں فعل محذوف کے مفعول مطلق ہیں جملہ سابقہ کی تاکید کے لئے ہیں جیسے جَزَاءً وِفَاقًا میں ہم نے بیان کر دیا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کو کامل جزا اور کامل عطا دی جائے گی۔

(یہ فقیر کہتا ہے شاید یہ مطلب ہے کہ متقیوں کو جو کچھ ملے گا وہ بظاہر ان کے اعمال صالحہ کی جزا ہو گی مگر حقیقت میں محض عطاالٰہی ہو گی کیونکہ اعمال بذات خود موجب جزا نہیں ہیں)

حِسَابًا ﴿۳۶﴾ یہ عطاء اکی صفت ہے پوری پوری۔ کامل عطا احسبت فلانا کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس کو اتنا دیا جو اس کے لئے کافی تھا یہاں تک کہ اس نے بس۔ کہہ دیا۔ ابن عتبہ نے کہا عطاء ا حسابا تاکید لنفسہ ہو گا جیسے الله اکبر دعوة الحق اور له علی الف درهم اعترافا بعض علماء نے کہا حِسَابًا کا معنی ہے اعمال کے موافق۔ بقدر اعمال۔ قاموس میں ہے هذا یحسبه یہ شمار میں اس کے برابر ہے اس صورت میں جَزَآءً وِّفَاقًا کے مقابلہ میں جَزَآءً اعَطَآءً احِسَابًا ہو گا مطلب یہ نکلے گا کہ اہل طغیان کو ان کے اعمال اور بیہودگیوں کے بقدر سزا ملے گی اور اہل تقویٰ کو ان کے اعمال کے مطابق جزا۔ میں کہتا ہوں کہ (جزاء اعمال کے مطابق نہیں) بلکہ اللہ کی مشیت اور فضل کے مطابق ملے گی کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اور اہل عمل کے اخلاص اور ان کے مراتب قرب کے اعتبار سے جزا ملے گی کیونکہ مقربین کو تھوڑے عمل کا بھی اتنا اجر ملے گا کہ ابرار کو زیادہ عمل کا بھی نہیں ملے گا۔ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میرے صحابیوںؓ کو گالیاں نہ دو اگر تم میں سے کوئی کوہ احد کی برابر سونا بھی راہ خدا میں خرچ کر دے تو صحابیوںؓ کے ایک مد بلکہ آدھے مد کے برابر نہ ہو گا (مد بقدر ایک سیر) اور یہ تفاوت اہل قرب کے آپس میں بھی درجات قرب کے فرق کے لحاظ سے ہو گا۔ مجدد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ تمام صحابہؓ اور بکثرت تابعین اور کچھ تبع تابعین یعنی مقربین کمالات نبوت کی وجہ سے دوامی تجلی ذات میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن ان تینوں قرون (دور دن) کے بعد جن کے خیر ہونے کی شہادت احادیث میں آچکی ہے اس دولت عظمٰی کی روشنی بجھ گئی اور اس کے نشانات بھی مٹ گئے پھر ہجرت سے ہزار سال کے بعد اللہ نے بعض بزرگوں کو پیدا کیا اور ان کو اولین کی طرح کمالات عطا فرمائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا تھا کہ میری امت بارش کی طرح ہے جس میں نہیں جانا جا سکتا کہ اس کا اول حصہ بہتر ہے یا آخر حصہ۔ ترمذی بروایت حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں اس امت کے اول و آخر کو یکساں قرار دیا کہ معلوم نہیں اس کا اول دور بہتر ہے یا آخر دور۔

حضرت جعفر بن محمدؒ کے دادا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوش ہو جاؤ بشارت سن لو کہ میری امت کی حالت بارش کی طرح ہے جس میں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر۔ یا باغ کی طرح ہے جس سے ایک گروہ ایک سال اور دوسرا گروہ دوسرے سال پھل کھاتا ہے ممکن ہے کہ آخر میں پھل کھانے والا گروہ سب سے زیادہ لمبا چوڑا اور گہرا ہو اور سب سے زیادہ نیکیوں والا ہو الحدیث بیہقی۔ اور رزین نے ایک صحابی کی روایت سے جنہوں نے خود حضور سے سنا تھا نقل کیا ہے

کہ اس امت کے آخر میں ایک قوم آئے گی جس کا اجر اوائل امت کی طرح ہوگا بیہقی فی دلائل النبوۃ۔
اس تفسیر پر جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا تاکید لغیرہ ہوگا جیسا کہ ہم نے جَزَاءً وِفَاقًا میں بیان کر دیا۔
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا　کوفیوں کی قرات میں رب جر کے ساتھ ہے اور باقی قراء کے نزدیک رب رفع کے ساتھ۔
الرَّحْمٰنِ　عاصم اور ابن عامر کی قرات میں جر کے ساتھ اور باقی اہل قرات کے نزدیک رفع کے ساتھ ہے۔ بر قرات جر رب اور الرحمٰن دونوں رَبِّكَ کی صفت ہوں گے یا بدل ہوں گے اور بر قرات رفع رَبُّ السَّمٰوٰتِ مبتدا ہوگا اور الرحمن اس کی صفت اور لَا يَمْلِكُوْنَ خبر یا رَبُّ السَّمٰوٰتِ خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے یعنی وہ رب السموات ہے اور الرحمن رب کی صفت ہے یا ھُوَ (محذوف) مبتدا رب السموات پہلی خبر۔ الرحمن دوسری خبر اور لَا يَمْلِكُوْنَ تیسری خبر ہے وغیرہ۔
لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا　یعنی زمین و آسمان والوں میں سے کوئی بھی رحمٰن سے خطاب کرنے کی قدرت نہیں رکھے گا۔ کلبی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ کوئی اللہ پر اعتراض نہ کر سکے گا کہ بعض کو بعض سے زیادہ اجر کیوں دیا کیونکہ سب خدا کے بندے ہیں اس کی ملک ہیں کسی کو ثواب کا استحقاق نہیں ثواب اللہ کی مہربانی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری زندگی کا زمانہ گزشتہ امتوں کے زمانہ کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا عصر سے مغرب تک کا وقت تمہاری مثال یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے کسی نے کام کرنے کے لئے مزدور رکھے اور کہا جو شخص دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک قیراط ملے گا چنانچہ یہودیوں نے ایک ایک قیراط کی شرط پر کام کیا پھر اس نے کہا جو دوپہر سے عصر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ نصاریٰ نے دوپہر سے عصر تک ایک ایک قیراط کی شرط پر کام کیا پھر اس نے کہا جو شخص نماز عصر سے مغرب تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گی۔ پس اب تم ہی وہ لوگ جو عصر سے مغرب تک کام کرو گے خوب سن لو۔ تمہارے لئے دوہرا اجر ہے اس پر یہودی اور عیسائی ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کام ہمارا زیادہ ہے اور عطیہ ہم کو کم ملا اللہ نے فرمایا کیا میں نے تمہارے حق میں سے کچھ مار لیا یہود و نصاریٰ نے کہا نہیں اللہ نے فرمایا تو پھر میری مہربانی ہے میں نے جس کو چاہا دیا۔ بخاری۔
میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے جو گزشتہ اقوام کے مقابلہ میں اس امت کی میعاد زندگی عصر سے مغرب تک قرار دی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کی عمریں کوتاہ اور عمل زیادہ ہوں گے۔ اور دو قیراط سے مراد مطلق کثرت ہے جیسے آیت ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ میں کثرت مراد ہے صرف دو گنا مراد نہیں ہے۔ ہماری اس تفسیر پر آیت گزشتہ آیت جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا سے مربوط ہو جائے گی۔
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا　يَوْمَ کا تعلق لَا يَمْلِكُوْنَ سے ہے یعنی جس روز روح و ملائکہ کا قیام ہوگا اس روز اللہ سے کوئی خطاب نہ کر سکے گا یا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ سے متعلق ہے یعنی اس روز سوائے اس کے جس کو خدا اذن دے دے اور کوئی اللہ سے کلام نہیں کر سکے گا۔ اول صورت زیادہ ظاہر ہے۔
روح کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ روح چوتھے آسمان پر ہے۔ تمام آسمانوں سے پہاڑوں سے اور ملائکہ سے بڑا ہے۔ بغوی نے اتنا اور بھی بیان کیا ہے کہ وہ روزانہ بارہ ہزار بار تسبیح (سبحان اللہ) پڑھتا ہے اور اس کی ہر ایک تسبیح سے اللہ ایک فرشتہ کو پیدا کر دیتا ہے قیامت کے دن روح تنہا ایک صف ہوگا۔
اس آیت کے ذیل میں ابو الشیخ نے ضحاک کا قول بیان کیا ہے کہ روح اللہ کا صاحب ہے اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تمام فرشتوں سے بڑا ہے اگر منہ کھول دے تو سارے ملائکہ اس میں سما جائیں فرشتے اس کی ہیبت سے اس کی طرف نظر نہیں اٹھاتے اور اوپر کو نہیں دیکھتے۔ ابو الشیخ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں ہر منہ

میں ستر ہزار زبانیں ہیں ہر زبان میں ستر ہزار بولیاں ہیں اور ان تمام بولیوں میں وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے۔
ابوالشیخ نے باسناد عطا حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جس کے دس ہزار بازو ہیں باسناد ابوطلحہؒ حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ وہ جسمانیت میں سب فرشتوں سے بڑا ہے۔ بغوی نے عطا کی روایت میں اتنا اور نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تنہا روح ایک صف میں اور باقی ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے پس اس کی جسمانیت ان سب کے برابر ہو گی۔
ابوالشیخ نے مقاتل بن حبان کا قول نقل کیا ہے کہ روح اشرف الملائکہ ہے تمام ملائکہ سے زیادہ خدا کا مقرب ہے صاحب وحی ہے۔
اسی آیت کے ذیل میں ضحاک کا قول بروایت ابوالشیخ آیا ہے کہ روح جبرئیل علیہ السلام ہیں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت جبرئیلؑ قیامت کے دن اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اللہ کے خوف سے ان کے شانے لرز رہے ہوں گے اور عرض کرتے ہوں گے تو پاک ہے سوائے تیرے کوئی معبود نہیں ہم نے اور مشرق سے لے کر مغرب تک کسی نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔ آیت یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا کا یہی مطلب ہے۔ ابو نعیمؒ نے مجاہدؒ کا اور ابن مبارک نے ابو صالح مولی ام ہانی کا قول نقل کیا ہے کہ روح آدمی کی شکل کی ایک اور مخلوق ہے جو آدمی نہیں ہے۔ بغوی نے اتنا زائد بیان کیا کہ وہ ایک قطار میں ہو گی اور ملائکہ ایک قطار میں ان کی بھی ایک جماعت ہو گی اور ان کی بھی ایک جماعت بغوی نے یہی قول قتادہؒ کا نقل کیا ہے۔ ابوالشیخ نے باسناد مجاہد حضرت ابن عباسؓ کی حدیث مرفوعاً نقل کی ہے کہ اللہ کی فوجوں میں سے روح ایک فوج جماعت ہے جو ملائکہ نہیں۔ اس کے سر بھی ہیں اور ہاتھ پاؤں بھی پھر یہ آیت تلاوت کی یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا اور فرمایا ایک ان کی جماعت ہو گی اور ایک ان کی۔
بغوی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے روح کو اولاد آدم کی شکل پر پیدا کیا ہے۔ جو فرشتہ آسمان سے اترتا ہے اس کے ساتھ روح کا ایک شخص ضرور ہوتا ہے۔ ابن مبارک اور ابوالشیخ نے بیہقی کا قول یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن رب العالمین کے سامنے دو قطاریں کھڑی ہوں گی۔ ایک ملائکہ کی دوسری روح کی۔ بغویؒ نے حسنؒ بصری کا قول نقل کیا ہے کہ روح اولاد آدم ہے یعنی آیت میں روح سے مراد آدمی ہیں) بروایت قتادہ ابن عباس کا بھی یہی قول ہے قتادہ نے کہا اس کو ابن عباس چھپایا کرتے تھے (یعنی یہ ابن عباسؓ کے اسرار میں سے ہے)
صَفًّا یَقُوْمُوْنَ کے فاعل سے حال ہے یا فعل محذوف کا مصدر (مفعول مطلق) ہے یعنی وہ صف بستہ ہوں گے۔
لَا یَتَكَلَّمُوْنَ لَا یَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا کی تاکید ہے کیونکہ جب روح و ملائکہ جو تمام مخلوق سے افضل اور اللہ کے سب سے مقرب ہیں اللہ کے سامنے بول نہیں سکتے تو دوسروں کا ذکر ہی کیا ہے۔
اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ یعنی کوئی نہ بول سکے گا سوا اس کے جس کو بولنے یا شفاعت کرنے کی اللہ اجازت دے دے۔ یہ لَا یَتَكَلَّمُوْنَ کی ضمیر فاعل یا لَا یَمْلِكُوْنَ کی ضمیر فاعل سے حال ہے اول لفظی قرب کی وجہ سے زیادہ ظاہر ہے اور دوسرا معنی کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ شفاعت کرنے اور بولنے کی اجازت روح و ملائکہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔
وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ اور وہ صحیح اور حق بات کہے اور اس پر اعتقاد بھی رکھتا ہو قول سے بطور کنایہ اعتقاد مراد ہے کیونکہ اعتقاد کا اظہار قول سے ہی ہوتا ہے قَالَ کا عطف ہے اَذِنَ پر۔ یعنی دنیا میں اس نے اعتراف حق کیا ہو اور جھوٹی بات نہیں کہی ہو اور سب سے بڑا جھوٹ کفر ہے کیونکہ کسی تاویل سے بھی کفر کا سچ ہونا ممکن نہیں کفر کے بعد اہل بدعت کے قول کا درجہ ہے کیونکہ قرآن ان کی تکذیب کر رہا ہے۔ بعض لوگوں نے قول صواب لا الہ الا اللہ کو قرار دیا ہے۔ پس کفار کو تو بولنے اور معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہو گی اور اہل بدعت کو شفاعت کی اجازت نہ ہو گی (کیونکہ دنیا میں وہ شفاعت کے منکر تھے

اس سے اشارہ معتزلہ کی طرف ہے)

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ یہ دن یعنی مذکورہ بالا احوال والا دن اَلْحَقُّ حق ہی ہے بلا ریب حقانیت اور صداقت پر یہ دن مقصور ہے (یعنی اَلْحَقُّ خبر ہے اور خبر پر الف لام مفید قصر ہوتا ہے پس مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کا دن یقیناً حق ہی ہے)

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝٣٩ مَآبَ جائے رجوع اللہ کے قرب تک پہنچانے والا راستہ یعنی جو چاہے اطاعات اتباع انبیاء اور مجذوب و سالک اہل ہدایت کی پیروی کر کے اللہ کے قرب کا راستہ اختیار کرے۔ فَمَنْ میں فاء سببی ہے کیونکہ اللہ تک پہنچانے والا راستہ اختیار کرنے کا سبب قیامت کا برحق ہونا ہے۔ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا کے متعلق ہے یا حال ہے۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ اے کافرو ہم تم کو عذاب قریب سے ڈراتے ہیں عذاب قریب سے مراد یا عذاب آخرت ہے کیونکہ جو آنے والا ہے وہ قریب ہی ہے یا عذاب قبر مراد ہے اور موت جوتہ کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ یوم عَذَابًا کا مفعول فیہ ہے کیونکہ عذاب بمعنی تعذیب (مصدر) ہے۔ مَا قَدَّمَتْ میں مَا یا سوالیہ ہے اور قَدَّمَتْ (کا مفعول ہونے) کی وجہ سے محل نصب میں ہے یا موصولہ ہے اور يَنْظُرُ کا مفعول ہے اور صلہ میں ضمیر محذوف ہے یعنی قدمتہ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص قیامت کے دن اپنے اس عمل کو جو پہلے اس نے دنیا سے بھیجا ہوگا اپنے اعمالنامہ میں دیکھے گا یا اس کا بدلہ آخرت میں دیکھے گا یا قبر میں دیکھے گا۔ اعمال کو بھیجنے کی نسبت ہاتھوں کی طرف اس لئے کی کہ عموماً کام ہاتھ سے ہی ہوتے ہیں یا ید (ہاتھ) سے بطور کنایہ قدرت اور قوت مراد ہے۔ حضرت عثمان کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخرت کی منزلوں میں قبر پہلی منزل ہے اگر اس سے بچ گیا تو اس کے بعد والی منزلیں آسان ہو جاتی ہیں اور اس سے نہ بچا تو بعد والی منزلیں اس سے زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ عذاب قبر کے متعلق احادیث بہت ہیں صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ دو قبروں کی طرف سے گزرے فرمایا ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا ہے (بلکہ معمولی چیز کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے جس سے پرہیز رکھنا بہت آسان ہے) ایک تو پیشاب سے آڑ نہیں کرتا تھا اور مسلم کی روایت میں ہے ایک تو پیشاب سے اپنا بچاؤ نہیں رکھتا تھا اور دوسرا چغلیاں کھاتا پھرتا تھا۔

قبر کے اندر بعض اعمال کے سامنے آنے پر حضرت براء بن عازب والی لمبی حدیث دلالت کرتی ہے اس حدیث میں مومن کے تذکرہ کے ذیل میں آیا ہے۔ پھر اس کے لئے وہاں تک کشادگی ہو جاتی ہے جہاں تک اس کی نظر پہنچے اور اس کے پاس ایک خوبصورت خوش لباس پاکیزہ خوشبو والا آدمی آتا ہے اور کہتا ہے خوش کن چیزوں کی تجھے بشارت ہو یہ تیرا وہی دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا مومن اس سے کہتا ہے تیرا چہرہ تو بڑا خوبصورت چہرہ ہے تو خیر کو لے کر آ رہا ہے تو کون ہے وہ کہتا ہے میں تیرا نیک عمل ہوں کافر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس کی قبر تنگ کی جاتی ہے (اور اس کو زمین اتنا دباتی ہے) کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر نکل جاتی ہیں اور ایک بدرو بدلباس بدبودار آدمی اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے میں تیرا عمل بد ہوں تجھے بشارت ہو ایسی چیز کی جو تیرے لئے ناگوار ہے۔ یہ تیرا وہی دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا وہ کہتا ہے تو کون ہے تیرا چہرہ تو بڑا بدصورت ہے تو بری چیز لے کر آیا وہ کہتا ہے میں تیرا عمل خبیث ہوں۔ الحدیث۔ رواہ احمد۔

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝٤٠ اور کافر کہے گا کاش میں خاک ہو جاتا۔ حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو زمین کو چمڑے کی طرح کھینچ دیا جائے گا اور اللہ ساری مخلوق یعنی انسان جنات چوپایوں اور وحشی جانوروں کو اٹھائے گا اس روز اللہ چوپایوں کو آپس میں بدلہ دلوائے گا یہاں تک کہ منڈی بکری کا سینگ والی بکری سے بھی بدلا دلوائے گا جب چوپایوں کے باہمی قصاص سے فارغ ہو جائے گا تو فرمائے گا خاک ہو جاؤ (وہ خاک ہو جائیں گے) کافر یہ بات دیکھ کر کہے گا کاش میں بھی خاک ہو جاتا۔

ع ٢ ١٠ ٢

دینوری نے یحییٰ بن جعدہ کی روایت سے اور ابن جریر و ابن حاتم و بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اور بغوی نے مقاتل کا قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے اس قول میں یہ الفاظ ہیں کہ کافر کہے گا کاش میں دنیا میں خنزیر کی شکل پر ہوتا اور آج میں خاک ہو جاتا۔

بغوی نے کہا زیاد اور عبداللہ بن ذکوان کا قول ہے جب اللہ لوگوں کا فیصلہ کر چکے گا جنتیوں کو جنت کی طرف اور دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لے جانے کا حکم دے چکے گا تو دوسری انواع کی حیوانات اور مومن جنات کے متعلق فیصلہ صادر فرمائے گا اور وہ لوٹ کر خاک بن جائیں گے اس وقت کافر کہے گا کاش میں خاک ہو جاتا۔ ابن سلیم نے کہا مومن جنات لوٹ کر خاک ہو جائیں گے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکافر سے مراد ہے ابلیس کیونکہ اس نے آدمؑ کی تخلیق خاکی کی تحقیر کی تھی اور اپنے آتشی خلقت ہونے پر فخر کیا تھا جب قیامت کے دن آدمؑ اور ایمان دار اولاد آدم کے ثواب
و رحمت کو دیکھے گا اور اپنی سزا و سختی کی حالت اس کو نظر آئے گی تو
کہے گا کاش میں مٹی ہوتا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا
اللہ فرمائے گا ایسا نہیں ہو سکتا۔ جس نے
میری مثل کسی کو قرار دیا اس کی
کوئی عزت نہیں۔

(سورۃ النباء ختم ہوئی بعونہ ومنہ تعالیٰ)

سورۃ النازعات

یہ سورت مکی ہے اس میں ۴۶ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ واؤ قسمیہ ہے۔ جواب قسم محذوف ہے۔ یعنی قسم ہے نَازِعَاتِ اور نَاشِطَاتِ کی تم کو ضرور اٹھایا جائے گا اور بلاشبہ تم سے حساب فہمی ہو گی۔ محذوف جواب پر آئندہ آیت دلالت کر رہی ہے۔

اَلنَّازِعَات غَرْقًا سے مراد ہیں وہ ملائکہ جو کافروں کی جانیں پوری قوت اور شدت سے نکالتے ہیں۔ غَرْقًا اسم ہے لیکن بجائے مصدر کے مستعمل ہے یعنی مفعول مطلق من غیر لفظہ ہے جیسے قعدت جلوسا میں جلوسا مفعول مطلق من غیر لفظہ ہے۔ اغرق النازع فی القوس کمان کھینچنے والے نے پوری قوت اور شدت کے ساتھ جہاں تک کھنچاؤ ممکن تھا کمان کو کھینچا۔ اَلنَّاشِطَاتِ نَشْطًا سے مراد ہیں وہ ملائکہ جو اہل ایمان کی جانیں آہستگی کے ساتھ نکالتے ہیں یہ لفظ نشط الدلو ڈول کو آسانی کے ساتھ بغیر تکلیف کے نکال لیا کے محاورہ سے ماخوذ ہے یا نشط الحبل سے ماخوذ ہے یعنی رسی کو اتنا ڈھیلا چھوڑ دیا کہ وہ کھل گئی۔ درحقیقت مومن دنیوی مصائب میں گویا بندھا ہوا قیدی ہوتا ہے ملائکہ اس بندش سے اس کو رہا کرتے اور آسانی سے اس کی گرہ کھول دیتے ہیں جیسے اونٹ کا زانو بند کھول دیا جاتا ہے (اور اونٹ آزاد ہو جاتا ہے) حدیث میں مومنوں کی روح کے متعلق آتا ہے کہ گویا انکا زانوں بند کھول دیا گیا اور ان کو رہا کر دیا گیا۔ حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مومن دنیا سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ کی حالت میں ہوتا ہے تو آفتاب جیسے گورے چہروں والے ملائکہ جنتی کفن اور بہشتی خوشبو لے کر آتے ہیں اور مد نظر کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے نفس مطمئنہ اللہ کی مغفرت اور خوشنودی کی طرف نکل کر چل فوراً جان اس طرح بہہ کر باہر آجاتی ہے جیسے مشکیزہ سے پانی کا قطرہ ملک الموت اس کو لے لیتا ہے مگر وہ ملائکہ لحہ بھر نفس کو ملک الموت کے پاس نہیں چھوڑتے اور خود اپنے قبضہ میں لے کر جنتی کفن اور بہشتی خوشبو میں رکھ دیتے ہیں اور اس سے پاکیزہ ترین مشک کی خوشبو نکلتی ہے۔ الحدیث۔ اور کافر بندہ جب دنیا سے قطع تعلق کی حالت میں ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ رو ملائکہ ٹاٹ لے کر اس کے پاس آتے ہیں اور بقدر مد نظر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے اے نفس خبیث اللہ کے غضب کی طرف نکل کر چل جان بدن کے اندر ڈرتی پھرتی ہے مگر ملک الموت اس کو اس طرح کھینچ کر نکالتا ہے جیسے خار دار تار تر اون سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے آخر اس کو پکڑ لیتا ہے اس کے بعد وہ ملائکہ اس کو لحہ بھر تاخیر کئے بغیر لے لیتے ہیں اور ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں اور اس سے مردار کی بو کی طرح بدبو نکلتی ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ملک الموت کافر کی جان اور رگوں سمیت کھینچتا ہے۔ رواہ احمد۔

بغویؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول بیان کیا ہے کہ ملک الموت کافر کی جان ہر بال اور ناخن اور قدموں کے تلوؤں کے نیچے سے کھینچتا ہے اور جسم کے اندر اس کو لوٹا دیتا ہے پھر کھینچتا ہے یہاں تک کہ جب وہ نکلنے کے قریب آجاتی ہے تو پھر بدن کے اندر لوٹا دیتا ہے کافر کی جان کے ساتھ اس کا یہ عمل ہوتا ہے مقاتل نے کہا ملک الموت اور اس کے مددگار کافر کی جان کو اس طرح

کھینچتے ہیں جیسے بہت زیادہ شاخ دار تار تر اون میں سے کھینچا جاتا ہے۔

فائدہ

روایت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کثیف کی طرح نفس بھی ایک جسم ہے مگر لطیف جو بدن میں نفوذ کئے ہوئے ہے اور عناصر اربعہ کی پیداوار ہے اور روح و قلب اور دوسرے غیر مادی جواہر ممکنہ جن کا وجود عالم امر سے تعلق رکھتا ہے اس پر حاکم ہیں چونکہ جواہر مجردہ لطیف اور غیر مادی ہیں اس لئے کشف کی نگاہ سے ہی عالم مثال میں عرش کے اوپر ان کی ہستی دیکھی جاتی ہے (مادی نظر سے اس عالم خلق میں ان کو نہیں دیکھا جاسکتا)۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ ارواح کے سامنے نفوس کو اللہ نے اپنے کمال قدرت سے اس طرح قائم کیا ہے جیسے سورج کے سامنے آئینہ جس طرح آئینہ سورج کی کرنوں سے بھر جاتا ہے اور جگمگا جاتا ہے اسی طرح روح کا فیضان نفس پر ہوتا ہے یا نفس چاند کی طرح اور روح سورج کی طرح ہے اور فلاسفہ کا قول ہے کہ چودھویں کا چاند سورج کی روشنی سے بھرپور روشن ہوتا ہے پس بدن کی زندگی تو نفس کی وجہ سے ہے اور نفس کی حیوٰۃ روح کی وجہ سے میعاد مقرر پر نفس کو بدن سے کھینچ لیا جاتا ہے لیکن روح مجرد کا تعلق منقطع نہیں ہوتا نفس کے کھنچ جانے سے روح نہیں کھنچتی۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ نفس کو بدن سے کھینچا جاتا ہے اور کفن و حنوط (ایک خاص خوشبو) میں رکھ کر اوپر چڑھایا جاتا ہے اور نفس مومن کے لئے ساتویں آسمان تک سب آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پھر اللہ فرماتا ہے میرے بندے کے اعمالنامے کو علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ زمین سے ہی میں نے ان کو پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹاؤں گا اور اسی سے دوبارہ برآمد کروں گا۔ کافر کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے بلکہ اس کی روح کو زمین پر پھینک دیا جاتا ہے۔

اس حدیث سے صراحتہً معلوم ہوتا ہے کہ روح بمعنی نفس ایک جسم ہے جو زمین سے بنا ہے یعنی عنصری ہے مادی ہے اس تحقیق کی بناء پر اب عذاب قبر کے انکار کی گنجائش نہیں رہی جیسا کہ بعض اہل بدعت معتزلہ کا خیال ہے کہ بدن کثیف سے قطع نظر کر کے عذاب قبر ممکن نہیں۔ اہل حق کے نزدیک تو عذاب قبر بدن کثیف پر بھی ممکن ہے موت اس سے مانع نہیں۔ سورۂ بقرہ میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ سیر کرنے والوں کی یا تیرنے والوں کی قسم۔ مجاہدؒ نے کہا اس سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو تیزی کے ساتھ اعلیٰ گھوڑے کی رفتار کی طرح اترتے ہیں۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ اور سبقت کرنے والوں کی قسم۔ مجاہد نے کہا ان سے مراد ہیں وہ ملائکہ جو نیکی اور عمل صالح میں انسان سے آگے ہیں مقاتل نے کہا وہ ملائکہ مراد ہیں جو مومنوں کی روحوں کو جنت یعنی ثواب کی طرف لے جاتے ہیں میں کہتا ہوں اور کافروں کی روحوں کو عذاب کی طرف۔ یہ وہی ملائکہ ہیں جن کا ذکر حضرت براء کی روایت کردہ حدیث میں پہلے آچکا ہے کہ ملک الموت جب نفس پر قبضہ کر لیتا ہے تو ملائکہ لحہ بھر اس نفس کو اس کے پاس نہیں چھوڑتے بلکہ خود لے لیتے ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ کا قول مروی ہے کہ اَلسّٰبِقٰتِ سے مراد ہیں اہل ایمان کے نفوس جو قبض کرنے والے ملائکہ کی جانب اللہ کی ملاقات کے شوق اور انتہائی خوشی میں بڑھتے ہیں۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝ اور امر کا انتظام کرنے والوں کی قسم۔ ابن ابی الدنیا کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ اَلْمُدَبِّرٰت سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو مردوں کی روحیں قبض کرنے کے وقت ملک الموت کے ساتھ آتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو روح کو چڑھا کر لے جاتے ہیں اور بعض میت کے لئے کی جانے والی دعا پر آمین کہتے ہیں اور بعض میت کے

لئے اس وقت تک دعا مغفرت کرتے ہیں کہ اس پر نماز پڑھ لی جائے اور اس کو قبر میں رکھ دیا جائے۔
بغوی کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک وہ ملائکہ مراد ہے جن کے کے سپرد کچھ کام بحکم خدا کر دیئے گئے ہیں اور ان کو انجام دینے کا طریقہ اللہ نے ان کو بتادیا ہے۔
عبدالرحمٰن بن سابطؒ نے کہا دنیا کا انتظام کرنے والے چار فرشتے ہیں جبرئیلؑ میکائیل ملک الموت اور اسرافیلؑ، جبرئیلؑ کے سپرد ہوائیں اور فوجیں ہیں (یعنی اگر ملائکہ کو لے کر مومن مجاہدوں کی مدد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بحکم الٰہی جنود ملائکہ کی قیادت جبرئیلؑ کرتے ہیں اور میکائیل کے سپرد بارش اور زمین کی روئیدگی کی خدمت ہے اور ملک الموت قبض ارواح پر مامور ہیں اور اسرافیل اللہ کا امر لے کر ان کے پاس اترتے ہیں۔ قتادہ نے اَلْمُدَبِّرَات کے علاوہ باقی تینوں سے ستارے مراد لئے ہیں ستارے ایک افق سے دوسرے افق کی طرح کھینچے (زبردستی بغیر طبعی میلان کے) جاتے ہیں پھر ڈوب جاتے ہیں اور ایک افق سے دوسرے افق کی طرف (طبعی میلان کے ساتھ) حرکت بھی کرتے ہیں اللہ نے فرمایا ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ اور باہم رفتار میں ستارے سبقت بھی کرتے ہیں۔ یہ قول ضعیف ہے نزع نشط اور سبح میں اس قول پر کوئی نمایاں فرق نہیں اور ایک ہی چیز کو چار مرتبہ ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ نزع اور نشط میں یہ فرق قائم کرنا کہ مشرق سے مغرب کی طرف ستاروں کی قسری (خلاف طبع) حرکت نزع ہے اور ایک برج سے دوسرے برج کی طرف مناسب طبع حرکت نشط ہے۔ یہ فرق یونانی فلسفیوں کے خیال پر مبنی ہے جو قائل ہیں کہ ہر آسمان دوسرے سے چپاں ہے اسی صورت میں حرکت قسری (غیر طبعی) کا امکان ہو سکتا ہے مگر شرع کے نزدیک (بعض احادیث سے) ثابت ہے کہ ایک آسمان دوسرے آسمان سے پانچ سو برس کی راہ کے فاصلہ پر ہے۔
اس آیت کی تاویل میں کچھ عقلی احتمالات بغیر روایت و نقل کے کچھ اور بھی بیان کئے گئے ہیں بیضاوی نے لکھا ہے یہ نفوس فاضلہ کے احوال ہیں جو بدن سے جدا ہونے کے وقت ہوتے ہیں۔ نفوس فاضلہ اول ابدان سے شدت کے ساتھ کھنچتے ہیں۔ اغراق النازع فی القوس کمان کھینچنے میں شدت اور زور کرنا۔ اس جگہ بھی اَلنّٰزِعٰتِ غَرْقًا اسی محاورہ سے ماخوذ ہے پھر تیزی کے ساتھ عالم ملکوت کی طرف جاتے پھر وہاں اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں پھر حظیرہ قدس کی طرف بڑھتے ہیں یہاں تک کہ اپنے مرتبہ اور قوت کی وجہ سے مدبرات میں سے ہو جاتے ہیں یا یوں کہو کہ بوقت سلوک الی اللہ سالکین کے نفوس فاضلہ کے یہ احوال ہوتے ہیں خواہشات نفس سے نکل کر عالم القدس کی طرف نشاط کے ساتھ جاتے۔ پھر مراتب ترقی میں تیرتے۔ پھر کمالات کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مدبرات میں سے ہو جاتے ہیں (یعنی دوسرے لوگوں کو سلوک راہ کا طریقہ بتانے والے)

یا مجاہدوں کے احوال مراد ہیں کہ ان کے ہاتھ کمانوں کو قوت کے ساتھ کھینچتے پھر چستی کے ساتھ تیر پھینکتے ہیں اور وہ بحر و بر میں پھرتے ہیں اور دشمن کے مقابلہ کی طرف بڑھتے ہیں اور جنگی امور کا نظم کرتے ہیں۔
یا یہ مجاہدوں کے گھوڑوں کے اوصاف ہیں ان کے گھوڑے اپنی لگاموں میں شوخیاں کرتے ہیں پسینہ میں ڈوبے ہوتے ہیں دارالاسلام سے دارالکفر کی طرف جاتے ہیں۔ رفتار میں (ہمواری رکھتے ہیں گویا) تیرتے ہیں۔ دشمن کی طرف سبقت کرتے ہیں آخر میں امر فتح کا انتظام کرتے ہیں۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ یَوْمَ ظرف زمان قسم کے جواب محذوف سے متعلق ہے یعنی تمہارا حشر و حساب اس روز ہوگا جس روز زمین و پہاڑ میں زلزلہ آئے گا۔ اس روز کی مقدار تو نفخہ اولیٰ کے وقت سے جنت و دوزخ کے داخلہ کے وقت تک پچاس ہزار برس کی ہوگی مگر حشر و حساب اس دن کے کچھ حصہ میں ہوگا انہی اجزاء وقتی کے لحاظ سے پورے دن کو یوم الحشر والحساب قرار دیا۔
بیہقی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ یعنی زمین اور پہاڑوں میں لرزہ آئے گا۔ الراجفۃ زلزلہ۔ اس کے بعد دوسرا زلزلہ آئے گا۔

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ⑦ اَلرَّاجِفَۃ سے مراد ہے پہلا نفخہ اور الرَّادِفَۃ سے مراد ہے دوسرا نفخہ۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے۔ پہلے نفخہ کو راجفہ کہنے کی یہ وجہ ہے کہ پہلی بار صور پھونکنے سے زلزلہ آجائے گا اور ہر چیز ہل جائے گی اور مخلوق مرجائے گی دوسرے نفخہ کو رادفہ اس لئے کہا کہ وہ پہلے کے پیچھے آئے گا۔ ابن مبارک نے حسنؒ بصری کا مرسل قول نقل کیا ہے کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس برس کی مدت ہوگی اول نفخہ سے بحکم خدا ہر مرنے والی چیز مرجائے گی۔ حلیمیؒ نے بیان کیا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہونے پر تمام روایات متفق ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں نفخوں کے درمیان چالیس کی مدت ہوگی لوگوں نے پوچھا ابوہریرہؓ کیا چالیس دن کی میعاد ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا مجھے اس سے انکار ہے لوگوں نے کہا تو پھر چالیس مہینے ہوں گے ابوہریرہؓ نے کہا مجھے اس سے بھی انکار ہے پھر اللہ آسمان سے بارش برسائے گا جس سے لوگ (ایسے قبروں سے) اگیں گے جیسے سبزی اگتی ہے۔ انسان کا ہر جزء بدن فنا ہو جاتا ہے۔ سوائے دم گزے کی ہڈی کے۔ اسی سے قیامت کے دن جڑ کر دوبارہ تخلیق ہوگی۔ ابن ابی داؤد نے البعث میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث لکھی ہے اس روایت میں چالیس سال کا لفظ ہے لیکن اول روایت اس کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے (جس میں چالیس کا لفظ تو ہے مگر سال کا لفظ نہیں ہے)

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا کہ دونوں نفخوں کے درمیان وادی میں سیلاب آجائے گا اور دونوں کے درمیان چالیس (دن یا مہینہ یا سال) کا فاصلہ ہوگا پھر ہر فنا شدہ انسان حیوان چوپایہ زمین سے اگے گا اگر ان کے مرنے سے پہلے کوئی گزرنے والا ان کی طرف سے گزرا ہو اور پھر جی اٹھنے کے بعد ادھر سے گزرے تو ان کو پہچان لے یعنی اول زندگی کی شکل صورت اور دوسری زندگی کی شکل صورت میں کوئی فرق نہ ہوگا پھر روحوں کو چھوڑا جائے گا اور بدنوں سے لاکر ملادیا جائے گا آیت وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا یہی معنی ہے۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ⑧ اَلْوَاجِف تیز رفتار بطور استعارہ اضطراب شدید مراد ہے بہت دل اس روز دھڑکتے ہوں گے سخت مضطرب ہوں گے۔

اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ⑨ خوف کی وجہ سے ان دلوں کی نگاہیں یعنی دل والوں کی نگاہیں پست ہوں گی دل دھڑکنے اور نگاہیں پست ہونے کی وجہ کیا ہوگی۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ⑩ یہ کلام سابق کی علت ہے کیونکہ وہ دنیا میں حشر آخرت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم کو پہلی زندگی میں واپس کیا جائے گا یعنی مرنے کے بعد پھر زندہ کیا جائے گا۔ انا میں استفہام انکاری ہے (یعنی نہیں لوٹایا جائے گا) بعض قراتوں میں ہمزہ استفہام لفظا محذوف ہے مگر معنی مراد ہے۔ الحافرة پہلی زندگی رجع فلان فی الحافرة کا معنی یہ ہے کہ فلاں شخص اپنے اسی طریق پر لوٹ گیا جس پر آیا تھا اور جس کو اپنی مرضی سے اس نے کھودا تھا گویا محفورة بمعنی محفوه کے ہے کھودا ہوا جیسے عيشة راضية یعنی مرضية یا یوں کہو کہ قابل کو مقبول سے تشبیہ دی اور مقبول کی جگہ قابل کا استعمال کیا۔ ابن زید نے کہا اَلْحَافِرَة سے مراد دوزخ ہے۔

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ⑪ استفہام انکاری ہے۔ انکار کے بعد انکار مزید تاکید کے لئے ہے۔ یعنی کیا ہم کو اٹھایا جائے گا یا کیا ہم کو زندگی کی طرف لوٹایا جائے گا جبکہ ہم بوسیدہ ہڈیاں بن جائیں گے۔

سعید بن منصور نے محمد بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت يَقُوْلُوْنَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ نازل ہوئی تو کفار قریش کہنے لگے اگر مرنے کے بعد ہم دوبارہ زندگی کی طرف لوٹے تو بڑے گھاٹے میں رہیں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ⑫ اس کا عطف يَقُوْلُوْنَ پر ہے یا اذ مقدر ہے اور يَقُوْلُوْنَ کے فاعل سے حال ہے لیکن محمد بن کعب کی بیان کردہ شان نزول حال ہونے کی اجازت نہیں دیتی (کیونکہ حال اور ذوالحال کے زمانہ کا اتحاد

ضروری ہے اور یہاں قول دوئم کا زمانہ قول اول کے زمانہ سے موخر ہے) تِلْكَ سے اشارہ رجعت کی طرف ہے اور رجعت کا مفہوم لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ سے مستفاد ہو رہا ہے (گویا مشار الیہ معنی مذکور ہے) یعنی جب ایسا ہو گا جیسا محمد ﷺ کہتے ہیں تو یہ زندگی کی واپسی بڑھے گھاٹے کی ہو گی۔ نقصان رساں ہو گی اور ایسی زندگی والے نقصان میں رہیں گے مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہم دوسری زندگی کی تکذیب کرتے ہیں تو اگر دوسری زندگی ہوئی لامحالہ ہم کو گھاٹا اٹھانا پڑے گا۔ کفار قریش کا یہ کلام بطور استہزاء تھا۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ یعنی نفخہ دوم تو بس ایک جھڑکی ہو گا صحاح میں ہے کہ زجر کا معنی ہے آواز سے نکال دینا زجرتہ فانزجر میں نے اس کو جھڑک کر نکال دیا وہ نکل گیا اس آیت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ صور میں جو آواز پھونکی جائے گی اس سے لوگ قبروں سے باہر نکال دیئے جائیں گے لفظ زجر کا استعمال کبھی صرف آواز میں ہوتا ہے جیسے وَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا میں وہ ملائکہ مراد ہیں جو ابر کو ڈانٹ کی آواز سے ہنکاتے ہیں (نکالتے نہیں ہیں) کبھی صرف نکال دینے کا معنی مراد ہوتا ہے جیسے وازدجر یعنی اس نے نکال دیا روک دیا۔

فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾ فاء عطف کے لئے ہے اور اِذَا مفاجاتی (اچانک اور ناگہاں کے معنی میں) ہے اِذَا کے آنے سے هُمْ بِالسَّاهِرَةِ جو جملہ اسمیہ تھا جملہ فعلیہ کی قوت میں ہو گیا اسی لئے اس کا عطف جملہ فعلیہ پر صحیح ہو گیا مطلب یہ ہو گا کہ دنیا میں یہ ایسی بات کہہ رہے ہیں مگر جب یہ زمین کے اوپر ایک میدان میں ہوں گے تو ناگہاں وہ وقت آہی جائے گا۔ اس صورت میں جملہ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ معترضہ ہو گا جو معطوف علیہ کے درمیان اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ جس لرزہ کے یہ منکر ہیں اس کو لانا اللہ کے نزدیک آسان ہے کچھ دشوار نہیں۔

اَلسَّاهِرَةِ روئے زمین مراد یہ کہ اچانک وہ زندہ ہو کر روئے زمین پر آجائیں گے۔ بعض نے کہا الساھرۃ سے مراد ہے زمین قیامت قتادہ نے کہا جہنم مراد ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿۱۵﴾ استفہام تقریری ہے یعنی آچکی۔ یہ جملہ معترضہ ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تکذیب قوم پر صبر آفرینی مقصود ہے اور کافروں کے لئے تباہی کی دھمکی ہے کہ تم پر بھی کہیں وہی مصیبت نہ آپڑے جو تم سے بڑے لوگوں پر پڑی تھی۔ یعنی تمہارے پاس موسیٰ کے واقعہ کی اطلاع پہنچ ہی چکی ہے کہ۔

إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ حدیث موسیٰ کے مفہوم سے ظرف (اذ) کا تعلق ہے یعنی تمہارے پاس موسیٰ سے تعلق رکھنے والی اس وقت کی بات تو آہی چکی ہے۔ جب اللہ نے ان کو وادی مقدس یعنی طوی میں نداء دی تھی۔ طوی ایک وادی کا نام ہے یا طَیٌّ سے مشتق ہے اور ثُنًی کی طرح ہے اس وقت یہ نُوْدِيَ یا اَلْمُقَدَّس کا مفعول مطلق ہو گا یعنی دوبار نداء دی یا اس وادی کا تقدس دوہرا تھا۔ بصورت اسمیت اَلْوَادِیْ کا عطف بیان ہو گا۔

اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿۱۷﴾ یہ نَادٰی کا بیان ہے یعنی موسیٰ کے جانے سے کچھ پہلے اللہ نے اس سے کہا کہ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ حد سے آگے بڑھ چکا ہے۔

فَقُلْ هَلْ لَكَ إِلَىٰ أَنْ تَزَكَّىٰ ﴿۱۸﴾ اور اس سے کہو کہ کیا تجھے شرک سے پاک ہو جانے کی خواہش ہے۔ تَزَكّٰی تو شرک سے پاک صاف ہو جائے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تو لا اله الا الله کی شہادت دے کیا تجھے اس طرف رغبت ہے۔

وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ﴿۱۹﴾ اور کیا تجھے اس بات کی خواہش ہے کہ میں تجھے اللہ کی معرفت عبادت اور توحید کا راستہ بتاؤں اور نتیجہ میں تو اس کے عذاب سے ڈرنے لگے یعنی فرائض کو ادا کرے اور ممنوعات سے اجتناب رکھے۔ فَتَخْشٰی میں فاء سببی ہے خشیۃ الٰہی (خوف خدا) نتیجہ معرفت ہے اور معرفت ثمرہ ہدایت (لہٰذا خوف خدا نتیجہ ہدایت ہے)

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ﴿۲۱﴾ یہ فعل محذوف پر معطوف ہے یعنی موسیٰ گئے

فرعون کے پاس پہنچے اور اس کو اپنی سچائی کی بڑی نشانی دکھائی یعنی وہ کھلے کھلے عظیم الشان معجزے دکھائے جو واضح طور پر موسیٰ کی صداقت بتا رہے تھے لیکن فرعون نے موسیٰ کو جھوٹا قرار دیا اور موسیٰ کی صداقت معجزات سے ظاہر ہونے کے بعد بھی فرعون نے اللہ اور اس کے پیغمبر کی نافرمانی کی۔ اَلْاٰیَۃَ الْکُبْرٰی سے مراد ہیں معجزات لیکن تمام معجزات چونکہ حضرت موسیٰ کی صداقت ظاہر کرنے میں ایک معجزہ کی طرح تھے (سب میں یکسانیت تھی گویا سب ایک ہی تھے) اس لئے (الایۃ) بصیغہ واحد ذکر کیا اس سے مراد ہے لاٹھی کا سانپ بن جانا۔

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی ﴿۲۲﴾ جب سانپ کو فرعون نے اپنی طرف تیزی سے آتے دیکھا تو منہ پھیر کر پشت موڑ کر تیزی سے بھاگا۔ یَسْعٰی ضمیر اَدْبَرَ سے حال ہے (دوڑتا ہوا تیزی سے بھاگتا ہوا) یا یہ معنی ہے کہ اس نے ملک میں تباہی کی کوشش کرتے ہوئے ایمان اور طاعت سے پشت پھیری۔

فَحَشَرَ فَنَادٰی ﴿۲۳﴾ پھر فوج کو یا جادوگروں کو جمع کر کے مجمع میں پکارا۔

فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ﴿۲۴﴾ یہ نَادٰی کا بیان ہے (یعنی فرعون نے ندا میں یہ) کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں مجھ سے اوپر تمہارا کوئی رب نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ تمہارے کام کے کرتا دھرتا ہیں میں ان سب سے بڑا ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کلام سے فرعون کی مراد یہ تھی کہ یہ بت دیوتا ہیں اور میں ان کا بھی دیوتا ہوں اور تمہارا بھی۔

فَاَخَذَہُ اللّٰہُ نَکَالَ الْاٰخِرَۃِ وَالْاُوْلٰی ﴿۲۵﴾ لغت میں نَکَلٌ کا معنی ہے ضعف اور عجز یا ایسی چیز جو کسی کو کسی کام سے روک دے اور عاجز بنا دے چوپایہ کے پاؤں میں بندھی ہوئی رسی اور لگام کے دہانہ کو بھی نکل اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ چوپائے کو روک دیتے ہیں (آزاد نہیں رہنے دیتے) نکال تَنْکِیْل کا اسم ہے (یعنی عبرت۔ ایسی سزا جو دوسروں کو اس جرم کے اقدام سے روک دے) کہا جاتا ہے نکلت بہ میں نے اس کو ایسی سخت سزا دی کہ دوسروں کے لئے عبرت بن گئی آیت میں نَکَال یا مصدر محذوف کی صفت ہے جو پہلے فعل کی تاکید کر رہا ہے یعنی میں نے اس کی گرفت کی عبرت انگیز گرفت دیکھنے اور سننے والوں کو اس جیسی حرکت کرنے سے روک دینے والی۔

یا فعل محذوف ہے اور نکال اس کا مفعول مطلق برائے تاکید ہے یعنی اللہ نے اس کو پکڑا اور اس کو سخت عبرت بنا دیا۔ نَکَالَ کی اضافت اَلْاٰخِرَۃِ کی جانب بتقدیر فِیْ ہے یا اضافت لامیہ ہے اول صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ (فرعون کی گرفت آخرت میں بھی نکال تھی اور دنیا میں بھی آخرت میں دوزخ کے اندر جلانا اور دنیا میں ڈبونا (دونوں عبرت آفریں سزائیں تھیں) حسنؒ بصری اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ دوسری صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ پہلے لفظ اور دوسرے لفظ کی وجہ سے اللہ نے اس کو عبرت آفریں سزا دی۔ ایک کلمہ تھا اِنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی اور دوسرا کلمہ تھا مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ ان دونوں لفظوں میں چالیس برس کا فصل تھا۔ مجاہد اور ایک جماعت علماء کا یہی قول ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی ﴿۲۶﴾ اس گرفت اور سزا میں اہل خشیہ کے لئے نصیحت ہے۔ من یخشی سے مراد ہیں وہ لوگ جن میں اللہ سے ڈرنے کی صلاحیت ہے (بالفعل خشیہ رکھنے والے اہل تقوی کے لئے تو نصیحت کی ضرورت ہی نہیں ہے)

اس کے بعد آئندہ آیت میں کلام کا رخ بدل کر منکرین حشر کو خطاب فرمایا اور وجود حشر پر اللہ کے قادر ہونے کو موجودہ کائنات کی ایجاد کو ذکر کر کے ثابت کیا اور فرمایا۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ السَّمَآءُ کی خبر محذوف ہے یعنی تخلیق کے اعتبار سے تم زیادہ سخت ہو یا آسمان زیادہ سخت ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے یعنی آسمان کی تخلیق زیادہ سخت ہے آسمان سے مراد ہے آسمان مع ان تمام چیزوں کے جو اس کے اندر ہیں کیونکہ مقام تفصیل میں زمین اور پہاڑوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے خلاصہ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور اس کی موجودات کی تخلیق تمہاری تخلیق سے زیادہ سخت ہے تم کائنات سماوی کا جز ہو اور جز کی تخلیق کل کی تخلیق سے بداہۃً آسان ہوتی

ع ۲۶ / ۲

ہے پھر دوبارہ تخلیق تو خلق اول سے سہل ہی ہے۔

بَنٰهَا ﴿٢٧﴾ اللہ نے آسمان کو بنایا یہ جملہ السماء کی صفت ہے (لیکن جملہ نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے اور السماء معرفہ ہے۔ اور معرفہ کی صفت معرفہ ہونی چاہئے) اور السماء میں الف لام زائد ہے (فرد غیر معین کے لئے ہے) جیسے ولقد امر علے اللئیم یسبنی میں (یسبنی جملہ ہونے کے باوجود اللئیم معرف باللام کی صفت ہے کیونکہ اللئیم سے فرد غیر معین مراد ہے) یا التی موصول محذوف ہے یعنی وہ آسمان جس کو خدا نے بنایا یا دوسرے جملہ کا پہلے جملہ پر عطف ہے اور حرف عطف محذوف ہے۔ دونوں جملوں کو ملانے سے پوری دلیل اس طرح بنتی ہے کہ اللہ نے آسمان بنایا جس کی تخلیق تمہاری تخلیق سے زیادہ دشوار ہے اور جو اس کی تخلیق پر قدرت رکھتا ہے وہ ایسی چیز کو جو آسمان سے کمزور ہے دوبارہ بنانے پر (بدرجہ اولی) قدرت رکھتا ہے۔

رَفَعَ سَمْكَهَا اَلسَّمک بلندی یعنی اللہ نے زمین سے آسمان کی بلندی کی ایک مقدار مقرر کی یا وہ بلندی جو آسمان کے نیچے اور زمین سے فوق ہے اس کو بنایا۔

فَسَوّٰهَا ﴿٢٨﴾ پھر اس کو ہموار بلا شگاف بنایا۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا اور آسمان سے پیدا ہونے والی رات کو تاریک بنایا۔ غَطَشَ اللَّيْل رات اندھیری ہو گئی۔ آسمان کی طرف رات کی اضافت اس لئے کی کہ سورج آسمان پر ہے اور سورج کی حرکت سے رات پیدا ہوتی ہے۔

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿٢٩﴾ اور آسمان کے سورج کی روشنی نمودار کی اور دن کو اس سے پیدا کیا۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴿٣٠﴾ یعنی آسمان کو پیدا کرنے کے بعد اللہ نے زمین کو بچھایا پھیلایا۔

وَالْاَرْضَ سے پہلے دَحٰی فعل محذوف ہے اور فعل محذوف کی تفسیر دَحَاهَا کر رہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بغیر اس کے کہ آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین پھیلائی جائے اللہ نے زمین کو پیدا کر دیا پھر براہ راست آسمان کو بنانے کا ارادہ کیا اور دو روز میں سات آسمانوں کو ٹھیک ٹھیک بنایا پھر دو روز میں زمین کو بچھایا غرض زمین مع اپنی موجودات کے چار روز میں بنائی گئی۔ بعض علماء نے کہا کہ بَعْدَ ذٰلِكَ کا معنی ہے مَعَ ذٰلِكَ یعنی اس کے ساتھ اللہ نے زمین کو بچھایا جیسے آیت میں آیا ہے عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ۔

بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ لفظ بعد اس جگہ حقیقی معنی میں مستعمل ہے اور آیت ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ میں (ثُمَّ تراخی زمانی کے لئے نہیں بلکہ) بعد مرتبہ کے لئے ہے آسمان و زمین کی تخلیق میں عظیم الشان فرق ہے جیسے آیت ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ثم فرق مرتبہ (یعنی ادنی سے اعلیٰ کی طرف ترقی) کو ظاہر کر رہا ہے تفسیر اول چونکہ سلف کے کلام سے ماخوذ ہے اس لئے اولیٰ ہے۔

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا زمین سے اللہ نے اس کا پانی بر آمد کیا زمین سے چشمے نکال دیئے۔

وَمَرْعٰهَا ﴿٣١﴾ اور زمین کی گھاس پیدا کر دی۔ مَرْعٰی چراگاہ مرغزار یہ ظرف مکان ہے محل بول کر حال مراد لیا۔ مقام سبزہ سے مراد سبزہ ہے یا مرعی مصدر ہے اور مراد اسم مفعول ہے (چرنا یعنی وہ شئے جو چری جائے)

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴿٣٢﴾ اور اللہ نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں بنایا۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾ اے لوگو! اللہ نے زمین بچھائی اور پہاڑوں کی میخیں قائم کیں تم کو اور تمہارے چوپایوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔ مَتَاعًا دَحٰی اور اَرْسٰی کی علت ہے دونوں فعل اس کو اپنا مفعول بنانے میں نزاع کر رہے ہیں (اس لئے پہلے یا دوسرے کا مفعول محذوف ہے اور وہی مفعول محذوف ہے جس پر مفعول مذکور دلالت کر رہا ہے۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ اگر مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ کو اَخْرَجَ مِنْهَا کی علت غائی قرار دے دیا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ اللہ نے پانی اور سبزہ انسانوں اور جانوروں یعنی کل جانداروں کے فائدہ

کے لئے بنایا)

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ فاء سببی ہے یعنی جب اس کائنات کی ایجاد سے اللہ کا قادر ہونا ظاہر ہو گیا اور قیامت کا امکان ہو گیا اور پھر اللہ کے خبر دینے سے حشر کا ثبوت بھی ہو چکا تو اب اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى کا لفظ بول کر اللہ نے قیامت آنے کا وقت اور اس کے احوال بتائے یہ لفظ اس لئے اختیار کیا کہ (تفصیل بیان کرنے سے پہلے) عنوان سے ہی قیامت کے کچھ احوال معلوم ہو جائیں لغت میں طَمٌّ کا معنی ہے غلبہ۔ سمندر کو طم کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ عرب ناقابل برداشت مصیبت کو اَلطَّآمَّة کہتے ہیں قیامت کو طامہ کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ حادثہ قیامت تمام حوادث و مصائب پر غالب ہے (سب سے بڑی مصیبت ہے) اَلْكُبْرٰى اَلطَّآمَّة کی صفت تاکیدی ہے اور اِذَا ظرفیہ ہے (جس وقت) لیکن معنی شرط کو متضمن ہے۔ (جب بھی)

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ یَوْمَ اِذَا سے بدل ہے مَاسَعٰی میں ما مصدری یا موصولہ مطلب یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی یعنی وہ دن آئے گا کہ انسان انتہاء غفلت یا امتداد زمانہ کے سبب اپنے کئے ہوئے اعمال کو اپنے اعمال نامہ میں دیکھ کر یاد کرے گا۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ نمایاں ہو جائے گی۔ مقاتل نے کہا دوزخ کا سرپوش ہٹا دیا جائے گا کافر اس میں داخل ہو جائیں گے اور مومن اس کی پشت پر قائم شدہ پل صراط سے گزر جائیں گے یا یہ مراد ہے کہ دیکھنے والے کافروں کے سامنے دوزخ نمایاں ہو جائے گی۔ اِذَا کا جواب (اس دن کیا ہوگا) محذوف ہے جس پر يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ دلالت کر رہا ہے ظاہر یہ ہے کہ محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں آئندہ جو تفصیل احوال آرہی ہے وہی اذا کا جواب ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ پس جو معصیت میں حد سے آگے بڑھ گیا ہے یہاں تک کہ کافر ہو گیا ہے اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ کر دنیوی زندگی کو آخرت پر اس نے ترجیح دے رکھی اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ابو موسیٰ کی روایت ہے جو اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو پیچھے ڈال دے گا اور جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو پیچھے کر دے گا۔ پس تم باقی کو فانی کے مقابلہ میں اختیار کرو۔ احمد و بیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دوزخ خواہشات سے ڈھانکی ہوئی ہے۔ (اور مسلم کی روایت میں گھری ہوئی ہے) اور جنت نامرغوب اشیاء سے ڈھانکی ہوئی یا گھری ہوئی ہے۔ یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ سوائے ذکر اللہ اور اس کے متعلقات اور عالم اور متعلم کے (باقی) دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون ہے۔ ترمذی و ابن ماجہ۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ اور جو قیامت کے دن حساب کے لئے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ اور بدی کا حکم دینے والے نفس کو خواہشات سے اس نے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہی ہے۔ صحاح میں ہے کہ ہوا کا معنی ہے اپنی پسندیدہ چیزوں کی طرف نفس کا جھکاؤ۔ ھَوٰی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہوا صاحب ہوا کو دنیا میں مصیبت میں لے کر گرتی ہے اور آخرت میں ھاویہ کے اندر ہوا کا معنی ہے نشیب کی طرف اترنا اور بلندی سے پستی کی طرف گرنا۔

ہوا تمام ممنوعات کا سرچشمہ اور حرام چیزوں کی بنیاد ہے ابو بکر وراق کا قول ہے کہ اللہ نے کوئی مخلوق ہوا سے زیادہ گندی نہیں پیدا کی ہوا از روی عقل بھی بری ہے اور از روی شرع بھی عقلی برائی تو یہ ہے کہ اشیاء کی حقیقتیں واقع میں موجود ہیں خصوصاً مبدء و معاد کی حقیقت اور اخلاق و اعمال وغیرہ کے نتائج جو بجائے خود اپنے حسن و قبح کے خواستگار ہیں مگر ان کی اچھائی

برائی عموماً عقل سے دریافت نہیں کی جاسکتی اگر بعض امور کا اچھا برا ہونا صرف عقل سے معلوم بھی ہوتا ہے تو وہ ناقابل اعتماد ہوتا ہے تاوقتیکہ علام الغیوب پیغمبروں کی معرفت اس کی اطلاع نہ دیدے۔ کیونکہ اگر اشیاء کے حسن وقبح کو جاننے کے لئے عقل کافی ہو تو پیغمبروں کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ عقائد صحیحہ کا حصول اچھے برے اعمال کی شناخت اور ان پر عمل اور شریف ورذیل اخلاق کی تمیز اپنی خواہش کو چھوڑ کر پیغمبروں کا اتباع کئے بغیر ناممکن ہے۔ خواہش پرستی تو اتباع انبیاء کی ضد ہے۔

ہوا میں شرعی قباحت یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون جن وانس کو میں نے صرف اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے صحاح جوہری میں ہے کہ عبودیت کے معنی ہے اظہار فروتنی اور عبادت کے مفہوم میں اور بھی زیادتی ہے یعنی انتہائی درجہ کی فروتنی کا اظہار۔

عبادت دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) تکوینی اضطراری جیسا کہ اس آیت میں ہے وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا جو کوئی آسمان وزمین میں ہے سب چار ناچار اللہ کا فرماں بردار ہے۔ (۲) اختیاری یہی جن وانس سے مطلوب ہے پس جس طرح تکوینی طور پر ہر چیز اللہ کی فرمانبدار ہے اللہ کی مشیت وارادہ کے خلاف تکوینی نظم کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اختیاری عبادت بھی ہونی چاہئے قلب کا کوئی فعل ہو یا اعضاء کا یا اخلاق نفسانیہ کوئی بھی اللہ کے ارادہ اور حکم کے خلاف نہ ہونا چاہئے ہوا کو اس میں قطعاً دخل نہ ہونا چاہئے خواہش پرستی تو عبودیت کے خلاف ہے ہر باطل قبیح (فعل عمل عقیدہ رائی ہوا پرستی ہی کی شاخ ہے اور غلط افکار سے ہی پیدا ہوتا ہے کافروں نے اپنی فکر فاسد پر اعتماد کرتے ہوئے ہی تو کہا تھا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے کیا ہم اپنے میں سے ایک آدمی کا اتباع کریں)

فرقہ مجسمہ نے کہا تھا اللہ موجود ہے اور ہر موجود جسم مکانی ہوتا ہے (اس لئے اللہ بھی جسم مکانی ہے) معتزلہ وغیرہ نے کہا تھا کہ عذاب قبر وزن اعمال اور وجود پل صراط ممکن نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

گناہ کبیرہ کرنے والے اقرار کرتے ہیں کہ رسول اور قرآن کے احکام کی تعمیل فرض ہے اور برے کی وجہ سے وہ اوامر نواہی کے پابند نہیں ہوتے۔ اسی لئے فرائض کو ترک کرتے اور ممنوعات ومکروہات کا ارتکاب کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تین چیزیں تباہ کن ہیں یہاں تک کہ حضور ﷺ نے فرمایا خواہش پرست بندہ برا بندہ ہے خواہش اس کو گمراہ کردیتی ہے۔ ترمذی و بیہقی بروایت حضرت اسماء بن عمیس۔

یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا تین چیزیں تباہ کن ہیں خواہش نفس جس کا اتباع کیا جائے حد سے بڑی کنجوسی جس کے حکم پر چلا جائے اور خود پرستی اور یہ سب سے زیادہ بری ہے۔ بیہقی نے ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے میں کہتا ہوں اگرچہ حدیث میں ہوا سے خاص قسم کی ہوا مراد ہے مگر حقیقت میں تینوں تباہ کن چیزوں کا رجوع خواہش پرستی ہی کی جانب ہے۔

فائدہ

ترک ہوا کے مختلف درجات ہیں ادنی درجہ یہ ہے کہ عقائد کے متعلق جو سلف کا اجماع اور ظاہری نصوص ہیں ان کی مخالفت سے پرہیز کرے اسی سے سنی مسلمان ہوتا ہے۔ اوسط درجہ وہ ہے جس کے متعلق مقاتل نے کہا ہے کہ گناہ کے ارادہ کے وقت آدمی یاد کرے کہ حساب فہمی کے لئے اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ یہ سن کر گناہ کے ارادہ کو چھوڑ دے۔ اس درجہ کی تکمیل یہ ہے کہ مشتبہات (جن کی حرمت حلت واضح نہ ہو) کو بھی ترک کردے اور گناہ میں مبتلا ہوجانے کے ڈر سے ان چیزوں کو بھی ترک کردے جن کو کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مشتبہات سے بچتا ہے وہ اپنا دین و آبرو بچالیتا ہے اور جو مشتبہات میں پڑجاتا ہے وہ ممنوعات میں بھی (آئندہ) پڑجاتا ہے جیسے وہ چرواہا جو جانوروں کو محفوظ ممنوع چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے ممکن ہے کسی جانور کو چراگاہ کے اندر بھی ڈال دے۔ بخاری ومسلم۔

اس مرتبہ کی تکمیل یہ بھی ہے کہ ضروریات پر جواز کا دائرہ محدود کردے۔ غیر ضروری چیز کی خواہش ترک کردے۔ حضرت نعمانؓ بن بشیر کی روایت ہے حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر دل پسند چیز کو کھالینا بھی اسراف میں داخل ہے۔ (رواہ ابن ماجہ والبیہقی عن انسؓ)

حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارے شیخ اجل حضرت شیخ بہاء الدین نقشبند فرماتے تھے کہ اللہ تک پہنچنے کا سب سے قریب راستہ مخالفت نفس ہے مراد یہ ہے کہ احکام شریعت کی پوری نگہداشت کے ساتھ ساتھ نفس کی مخالفت کی جائے۔ واللہ اعلم۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے وہ یہ کہ کچھ گناہ تو کھلے ہوئے ہیں بخوف حساب ان سے پرہیز ممکن ہے کچھ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ دقیق ہیں وہ یہ گناہ ہیں جو نیکی کے جامہ میں ہوتے ہیں جیسے (عبادت وغیرہ کی) دکھاوٹ اور (اپنی عبادت وریاضت پر) غرور اور کثرت نوافل وطاعات سے نفس کا ایسا تزکیہ جس کی ممانعت آئی ہے۔ یہ مقام بڑی لغزش گاہ ہے اکابر میں سے کسی نے اپنے مُرید سے کہا تھا بیٹا مجھے یہ اندیشہ تو نہیں کہ گناہوں کے راستہ سے شیطان کی رسائی تیرے پاس ہوسکے گی مجھے تو یہ خوف ہے کہ نیکیوں کے راستہ سے کہیں وہ تجھ تک (نہ) پہنچ جائے۔ اس مقام میں نگہداشت کی صورت یہ ہے کہ ہر کام میں نفس کو مشتبہ سمجھے اور زاری واستغفار کرے چند اشعار۔

نفس وشیطان کی مخالفت ونافرمانی کر اگر وہ تیری خالص خیر خواہی بھی کریں تب بھی مشتبہ سمجھ حریف اور پیچ کی خفیہ تدبیروں سے تو واقف ہی ہے اس لئے وہ دونوں حریف بن کر آئیں یا پنچ بنکر تو کسی کا کہنا نہ مان۔ بے عمل قول کی اللہ سے معافی طلب کر کیونکہ بانجھ (ناقابل تولید) کی طرف نسب کی نسبت کررہا ہے (یعنی بے عمل قول بانجھ ہے اس سے ثواب وخیر کی نسل نہیں پیدا ہوسکتی) اس مقام میں کامل تحفظ کی صورت یہ ہے کہ کسی فانی فی اللہ باقی باللہ شیخ کا دامن پکڑ لے اور کوئی کام اس کے حکم واجازت کے بغیر نہ کرے۔

حضرت شیخ امام یعقوب کرخی نے اپنے ابتدائی حال کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں نجار تھا مجھے اپنے نفس میں کچھ سستی اور باطن میں کچھ تاریکی محسوس ہوئی میں نے ارادہ کرلیا کہ کچھ دنوں روزے رکھوں گا تاکہ یہ سستی اور تاریکی دور ہوجائے روزہ رکھ لیا اور صبح کو شیخ اجل حضرت بہاء الدین نقشبند کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے کھانا حاضر کرنے کا حکم دیا (کھانا آگیا) تو مجھ سے فرمایا کھاؤ وہ بندہ برا ہے جو ہوا پرست ہو اور خواہش اس کو گمراہ کردے اور فرمایا جو روزہ خواہش نفس کے زیر اثر ہو اس سے کھانا افضل ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ نفل عبادت کے لئے ایسے شیخ کی اجازت ضروری ہے جو فانی فی اللہ ہو اور خواہش نفس سے آزاد ہوچکا ہو۔ میں نے عرض کیا اگر ایسا شیخ نہ ملے تو آدمی کیا کرے۔ فرمایا اللہ سے بکثرت استغفار کرے یا ہر نماز کے بعد بیس مرتبہ اللہ سے مغفرت کی طلب کرلیا کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے دل پر کچھ کدورت آجاتی ہے اور میں روزانہ اللہ سے سوبار استغفار کرتا ہوں۔

خواہش نفس سے باز رہنے کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اپنے دل سے بالکل خواہش نکال پھینکے سوائے خدا اور مرضی خدا کے اس کا نہ کوئی مقصود ہو نہ مراد۔ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے صوفیہ لا الہ الا اللہ کی کثرت کرتے ہیں۔ مگر لا الہ الا اللہ کہتے وقت پیش نظر یہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی مقصود نہیں۔

حضرت مجدد صاحب نے فرمایا ہے کہ بندہ جب تک خواہش نفس میں لگا رہتا ہے۔ بندۂ نفس اور مطیع شیطان ہو[illegible] ہے۔ یہ نعمت عظمیٰ یعنی بالکل خواہش نفس سے آزاد ہوجانا خالص ولایت سے وابستہ ہے اور کامل ترین فنا وبقا پر موقوف ہے ([illegible] کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا) میں کہتا ہوں کہ اس مرتبہ پر پہنچ کر صوفی تقدیر الٰہی کو پسند کرتا ہے خواہ اس کی طبیعت [illegible] خلاف ہی ہو کسی آئے ہوئے دکھ کو دور کرنے کی دعا وہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کو دعا کرنے کا حکم ہے اور طلب عافیت پر [illegible] مامور ہے اس لئے دعا نہیں کرتا کہ وہ تکلیف سے دل تنگ اور مراد نہ ملنے سے کبیدہ خاطر ہوجاتا ہو اس مرتبہ میں وہ ایسا ہی اللہ کا

بندہ اپنے اختیار سے ہو جاتا ہے جس طرح وہ تکوینی اور اضطراری طور پر خدا کا بندہ ہوتا ہے اس وقت شیطان کو اس کے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا شاذ و نادر صورت اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ انسان تک شیطان کا راستہ عموماً خواہش نفس کے ہی ذریعہ سے پہنچتا ہے دیکھو جو شخص گرم مزاج رکھتا ہو اور غصہ سے مغلوب ہو جاتا ہو شیطان اس کی نظر میں قتل اور ظلم کو اچھا فعل بنا کر دکھاتا ہے اور جو شخص ٹھنڈے مزاج اور کمزور دل والا ہو اس کو شیطان بتاتا ہے کہ جہاد سے بھاگ جانا حق کے معاملہ میں غیرت کو چھوڑ دینا اور منافقت کرنا اچھا ہے وغیرہ۔

لہٰذا اگر کوئی شخص خواہش ہی کو ختم کر دے تو اس کے پاس آنے کے شیطان کے سب راستے بند ہو جاتے ہیں یہی مفہوم ہے اس آیت مبارکہ کا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا۔

شیخ اجل مولانا یعقوب کرخی نے اسی مقام کے متعلق فرمایا ہے کہ آدمی جب تک خواہش سے آزاد نہ ہو جائے مردوں کے مرتبہ پر نہیں پہنچتا۔ اسی مقام پر پہنچ کر بندہ کو مومن حقیقی کہا جاتا ہے اور یہی مراد ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی کہ جب تک کسی کی خواہش اس (شریعت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں مومن نہیں ہوتا۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔ نوویؒ نے اربعین میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

ابن حاتمؒ نے باسناد جبیرؒ ضحاک کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مکہ کے مشرکوں نے بطور استہزاء رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ قیامت کب بپا ہو گی اس پر اللہ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾ مُرْسٰی راس سے مصدر ہے کھڑا ہونا جمنا بپا ہونا یعنی کفار قریش قیامت کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہوگا (وہ کب بپا ہو گی) حاکم اور ابن جریرؒ نے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (لوگوں کے سوال کا جواب دینے کے لئے) قیامت کے متعلق (جبرئیلؑ سے یا بوقت مناجات اللہ سے) سوال کرتے تھے اس پر آیت یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ الخ نازل ہوئی۔ طبرانی اور ابن جریر نے طارق بن شہاب کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیامت کا ذکر بکثرت کرتے تھے اس پر۔

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ نازل ہوئی ابن حاتم نے حضرت عروہ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے حاصل کلام یہ کہ لوگ رسول اللہ سے قیامت بپا ہونے کا وقت دریافت کرتے تھے اور آپ ﷺ ان کو جواب دینے کے خواہش مند تھے اس لئے اللہ سے وقت قیامت دریافت کرتے تھے اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا اور آپ نے سوال کرنا ترک کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعین قیامت کو پوشیدہ رکھنے میں خاص حکمت ہے اور اس کا علم ناقابل امید ہے۔

فِیْمَ میں م (جو اصل میں ماتھا) استفہام انکاری کے لئے ہے اور مِنْ ذِکْرٰىهَا اس کا بیان ہے یعنی آپ قیامت کے کس ذکر میں پڑے ہیں اس کے وقت کا بیان جائز نہیں کیونکہ آپ کو اس کا علم نہیں اور نہ علم ہو سکتا ہے اس کو پوشیدہ رکھنے میں مصلحت ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کا علم خود آپ کو نہیں (اس وقت ذکری بمعنی علم ہوگا۔ محاورہ میں بولا جاتا ہے لیس فلان فی العلم من شئے یعنی فلاں شخص کو بالکل علم نہیں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ فیم خبر ہو اور مبتدا محذوف ہو یعنی یہ سوال کس غرض سے ہے اس کا کیا فائدہ۔ اس کے بعد اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰىهَا سے نیا کلام شروع کیا کہ آپ تو خود قیامت کی علامات میں سے ہیں آپ کے وجود سے تو خود قیامت کی یاد ہو جاتی ہے کیونکہ آپ آخری نبی ہیں۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ کو اور قیامت کو ان دونوں (انگلیوں) کی طرح (متصل) بھیجا گیا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت مستوردؓ بن شداد کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے قیامت کے ہی وقت میں بھیجا گیا ہے مجھے سابق بنادیا گیا جیسے یہ اس سے سابق ہے حضور نے کلمہ کی انگلی اور انگوٹھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا۔ (ترمذی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰىهَا کا تعلق۔ یَسْـَٔلُوْنَکَ سے ہے یعنی وہ لوگ آپ سے قیامت کے وقت

کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ کب بپا ہو گی اور کہتے ہیں تم کو اس کے مقرر وقت کے متعلق کیا معلومات ہیں بتاؤ اور اس کا معین وقت بیان کرو۔

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ یعنی مدت دنیا جس کے ختم ہونے پر قیامت بپا ہو گی خدا ہی کے سپرد ہے اس کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں۔ یہ کلام انکار سابق کی علت ہے جواب نما لیکن اگر فِيمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا کو سوال کا تتمہ قرار دیا جائے تو یہ جواب ہو گا۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ﴿۴۵﴾ یعنی آپ کو قیامت کا وقت بیان کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا بلکہ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اہل خشیہ کو شدائد قیامت سے ڈراؤ تاکہ شدائد قیامت میں مبتلا کرنے والے اسباب سے وہ پرہیز رکھیں اور صرف اتنا یقین کرلینا کہ قیامت آئے گی دوسروں کو ڈرانے کے لیے کافی ہے قیامت کا تعیینی وقت بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (رسول اللہ ﷺ ہر شخص کے لئے منذر تھے کیونکہ بغیر تخصیص کے آپ کی نبوت عمومی تھی) مگر اہل خشیہ ہی آپ کے انذار سے فائدہ اٹھانے والے ہیں (جن کے دل میں خوف خدا اور اندیشہ قیامت نہیں ان کو کچھ فائدہ نہیں) اسی لئے خاص طور پر اہل خشیہ کا ذکر کیا۔

سوال کرنے کی ممانعت کی علت جو پہلے کلام سے مستفاد ہوتی تھی اس کی یہ جملہ تاکید ہے۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ﴿۴۶﴾ یعنی جس روز وہ قیامت کو دیکھیں گے تو ایسا محسوس کریں گے کہ گویا دنیا میں اور قبروں میں ایک دن کے صرف نصف اخیر یا مع نصف اول کے (یعنی پورے دن) رہے تھے۔ ضُحٰا کی اضافت عَشِيَّةً کی ضمیر کی جانب اس لئے کی گئی کہ دونوں ایک ہی دن کے جز ہیں (نصف اول یعنی ضحیٰ اور نصف اخیر یعنی عشیۃ) مراد یہ ہے کہ دنیا میں اور قبروں میں رہنے کی مدت چونکہ محدود ہے اور وہ مدت عذاب کے مقابلہ میں دنیا اور قبر کے قیام کو ہیچ سمجھیں گے اور خیال کریں گے کہ ہم وہاں بہت تھوڑے وقت رہے اسی مضمون کو آیت لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ میں بیان کیا گیا ہے گویا مذکورہ بالا آیت ان کے سوال کا جواب ہے انہوں نے وقت قیامت پوچھا تھا جواب دیا گیا کہ قیامت آنے کا وقت قریب ہی ہے۔

سورۂ والنازعٰت ختم شد

سورت عَبَسَ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۴۲ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بغوی نے لکھا ہے کہ ابن ام مکتوم یعنی عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ فہری جو بنی عامر بن لوی کے قبیلہ میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضور اس وقت عتبہ بن ربیعہ ابو جہل بن ہشام عباس بن عبدالمطلب ابی بن خلف اور امیہ بن خلف سے خاموشی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے ان کو اسلام کی دعوت دے رہے اور حضور کو ان کے مسلمان ہو جانے کی امید لگی ہوئی تھی۔ ابن ام مکتوم (نابینا تھے نظر تو کچھ آتا ہی نہ تھا) بولے یا رسول اللہ ﷺ جو کچھ اللہ نے آپ کو سکھایا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیے اور پڑھائیے۔ ابن ام مکتوم بار بار پکارتے ہی رہے ان کو معلوم نہ تھا کہ حضور ﷺ دوسری طرف متوجہ ہیں ابن ام مکتوم حضور ﷺ کی بات کاٹ رہے تھے اس لئے چہرہ مبارک پر کچھ کراہت کے آثار نمودار ہوگئے۔ آپ ﷺ نے دل میں کہا یہ سردار خیال کریں گے کہ محمد ﷺ کے پیرو صرف اندھے، غلام اور نچلے طبقہ کے لوگ ہیں۔ یہ خیال کر کے ترش رو ہو کر عبداللہ کی طرف سے رخ موڑ لیا اور جن لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے ان کی طرف متوجہ ہوگئے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② محمد ﷺ ترش رو ہوگئے اور منہ پھر لیا۔ اس لئے کہ ان کے پاس اعمٰی آیا تھا یعنی ابن ام مکتوم اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى عَبَسَ اور تَوَلّٰى کی علت یعنی مفعول لہ ہے۔

ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ اَلْاَعْمٰى سے مراد ابن ام مکتوم ہے اسی روایت میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ نے عرض کیا کیا میرے قول میں آپ کو کوئی حرج محسوس ہو رہا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اسی طرح حضرت انسؓ سے بھی روایت آئی ہے یونہی ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے اس روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ اس کے بعد جب رسول اللہ ﷺ ابن ام مکتوم کو دیکھتے تو عزت کرتے تھے اور فرماتے تھے مرحبا اس شخص کے لئے جس کے معاملہ میں مجھے میرے رب نے عتاب کیا اور ابن ام مکتومؓ سے فرماتے تھے کیا تمہارا کوئی کام ہے۔

ترمذیؒ اور حاکمؒ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن ام مکتومؓ کو دوبار مدینہ پر اپنی جگہ قائم کیا تھا جبکہ آپ دونوں مرتبہ جہاد پر تشریف لے گئے تھے۔ الاعمی کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات کاٹنے کی جرات کرنے میں ابن ام مکتومؓ معذور تھے۔ (نابینا تھے)

وَمَا يُدْرِيْكَ مَا نافیہ ہے یعنی تم کو اس کا حال نہیں معلوم یا استفہام انکاری بمعنی نفی ہے یعنی تم کو اس کے حال پر کون واقف بنائے بہر حال اس لفظ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک عذر (مترشح) ہے کہ تم واقف نہ تھے اگر نابینا کے حال سے واقف ہوتے تو دوسروں کی طرف متوجہ اور اس کی طرف سے روگرداں نہ ہوتے آیت میں چند طور پر رسول اللہ ﷺ کا اعزاز موجود ہے۔

(۱) آغاز کلام میں ہی اعراض کا سبب بصیغہ ماضی بیان کیا مخاطب کا صیغہ نہیں ذکر کیا گویا مخاطب کے ذہن کو اس طرف موڑا کہ اس فعل کا صدور تم سے نہیں کسی اور سے ہوا تم ایسے نہیں کہ ایسا کام تم سے صادر ہو۔ اس کی توجیہ اس طرح ہوگی کہ

اعمال کا مدار نیت پر ہے اور رسول اللہ ﷺ کی نیت اس کی طرف سے بالکل منہ موڑنے کی نہیں تھی بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ یہ شخص تو مومن ہی ہے اگر اس کی تعلیم میں کچھ تاخیر بھی ہو جائے تو اس کا کچھ نقصان نہ ہوگا نہ اس کی طرف سے انحراف اور چلے جانے کا کوئی اندیشہ ہے اور قریش کے سردار اپنی طرف سے میرے رخ کو پھرا دیکھ کر چلے جائیں گے انتظار نہیں کریں گے اور یہ سردار اگر مسلمان ہو گئے تو ان کے ساتھ بہت لوگ مسلمان ہو جائیں گے اور دائرہ اسلام وسیع ہو جائے گا انہی مقاصد کے زیر اثر حضور ﷺ نے عبداللہ کی طرف سے منہ پھیر لیا گویا واقعی طور پر ان کی طرف سے روگردانی نہیں کی اگرچہ ظاہری طور پر اس فعل کا وقوع ہو گیا۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کی طرف سے معذرت بھی اشارۃً بتادی کہ آپ ﷺ ناواقف تھے ورنہ ایسا نہ کرتے۔

(۳) صیغہ غائب سے صیغہ خطاب کی طرف کلام کا رخ پھیرنے سے رسول اللہ ﷺ کو مانوس بنانا اور آپ کے دل سے ملال کو دور کرنا مقصود ہے اور صیغہ غائب سے جو وہم پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے آپ کو ساقط الالتفات سمجھ لیا ہے صیغہ خطاب سے اس وہم کا ازالہ کر دینا غرض ہے۔

(۴) موجب عذر (عدم علم) کی اسناد رسول اللہ ﷺ کی طرف صریحی تخاطب کے ساتھ بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ سے جو فعل سرزد ہو گیا اس میں آپ معذور تھے۔

لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ③ شاید وہ کامل طور پر پاک ہو جاتا شرک ظاہر اور خفی سے عیوب نفسانی سے ہوا و ہوس سے اللہ کے علاوہ دوسروں کے ساتھ دل کو وابستہ رکھنے سے (روح دل خفی اخفی وغیرہ) تمام لطائف کو ہوشیار بنانے سے اور عالم خلق (مادی قوئ) کو ہر مادے کے غلبہ سے اور یہ سب کچھ رسول اللہ کی صحبت کی برکت۔ انفاس قدسیہ کے فیض اور ظاہری باطنی انوار نبوت کی شعاع اندوزی سے حاصل ہوتا۔

اَوْ يَذَّكَّرُ یہ لفظ اصل میں يَتَذَكَّرُ تھا۔ یا وہ اللہ کی یاد میں مشغول ہو جاتا اس کا حضور قلب بڑھ جاتا خوف عذاب اور امید ثواب کا حصول ہو جاتا۔

فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ صحاح میں ہے کہ ذِكْرٰى کا معنی ہے کثرت ذکر۔ ذکر کے مفہوم سے اس کے مفہوم میں زیادتی ہے لعلہ یزکی میں تو مراتب ابرار کی انتہا کی طرف اشارہ ہے اور اَوْ يَذَّكَّرُ میں اخیار (برگزیدگان الٰہی) کے آغاز حال کی طرف ایماء ہے۔ مقربین اور صدیقین کا حال یہاں نہیں بیان کیا کیونکہ یہ مقام انانیت کا مقام ہے (یعنی کسی اختیاری مراتب کے حصول کے بیان کا مقام ہے ان مراتب کو بیان کرنے کا مقام نہیں ہے جو محض وہبی ہیں جو خالص عطیہ الٰہیہ ہیں اعمال حسنہ سے ان مراتب تک پہنچنا ممکن نہیں) اور اہل قرب کے امر کا مدار محض انتخاب خداوندی ہے انتخاب الٰہی کا براہ راست تعلق تو انبیاء سے ہے (اللہ جس کو چاہتا ہے نبوت مرحمت فرماتا ہے) لیکن انبیاء کی وراثت کے طور پر ان کے طفیل میں اولیاء میں سے بھی جن کو اللہ چاہتا ہے انتخاب فرمالیتا ہے۔

لفظ اَوْ کا یہ مطلب نہیں کہ تزکیہ اور تذکر دونوں کا مجموعہ ابن ام مکتوم کو حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس تردید کا مطلب یہ ہے کہ دونوں اوصاف میں کوئی تو ضرور ہی اس کو حاصل ہو جاتا جیسے کہا جاتا ہے جالس الحسن اوابن سیرین (حسنؒ بصری کے ہم نشین بنو یا ابن سیرین کے یعنی دونوں کے نہ بنو تو کم سے کم ایک کے ہم نشین تو ضرور بن جاؤ) پورا جملہ معترضہ ہے اور اپنے اندر مذکورۃ الصدر فوائد رکھتا ہے اس میں درپردہ اس امر کا بیان ہے کہ سرداران قریش اس قابل نہیں کہ آپ ان سے تخاطب کریں۔ یہ نابینا تخاطب کے قابل ہے اور جس (اسلام) کا ان سے ارادہ کیا جا رہا ہے اس کی امید نہیں جیسے کوئی شخص کسی کو کچھ پڑھا رہا ہو اور وہ سمجھتا نہ ہو اور اس کے پاس بیٹھا ہوا دوسرا آدمی سمجھ رہا ہو تو سمجھانے والے سے کہا جاتا ہے بلکہ یہ دوسرا شخص تمہاری بات سمجھتا ہے یعنی پہلا نہیں سمجھتا اس کو نہ سمجھاؤ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ لَعَلَّهٗ کی ضمیر کافر کی طرف راجع ہے یعنی تم کو کافر کے پاک ہونے اور نصیحت پذیر بن جانے کی

حرص ہے اور تم واقف نہیں کہ تمہاری تمنا پوری ہو ہی جائے اس صورت میں یُذکّٰی کا مفعول اول ک ہوگا اور مفعول دوئم لعله یزکی ۔ واللہ اعلم۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ لیکن جو اپنے مال کے اعتماد پر اللہ اور ایمان باللہ سے لاپرواہ ہے حضرت ابن عباسؓ۔

فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ آپ اس کے درپے ہیں اس کی طرف متوجہ ہیں تاکہ تزکیہ اور طہارت اس کے ہاتھ سے جاتی نہ رہے۔

وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰى ۝ حالانکہ اس کے پاکیزہ نہ بننے سے آپ ﷺ کا کوئی حرج نہ تھا (اگر اس کے پاکیزہ نہ بننے سے آپ کا کچھ ہرج ہوتا) تو اس کے مسلمان بن جانے کی حرص آپ کو اس کی طرف توجہ اور مسلمانوں سے اعراض کرنے پر آمادہ کر سکتی (اور اس وقت آپ مسلمان سے روگردانی کرنے میں معذور ہوتے) آپ کے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے (کسی کے نہ ماننے سے آپ کا کوئی نقصان نہیں) یعنی کسی کو پاک کر دینا آپ کا فرض نہیں صرف پہنچا دینا آپ کا فرض ہے۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰى ۝ وَهُوَ یَخْشٰى ۝ لیکن جو دوڑتا ہوا آپ سے ہدایت طلبی کرتا ہوا اور (اللہ کے عذاب سے) ڈرتا ہوا آپ کے پاس آتا ہے۔ یَسْعٰى حال ہے اور وَهُوَ یَخْشٰى بھی حال مرادف یا حال متداخل ہے۔

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ تو آپ اس کی طرف سے غافل ہو کر دوسروں کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں۔

عَبَسَ اور تَوَلّٰى میں جس مضمون کو مجمل بیان کیا تھا یہ اس کی تفصیل ہے اور اس قصور کا بیان ہے جس پر عتاب ہوا یعنی طالب کو یونہی چھوڑ دینا اور غافل کے لئے پوری کوشش صرف کرنا حالانکہ اس کے برعکس کرنا اولیٰ تھا۔

كَلَّآ گزشتہ فعل سے باز داشت ہے یعنی آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ بلاشبہ قرآن یا آیات قرآن نصیحت ہے اور یاد خداوندی کا موجب ہے۔ اِنَّهَا کی ضمیر کا قرآن کی طرف راجع ہونا اس لئے درست ہوگا کہ اس کی خبر مونث ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ جو نصیحت پذیر ہونا اور اللہ کی یاد کرنی چاہے اس کو یاد رکھے حفظ قرآن کو مشیت انسانی سے وابستہ کرنا صیغہ کے لحاظ سے تو تفویض اختیار ہے (جو چاہے یاد کرے نہ چاہے نہ کرے) لیکن معنوی حیثیت سے حفظ قرآن نہ کرنے والوں کے لئے زجر اور ذکر قرآن میں مشغول رہنے والوں کی ثناء ہے۔

فِیْ صُحُفٍ یہ تَذْكِرَةٌ کی صفت یا اِنَّهَا کی دوسری خبر یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی وہ تَذْكِرَةٌ صحیفوں میں لکھا

---

[1] صحف انبیاء میں قرآن کے موجود ہونے کا یہ معنی نہیں کہ قرآن صرف معانی کا نام ہے الفاظ و عبارت قرآن کی جز نہیں کیونکہ قرآن کا صحف انبیاء میں موجود ہونا بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عبارت موجود تھی۔ لامحالہ قرآن کے معانی ہی قرآن ہوئے اور الفاظ قرآن الٰہی کے جز نہ ہوئے بلکہ یہ الفاظ جبرئیلؑ یا نبیؐ کے ساختہ پرداختہ ہیں جیسا کہ فرقہ قرآنیہ قائل ہے اور قدماء میں سے بھی بعض لوگوں نے عبارت کو قرآن قرار دینے سے انکار کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی ایک سورت یا دس سورتوں کو پیش کر کے دعوت مقابلہ دینا اور بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ اس قرآن کو کہنا اور اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کہہ کر اس کی بعینہٖ حفاظت کا وعدہ کرنا ثابت کرتا ہے کہ قرآن الٰہی مجموعہ الفاظ و معانی کا نام ہے۔ علم کلام میں کلام نفسی کی تحقیق کے موقع پر یہ بحث مفصل موجود ہے یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں۔

صحف انبیاء میں وجود قرآن کا صرف یہ مطلب ہے کہ قرآن کی بنیادی تعلیم مثلاً توحید الوہیت و ربوبیت اور اللہ کی صفات کمالیہ اور وجود ملائکہ اور خیر و شر کا مقدر من اللہ ہونا اور مبدء و معاد کے متعلق قرآنی بیان اور وحی و رسالت اور اصول حسنات کا امر اور اصول سیآت سے باز داشت ان میں سے کوئی چیز نئی نہیں ہر پیغمبر کے صحیفہ میں اور ہر آسمانی کتاب میں یہ تعلیم مشترک ہے رہیں خصوصیات شریعت اور وہ ضوابط و آئین جن میں قرآن منفرد ہے وہ گزشتہ صحف انبیاء میں موجود نہ تھے۔ الزبر الاولین اور صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى میں قرآن کے موجود ہونے کا یہ معنی ہے بعض علماء نے آیت کی تشریح اس طرح بھی کی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کا ذکر تمام صحف انبیاء میں تھا حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ پر نازل شدہ صحیفے بھی اس ذکر سے خالی نہ تھے۔ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ اور اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى کا مطلب یہی ہے۔

ہوا ہے صحیفوں سے مراد ہے لوح محفوظ یا لوح محفوظ کی نقلیں جو ملائکہ لکھ لیتے ہیں یا انبیاء کے صحیفے کیونکہ اللہ نے فرمایا وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ۔ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى یا وہ صحیفے مراد ہیں جو صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھ رکھے تھے۔

مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ اللہ کے ہاں عزت والے عالی قدر یا ساتویں آسمان میں اٹھائے ہوئے۔

مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ جنب اور بے وضو اور حائضہ و نفساء کے چھونے سے پاک۔

بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ سَفَرَةٌ جمع ہے سافر کی۔ سافر کا معنی لکھنے والا۔ اسی مناسبت سے کتاب کو سفر کہتے ہیں سفر کی جمع اسفار ہے۔ ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کا یہی قول ہے سفرۃ سے مراد ہیں اعمال لکھنے والے فرشتے یا انبیاء یا وحی کو لکھنے والے لوگ۔ دوسرے علماء کا قول ہے کہ سَفَرَة سفیر کی جمع ہے۔ سفیر وہ درمیانی آدمی جو قوم میں باہم صلح کرانے کے درپے ہوتا ہے یہاں مراد ہیں ملائکہ اور انسانوں میں اللہ کے پیغمبر میں کہتا ہوں کہ وحی کے کاتب اور علماء امت بھی اسی طرح سفیر ہیں۔ رسول اور امت کے درمیان ان میں سے ہر ایک سفیر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ قرآن کا ماہر بھی ہے وہ السفرۃ الکرام الابرار (معزز پاک سفیروں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پڑھتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور یہ فعل اس کے لئے دشوار بھی ہے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے۔ بخاری و مسلم بروایت حضرت عائشہؓ۔ یعنی اس کو دو ثواب ملیں گے ایک قرآن پڑھنے کا دوسرا دشواری اٹھانے کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہر کے لئے غیر متناہی ثواب ہے کرام سے مراد ہے اللہ کی نظر میں معزز جو مومنوں پر مہربان ہیں کہ ان کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور ان کے لئے دعا مغفرت بھی کرتے ہیں۔ بَرَرَة یعنی متقی یہ سَفَرَة کی دوسری صفت ہے علماء کی یہی حالت ہوتی ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ انسان پر لعنت ہو یہ کیسا سخت ناشکرا ہے لفظ قُتِلَ انسان کے لئے بدترین بددعاء ہے اور تعجب ہے کہ شکر گزاری اور ایمان کے تمام اسباب موجود ہونے کے بعد بھی انسان انتہائی ناشکری کرتا ہے یہ الفاظ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود اللہ کے انتہائی غضب اور خدا تعالیٰ کی طرف سے پوری پوری مذمت[1] پر دلالت کر رہے ہیں۔ مقاتل کا قول ہے اور بروایت ابن المنذر عکرمہؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس آیت کا نزول ابولہب کے بیٹے عتبہ کے حق میں ہوا تھا جس نے کفرت برب النجم کہا تھا۔ سیر کی کتابوں میں یہ قصہ اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت ام کلثوم اور ان کی بہن کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے کر دیا تھا جب سورۃ تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا اگر تم محمد کی بیٹیوں کو طلاق نہ دو تو تم عاق ہو دونوں نے طلاق دیدی۔

یہ واقعہ رخصت سے پہلے کا ہے حضرت ام کلثومؓ کو عتبہ نے جب طلاق دے دی تو پھر حضور کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا میں نے تیرے دین کا انکار کر دیا اور تیری بیٹی کو چھوڑ دیا اور حضور ﷺ پر حملہ بھی کیا اور قمیص مبارک پھاڑ ڈالی حضور ﷺ نے فرمایا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو تجھ پر مسلط فرما دے۔

۔ ایک بار عتبہ قریش کے کچھ لوگوں کے ساتھ بغرض تجارت شام کو جا رہا تھا (جنگل میں) ایک مقام پر جس کا نام زوراء تھا

---

[1] یعنی لفظ قُتِلَ ضرور بددعاء کا ہے اور مَاۤ اَكْفَرَهٗ صیغۂ تعجب ہے مگر بددعاء وہ شخص کرتا ہے جو انتقام سے عاجز ہو اور تعجب وہ کرتا ہے جس کی نظر کے سامنے اس سے زیادہ تعجب انگیز چیزیں نہ ہوں اور خدا نہ عاجز ہے نہ جاہل۔ اس لئے محاورہ عربیہ کے مطابق صیغہ بددعاء سے مراد ہے اظہار مذمت اور صیغہ تعجب سے یہ مراد ہے کہ یہ چیز لوگوں کے لئے بہت بڑی تعجب انگیز ہونی چاہئے کیونکہ واقع میں تعجب آفریں ہے خدا کی طرف سے اظہار تعجب نہیں ہے بلکہ انسان کی ناشکری کی تعجب انگیزی کا اظہار ہے۔

پڑاؤ کیا۔ رات کو ایک شیر آیا اور ان لوگوں کے آس پاس اس نے چکر لگایا عتبہ کہنے لگا وائے مصیبت مجھے محمد کی بددعا سے اندیشہ ہے لوگوں نے اپنے تمام پالان اور سامان لا کر ایک اونچا ڈھیر کر دیا۔ عتبہ کو اس کے اوپر کر دیا اور خود اس کے گرد اگرد سو گئے۔ شیر جا چکا تھا جب لوگ سو گئے اور عتبہ سب کے وسط میں تھا کہ شیر آ گیا ہر شخص کے اوپر سے چھلانگ لگاتا اور ہر شخص کو سونگھتا عتبہ تک پہنچا اور اس کو پھاڑ دیا۔

میں کہتا ہوں کہ عتیبہ اور معتیب ابولہب کے دونوں بیٹے اس کے بعد مسلمان ہو گئے اور جنگ حنین میں (ہنگامی طور پر بھاگنے کے بعد) جو لوگ حضور اقدس ﷺ کی طرف پھر لوٹ آئے تھے ان میں سے یہ دونوں بھی تھے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ اللہ نے اس کو کس چیز سے بنایا یہاں سے ایمان و شکر کے دواعی (اسباب مقتضی) کا بیان ہے مبدء تخلیق کا سب سے پہلے ذکر اس لئے کیا کہ تمام نعمتوں سے پہلے اسی کا درجہ (اور زمانہ) ہے۔ استفہام تقریری ہے یعنی مخاطب کو آمادہ کیا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ اللہ نے اس کو نطفہ سے بنایا ہے ما اکفرہ میں جو ما استفہامیہ ہے اس کا بیان من ای شیئٍ سے کیا اس طرح کلام کا اثر زیادہ دل نشین ہو گیا۔ پھر نطفہ سے تخلیق کو بیان کر کے انسان کی حقارت کو ظاہر فرمایا ہے اور یہ خلقی تحقیر تکبر کے منافی ہے (اس لئے انسان کا تکبر بے بنیاد اور نازیبا ہے)

مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ میں جو مضمون مبہم تھا یہ اس کی تشریح ہے یعنی اللہ نے انسان کو نطفہ سے بنایا اس کے بعد آغاز تخلیق سے لے کر انتہا حیات تک تمام احوال انسانی کو بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا۔

خَلَقَهٗ اول اس کو رحم کے اندر نیست سے ہست کیا۔

فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ اس کے بعد اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا یعنی اللہ کے حکم سے موکل فرشتے نے اس کے لئے چار باتیں لکھ دیں مقدار عمل۔ مدت زندگی۔ رزق اور شقی یا سعید ہونا جیسا کہ ہم سورۃ المرسلات میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کردہ حدیث نقل کر چکے ہیں اور مسلم و بخاری اس کے ناقل ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ اعضاء و شکل بنانا تقدیر سے مراد ہے یا حالت نطفہ سے تکمیل تخلیق تک جتنے احوال جنین پر گزرتے ہیں وہ مراد ہیں ہماری تشریح ان اقوال سے اولیٰ ہے۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ اَلسَّبِيْلَ فعل محذوف کا مفعول ہے اور یسرہ اس کی تشریح ہے یعنی پھر اللہ نے پیٹ سے نکلنے کا راستہ اس کے لئے آسان کر دیا سدی اور مقاتل نے یہی معنی بیان کئے۔ یا پیغمبر اور کتابیں بھیج کر اللہ نے راہ حق اور خدا تک پہنچنے کی سبیل آسان کر دی تاکہ تکمیل حجت ہو جائے اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے یہ آیت اَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى یا اللہ نے انسان کے لئے دنیوی زندگی اور وہ (مآل و نتیجہ) جو دنیوی زندگی پر موقوف ہے آسان کر دیا کیونکہ دنیا یا جنت کا راستہ ہے یا دوزخ کا۔ قرار گاہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دنیا میں پردیسی یا راہ گیر کی طرح رہو رواہ البخاری من حدیث ابن عمرؓ۔ امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے ان کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اپنے آپ کو اصحاب قبور میں سے شمار کرو۔ اس آخری تفسیر کے مناسب ہے آیت۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ چونکہ موت دار القرار تک پہنچانے والی ہے اس لئے امات کا شمار نعمتوں میں کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت مومن کے لئے تحفہ ہے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے یہ حدیث طبرانی نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں۔ اور حاکم نے اور ابو نعیم نے حلیہ میں نقل کی ہے۔ دنیا کا راہ جہنم ہونا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان (راہ زندگی کا) انتخاب خراب کرتا ہے جبر تو بہر حال نہیں ہے (ہر انسان راہ زندگی کو اختیار کرنے میں آزاد ہے۔)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھ سے کہا گیا کہ کسی سردار قوم نے ایک مکان بنایا اس میں دستر خوان چنا اور ایک پکارنے

والے کو (عمومی دعوت کا اعلان کرنے کے لئے) بھیج دیا اب جس نے پکارنے والے کی دعوت قبول کر لی وہ گھر کے اندر آگیا اور دستر خوان پر کھانا کھالیا اور وہ سردار اس سے خوش ہو گیا۔ اور جس نے دعوت کرنے والے کا کہنا نہ مانا وہ گھر کے اندر نہیں آیا اور نہ دستر خوان سے کچھ کھایا اس پر وہ سردار ناراض ہوا پس سردار تو اللہ ہے اور داعی محمد ﷺ ہے اور مکان اسلام ہے اور دستر خوان جنت ہے یہ حدیث دارمی نے ربیعہ جرسی کی روایت سے اور بخاری نے جابرؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ اَقۡبَرَهٗ کا معنی یہ ہے کہ جنازہ کو درندوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ نے لوگوں کو حکم دیا کہ میت کو قبر میں دفن کریں۔ (یعنی قبر مجرد سے بمعنی ادخل فی القبر کے آتا ہے اور اَقۡبَرَ مزید سے امران یقبروا کے معنی میں آتا ہے قَبَرَ قبر میں داخل کیا۔ اَقۡبَرَ قبر میں داخل کرایا قبر میں داخل کرنے کا حکم دیا) قبر میں دفن کرنے کا حکم اللہ کی مزید نعمت ہے کہ اللہ نے انسان کو اتنی عزت عطا فرمائی کہ اس کی لاش کو دوسرے جانوروں کی لاشوں کی طرح پھینکنے کا حکم نہیں دیا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ پھر جب اللہ اس کو قبر سے اٹھانا چاہے گا تو موت کے بعد زندگی عطا فرما دے گا کیونکہ جو خدا اول تخلیق کی قدرت رکھتا ہے وہ قبر سے زندہ اٹھانے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ اس کی اطلاع پیغمبروں کی زبانی اللہ دے چکا ہے۔ اگر حشر اور جزا نہ ہو تو شاکر بھی کافر کی طرح ہو جائے گا (نہ شاکر کو جزا نہ کافر کو سزا) اور یہ (عقلاً) قبیح ہے۔

كَلَّا ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے موجب ایمان دلائل اور موجب شکر نعمتوں کے ہوتے ہوئے ناشکری اور انکار کرنے سے کافر کو باز داشت کی گئی۔

لَمَّا يَقۡضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ عظیم الشان نعمتوں اور روشن دلائل کو جاننے کے بعد بھی اللہ کے حکم کو اس نے ابھی تک پورا نہیں کیا نہ ایمان لایا نہ شکر کیا۔

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ کلام سابق کے مفہوم پر عطف ہے یعنی انسان کو اول آغاز خلقت سے آخر حیات تک اپنے اوپر غور کرنا چاہئے پھر اپنی غذا کو دیکھنا چاہئے کہ ہم نے اس کی غذا کیسے پیدا کی اور کس طرح اس کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا۔

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ہم نے ہی آسمان سے خوب پانی برسایا۔

ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ پھر ہم نے ہی دلنہ میں سوئی نکالی یا ہل وغیرہ سے زمین کو پھاڑا۔ موخر الذکر صورت میں اللہ کی طرف زمین کو پھاڑنے کی نسبت اس لئے کی گئی کہ اللہ ہر فعل کا مسبب ہے۔

فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ پھر ہم نے زمین میں اگائے دانے جیسے گیہوں جو وغیرہ۔

وَّعِنَبًا وَّقَضۡبًا ﴿۲۸﴾ اور انگور اور ساگ قَضۡبٌ اصل میں مصدر ہے کاٹا قضبہ اس کو کاٹ دیا۔ ساگ بھی بار بار کاٹا جاتا ہے اس لئے اس کو قضب کہا جاتا ہے صحاح جوہری میں ہے کہ قضب کا استعمال سبزی میں ہوتا ہے قاموس میں ہے قضب وہ درخت ہے جس کی شاخیں لمبی اور پھیلی ہوئی ہوں کوئی درخت ہو۔

وَّزَيۡتُوۡنًا وَّنَخۡلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلۡبًا ﴿۳۰﴾ اور زیتون اور کھجور کے درخت اور گھنے باغ حَدَآئِق جمع حدیقة واحد غُلۡبٌ گھنے درختوں والا۔ قاموس۔

وَّفَاكِهَةً اور وہ پھل جن کو مزہ کے لئے کھایا جاتا ہے اسی جگہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی نے فاکہہ نہ کھانے کی قسم کھالی تو کھجور انگور اور زیتون کھانے سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی (کیونکہ یہ پھل طاقت کے لئے کھائے جاتے ہیں تنہا مزہ کے لئے نہیں کھائے جاتے) اسی طرح اس پھل کو کھانے سے بھی قسم نہیں ٹوٹے گی جس سے مقصود غذائیت اور دوائیت دونوں ہوتے ہیں جیسے انار اس کے علاوہ فَاكِهَةً کا عطف حَبًّا وَّعِنَبًا وغیرہ پر ہے اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے (معطوف علیہ اور چیز ہو اور معطوف اور چیز)

وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ اور گھاس۔ چراگاہ۔ قاموس۔

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ یہ اَنْبَتْنَا کی علت ہے ان چیزوں کو ہم نے تمہارے لئے اگایا جیسے گیہوں اور دوسرا غلہ اور تمہارے چوپایوں کے لئے جیسے گھاس۔

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿۳۳﴾ سخت چیخ، قاموس۔ مراد صور پھونکنے کی آواز صحاح میں ہے کہ ناطق کی سخت چیخ کو صَاخَّۃ کہتے ہیں۔ اس صورت میں نفخہ صور پر صاخۃ کا اطلاق مجازی ہوگا۔ یعنی صور کی آواز سے لوگ سخت چیخ پکار مچائیں گے۔ جب صور پھونکنے کی آواز آئے گی تو اس شرط کی جزا محذوف ہے اور پورا جملہ شرطیہ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ سے مربوط ہے یا قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ سے تعلق رکھتا ہے اول صورت میں پورا معنی اس طرح ہوگا کہ قرآن ایک یادداشت اور نصیحت ہے جب صور کی آواز آئے گی اس وقت نصیحت قبول کرنے والوں کا حال نصیحت نہ قبول کرنے والوں کے حال سے جدا ہوگا اختلاف حال کیا ہوگا اس کا بیان آئندہ آیات وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ الخ میں کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس صورت میں جزاء محذوف نہ ہو بلکہ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ الخ جزاء ہو۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا کہ انسان پر لعنت ہو یہ کیسا ناشکرا ہے جب صور کی آواز آئے گی اس وقت اس کو اپنی ناشکری کا نتیجہ کے گا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿۳۶﴾ جس روز آدمی اپنے بھائی ماں باپ بیوی اور لڑکوں سے بھاگے گا۔ یا تو بھاگنے کی یہ وجہ ہوگی کہ اس کو خود ہی اپنی پڑی ہوگی اور اس کو معلوم ہوگا کہ ان اقرباء میں سے کوئی میرے کام آنے والا نہیں یا اقرباء کے کفر اور ان کی بدحالی کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے اقربا سے نفرت اور عداوت ہو جائے گی۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے دو بچوں کی کیفیت رسول اللہ ﷺ سے دریافت کی جن کا انتقال اسلام سے پہلے ہو گیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ دونوں دوزخ میں ہوں گے (حضرت خدیجہؓ کو یہ سن کر کچھ ناگواری ہوئی) حضور ﷺ نے ان کے چہرہ پر ناگواری کا اثر دیکھ کر فرمایا اگر تم ان کے مقام کو دیکھ لو تو تم کو بھی ان سے نفرت ہو جائے گی الحدیث رواہ احمد۔

آیت میں ترتیب وار زیادہ محبوب کو موخر اور کم محبوب کو مقدم ذکر کیا ہے اور اس سے کلام میں زور پیدا کرنا مقصود ہے گویا یوں فرمایا کہ اس روز آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا بلکہ ماں باپ سے بھی بھاگے گا بلکہ بیوی اور اولاد سے بھی بھاگے گا۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿۳۷﴾

لوگوں میں سے ہر شخص کا حال اس روز ایسا ہوگا کہ دوسرے کے حال سے اس کو لاپرواہ بنادے گا۔ ام المومنین حضرت سودہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ لوگوں کو برہنہ پا ننگے بدن بے ختنہ اٹھائے گا لوگوں کے منہ پر پسینہ کی لگام ہوگی اور کانوں کی لو تک پسینہ پہنچا ہوگا یعنی قدم سے لے کر منہ اور کانوں کی جڑوں تک آدمی پسینہ میں غرق ہوگا) حضرت سودہ کہتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پردہ کے اعضاء ایک دوسرے کے دیکھے گا۔ فرمایا لوگوں کو اس کا ہوش ہی نہیں ہوگا۔ ہر شخص کا حال اس روز ایسا ہوگا کہ اس کو دوسروں سے لاپرواہ کردے گا۔ اس حدیث کو طبرانی بیہقی اور بغوی نے نقل کیا ہے صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔

اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ اس روز لوگوں کا معاملہ اس سے زیادہ سخت ہوگا۔ یعنی کوئی کسی کو دیکھے (اس کی فرصت کسی کو کہاں ہوگی) بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت بھی اسی طرح نقل کی ہے۔

وُجُوهٌ مومنوں کے چہرے (تنوین عوض مضاف الیہ) یا بہت چہرے (تنوین تکثیر) یا بعض لوگوں کے چہرے (تنوین بعض)

يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ اس روز روشن ہنستے ہوئے اور شگفتہ ہوں

گے۔ مُّسْفِرَۃٌ (اسم فاعل) اسفار الصبح سے مشتق ہے اسفار الصبح یعنی صبح نکل آنا۔ روشن ہو جانا یہ تینوں صفات وجوہ کے ہیں اصل میں فرحت شگفتگی تو چہروں والوں کو ہو گی مجازاً ان کو چہروں کی صفت قرار دیا۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ غَبَرَةٌ غبار یا کدورت بہت چہروں پر یا کچھ چہروں پر یا کافروں کے چہروں پر اس روز غبار یا کدورت ہو گی۔

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ ان پر سیاہی اور کلونچ چھائی ہو گی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان پر ذلت چھائی ہو گی ابن زید نے کہا غَبَرَۃٌ اور قَتَرَۃٌ میں فرق ہے قَتَرَۃٌ اٹھتا ہوا غبار جس میں (اوپر پہنچ کر) کچھ پانی کی آمیزش ہو جائے (میل) اور غَبَرَۃٌ نیچے والی دھول۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ ہُمْ ضمیر فصل ہے یعنی وہ غبار آلود چہرے یعنی غبار آلود چہروں والے کافر بدکار ہوں گے کَفَرَۃٌ کافر کی جمع ہے اور فَجَرَۃٌ فاجر کی فجور کا معنی ہے پھاڑ دینا یعنی دین اور دیانت کو پھاڑ دینا فجور کا اعلیٰ درجہ کفر ہے۔ واللہ اعلم۔

سورت عبس ختم ہوئی

بعونہ ومنہ

سورۃ التکویر

یہ سورت مکی ہے اس میں 29 آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کو قیامت کا منظر آنکھوں سے دیکھنا پسند ہو وہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اور اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ پڑھے۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور بغوی نے صرف اول کا ذکر کیا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۞ اِذا شرطیہ ہے اور الشمس فعل محذوف کا فاعل ہے اور کُوِّرَتْ اسی فعل محذوف کی تفسیر ہے۔ کُوِّرَتْ بیکار ہو جائے گا روشنی جاتی رہے گی تاریک ہو جائے گا۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور بیہقی نے بروایت ابو طلحہ بیان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کُوِّرَتْ کی تشریح میں فرمایا اظلمت تاریک ہو جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے اور کتاب فی البحر والاحوال میں ابن ابی الدنیا نے اور کتاب العظمۃ میں ابو الشیخ نے ان آیات کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن خدا سورج چاند اور ستاروں کو بے نور کر کے سمندر میں ڈال دے گا اور ایک پچھمی ہوا بھیجے گا جو سمندر پر لگے گی اور سمندر آگ ہو جائے گا۔

بعض لوگوں کا قول ہے جب سورج کو سمندر میں پھینکا جائے گا تو سمندر گرم ہو کر آگ بن جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے ابن ابی مریم کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب سورج کو بے نور کر کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور جب ستارے پراگندہ ہو کر جہنم میں پڑ جائیں گے اور سواء عیسیٰ اور ان کی ماں کے جس معبود کی اللہ کے علاوہ پرستش کی جاتی تھی وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ سمندر میں سورج کا پھینکا جانا اور جہنم میں پھینکا جانا بظاہر متعارض ہے دونوں کی تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ سمندر خود گرم آگ بن جائے گا۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن چاند اور سورج بے نور کر دیئے جائیں گے بزار نے اپنی مسند میں اتنا زیادہ بیان کیا ہے آگ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۞ اور جب ستارے ٹوٹ پڑیں گے آسمان سے بکھر کر زمین پر آپڑیں گے انکدر الطیر پرندہ ٹوٹ کر گر پڑا کلبی نے کہا اس روز آسمان سے ستاروں کی بارش ہو گی کوئی تارہ بغیر گرے نہیں بچے گا۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۞ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے یعنی زمین سے چلا کر ہوا میں پراگندہ ذرات بنا دیئے جائیں گے۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۞ العشار جمع ہے العشراء اس کا واحد ہے۔ دس ماہہ گابھن اونٹنیاں پورے سال میں اگر اونٹنی کے بچہ ہو تب بھی بچہ پیدا ہونے سے پہلے پہلے عرب اس کو عشراء کہتے تھے عرب کے نزدیک عشراء اونٹنی نفیس ترین مال سمجھا جاتا تھا وہ لوگ ایسی اونٹنیوں کی دمیں پکڑے ہی رہتے تھے (یعنی ہمیشہ ان کی نگہداشت کرتے تھے) عُطِّلَتْ یعنی بغیر چرواہے کی نگرانی کے چھوڑ دی جائیں گی قیامت کی ہیبت کی وجہ سے عشراء اونٹنیوں کے مالک ان کو یونہی چھوڑ دیں گے یا العشار سے مراد بادل ہیں یعنی بادل بارش سے خالی ہو جائیں گے۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا حُشِرَتْ کا معنی یہ ہے کہ ان میں ایک موجی حرکت پیدا ہوگی اور باہم ایک دوسرے میں گھس پڑے گا۔ یہ مطلب بھی کہا گیا ہے کہ چوپایوں کو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور باہمی قصاص کے لئے جمع کیا جائے گا جیسا کہ آیت یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا کی تفسیر کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ جانوروں کا حشر ان کی موت ہے یہ بھی فرمایا کہ سوائے جن وانس کے ہر چیز کا حشر اس کی موت ہے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب سمندر بھڑکائے جائیں گے اور وہ بھڑکتی آگ بن جائیں گے۔ حضرت ابی بن کعب کا بھی یہی قول ہے کلبی نے ترجمہ کیا جب سمندر بھر دیئے جائیں گے کیونکہ مسجور کا معنی ہے بھرا ہوا مجاہد ومقاتل نے کہا بعض سمندر بعض میں گھس پڑیں گے میٹھے اور شور مل کر گرم پانی کا ایک سمندر دوزخیوں کے لئے بن جائے گا۔

حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے کہا خشک ہو جائیں گے پانی سوکھ جائے گا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کو (ایک نقطہ پر) جمع کرنے کی یہ صورت ہے کہ تمام سمندر جمع کر کے ایک سمندر لبریز کر دیا جائے گا اور سورج کو اس میں ڈال دیا جائے گا جس کی وجہ سے سمندر گرم ہو کر آگ ہو جائے گا۔ اور دوزخیوں کے لئے آب حمیم بن جائے گا کل پانی خشک ہو جائے گا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابی بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت سے پہلے چھ نشانیاں ہوں گی لوگ بازاروں میں مشغول ہوں گے کہ یکدم سورج کی روشنی جاتی رہے گی۔ اسی اثناء میں پہاڑ زمین پر آگریں گے زمین ہل جائے گی اور اس میں لرزہ پیدا ہو جائے گا آدمی اور جنات ڈر جائیں گے جنات آدمیوں سے کہیں گے ہم تم کو خبر لا کر دیتے ہیں چنانچہ جنات سمندر تک پہنچیں گے اور سمندر بھڑکتی آگ نظر آئے گا اسی دوران میں اچانک ایک ہوا آئے گی جس سے سب مر جائیں گے۔ بغوی نے حضرت ابی بن کعبؓ کا یہی قول بروایت ابوالعالیہ بیان کیا ہے لیکن اس میں سمندر کے آگ ہو جانے کے بعد اتنا زائد ہے کہ وہ اسی کام میں ہوں گے کہ یکدم زمین پھٹ پڑے گی یعنی ساتویں زمین سے بلند ترین آسمان تک (ایک آواز ہوگی) اور اسی دوران میں ایک ہوا آئے گی جس سے سب مر جائیں گے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کی بارہ باتیں ہوں گی چھ دنیا میں اور چھ آخرت میں۔ آخرت والی چھ باتیں آئندہ آیات میں مذکور ہیں۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ ابن ابی حاتمؒ نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس آیت میں وہ لوگ (مراد) ہیں جو باہم مشارکت عملی رکھتے تھے ہر وہ شخص جو اپنی قوم کے ساتھ وہی کام کرتا تھا جو قوم کرتی تھی (قوم سے ملا دیا جائے گا) اور یہ اللہ کے حکم سے ہوگا اور حضور ﷺ (یہ آیت بھی اس موقع پر) فرماتے تھے وَکُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ مَا اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَا اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ بیہقی نے حضرت نعمانؓ بن بشیر کے حوالہ سے حضرت عمرؓ بن خطاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت واذا النفوس زوجت میں وہ دو شخص مراد ہیں جو ایک ہی کام کرتے تھے جس کی وجہ سے دونوں جنت یا دوزخ میں چلے جائیں گے۔

حضرت عمرؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ میں (ازواج سے) مراد ہیں ان کے شرکاء کار۔ سعید بن منصورؒ کے یہ الفاظ ہیں کہ اچھے آدمی کو اچھے آدمی کے ساتھ جنت میں ملا دیا جائے گا اور برے آدمی کو برے کے ساتھ دوزخ میں۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے ابن عباسؓ نے فرمایا اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ہنکا کر لے جاؤ ظالموں کو اور ان کے ازواج کو یعنی ان کے متبعین کو۔

بعض علماء نے کہا جوڑے جانے سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ عطاءؒ اور مقاتلؒ نے کہا نفوس مومنین کا جوڑا تو فراخ چشم حوروں کے ساتھ لگا دیا جائے گا اور نفوس کفار کو شیطانوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ عکرمہ کا

قول مروی ہے کہ نفوس کو جوڑ دینے کا یہ مطلب ہے کہ روحوں کو اجسام میں واپس کر دیا جائے گا۔

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ مَوْءُدَةُ زندہ دفن کی ہوئی لڑکی۔ واد بوجھ عرب زندہ لڑکی پر مٹی کا بوجھ اتنا ڈالتے تھے کہ وہ مر جاتی تھی اسی لئے اس کو مَوْءُدَةُ کہا جاتا تھا (بعض) عرب (دامادی کی) عار اور افلاس کے اندیشہ سے اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ آیت میں مدفونہ سے سوال کرنے کی غرض یہ ہے کہ دفن کرنے والے کی تذلیل و تجیز کی جائے جیسے آیت یَاعِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ میں نصاری کی تذلیل مقصود ہے یا یوں کہا جائے کہ مَوْءُدَةُ کی طرف سوال کی نسبت مجازی ہے یعنی آیت کی مراد اس سے سوال کرنا نہیں بلکہ اس کے متعلق سوال کرنا ہے جیساکہ آیت اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا میں (عہد سے سوال کیا جانا مقصود نہیں بلکہ صاحب عہد سے عہد کے متعلق باز پرس کی جانی مقصود ہے) یا مؤدۃ بمعنی دائدۃ کے ہے (یعنی دفن کرنے والی سے باز پرس کی جائے گی) اسم مفعول کو بمعنی اسم فاعل بولا جاتا ہے جیسے آیت کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا میں (مَاْتِیًّا بمعنی اٰتِیًا ہے) یا اَلْمَوْءُدَةُ سے مراد اَلْمَوْءُدَةُ لَھُمَا (مدفونہ کی ماں اور دائی جن کی سازش سے بچی کو دفن کیا جاتا تھا) ہیں جیساکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا الوائدة والمؤدة في النار یعنی وائدۃ (دفن کرنے والی دائی) اور مَوْءُدَةُ لَھَا (جس کی طرف سے دائی جاکر بچی کو دفن کرتی تھی مراد ماں) دونوں دوزخی ہیں۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے اچھی سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے نقل کیا ہے اور سوائے مذکورہ بالا تاویل کے کوئی صورت مفہوم حدیث کی صحت کی نہیں۔

فائدہ

زندہ بچہ کو دفن کر دینا گناہ کبیرہ ہے یہ قتل ناحق ہے چار ماہ سے زیادہ کا حمل ساقط کرنا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ جنین کی جسمانی تخلیق اس مدت میں پوری ہو جاتی ہے اور روح جسم میں پڑ جاتی ہے چار مہینے سے کم کا حمل ساقط کر دینا بھی حرام ہے لیکن اس کا گناہ پہلے سے کم ہے حرمت کی وجہ سے ہی باتفاق علماء ایک نابالغ غلام دینا واجب ہے جب کسی نے کسی حاملہ کے پیٹ پر کچھ ایسی ضرب پہنچائی ہو کہ کامل یا ناقص اعضاء والا حمل ساقط ہو جائے بشرطیکہ اس میں تخلیق انسانی کا نقشہ پیدا ہو گیا ہو اور مردہ ہو جانے کی حالت میں ساقط ہو لیکن اگر گرنے کے وقت زندہ تھا پھر مر گیا تو بڑے آدمی کی برابر دیت واجب ہو گی حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ بنی لحیان کی ایک عورت کا بچہ (ضرب سے) ساقط ہو گیا تھا رسول اللہ ﷺ نے ایک نابالغ غلام یا باندی دینے کا حکم دیا۔ بخاری و مسلم۔

مسئلہ: باندی سے عزل جائز ہے آزاد عورت سے اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں مگر عزل باوجود جائز ہونے کے ہے بہر حال مکروہ۔ ایک حدیث میں حضرت حذامہ بنت وہب کی روایت سے آیا ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ نے عزل کے متعلق دریافت کیا فرمایا یہ پوشیدہ زندہ دفن ہے اور وہ اِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ (میں موجود) ہے جواز عزل کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہوتا تھا (یعنی نزول قرآن ختم نہیں ہوا تھا پھر بھی ہم کو عزل کی ممانعت نہیں کی گئی) بخاری و مسلم۔ مسلم نے اتنا زائد نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی مگر حضور ﷺ نے ہم کو ممانعت نہیں فرمائی۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور اقدس (ﷺ) نے باندی کے معاملہ میں فرمایا اگر چاہو تو اس سے عزل کر لو مگر جو کچھ اس کے مقدر میں ہے وہ توا سے پہنچے گا۔ دوسری روایت میں ہے ایسا نہ کرو تو تمہارا کیا حرج ہے جو جان قیامت تک پیدا ہونے والی ہے وہ تو پیدا ہوئے گی۔ بخاری و مسلم۔

عزل کے لئے آزاد عورت کی اجازت کی ضرورت حضرت عمرؓ کی روایت سے ثابت ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے آزاد عورت سے عزل کی اس کی اجازت کے بغیر ممانعت فرمادی تھی۔ ابن ماجہ۔

بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ کس جرم میں اس کو قتل کیا گیا۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ اور جب اعمالنامے حساب کے لئے پھیلائے جائیں گے یا جن کے اعمالنامے ہوں گے ان کو تقسیم کئے جائیں گے۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ جب آسمان اکھاڑ دیا جائے گا۔ ہٹادیا جائے گا جیسے ذبیحہ کی کھال اتاری جاتی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ نفخۂ بے ہوشی سے پہلے اس وقت ہوگا جب سورج کی روشنی زائل ہوگی اور ستارے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے یا نفخۂ بے ہوشی کے وقت ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں نفخوں کے درمیان ہو اور آسمان وزمین کو لپیٹ دیا جائے اس آسمان کو دوسرے آسمان میں اور اس زمین کو دوسری زمین میں تبدیل کر دیا جائے۔

قرطبی نے لکھاہے کہ صاحب افصاح نے اخبار (مختلفہ) کے درمیان توفیق پیدا کی ہے اور کہاہے کہ آسمان وزمین کی تبدیلی دو مرتبہ واقع ہوگی ایک تو فقط حالات کی تبدیلی ہوگی یہ نفخۂ بیہوشی سے پہلے ہوگی۔ ستارے بکھر جائیں گے چاند سورج کو گہن لگ جائے گا۔ آسمان تانبے کی طرح ہو جائے گا اور رؤس سے ان کو ہٹادیا جائے گا۔ پہاڑ رواں ہو جائیں گے سمندر آگ بن جائے گا زمین میں نشیب فراز پیدا ہو جائیں گے۔ زمین پھٹ جائے گی۔ اس کی ہیئت پہلی ہیت کے خلاف ہو جائے گی۔ پھر دونوں نفخوں کے درمیان آسمان وزمین لپیٹ دیئے جائیں گے اور اس آسمان کو دوسرے آسمان سے بدل دیا جائے گا (یہ تبدیل ذات ہوگی)

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾ اور جب اللہ کے دشمنوں کے لئے جحیم کو خوب بھڑکایا جائے گا۔

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ اور جب جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی۔ اللہ نے فرمایا ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور اس کے بعد والے جملوں میں جو اِذَا ہے یہ جملہ اس کی جزا ہے یعنی اس وقت ہر شخص اپنی کی ہوئی اچھائی برائی کو جان لے گا۔ یہ وقت ایک وسیع وقت ہوگا نفخہ اولی کے پہلے سے جنت ودوزخ کے داخلہ کے وقت تک (سارا وقت قیامت کا وقت) ہوگا۔

فَلَآ اُقْسِمُ اس لفظ کی تفصیل سورۂ قیامۃ کے شروع میں کردی گئی ہے (لازائد برائے تاکید قسم ہے یا نافیہ ہے یالا نہیں بلکہ صرف لا قسم ہے جس میں لام تاکیدی ہے وغیرہ) فَلَآ اُقْسِمُ میں فاء تفریع کے لئے ہے یعنی جب احوال قیامت کے متعلق ہم نے آیات نازل کردیں تو آئندہ کی خبریں دینے سے ہی) تم سمجھ لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے خدا پر دروغ بانی نہیں کی گئی ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔

بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ خنوس کا معنی ہے منتہی سے مبداء سیر کی طرف لوٹنا۔ اَلْخُنَّس سے اس جگہ وہ پانچ ستارے مراد ہیں جن کو متحیرہ کہا جاتا ہے یعنی عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل ان کو متحیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی رفتار کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ مشرق سے مغرب کی طرف جاتے جاتے لوٹ پڑتے ہیں کبھی یہ ٹھہرے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ہیت (قدیم) کی نظر میں اس کا سبب یہ ہے کہ کچھ افلاک جزئیہ (چھوٹے دائرے) ہیں جو کھوکھلے نہیں ہیں ان میں یہ ستارے پیوستہ ہیں ان چھوٹے دائروں کو تدویرات کہا جاتا ہے یہ دائرے خود بھی متحرک ہیں اور ان کے بالائی حصوں کی حرکت ان افلاک کی رفتار کے تابع بھی ہے جن کے اندر یہ موجود ہیں ان دائروں کے بالائی حصہ کی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف اپنے اپنے افلاک کی رفتار کے موافق ہے اور زیریں حصوں کی حرکت اس کے برعکس مشرق سے مغرب کی جانب ہے پس مذکورہ ستارے جب تدویرات کے اعلی حصے میں ہوتے ہیں تو تدویر کی حرکت اور اس فلک کلی کی حرکت جس میں یہ فلک جزئی یعنی تدویر ہے دونوں موافق ہوتی ہیں اور ستارہ کی رفتار تیزی کے ساتھ مغرب سے مشرق کی طرف دکھائی دیتی ہے لیکن جب ستارے تدویر کے زیریں حصے میں ہوتے ہیں تو تدویر کی حرکت فلک کلی کی حرکت کے مزاحم ہوتی ہے یا کم از کم ایک دوسرے کے موافق نہیں ہوتی (ایک کی مغرب سے مشرق کو دوسرے کی مشرق سے مغرب کو) اس لئے مذکورہ ستارے کبھی مشرق سے مغرب کی طرف

جاتے نظر آتے ہیں یہی واپسی اور خنوس ہے۔ اور کبھی ساکن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک (ہیئت قدیم) کی یہ فضائی تحقیق واجب التسلیم نہیں بلکہ ہمارے نزدیک) تو سب ستارے ایک ایک دائرہ میں تیرتے (یعنی ہموار چال سے رواں اور متحرک) ہیں اور نہ آسمانوں کا پھٹنا ناممکن ہے نہ جڑنا پس خمسہ متحیرہ کی حرکت کبھی مشرق کی طرف ہوتی ہے کبھی مغرب کی طرف کبھی سست کبھی تیز جب اللہ چاہتا ہے اور جیسا ضابطۂ خالق ہے ویسی ہی ستاروں کی حرکات ہیں ہاں ضابطۂ فاطر یہی ہے کہ تمام ستارے ایک ہی قسم کی رفتار اور ترتیب کے ساتھ متحرک ہیں۔

قتادہؒ نے کہا کہ خنس یہی ستارے ہیں جو رات میں نمودار ہوتے اور دن میں چھپ جاتے ہیں خنوس سے اس جگہ مراد ہے چھپ جانا یہ بھی کہا گیا ہے کہ خنوس سے مراد ہے غائب ہو جانا۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں اَلْخُنَّس اور اَلْکُنَّس دونوں ہم معنی ہوں گے پھر تکرار کی کوئی وجہ نہیں۔

الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ یعنی وہ خمسہ متحیرہ جو دائرے میں چلتے اور غروب یا محاق کے وقت چھپ جاتے ہیں۔ کنوس کا معنی ہے خرگوش اور ہرن کا اپنے مسکن (جھاڑی وغیرہ میں پناہ گیر ہونا یہاں کنوس سے مراد ہے غروب یا محاق کے وقت ستاروں کا چھپ جانا۔

میں کہتا ہوں احتمال ہے کہ ان ستاروں کے مکان سے مراد ہو زیر ین عرش ان کی قرار گاہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے سورج ڈوب گیا تو فرمایا کیا تو جانتا ہے یہ کہاں جاتا ہے میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہے فرمایا وہ عرش کے نیچے سجدہ کرنے جاتا ہے۔ (الحدیث)

وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ حسن بصریؒ نے عَسْعَسَ کا ترجمہ کیا اقبل بظلامه و ادبر قسم ہے رات کی جب وہ اپنا اندھیرا لے کر سامنے سے آتی ہے یا پشت موڑ کر جاتی ہے یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اور قسم ہے صبح کی جب اس کی پو پھٹتی ہے یا اس کی روشنی پھیلتی ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۱۹﴾ ذِي قُوَّةٍ یہ جواب قسم ہے رسول سے مراد ہیں حضرت جبرئیلؑ یا رسول اللہ ﷺ یعنی یہ قرآن بلا شبہ اس مرسل (قاصد) کا قول ہے جو اللہ کے نزدیک معزز اور طاقت والا ہے مطلب یہ کہ رسول (اور قاصد) کی حیثیت سے اس کا قول ہے خود بنا کر خدا کی طرف منسوب نہیں کر دیا ہے۔ [۱] (نہ اس کی حیثیت محض ترجمان کی ہے) اگر رسول سے مراد جبرئیل ہوں تو ان کی قوت یہ تھی کہ قوم لوط کی بستیوں کو اکھاڑ کر بحر اسود کے کنارہ سے اپنے بازو پر اٹھا کر بلندی پر لے جا کر الٹ دیا قوم ثمود پر ایسی دھاڑ ماری کہ سب بیٹھے بیٹھے مردہ ہو گئے آن کی آن میں آسمان سے زمین پر آتے اور پلک مارنے میں زمین سے آسمان پر چڑھ جاتے تھے۔ اگر رسول سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہو تو آپ کی طاقت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت نوح ساڑھے نو سو برس اپنی قوم میں رہے اور تھوڑے لوگوں کو مومن بنا سکے مگر رسول اللہ ﷺ

---

[۱] جو لوگ قرآنی عبارت کو جبرئیلؑ کی ساختہ یا رسول اللہ ﷺ کی پرداختہ کہتے ہیں اور قرآن نام صرف معانی و مضامین کا قرار دیتے ہیں وہ اپنے استدلال میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ قرآن رسول کا قول ہے خدا کا قول نہیں۔ حضرت مولف قدس سرہ نے من حیث انہ رسول کے الفاظ فرما کر مذکورہ بالا شبہ کا استیصال کر دیا۔ کوئی رسول اور پیامبر اگر کسی کو کسی کی طرف سے کوئی پیام پہنچاتا ہے تو اس کی صرف یہ شکل ہی ہے کہ وہ اپنا رسول ہونا ظاہر کرے اور جو کچھ پیام بھیجنے والے نے کہا اس کو اسی کے الفاظ میں ادا کر دے۔ یہ طریقہ کامل رسالت اور پیام رسانی کا ہے لیکن اگر وہ قاصد اپنے الفاظ میں پیام بھیجنے والے کا مطلب ادا کرتا ہے تو اس کو پورا پورا پیام رساں نہیں کہا جا سکتا اول تو الفاظ کی قدرے تبدیل بھی مضمون کو بدل دیتی ہے اور نہ بھی بدلے، تب بھی اپنے الفاظ میں کسی کے مطلب کو پہنچانے سے فرض رسالت کی ادائیگی کامل طور پر نہیں ہوتی جبرئیلؑ ہوں یا رسول اللہ ﷺ ہر ایک کی حیثیت رسول کامل کی تھی۔ ترجمان کی نہ تھی یہ مضمون الٰہی کو اپنے الفاظ میں تعبیر کرنے والے نہ تھے ترجمان اور معبر کو رسول نہیں کہا جاتا۔ رسول اللہ کی حیثیت رسالت کا تقاضا ہے کہ مرسل کے الفاظ پہنچا دیئے جائیں۔ واللہ اعلم۔

نے تئیس برس میں (لاکھوں کو) اللہ کی طرف کھینچ لیا 23 برس میں ہر طرف دین کو پھیلا دیا جوق در جوق لوگ دین خدا میں داخل ہونے لگے حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ ساتھ تھے۔ ساتویں آسمان سے بھی اوپر جہاں پہنچنے کی جبرئیلؑ کی طاقت نہ تھی پہنچ گئے پھر زمین پر اتر آئے اور گھڑی بھر وقت بھی صرف نہ ہوا۔ آپ نے دیدار رب کا شرف حاصل کیا کسی دوسرے کو یہ نعمت میسر نہیں ہوئی (حضرت موسیٰ کی درخواست پر) جب اللہ کا جلوہ پہاڑ پر پڑا تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین سے ہموار کر دیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ﴿۲۱﴾

عرش والے (اللہ) کے ہاں وہ معزز و باوجاہت اور مطاع ہے (اس کا حکم مانا جاتا ہے) اور وہاں وہ امین وحی ہے۔ عِنْدَ مَكِيْنٍ سے متعلق ہے یعنی ثَمَّ (وہاں) کا تعلق اَمِیْنٍ سے ہے اور مُطَاعٍ سے بھی ہو سکتا ہے یعنی ملا اعلیٰ (عالم ملائکہ) میں اس رسول کی اطاعت کی جاتی ہے بغوی نے کہا من جملہ دوسرے واقعات کے ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کے لئے جبرئیلؑ کے کہنے سے ملائکہ نے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے تھے اور جنت کے دربانوں نے جنت کے دروازے۔ میں کہتا ہوں یہ بعینہ اطاعت محمد رسول اللہ کی تھی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اطاعت سے مراد یہ ہو کہ اللہ کے احکام پہلے حضرت جبرئیلؑ پر اترتے ہیں پھر ان کے ذریعہ سے دوسرے فرشتوں کو پہنچتے ہیں۔

حضرت نواس بن سمعان کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ کسی امر کی وحی کرنا چاہتا ہے تو وحی کے ساتھ کلام فرماتا ہے جس سے آسمانوں میں ایک سخت لرزہ پیدا ہو جاتا ہے جب آسمانوں والے اس کو سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں اور اللہ کے سامنے سجدہ میں گر پڑتے ہیں پھر (ہوش میں آکر) سب سے پہلے سر اٹھانے والے جبرئیلؑ ہوتے ہیں اللہ ان سے اپنی وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے پھر جبرئیلؑ ملائکہ کی طرف سے گزرتے ہیں جس آسمان کی طرف سے گزرتے ہیں اس کے فرشتے جبرئیلؑ سے پوچھتے ہیں جبرئیلؑ ہمارے مالک نے کیا فرمایا جبرئیلؑ کہتے ہیں (جو کچھ فرمایا) حق ہی ہے وہ بزرگ و برتر ہے پھر سب ملائکہ ویسے ہی کہتے ہیں۔ جیسے جبرئیل وحی کے متعلق حکم خداوندی کے موافق کہتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل مطاع ملائکہ ہیں رہا محمد رسول اللہ ﷺ کا مطاع ملائکہ ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل حق (صوفیہ) کے نزدیک حقیقت محمدیہ فیض وجود اور مرتبہ قرب کے لئے اول ترین تعین (مخلوق اور ممکن) ہے اور مراتب قرب میں سے ہی وحی و کلام کا مرتبہ بھی ہے۔ حقیقت محمدیہ کے توسل کے بغیر کسی کو وحی نہیں پہنچ سکتی یہ صرف کشفی چیز ہے بعض نصوص بھی اس پر دلالت کر رہی ہیں۔ اللہ نے فرمایا وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ خود حضورؐ نے فرمایا آسمان میں میرے دو وزیر جبرئیلؑ و میکائیلؑ ہیں اور زمین پر میرے دو وزیر ابو بکرؓ و عمرؓ ہیں۔ لہٰذا جبرئیلؑ کا مطاع ہونا بطریق اولیٰ ہے۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ﴿۲۲﴾

اور تمہارا ساتھی مجنون نہیں ہے۔ یہ کلام بھی جواب قسم ہے صَاحِبُكُمْ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ اگر لفظ رسول سے گزشتہ کلام میں رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد ہو تو اس جگہ بجائے ضمیر کے اسم ظاہر (صَاحِبُكُمْ) کہنے سے اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ چالیس برس سے یہ تمہارے ساتھ ہیں کوئی حرکت ان سے ایسی نہیں ہوئی جو کمال عقل و ہوش کے خلاف ہو لہٰذا ان کو اب مجنون کہنا یا محض ضد ہے یا بجائے خود جنون ہے کافروں نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا تھا اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ مذکورہ بالا آیت میں قول کفار کا رد ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ﴿۲۳﴾

باتفاق علماء رَاٰی کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہی دیکھا تھا۔ ہ کی ضمیر یا ذی العرش کی طرف راجع ہے یا رسول کریم یعنی جبرئیل کی طرف اول صورت میں بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ رَاٰی کی ضمیر فاعلی سے حال ہوگا۔ یعنی جب رسول اللہ ﷺ ساتوں آسمانوں کے آخر میں عالم کے افق پر تھے اس وقت آپ ﷺ نے اللہ کو دیکھا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ہم نے قصہ معراج میں باسناد شریک بن عبداللہ حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ رب العزت قریب ہوا نیچے کو آیا یہاں تک کہ بقدر فاصلہ قوسین یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا ابو سلمہؒ کی بھی یہی روایت ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول مروی ہے اور ضحاک بھی اسی کے قائل ہیں۔ جو لوگ۔ قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کو دیکھا تھا۔

تفصیل میں ان کے اقوال مختلف ہیں بعض قائل ہیں کہ اللہ نے آپ کے دل کے اندر آنکھوں کی بینائی پیدا کر دی تھی اور آپ نے دل سے دیکھا تھا اس قول کا استنباط آیت مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى سے کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے مسلم نے بروایت ابوالعالیہؒ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کو دل سے دوبار دیکھا۔

حضرت انسؓ حسنؒ بصری اور عکرمہؒ قائل تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ کا انتخاب خلت کے لئے اور موسیٰؑ کا کلام کے لئے اور محمد کا رویت (دیدار) کے لئے کیا۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا فرمایا (وہ) نور ہے میں اس کو کیسے دیکھتا۔ رواہ مسلم۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اَلْاُفُقِ الْمُبِيْنِ اور اَلْاُفُقِ الْاَعْلٰى سے مراد ہو۔ سالکوں کی سیر کا آخری درجہ حقیقت عابدیت کا آخری مرتبہ حقیقت محمدیہ ہے جس کو محبوبیت خالصہ کا درجہ کہا گیا ہے۔ یہ مرتبہ لاتعین (اطلاق) کے مرتبہ سے ادھر ہے لاتعین کی حد میں سیر و سلوک کی کوئی گنجائش نہیں اس مقام پر سیر صرف نظری سیر ہو سکتی ہے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔

جمہور اہل تفسیر نے ہ ضمیر رسول کریم کی طرف راجع کی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھا جبکہ جبرئیلؑ افق مبین میں تھے قتادہ اور مجاہد نے کہا یعنی بجانب مشرق بالائی افق میں تھے۔ بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ سے فرمایا تھا میں آپ کو اس شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں جس شکل میں آپ آسمان میں ہوتے ہیں حضرت جبرئیلؑ نے کہا آپ ایسا نہ کر سکیں گے حضور ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ جبرئیلؑ نے کہا آپؐ کس جگہ چاہتے ہیں کہ میں وہ صورت آپ ﷺ کو دکھاؤں حضور ﷺ نے فرمایا ابطح میں جبرئیلؑ نے کہا وہاں تو میں نہیں سما سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا منا میں جبرئیلؑ نے کہا وہاں بھی میری سمائی نہ ہوگی فرمایا عرفات میں جبرئیل نے کہا اس میں بھی میری وسعت نہیں۔ فرمایا حراء میں جبرئیل نے کہا اس کی بنیادی دیواروں میں اگر میری گنجائش ہو گی۔ غرض وقت مقرر پر رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اچانک عرفہ کے پہاڑوں سے ہتھیاروں کی کھٹاکھٹ اور بادلوں کی گرج جیسی آواز کے ساتھ جبرئیل سامنے نمودار ہو گئے ان کا سر آسمان تک اور پاؤں زمین میں تھے اور مشرق سے مغرب تک خلا بھری ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ یہ سماں دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ راوی کا بیان ہے اس کے بعد جبرئیل نے اپنی صورت بدل دی اور حضور کو سینہ سے چمٹا کر کہا محمد خوف نہ کرو اگر تم اسرافیل کو دیکھ لو گے تو کیا حال ہو گا کہ ان کا سر عرش کے نیچے اور پاؤں ساتویں زمین کی حدود میں ہیں۔ عرش ان کے کاندھے پر ہے اور ایسی عظمت کے باوجود اللہ کے خوف سے وہ کبھی کبھی اتنا سمٹ جاتے ہیں کہ چڑیا کی طرح ہو جاتے ہیں اور عرش رب کو (اس وقت) محض عظمت (الٰہی) اٹھائے رہتی ہے۔

اس قول (رویت جبرئیلؑ) کے قائلین میں سے حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔ بخاری نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص کو جھوٹا قرار دیا جو کہتا ہے کہ محمد نے اپنے رب کو دیکھا تھا۔ آپ نے اپنے قول پر آیت لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے استدلال کیا اور آیت مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ کو بھی ثبوت میں پیش کیا۔

مسئلہ کا فیصلہ یہ ہے کہ رویت الٰہیہ کو ثابت کرنے والوں کا قول حضرت عائشہؓ کے قول سے اولیٰ ہے۔ آیت لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ سے آخرت میں رویت کی نفی تو باجماع اہل سنت ظاہر نہیں ہوتی اسی طرح دنیا میں شب معراج کے اندر رویت الٰہیہ اور جنت دوزخ کو دیکھنے کے منافی کوئی چیز آیت میں نہیں ہے۔ رہا جبرئیلؑ کو اصل صورت میں دیکھنے کا واقعہ جو حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ نے نقل کیا ہے وہ بجائے خود صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیت ولقد راہ میں بھی یہی واقعہ مراد ہے بلکہ کلام کی رفتار تو رسول اللہ ﷺ کی فضیلت اور کمال کے اظہار کو بتا رہی ہے جبرئیل کو دیکھنا کوئی فضیلت نہیں باجماع علماء جبرئیلؑ سے تو رسول اللہ ﷺ افضل تھے۔ پھر لفظ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ کمال قرب رسول پر دلالت کر رہا ہے۔ اس سے آگے مرتبہ کی ترقی بس رؤیت خداوندی کا اثبات ہی ہو سکتا ہے۔ جبرئیلؑ کو دیکھنے کا مرتبہ مکین عند اللہ ہونے کے مرتبہ سے بڑا نہیں۔ لیکن اگر مکین عند اللہ ہونے کو حضرت جبرئیلؑ کی صفت کہا جائے اور لَقَدْ رَاٰهُ سے رویت جبرئیلؑ مراد لی جائے تو مضمون الٹا ہو جائے گا (کہ جبرئیلؑ تو مکین عند اللہ ہیں اور رسول کو بس اتنا شرف حاصل ہے کہ انہوں نے جبرئیل کو دیکھ لیا)

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اور محمد ﷺ وحی پر بخیل نہیں کہ جو چیز ان کو وحی سے معلوم ہو وہ کسی کو نہ پہنچائیں نہ سکھائیں۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾ اور قرآن کسی شیطان مردود کا قول نہیں کہ چوری سے سن کر اپنے دوست کاہن کے دل میں اس نے ڈال دیا ہو۔ کافر کہتے تھے کہ رسول اللہ کاہن ہیں اس جملہ میں کافروں کے قول کا رد کر دیا۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ پس تم کہاں جا رہے ہو۔ فاء سببی اور استفہام انکاری ہے یعنی باطل کی طرف جو تم جا رہے ہو ایسا نہ کرو۔ کافر حضور کو قرآن کو شاعر یا مجنون یا کاہن کہتے تھے لفظ اَیْنَ سے اس کا انکار کر دیا۔ زجاج نے کہا جو راستہ میں نے کھول کر بیان کر دیا اس سے زیادہ واضح کس راستہ پر چلو گے سائل سوال کر سکتا ہے وہ کیا راستہ ہے تو گویا اس کے جواب میں فرمایا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ قرآن تو بس سارے جہان کے لئے یاد داشت ہے۔ قاموس میں ہے کہ ذِکْرٌ تَذْکَارٌ کی طرح (مصدر ہے) کسی چیز کو یاد رکھنا (نیز) وہ چیز جو زبان پر رواں ہو۔ شہرت، زبان سے تعریف، نماز، شرف، دعا وہ کتاب جس کے اندر دین اور وضع شریعت کی تفصیل ہو اس جگہ آخر الذکر معنی مراد لینا ظاہر ہے مگر دوسرے معانی پر بھی حمل کیا جا سکتا ہے کیونکہ قرآن ذکر خدا ہے۔ ایسی چیز بھی ہے جس کو یاد رکھنا ضروری ہے ہر وقت یا اکثر اوقات زبان پر جاری رکھنے کی چیز بھی ہے۔ اللہ کی ثنا بھی ہے عبادت خدا بھی ہے انسان کے لئے شرف بھی ہے انسانی دعاء بھی ہے۔

عٰلَمِیْنَ سے عموماً تمام جنات اور انسان مراد ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت تمام جن وانس کے لئے تھی بلکہ آپ کی ذات رحمتہ للعالمین تھی۔ اور قرآن کا فیض ملائکہ کو بھی حاصل ہے آیت بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ اس پر دلالت کر رہی ہے حاکم نے مستدرک میں حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب سورۂ انعام نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی پاکی کا زبان سے اظہار فرمایا پھر فرمایا ملائکہ نے بھی پاکی بیان کی (اتنی تعداد نے) کہ افق کو بند کر دیا۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ یعنی جو لوگ حق کا اتباع کرتے اور حق کی چال چلتے ہیں قرآن ان کے لئے خصوصیت کے ساتھ یاد داشت ہے اتباع حق کرنے والوں کی یہ خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ حقیقت میں یہی قرآن سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں۔ لفظ استقامت تمام احکام کو جامع ہے سفیان بن عبد اللہ ثقفی نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے اسلام کی کوئی ایسی بات فرما دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے اس کے متعلق کسی اور سے نہ پوچھنا پڑے فرمایا کہو امنت باللہ پھر استقامت رکھ۔ رواہ مسلم۔

ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتم نے سلیمان بن یسارؒ کی روایت سے اور ابن ابیؒ حاتم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور ابن المنذر نے بحوالہ سلیمان قاسم بن مخیمرہ کی روایت سے بیان کیا کہ جب لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ نازل ہوئی تو ابو جہل کہنے

سورۃ الانفطار

یہ سورت مکی ہے اس میں انیس آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲ جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳ اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے ایک کا راستہ دوسرے میں کھول دیا جائے گا۔ شیریں سمندر شور سے مل کر ایک سمندر بن جائے گا۔

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴ اور جب قبروں کی مٹی الٹ دی جائے گی اور مردوں کو ان کے اندر سے نکال لیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵ اس وقت آدمی کو معلوم ہو جائے گا جو کچھ اس نے پہلے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔ یہ اِذَا کا جواب ہے اور اِذَا چاروں آیات میں ویسا ہی ہے جیسے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں گزر چکا۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ جو اچھا برا عمل اس نے پہلے کیا اور جو اچھا برا طریقہ (بنیاد ڈال کر) وہ پیچھے چھوڑ آیا وہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا بعض علماء نے کہا کہ جو کام اس نے کیا اور جو کام اس نے چھوڑا وہ معلوم ہو جائے گا۔ بعض نے کہا صدقات کو پہلے دینا اور زکوٰۃ دینا مراد ہے بعض نے کہا دنیا کی آخرت پر تقدیم یا تاخیر مراد ہے یعنی دنیا کو آخرت پر مقدم قرار دیا تھا یا موخر۔ آیت يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ اس کی نظیر ہے۔ (اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے)

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶ اے انسان تجھ کو کس نے فریب خوردہ بنایا اور رب کریم کی نافرمانی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی پر جرات دلائی۔ اَلْكَرِيْم در گزر کرنے والا يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ پورا جملہ معترضہ ہے عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ کے جملہ سے ہر بد اعمالی کا مفہوم سمجھا جا رہا ہے اس پر يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ الخ سے تنبیہ فرمائی ہے۔ بغوی کا بیان ہے کہ ولید بن مغیرہ کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ نزول آیت کا مورد ابی بن خلف تھا کلبی نے اسید بن کلدہ کے متعلق آیت کا نزول قرار دیا ہے اسید نے رسول اللہ ﷺ کو مارا تھا اور اللہ نے اس کو فوری سزا نہیں دی تھی۔ اور یہ آیت نازل فرمائی یعنی رب کریم کے متعلق تجھے کس چیز نے فریب خوردہ بنایا اور کس نے اس کی خلاف ورزی پر تجھے جرات دلائی کیا اس کی درگزر نے یا اس بات نے کہ اس نے تجھے فوری سزا نہیں دی رب کی صفت کریم اس موقع پر ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ خدا کے وصف کریمی ہی کی وجہ سے اس نے فریب کھایا تھا اور شیطان یہ ہی کہہ کر دھوکا دیتا ہے کہ تیرا رب کریم ہے کسی کو فوری سزا نہیں دیتا۔ مقاتل نے جو کہا تھا کہ اللہ کی درگزر نے اس کو فریب دیا تھا کہ خدا نے اس کی حرکت کی فوری سزا نہیں دی اس قول کا بھی وہی مطلب ہے جو ہم نے بیان کیا ہے سدی نے کہا اللہ کے نرمی کرنے نے اس کو فریب دیا۔

آیت میں استفہام انکاری ہے اگر اللہ میں صرف وصف کرم ہو تب بھی اس کے کرم اور فی الفور عذاب نہ دینے سے فریب کھانا جائز نہیں ظالم کو بالکل مطلق العنان ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا اور دشمن دوست کو برابر کر دینا کرم کا تقاضا نہیں اور جب کرم کے ساتھ (اس کے مخالف) اوصاف قہر و انتقام وغیرہ کا بھی خدا کو جامع مانا جائے تب تو کرم پر مغرور ہو جانا (اور انتقام کی

طرف سے غافل ہو جانا) جائز ہو سکتا ہی نہیں۔
لفظ الکریم ناشکری کی کامل تردید کر رہا ہے کثرت کرم کا تو تقاضا یہ ہے کہ کریم کا شکر کیا جائے۔ کفران نعمت نہ کیا جائے طاعت میں کوشش کی جائے کرم پر اعتماد کر کے گناہوں میں انہماک نہ کیا جائے۔
بعض اہل بشارت کا قول ہے کہ دوسرے اسماء و صفات کو چھوڑ کر بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ کہنے سے گناہ گار کو یہ جواب دینے کا موقع مل گیا کہ جب اس سے گناہ کی باز پرس ہو تو وہ کہہ دے کہ مجھے کریم کے کرم نے دھوکہ دیا یحییٰ بن معاذ نے کہا اگر مجھے سامنے کھڑا کر کے پوچھا کہ یحییٰ تجھے میرے متعلق کس نے فریب خوردہ کر دیا اور مجھ پر کس نے جرات دلائی تو کہہ دوں گا کہ تیرے گزشتہ اور حالیہ کرم نے مجھے دھوکہ دیا ابو بکر وراق نے کہا اگر مجھ سے فرمایا مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ تو کہہ دوں گا غرنی کرم الکریم حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ قیامت کے دن اللہ اس سے باز پرس نہ کرے وہ ضرور کہے گا کہ اے ابن آدم تجھے مجھ پر کس چیز نے جری بنا دیا اے ابن آدم تو نے اپنے علم کے موافق کیا عمل کیا اے ابن آدم تو نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا۔ عطاء نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں کہا کہ تجھے کس چیز نے خدا سے کاٹ دیا کس نے خدا سے روک کر نفس میں پھنسا دیا بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا۔
نقل ہے کہ ایک عورت نے قاضی سے استغاثہ کیا کہ میرے شوہر نے میرے اوپر ایک اور عورت سے نکاح کر لیا ہے قاضی نے کہا تجھ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں اللہ نے مردوں کے لئے حسب مرضی دو دو تین تین اور چار چار عورتیں مباح کر دی ہیں عورت بولی قاضی جی اگر حجاب و حیاء مانع نہ ہوتی تو میں اپنا حسن تم کو دکھاتی اور پھر پوچھتی کہ جس کا حسن و جمال ایسا ہو جیسا میرا کیا اس سے رخ موڑ کر دوسرے سے مشغلہ کرنا جائز ہے۔ عورت کا یہ قول ایک اہل دل نے سن پایا اور سنتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو کر گر پڑا کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا تو کہنے لگا میں نے ایک ہاتف کو یہ ندا دیتے سنا کہ کیا اس عورت کی بات تو نے نہیں سنی اگر عظمت و کبریاء کا حجاب نہ ہوتا تو میں تم کو اپنا جمال و جلال دکھاتا جس کی سمائی کسی مقابل میں نہیں اور تم سے پوچھتا کہ جو مجھ سے مشغلہ رکھ سکتا ہے کیا اس کے لئے دوسرے سے مشغلہ رکھنا درست ہے مجھ جیسا کہاں ہے میری مثل کون ہے کوئی میری مثل ہو ہی نہیں سکتا۔ میری ہی طلب کر طلب کرے گا تو مجھے پالے گا۔
حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اللہ بھی اپنا رخ اس کی طرف کر لیتا ہے پھر جب آدمی رخ پھیر لیتا ہے تو اللہ فرماتا ہے اے ابن آدم کس کی طرف تو رخ پھیرتا ہے مجھ سے بہتر کون ہے۔ میری طرف رخ کر جب آدمی دوبارہ رخ گردانی کرتا ہے تو اللہ وہی پہلی بات فرماتا ہے جب تیسری بار آدمی منہ پھیر لیتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف سے رخ پھیر لیتا ہے۔ رواہ البزار۔

الَّذِي خَلَقَكَ جس نے تجھے اول مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے جب کہ پہلے کچھ بھی نہ تھا (یعنی حضرت آدمؑ کو مٹی سے اور ان کی نسل کو نطفہ سے بنایا)

فَسَوَّاكَ پھر اس نے تجھ کو پورے درست اعضاء والا آدمی بنا دیا۔ تخلیقی درستی کا یہ معنی ہے کہ اعضاء کو درست بنایا اور اس قابل کر دیا کہ وہ اپنے اپنے فرائض ادا کر سکیں۔

فَعَدَلَكَ ﴿۷﴾ تجھے موڑا اور جس صورت کی طرف چاہا پھیر دیا یا دوسرے حیوانوں کی خلقی (صورت و طبیعت سے) پھیر دیا یہاں تک کہ تو سب سے جدا اور ممتاز ہو گیا۔ یا بعض اجزاء کی طبیعت کو بعض کی طرف موڑ کر اعتدال پیدا کر دیا۔ صفراء کی حرارت اور خشکی کو بلغم کی سردی اور رطوبت سے توڑ دیا اور سوداء کی خشکی و برودت کو خون کی رطوبت و حرارت سے شکستہ کر دیا اور بلغم کی برودت و رطوبت کو صفرا کی حرارت و یبوست سے اور خون کی حرارت و رطوبت کو سودا کی خشکی و برودت سے توڑ دیا۔ اس طرح تمام حیوانات سے زیادہ تیرے مزاج میں اعتدال پیدا ہو گیا (کوفیوں کی قرات میں عَدَلَكَ ہے جس کی توضیح ہم نے کر دی) دوسرے قاریوں کی قرات میں فَعَدَّلَكَ آیا ہے یعنی اللہ نے تیری جسمانی ساخت کو متوازن بنایا اور اعضاء جسم

متناسب بنائے جن کے اندر اپنے اپنے فرائض کو ادا کرنے کی قوتوں کی قابلیت بنائی۔ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۞ صُوْرَةٍ میں تنوین تنکیر ہے اور تنکیر کی تاکید کے لئے مَا کو لایا گیا ہے اور تنکیر اس جگہ مفید تکثیر ہے یعنی جس جس صورت میں چاہا تم کو جوڑ دیا۔ مجاہد کلبی اور مقاتل نے کہا باپ یا ماں یا ماموں یا چچا کی غرض جس کی شکل چاہی دیدی حدیث میں آیا ہے جب نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے تو اس سے لے کر آدم تک سب (صورتوں) کو سامنے لایا جاتا ہے پھر حضور نے آیت فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ تلاوت فرمائی اس حدیث کو ابن جریر اور طبرانی نے موسیٰ بن علی بن رباح کے سلسلہ سے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ عَدَلَكَ کا بیان ہے اسی لئے دونوں جملوں کے درمیان حرف عاطف نہیں لایا گیا۔

اَلَّذِیْ سے رَكَّبَكَ تک پورا کلام رَبِّكَ کی دوسری صفت ہے جس سے رب کی ربوبیت کا ثبوت اور کریم کے کرم کی وضاحت ہو رہی ہے اور اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ جو خدا اول تخلیق میں ایسے ایسے کام کر سکتا ہے وہ دوسری تخلیق پر بھی قادر ہے۔ اس سے ممانعت کفران کی تاکید اور غرور و کفران پر زجر کرنی بھی مقصود ہے کیونکہ جس کی شان ایسی ہو اس کی ناشکری جائز نہیں۔

كَلَّا یہ اللہ کے کرم سے فریب خوردہ ہونے سے بازداشت ہے۔

بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ۞ اَلدِّیْن سے مراد ہے اسلام یا جزاء سزا کریم کے کرم پر اعتماد کر بیٹھنے سے اس کلام میں اعراض کیا ہے (یعنی ادنیٰ سے رخ موڑ کر اعلیٰ کی طرف توجہ کی ہے) مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا فریب خوردگی ہی پر تم بس نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ اسلام عقیدہ جزا سزا کی تکذیب کرتے ہو۔

یہ بھی احتمال ہے کہ جملہ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ کے مفہوم سے اعراض ہو یعنی ہر انسان نے جو پہلے معصیت اور پیچھے طاعت کی ہوگی اس کو جان لے گا اور تم عصیان کرتے ہو (لہٰذا تم اپنے گناہوں کو جان لو گے) اور فقط معصیت ہی نہیں کرتے بلکہ جزا سزا کو ہی نہیں مانتے۔

وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۞ حالانکہ تمہاری رفتار گفتار اور اطوار کی نگہداشت کرنے والے فرشتے تم پر مقرر ہیں۔

كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۞ جو اللہ کے ہاں معزز اور سزا جزا کے لئے تمہارے اعمالناموں میں تمہارے ہر عمل کو لکھنے والے ہیں۔

یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۞ تم جو کچھ اچھی بری بات یا عمل کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں كِرَامًا اور كَاتِبِیْنَ اور یَعْلَمُوْنَ تینوں اوصاف حافظین اعمال کی عظمت کو ظاہر کرنے اور اس امر پر تنبیہ کرنے کے لئے لائے گئے ہیں کہ حافظین کے علم سے کوئی عمل چھپا نہیں رہتا۔ اس سے تکذیب سزا و جزا کرنے والوں کو زجر اور سزا جزا کی حقانیت کا ثبوت ظاہر ہو رہا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۞ بلاشبہ ابرار راحت میں ہوں گے ابرار وہ لوگ جو اپنے ایمان میں سچے ہیں غلط عقائد برے اخلاق اور قبیح کردار غرض ہر ممنوع سے پرہیز رکھتے اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ان کو ابرار اس لئے فرمایا کہ انہوں نے باپ اور بیٹوں کے ساتھ نیک سلوک کیا۔

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۞ فجور کا معنی ہے پھاڑنا جن لوگوں نے کفر و معصیت کے ہاتھ سے دین اور دیانت کا پردہ پھاڑ دیا وہ فجار ہیں اِنَّ الْاَبْرَارَ سے لَفِیْ جَحِیْمٍ تک عَلِمَتْ نَفْسٌ کا بیان ہے کیونکہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے اچھے برے عمل کو سزا جزا سے پہچان لے گا۔ سلیمان بن عبدالملک نے ابوحازم مدنی سے کہا کاش ہم کو علم ہو جاتا کہ اللہ کے پاس ہمارے لئے کیا ہے (ثواب یا عذاب) ابوحازمؒ نے کہا اپنے اعمال کو کتاب اللہ کے سامنے لاؤ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کے پاس تمہارے

لئے کیا ہے سلیمانؒ نے کہا کتاب اللہ میں مجھے کس جگہ ملے گا۔ ابو حازم نے کہا آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ میں سلیمانؒ نے کہا پھر اللہ کی رحمت کہاں ہے ابو حازم نے کہا نیک کام کرنے والوں کے قریب۔

یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآىٕبِیْنَ ﴿۱۶﴾ جزاء کے دن وہ جحیم میں داخل ہوں گے اور اس سے غائب نہیں ہوں گے۔ ہُمْ کی ضمیر بعض فجار کی طرف راجع ہے اور بعض الفجار سے کافر مراد ہیں (یا آیت مذکورہ بالا میں الفجار کا لفظ ہے اس سے مراد ہی کافر ہیں (کیونکہ الفجار میں لام عہدی ہوگا اور معہود وہی فجار ہوں گے جو یوم دین کی تکذیب کرتے ہیں یعنی کافر)

جحیم سے غائب نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے یا یہ معنی ہے کہ وہ پہلے ہی اس سے غائب نہ تھے۔ یا یہ مطلب کہ قبروں میں بھی دوزخ کی گرم ہوا ان کو پہنچتی تھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جب کوئی مر جاتا ہے تو صبح شام اس کی جگہ اس کے سامنے لائی جاتی ہے اگر وہ جنتی ہے تو جنت والوں کی جگہ اور دوزخی ہے تو دوزخ والوں کی جگہ پیش ہوتی ہے اور اس سے کہا جاتا ہے یہ تیری جگہ ہے یہاں تک کہ اللہ تجھے اٹھا کر قیامت کے دن وہاں لے جائے گا۔ بخاری و مسلم۔

حضرت براء بن عازب کی روایت سے حسب فرمان رسول اللہ ﷺ قبر میں کافر کے حال کے ذکر میں آیا ہے کہ اس سے اس کے دین کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاہا مجھے نہیں معلوم اس پر آسمان کی طرف سے ایک نداء آتی ہے اس نے جھوٹ کہا اس کے لئے آگ کا فرش کر دو اور آگ کے کپڑے اس کو پہنا دو اور آگ کی طرف اس کے لئے دروازہ کھول دو۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۷﴾ اس کلام سے یَوْمُ الدِّیْن کی عظمت کا اظہار فرمایا ہے استفہام موجب تعجب و توبیخ ہے یعنی وہ دن سخت مصیبت اور شدت کا ہوگا اس کی شدت و مصیبت کی حقیقت کو کسی دانشمند کا فہم نہیں پا سکتا۔

ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۱۸﴾ یوم الدین کی عظمت شان کو موکد کرنے کے لئے جملہ کی تکرار کی گئی۔

یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْــٴًـا ط جس روز کہ کوئی کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا۔ یومُ بر قرأت ابن کثیر و ابو عمرو مَا یَوْمُ الدِّیْنِ سے بدل ہے یا هُوَ (وہ) محذوف کی خبر ہے یَوْمَ بر قرأت جمہور یَصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ میں جو یوم الدین ہے اس سے بدل ہے یا فعل محذوف کا ظرف ہے یعنی دونوں فریقوں کو اس روز بدلہ ملے گا جبکہ کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا یا اذکر فعل محذوف ہے یعنی اس روز کو یاد کر جبکہ الخ۔

یہ لفظ محل رفع میں ہے لیکن چونکہ اس کی اضافت غیر متمکن کی طرف ہو رہی ہے اس لئے منصوب پڑھا جاتا ہے۔ لِنَفْسٍ میں نفس سے مراد ہے کافر کذا قال مقاتل

وَالْاَمْرُ یَوْمَىٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ اس روز حکم محض اللہ واحد کا ہوگا وہ دنیا کی طرح اس روز کسی کو کسی چیز کا مالک نہیں بنائے گا۔ مومنوں کے لئے شفاعت کی اجازت ضرور ہوگی مگر اذن شفاعت تملیک نہیں (اذن سے ماذون مالک نہیں ہو جائے گا) یا یہ مطلب کہ درحقیقت دنیا میں بھی اہل بصیرت کی نظر میں ہر امر اللہ ہی کا ہے (اگرچہ ظاہر بیں لوگوں کو زید عمرو کا امر دکھتا ہے) مگر اس روز ہر شخص کے سامنے اور ہر شخص کے گمان میں بھی اللہ ہی کا حکم ہوگا (کسی دوسرے کا نہ ہوگا) واللہ اعلم بالصواب

سورۃ الانفطار ختم ہوئی بعونہ تعالیٰ

☆

سورۃ التطفیف

یہ سورت مکی ہے اس میں ۳۶ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اس زمانہ میں مدینے والے ناپ تول کے لحاظ سے بہت ہی برے لوگ تھے اس پر اللہ نے وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ نازل فرمائی اس کے بعد مدینہ والوں نے ناپ ٹھیک کر لیا۔ رواہ الحاکم والنسائی وابن ماجۃ بسند صحیح۔

سدی کا بیان ہے کہ جب حضور اقدس مدینہ میں تشریف لائے تو وہاں ایک شخص رہتا تھا جس کو ابوجہینہ کہا جاتا تھا اس کے پاس دو صاع (تقریباً چار سیر کا ایک پیمانہ) تھے ایک صاع سے ناپ کر دیتا تھا دوسرے سے لیتا تھا اس پر اللہ نے وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ نازل فرمائی۔

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫﴿۲﴾ ناپ تول میں کمی بیشی کرنے والوں کے لئے ویل ہے جو اگر لوگوں سے اپنا حق ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا ناپتے ہیں۔ الطف حقیر المطففین سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو الذین سے بیان کیا ہے۔ اکۡتَالُوۡا ناپ کر لیتے ہیں یا تول کر اس جگہ صرف ناپ کے ذکر پر اکتفا کیا کیونکہ آگے اَوۡ وَّزَنُوۡھُمۡ آیا ہے۔ قرینہ موجود ہے کہ اس جگہ بھی ناپ اور تول دونوں مراد ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ اس زمانہ میں پیمانوں سے ناپ کر لین دین زیادہ ہوتا تھا تول کر کم ہوتا تھا۔ بجائے من الناس (لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں) کے عَلَی النَّاسِ لوگوں پر فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ عَلَی النَّاسِ کہنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ لوگوں پر جو ان کا حق ہوتا ہے اس کو وہ پورا پورا لیتے ہیں یا یوں کہو کہ لوگوں پر اپنا حق مکر کے ساتھ ٹھونس کر وصول کرتے ہیں۔

فراء نے کہا ایسے مقام پر مِنۡ اور عَلٰی دونوں مستعمل ہیں اکتلت علیک میرا جو کچھ تجھ پر تھا وہ میں نے ناپ کر لے لیا اکتلت منک تجھ سے میں نے پورا وصول کر لیا۔

وَ اِذَا کَالُوۡھُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡھُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۳﴾ اور جب ان کو ناپ تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کَالُوۡھُمۡ اور وَزَنُوۡھُمۡ میں حرف جار محذوف ہے اصل میں کَالُوۡا لَھُمۡ اور وَزَنُوۡا لَھُمۡ تھا یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصل کلام کَالُوۡا مَکِیۡلَھُمۡ تھا۔ مکیل (ناپی ہوئی چیز) کو حذف کر کے ھم کو اس کے قائم مقام کر دیا۔

یُخۡسِرُوۡنَ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ خسر المیزان واخسرہ وزن کم ہو گیا اور وزن کو کم کر دیا ایسا کرنے کو تطفیف کہا جاتا ہے کیونکہ ناپ تول میں کمی حقیر سی ہی ہوتی ہے۔ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ حقیر چیز کی کمی بھی ویل و عذاب کی موجب ہے زیادہ چیز کی کمی تو بطریق اولیٰ موجب عذاب ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ چیزیں پانچ چیزوں سے آتی ہیں۔

جس قوم نے بھی عہد توڑا اللہ نے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کر دیا جس قوم نے بھی اللہ کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ان میں افلاس ضرور پھیل گیا۔ جس قوم میں بدکاری کھلم کھلا ہوئی ان میں موت ضرور پھیلی۔ جس قوم نے بھی ناپ میں کمی بیشی کی اس سے زمین کی روئید گی ضرور روک دی گئی اور کال میں مبتلا کیا گیا اور جس قوم نے نہ زکوٰۃ روکی اس سے بارش روک دی گئی۔ رواہ الحاکم من حدیث بریدۃ و من حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

(ہم نے ماضی کے صیغوں کا ترجمہ ماضی کے صیغوں سے ہی کیا ہے اگرچہ سیاق حدیث کا تقاضا ہے کہ ضوابط خمسہ استمراری قرار دیئے جائیں لیکن حدیث میں ایسا کوئی لفظ نہیں جو مستقبل کے لئے بھی مفید استمرار ہو اس لئے ماضی کا ماضی سے ترجمہ کیا گیا) طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مال غنیمت کی چوری جس قوم میں پیدا ہوئی اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ضرور ڈال دیا اور سود جس قوم میں پھیلا اللہ نے ان میں موت زیادہ کر دی اور جس قوم نے ناپ تول میں کمی کی اللہ نے ان سے رزق قطع کر دیا اور جس قوم نے خلاف حق فیصلے کئے ان کے اندر خون (ریزی) ضرور پھیل گئی اور جس قوم نے عہد کو توڑا اللہ نے ان پر دشمن کو مسلط کر دیا۔ رواہ مالک موقوفاً۔ اس حدیث میں ختر کا معنی ہے عہد شکنی۔ ناپ تول میں کمی کرنے کی پاداش میں جو رزق قطع کر دیا جاتا ہے کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی فقیر ہو جاتا ہے اس کے پاس کچھ رہتا ہی نہیں ہے کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ رزق ہوتا ہے مگر کھا نہیں سکتا جیسا کہ ہمارے ملک میں بنیوں کا حال ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ بائع کی طرف سے گزرتے تو فرماتے اللہ سے ڈر تار ہ ناپ تول پورا کیا کر کیونکہ قیامت کے دن ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو اتنا کھڑا کیا جائے گا کہ پسینہ کی لگام ان کے دہانہ پر ہو جائے گی اور آدھے کانوں تک پسینہ پہنچے گا۔ (گویا پسینہ میں غرق ہوں گے ناک اور ناک سے اوپر کا حصہ ڈوبنے سے بچے گا)۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۝ کیا ان کو گمان بھی نہیں کہ قیامت کے دن حساب کے لئے ان کو اٹھایا جائے گا۔ یقین کی جگہ ظن کو ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس کو یوم آخرت میں حساب فہمی کا گمان بھی ہو گا وہ بھی ایسی حرکتیں نہیں کرے گا جو مصائب قیامت کا موجب ہوں۔ یقین رکھنے والا تو بدرجہ اولی ایسی حرکتوں سے باز رہے گا۔ استفہام انکاری ہے اہل تطفیف کے حال کو تعجب آفریں بتانا اور ان کو زجر کرنا بھی مقصود ہے۔

لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۝ لام علت کا ہے یعنی یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ کے حساب کے لئے یا ظرفیہ بمعنی فی ہے یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ میں۔ روز قیامت کو یوم عظیم اس لئے قرار دیا کہ اس دن کے واقعات عظیم ہوں گے۔

ابن مبارک نے حسن بصریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ تم سے پہلے کچھ قومیں ایسی گزری ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ان سنگریزوں (کی شمار) کے برابر بھی (راہ خدا میں) صرف کر دیتا تب بھی روز قیامت کی عظمت کا خوف اس کو لگا رہتا اور آخرت کے ڈر سے اس کی رہائی نہ ہوتی۔

یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ اس کا تعلق مَبۡعُوۡثُوۡنَ سے ہے یعنی اس روز ان کو اٹھایا جائے گا جس روز لوگ قبروں سے اٹھیں گے۔

یا یوم عظیم سے بدل ہے اور غیر متمکن کی جانب اضافت کی وجہ سے مفتوح ہے یعنی وہ دن جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ یعنی رب العالمین کی طرف سے حساب اور سزا جزا کے لئے لوگ کھڑے ہوں گے۔

حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ رب العالمین کے سامنے لوگ اس روز کھڑے ہوں گے جبکہ بعض لوگ اپنے پسینے میں نصف کانوں تک ڈوبے ہوں گے۔ حاکم نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کو اتنا پسینہ آئے گا کہ زمین میں ستر باتھ تک پہنچ جائے گا اور کانوں تک پسینہ کی لگام لگی ہو گی۔ طبرانیؒ اور ابو یعلیٰؒ اور ابن حبانؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول لکھا ہے کہ قیامت کے دن کافر کو اس کے پسینہ کی لگام لگی ہو گی (یعنی منہ تک پسینہ میں غرق ہو گا) یہاں تک کہ وہ کہے گا پروردگار مجھے اس سے نجات دے خواہ دوزخ ہی کو بھیج دے۔ حاکمؒ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مقام حشر میں (کچھ) لوگوں کو پسینہ کی لگام لگی ہو گی اور وہ عرض کرے گا۔ پروردگار میرے لئے دوزخ میں چلا جانا اس تکلیف سے آسان ہے جو میں پا رہا ہوں وہ دوزخ کے عذاب کی شدت سے واقف ہوتے ہوئے ایسا کہے گا۔

بیہقیؒ نے آیت یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کی تشریح میں قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے قتادہ نے کہا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حضرت کعبؓ فرماتے تھے کہ لوگ بمقدار تین سو برس کھڑے رہیں گے۔

حضرت مقدادؓ بن اسود نے کہا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ قیامت کے دن سورج مخلوق سے قریب آجائے گا۔ یہاں تک کہ ایک میل کے بقدر ہوگا۔ سلیم بن عامر نے کہا خدا کی قسم ہم کو نہیں معلوم کہ میل سے حضور ﷺ کی مراد کیا ہے کیا زمین کی مسافت مراد ہے یا آنکھ میں سرمہ لگانے کی سلائی (حضور ﷺ نے فرمایا) لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق پسینہ میں ہوں گے پسینہ بعض لوگوں کے ٹخنوں تک بعض کے زانو تک بعض کے کمر تک ہوگا اور بعض کو پسینہ کی لگام لگی ہوگی (یعنی منہ تک ہوگا) رسول اللہ ﷺ نے یہ فرماتے ہوئے اپنے ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مسلم۔

حضرت عقبہؓ بن عامر کی روایت سے بھی یہ حدیث طبرانی۔ احمد، ابن حبان بیہقی اور حاکم نے لکھی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ حضرت ابو امامہؓ باہلی کی روایت سے بھی احمد و طبرانی نے ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ سورج کی گرمی سے (پسینہ میں) کیڑے مکوڑے اس طرح ابال کھائیں گے جس طرح ہانڈی میں ابال آتا ہے۔ احمد و طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آغاز آفرینش سے موت سے زیادہ سخت تکلیف آدمی کو پیش نہیں آتی لیکن موت بعد والی شدائد سے آسان ہے اس روز کی دہشت سے لوگوں کو ایسا پسینہ آئے گا کہ منہ تک پسینہ کی لگام لگ جائے گی اگر کشتیاں اس میں چلائی جائیں تو چل جائیں۔

بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس روز سختی کی اتنی شدت ہوگی کہ حساب سے پہلے کافر کو پسینہ کی لگام لگ جائے گی۔ دریافت کیا گیا پھر مومن کہاں ہوں گے فرمایا سونے کی کرسیوں پر ابر کے سایہ کے نیچے۔ ہناد نے یہ تمام حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی طرف بھی نسبت کر کے بیان کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ مومنوں کے لئے وہ پورا دن بس دن کی ایک گھڑی کے برابر ہوگا۔ ہنادؒ اور ابن مبارکؒ نے حضرت سلمانؓ فارسی کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سورج لوگوں کے سروں کے قریب دو کمانوں کے فصل کی برابر یا دو کمان کے برابر آجائے گا اور دس سال کی گرمی دے گا اس روز کسی کے بدن پر کوئی پردہ نہ ہوگا۔

مومن اور مومنہ کا ستر دکھائی نہ دے گا اور نہ سورج کی گرمی مومن و مومنہ کو محسوس ہوگی ہاں کافروں کو وہ گرمی خوب پکائے گی کہ ان کے اندر سے عق عق کی آواز سنائی دے گی۔

کَلَّآ یہ بجائے خود پورا کلام ہے اور تطفیف مذکور سے بازداشت ہے حسنؒ بصری نے فرمایا کَلَّآ اس جگہ ابتدائیہ ہے بعد والے کلام سے اس کا ربط ہے اور حقا (یقیناً) کا ہم معنی ہے۔

اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ ؕ الۡفُجَّارِ سے مراد ہیں کافر یعنی کافروں کے اعمالنامے جن کو کرام کاتبین لکھتے ہیں سجین میں ہیں۔

سِجِّیۡنٍ سجن سے مشتق ہے سجن کا معنی ہے حبس قید۔ قاموس میں ہے سجین بروزن سکین دوامی سخت قید۔ اخفش نے کہا سجین سجن سے بروزن فعیل ہے جیسے شریب بہت پینے والا فسیق بڑا فاسق ایسے ہی سجین سخت قید۔ عکرمہ نے کہا آیت لفی سبجین میں سجین سے مراد ہے ذلت اور گمراہی حقیقت میں فجار کے مندرجہ کتاب اعمال ان کی قید ذلت اور گمراہی کے موجب ہیں (یعنی اپنے اعمال کی وجہ سے کافر قید ذلت اور گمراہی میں ہوں گے) مگر مجازاً کتاب کو قید و ذلت میں قرار دیا۔

احادیث اور آثار سے ظاہر ہے کہ سجین اس مقام کا نام ہے جہاں کفار کا جسٹر ہے۔ (قاموس) سجین میں کفار کا رجسٹر ہونا بایں معنی ہے کہ ان کے اعمال نامے وہاں رکھے جاتے ہیں یا یہ معنی ہے کہ کافر جن وانس کے اعمالناموں کی ایک کتاب ہے جس میں سب اعمالنامے جمع کئے جاتے ہیں۔ سجین کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کافروں کی روحیں وہاں بند کر دی جاتی ہیں اور سجن کا معنی

جس ہے سجین ساتویں زمین یا ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ ابن مندہ طبرانی اور ابوالشیخ نے حمزہ بن حبیب کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ارواح اہل ایمان کے متعلق دریافت کیا گیا۔ فرمایا سبز پرندوں (کی شکل) میں جنت کے اندر جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی پھرتی ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ کفار کی روحیں (کہاں ہوتی ہیں) فرمایا سجین میں بند ہوتی ہیں۔ ابن مبارک حکیم ترمذی ابن ابی الدنیا اور ابن مندہ نے بروایت سعید بن المسیب حضرت سلمان فارسی کا قول نقل کیا ہے کہ کافر کی روح سجین میں ہوتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو۔ قتادہ مجاہد اور ضحاک نے بیان کیا کہ سجین سب سے نچلی ساتویں زمین ہے جس میں کافروں کی روحیں ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ بن عمر کا بھی یہ ہی قول نقل کیا ہے۔

بغوی نے اپنی سند سے بروایت حضرت براءؓ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سجین سات زمینوں کے نیچے اور علیین ساتویں آسمان پر عرش کے نیچے ہے۔ مومنوں اور کافروں کی موت کے تذکرہ میں حضرت براء بن عازبؓ کی طویل حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ کفار کے سلسلہ میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے ہیں اور اللہ فرماتا ہے اس کی کتاب کو نچلی زمین میں سجین کے اندر لکھ لو چنانچہ اس کی روح دور پھینک دی جاتی ہے۔ (الحدیث)

امام احمد وغیرہ نے بیان کیا ہے اور بغوی نے بھی شبرمہ بن عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ حضرت کعب احبار کے پاس گئے اور فرمایا آیت اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کی تشریح سے مجھے مطلع کیجئے کعب احبار نے فرمایا فاجر (کافر) کی روح کو آسمان کی طرف چڑھایا جاتا ہے مگر آسمان اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے پھر زمین کی طرف اس کو اتارا جاتا ہے زمین بھی اس کو لینے سے انکار کر دیتی ہے آخر سات زمینوں کے نیچے اس کو داخل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سجین تک اس کو پہنچا دیا جاتا ہے اور اس میں لکھ کر مہر کر کے ابلیس کی فوج کے نیچے (ایک مقام پر) اس کو رکھ دیا جاتا ہے تاکہ قیامت کے دن بوقت حساب اس کی تباہی کی شناخت ہو سکے۔

کلبیؒ کا قول ہے کہ سجین ساتویں نچلی زمین کے نیچے ایک سبز پتھر ہے آسمانوں کی سبزی اسی (کے عکس) کی وجہ سے ہے اس کے نیچے کافروں کی کتاب رکھ دی جاتی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے الفلق جہنم کے اندر سجین میں سرپوش ڈھانکا ہوا ایک کنواں ہے اور ایک کنواں سرپوش کھلا ہوا (بھی) جہنم میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ہے اور سجین جہنم میں ہے یہ دونوں قول متعارض ہیں ان کا تعارض اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ ابوالشیخ نے العظمۃ میں نیز بیہقی نے باسناد ابوالزعراء حضرت عبداللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت ساتویں آسمان میں اور دوزخ ساتویں نچلی زمین میں ہے۔ بیہقی نے دلائل میں حضرت عبداللہ بن سلام کا قول نقل کیا ہے کہ جنت آسمان میں اور دوزخ زمین میں ہے۔

ابن جریر نے تفسیر میں حضرت معاذ کا قول لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا قیامت کے دن جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا۔ فرمایا ساتویں زمین سے اس کو لایا جائے گا اس کی ہزار لگامیں ہوں گی اور ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچتے ہوں گے جب انسانوں سے اس کا فاصلہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر رہ جائے گا تو وہ ایک دم کھینچے گی جس سے ہر مقرب فرشتہ اور ہر نبی مرسل دوزانو ہو کر کہے گا رب نفسی نفسی۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ تم کو کیا معلوم کہ سجین کیسی ہولناک ہے یہ استفہام (طلب علم کے لئے) بلکہ سجین کی عظمت اور ہولناکی ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا سجین ان چیزوں میں سے ہے جن کو نہ تم جانتے ہو نہ تمہاری قوم۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾ وہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں کافروں کے اعمال چھپا دیئے گئے ہیں اور اس طرح ثبت کر دیئے گئے ہیں جیسے نقوش کپڑے میں ثبت ہوتے ہیں نہ وہ بھولے میں آئیں گے نہ مٹائے جائیں گے یہاں تک کہ اس تحریر

کے مطابق سزادی جائے گی۔ یا یہ معنی ہے کہ اس کتاب پر ایسی علامات ہیں کہ ہر دیکھنے والا دیکھتے ہی پہچان لے کہ اس کے اندر کوئی خیر نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ قبائل حمیر (یمنی) کے محاورہ میں مرقوم کا معنی ہے مہری۔ مہرزدہ

بغویؒ نے لکھا ہے کہ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ سجین کی تشریح نہیں ہے بلکہ کِتٰبُ الْفُجَّارِ کا بیان ہے۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے یہ سجین کی تشریح ہے۔ سجین کو کتاب کے لقب سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کتاب حبس وقید کا ذریعہ ہے۔ گویا سجین ایک کتاب ہے جو جن وانس کے تمام کتابچوں کو اپنے اندر جمع رکھتی ہے۔ (میرے نزدیک) ظاہر یہ ہے کہ سجین کافروں کی روحوں کی قرارگاہ بھی ہے اور ان کے اعمال ناموں کا گودام بھی یہی ہے اور کلام میں ایک لفظ محذوف ہے یا تو تا سجین اصل میں ماکتاب سجین تھا۔ یا کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ اصل میں محل کتاب مرقوم تھا۔ مرقوم سے مراد ہے تحریر شر۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑩ حق کو جھوٹا سمجھنے والوں کے لئے اس روز ذیل ہو گی۔

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ⑪ جو یوم سزا جزا کی تکذیب کرتے ہیں اَلَّذِيْنَ سے پورا جملہ اَلْمُكَذِّبِيْنَ کی صرف توضیحی صفت ہے یا صفت ذم ہے یا مخصصہ ہے (مکذبین حق کی تکذیب کرنے والے حق کوئی بات ہو لیکن الذین سے خصوصیت کے ساتھ صرف روز جزا کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر کیا۔ اس لئے تعمیم کے بعد صفت مخصصہ ہو گئی) یا المکذبین سے بدل ہے۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ پورا جملہ معترضہ ہے جو مکذبین کی مذمت کو ظاہر کر رہا ہے میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے یہ جملہ مرقوم کا نائب فاعل ہو یعنی کتاب میں لکھ دیا گیا ہے کہ سزا جزا کے دن مکذبین کے لئے ذیل ہو گی یا یہ جملہ کتاب کی صفت ہے یعنی کتاب موجب ذیل ہو گی اول تاویل لفظی قرب کی وجہ سے زیادہ مناسب ہے لیکن معنوی مناسبت کے لحاظ سے آخری دونوں تاویلیں قابل ترجیح ہیں کیونکہ کتاب مرقوم صرف کافروں کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ کتاب الابرار میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫ یعنی یَوْمِ الدِّيْنِ کی تکذیب صرف مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ہی کرتا ہے۔ معتد وہ شخص جو جہالت اور جاہل آباء واجداد کی پیروی میں حد سے بڑھ گیا ہو یہاں تک کہ دوبارہ پیدا کرنے پر خدا کو بھی قادر نہ سمجھتا ہو۔ اثیم وہ گناہ گار جو خواہشات نفس میں منہمک اور اتنا مشغول ہو کہ مخالف خواہش امور کو اس نے پس انداز کر دیا ہو اور اس انہماک نفسانی نے اس کو مخالف نفسانیات چیزوں کے انکار پر آمادہ کر دیا ہو۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬ جب اس کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو اپنی انتہائی نادانی اور اعجاز قرآنی سے غافل ہونے کی وجہ سے یا اپنی عبادت اور دیدہ دانستہ حق سے روگردانی کی وجہ سے کہتا ہے یہ تو گزشتہ لوگوں کی لکھی ہوئی داستانیں ہیں اَسَاطِيْرُ جمع اسطور یا اسطار یا اسطر واحد بے ترتیب غیر مرطوب باتیں۔ قاموس۔

صراح میں ہے اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ یعنی وہ باتیں جو گزشتہ لوگوں نے جھوٹ موٹ لکھ دی ہیں۔ اس جملہ سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ مکذب اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ عقلی نقلی کوئی دلیل اس کو نفع نہیں پہنچا سکتی۔

كَلَّا یہ تکذیب اور قول مذکور (اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ) سے بازداشت ہے مقاتل نے کہا كَلَّا کا اس جگہ معنی ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ وہ ایمان نہیں لاتے۔

بَلْ سکتہ اس لفظ سے کلام سابق سے اعراض کر کے یہ بات بتائی ہے کہ ادراک حق اور باطل کی تمیز کی قابلیت ہی ان کے دلوں میں نہیں ہے (یعنی پہلے صرف یہ کہا گیا تھا کہ وہ یوم جزا کی تکذیب کرتے ہیں پھر کلا کہہ کر ان کو اس تکذیب سے روکا گیا اس کے بعد کہا گیا کہ یہ لوگ صرف تکذیب ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے دلوں پر بداعمالی کا زنگ چڑھا ہوا ہے اس لئے ادراک حق کی قابلیت ہی ان کے دلوں میں نہیں ہے)

رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑭ رین کا معنی ہے غلبہ ران الخمر علی قلبه

شراب کا نشہ اس کے قلب پر غالب ہو گیا۔ یعنی بداعمالی کی تاریکیاں ان کے دلوں پر اتنی غالب آگئیں کہ حق و باطل کی تمیز سے ان کے دل اندھے ہو گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے ڈر جاتا ہے اور استغفار کر لیتا ہے تو دل سے گناہ کا نکتہ دور ہو جاتا ہے لیکن اگر گناہ میں زیادتی کرتا ہے تو نکتہ بھی بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے یہی ہے وہ رَانَ جس کا ذکر اللہ نے آیت بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ میں فرمایا ہے بغوی۔ احمد نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ترمذی، ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ بعض روایات میں المومن اذا اذنب کی جگہ ان العبد کلما اذنب ذنبا آیا ہے۔ حدیث میں المومن کا لفظ بتا رہا ہے کہ کافر کے دل میں سیاہ نکتہ بدرجہ اولیٰ شدید ہوتا ہے۔

كَلَّآ یہ زنگ پیدا کرنے والے گناہوں کے ارتکاب سے بازداشت ہے یا حَقًّا کے معنی میں ہے جس سے قلوب کا زنگ خوردہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مقاتل نے کہا کہ كَلَّا اس جگہ معنی ہے لا یصدقون یقیناً وہ تصدیق نہیں کرتے۔

اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ یعنی قیامت کے دن مومن جب اللہ کو دیکھیں گے کافر اس روز دیدار الٰہی سے یقیناً روک دیئے جائیں گے۔ بداعمالیوں کی تاریکیوں کے حجاب ان کی آنکھوں پر پڑے ہوں گے پس جس طرح وہ دنیا میں حق کو نہیں دیکھتے تھے اسی طرح قیامت کے دن دیدار الٰہی نہ کر سکیں گے۔

حسن بصریؒ نے فرمایا اگر زاہدوں اور عابدوں کو معلوم ہو جائے کہ رب کا دیدار ان کو نہ ہوگا تو ان کی جان نکل جائے۔ مالکؒ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا جب دشمنوں کو دیدار سے روک دیا جائے گا اور ان کو دیدار میسر نہ ہوگا تو دوستوں پر وہ ضرور جلوہ فگن ہوگا۔ دوست اس کو دیکھیں گے امام شافعیؒ نے فرمایا آیت میں (بطور مفہوم مخالف) دلالت ہے اس امر پر کہ اولیاء اللہ کو دیدار ہوگا۔

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ پھر دیدار سے محروم ہونے کے بعد وہ ضرور جحیم میں داخل ہوں گے۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾ پھر جہنم کے کارندے ان سے کہیں گے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کو تم دنیا میں نہیں مانتے تھے۔ كَلَّآ کے بعد جس طرح کافروں کے لئے وعید عذاب کا اظہار کیا ہے اسی طرح آئندہ آیت میں کلا کے بعد نیک لوگوں کے ثواب کا وعدہ ذکر فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تطفیف (وزن و ناپ کی کمی جس طرح سخت گناہ ہے اسی طرح وزن و ناپ کی تکمیل اعلیٰ نیکی ہے۔

كَلَّآ مذکورہ بالا توضیح کے علاوہ اس جگہ كَلَّا کو تکذیب عذاب سے بازداشت کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے یا حَقًّا (یقیناً) کا معنی بھی ہو سکتا ہے مقاتلؒ نے کہا اس جگہ كَلَّآ کا مفہوم یہ ہے کہ جس عذاب میں وہ داخل ہوگا اس پر ایمان نہیں لاتا۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ بعض اہل معنی نے لکھا ہے کہ علیین سے مراد ہے علو ور علو اور بلندی بالاء بلندی اسی لئے واؤ اور نون کے ساتھ بھی (علی کی) جمع آئی ہے۔ فراء نے کہا یہ صیغہ جمع کا ہے جس کا اس مادہ سے واحد نہیں آتا مگر ایک جگہ کا نام ہے۔ بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے یہ علو سے مشتق ہے اور علي بروزن فعیل کی جمع سے منقول (شرعی) ہے حضرت براء کی مرفوع روایت پہلے گزر چکی ہے کہ علیین ساتویں آسمان میں عرش کے نیچے ہے حضرت براء کی طویل حدیث میں مومنوں اور کافروں کی موت کے ذکر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ مومن کی روح کو اوپر چڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ ساتویں آسمان تک لے جایا جاتا ہے پھر اللہ فرماتا ہے میرے بندہ کی کتاب علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو۔ الحدیث۔

یہ حدیث صحیح طریقوں سے امام احمد ابوداؤد اور حاکم وغیرہ نے بیان کی ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ یعنی علیین زمرد سبز کی ایک تختی ہے جو عرش کے نیچے آویزاں ہے۔ مومنوں کے اعمال اس میں لکھے ہوئے ہیں۔ اسی اثر کی بناء پر لوگوں نے کہا ہے کہ علیین ایک ایسا رجسٹر ہے جس میں ملائکہ اور جن و انس کے اچھے اعمال جمع ہوتے ہیں۔ کعب اور قتادہ کا قول ہے کہ علیین

عرش کا دلیاں پایہ ہے۔ عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ علیین جنت ہے۔ عطاء اور ضحاک نے کہا وہ سدرۃ المنتہی ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ تم کو کیا معلوم کہ عِلِّيُّوْنَ کیا ہے ایک کتاب ہے مرقوم۔ اس جملہ کی پوری تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ جس طرح وَيْلٌ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کتاب کی صفت ہے اسی طرح یہ جملہ بھی کتاب کی صفت ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مُقَرَّبُوْنَ سے مراد ہیں قرب رکھنے والے ملائکہ میں کہتا ہوں کہ شہیدوں اور صدیقوں اور پیغمبروں کی روحیں بھی مقربین میں شامل ہیں کیونکہ یہ سب ارواح وہاں ہوں گی۔ مسلم نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہیدوں کی روحیں اللہ کے ہاں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہیں اور جنت کے دریاؤں پر جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی پھرتی ہیں اور لوٹ کر ان قندیلوں میں آجاتی ہیں جو عرش کے نیچے (آویزاں) ہیں۔

سعید بن منصورؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور بقیؒ بن مخلد نے حضرت ابن ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ ابوالشیخ نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ (قیامت کے دن) سفید پرندوں کے پوٹوں سے اللہ شہیدوں کو اٹھائے گا۔ یہ پرندے ان قندیلوں میں ہوں گے جو عرش سے آویزاں ہیں۔ صبح کو نکل کر (سیر کو) چلے جاتے ہیں پھر گلزار جنت کی طرف لوٹ جاتے ہیں روزانہ اللہ ان پر جلوہ انداز ہو کر السلام علیکم فرماتا ہے۔

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابو درداء کا قول نقل کیا ہے کہ ارواح شہداء سبز پرندوں (کی شکل) میں ہوتی ہیں الحدیث۔ بخاری نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب حضرت حارثہؓ شہید ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک وہ جنتی ہے اور فردوس اعلیٰ میں ہے۔ حضرت حبیبؓ نجار کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ الآیۃ۔

شہداء کا جنت کے اندر ہونا اور عرش کے نیچے قندیلوں میں ہونا باہم متعارض نہیں کیونکہ جنت کے لئے عرش آسمان کی طرح ہو گا۔ میں کہتا ہوں یہ حکم شہیدوں کے لئے ہی خاص نہیں کیونکہ انبیاء اور صدیقوں کا مرتبہ تو شہیدوں سے اونچا ہے بلکہ حدیث میں تو المومنین کا لفظ عمومی آیا ہے۔ (گویا ہر کامل مومن کی مرنے کے بعد یہی حالت ہوتی ہے)

مالک اور نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومنوں کی روحیں پرندوں (کی شکل میں) جنت کے درخت سے آویزاں ہوتی ہیں آخر میں قیامت کے دن اپنے اپنے جسموں میں لوٹ آئیں گی۔ اسی طرح احمد اور طبرانی نے حضرت ام ہانی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روحیں پرندوں (کی شکل میں) درختوں سے آویزاں ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو ہر روح اپنے جسم میں داخل ہو جائے گی ابن عساکر نے حضرت ام بشر زوجۂ ابو معروف کی روایت سے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ مگر ان احادیث میں مومنوں سے مراد کامل مومن ہیں آیت يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ اسی پر دلالت کر رہی ہے (اہل قربت علیین میں موجود ہوں گے) بعض احادیث میں آیا ہے کہ مومنوں کی روحوں کی قرار گاہ ساتویں آسمان میں ہے وہاں سے وہ اپنے جنت والے مکانوں کو دیکھتے ہیں۔

ابو نعیمؒ نے ضعیف سند سے حضرت ابو ہریرہؓ اور وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ساتویں آسمان میں اللہ کا مقرر کردہ ایک مکان ہے جس کو مکان سفید کہا جاتا ہے اس میں مومنوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ (مومن کی) روح کو جب جسم سے نکال لیا جاتا ہے تو اس کو آسمان وزمین کے درمیان رکھا جاتا ہے رواہ سعید بن منصور عن سلمان الفارسیؓ۔

ابن مبارک اور حکیم ترمذی اور ابن ابی الدنیا اور ابن منذر نے سعید بن مسیب کی وساطت سے حضرت سلمانؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مومنوں کی روحیں ارضی برزخ میں ہوتی ہیں جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں اور کافر کی روح سجین میں (بند) ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل حدیث میں مومنوں کی روحوں کی حالت حسب تفاوت درجہ بیان کی گئی ہے جو شعبیؒ نے بحر الکلام میں نقل کی ہے کہ روحیں چار طرح کی ہوتی ہیں۔ انبیاء کی روحیں بدن سے نکل کر مشکی اور کافوری شکلیں اختیار کر لیتی ہیں اور جنت میں کھاتی پیتی اور چین کرتی ہیں اور رات کو ان قندیلوں میں قرار گزین ہوتی ہیں جو عرش سے آویختہ ہیں۔ شہیدوں کی روحیں بدن سے نکل کر سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہ کر جنت کے اندر کھاتی پیتی اور چین کرتی ہیں اور رات کو ان قندیلوں میں قرار گزین ہوتی ہیں جو عرش سے آویختہ ہیں۔ فرماں بردار مومنوں کی روحوں کو جنت میں روک لیا جاتا ہے وہ جنت میں نظارے تو کرتی ہیں مگر کھاتی پیتی نہیں نہ اور کسی طرح سے لذت اندوز ہوتی ہیں۔ گناہ گار مسلمانوں کی روحیں آسمان وزمین کے درمیان فضاء میں رہتی ہیں۔

رہیں کافروں کی روحیں تو وہ سیاہ پرندوں کے جوف میں سجین کے اندر ساتویں زمین کے نیچے بندر ہتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ انبیاء کی روحوں کے متعلق جو یہ آیا ہے کہ وہ اپنی مشکی شکلوں میں ہو جاتی ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے جسم انسانوں جیسے جسم ہوتے ہیں مگر مشکی ہوتے ہیں تاکہ ان کی پاکیزہ خوشبو (ادھر ادھر منتشر) ہو۔ شیخ مجددؒ نے ان مشکی اور کافوری اجسام کو وہبی اجسام سے تعبیر کیا ہے جو انبیاء (علیہم السلام اور ان کا کامل اتباع کرنے والوں یعنی صدیقوں کو مرنے سے پہلے ہی حاصل ہو جاتے ہیں۔

ایک شبہ : بعض صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں اور عام مومنوں بلکہ انبیاء تک کی روحیں قبروں میں ہوتی ہیں۔ (پھر علیین اور سجین میں ہونے کا کیا معنی) جیسا کہ حضرت براء کی روایت کردہ طویل حدیث میں آیا ہے کہ مومنوں کے متعلق اللہ فرماتا ہے۔ میرے بندہ کی کتاب علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف کو لوٹا دو کیونکہ زمین سے ہی میں نے ان کو پیدا کیا ہے اسی کی طرف لوٹاتا ہوں اور اسی سے دوبارہ نکالوں گا۔ حسب الحکم اس کی روح اس کے جسم میں لوٹادی جاتی ہے۔

اسی طرح کافر کے متعلق آیا ہے کہ اس کی روح قبر میں لوٹادی جاتی ہے۔ ابن عبد البرؒ نے اس قول کو صحیح ترین قرار دیا ہے۔ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میری قبر کے پاس جو درود پڑھے گا میں اس کو سن لوں گا اور جو غائب حالت میں درود پڑھے گا اس کا درود مجھے پہنچا دیا جائے گا۔

ازالہ : تعارض کو دفع کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ ارواح مومنین کی قرار گاہ علیین میں ہے یا ساتویں آسمان میں اور ارواح کفار کی قرار گاہ سجین میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر روح کا اپنے قبر والے جسم سے ایک خاص تعلق رہتا ہے جس کی حقیقت سواء خدا کے کوئی نہیں جانتا اسی تعلق کی وجہ سے وہ تمام اقوال صحیح ثابت ہو جاتے ہیں جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں کہ انسان یعنی جسم وروح کے مجموعہ کے سامنے (قبر کے اندر) اس کا جنتی یا جہنمی مقام لایا جاتا ہے۔ وہ دکھ سکھ کا احساس کرتا ہے آنے والے کے سلام کو سنتا ہے منکر نکیر کو جواب دیتا ہے وغیرہ جیسے حضرت جبرئیل باوجودیکہ ان کا مستقر آسمانوں میں ہے حضور اقدس ﷺ کے پاس آجاتے تھے یہاں تک کہ اپنے ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیتے تھے۔

شعبی نے بحر الکلام میں لکھا ہے روحوں کا تعلق اجسام سے ہوتا ہے روحوں کو عذاب ہوتا ہے اور جسم کو دکھ ہوتا ہے جیسے آفتاب آسمان میں ہے اور اس کی روشنی زمین پر۔[1]

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍۙ۝۲۲ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ یَنْظُرُوْنَۙ۝۲۳ نیک لوگ بلاشبہ راحت میں ہوں گے پردہ دار مسہریوں پر فروکش ہوں گے۔ نظارہ کرتے ہوں گے (کس چیز کا نظارہ) اکثر مفسرین نے کہا اللہ کی دی ہوئی

---

[1] موت انسانی کیا ہے روح کا تعلق جسم سے منقطع ہونا کسی جسم سے اس کو توضیح کرنے کے لئے بطور اختصار اتنا لکھنا ضروری ہے کہ قبر کے اندر منکر نکیر کا سوال کرنا اور مردہ کا سن کر جواب دینا۔ قبر کا عذاب ثواب۔ مردہ کا علم۔ رسول اللہ ﷺ کا زائر کے درود کو سننا وغیرہ وغیرہ مختلف احوال کا مردہ پر توارد صحیح احادیث سے ثابت ہے پھر علیین اور سجین کا وجود تو صراحت قرآنی میں موجود ہی ہے لیکن ہم محسوس کرتے ہیں۔ تجربہ سے بھی ثابت ہے آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں کانوں سے بھی سنتے ہیں غرض متواتر مشاہدات (بقیہ اگلے صفحے پر)

عزت اور نعمت کا نظارہ قتادہؒ نے کہا اپنے دشمنوں پر دوزخ کے اندر عذاب ہونے کا نظارہ میں کہتا ہوں اپنے رب کا نظارہ جب کہ کفار اس روز دیدار رب سے محروم ہوں گے۔

تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿۲۴﴾ ان کے چہروں پر جنت النعیم کی وجہ سے تم کو تازگی نظر آئے گی۔ تعرفُ میں مخاطب عام ہے حسن بصریؒ نے کہا تازگی چہرہ پر ہوتی ہے اور خوشی دل میں۔

يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ رحیقٍ یعنی جنت کی صاف سفید پاکیزہ شراب۔

مَّخْتُومٍ ﴿۲۵﴾ مہر زدہ یعنی ابرار ہی اس کی مہر توڑیں گے اس سے پہلے کوئی اس کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔ مطلب یہ کہ ابرار کو ان کی مخصوص صاف سفید پاکیزہ شراب پلائے جائے گی جس کی مہر وہ خود توڑیں گے کسی نے اس کو ہاتھ سے چھوا بھی نہ ہوگا۔

خِتَامُهُ مِسْكٌ جس پر مہر لگی ہوگی وہ (مٹی یا موم نہ ہوگا) مشک ہوگا۔ قاموس میں ہے خِتَامٌ بروزن کتاب وہ مٹی جس پر مہر لگائی جاتی ہے اور خاتم وہ مہر جو مٹی پر لگائی جاتی ہے یعنی بجائے مٹی کے (موم وغیرہ) کے اس شراب کے

(گذشتہ سے پیوستہ) اور متواترات سے ثابت ہے کہ کروڑوں مردے دفن نہیں کئے جاتے جلا دیئے جاتے ہیں۔ ان کی خاک اڑادی جاتی ہے دریاؤں میں بہادی جاتی ہیں بعض لاشوں کو ممیا کر رکھ لیا جاتا ہے اور برسوں تک محفوظ رکھا جاتا ہے ان تجربات مشاہدات اور متواترات کا انکار نہیں کیا جاسکتا نہ عقل سلیم کو اپیل کرنے والی کوئی تاویل کی جاسکتی ہے پھر کیا ہے کیا احادیث غلط ہیں؟ اور قطعی منصوصات خلاف واقع ہیں ایسا نہیں ہے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے امام غزالی۔ شاہ ولی اللہ متکلم اعظم۔ اور بعض دوسرے اصحاب وجدان وشہود نے لکھا ہے کہ قبر نام اس محسوس مرئی گڑھے کا نہیں جو زمین میں کھودا جاتا ہے بلکہ عالم ارواح مجردہ اور عالم اجسام مادیہ کے درمیان ایک اور عالم ہے جس کو برزخ کہا جاتا ہے اس میں دونوں عالموں کے کچھ کچھ خصوصیات ہیں نہ وہ مجرد محض ہے نہ بالکل مادی عالم ارواح جسمانی نہیں روح کا جسم نہیں لیکن عالم برزخ جسمانی ہے مشکل ہے رنگا رنگ ہے اس میں جواہر بھی ہیں اعراض بھی ہیں صورتیں بھی ہیں صورتوں کی لمبائی چوڑائی رنگینی حسن وقبح اور امتیازات بھی ہیں لیکن برزخی جسم کا یہ مادہ نہیں یہ صورت نہیں۔ یہ جوہر وعرض نہیں یہ مقدار وشکل نہیں یہ صورت و نغمہ نہیں یہ حسن وقبح نہیں عالم برزخ کا انسان کھاتا بھی ہے پیتا بھی ہے چلتا بھی ہے پھرتا بھی ہے خوش اور ناخوش بھی ہوتا ہے لذت والم کا احساس بھی کرتا ہے اس میں شعور بھی ہے حس بھی ہے علم وادراک بھی ہے مگر یہ ہماری دنیا کا مادی احساس وشعور نہیں بلکہ اس کی ہر کیفیت یہاں کی ہر کیفیت سے زیادہ قوی لطیف اور تیز اور وسیع ہے اسی برزخ کو عالم مثال اور عالم اشباح بھی کہتے ہیں برزخ کا انسان لافانی ہے مرتا نہیں تغیر پذیر نہیں اس میں توالد تناسل نہیں پیدائش اور موت نہیں ہماری دنیا کی جسمیت اور لوازم جسمیت اس میں موجود نہیں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ نے افلاطون کے جس عالم امثال کی صراحت کی ہے۔ وہ شیخ ولی اللہ کے عالم مثال کا بھی بالکل عین تو نہیں کیونکہ امثال افلاطونیہ کو ہم حقائق تکوینیہ اور ماہیات امکانیہ کہہ سکتے ہیں مگر جزاء وسزا والا عالم برزخ نہیں کہہ سکتے لذت و الم کا عالم نہیں قرار دے سکتے۔ حقیقت میں اصحاب وجدان کے نزدیک عالم مثال حقیقی ہے اور یہ عالم ظاہر اس کا سایہ وہ اصل ہے یہ اس کی کاپی سایہ اور کاپی فنا ہو جائے تباہ ہو جائے مٹ جائے اصل اور حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے نہ مٹتی ہے نہ تباہ ہوتی ہے دنیا میں جو شخص مرتا ہے اس کی روح کا رشتہ اس مادی جسم سے ٹوٹ جاتا ہے یہ جسم فنا ہو جاتا ہے مگر مثالی اصلی جسم باقی رہتا ہے اس سے روح کا تعلق نہیں ٹوٹتا گویا ہر شخص دو جسم رکھتا ہے ایک یہی محسوس کثیف ظاہری مادی جسم دوسرا برزخی مثالی لطیف باطنی جسم موت کا معنی ہے صرف ظاہری کثیف جسم سے قطع تعلق مگر مثالی برزخی جسم سے روح کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ عالم برزخ چونکہ مجرد اور مادی کے درمیان حجاب حاجز ہے اور دونوں عالموں سے اس کا قرب ہے اس لئے دونوں عالموں کی کچھ کچھ خصوصیات اس میں موجود ہیں وہ اس عالم جسم کی طرح عمل اور کردار اور سعی حیوۃ کا عالم نہیں۔ دار التکلیف نہیں ارادہ خیر وشر میں وہاں کا انسان مختار نہیں بلکہ اس زندگی کے نتائج و ثمرات اور جزاو سزا کا عالم ہے مگر روز قیامت کی طرح مکمل جزاو سزا کا عالم بھی نہیں بلکہ کارواں انسانی کا ایسا وقفہ منزل ہے جو گزشتہ زندگی کے افکار و کردار کا مجمل دھندلا خاکہ نظر کے سامنے لاتا ہے اور عقیدہ وعمل کی صحت و غلطی اور اچھائی برائی کے فیصلہ کے آثار وعلامات برزخ میں ہی منہ دکھانے لگتے ہیں برزخی انسان اپنا ہاتھ اپنا پاؤں اپنا سر اپنے گوش وچشم اور اپنے قیام و قعود اور اطوار و گفتار غرض ہر جسمانی کیفیت و حالت کو دیکھتا جانتا اور سمجھتا ہے بلکہ اس کا ادراک و احساس زیادہ لطیف اور تیز ہو جاتا ہے راحت اور (باقی اگلے صفحے پر)

برتنوں پر مشکی مہر لگی ہوگی۔ ابن زیدؒ نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ (اس جگہ ختام کا معنی آخری مزہ) اس کا آخری مزہ (یعنی آخری گھونٹ) مشک سے ملا ہوا ہوگا۔ قاموس میں ہے ہر چیز کا ختام آخر۔ خاتمہ۔

وَفِيْ ذٰلِكَ یعنی اسی شراب یا راحت (کی طلب)

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ اہل رغبت شدہ رغبت کے ساتھ کریں تنافس نفس یا نفیس سے مشتق ہے تنافس کا معنی ہے کسی نفیس چیز کو اپنے لئے اس طرح انتخاب کر لینا کہ دوسروں کو وہ چیز دینے میں بخل کیا جائے مطلب یہ کہ دنیوی سامان بے مقدار اور حقیر اور زوال پذیر ہے اس لئے اس کی طلب اور شدہ رغبت اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں نہ ہونی چاہئے۔

شبہ: تنافس (شدت حرص) تو بری خصلت ہے پھر اس کا مرغوب ہونا (شرعاً) کس طرح ممکن ہے۔

ازالہ: تنافس اس وقت برا ہے جب اس کا تعلق دنیوی امور سے ہو اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنا ضروری ہے کیونکہ کوئی چیز اپنے لئے مخصوص کر لینے کا معنی ہی یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نہیں ملے گی اور اللہ کو بھی دنیوی امور پسند نہیں کیونکہ دنیوی چیزیں بے مقدار اور زوال پذیر ہیں۔ آخرت کی نعمتوں کی حالت اس کے خلاف ہے وہ اللہ کو پسند بھی ہیں اور ختم ہونے والی بھی نہیں ہیں ان کو اپنے لئے پسند کرنے سے دوسروں کو ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ جنت کی شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی مزاج وہ چیز جو شراب میں ملائی جاتی

(گذشتہ سے پیوستہ) رنج مسرت و غم ہر وجدانی کیفیت اس کو محسوس ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ یہ ظاہری مادی جسم نہیں رکھتا یہ جسم تو فنا ہو چکا ہوتا ہے اس جسم کو جلا دیا جائے اس کی خاک اڑا دی جائے پانی میں بہادی جائے اس کو شیر کھا جائے یا صندوق میں اسکو محفوظ رکھا جائے برزخی جسم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس کا تو ہر احساس وادراک جسم مثالی کے ساتھ ہوتا ہے اور جسم مثالی میں جسم مادی کے تغیر سے کوئی تغیر نہیں آتا۔ روح جسم مثالی کے ساتھ ہی منکر نکیر کے سوال کا جواب دیتی ہے جنت و دوزخ کے مناظر دیکھتی ہے خواب کی کیفیت اور کیفیت کی گونا گونی ہے کون انکار کر سکتا ہے خواب دیکھنے والے کا جسم اپنے بستر پر ہوتا ہے دیکھنے والے اس کو بستر پر موجود پاتے ہیں تنفس جاری ہوتا ہے لیکن خواب دیکھنے والا بھی اپنے جسم کو جیل خانہ کے اندر بند پاتا ہے اور شدائد جیل کا اس کو احساس ہوتا ہے کبھی قصر شاہی میں اپنے کو رونق افروز پاتا ہے اور شاہانہ استقبال اپنے لئے دیکھتا ہے کبھی صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے تو کبھی مرغزاروں اور خیابانوں میں گل گشت کرتا ہے یہ عالم برزخ تو نہیں مگر برزخ کا نمونہ ضرور ہے جسم مثالی کا یہاں سے سراغ ملتا ہے مثالی لذت والم کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے گویا افلاطون نے جس بعد کو مادہ سے مجرد قرار دیا ہے دوسرے الفاظ میں غیر مادی جسمانیت کا اقرار کیا ہے (گو مکان کی تعریف میں سے یہ الفاظ کہے ہیں مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرگروہ اشراقیہ کی نظر کشفی بھی ایک ایسے جسم تک پہنچ گئی تھی جو باوجود حامل جسمانیت ہونے کے غیر مادی ہے) اس کا جولانگاہ اور میدان ظہور یہی عالم برزخ ہے پس قبر نام اسی برزخی گڑھے کا ہے یہ ہی جنت یا جہنم کا دروازہ ہے اسی میں اعلیٰ اور ادنیٰ یعنی علیین اور سجین دو مقام ہیں سجین کا دوسرا نام سجین ہے اور علیین کا دوسرا نام قندیل نور مبین۔ اسی مقام سے جنت کی تفریح نظری اور جہنم کی نظر سوز سیر ہوتی ہے یہیں جنت کی فرحت بخش ہوائیں اور جہنم کی جان گسل لپٹیں آتی ہیں یہی منزل جنان و سقر کا وقفہ سیر ہے یہاں سہولت مل گئی تو آئندہ اس سے زیادہ سہولتیں ملیں گی اور یہاں دکھ ہوا تو آئندہ کا دکھ اس سے زیادہ سخت ہوگا یہ ہے جو مر گیا اس کی قیامت بپا ہوگئی یہ قیامت صغریٰ ہے جو قیامت کبریٰ کا پیش خیمہ اور ہر اول ہے برزخ ارضی بھی ہے عالم مادی کے قریب ہے اور سماوی بھی ہے عالم روحانی کے قریب ہے اور فضائی بھی ہے عالم مادی اور عالم ارواح کے درمیان حائل ہے روح مومن کو زمین کی طرف لوٹائے جانے کا اظہار کیا جائے یا عرش کے نیچے نورانی قندیلوں میں سبز پرندوں کی شکل میں بند ہونے کا اقرار کیا جائے بات ایک ہی ہے برزخ زمین بھی ہے اور آسمان بھی ہے اس زمین سے اعلیٰ ہے اور سماء ارواح سے اسفل مکمل تفصیل کی یہ جگہ نہیں۔ احادیث متعارضہ کا تعارض دفع کرنے کیلئے اتنا بیان کافی ہے مگر اس پر یقین رکھنے کے لئے شہودی نظر اور وجدانی علم کی ضرورت ہے گو عالم مثال کا وجود عقلیت کے خلاف تو نہیں مگر عقل سے وراء ضرور ہے اس لئے عقل استدلالی اور منطق برہانی کی اس کی حدود میں رسائی نہیں۔ واللہ اعلم۔

ہے قتادہ نے کہا لفظ تسنیم کی وضعی ساخت بلندی کے مفہوم کی حامل ہے کیونکہ سنام کے معنی ہے اونچی چیز اسی لئے سنام اونٹ کے کوہان کو کہتے ہیں۔ بغویؒ نے قتادہ کے قول کی روشنی میں لکھا ہے کہ تسنیم وہ شراب ہوگی جو ابرار کے کمروں اور گھروں میں اوپر سے برسے گی میں کہتا ہوں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرش کے اوپر سے برسے گی کیونکہ جنت کے اوپر عرش چھت کی طرح ہوگا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اوپر ہوا میں شراب رواں ہوگی اور اہل جنت کے برتنوں میں ان کو بھرنے کے بقدر گرے گی جب برتن بھر جائیں گے تو شراب کی بارش رک جائے گی۔

ضحاکؒ نے کہا تسنیم ایک شراب کا نام ہے جنت کی اعلیٰ شرابوں میں اس کا شمار ہے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تسنیم اہل قرب کے لئے مخصوص ہے اہل قرب اس کو کسی چیز کی آمیزش کے بغیر پئیں گے اور باقی اہل جنت کے لئے اس میں آمیزش کی جائے گی۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا یہ تسنیم کی تشریح ہے خواہ اس کا نصب امدح یا اَعْنِی مقدر کی بنا پر قرار دیا جائے یا تسنیم سے حال کہا جائے اور بِھَا کا معنی ہے مِنْهَا (یعنی اس میں سے پئیں گے) یا یَشْرَبُ چونکہ یلتذ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے اس کے بعد بِھَا لایا گیا (یعنی اس شراب سے لذت یاب ہوں گے۔

الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ وہ لوگ جو کمالات نبوت کے خود حامل ہیں یا انبیاء کی معرفت ان کو وہ کمالات حاصل ہوئے ہیں یعنی صدیق۔ (گویا اہل قرب سے مراد ہیں انبیاء اور صدیقین) بغوی نے یوسف بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس سے مِنْ تَسْنِيْمٍ کا مطلب دریافت کیا گیا فرمایا یہ ان (نامعلوم) چیزوں میں سے ہے جن کے متعلق اللہ نے فرمایا فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا یعنی قریشی کافر ابو جہل ولید بن مغیرہ عاص بن وائل اور ان کے ساتھی دوسرے مشرکین مکہ۔

كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد ہیں حضرت عمارؓ خبابؓ، صہیبؓ، بلالؓ اور ان کے ساتھی نادار مسلمان یعنی یہ مجرم مومنوں کا مذاق اڑانے کے لئے ان سے ہنستے تھے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ اور جب مومن کافروں کی طرف سے گزرتے تھے تو وہ کافر مسلمانوں کی طرف بطور استہزاء آنکھ اور ابرو سے اشارے کرتے تھے۔

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ اور جب گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاتے تھے تو مسلمانوں کے استہزاء سے خوش خوش مزے اڑاتے ہوئے جاتے تھے۔

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ اور مسلمانوں کو دیکھ کر کہتے تھے یہ بھکے ہوئے ہیں محمد نے ان کو بہکالیا ہے یہ باپ دادا کے دین سے بھٹک گئے ہیں آخرت کی عزت کے لئے دنیا کی لذتیں انہوں نے چھوڑ دی ہیں اور حقیقت کو چھوڑ کر خیال کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾ حالانکہ ان کافروں کو اس غرض سے نہیں بھیجا گیا تھا کہ مومنوں کے اعمال کی نگہداشت کریں اور ان کی ہدایت وصلاح کا فیصلہ کریں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ یعنی جب مومن اپنی اپنی مسہریوں پر بیٹھے دیدار خدا کر رہے ہونگے اور کافروں کو طوق وزنجیر میں بندھا ہوا دوزخ کے اندر دیکھیں گے تو اس روز مومن کافروں پر ہنسیں گے۔

ابو صالح۔ نے کہا اس کی صورت یہ ہوگی کہ جب کافر دوزخ کے اندر ہونگے تو دوزخ کے دروازے کھول کر ان سے کہا جائیگا باہر نکل جاؤ دروازے کھلے ہوئے ہیں کافر دروازے کھلے دیکھ کر باہر نکلنے کے لئے دروازوں کی طرف بڑھیں گے۔ مومن

ان کی حالت یہ دیکھتے ہونگے کافر دروازوں پر پہنچیں گے تو یکدم دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ ایسی حرکت بار بار ہوگی اس وقت مومن کافروں پر ہنسیں گے جیسے دنیا میں کافر مسلمانوں پر ہنستے تھے۔

حضرت کعبؓ نے کہا جنت اور دوزخ کے درمیان کچھ کھڑکیاں ہونگی جب مومن اپنے دنیوی دشمن کو دیکھنا چاہیگا تو کھڑکیوں سے دوزخ کے اندر جھانکے گا۔ جیسا اللہ نے فرمایا ہے فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ۔ دوزخ کے اندر کافروں پر عذاب ہوتا دکھائی دیگا تو مومن ہنسیں گے آیت مذکورہ بالا میں اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے۔

بیہقی نے حسن بصریؒ کی روایت سے رسول ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ (مسلمان) آدمیوں کا مذاق اڑانے والوں میں سے بعض کے لئے جنت کا کوئی دروازہ کھول دیا جائیگا اور اس سے کہا جائیگا اندر آجاوہ اپنے دکھ اور رنج کے ساتھ بڑھیگا جب (دروازہ پر) پہونچے گا تو وہ دروازہ بند کر دیا جائیگا یہ کیفیت پیہم ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ آخر میں انتہائی مایوسی کی وجہ سے کوئی استہزاء کرنیوالا جنت کے دروازے تک نہیں جائیگا۔

عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی مومن اپنی مسہریوں پر بیٹھے ہوئے دوزخ کے اندر کافروں کو دیکھتے ہونگے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ استفہام تقریری ہے یعنی کافروں کو اسی استہزاء کا بدلا دیا جائے گا۔ جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔
واللہ اعلم۔

ع ۱ ۳۶ ۸

سورۂ تطفیف ختم ہوئی بعونہ ومنہ تعالی

سورۂ انشقاق

یہ سورت مکی ہے اسمیں ۲۵ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ جب آسمان پھٹ جائیگا اَلسَّمَآءُ اُنْشَقَّتْ محذوف کا فاعل ہے اور اِنْشَقَّتْ مذکورہ اس محذوف کی تفسیر ہے۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا اور اپنے مالک کے حکم انشقاق کو سنے گا اور اطاعت کریگا۔

وَحُقَّتْ ﴿۲﴾ اور آسمان کے لئے حکم کی اطاعت ہی حق ہے ممکن کی چونکہ اپنی ذاتی کوئی اقتضا نہیں ہو سکتی اس لئے مشیت واجب کی اطاعت کے سوا اس کے لئے کوئی امکان ہی نہیں۔

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾ جب زمین پھیلائی یعنی اس کی وسعت بڑھادی جائیگی۔ مقاتل نے کہا زمین کو ایسا ہموار کردیا جائیگا جیسا چمڑے کو پھیلا دیا جاتا ہے نہ اس پر کوئی پہاڑ رہے گا نہ کوئی عمارت۔ حاکمؒ نے حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کا دن ہوگا تو زمین کو اس طرح پھیلا دیا جائیگا جیسے چمڑا پھیلایا جاتا ہے اور مخلوق کو اٹھایا جائیگا۔

حاکمؒ نے عمدہ سند سے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن زمین کو اس طرح پھیلایا جائیگا جیسے چمڑے کو پھیلایا جاتا ہے پھر آدمی کو زمین میں صرف قدم رکھنے کی جگہ ملیگی۔ پھر سب سے پہلے مجھے بلایا جائیگا۔ میں سجدہ میں گر جاؤں گا تو مجھے (کچھ عرض کرنے کی) اجازت دی جائے گی۔ اس وقت جبرائیل اللہ کے دائیں طرف ہونگے واللہ اس سے پہلے جبرائیل نے اللہ کو پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا میں عرض کرونگا اے میرے رب اے میرے رب مجھے اس جبرائیل نے خبر دی تھی کہ تو نے اس کو میرے پاس بھیجا تھا جبرائیل خاموش ہونگے کوئی بات نہیں کرینگے یہاں تک کے اللہ فرمائیگا۔ اس نے سچ کہا پھر اللہ مجھے شفاعت کی اجازت دیگا اور میں عرض کرونگا اے میرے رب تیرے بندے تمام زمین پر (پھیلے ہوئے ہیں) مقام محمودا (شفاعت کا مقام) یہی ہوگا۔

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾ اور زمین اپنے اندر کے تمام مردے اور خزانے باہر پھینک دیگی اور کوشش کے ساتھ (اندر سے) خالی ہوجائیگی اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہے گی۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾ خزانوں اور مردوں کو اندر سے باہر پھینکنے کے حکم کو سنکر اطاعت کریگی اور اس کی یہ اطاعت حق ہوگی اِذَا کی خبر محذوف ہے جس کے مضمون پر آئندہ آیات دلالت کررہی ہیں۔ یعنی جب ایسا ہوگا تو انسان اپنی کوشش کو پائیگا، اس کے دائیں ہاتھ میں کتابچہ دیا جائیگا تو وہ خوش خوش لوٹے گا اور بائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دیا جائیگا تو ہلاکت کو پکارے گا۔

چونکہ دونوں جملوں میں سے ہر جملہ ایک قسم کی مخصوص قدرت کا حامل ہے اس لئے ہر جملہ کے ساتھ اِذَا الگ الگ لایا گیا۔

ابو القاسم ختلی نے الدیباج میں عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیات اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ الخ کی تشریح میں فرمایا۔ میں ہی ہونگا سب سے اول وہ شخص جو زمین پھٹ کر باہر نکلے گا۔ میں

(اٹھ کر) اپنی قبر میں بیٹھ جاؤں گا۔ میرے سر کے مقابل آسمان تک ایک دروازہ کھل جائے گا کہ عرش تک مجھے دکھائی دیگا۔ پھر میرے نیچے سے ایک دروازہ کھولا جائیگا کہ ساتویں زمین تک مجھے دکھ جائیگی اور ثریٰ تک میں دیکھ لونگا پھر دائیں طرف ایک دروازہ کھولا جائیگا کہ میں جنت تک دیکھ لونگا اور اپنے ساتھیوں کے مکان مجھے دکھ جائیں گے اور زمین مع میرے جنبش میں آجائیگی تو میں کہونگا زمین تجھے کیا ہو گیا زمین جواب دے گی۔ میرے مالک نے مجھے حکم دیا ہے کہ میرے اندر جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک دوں اور خالی ہو جاؤں لہٰذا جیسے میں (انسانوں سے پہلے) تھی ویسی ہی ہو جاؤں گی اسی (مضمون) کے متعلق ہے اللہ کا فرمان وَاَلْقَتْ مَافِیْهَاوَتَخَلَّتْ۔

ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں آیت وَاَلْقَتْ مَافِیْهَاوَتَخَلَّتْ کے سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ (زمین) سونے کے ستون (باہر پھینک دیگی) یعنی زمین کے اندر جو خزانے مدفون ہونگے ان کو زمین باہر نکال پھینکے گی۔ ابن ابی حاتم نے عطیہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا اور فریابی نے مجاہد کا یہ قول بیان کیا کہ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا زمین اپنے اندر سے اپنا بوجھ باہر نکال پھینکے گی یعنی مردوں کو۔

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ عام انسانوں سے خطاب ہے۔

اِنَّكَ كَادِحٌ كَدْحٌ کے معنی ہے اچھے برے کام میں اتنی محنت اور کوشش کرنا کہ محنت کا اثر کرنے والے میں پیدا ہو جائے کیونکہ کدح کا لغوی معنی ہے خراش پیدا کر دینا (پس کوشش اور محنت اگر انسان میں کوئی اثر پیدا کر دے تو گویا کوشش نے اس کے اندر خراش پیدا کر دی)

اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا اپنے مالک کی طرف یعنی موت کی طرف۔ مراد یہ ہے کہ اے انسان تو مرنے تک (اچھے برے کام کی) کوشش میں لگا رہتا ہے۔

فَمُلٰقِیْهِ ۝ ضمیر یا كَدْحًا کی طرف لوٹ رہی ہے مطلب یہ کہ آخر میں تو اپنی کوشش کو یعنی کوشش کے بدلہ کو پالیگا۔ یا ضمیر۔ رَبِّكَ کی طرف راجع ہے یعنی مرنے کے بعد جب قیامت کا دن ہوگا تو اپنے مالک تیری ملاقات ہوگی۔ یا مضاف محذوف ہے یعنی رب کی طرف سے محاسبہ تجھے پیش آئیگا۔ اس آیت میں اجمالاً کوشش کا عوض ملنے کا اظہار کیا اور آئندہ آیت میں خود ہی اس کی تفصیل کر دی فرمایا۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝ پس جس شخص کے دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ دیا جائیگا اس کا حساب آسان ہوگا اس سے مراد مومن ہیں۔ بخاری نے اپنی سند سے ابن ابی ملیکہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اگر کوئی بات ایسی سنتی تھیں جس کا مطلب انکی سمجھ میں نہیں آتا ہے تو سمجھ لینے کے لئے اس بات کو (حضور ﷺ سے) دریافت کر لیتی تھیں چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من حوسب عذب جس سے حساب لیا گیا (پس) اس کو عذاب دیا گیا تو حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا (پھر حساب فہمی کے لئے عذاب کس طرح لازم ہے فرمایا یہ (حساب جسکا ذکر آیت میں ہے) صرف ایک پیشی ہوگی جسکی پوچھ کچھ کے ساتھ حساب فہمی ہوگی وہ ہلاک ہو جائیگا۔

امام احمد کی روایت ہے حضرت عائشہؓ صدیقہ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حساب یسیر کیا ہوگا فرمایا یعنی صرف اس کا کتابچہ دیکھ کر در گزر کی جائے گی۔ البتہ جس کی حساب فہمی پوچھ کچھ کے ساتھ کی جائے گی وہ ہلاک ہو جائے گا۔

وَّیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اور اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش لوٹکر جائیگا۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ اور جس کے ہاتھ میں پشت کے پیچھے سے اعمالنامہ دیا جائے گا۔

اس آیت کی تشریح میں علامہ بیہقی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ پشت کے پیچھے کر دیا جائیگا اور اعمالنامہ کو وہ بائیں ہاتھ سے لیگا۔ ابن السابطؒ نے کہا اس کا بایاں ہاتھ مروڑ کر سینہ کے اندر سے پشت کے پیچھے نکال دیا جائیگا۔

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ﴿١١﴾ ثبور کا معنی ہے ہلاکت یعنی وہ مرنے کی تمنا کرے گا اور کہے گا وائے موت (آجا)

وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿١٢﴾ اور دہکتی آگ میں داخل ہو گا۔

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿١٣﴾ یعنی وہ دنیا میں اپنے گھر والوں کے ساتھ آخرت سے غافل اور نڈر ہو کر مال و جاہ میں پڑ کر خوش تھا یہ جملہ موت کو پکارنے کی علت ہے۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿١٤﴾ یہ قیامت کا انکار کرتے ہوئے خیال رکھتا تھا کہ حساب فہمی کے لئے مالک کے پاس لوٹ کر جانا نہ ہو گا۔

بَلٰىٓ ۚ یہ نفی کا ایجاب ہے یعنی اللہ کی طرف واپسی لازمی ہے۔

اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿١٥﴾ یہ رجوع کو ثابت کرنے کی علت ہے یعنی اس کی واپسی خدا کی طرف ضرور ہو گی اللہ اس کو ضرور سزا دیگا کیونکہ اللہ اس کے اعمال سے بخوبی واقف ہے دیکھ رہا ہے اس کے اعمال کو یونہی رائگاں نہیں چھوڑیگا، ضرور انتقام لیگا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾ شَفَق مغرب کے بعد والی سفیدی جو سرخی کے بعد ہوتی ہے۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾ مَا وَسَقَ سے مراد ہیں وہ مویشی جو دن میں ادھر ادھر منتشر ہوتے ہیں اور رات ان کو انکے ٹھکانوں پر جمع کر دیتی ہے۔

منصورؒ نے مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ مَا وَسَقَ کا معنی یہ ہے کہ جس چیز کو رات اپنی لپیٹ میں لے لے اور تاریکی میں چھپالے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا رات میں جو کچھ کیا جائے (سب مَا وَسَقَ میں داخل ہے) یعنی قسم ہے شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات سمیٹ دیتی ہے یا جن کو رات اپنے لپیٹ میں لیتی ہے یا اسکی جو رات میں کیا جاتا ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿١٨﴾ اور قسم ہے چاند کی جب وہ مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی چاندنی روشن راتوں میں پوری ہو جاتی ہے۔ اتسق باب افتعال سے ہے وسق اس کا مجرد ہے وسق کا معنی ہے جمع کرنا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ اگر لَتَرْكَبَنَّ صیغہ واحد مذکر مخاطب بر قرات ابن کثیر و حمزہ و کسائی پڑھا جائے تو خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا۔ بر قول شعبیؒ و مجاہدؒ یہ مطلب ہوگا کہ اے محمد ﷺ تم ضرور ایک آسمان پر چڑھو گے اللہ نے فرمایا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (گویا طَبَقٌ عَنْ طَبَقٍ سے مراد ہے آسمان بالائے آسمان کیونکہ اللہ نے سات آسمان منزل در منزل بنائے ہیں) پس اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے معراج کی بشارت ہے۔ قصۂ معراج کے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان کا ذکر سورۂ اسراء اور سورۃ النجم میں ہو چکا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرب خداوندی اور علو مرتبہ میں درجہ بدرجہ ترقی دینا مراد ہو۔ بخاریؒ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ طَبَقًا عن طبق کے معنی ہے حال بعد حال ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد تمہارے نبی اکرم ﷺ ہیں۔ اگر لَتَرْكَبَنَّ کو واحد مونث غائب کا صیغہ قرار دیا جائے تو ضمیر فاعلی آسمان کی طرف راجع ہو گی (اور طبق عن طبق کا معنی ہو گا ایک کے بعد دوسرا حال) یعنی آسمان ایک حال کے بعد دوسرا حال اختیار کریگا سعید بن منصور اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن سعدؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آسمان میں شگاف ہو جائینگے پھر پھٹ پڑیگا پھر سرخ ہو جائیگا۔

بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آسمان کے مختلف رنگ ہونگے وردی گلابی اور آسمان کمزور ہو جائیگا اور پھٹ جائیگا اس طرح ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت ہو گی۔

موجودہ قرات میں باء کے ضمہ کیساتھ جمع کا صیغہ ہے اور انسانوں کو خطاب ہے یعنی اے انسانو قیامت کی منازل میں تم ایک حال کے بعد دوسرے حال میں اور ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر ہو گے مقاتل نے طبق سے مراد لی ہے موت اور موت کے بعد زندگی۔ عطاء نے دنیوی احوال سے تفسیر کی ہے کبھی فقیر کبھی مالدار عمرو بن دینار کی روایت سے حضرت ابن

عباسؓ کا قول آیا ہے کہ (طبق عن طبق سے مراد ہیں) شدائد، مصائب، موت، پھر حشر پھر پیشی۔ عکرمہ نے کہا طبق عن طبق یعنی ایک حال کے بعد دوسرا حال پہلے شیر خوار ہوتا ہے پھر دودھ چھوٹتا ہے پھر بچہ لڑکا ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ابو عبیدہؓ نے اس طرح تشریح کی کہ تم ضرور گزشتہ اقوام کے طریقوں پر چلو گے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث آئی ہے جس کو حاکم نے صحیح کہا ہے کہ تم لوگ بالشت اور بانہہ بانہہ گزشتہ اقوام کے طریقوں پر چلو گے یہاں تک کہ اگر گزشتہ اقوام میں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوا تھا تو تم بھی داخل ہو گے اور اگر ان میں سے کسی نے اپنی بیوی سے سر راہ جماع کیا تھا تو تم بھی کرو گے۔ بخاریؒ نے اسی طرح کی حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ اس استفہام سے مقصود ہے انکار اور تعجب کا اظہار۔ وعد ابرار اور وعید فجار جو اوپر گزرا اس سے یہ کلام تعلق رکھتا ہے درمیان میں جملہ فَلَآ أُقْسِمُ بطور معترضہ ذکر کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کلام کا ربط آیت لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ سے ہو کیونکہ تبدیل احوال سے تبدیل کرنیوالے کی ہستی کا پتہ چلتا ہے پھر کیا وجہ کہ اس کو نہیں مانتے۔

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿٢١﴾ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سننے سے سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن سنکر سجدہ نہ کرنے والوں کی اس آیت میں مذمت کی ہے حالانکہ اگر آیت میں سجدہ نہو کوئی دوسری آیت ہو تو عموماً قرآن سن کر بالاجماع سجدہ واجب نہیں۔ پس آیت مذکورہ میں سجدہ سے مراد یا تو خضوع ہے، خضوع کو مجازاً سجدہ فرمایا ہر آیت قرآنی کو سننے کے وقت دل کا خضوع واجب ہے یا سجدہ سے سجدہ تلاوت مراد ہے اور القرآن میں الف لام (جنسی نہیں) عہدی ہے یعنی آیات سجدہ مراد ہے۔ امام اعظمؒ ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سجدۂ تلاوت کو واجب قرار دیتے ہیں موخر الذکر معنی کے بناء پر امام اعظمؒ کے لیے آیت دلیل بن جائیگی۔ لیکن امام صاحب نے سجدہ تلاوت کو فرض نہیں قرار دیا (باوجودیکہ آیت مذکورہ میں حکم سجدہ موجود ہے) کیونکہ مسئلہ مختلف فیہا ہے اور تفسیر مذکورہ متعین نہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ شک واحتمال کی صورت میں تو وجوب بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ وجوب کا ثبوت دلیل ظنی سے ہوتا ہے۔

چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ نے وجوب سجدہ تلاوت کے ثبوت میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی سجدہ کی آیت پڑھتا (اور سجدہ کرتا) ہے تو شیطان روتا ہوا الگ چلا جاتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس آدمی کو سجدہ کا حکم دیا گیا اور اس نے سجدہ کیا اور اس کے لئے جنت ہو گئی اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا مگر میں نے نہیں کیا اور میرے لئے دوزخ ہو گئی۔ مسلم

وجہ استدلال یہ ہے کہ جب کوئی دانشمند کسی دانشمند کے کلام کو نقل کرتا ہے اور نقل کرنے کے بعد اسکی تردید نہیں کرتا تو معلوم ہوتا ہے کہ ناقل کے نزدیک منقول عنہ کا کلام صحیح ہے (رسول اللہ ﷺ نے شیطان کا کلام نقل کیا ہے جس میں آیت سجدہ پڑھنے پر حکم سجدہ کا ذکر تھا اور شیطان کے اس قول کی حضور نے تردید نہیں فرمائی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت واجب ہے اور شیطان نے سچ کہا ہے) ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص (آیت) سجدہ سن لے اس پر سجدہ واجب ہے۔

جمہور فقہاء و محدثین کے نزدیک سجدہ تلاوت سنت ہے۔ جمہور نے مندرجہ ذیل حدیث واثر سے استدلال کیا ہے حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے النجم پڑھی مگر حضور ﷺ نے سجدہ نہیں کیا۔ مسلم، بخاری، دار قطنی اور اصحاب السنن نے یہ حدیث بیان کی ہے دار قطنی نے اتنا زائد بیان کیا ہے کہ ہم میں سے کسی نے سجدہ نہیں کیا حنفیہؒ نے اس کے جواب میں کہا کہ اس حدیث سے سجدہ کا واجب نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو ایک واقعہ کا بیان ہے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ترک سجدہ اس وجہ سے ہو کہ قرات مکروہ وقت میں کی گئی ہو یا وضو نہو یا یہ بتانا مقصود ہو کہ سجدہ تلاوت فوراً

واجب نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر ان وجوہ میں سے ترک سجدہ میں سے کوئی وجہ ہوتی تو اس کو بیان کر دیا جاتا عدم بیان سے تو وقت حاجت میں بیان مجمل کا ترک لازم آئیگا۔ دوسری حدیث حضرت عمر بن خطابؓ کی ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز ممبر پر سجدہ کی آیات پڑھی اور نیچے اتر کر سجدہ کیا اور سب لوگوں نے آپ کے ساتھ سجدہ کیا پھر ایک اور جمعہ میں بھی (اسی طرح) آیت سجدہ کی تلاوت کی اور لوگ سجدہ کرنے کو تیار ہو گئے مگر آپ نے ممبر ہی پر سے فرمایا اللہ نے تم کو مہلت دی ہے فرض نہیں کیا ہاں جو چاہے (کرے) یہ اثر بخاریؒ نے بھی بیان کیا ہے اور امام مالکؒ نے مؤطا میں بھی۔

شیخ ابن حجر مکی نے کہا مزی کا خیال ہے کہ یہ بخاری کے تعلیقات میں سے ہے مگر یہ وہم ہے بیہقی اور ابو نعیم نے اس کی روایت کی ہے۔ میں کہتا ہوں اس روایت میں اجماع کا بیان ہے کہ سب لوگ جمعہ کی نماز میں موجود تھے اور کسی نے حضرت عمر کے قول کی تردید نہیں کی۔

رہی وہ روایت جس میں بیان کیا گیا ہے کہ شیطان نے کہا تھا آدمی کو حکم دیا گیا اور اس نے سجدہ کر لیا تو بظاہر اس سے مطلق سجدہ مراد ہے خصوصیت کے ساتھ سجدہ تلاوت مراد نہیں کیونکہ شیطان کو تو حکم دیا گیا تھا کہ آدمؑ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرے وہاں سجدہ تلاوت کا حکم نہیں تھا۔

مسئلہ: مفصلات میں سجدہ تلاوت اختلافی ہے جمہور کے نزدیک النجم اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اور اقرأ میں سجدہ ہے پھر باہم اختلاف ہے کہ حج میں دو سجدہ ہیں یا صٓ میں۔ اس طرح جمہور کے نزدیک پورے قرآن میں ۱۴ یا ۱۵ سجدے ہیں۔ امام مالک نے فرمایا مفصلات میں کہیں سجدہ نہیں آپ نے استدلال میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مفصلات میں کہیں سجدہ نہیں کیا۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ابو علی بن السکن نے بروایت ابو قدامہ حارث بن عبید از مطر از عکرمہ بھی بیان کیا ہے اور ابو قدامہ نے براہ راست بھی عکرمہ سے اس کی نقل کی ہے۔ شیخ ابن حجرؒ نے ابو قدامہ اور مطر کو ضعیف کہا ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ امام احمد نے فرمایا ابو قدامہ مضطرب الحدیث ہے یحییٰ نے کہا ابو قدامہ ہیچ ہے اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔ طحاویؒ اور بعض دوسرے لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت ابی بن کعب سے مفصلات میں سجدہ کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا نہیں ہے۔

ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اذا السماء انشقت اور اقرأ میں سجدہ نہیں کیا یہ حدیث صرف مسلم نے بیان کی ہے لیکن دوسری اسناد سے بخاری و مسلم دونوں نے ابو نافع کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی آپ نے اذا انشقت پڑھی اور سجدہ کیا میں نے کہا یہ کیا۔

فرمایا رسول اللہ ﷺ کے پیچھے میں نے سجدہ کیا تھا لہٰذا مرتے دم تک اس جگہ سجدہ کرتا رہونگا۔ حضرت ابو ہریرہ سن ۶ ہجری میں مسلمان ہوئے تھے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباسؓ کی ہے کہ اس میں یعنی النجم میں رسول اللہ ﷺ نے بھی سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی یہ روایت بخاری نے بیان کی ہے اور ترمذی نے اسکو نقل کرنے کے بعد صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن میں پندرہ سجدے پڑھے۔ تین مفصلات میں اور دو سورۂ حج میں۔ یہ حدیث ابو داؤد، ابن ماجہ، دار قطنی اور حاکم نے بیان کی ہے۔ منذری اور نووی نے اس کو حسن کہا ہے مگر شیخ عبد الحقؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن جوزی نے بھی اس کو نا قابل اعتماد کہا ہے اور صراحت کی کہ اس حدیث کی اسناد میں محمد بن راشد ہے اور علماء نے اس کو کاذب قرار دیا ہے۔ حضرت عبد الرحمان بن عوف کی روایت ہے کہ میں نے خود دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اذا السماء انشقت میں (صرف) دس بار سجدہ کیا۔ رواہ البزار

مسئلہ: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا پڑھنے والے اور سننے والے پر سجدہ تلاوت کرنا واجب ہے خواہ ارادہ سے سنے یا بلا ارادہ سن لے کیونکہ موجب سجدہ مطلق ہے ترک سجدہ پر مذمت غیر مقید ہے۔ جمہور کے نزدیک بلا ارادہ سجدہ سننے پر حکم سجدہ

نہیں ہے (یعنی سنت بھی نہیں ہے) حضرت عثمانؓ والی حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے جب حضرت عثمانؓ عاصؓ کی طرف سے گزرے اور عاصؓ نے آیت سجدہ پڑھی تاکہ حضرت عثمان بھی سجدہ میں شرکت فرمائیں لیکن آپؓ نے سجدہ نہیں کیا اور چلے گئے اور فرمایا سجدہ اس شخص پر ہے جو قصداً سنے۔ یہ حدیث عبدالرزاق نے بروایت معمر از زہری از ابن مسیب بیان کی ہے۔ بخاری نے اس کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت عثمان کا قول نقل کیا ہے کہ سجدہ اس شخص پر ہے جو اس کے (یعنی آیت سجدہ سننے کے) لئے بیٹھا ہوا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ سجدہ اس شخص پر ہے جو اس کے لیے بیٹھا ہو۔ رواہ البیہقی وابن ابی شیبہ۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ کے نزدیک سننے والے پر سجدہ واجب ہے خواہ پڑھنے والا سجدہ نہ کرے کیونکہ امر مطلق ہے (پڑھنے والے کے سجدہ کرنے کی قید اسمیں نہیں ہے) جمہور کے نزدیک سامع کے لئے سجدہ کا حکم اس وقت تک نہیں ہے جب تک قاری سجدہ نہ کرے کیونکہ زید بن اسلمؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور کے سامنے آیت سجدہ پڑھی اور حضور ﷺ نے سجدہ کیا پھر ایک اور آدمی نے آیت سجدہ پڑھی مگر حضور ﷺ نے سجدہ نہیں کیا اس شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس شخص کی تلاوت پر تو حضور نے سجدہ کیا اور میری تلاوت پر نہیں کیا۔ فرمایا تو امام تھا اگر تو سجدہ کرتا تو ہم بھی سجدہ کرتے ابوداؤدؒ نے یہ حدیث زید بن اسلمؓ کی روایت سے مرسلاً (بغیر ذکر صحابیؓ کے) ذکر کی ہے لیکن زید بن اسلم نے بحوالہ عطاء بن یسار بھی اس کو ذکر کیا ہے (یعنی تابعی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے مگر صحابی کا ذکر اس میں بھی نہیں ہے) امام شافعیؒ نے بھی اس کو اسی طرح (یعنی مرسل صحابی) بیان کیا ہے لیکن بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث قرہ نے اور قرہ سے زہریؒ نے اور زہریؒ سے حضرت ابوہریرہ نے بیان کی مگر قرہ ضعیف ہے بخاری کے نزدیک تعلیقاً حضرت ابن مسعود سے یہ حدیث مروی ہے۔

مسئلہ: اگر امام ہو تو سری نماز میں آیت سجدہ کو (جہراً) پڑھنا مکروہ ہے۔ لیکن یہ حکم جہری نماز کا نہیں نہ منفرد کے لئے یہ حکم ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا اگر امام آیت سجدہ سراً پڑھے تو سجدہ نہ کیا جائے۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک کسی صورت میں مکروہ نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ ظہر کی نماز میں رسول اللہ ﷺ نے سجدہ تلاوت کیا جب صحابہؓ نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے آیت سجدہ پڑھی تو انھوں نے بھی سجدہ کیا۔ ابوداؤد۔ طحاوی۔ حاکم۔

مسئلہ: جب امام سجدہ کرے تو مقتدی بھی سجدہ کریں امام شافعیؒ کے نزدیک سجدہ تلاوت اگرچہ سنت ہے مگر حکم اقتداء یہی ہے قنوت کے متعلق بھی امام شافعی کا یہی قول ہے۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ﴿٢٢﴾ کافر فقط اتنا ہی نہیں کرتے کہ قرآن سننے کے وقت سجدہ نہ کریں بلکہ قرآن کی، تکذیب بھی کرتے ہیں۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿٢٣﴾ یعنی جو کفر و عداوت وہ اپنے سینوں میں جمع رکھتے ہیں اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ مجاہد نے کہا کہ جو کچھ کافر چھپاتے ہیں اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٤﴾ فاء سببی ہے تکذیب سبب بشارت ہے عذاب سے ڈرانے کی جگہ عذاب کی خوشخبری دینے کا حکم استہزاءً دیا (یعنی ان کے حق میں یہی بشارت ہے)

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿٢٥﴾ استثناء متصل ہے یا منقطع ہے یعنی اِلَّا کا معنی لٰکِنَّ ہے مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو بشارت نہ دو جو ان میں سے ایمان لے آئیں اور نیک کام کریں کیونکہ ان کے لئے ثواب لازوال ہے یا غیر ناقص (پورا پورا) ثواب ہے یا بلا منت ثواب ہے۔ یہ استثناء کی علت ہے۔

سورۃ الانشقاق ختم ہوئی بحمدہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ البُرُوج

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۲ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمان الرحیم

وَالسَّمَاۤءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ① برجوں والے آسمان کی قسم، برج کا معنی ہے قلعہ لغوی معنی ہے ظہور۔ تبرجت المرأت وہ عورت بر آمد ہو گئی۔ قلعہ بھی بالکل نمایاں ہوتا ہے (عموماً پہاڑیوں پر قلعے بنائے جاتے تھے اس لئے اس کو برج کہا جاتا ہے۔ عطیہ عوفی نے بروج کا ترجمہ کیا ہے وہ محل جہاں چوکیدار متعین ہوں۔ صحیحین میں حدیث معراج کی تفصیل میں آیا ہے کہ پھر بیت معمور تک مجھے اٹھا کر لیجایا گیا یعنی ساتویں آسمان پر کعبہ کے مقابل سورہ تطفیف میں وہب بن منبہ کا قول گزر چکا ہے کہ ساتویں آسمان میں ایک مکان ہے جس کو سفید مکان کہا جاتا ہے وہاں مومنوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں۔ یا بروج سے مراد آسمان کے دروازے ہیں کیونکہ اترنے والے دروازوں سے ہی نکلتے اور بر آمد ہوتے ہیں۔ فلاسفہ کے اتباع میں عوام کا بھی یہ خیال ہو گیا ہے کہ وہمی (یعنی فرضی) طور پر آسمان کو ۱۲ حصوں پر تقسیم کر لیا گیا ہے ہر حصہ کو برج کہتے ہیں جس میں ثوابت (غیر متحرک) تارے تو رہتے ہی ہیں اور سیارے بھی آتے رہتے ہیں اور ثوابت کے اجتماع سے جو صورت بن گئی ہے وہی اس کا نام رکھدیا گیا جیسے حمل (بکری کا بچہ) ثور (بیل) جوزاء (جڑواں بچہ) وغیرہ مگر یہ قول پیچ ہے اس خیال کی بنا اس امر پر ہے کہ آسمان کی حرکت دوامی ہے ہر سیارہ فلک میں ہموار رفتار سے چلتا ہے (تیرتا ہے) آسمانوں میں غیر متحریک ستارے موجود ہی نہیں ہیں کہ ان کے مجموعہ کے لحاظ سے آسمان کے ایک خاص حصہ کو برج کہا جاسکے۔ اللہ کے کلام میں بے دین فلسفیوں کی اصطلاح مراد نہیں ہوسکتی۔ اس لئے آسمان کے موہوم حصوں کو برج نہیں کہا جاسکتا۔ برج کی لفظی ساخت تو ظہور کے معنی پر دلالت کر رہی ہے اور اصطلاحی حصۂ آسمان محض وہمی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں کیونکہ وہ بالکل نمایاں ہیں۔ یہ قول حسنؒ مجاہدؒ اور قتادہؒ کا ہے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ② اور مقرر دن یعنی روز قیامت کی قسم

وَشَاهِدٍ یعنی روز جمعہ کی قسم یا ہر اس شاہد کی قسم جو حق کی شہادت دے۔

وَّمَشْهُوْدٍ ③ اور یوم عرفہ کی قسم یا ہر اس چیز کی قسم جس کی شہادت سچا شاہد دیتا ہے۔ یہ امور عظمت والے ہیں اس لئے اللہ نے ان کی قسم کھائی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یوم موعود۔ یوم قیامت ہے اور مشہود یوم عرفہ اور شاہد روز جمعہ یوم جمعہ میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اگر ٹھیک اس ساعت میں کوئی مومن بندہ اللہ سے کسی بھلائی کی دعا کرتا ہے تو اللہ اسکی دعاء قبول فرماتا ہے اور جس شر سے پناہ مانگتا ہے اللہ اس شر سے اسکو بچالیتا ہے رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے اس کا راوی صرف موسیٰ بن عبیدہ ہے اور موسیٰ ضعیف ہے۔ طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابومالکؓ اشعری کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے اس میں اتنا زائد ہے کہ یوم جمعہ کو اللہ نے ہمارے لئے مخصوص فرما دیا ہے اور صلوۃ وسطی عصر کی نماز ہے۔

یوسفؒ بن مہران نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ شاہد محمد ﷺ ہیں اللہ نے فرمایا ہے وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى

هولاء شهيدا۔ اور مشہود سے مراد روز قیامت ہے اللہ نے فرمایا ذٰلِکَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِکَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ۔ اس قول پر تکرار لازم آئے گی یوم موعود اور یوم مشہود دونوں ایک ہی ہونگے۔ بعض لوگوں نے کہا شاہد اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے ہیں اور مشہود آدمی ہے۔ حسین بن فضل نے کہا شاہد سے مراد ہے یہ امت اور مشہود سے مراد ہیں باقی اقوام اللہ نے فرمایا ہے لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ سالم بن عبد اللہ نے سعید بن جبیر سے اس آیات کی مراد پوچھی تو سعیدؒ نے فرمایا شاہد اللہ اور مشہود ہم ہیں آیت کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض نے کہا اعضاء انسانی شاہد ہیں اللہ نے فرمایا یَوْمَ یَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بعض کے نزدیک شاہد انبیاء اور مشہود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اللہ نے فرمایا وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ .... فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ۔ میں کہتا ہوں اگر آیت کی تفسیر میں کسی حدیث کا ورود صحیح طور پر ثابت ہو جائے تو بس وہی تفسیر معین ہے ورنہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں بلکہ شاہد سے ہر شاہد بالحق اور مشہود سے ہر مشہود بالحق مراد ہوگا کوئی ہو اللہ نے فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِکَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ پس شاہد اللہ بھی ہے ملائکہ بھی اعمالنامے لکھنے والے فرشتے بھی انبیاء بھی رسول اللہ ﷺ بھی تمام مومن خصوصاً امت محمدیہ بھی اور اس امت میں سے خصوصیت کے ساتھ علماء بھی اور وہ لوگ بھی جو مقدمات کے فیصلے کرنے اور حدود قائم کرنے کے لئے سچی شہادت دیتے ہیں۔ اور مشہود ہے کلمہ توحید انبیاء کی صداقت اور تبلیغ رسالت انسان کے اعمال اور ہر کلمہ حق جو کسی سچے شاہد نے کہا ہو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا گواہوں کی عزت کرو اللہ انہی کے ذریعہ سے حقوق کو بر آمد کرتا اور مظالم کو دفع فرماتا ہے رواہ الخطیب وابن عساکر بسند ضعیف عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

قُتِلَ یہ جواب قسم ہے مگر یہ قول ضعیف ہے کیونکہ قسم کا جواب بغیر لام کے بہت کم آتا ہے اس لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ قسم کا جواب محذوف قرار دیا جائے جس کی تعیین آئندہ کلام سے ہو رہی ہے یعنی میں قسم کھاتا ہوں کہ کفار قریش ملعون ہیں جیسے اصحاب الاخدود ملعون تھے۔

اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ملعون تھے خندقوں والے یعنی آگ والے۔ حضرت صہیبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گزشتہ اقوام میں یمن میں ایک بادشاہ تھا اس کے پاس ایک جادوگر تھا جادوگر جب بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا میں تو بوڑھا ہو گیا اس لئے کوئی لڑکا میرے پاس بھیج دیجئے کہ میں اس کو سحر سکھادوں، بادشاہ نے ایک لڑکا اس کے پاس جادو سیکھنے کے لئے بھیج دیا لڑکے کے راستہ میں ایک درویش پڑتا تھا لڑکا درویش کے پاس جاتا تھا اور اس کی باتیں سنتا تھا تو اس کی باتیں اسکو پسند آتی تھیں چنانچہ جادوگر کے پاس جانے میں درویش کے پاس راستہ میں بیٹھ جانے کی وجہ سے دیر ہو جاتی تھی ساحر اس کو مارتا تھا اور جادوگر کے پاس سے واپسی میں بھی لڑکا اس درویش کے پاس بیٹھ جاتا اور اس کی باتیں سنتا تھا اس لئے گھر پہنچنے میں بھی دیر ہو جاتی تھی گھر والے بھی اسکو مارتے تھے لڑکے نے درویش سے اس بات کی شکایت کی۔ درویش نے کہا جب تم جادوگر کے پاس پہنچا کرو تو اس سے کہہ دیا کرو کہ مجھے گھر والوں نے روک لیا تھا اس لئے دیر ہو گئی اور گھر پہنچا کرو تو گھر والوں سے کہدیا کرو کہ مجھے جادوگر نے روک لیا تھا اس لئے دیر ہو گئی غرض لڑکا اس طرح کرتا رہا (ایک روز) جب راستہ میں جا رہا تھا تو دیکھا کیا ہے کہ ایک بڑے جانور (درندے) نے لوگوں کا راستہ روک رکھا ہے لڑکا کہنے لگا آج میں آزمائش کرونگا کہ درویش افضل ہے یا جادوگر یہ سوچکر پتھر لے کر کہنے لگا اے خدا اگر درویش کا معاملہ جادوگر کے معاملہ سے تجھے زیادہ محبوب ہے تو اس جانور کو قتل کردے تاکہ لوگ راستہ پر چلنے لگیں یہ دعا کر کے لڑکے نے پتھر مارا اور جانور مر گیا لوگ راستہ چلنے لگے اور لڑکے نے جاکر درویش سے یہ بات کہدی، درویش نے کہا بیٹے اب تو مجھ سے افضل ہے تیرا معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے جیسا تو دیکھ رہا ہے عنقریب تو مصائب میں مبتلا ہوگا مصائب میں مبتلا ہو کر کہیں میرا نام نہ بتا دینا۔ اس کے بعد وہ لڑکا مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کا اور لوگوں کے امراض کا (کامیاب) علاج کرنے لگا۔ ایک بار بادشاہ کے کسی ہم نشین نے لڑکے کی یہ شہرت سن لی وہ نابینا ہو گیا تھا لڑکے کے پاس بہت سے تحفے لے کر پہنچا اور کہا اگر تو مجھے اچھا کر دیگا تو یہ سب تحفے تیرے لئے ہیں۔ لڑکے نے کہا میں شفا کسی

کو نہیں دیتا اللہ شفا دیتا ہے اگر تو اللہ کو اور اللہ سے دعا کرنے کو مان لے گا تو اللہ تجھے شفا عطا فرما دیگا وہ ایمان لے آیا اللہ نے اس کو شفا دے دی وہ (بینا ہو کر) بادشاہ کے پاس پہونچا اور (نابینا ہونے سے پہلے) جیسا بیٹھتا تھا جا کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ بینائی کیسے لوٹ آئی ہم نشین نے کہا میرے مالک نے لوٹا دی۔ بادشاہ نے کہا کیا تیرا کوئی مالک میرے علاوہ اور بھی ہے ہم نشین نے کہا وہ میرا بھی رب ہے اور تیرا بھی، بادشاہ نے اس کو قید کر دیا اور برابر دکھ دیتا رہا۔ یہاں تک کہ اس لڑکے کا پتہ بتلا دیا۔ لڑکے کو لایا گیا بادشاہ نے اس سے کہا میرے بیٹے تیرے سحر کی حالت اب اس حد تک پہنچ گئی کہ نادرزادہ نابینا اور کوڑھی کو اچھا کرنے لگا لڑکے نے کہا میں کسی کو شفاء نہیں دیتا اللہ ہی شفاء دیتا ہے بادشاہ نے اس کو بھی گرفتار کر لیا اور استاد کہ دیا کہ بلا آخر اس نے درویش کا پتہ بتادیا۔ درویش کو بلایا گیا اور اس سے کہا گیا اپنے مذہب سے باز آ۔ درویش نے انکار کر دیا بادشاہ نے اس کے وسط سر پر آرا رکھو کر دو ٹکڑے کرا دیا۔ پھر لڑکے کو بلوایا گیا اور کہا اب بھی اپنے دین سے باز آ لڑکے نے انکار کیا۔ بادشاہ نے اپنے چند آدمیوں کو بلوا کر حکم دیا اس لڑکے کو فلاں فلاں پہاڑ کے اوپر لیجاؤ اور چوٹی پر پہونچ کر اگر یہ اپنا دین ترک کر دے تو خیر ورنہ اس کو نیچے پھینک دو۔ لوگ اس کو پہاڑ پر لے گئے لڑکے نے دعا کی الٰہی مجھے ان کی شر سے بچا جس طرح تو چاہے۔ یک دم پہاڑ میں زلزلہ آ گیا سب گر گئے لڑکا پھر چلتا چلتا بادشاہ کے پاس پہنچ گیا بادشاہ نے پوچھا تیرے ساتھیوں کا کیا ہوا۔ لڑکے نے کہا اللہ نے مجھے ان سے بچا لیا۔

بادشاہ نے پھر لڑکے کو چند آدمیوں کے حوالے کر کے حکم دیا اس کو لیجا کر کسی کشتی میں بٹھا کر سمندر میں لیجاؤ اگر یہ اپنے مذہب سے توبہ کر لے تو خیر ورنہ سمندر میں پھینک دو۔

لوگ لڑکے کو لے گئے لڑکے نے دعا کی الٰہی جس طرح تو چاہے مجھے ان سے بچالے (طوفان کی وجہ سے) کشتی الٹ گئی ، سب ڈوب گئے اور لڑکا چلتا چلتا پھر بادشاہ کے پاس پہونچ گیا بادشاہ نے ساتھ والوں کی کیفیت دریافت کی لڑکے نے کہا اللہ نے مجھے ان سے بچا لیا (ان کو ڈبو دیا) پھر کہنے لگا جب تک میرے کہنے کے موافق تو عمل نہیں کریگا مجھ کو قتل نہیں کر سکتا بادشاہ نے پوچھا وہ کیا بات ہے لڑکے نے کہا ایک میدان میں لوگوں کو جمع کرو اور مجھے کسی لکڑی کے ستون سے باندھ کر لٹکا دو پھر میری ترکش سے ایک تیر لے کر کمان کے چلے میں رکھ کر بسم اللہ رب الغلام کہ کر تیر مجھ پر چھوڑ دو اگر ایسا کرو گے تو مجھے قتل کر سکو گے حسب مشورہ بادشاہ نے لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا لڑکے کو لکڑی کی تنہ سے باندھ کر لٹکا دیا اور اسی کی ترکش سے ایک تیر لے کر کمان کے چلہ میں رکھ کر بسم اللہ رب الغلام کہ کر مارا فوراً لڑکے کی کنپٹی میں تیر پیوست ہو گیا اور لڑکا مر گیا یہ دیکھ کر لوگوں نے تین بار کہا ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے کچھ آدمیوں نے بادشاہ سے جا کر کہا دیکھئے جس بات کا آپ کو اندیشہ تھا وہی واقع ہو گئی۔ سب لوگ لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔

بادشاہ نے کوچوں کے دہانے پر خندق کھودنے کا حکم دیا خندقیں کھود دی گئیں تو ان میں لکڑیاں بھر کر آگ لگا دی اور حکم دے دیا جو شخص اپنے مذہب سے نہ پھرے اس کو خندق میں ڈال دو لوگ حکم کی تعمیل کرنے لگے آخر ایک عورت بھی آئی جس کے پاس چھوٹا بچہ تھا عورت خندق میں گرنے سے کچھ جھجکی لیکن بچہ نے کہا اماں ثابت قدم رہ بلاشبہ تو حق پر ہے۔ (صحیح مسلم)

عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ایسا ہی قصہ نقل کیا ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا کہ نجران (علاقہ یمن) میں حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جس کا نام یوسف ذونواس بن شرحبیل تھا۔ یہ واقعہ حضرت رسول خدا ﷺ کی ولادت مبارک سے سترہ سال پہلے کا ہے اس زمانہ میں کوئی نبی نہ تھا اور اس لڑکے کا نام عبداللہ بن تامر تھا۔ محمد بن اسحاقؒ نے وہب بن منبہ کے حوالے سے لکھا ہے ذونواس نے بارہ ہزار آدمی جلا دئے پھر ارباط (حبشی) نے یمن فتح کر لیا اور ذونواس بھاگ کر مع گھوڑے کے سمندر میں گھس گیا اور ڈوب گیا۔ کلبیؒ نے بیان کیا کہ ذونواس نے عبداللہ بن تامرؓ کو قتل کیا تھا۔

محمد بن عبداللہ بن ابی بکر الصدیقؒ نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں کوئی نہر کھودی گئی تھی تو دیکھا گیا کہ سر کے زخم پر عبداللہ بن تامر ہاتھ رکھے ہوئے ہے جب ہاتھ کو زخم سے ہٹایا جاتا تھا تو خون ابل پڑتا تھا اور جب ہاتھ کو چھوڑ

دیا جاتا تھا تو ہاتھ لوٹکر اپنی جگہ پہنچ جاتا تھا اور لوہے کی ایک مہر بھی عبداللہؓ کی انگلی میں پڑی تھی جس میں ربی اللہ لکھا تھا۔ حضرت عمر کو اس کی اطلاع پہونچی تو آپ نے لکھ بھیجا کہ عبد (یعنی عبداللہ) اور اس کی انگھوٹھی کو اسی حالت پر رہنے دو جس حالت میں تم نے اس کو پایا ہے۔

اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ کے متعلق کچھ دوسری روایت بھی آئی ہیں لیکن قوت میں مسلم کی روایت کے ہم پلہ کوئی نہیں۔ اس لئے نا قابل التفات ہیں۔

ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۝ بھڑکتی ہوئی، یہ آگ کی صفت ہے جو کثرت التہاب کی وجہ آگ کی بڑائی کو ظاہر کر رہی ہے۔ الف لام جنسی ہے۔

ربیع بن انس کا قول ہے جن مومنوں کو آگ میں پھینکا گیا تھا آگ کے مس کرنے سے پہلے ہی اللہ نے ان کی روحوں کو قبض کر لیا تھا اور اس طرح (جلنے سے) ان کو محفوظ رکھا تھا اور خندق کے کناروں پر بیٹھے ہوئے کافروں کو آگ کے شعلوں نے خندق سے نکل کر جلادیا تھا۔

اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۝ یعنی جب خندقوں کے کناروں کے پاس کرسیوں پر وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجاہد۔

وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ۝ اور وہ مسلمانوں کے عذاب کو دیکھ رہے تھے یعنی انکی غفلت کی حالت میں مومنوں پر عذاب نہیں ہو رہا تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ کے پاس جاکر شہادت دے رہے کہ فلاں فلاں شخص کے متعلق جو ڈیوٹی کی گئی تھی اس میں کوئی کوتاہی اس نے نہیں کی۔ یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن جبکہ انکی زبانیں اور ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے وہ خود مومنوں کو عذاب دینے کے شاہد ہونگے۔

وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ یعنی کافروں کو مومنوں کی طرف سے سواء اس کے اور کوئی ناگواری نہ تھی کہ مومنوں کا ایمان اللہ پر تھا۔ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا نَقَمُوۡا کا مفعول ہے۔ اور چونکہ نَقَمُوۡا ماضی ہے اس لئے يُؤۡمِنُوۡا (مضارع) بھی ماضی کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ مومنوں کی طرف سے کسی کمال شرف اور ذاتی محاسن کا کوئی ایسا مظاہرہ نہ تھا جس کو کافروں نے اپنی جہالت اور بدبختی کی وجہ سے مذکورہ عذاب کا موجب قرار دیا ہو بلکہ (مومنوں کی بری بات یہ تھی کہ) وہ اللہ پر ایمان لے آئے تھے۔

الۡعَزِيۡزِ ایسا غالب جو اتنا با اقتدار ہے کہ اس کے عذاب سے اندیشہ کیا جاتا ہے۔

الۡحَمِيۡدِ ۝ ایسا مستحق حمد محسن کہ اس سے ثواب کی امید کی جاتی ہے۔

الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ وہ خدا کہ صرف اسی کی حکومت زمین اور آسمان اور ان دونوں کے درمیان ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ ہی کو مرکز بیم وامید ثابت کرنے کے لئے یہ جملہ فرمایا گیا۔ اللہ نے اپنے یہ اوصاف اس لئے بیان فرمائے تاکہ مومنوں کے ایمان کی حقانیت اور ان کو ثواب کا استحقاق ثابت ہو جائے اور کافروں کا باطل پرست ظالم ناحق کوش اور مستحق لعنت وعذاب ہونا ظاہر ہو جائے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ۝ یہ جملہ گزشتہ جملہ کے لئے تذلیل ہے يُؤۡمِنُوۡا کے مفعول سے حال ہے یا شُهُوۡدٌ سے حال ہے اور مَا نَقَمُوۡا کا جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ ہر چیز کا مشاہدہ رکھتا ہے اس لئے ہر شخص کے اچھے برے عمل کا بدلا دیگا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَـنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو عذاب دیا۔ عذاب دینے والوں میں اصحاب الاخدود بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہیں مومن ہوں یا کافر بہر حال مومنوں کو انہوں نے دکھ دیا ہو۔ اسی طرح المومنین اور المومنات کا لفظ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جن کو اصحاب اخدود نے جلایا تھا اور وہ مومن بھی اسمیں داخل ہیں جن کو کوئی شخص دکھ پہونچائے۔

ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ　پھر انھوں نے اس معصیت سے توبہ نہیں کی تو آخرت میں انھی لوگوں کے لئے جہنم کا عذاب ہے یعنی وہ عذاب آخرت کے مستحق ہیں۔ یہ قول اس بات کے منافی نہیں کہ اگر عذاب دینے والے مومن ہوں تب بھی ان کی مغفرت نہیں ہوگی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اَلَّذِیۡنَ فَتَنُوۡا سے صرف کافر ہی مراد ہوں کیونکہ اس وقت صرف حیثیت ایمان عذاب دینے کی علت ہوگی مطلب یہ ہوگا کہ جن کافروں نے اہل ایمان کو ان کے ایماندار ہونے کی وجہ سے عذاب دیا ان کے لئے عذاب جہنم ہے اور

وَلَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ﴿۱۰﴾　جلنے کا عذاب ہے یہ پہلے جملہ کی تاکید ہے (یعنی اس سے بھی وہی عذاب دوزخ مراد ہے جو پہلے جملہ میں مذکور ہے)

یا دنیا میں جلنے کا عذاب ان کو پہونچے گا، کیوں کہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ جو دوسرے کے لئے کنواں کھودتا ہے خود اس میں گر جاتا ہے پہلے گزر چکا ہے کہ خندقوں کے کناروں پر بیٹھے ہوئے کافر بھی آگ کے لپیٹ میں آکر جل گئے۔ اور ذونواس سمندر میں ڈوب گیا۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوۡا سے گویا اس مفروضہ سوال کا جواب دیدیا گیا کہ اللہ نے اصحاب الاخدود اور ان جیسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ　یعنی نیکوکار مومنوں کے لئے

لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ　ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے دریا جاری ہیں۔

ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡكَبِیۡرُ ﴿۱۱﴾　یہ ہی بڑی کامیابی ہے دنیا اور دنیا کی ہر چیز اس کے مقابلہ میں حقیر ہے۔

اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِیۡدٌ ﴿۱۲﴾　بَطۡشٌ سخت گرفت یعنی تمہارے مالک کی پکڑ بہت سخت ہے جسکو دفع کرنا ممکن نہیں۔

اِنَّهٗ هُوَ یُبۡدِئُ وَیُعِیۡدُ ﴿۱۳﴾　یعنی آغاز تخلیق وہی کرتا ہے اور دوبارہ تخلیق بھی وہی کریگا اس کے سوا کوئی الہ نہیں کہ اس کی گرفت کو دفع کرنا ممکن ہو سکے۔ یا یہ مطلب کہ کافروں کی دنیا میں ابتدائی گرفت بھی وہی کرتا ہے اور آخرت میں بھی وہی پکڑ کریگا۔

وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ　اور وہی مومنوں کے گناہ معاف کرنے والا ہے۔

الۡوَدُوۡدُ ﴿۱۴﴾　وہی اپنے فرماں برادروں کا محب اور محبوب ہے۔

ذُو الۡعَرۡشِ　عرش کا مالک ہر چیز پر قابو رکھنے والا۔

الۡمَجِیۡدُ ﴿۱۵﴾　بزرگی والا۔ اللہ کی بزرگی کا معنی ہے اس کی ذات وصفات کی عظمت اس کا واجب الوجود ہونا اس کی قدرت وحکمت کا کامل ہونا۔ حمزہؒ اور کسائیؒ کی قرات میں اَلۡمَجِیۡدِ بکسرہ دال آیا ہے اسوقت یہ عرش کی صفت ہوگی عرش انوار رحمٰن کی جلوہ گاہ ہے تجلیات رحمانیہ سے اس کو خصوصیت حاصل ہے یہی اس کی عظمت ہے۔

فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ﴿۱۶﴾　وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اس کو کوئی عاجز کرنے والا نہیں نہ اس کو اس کی مراد سے کوئی روک سکتا ہے اِنَّهٗ هُوَ یُبۡدِئُ وَیُعِیۡدُ پورا جملہ معترضہ ہے جو اللہ کی ستائش کو ظاہر کر رہا ہے اور اس سے یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ مومنوں کے ساتھ اللہ مودت ومغفرت کا برتاؤ کرنے والا ہے اور کافروں کو طرح طرح کے عذاب دینے والا ہے۔

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِیۡثُ الۡجُنُوۡدِ ﴿۱۷﴾　استفہام تقریری ہے یعنی تمہارے پاس آچکا ان کافروں کا قصہ جنھوں نے انبیاء کے خلاف جتھے جمع کئے تھے۔

فِرۡعَوۡنَ وَثَمُوۡدَ ﴿۱۸﴾　یہ اَلۡجُنُوۡدِ سے بدل ہے یا جنود محذوف ہے یعنی فرعون اور ثمود کی فوجوں کا قصہ تمہارے پاس آچکا ہے کہ ان کو ڈبو کر ہلاک کر دیا گیا یا ایک (غیبی) چیخ سے ان کا دم نکل گیا پھر انکو دوزخ میں داخل کر دیا گیا۔ تم اپنی قوم کی اس تکذیب پر صبر کرو اور ان کو اس عذاب سے ڈراؤ جو ان جیسے کافروں پر پہلے پہونچ چکا ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿١٩﴾ بلکہ تمہاری قوم کے یہ کافر تو نزول عذاب کے گزشتہ اقوام اور سابق امتوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہیں انھوں نے تو گزشتہ اقوام کی ہلاکت کے قصے سن بھی لئے اور ان کی بربادی کے نشانات بھی دیکھ لئے اسکے باوجود یہ قرآن کی تکذیب میں اسقدر منہمک ہیں کہ پچھلے کافر تکذیب انبیاء میں اتنا انہماک نہیں رکھتے تھے حالانکہ گزشتہ آسمانی کتابیں اعجازی نہیں تھیں اور قرآن کی عبارت بھی معجزہ ہے۔ تکذیب میں تنوین تعظیم ہے یعنی بڑی تکذیب۔

بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ بَلْ کلام سابق سے رخ پھیرنے کے لئے نہیں بلکہ ابتدائیہ ہے جس کا معنی ہے۔ لیکن۔ اور جملہ استدراکیہ ہے جس کا ربط جواب قسم سے ہے اور درمیانی تمام جملے معترضہ ہیں۔ مطلب اس طرح ہوگا لیکن یہ کافر تو تکذیب میں گھرے ہوئے ہیں۔ فِيْ تَكْذِيْبٍ میں ظرفیت اعتباری ہے (حقیقی نہیں۔ تکذیب نہ تو زمان ہے نہ مکان) گویا وصف تکذیب کافروں کو اسطرح ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے جیسے مکان یا زمان اپنے اندر کی چیز کو گھیر لیتا ہے۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿٢٠﴾ اور اللہ ان کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے اللہ کا محیط ہونا باحاطہ ذاتیہ ہے لیکن یہ احاطہ بلا کیف ہے۔ محیط کا محاطہ سے قرب اور اس پر قابو ضرور اس احاطہ کے لئے لازم ہے پس اللہ ان کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور انسے انتقام لینے پر قابو رکھتا ہے ممکن نہیں کہ اس کی گرفت سے یہ لوگ باہر ہو سکیں۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ بزرگی اور شرف والا تمام کتابوں میں عالی مرتبہ۔ یکتا بے مثال جس کی عبارت بھی اعجازی ہے اور معنی بھی۔ اس جملہ کا بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے معنوی ربط ہے مطلب یہ کہ کافروں کی طرف سے تکذیب قرآن میں حقانیت کا شائبہ بھی نہیں قرآن کی تکذیب تو وہ شخص کر ہی نہیں سکتا جسکو عبارت و معنی کا کچھ بھی شعور ہو۔

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے لوح محفوظ کو سفید موتی کا بنایا ہے اس کے صفحات سرخ یاقوت کے قلم نور کا اور تحریر نور کی ہے ہر روز کے تین سو ساٹھ لمحات میں اللہ پیدا کرتا، رزق دیتا موت اور زندگی عطا کرتا عزت اور ذلت دیتا اور جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔

بغویؒ نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ سر لوح پر لکھا ہوا ہے اللہ اکیلا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا دین اسلام ہے محمد ﷺ اس کے رسول اور بندے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھے گا اللہ کے وعدہ کی تصدیق کریگا اور اس کے پیغمبروں کا اتباع کریگا اللہ اسکو جنت میں داخل کریگا۔ لوح محفوظ سفید موتی کی ہے اس کا طول اتنا ہے جتنا زمین سے آسمان اور عرض اتنا ہے جیسے مشرق سے مغرب اس کے دونوں کنارے موتی اور یاقوت کے ہیں اور (اول آخر کے) دونوں پٹھے یاقوت سرخ کے اس کا قلم نور کا اور تحریر نور کی ہے وہ عرش سے وابستہ ہے اس کی جڑ ایک فرشتہ کی گود میں ہے۔ مقاتل نے کہا لوح محفوظ عرش کے دائیں طرف ہے۔

محفوظ لوح کی صفت ہے لوح شیطانوں سے اور کمی بیشی سے محفوظ ہے اسی لئے اس کو لوح محفوظ کہا جاتا ہے۔ یہ ام الکتاب بھی ہے اسی سے الکتاب (یعنی قرآن) کو نقل کیا گیا ہے۔ نافع کی قرآت میں محفوظٌ آیا ہے اسوقت یہ قرآن کی صفت ہوگی اللہ نے فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اس لئے ممکن نہیں کہ اس میں کسی دوسری عبارت کا الحاق کردیا جائے اللہ خود اس کا محافظ ہے اور اس کی عبارت بھی اعجازی ہے نہ اس میں ردوبدل ممکن ہے نہ کچھ حذف کردینا۔ رافضی کہتے ہیں کہ غیر قرآن کو قرآن کے ساتھ ملادیا گیا ہے اور بقدر دس پاروں کے حذف کردیا گیا ہے اس لئے چالیس کے بجائے تیس رہ گئے اور یہ تیس بھی بگڑے بگڑائے ہیں پس ان پر آیات بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ پڑیگی۔

واللہ اعلم۔ سورۃ البروج ختم ہوئی۔ بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ الطارق

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۷ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلبی نے کہا ابو طالب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کچھ روٹی اور دودھ پیش کیا۔ آپ ﷺ بیٹھے کھا رہے تھے کہ ایک تارا ٹوٹا جس کی چمک سے وہاں کی ہر چیز روشن ہو گئی ابو طالب نے گھبرا کر کہا یہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تارا (کسی شیطان کے) مارا گیا تھا اور یہ قدرت خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ابو طالب کو یہ سن کر تعجب ہوا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ آسمان کی اور ٹوٹنے والے تارے کی قسم۔ الطارق اصل لغت کے اعتبار سے راستہ پکڑنے والا۔ عرف عام میں رات کو آنیوالا۔ پھر استعمال میں نمودار ہونے والے کو بھی طارق کہہ لیا جاتا ہے۔ اس جگہ الطارق مجمل ہے تشریح اگلی آیت میں کی گئی۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ تارے ٹوٹنے کے فوائد چند در چند ہیں شیطانوں کو مار کر نکالنا۔ آسمان کی سجاوٹ (نشان قدرت دکھا کر) بندوں کو ڈرانا وغیرہ پس ممکن ہے کہ اسی امر کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے استفہام کا استعمال کیا گیا ہو (اور اگر استفہام کو تعظیم کے لئے نہ قرار دیا جائے تو بہر حال کلام مجمل ہو گا جس کی تشریح آئندہ آیت میں ہے)

اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اَلنَّجْمُ کوئی تارہ۔ الف لام جنسی ہے۔ یا کوئی ٹوٹنے والا جو شیطانوں کے مارا جاتا ہے (اس وقت بھی الف لام جنسی ہو گا) یا الف لام عہدی ہے اور ثریا مراد ہے یہ قول ابن زید کا ہے۔ عرب ثریا کو النجم کہتے ہیں۔ یا زحل مراد ہے۔ زحل چونکہ بلند ہے اس لئے اس کو اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ کہا گیا پرندہ اگر او نچا اڑ کر جہت بلندی پر پہونچ جائے تو عرب کہتے ہیں قد ثقب اس قول کی صحت یونانی حکماء کے اس خیال پر مبنی ہے کہ زحل ساتویں آسمان میں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ الثاقب کا معنی ہے چمکدار جگمگاتا ہوا (کیونکہ ثقب کے معنی ہے سوراخ کرنا پار ہو جانا) ٹوٹنے والا اپنی روشنی سے تاریکی میں سوراخ کر دیتا ہے۔ روشنی تاریکی کے پار ہو جاتی ہے۔ مجاہد کا یہی قول ہے۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ ابن عامر۔ عاصم اور حمزہ کی قرات میں لَمَّا میم کی تشدید کے ساتھ آیا ہے اور بنی ہذیل کے محاورہ میں لَمَّا استثنائیہ آتا ہے۔ اس صورت میں اِنْ نافیہ ہو گا۔ ترجمہ اس طرح ہو گا نہیں ہے کسی حالت میں کوئی نفس مگر اس پر نگراں موجود ہے۔ دوسرے اہل قرات نے لَمَا بغیر تشدید کے پڑھا ہے اسوقت اِنْ کو مخففہ کہا جائیگا اصل میں اِنَّ (حرف مشبہ بالفعل) تھا اِنْ کا اسم محذوف ضمیر ہے۔ لَمَا میں لام تاکیدی ہے اور مَا کو مزید تاکید کیلئے ذکر کیا گیا (یعنی ما موصولہ نہیں نہ نافیہ ہے)

مطلب اس طرح ہو گا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر نفس انسانی پر بلاشک وشبہ رب کی طرف سے کوئی نگراں مقرر ہے جو اسکے اعمال کی نگرانی کرتا اور ہر نیکی بدی کو احاطہ کے ساتھ لکھ لیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ فرمایا یہ نگراں ملائکہ میں سے ہیں۔

بعض نے حافظ کا ترجمہ نگہبان کیا ہے یعنی ہر شخص کا ایک نگہبان موجود ہے جو آفات سے اس کی حفاظت رکھتا ہے اور جب اس کی مدت زندگانی اور رزق کی تکمیل ہو چکتی ہے تو وہ مر جاتا ہے حافظ سے مراد مفہوم جنسی ہے ایک حافظ ہو یا زیادہ

(گویا حافظ سے صیغہ اسم فاعل مذکر مفرد مراد نہیں بلکہ نگرانی یا نگہبانی رکھنے والی شخصیت مراد ہے خواہ وہ ایک ہو یا چند ہوں) اب اس آیت میں اور آیت وان علیکم لحافظین میں کوئی تضاد نہیں رہا (اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں حافظ صغیہ مفرد ہے اور موخر الذکر آیت میں حافظین بصیغہ جمع ہے) یا یہ مراد ہے کہ حافظ تو خدا ہے اور حفاظت کرنے والے (ملائکہ) اسی کے حکم سے نگرانی رکھتے ہیں پس فرشتوں کے عمل کی اللہ کی طرف نسبت کر دی گئی۔ دونوں قرأتوں پر یہ جملہ جواب قسم ہے۔

ابن ابی حاتمؒ نے عکرمہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ابواسد (مشہور پہلوان) جانور کے کچے چمڑے پر کھڑا ہو کر کہتا تھا اے گروہ جو محمد ﷺ کو ایذا دیگا اس کے لئے اتنا اتنا انعام ہے۔ ابواسد یہ بھی کہتا تھا کہ محمد ﷺ کہتے ہیں جہنم کے کارندے انیس ہیں۔ دس کے لئے تو میں کافی ہوں باقی نو سے تم نمٹ لینا۔ اس پر ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ فاء سببی ہے نگراں فرشتوں کا وجود (اور ہر چھوٹے بڑے عمل کے اندراج کا اندیشہ) اس امر کا سبب ہے کہ آدمی اپنے حالات پر غور کرے تاکہ اپنے تخلیقی احوال سے دوبارہ تخلیق کی صحت پر استدلال کر سکے اور اس کے لئے اللہ اور رسول کو ماننا ان کے احکام پر چلنا اور ممنوعات سے اجتناب رکھنا لازم ہو جائے مِمَّ میں مِنْ ابتدائیہ اور مَا استفہامیہ ہے اور مِمَّ خُلِقَ پورا جملہ یَنْظُر کا مفعول ہے (یعنی مادہ تخلیق کی حالت پر غور کرے کہ اسکو کس چیز سے پیدا کیا گیا) اس استفہام کے جواب میں خود ہی فرمایا۔

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ اسکو پانی یعنی منی سے پیدا کیا اس سے مراد وہ مخلوط نطفہ ہے جو عورت اور مرد کے پانی سے مل کر بنتا ہے۔

دَافِقٍ ۝ کودنے والا دافق اسم فاعل ہے پانی کی طرف دفق کی نسبت مجازی ہے یا اسم فاعل بمعنی اسم مفعول ہے جیسے عیشۃ راضیۃ میں راضیۃ (پسند کرنے والی) کا معنی مرضیۃ (پسندیدہ) ہے دفق کا معنی ہی یکدم بہنا۔ اسوقت ماء کی طرف دافق کی اسناد حقیقی ہوگی۔

يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ صلب پشت صراح میں ہے صلب کا معنی ہے مضبوط۔ مضبوطی کی وجہ سے ہی (اعضاء انسانی میں سے) پشت کو صلب کہا جاتا ہے۔ اس جگہ صلب سے مراد ہے مرد کی پشت۔ الترائب عورت کے سینہ کی ہڈیاں۔

قاموس میں ہے۔ ترائب سینہ کی ہڈیاں یا وہ ہڈیاں جو دونوں طرف ہنسلی کی ہڈیوں سے ملی ہوئی ہیں یا وہ ہڈیاں جو چھاتیوں اور ہنسلیوں کے درمیان ہیں یا سینہ کے دائیں بائیں جانب کی چار چار پسلیاں یا دونوں ہاتھ و دونوں ٹانگیں اور دونوں آنکھیں یا ہار ڈالنے کی جگہ۔ بیضاوی میں ہے کہ چوتھے ہضم کے جوہر اعلیٰ سے نطفہ بنتا ہے اور تمام اعضاء سے کھنچ کر آتا ہے۔ دونوں خصیوں کی رگوں کا جال نطفہ کی قرارگاہ ہے۔ نطفہ کی پیدائش میں سب سے بڑا مددگار دماغ ہوتا ہے۔ اسی لئے جماع کی زیادتی سے دماغی ضعف بہت پیدا ہو جاتا ہے تولید نطفہ کے لئے دوسرا نمبر حرام مغز کا ہے حرام مغز پشت (کے مہروں) کے اندر ہوتا ہے اس کی بکثرت شاخیں سینہ کی ہڈیوں تک پھیلتی ہیں ظروف منی سے زیادہ قرب صلب اور ترائب کو ہی ہوتا ہے اسی لئے خصوصیت کے ساتھ آیت میں انہی دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ اِنَّهٗ میں ضمیر خالق کی طرف لوٹتی ہے خالق کو لفظاً ذکر نہیں ہے مگر خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ سے اس کا مفہوم سمجھ میں آرہا ہے مطلب یہ کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر خالق یقیناً قدرت رکھنے والا ہے۔ کذا قال قتادہ۔

کیونکہ اول تخلیق دوبارہ تخلیق کے امکان کو بتا رہی ہے جس نے پہلی بار پیدا کیا اس کی قدرت کا انکار درست نہیں جبکہ ایک مخبر صادق جس کی صداقت معجزات سے ثابت ہے۔ خالق کے وجود قدرت کی اطلاع بھی دے رہا ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ یعنی انسان کو اس روز دوبارہ پیدا کیا جائیگا جس روز پوشیدہ اعمال اور مخفی عقائد اور دلوں

میں چھپی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ ہر راز کو ظاہر کر دیگا پوشیدہ راز چہروں پر نمودار ہو جائے گا۔

فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾ جب منکر قیامت آدمی دوبارہ پیدا ہو جائیگا تو اس کے پاس نہ اپنی ذاتی قوت ایسی ہو گی جس کی وجہ سے عذاب سے بچ سکے نہ کوئی ایسا مددگار ہو گا جو مدد کر کے عذاب سے بچا لے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ بارش والے آسمان کی قسم (رجع لوٹانا) بارش کو رجع کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر سال بارش لوٹ لوٹ کر آتی ہے۔ آسمان صاحب رجع ہے یعنی آسمان کے جس حصہ سے ستارے حرکت شروع کرتے ہیں ۲۴ گھنٹہ میں یا ایک مہینہ میں یا ایک سال بھر میں اسی مقام پر آجاتے ہیں۔

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ اور شگاف والی زمین کی قسم سبزہ پیدا ہونے اور چشمے پھوٹنے سے اور بعض دوسری وجوہ سے زمین میں شگاف پیدا ہوتے ہیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ بلاشبہ قرآن حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا ہے

وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾ اور وہ کھیل اور دل لگی نہیں ہے بلکہ واقعی حقیقت ہے قرآن کا تقاضا ہے کہ اس کو پڑھنے اور سننے والا پڑھنے اور سننے کے وقت دل لگی اور مزاح میں مبتلا نہ ہو بلکہ قلبی خشوع سے اس کی طرف متوجہ ہو۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ اہل مکہ اللہ کے رسول سے مکاری کرتے ہیں۔ باطن کے خلاف اظہار کرتے ہیں یا یہ مطلب کہ رسول اللہ ﷺ کے کام کو بگاڑنے اور نور حق کو بجھانے کی ہر تدبیر کرتے ہیں۔

وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ اور میں بھی پوشیدہ تدبیر کرتا ہوں۔ اللہ کی تدبیر کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو ڈھیل دیتا رہتا ہے اللہ کی طرف سے ڈھیل دینے کا ان کو پتہ نہیں چلتا یا یہ مطلب کہ ان کے فریب کی سزا آخرت میں ان کو دوں گا۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ تم بھی ان کو مہلت دو یعنی ان سے انتقام لینے میں مشغول نہ ہو یا بددعا کر کے ان کے ہلاک کئے جانے کی فوری طلب نہ کرو۔ اول مطلب پر آیت قتال والی آیت سے منسوخ قرار دی جائیگی۔

اَمْهِلْهُمْ یہ حکم مہلت کی تاکید ہے مَهِّلْ (باب تفعیل) اَمْهِلْ (باب افعال) میں لفظ کا تغیر محض تحسین لفظی یا تسکین کے لئے ہے۔

رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾ کسی قدر۔ رُوَيْدًا یعنی قدرے مہلت دینا۔ یا روید۔ ارواد کی تصغیر ہے اس میں تصغیر ترخیم ہے یعنی حروف زوائد حذف کرنے کے بعد تصغیر کی گئی ہے اسکا مادہ رود ہے رود آہستہ حرکت کرنا رادت الریح ہوا آہستہ آہستہ چلی۔
بغیر تصغیر کے اس کا استعمال عربی میں نہیں آیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کی طرف سے یہ گرفت کی دھمکی ہے چنانچہ بدر کی لڑائی میں اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔

ع ۱۷ / ۱۱

(سورۃ الطارق ختم ہوئی بعونہ و حمدہ)

سورۃ الاعلیٰ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۹ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿١﴾ اپنے مالک برتر کے نام کو پاک رکھو یعنی اس کے نام میں نہ کوئی الحاد کرو نہ کسی دوسرے پر اس کے نام کا اطلاق کرو۔ یا تنزیہ اسم رب سے مراد ہے کہ تعظیم واحترام کے ساتھ اللہ کا نام لو اور اپنی طرف سے اس کا کوئی نام مقرر نہ کرو بلکہ وہی نام لو جو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کئے ہیں یا اپنے پیغمبر کی زبانی ظاہر فرمائے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت میں اسم سے مراد ذات مسمی ہے جیسے آیت مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ میں اسماء سے مراد مسمی ہیں۔

بعض علماء کے نزدیک لفظ اسم زائد ہے مراد یہ ہے کہ زبان سے اپنے رب کی پاکی بیان کرو اور بے دین لوگ جو رب کی صفات بیان کرتے ہیں ان سے اللہ کا پاک ہونا ظاہر کرو۔ اس تقدیر پر آیت میں تسبیح قولی کا امر ہوگا۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بغوی نے اپنی سند سے بحوالہ حضرت ابن عباسؓ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى پڑھ کر کہا سبحان ربی الاعلی (گویا رسول اللہ ﷺ نے سمجھا کہ آیت میں تسبیح قولی کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی لئے تعمیل حکم کرتے ہوئے سبحان ربی الاعلیٰ فرمایا)

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آیت میں ہر تنزیہ کا حکم ہے زبانی ہو یا عملی یا اعتقادی۔ تخصیص قولی کی کوئی وجہ نہیں۔ حدیث سے بھی قول کے ساتھ تنزیہ کو مخصوص کر لینے کی کوئی دلیل مستفاد نہیں ہوتی بلکہ تسبیح کی ایک خاص صورت یعنی زبان سے قولی تسبیح کرنا اور دل سے اس کے موافق عقیدہ رکھنا جو لفظ تسبیح کا ایک محتمل معنی ہے مراد ہے بغیر تائید قلبی کے لفظی تسبیح تو ناقابل اعتبار ہے۔ بغوی نے کہا کہ اس آیت میں (بقول حضرت ابن عباسؓ) نماز کا حکم ہے (کیونکہ آیت کی تشریح میں) آپ ﷺ نے فرمایا صل بامر ربک الاعلی اپنے رب برتر کے حکم سے نماز پڑھو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ نماز میں زبان سے تسبیح پڑھنا مراد ہو کیونکہ سورۃ الحاقہ میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے ہم نے حدیث بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو تم اپنے سجود میں (داخل) کر لو۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں سبحان ربی الاعلی پڑھتے تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔ رکوع اور سجود کی تسبیحات کا مسئلہ ہم الحاقہ میں بیان کر چکے ہیں یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اَلْاَعْلٰی رب کی صفت ہے فعل تسبیح کی علت اور وجہ شان رب کی برتری ہے اللہ کی شان کار سائی عقل سے ماوراء ہونا اور اس کا اقتدار و تسلط اجازت نہیں دیتا کہ اس کے خود مقرر کردہ ناموں کے علاوہ کوئی اور نام اس کا رکھا جائے اس کی شان کی برتری کا تقاضا ہے کہ بے دینوں اور کج فہموں کے بیان کردہ اوصاف سے اس کو پاک سمجھا جائے۔

الَّذِيْ خَلَقَ جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا مفعول کے عموم کو بتانے کے لئے خلق کا مفعول حذف کر دیا گیا یعنی اس نے تمام جواہر (مستقل وجود رکھنے والی چیزیں جیسے آسمان زمین تمام عناصر و ملائکہ اور حیوانات نباتات جمادات وغیرہ) اور اعراض

(مستقل وجود نہ رکھنے والی چیزیں جیسے مختلف رنگ شکل ہیت آواز تمام کیفیات اور مقادیر وغیرہ) اور انسان کے تمام اعمال پیدا کیے۔[1]

فَسَوّٰی ﴿۲﴾ یعنی پھر اس نے ہر چیز کے اجزاء متناسب اور متوازن بنائے یا یہ مطلب ہے کہ جن نا قابل تصور منافع اور مصالح کے پیش نظر اس نے بنانا چاہا ٹھیک ویسا ہی بنادیا یا یہ معنی ہے کہ نظام کائنات کا جیسا تقاضا تھا ویسا ہی اس نے بنادیا۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ جیسا بنادیا گیا اس سے بہتر ممکن ہی نہیں یعنی نظم کائنات کے تقاضے کے مطابق کوئی تخلیق موجودہ تخلیق سے بہتر ممکن نہیں۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ کسائی کی قرات میں قَدَرَ بغیر تشدید کے آیا ہے یعنی وہ ہر ممکن پر قادر ہے۔ مشہور قرات تشدید دال کے ساتھ ہے۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی اللہ نے اپنی مشیت کے مطابق تمام چیزوں کے اجناس انواع افراد مقادیر احوال افعال رزق اور مدت بقاء کو مقرر کردیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آسمان وزمین کی آفرینش سے پچاس ہزار برس پہلے ساری مخلوق کے مقدرات کو مقرر فرمادیا تھا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ رواہ مسلم۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ہر چیز مقدر ہے یہاں تک کہ فہم کی نارسائی اور ہوشیاری بھی۔ رواہ مسلم

فَهَدٰی ﴿۳﴾ یعنی خیر ہو یا شر جس غرض کے لئے اللہ نے پیدا کیا اسی کا راستہ بتادیا۔ مجاہد نے کہا انسان کو اچھائی برائی اور سعادت وشقاوت کا راستہ بتادیا اور حیوان کو چراگاہوں کا۔ مقاتلؒ اور کلبیؒ نے کہا نر کو مونث سے جفتی کا طریقہ بتادیا۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے اشیاء کے منافع پیدا کئے اور انسان کو ان کے حاصل کرنے کا طریقہ بتادیا۔

سدی نے کہا شکم مادر کے اندر بچہ کے رہنے کی مدت مقرر کردی اور باہر نکلنے کا راستہ اسکو بتادیا۔ یا یہ معنی ہے کہ اللہ نے جسکو ہدایت کرنا چاہا اسکو ہدایت کردی اور جسکو گمراہ کرنا چاہا اس کو گمراہ کردیا پورا کلام اس طرح تھا فَهَدٰی واضل اضل کو

---

[1] یونانی فلاسفہ اور متکلمین اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ سارا عالم جواہر اور اعراض سے بنا ہے اہل کلام جواہر کو اعیان کہتے ہیں۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ جو چیز اپنے خارجی وجود اور تحقق میں دوسرے کی تابع نہ ہو وہ جوہر ہے اور تابع ہو تو عرض ہے مثلاً درخت پتھر جانور وغیرہ اپنی ایک ہستی رکھتا ہے اور اپنی ہستی میں کسی کا تابع نہیں اور رنگ شکل وغیرہ اعراض ہیں ان کی اپنی ہستی کوئی مستقل نہیں بلکہ رنگین کے اندر رنگ اور مشکل کے اندر شکل کی ہستی ہی رنگ اور شکل کی ہستی ہے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ جو چیز اپنا مستقل مکان رکھتی ہے اور تحیز میں دوسرے کی تابع نہیں وہ عین ہے ورنہ عرض۔ فلاسفہ کے نزدیک اللہ کے علاوہ ہر چیز ممکن بالذات ہے لیکن قدیم بالغیر آسمان کا مادہ اور صورت خاص جو اس وقت ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اگرچہ علت العلل یعنی واجب بالذات کی محتاج اور معلول ہے اسی طرح عالم عناصر کا مادہ اور صورت مطلقہ قدیم بالغیر ہے پس واجب اس عالم کی علت ہے لیکن غیر ارادی۔ خالق نہیں ہے یعنی عدم سے وجود میں لانے والی نہیں ہے عالم کبھی معدوم نہ تھا کہ اسکو موجود کیا جاتا جسطرح آگ حرارت کی اور سورج شعاعوں کی اور ہاتھ کی حرکت کنجی کی حرکت کی علت ہے لیکن حرارت کا وجود آگ کے وجود سے اور شعاعوں کا وجود سورج کے وجود سے اور حرکت مفتاح کا وجود حرکت دست کے وجود سے موخر نہیں۔ ذاتی تقدم و تاخر ہے زمانی تقدم تاخر نہیں لیکن اہل کلام اور جمہور اہل اسلام حسب نص قرآنی بالاجماع قائل ہیں کہ ہر چیز حادث ہے یعنی پہلے نہ تھی۔ ہر چیز کو نیست سے ہست کرنیوالا اور عدم سے وجود میں لانیوالا اللہ ہے وہ علت نہیں ہے بلکہ خالق ہے اس کائنات کا مادہ اور صورت سب کچھ ہالک الاصل اور فانی ہے عدم مطلق کے بعد انکا وجود ہوا۔ اہل اسلام میں فرقہ قدریہ کا خیال ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہے اگر خود خالق نہو تو سزا جزا کا مستوجب بھی نہیں ہو سکتا اشاعرہ کا قول ہے کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے انسانی عمل خواہ اچھا ہو یا برا وہ بھی خدا ہی کی مخلوق ہے انسان کاسب ہے اور کسب اختیاری کی وجہ سے وہ سزا جزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ حضرت مولفؒ کے قول میں اسی طرف اشارہ ہے کہ خلق کے مفعول کا حذف اشاعرہ کے قول کی تائید کر رہا ہے۔

حذف کر دیا کیونکہ آیت یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ میں یَفْعَلُ آ گیا ہے (قرینہ موجود تھا اس لئے اس جگہ اضلال کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی)

وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ یعنی وہ سبزہ اگایا جسکو چوپائے چرتے ہیں۔

فَجَعَلَهٗ غُثَآءً پھر سبزی کے بعد اس کو خشک اور ریزہ ریزہ کر دیا۔

اَحْوٰى ۝ سیاہ یہ غُثَآءً کی صفت ہے۔ بعض علماء نے مَرْعٰی سے حال قرار دیا ہے یعنی گھاس کو گہری سبزی کی وجہ سے اس نے سیاہ سبزی مائل بنا دیا۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝ ہم یقیناً تم سے پڑھوائیں گے تم (جبرائیلؑ کی قرأت) نہیں بھولو گے چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں بھولے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح جبرائیلؑ کی زبانی ہم نے قرآن نازل کیا اسی طرح تمہارے دل میں ہم اسکی قرات الہام کر دینگے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اصل لفظ فلا تنس (بصیغہ نہی) ہے سین کے بعد الف کی زیادتی فواصل آیات کی رعایت سے کر دی گئی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قرآن کی نگہداشت کرو۔ قسم ہے اس کی جس کی ہاتھ میں میری جان ہے جسطرح اونٹ اپنے زانو بند سے چھوٹ کر بھاگتا ہے قرآن (اگر اس کی طرف سے غفلت کی جائے تو) اس سے بھی زیادہ تیزی سے نکل جانے والا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اس طرح کی روایت آئی۔ (مسلم و بخاری) حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ صاحب قرآن کی حالت اس شخص کی طرح ہے جو زانو بندھا ہوا اونٹ رکھتا ہے اس کی نگہداشت کرتا رہتا ہے تو روکے رکھتا ہے اور کھول دیتا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔ حضرت سعد بن مسعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص قرآن پڑھ کر بھلا دیتا ہے وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے کوڑھی ہو کر جائیگا۔ ابوداؤد و دارمی۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ مگر جس کا فراموش کیا جانا اللہ چاہیگا وہ تم کو فراموش ہو جائیگا۔ تفسیر جمہور کے موافق اس سے مراد قرآن کا وہ حصہ ہے جس کی تلاوت بھی منسوخ ہو گئی اور حکم بھی جیسے آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا میں فرمایا ہے۔ انساء (فراموش کرا دینا) بھی نسخ ہی کی قسم ہے اس تشریح کی بناء پر آیت میں دو طرح کا معجزہ ہے۔

(۱) نسیان بالکل نہ ہونا۔ باوجودیکہ نسیان انسان کے فطری عوارض میں سے ہے۔

(۲) آئندہ ہونے والی چیز کی پہلے سے خبر دینا (یہ کل تفصیل اس صورت میں ہو گی جب فَلَا تَنْسٰۤى کو فعل منفی قرار دیا جائے) لیکن اگر اس کو صیغہ نہی کہا جائے (اور آخر کے الف کو زیادہ قرار دیا جائے) تو استثناء کا معنی یہ ہو گا کہ قرآن کی یادداشت اپنی طاقت کے موافق واجب ہے لیکن اگر خدا ہی فراموش کرا دینا چاہے تو آدمی معذور ہے۔

اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰى ۝ بے شبہ اللہ ظاہر قول و فعل کو بھی جانتا ہے اور پوشیدہ گفتار و اطوار کو بھی۔ یعنی ظاہر باطن دونوں سے واقف ہے تم جبرائیلؑ کے ساتھ اونچی آواز سے پڑھتے ہو اور اس قرات کا سبب یعنی اندیشۂ نسیان (دل میں) پوشیدہ ہوتا ہے۔ دونوں خدا کو معلوم ہیں۔

اس سے آگے ہمارے پیش نظر نسخہ میں ایک حدیث ناتمام مذکور ہے جو موجودہ الفاظ میں بالکل بے معنی ہے لکھا ہے۔ حتی یتکلم رسول الله صلى الله عليه وسلم باولها مخافة ان ینساها فانزل الله تعالى سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى - وفی اسناده جویبر ضعیف جدا وکذا قال مجاهد والکلبی الخ ظاہر ہے کہ حَتّٰی یَتَکَلَّمَ کا تعلق کسی پہلے کلام سے ہے جو سہو کاتب کی وجہ سے لکھنے سے رہ گیا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پورے کلام کا مفہوم نقل کر دیں جسکو شیخ ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔ حضرت جبرائیلؑ جب وحی لے کر آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نازل کردہ کلام پڑھتے تھے تو رسول اللہ ﷺ قرات جبرئیلؑ کے دوران میں ہی جو کچھ جبرئیلؑ سے سنتے اس کو شروع ہی سے پڑھتے جاتے تھے تاکہ پہلی آیت نہ بھول جائیں اسپر اللہ نے آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى نازل فرمائی اس صورت میں اس آیت کا مفہوم وہی ہو گا جو آیت لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ کا ہے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿۸﴾ یعنی ہم تم کو توفیق دینگے تمہارے لئے اعمال جنت کو آسان کر دینگے اور اعمال جنت میں سے نزول کے مطابق قرآن کی قرات اور اسکی یاداشت اور اسکے مطابق عمل بھی ہے (اس لئے اس کی توفیق بھی ہم ہی دینگے) جملہ مذکورہ کے الفاظ میں کچھ الٹ پھیر ہے اصل کلام نیسر الیسری لک (ہم تمہارے لئے آسانی پیدا کر دینگے) تھا۔ کلام کی ساخت الٹنے سے مضمون میں مبالغہ ہو گیا اصل کلام میں سہولت مطلوب تھی اور رسول اللہ ﷺ طالب الٹنے کے بعد سہولت طالب ہو گئی اور رسول مطلوب (جیسے آدمی رزق کا طالب ہے اور رزق مطلوب لیکن اگر رزق کا ملنا یقینی اور ضروری ہو تو کہا جاتا ہے تمہارا رزق تم کو ڈھونڈتا پھرتا ہے) میں کہتا ہوں کہ خالص محبوبیت کی یہی شان ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یُسْرٰی (سے مراد) اچھا عمل ہے بعض علماء نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم کو آسان اور صحیح شریعت کی توفیق دینگے۔

فَذَكِّرْ فا سببی ہے یعنی جب قرآن اور شریعت کو ہم نے تمہارے لئے آسان کر دیا تو اسکے ذریعے سے دوسروں کو ہدایت کرو۔

اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿۹﴾ گزشتہ حکم کا مضمون جزاء پر دلالت کر رہا ہے اس لئے اس شرط کو جزاء کی ضرورت نہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ بار بار نصیحت کرنے کے باوجود بعض لوگوں کے ایمان لانے سے مایوس ہونے کے بعد پھر (حکم تذکیر کے بعد) اس جملہ شرطیہ کو لانے سے غرض یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جان کو دکھ میں نہ ڈالیں اور ان بے ایمانوں کی حالت پر افسوس نہ کریں جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (آپ ایمان لانے پر ان کو مجبور کرنے والے نہیں ہیں) بعض عالموں نے کہا ہے یہ بظاہر شرطیہ کلام ہے لیکن حقیقت میں بے ایمانوں کی مذمت اور نصیحت کے اثر آفریں نہ ہونے کا اظہار ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعظ و نصیحت اور امر و نہی اس وقت واجب ہے جب اس کی اثر آفرینی کا گمان ہو اسی لئے اعراض کرنے والے سے رخ گردانی کا حکم دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ شرط کا ایک ٹکڑا محذوف ہے اصل اس طرح تھا نصیحت کرو خواہ نصیحت فائدہ رساں ہو یا نہ ہو جیسے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ میں وَالْبَرْدَ محذوف ہے۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾ یہ فائدہ اٹھانے والے کا ذکر ہے یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہی نصیحت اندوز اور منفعت گیر ہوگا۔ کیونکہ وہی نصیحت پر غور کریگا اور اللہ کے عذاب کے ڈر سے عمل کریگا۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقٰى ﴿۱۱﴾ اور کافر نصیحت سے گریز کریگا۔ اَلْاَشْقٰى سے مراد ہر کافر کیونکہ مومن فاسق سے ہر کافر زیادہ بد نصیب ہوتا ہے (اور اَلْاَشْقٰى اسم تفضیل ہے) یا بد نصیب ترین کافر مراد ہے اس وقت اَلْاَشْقٰى میں الف لام عہد ہوگا اور معین کافر یعنی ولید بن مغیرہ ہو یا عتبہ بن ربیعہ مراد ہوگا۔

الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ جو جہنم کی آگ یا آگ کے نچلے طبقہ میں داخل ہوگا۔

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا پھر اسمیں نہ تو اسے موت آئے گی کہ مر کر عذاب سے چھوٹ جائے۔

وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾ اور نہ خوشگوار زندگی پائیگا۔ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ کا عطف يَصْلٰى پر ہے۔ نفس عذاب سے دوام عذاب زیادہ ہولناک ہے اور زمانہ کے لحاظ سے بھی موخر ہے اس طرح شدت اور وجود دونوں لحاظ سے دوامی عذاب نفس عذاب سے متراخی ہے اسی لئے ثم کا استعمال کیا گیا (جو کبھی تراخی زمانی اور کبھی تراخی مرتبہ پر دلالت کرتا ہے)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ یعنی جس کا باطن شرک سے اور ظاہر نجاست سے اور مال زکوٰۃ نہ دینے کے میل سے اور دل یاد الٰہی کی غفلت سے اور ضمیر نفسانی عیوب سے اور اعضاء جسمانی گناہوں کے میل کچیل سے پاک ہو گیا وہ کامیاب (مطلب یہ کہ زکوٰۃ سے جس نے مالی کثافت کو دور کیا اور نماز سے ظاہری نجاست کو اور ذکر خداوندی سے دل کی کدورت کو اور نفس کو امراض نفسانیہ کی آلائش سے اور اعضاء جسم کو گناہوں کی گندگی سے وہی نجات پا گیا۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ اور اپنے رب کی یاد کی اور نماز پڑھی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (یعنی) جس نے لا الہ الا اللہ کی شہادت دی اور اللہ کے شرکاء کو نکال باہر کیا اور

میرے رسول اللہ ہونے کی شہادت دی۔ اور ذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (کی تشریح میں) فرمایا یہ پانچ نمازیں اور ان کی نگہداشت واہتمام ہے۔

حنفیہ نے کہا ذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ سے تکبیر تحریمہ مراد ہے اسی بناء پر احناف کے نزدیک تکبیر افتتاح کو وہ نماز کا رکن نہیں قرار دیتے بلکہ شرط صلوات کہتے ہیں کیونکہ فَصَلّٰى میں فاء عطف ہے اور تعقیب کے لئے ہے اور عطف تعقیبی کا تقاضا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ جدا جدا ہوں اور معطوف علیہ معطوف کے بعد آئے (اور جزء کل سے جدا نہیں ہوتا اس لئے تکبیر تحریمہ جزء صلوٰۃ نہیں)

شبہ: عام خاص کو شامل ہوتا ہے اس کے باوجود عام پر خاص کا عطف بالاتفاق درست ہے پس اسی طرح (کل جزء کو شامل ہوتا ہے) اور کل کا عطف جزء پر ہوتا ہے (اسلئے صلوٰۃ کا عطف تکبیر تحریمہ پر کردیا گیا ہے)

جواب: خاص کا عطف عام پر کسی ادبی نکتہ کے زیر اثر ہوتا ہے (مثلاً خاص کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے جیسے صلوٰۃ وسطیٰ کا عطف صلوات پر کیا گیا ہے یا خاص کے علو مرتبہ کو بیان کرنے کیلئے جیسے جبرائیل کا عطف ملائکہ پر) اور کل کا عطف جزء پر نکتہ آفریں نہیں۔ نہ کلام عربی میں اسکی کوئی مثال ہے۔ اسی وجہ سے فرض نماز پر نفل کی بناء صحیح ہے اور نفل پر بھی نفل کی بناء درست ہے بلکہ ابوالیسر کا قول تو ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ فرض کی بنا نفل پر بھی درست ہے لیکن عام حنفیہ اس کو درست نہیں کہتے اور فرض پر فرض کی بناء کے بھی منکر ہیں۔

میں کہتا ہوں اگر تحریمہ کو شرط کہا جائے (تب بھی اس پر جواز بناء ضروری نہیں دیکھو نیت نماز کے لئے شرط ہے لیکن دو نمازیں ایک نیت سے صحیح نہیں اور وضو شرط صلوٰۃ ہے لیکن ابتداء اسلام میں ہر نماز کے لئے جدا وضوء کرنا واجب تھا۔ ہاں فرض پر نماز کی بناء جبعاً ضرور صحیح ہے جیسے ظہر کی نماز میں اگر کسی نے بھولکر پانچ رکعتیں پڑھ لیں اور قعدہ کر لیا تو چھٹی رکعت ملالے اور سجدہ سہو کرلے یہ آخری رکعتیں نفل ہو جائینگی۔

امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ دوسرے ارکان صلوٰۃ کی طرح جزء نماز ہے کیونکہ جیسے دوسرے ارکان ضروری ہیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے یہی رکن ہونے کی علامت ہے۔ حنفیہ کا قول ہے کہ نماز کی تمام بیرونی شرائط کی نگہداشت قیام کے اتصال کی وجہ سے ہے ورنہ فی ذاتہ اور بجائے خود ان کی ضرورت نہیں اسی لئے بدن پر یا کپڑوں پر نجاست ہو یا واجب الستر حصہ بدن کھلا ہوا ہو یا زوال آفتاب نہوا ہو یا قبلہ کی طرف منہ نہ ہو اور اس حالت میں تکبیر تحریمہ کہ لی جائے مگر تکبیر کا آخری لفظ کہتے کہتے یہ موانع دور ہو جائیں مثلاً خفیف عمل کے ساتھ ستر عورت کرلے اور زوال ہو جائے اور قبلہ کی طرف منہ کرلے تو نماز درست ہو جاتی ہے (کیونکہ قیام صلوٰۃ کے ساتھ جس جزء تحریمہ کا اتصال ہے وہ صحیح شرائط کے ساتھ اور صحیح رخ پر ہوا) کافی میں لکھا ہے کہ ہمارے بعض (حنفی) علماء کے نزدیک تکبیر تحریمہ بھی رکن ہے۔

طحاوی کا ظاہر کلام یہی ہے اس قول پر مذکورہ بالا تفریعات درست نہونگی۔

میں کہتا ہوں کہ ......

ممکن ہے کہ ذکر اسم رب سے مراد اذان اور اقامت ہو اس صورت میں تکبیر افتتاح کے رکن نہونے پر (اس آیت میں) کوئی دلیل نہ ہوگی۔ تَزَكّٰى اور ذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى سے بعض علماء کے نزدیک صدقہ فطر اور تکبیرات عید اور نماز عید مراد ہے۔ عطاء کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی تزکی کا ترجمہ تصدق کیا اور فرمایا جس نے صدقہ دیا پھر نماز پڑھی یہ فرمانے کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

نافعؒ کی روایت ہے کہ عبداللہ جب فجر کی نماز پڑھ لیتے یعنی عید کے دن۔ تو فرماتے نافع کیا صدقہ فطر دیدیا گیا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو عیدگاہ کو چلے جاتے اور نہ کہتا تو فرماتے اب دیدو بلاشبہ آیت قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى اسی بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ یہی قول ابوالعالیہ اور ابن سیرین کا ہے۔ بعض علماء نے کہا مجھے اس تفسیر کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ

یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں نہ عید تھی نہ زکوٰۃ نہ صدقہ فطر۔ بغوی نے اس کے جواب میں لکھا ہے ہو سکتا ہے کہ آیت کا نزول وقوع حکم سے پہلے کا ہو دیکھو وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ والی سورت مکی ہے۔ مگر حل کا وقوع فتح مکہ کے دن ہو گا اسی طرح آیت سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ کا نزول مکہ میں ہوا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ کونسی جماعت پشت پھیر کر بھاگے گی لیکن بدر کی لڑائی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ رسول ﷺ زرہ میں نہیں سماتے اور فرما رہے ہیں سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

میں کہتا ہوں کہ ....

سَيُهْزَمُ تو مستقبل کا صیغہ ہے اس لئے خرابی نہیں ہوتی اگر نزول پہلے ہو گیا ہو (اور واقعہ کا وقوع مستقبل میں ہو گیا ہو) لیکن اس جگہ تو آیت ذَکَرَ اور صَلّٰی ماضی کے صیغے ہیں یہاں تو وقوع سے پہلے کسی واقع کی نقل ممکن نہیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ صلوٰۃ سے مراد دعاء کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ اول بھی اللہ کی ثناء کی جائے اور آخر میں بھی۔

حضرت فضالہؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے نماز پڑھی پھر (قعدہ اخیرہ کے بعد) کہا کہ اے اللہ مجھے بخشدے اور مجھ پر رحم فرما حضور اکرم ﷺ نے فرمایا دعاء کرنے والے تو نے عجلت سے کام لیا جب تو نماز پڑھے اور (آخری قعدہ) میں بیٹھ جائے تو (اول) ان اوصاف کو بیان کر کے اللہ کی حمد کر جن کا وہ مستحق ہے اور مجھ پر درود پڑھ پھر اللہ سے دعا کر۔

راوی کا بیان ہے پھر ایک اور شخص آیا اور نماز پڑھی پھر (قعدہ اخیرہ میں) اللہ کی حمد کی اور رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھی حضور نے فرمایا اے نماز پڑھنے والے دعاء کر تیری دعاء قبول ہو گی۔ ترمذی۔ ابوداؤد اور نسائی نے اسی طرح کی روایت حضرت ابن مسعودؓ کی نقل کی ہے۔ حضرت ابن مسعود کا بیان ہے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ بھی حضور کے ساتھ موجود تھے جب میں بیٹھ گیا تو میں نے اللہ کی ثنا شروع کی پھر رسول اللہ ﷺ کے لئے دعاء کی پھر اپنے لئے دعاء کی حضور ﷺ نے فرمایا مانگ تیرا سوال پورا ہو گا مانگ تجھے ملے گا۔ ترمذی۔

ہمارے شیخ اعظم یعقوبؒ کرخی نے فرمایا آیت میں مدارج سلوک کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) توبہ اور تزکیہ کی طرف قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى سے اشارہ ہے۔

(۲) زبانی، قلبی، روحی اور سری ذکر کی پابندی کی طرف وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ سے اشارہ ہے

(۳) مشاہدہ کے دوام کی طرف (فصلی) سے اشارہ ہے کیونکہ نماز اہل ایمان کی معراج ہے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا میری آنکھ کے لئے خنکی نماز میں کر دی گئی ہے۔ نسائی، احمد، حاکم، بیہقی

میں یہ کہتا ہوں کہ تَزَكّٰى پر ذَكَرَ کا واؤ کے ساتھ اور صَلّٰى کا فاء کے ساتھ عطف طریقہ ذکر کی اس ترتیب کو بتا رہا ہے جس کا تذکرہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ تزکیہ نفس کے ذیل میں مجدد صاحب نے مبتدی کے لئے اسم ذات یا نفی و اثبات کے ذکر کو معین کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بغیر تزکیہ نفس کے نماز کا پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر تجلیات ذاتیہ اور تجلیات کی ترقی کے لئے مجدد صاحب نے نماز کی تعین کی ہے (کہ نماز کے بغیر تجلیات ذاتیہ کا نہ حصول ہوتا ہے نہ ان میں ترقی)

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ یعنی اے بدبختو تم نہ تزکیہ کرتے ہو نہ اللہ کی یاد کرتے ہو نہ نماز پڑھتے ہو بلکہ آخرت کی زندگی پر دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ حالانکہ آخرت کی زندگی بہتر ہے اس میں بڑی بڑی لذتیں ہیں تمام کدورتوں سے خالی ہے سب سے بڑی نعمت اللہ کا دیدار، وصال اور رضامندی ہے جو آخرت میں حاصل ہو گی۔

وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اور وہ لازوال بھی ہے دنیوی زندگی ایسی نہیں۔

اِنَّ هٰذَا بیشک یہ یعنی یہ مضمون جو قَدْ اَفْلَحَ سے چوتھی آیت تک مذکور ہے۔

لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی ﴿۱۹﴾ گزشتہ انبیاء کی آسمانی کتابوں میں مذکور ہے یہ آیت تمام دینی امور کو حاوی ہیں تمام کتب کا خلاصہ یہی ہے۔ مجملہ آسمانی کتابوں کے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفے بھی تھے ان میں بھی یہی مضمون مذکور ہے۔ صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی۔ اَلصُّحُفِ الْاُوْلٰی سے بدل بعض ہے۔ بزار نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سب ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں تھا۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ اِنَّ هٰذَا میں اس تمام مضمون کی طرف اشارہ ہے جو اس سورت میں بیان کیا گیا ہے۔

بعض احناف نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نماز کے اندر فارسی زبان میں قرآن پڑھنا جائز ہے کیونکہ اللہ نے بقدر تیسیر قرآن پڑھنے کا نماز میں حکم دیا ہے پھر یہ بھی فرمایا کہ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی اور اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ اور ظاہر ہے کہ قرآن کی یہ عربی عبارت تو گزشتہ آسمانی کتابوں میں نہیں تھی بلکہ اس عبارت کا مضمون تھا (پس جس زبان میں قرآن کا مضمون ادا کر دیا جائے اسکو نماز میں پڑھنا جائز ہوگا۔ گویا قرآن نام صرف معانی اور مضامین کا ہوا عربی عبارت قرآن نہیں)

میں کہتا ہوں ....

حنفیہ کا یہ استدال بے حقیقت ہے قرآن نام تو عبارت اور مضمون کے مجموعہ کا ہے دیکھو اللہ نے ارشاد فرمایا ہے قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ دوسری آیت ہے فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ عبارت ہر سورت کی معجز ہے اس لئے مثلہ سے مراد ہے ترتیب عبارت میں مثل ہونا (یعنی کوئی ایسی سورت پیش کرو جو طرز عبارت میں قرآن کی طرح ہو) اسی لئے اگر فارسی میں قرآن کا ترجمہ ہو تو بے وضوء اور بے غسل آدمی اسکو چھو سکتا ہے بلکہ جنب اور حائضہ کا اسکو پڑھنا بھی درست ہے رہا اس آیت میں مضمون کی طرف اشارہ یا آیت اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ میں ضمیر کا مضمون کی طرف لوٹنا تو یہ مجاز ہوا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن صرف مضمون کا نام ہو۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سورت یعنی سورۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی سے محبت رکھتے تھے احمد۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (وتر کی تین رکعتوں میں سے پہلی) دو رکعتوں میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الاعلی اور قُلْ یٰاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھتے تھے اور طاق رکعت (یعنی تیسری رکعت) میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے تھے۔ ابوداؤد۔ ترمذی، ابن ماجہ۔

حضرت ابی بن کعب کی روایت ابوداؤد اور ترمذی نے اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ابوداؤد، نسائی، احمد اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تو پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور دوسری میں قُلْ یٰاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ اور تیسری میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیر کی روایت ہے کہ عیدین اور جمعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ اور هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ پڑھتے تھے۔ مسلم۔ ابوداؤد نسائی اور ابن حبان نے بروایت سمرہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ اور هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ پڑھتے تھے

فائدہ: مجدد صاحب نے فرمایا کہ جس طرح سورہ الم نشرح کی (مرتبہ) نزول میں قوی تاثیر ہے

اسی طرح مرتبہ عروج میں اس سورت کا بڑا اثر ہے۔ سورۃ الاعلی ختم ہوئی۔ بعونہ ومنہ تعلیٰ

سورۃ الغاشیہ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۶ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمان الرحیم

هَلْ اَتٰىكَ　استفہام تقریری ہے یعنی بے شک آپ کے پاس آگئی۔

حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ①　ایسی ساعت جس کی شدتیں اور ہولناکیاں ہر چیز پر چھاجائیں گی بعض لوگوں نے کہا کہ الغاشیۃ سے مراد آگ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ لیکن اَلْغَاشِيَةِ کے بعد چونکہ صرف کافروں ہی کا ذکر نہیں بلکہ مومنوں کی حالت کا بھی بیان ہے اس لئے اَلْغَاشِيَةِ سے ساعت ہی مراد لینی صحیح ہے۔

وُجُوْهٌ　تنوین کثرت کو ظاہر کر رہی ہے بہت چہرے یا تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے یعنی کافروں کے چہرے چہروں سے مراد ہیں، چہروں والے۔

يَّوْمَئِذٍ　اس روز۔ اس کا تعلق غاشیۃ سے ہے یعنی غاشیۃ کے دن بہت چہرے۔

خَاشِعَةٌ ②　غم اور حقارت کی وجہ سے ذلیل۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ③　مشقت کرنے والے تھکے ہوئے یعنی دوزخ میں۔ نَصَبٌ کا معنی تھکنا۔ حسن بصری نے فرمایا انھوں نے دنیا میں اللہ کے لئے کام نہیں کیا تو دوزخ میں اللہ نے ان سے مشقت لی اور طوق و زنجیر کا بار ڈال کر تھکادیا قتادہ کا بھی یہی قول ہے اور عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول آیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا وہ دوزخ میں اس طرح دھنس جائیگا۔ جس طرح اونٹ دلدل میں دھنس جاتا ہے۔

کلبیؒ نے کہا منہ کے بل ان کو دوزخ میں کھینچا جائیگا ضحاکؒ نے کہا دوزخ میں لوہے کے پہاڑ پر چڑھ جائیگا۔ بعض لوگوں نے کہا عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ سے وہ بت پرست اور کتابی کافروں میں سے تارک الدنیا درویش مراد ہیں جنھوں نے باطل مذہب کے موافق کام کئے اور دکھ اٹھائے اللہ ان کی اس ضلالت آگیں کوشش کو قبول نہیں فرمائیگا اور قیامت کے دن انکو دوزخ میں جانا ہوگا۔ یہ قول سعید بن جبیرؒ اور زید بن اسلم کا ہے اور عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اسی قول کی نسبت کی ہے۔ سدی اور عکرمہ نے کہا دنیا میں گناہوں کی مشقت کرنے والے اور آخرت میں دوزخ کا دکھ اٹھانے والے۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ④　وہ گرم آگ میں داخل ہونگے حضرت ابن عباسؓ نے کہا آگ تپائی جائیگی اور اللہ کے دشمنوں پر اسکو بھڑکایا جائیگا۔

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ⑤　ان کو کھولتے چشمے کا پانی پلایا جائیگا۔ ابن ابی حاتم نے سدی کا قول نقل کیا ہے کہ اٰنِيَةٌ کا معنی ہے گرمی کی آخری چوٹی پر پہونچا ہوا جس کے اوپر گرمی کی کوئی ڈگری نہ ہو۔ بیہقی نے بحوالہ حسن بصریؒ لکھا ہے کہ جس چیز کی گرمی آخری نمبر پر پہنچ جائے اور اس کے اوپر گرمی کا کوئی جواز نہو تو عرب کہتے ہیں قد انی حرہ اس چیز کی گرمی آخری حد تک پہنچ گئی۔ اسی لئے اللہ نے مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ فرمایا بعض اقوال میں آیا ہے کہ ابتداء آفرینش سے جہنم اس چشمہ پر دہک رہی ہے اس لئے اس کی گرمی آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہے۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے دوزخی دوزخ میں پیاسے داخل ہونگے تو ان کو کھولتے چشمہ کا پانی پلایا جائیگا۔ ایسا کھولتا ہوا کہ اگر دنیا کے پہاڑوں پر اس کا قطرہ گرجائے تو پہاڑ پگھل جائیں۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ⑥　ان کی خوراک ضَرِيْعٌ کے علاوہ کچھ نہوگی عبداللہ بن احمدؒ نے باسناد نہشل ضحاک کی روایت سے حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضریع ایک چیز ہے

ایلوے سے زیادہ تلخ مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم شوک کی طرح ہوگی۔ جب کسی کو کھلائی جائیگی تو نہ اس کے پیٹ میں اتریگی نہ منہ تک اٹھ آئے گی (بیچ میں پھنس جائیگی) نہ فربہی پیدا کریگی نہ بھوک کو دفع کریگی اور اس کے درمیان اسکو (کھولتا) پانی پلایا جائے گا۔

ابن ابی حاتم نے سعد بن جبیر کا قول نقل بیان کیا ہے کہ ضریع زقوم (تھوہر) ہے ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابودرداء کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخیوں پر ایسی بھوک مسلط کی جائیگی جو اس سارے عذاب کی برابر ہوگی جس میں وہ مبتلا ہونگے۔ مجاہدؒ عکرمہؒ اور قتادہؒ نے کہا ایک خاردار گھاس ہوتی ہے جس کے ریشے زمین میں نہیں ہوتے قریش اس کو شبراق کہتے ہیں لیکن جب اسکی لکڑی سوکھ جاتی ہے تو اسکو ضریع کہتے ہیں۔ یہ بدترین خوراک ہے۔ کلبی نے کہا جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو چوپایا اس کے قریب بھی نہیں جاتا۔ ابن ابی زید نے کہا دنیا میں جس خاردار خشک جھاڑ میں پتے نہوں وہ ضریع ہے اور آخرت کا ضریع آگ کا جھاڑ ہوگا۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا ضریع کھانے سے تو ہمارے اونٹ موٹے ہوتے ہیں کیونکہ اونٹ تروتازہ ضریع کو خصوصاً شبراق کو چرتے ہیں خشک ہو جانے کے بعد کوئی چیز اسکو نہیں کھاتی اسی طرح وہاں بھی ہوگا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ۝ نہ وہ فربہی پیدا کریگا نہ بھوک کے کام آئیگا اور کھانے کا مقصد انھی دو چیزوں میں سے کھانے کی کوئی چیز ہوتی ہے لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ سے مراد یہ ہے کہ طعام اور طعام جیسی اور کوئی چیز جو فربہی اور بھوک کے لئے مفید ہو۔ دوزخ میں ان کے لئے نہ ہوگی جیسے آیت وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ کا مطلب یہ ہے کہ محمد نہ شاعر نہ ساحر نہ کسی ایسے وصف کے حامل جو منافی رسول ﷺ ہو۔ آیت میں بعض کافروں کا طعام بیان کیا گیا ہے کہ ان کی خوراک صرف ضریع ہوگی لیکن کچھ دوسرے کافروں کا طعام ضریع بھی ہوگا اور زقوم بھی۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بہت چہرے اس روز (تنوین تکثیر) یا مومنوں کے چہرے (تنوین عوض مضاف الیہ) اس جگہ بھی چہروں سے چہروں والے آدمی مراد ہیں۔

نَّاعِمَةٌ ۝ نعومت والے تروتازہ

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ اللہ کی اطاعت میں دنیا میں رہ کر جو کوششیں انھوں نے کی تھیں آخرت میں ان کا ثواب دیکھ کر خوش ہونگے۔

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ عالی مرتبہ اور بلند مقام والی جنت میں

لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝ لَا تَسْمَعُ کی ضمیر وجوہ کی طرف راجع ہے وہ نہیں سنیں گے یا رسول اللہ کو خطاب ہے آپ نہیں سنیں گے یا مخاطب غیر معین ہے اے مخاطب تو نہیں سنیگا۔ لَاغِيَةً بمعنی لغو یعنی بے ہودگی۔ یا لغوبات مراد ہے یعنی بیہودہ بات یا لَاغِيَةً کا موصوف نفس محذوف ہے یعنی کسی شخص کو بے ہودہ بات کرتے تم نہیں سنوگے کیونکہ اہل جنت کا سارا کلام ذکر آمیز اور پر از حکمت ہوگا۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝ عینٌ کی تنوین عظمت کو ظاہر کر رہی ہے یعنی جنت میں عظیم الشان چشمہ رواں ہوگا جس کی روانی پیہم غیر منقطع ہوگی۔ ابن حبان۔ حاکم۔ بیہقی، اور طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے دریا مشک کے پہاڑ سے پھوٹ کر نکلتے ہیں۔

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝ جنت میں اونچے اور عالی مرتبہ تخت ہیں بیہقی نے بسند ابو طلحہؓ آیت سُرُرٌ مَّصْفُوفَةٌ کی تشریح میں حضرت ابن عباس کا قول اور احمد و ترمذی و ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ آیت وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ دونوں فرشوں کے درمیان اتنا فرق ہوگا جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے ترمذی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کی تشریح میں کہا کہ بستروں کا باہمی درجاتی فاصلہ اتنا ہوگا۔ جتنا

آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابوامامہؓ کا قول وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ اگر بالائی فرش زیریں فرش پر گر جائے تو چالیس برس میں بھی نہ پہنچے۔ طبرانی نے حضرت ابوامامہؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی فرش اوپر سے انتہائی نشیب کی طرف گرے تو سو سال تک گرتا چلا جائے۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان تختوں کے تختے سونے کے ہونگے جن کا حاشیہ زمرد، موتی اور یاقوت سے آراستہ ہوگا وہ اونچے ہونگے لیکن جب بیٹھنے والا ان پر بیٹھنا چاہیگا تو نیچے ہو جائینگے پھر اٹھ جائینگے اور اپنے مقام پر چلے جائینگے۔

وَّاَكْوَابٌ اور کوزے۔ اَكْوَاب کوب کی جمع ہے ہناد نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ کوب وہ کوزہ ہے جس میں قبضہ نہو (آبخورہ یا گلاس)

مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ چشموں کے کناروں پر پانی پینے کے لئے رکھے ہوئے

وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾ اور پہلو بہ پہلو ترتیب وار چنے ہوئے تکئے کہ جنتی جہاں بیٹھنا چاہیں بیٹھ جائیں اور سہارا لگالیں۔

وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿۱۶﴾ اور عمدہ لمبے چوڑے بچھے ہوئے فرش نَمَارِق نُمرقة یا نِمرقة کی جمع ہے اور زرَابِی زربیة کی۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ ابن جریر اور ابن حاتمؒ نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے جنت کی چیزوں کے اوصاف بیان فرمائے تو گمراہ لوگوں کو تعجب ہوا اور انہوں نے اس بیان کی تکذیب کی تو اللہ نے آیت اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ نازل فرمائی۔

صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ آیت سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ تختوں کی بلندی اتنی اتنی ہوگی اور اکواب موضوعة کی تشریح میں فرمایا کہ وہ بے شمار ہونگے انکی گنتی کوئی مخلوق نہ کر سکے گی اور تکیوں کا طول اور مسندوں کا عرض حضور ﷺ نے فرمایا تو کافروں نے تکذیب کر دی اور کہنے لگے ان تختوں پر چڑھنا کس طرح ممکن ہوگا اور اتنی کثرت سے کوزے اور اتنے لمبے تکئے اور اتنی چوڑی مسندوں کا فرش کیسے ہوگا دنیا میں تو ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اسوقت اللہ نے آیت اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ نازل فرمائی اس میں استفہام زجری ہے فاء عطف کے لئے ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے یعنی کیا یہ تعجب کرتے ہیں کیا یہ غافل ہیں کیا یہ نہیں دیکھتے کہ۔

اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ اونٹوں کی تخلیق کیسے کی گئی کہ اتنا لمبا جانور جب بیٹھتا ہے تو دوزانو ہو جاتا ہے پھر کھڑا ہو جاتا ہے اونٹوں کی طرح وہ تخت بھی مومنوں کے بیٹھنے کے لئے جھک جائیں گے۔

وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ اور آسمانوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ان کو بلند کیا گیا ہے اور آسمانوں کے تارے بے حساب ہیں۔

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ان کو پا کیا گیا ہے ایک جگہ اس طرح جمے ہوئے ہیں کہ باوجود اتنے طول کے ادھر ادھر نہیں جھکتے پس یہی حالت نَمَارِقُ کے طول اور ثبات کی ہوگی۔

وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہمواری کے ساتھ اس کا فرش بچھایا گیا ہے یہی حالت جنت کی مسندوں کی ہوگی۔ ممکن ہے آیت کا مطلب اس طرح ہو کہ انواع کائنات کچھ مرکب ہیں (جیسے اونٹ) اور کچھ بسیط ہیں (جیسے آسمان اور زمین پہاڑ) اور یہ سب اللہ کی قدرت پر دلالت کر رہی ہیں اور اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ قیامت پر قادر ہے پھر یہ لوگ اس کائنات مرکبہ وبسیط پر غور کر کے اللہ کی قدرت علی البعث پر کیوں استدلال نہیں کرتے اور اس سچے مخبر کی شہادت کو کیوں نہیں مانتے جس کی سچائی معجزات سے ثابت ہے اور کیوں اس کے لئے آخری تیاری نہیں کرتے؟

رہی یہ بات کہ مرکبات میں صرف اونٹ اور بسائط[1] میں سے تین چیزوں کا ذکر کیا (حالانکہ مرکبات بے انتہا ہیں اور بسائط اور بھی ہیں) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ استدلال میں انھی چیزوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو بکثرت سامنے آتی ہوں اور چونکہ خطاب عرب سے ہے اور عرب صحرانشین بدوی تھے جن کے سامنے آسمان زمین پہاڑ اور اونٹ تھے اور اونٹ ہی ان کا عزیزترین مال تھا دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں اونٹ کا استعمال بکثرت کیا جاتا تھا عربوں کی تمام ضروریات زندگی اونٹ سے وابستہ تھیں اس کا گوشت کھاتے دودھ پیتے اس پر سامان لادتے اور خود سوار ہوتے تھے اور دوسرے جانور ان خصوصیات سے بے بہرا تھے اس لئے فرمایا کہ اونٹ کی تخلیق پر یہ لوگ غور نہیں کرتے جو اللہ کی قدرت کاملہ اور حسن خلاقیت پر دلالت کر رہی ہے اتنا بڑا جانور لادے جانے کے لئے دوزانو بیٹھ جاتا ہے پھر لد کر بوجھ لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اپنے قائد کا (بے چون چرا) تابع ہے۔ لمبی گردن ہونے کی وجہ سے درختوں کے پتے بھی کھاتا ہے اور گھاس بھی چرلیتا ہے بیابانوں کو قطع کرنے میں اگر دس روز پانی نہ ملے تو پیاس کو برداشت کرلیتا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ابل سے مراد ابر ہے ابل اس ابر کو کہتے ہیں جو پانی سے بھرا ہوا ہو۔ قاموس۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے (حدیث قدسی) منقول ہے کہ میرے سوا کوئی ابل کی طرح پیدا کر سکتا ہے اور آسمان کی طرح (کوئی چھت) بلند کر سکتا ہے اور پہاڑوں کی طرح (کسی چیز کو) بپا کر سکتا ہے اور زمین کی طرح (کسی چیز کا فرش) بچھا سکتا ہے۔

فَذَكِّرْ ۟ یعنی دلائل کے ساتھ ان کو نصیحت کرو تاکہ وہ دلائل پر غور کریں اور اہمیت دلائل محسوس کریں۔

إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝۲۱ یہ نصیحت کرنے کی علت کا بیان ہے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ذمہ فقط پہنچا دینے کا ہے اگر وہ غور نہ کریں یا نصیحت پذیر نہ ہوں تو آپ ﷺ اس کے ذمہ دار نہیں۔

لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝۲۲ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ کے مفہوم کی اس آیت میں تاکید ہے یعنی آپ ان کو (نصیحت یاب کرنے) پر مسلط نہیں انکے نگراں نہیں۔ یہی مطلب آیت لَسْتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ کا ہے۔

إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ استثناء منقطع ہے اِلَّا لٰکِنَّ کے معنی میں ہیں لیکن جس نے ایمان سے منہ پھیرا۔

وَكَفَرَ ۝۲۳ اور اللہ کا انکار کیا تو اللہ اس پر قابو رکھتا ہے حاکم ہے۔

فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝۲۴ تو اللہ آخرت میں اسکو آگ کا عذاب دیگا۔ بعض نے کہا استثناء متصل ہے اور دنیا میں جہاد کی اور آخرت میں عذاب جہنم کی وعید ہے یہ بھی ایک تفسیری قول ہے کہ اس آیت کا تعلق فَذَكِّرْهُمْ سے ہے یعنی تم ان کو نصیحت کرو مگر ان میں سے جو ایمان سے روگرداں ہو اور کفر کرتا ہے اور تم کو اس کے ایمان کی امید نہ رہے تو وہ مستثنیٰ ہے (اس کو نصیحت کرنا ضروری نہیں۔

إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ۝۲۵ وعید کو قوی بنانے کے لئے اِلَيْنَا کو مقدم ذکر کیا یعنی ان کی واپسی ایسے جبار قہار کی طرف ہی ہوگی جو ان کو سزا دینے پر قادر ہے۔

پھر ہمارے ہی ذمہ ان سے حساب لینا اور حسب درجہ کفر ان کو عذاب دینا ہے۔ علی لزوم پر دلالت کر رہا ہے لیکن اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں (یعنی بالذات لازم) نہیں ہاں اس نے کافروں کو معاف نہ کرنے کا وعدہ کرلیا ہے اس لئے اس وعدہ کی وجہ سے کافروں کو عذاب دینا اس پر لازم ہے) کیونکہ خدا پر کسی چیز کا وجوب اس کی شان الوہیت کے منافی ہے (لزوم سے عجز لازم آتا ہے اور ہر عجز سے اللہ پاک ہے اس لئے اس جگہ علی کا استعمال تاکید وعید کے لئے ہے۔

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝۲۶ سورت الغاشیہ ختم ہوئی بعونہ و منہ تعالیٰ

[1] شاید حضرت مولف کی اس جگہ مرکبات سے مراد صرف مرکبات حیوانیہ و نباتیہ اور بسائط سے مراد تمام عناصر اور جمادات اور افلاک و فلکیات ہیں اسی لئے اونٹ کو مرکب اور پہاڑ وغیرہ کو بسیط فرمایا ورنہ فلسفہ کو اصطلاح میں تو پہاڑوں کا شمار بھی مرکبات میں کیا جاتا ہے پتھر ہوں یا دوسرے معدنیات سبکی ترکیب عناصر سے ہے ہاں اگر پہاڑوں کو ارض بسیط کے حکم میں داخل کرلیا جائے تو توضیح مولف میں کسی تاویل کی ضرورت نہوگی۔

سورۃ الفجر

یہ سورت مکی ہے اس میں ۳۰ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْفَجْرِ ۝۱ قسم ہے فجر کی۔ اَلْفَجْرِ سے مراد ہے ہر روز کی فجر ابو صالح کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے عکرمہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ عطیہؒ کے نزدیک نماز فجر مراد ہے قتادہؒ نے کہا ماہ محرم کے پہلے دن کی فجر مراد ہے اسی سے (نیا) سال پھوٹتا ہے۔ ضحاکؒ نے کہا ماہ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کی فجر مراد ہے کیونکہ اس سے ذی الحجہ کی دس راتیں (ابتدائی عشرہ) متصل ہیں۔

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝۲ تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے لور عظیم الشان دس راتوں کی قسم۔ ابن عباسؓ کے نزدیک ذی الحجہ کی دس ابتدائی راتیں مراد ہیں۔ یہی قول قتادہ، مجاہد، ضحاک، سدی لور کلبی کا بھی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ذی الحجہ کے دس دنوں کی عبادت سے زیادہ اللہ کو لور کسی دن کی عبادت محبوب نہیں اس کا ہر دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے لور اس کی ہر رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ بسند ضعیف۔

ضحاکؒ کا قول بروایت ابوروق آیا ہے کہ ماہ رمضان کی ابتدائی دس راتیں مراد ہیں لور ابوظبیان کی روایت میں ہے کہ رمضان کی آخری دس راتیں مراد ہیں۔ سورۂ بقرہ میں فضائل رمضان کے ذیل میں ہم اسکا ذکر کر چکے ہیں اور رمضان کے اخیری عشرہ میں شب قدر بھی ہے سورۂ قدر میں ہم اس کا تذکرہ کرینگے۔ ایمان بن ربابؒ کا قول ہے کہ محرم کا عشرہ اول مراد ہے جس کا دسواں دن عاشورہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا رمضان کے بعد افضل روزے ماہ محرم کے ہیں لور فرض نماز کے بعد افضل نماز (تہجد) ہے۔ رواہ مسلم

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝۳ شَفْعٌ سے مراد ہے مخلوق اللہ نے فرمایا وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ہم نے تم کو جوڑے جوڑے پیدا کیا لور وتر سے مراد خالق یکتا۔

یہ قول حضرت ابو سعید خدری اور عطیہ اور عوفی کا ہے مجاہد لور مسروق نے اسی طرح تفسیر کی لور فرمایا تمام مخلوق شفع ہے یعنی ہر مخلوق کا مقابل موجود ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ۔ کفر وایمان ہدایت اور گمراہی۔ نیک بختی اور بد بختی رات اور دن۔ آسمان اور زمین۔ بر، بحر سورج لور چاند جن وانس نر اور مادہ لیکن وتر اکیلا اللہ ہے۔ ابو بکر سے شفع لور وتر کی تشریح پوچھی گئی تو فرمایا مخلوق کے احوال کا باہمی تضاد شفع ہے زندگی اور موت۔ عزت لور ذلت عاجزی اور قدرت کمزوری اور قوت، علم اور جہالت بینائی اور نابینائی شنوائی اور بہرا پن بولنا اور خاموشی غنا اور فقر لور صفات خداوندی کا انفراد وتر ہے۔ حیات ہے بغیر موت کے عزت ہے بغیر ذلت کے قدرت ہے۔ بغیر عاجزی کے قوت ہے بغیر کمزوری کے۔ علم ہے بغیر جہالت کے کلام ہے بغیر سکوت کے لور غنا ہے بغیر فقر کے۔

حسن بصریؒ لور ابن زیدؒ کا قول ہے کہ شفع اور وتر دونوں مخلوق ہی ہیں کوئی مخلوق شفع ہے کوئی وتر۔ قتادہؓ کی روایت سے حسن بصری کا قول منقول ہے کہ شفع اور وتر دونوں عدد ہیں کوئی عدد جفت ہے کوئی عدد طاق۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ نماز مراد ہے کوئی نماز جفت ہے کوئی نماز طاق۔ مالکؒ نے مرفوعاً ابن حصینؓ کا قول اور احمد وترمذیؒ نے عبداللہ بن زبیر کا قول نقل کیا ہے کہ شفع سے مراد ہے حج سے پہلی واپسی اور وتر سے مراد ہے دوسری واپسی اللہ نے فرمایا ہے فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ

عَلَيْهِ الخ مقاتل، ابن حبان نے کہا کہ (دنیا کے) دن رات شفع ہیں اور قیامت کا دن وتر ہے جس کے بعد رات نہ ہوگی۔ حسن کا ایک قول یہ بھی ہے کہ جنت کے آٹھ درجات شفع ہیں اور دوزخ کے سات طبقات وتر ہیں گویا جنت اور دوزخ کی قسم کھائی گئی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾ اور جاتی ہوئی رات کی قسم۔ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے دوسری آیت میں فرمایا ہے وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ پشت پھیرتی ہوئی رات کی قسم۔ قتادۃ نے اِذَا يَسْرِ کا ترجمہ کیا ہے اذا جاء واقبل یعنی آتی ہوئی رات کی قسم۔ تعاقب شب اللہ کی قدرت کاملہ اور کثرت انعام پر دلالت کرتا ہے اس لئے (رات کی قسم کھانے میں یہ قید ذکر کی)۔ رات خود نہیں آتی جاتی بلکہ دوسری مخلوق رات میں آجاتی ہے اسی لئے رات کی طرف سیر کی نسبت مجازی ہے جیسے صلی المقام بولا جاتا ہے مقام نماز نہیں پڑھتا بلکہ مقام میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ رات سے مراد جنس رات ہے کوئی ہو مگر مجاہدؒ و عکرمہ کے نزدیک مزدلفہ کی رات مراد ہے۔

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ استفہام تقریری ہے (بیشک) اور قسم میں تنوین تعظیم ہے یعنی بلاشبہ اشیاء مذکورہ کی قسم عظیم الشان کافی قسم ہے کیونکہ جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہ بہت بڑی ہیں اللہ کی قدرت کی اعجوبہ کاری اور حکمت کی ندرت کا ان سے پتہ چلتا ہے۔

لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ عقلمند کے لئے (حجر روکنا) عقل بھی عقلمند کو بری چیزوں سے روکتی ہے اس لئے اسکو حجر کہا جاتا ہے۔ جواب قسم یا اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ہے یا محذوف ہے یعنی اشیاء مذکورہ کی قسم بلاشبہ اللہ انکی تاک میں ہے یا ہم ان کافروں کو ضرور تباہ کردینگے جیسے عاد ثمود کو تباہ کردیا۔

اَلَمْ تَرَ استفہام نفی کے انکار کے لئے ہے اور نفی کا انکار اثبات (کو لازم) ہے اس لئے استفہام تقریری تعجب کے لئے ہوگیا۔ رویت کا معنی اس جگہ یقین کرنا ہے (کیا تم یقین نہیں رکھتے یعنی تم کو اس بات کا ضرور یقین ہے)

كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾ کہ تمہارے رب نے عاد کی کیا حالت کردی ان کافروں سے ان کی عمریں لمبی تھیں، ان کی جسمانی طاقتیں بھی زیادہ تھیں لیکن اللہ نے ان کا ستیاناس کردیا۔ طوفان بھیج کر ان کو تباہ کردیا تو یہ اس کے عذاب سے کیسے بچ سکیں گے۔

اِرَمَ یہ عاد سے بدل ہے یا عطف بیان ہے ارم عاد کے ایک قبیلہ کا نام تھا جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا تھا اصل عاد بن سام بن نوح کے بیٹے کا نام ارم تھا اسی کے نام پر قبیلے کا نام ارم ہوگیا۔ محمد بن اسحاق نے کہا قوم عاد کے دادا کا نام تھا۔ اس صورت میں قوم عاد ارم کی ایک شاخ ہوگی۔ کلبی نے کہا عاد اور ثمود اور سکان سواد عراق اور اہل جزیرہ کا نسب اوپر پہنچکر ارم سے جا ملتا ہے اسی وجہ سے عاد ارم اور ثمود ارم کہا جاتا ہے۔ اللہ نے عاد اور ثمود کو تو بالکل تباہ کردیا اہل سواد اور اہل جزیرہ باقی رہ گئے۔ ان تمام اقوال پر ارم ایک قوم کا نام ہوگا۔ مجاہد نے کہا اس قوم کی صفت اللہ نے

ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ بیان فرمائی یعنی دراز قامت۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان کا طول قامت ستون کی طرح تھا مقاتلؒ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذراع سے بارہ ذراع ان کے قدوں کا طول تھا بعض نے اس سے بھی زیادہ کہا ہے قوم ارم کو ذات العماد کہنے کی بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ ڈیرے خیمے۔ خیموں کے ستون اور مویشی لے کر وہ موسم بہار میں نکل کھڑے ہوتے تھے جب سبزی ختم ہوجاتی تو پھر گھروں کو لوٹ آتے تھے ان کے پاس باغات اور کھیتیاں تھیں وادی قری میں ان کی بستیاں تھیں بعض نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ وہ اونچی عمارتیں اور مضبوط تھام بناتے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شداد بن عاد نے ایک ایسی عمارت بنائی تھی کہ ویسی عمارت دنیا میں کسی نے نہیں بنائی۔ اور قوم کو ساتھ لے کر اس عمارت کو دیکھنے گیا ابھی ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہی تھا کہ بحکم خدا آسمان کی طرف سے ایک چیخ پیدا ہوئی جس سے شداد اور سب قوم والے ہلاک ہوگئے۔ سعید بن مسیبؒ نے کہا کہ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادُ ایک شہر کا نام ہے جسکو دمشق کہا جاتا ہے قرطبی نے اسکندریہ کو اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادُ

کہا ہے اس صورت میں یہ معنی ہوگا کہ اللہ نے عاد کو ہلاک کیا جو اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ کی رہنے والی تھی (گویا ارم ایک شہر کا نام ہوا اور ذات العماد اس شہر کی صفت ہوئی) مراد یہ کہ اس شہر میں بلند عمارتیں اور ستون تھے۔

الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ۝ یہ ارم کی صفت ہے خواہ ارم کو قبیلہ کا نام کہا جائے یا شہر کا۔ اگر قوم (یا قبیلہ) مراد ہو تو مِثْلُهَا کا معنی یہ ہوگا کہ اس قوم کی طرح قد و قامت اور قوت میں کوئی دوسری قوم نہیں پیدا کی گئی اور اگر بستی مراد ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ عمارت کی بلندی پائداری اور حسن میں اس جیسی کوئی بستی پیدا نہیں ہوئی۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ ثمود کا عطف عاد پر ہے جَابُوْا کا معنی ہے انہوں نے تراشا۔ صخر جمع ہے صخرۃ کی۔ اَلْوَادُ سے مراد وادی قری ہے ثمود وادی قری میں پتھر تراش کر (پہاڑوں میں) رہنے کے لئے مکان بناتے تھے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ۝ اَلْاَوْتَادُ مضبوط عمارتیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور محمد ﷺ بن کعب قرظی کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا اوتاد سے مراد ہے مضبوط طاقتور پائیدار حکومت عرب کہتے ہیں کہ اعز ثابت الاوتاد انہوں نے عزت کی میخیں گاڑ دیں۔ یعنی مستحکم اور دوامی عزت کے مالک ہیں۔ عطیہ کا قول ہے کہ الاوتاد سے فوجیں مراد ہیں فوج اپنے ساتھ بکثرت ڈیرے خیمے رکھتی تھی اور سفر میں جہاں جاتی تھی میخوں کے ذریعے ڈیرے قائم کرتی تھی بروایت عطیہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ مقاتل اور کلبی نے کہا اوتاد وتد کی جمع ہے فرعون لوگوں کو چومیخا کرتا تھا سزا دینے کے لئے کسی ستون میں چومیخا کرا دیتا تھا یا ہوا میں لٹکا دیتا تھا مجاہد اور مقاتل بن حیان نے کہا آدمی کو زمین پر چت لٹا کر ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے ان میں میخیں ٹھوک دیتا تھا۔ سدی نے کہا آدمی کو لمبا لٹا کر میخیں ٹھوکتا پھر سانپ بچھو اس پر چھوڑ دیتا تھا۔

قتادہ اور عطا نے کہا فرعون نے اپنے سامنے اپنے خزانچی حزقیل کی بیوی کو چومیخا کر لیا تھا۔ بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس بیان کی نسبت کی ہے کہ فرعون کو ذُوالْاَوْتَادُ کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کا خزانچی حزقیل مومن ہو گیا تھا اور سو برس تک اپنے ایمان کو چھپاتا رہا تھا حزقیل کی بیوی فرعون کی بیٹی کی مشاطہ تھی ایک روز وہ مشاطہ فرعون کی بیٹی کے سر میں کنگھی کر رہی تھی کہ کنگھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اس کے منہ سے فوراً یہ الفاظ نکلے کہ اللہ کو نہ ماننے والے ہلاک ہوں فرعون کی لڑکی نے کہا کیا میرے باپ کے علاوہ تیرا کوئی اور معبود ہے مشاطہ نے کہا میرا اور تیرے باپ کا اور زمین و آسمان کا الٰہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں لڑکی فوراً کھڑی ہو گئی اور باپ کے پاس جا کر رونے لگی فرعون نے رونے کی وجہ پوچھی تو لڑکی نے کہا آپ کے خزانچی کی بیوی میری مشاطہ ہے اس کا خیال ہے کہ آپ کا اور اس کا اور زمین اور آسمان کا الٰہ ایک ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں فرعون نے مشاطہ کو بلوا کر جواب طلب کیا اس نے کہا اگر تو ستر مہینے تک مجھے عذاب دیتا رہیگا تب بھی اللہ کا انکار نہیں کرونگی مشاطہ کی دو لڑکیاں تھیں بڑی لڑکی کو پکڑوا کر مشاطہ کے روبرو فرعون نے ذبح کر دیا اور اس سے کہا خدا کا اب بھی انکار کر دے ورنہ تیرے ہی سامنے تیری چھوٹی لڑکی کو ذبح کر دونگا۔ چھوٹی لڑکی شیر خوار تھی مشاطہ بولی اگر تو تمام روئے زمین والوں کو بھی میرے روبرو ذبح کر دیگا تب بھی اللہ کا انکار نہیں کرونگی غرض بچی کو لے کر جب اوندھا لٹایا گیا اور قاتلوں نے اس کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو ماں بے صبر ہو گئی لیکن فوراً بچی کی زبان کو اللہ نے کھولدیا۔

دنیا میں چار بچے بچپن میں بولے ہیں ان میں سے یہ بھی ایک بچی تھی۔ بچی نے کہا ماں بے صبر نہو اللہ نے تیرے لئے جنت میں ٹھکانا کر دیا ہے، صبر کر تو بلاشبہ اللہ کی رحمت اور عزت افزائی تک پہونچے گی۔ غرض بچی کو ذبح کر دیا گیا وہ مر گئی اور اللہ نے اس کو جنت میں جگہ عطا فرما دی۔

اس کے بعد اس عورت کے شوہر حزقیل کی طلب میں آدمی بھیجے گئے لیکن وہ گرفتار نہ کر سکے کسی نے فرعون کو اطلاع دی کہ حزقیل فلاں پہاڑ میں فلاں مقام پر ہے فرعون نے دو آدمی تلاش کے لئے بھیجے یہ دونوں پہنچے تو حزقیل نماز پڑھ رہا تھا اور وحشی جانوروں کی تین صفیں نماز میں شریک تھیں دونوں آدمیوں کو حزقیل نے دیکھ کر کہا واپس چلے جاؤ پھر اللہ سے دعا کی کہ بار الٰہا میں نے اپنا ایمان سو برس چھپایا کسی کو میرے ایمان کا علم نہوا ان دونوں میں سے جو بھی میرے ایمان کو ظاہر کر دے تو فوراً

دنیا میں اس کو سزا دیدے اور آخرت میں اسکو دوزخ میں بھیج دے دونوں آدمی واپس چلے گئے ایک مومن ہو گیا اور اسکو بڑی عبرت ہوئی دوسرے نے اشاف کے سامنے فرعون کو اطلاع دیدی فرعون نے کہا کیا کوئی دوسرا بھی تیرے ساتھ تھا مخبر نے کہا ہاں فلاں شخص تھا۔ فرعون نے اس شخص کو بلوایا اور پوچھا کیا یہ سچ کہ رہا ہے اس شخص نے کہا نہیں اس نے جو بات کہی میں نے تو نہیں دیکھی فرعون نے اس کو کثیر انعام دیا اور مخبر کو مرواڈالا اور صلیب پر چڑھادیا۔

خاندان میں ایک بڑی حسین عورت تھی وہ فرعون کی بیوی تھی اس کا نام تھا آسیہ بنت مزاہم مشاطہ کے ساتھ فرعون نے جو حرکت کی تھی اس نے اس حرکت پر غور کیا اور کہنے لگی میں مومن ہوں فرعون کافر ہے فرعون کی حرکتوں پر صبر کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں دل میں یہ بات کہ رہی تھی کہ فرعون آگیا اور بیوی کے پاس بیٹھ گیا بیوی نے کہا تو ساری مخلوق سے برا اور سب سے خبیث ہے تو نے مشاطہ کو قصداً مار ڈالا فرعون نے کہا کیا تجھے بھی اسی کی طرح جنون ہو گیا آسیہ نے کہا مجھے جنون نہیں بلکہ میرا تیرا اس کا اور آسمان وزمین کا خدا ایک ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے فرعون نے اس کو مارا اور اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس کے ماں باپ کے پاس آدمی بھیج کر ان کو بلوایا وہ آگئے تو بولا مشاطہ کو جنون تھا وہی اسکو بھی ہو گیا آسیہ کہنے لگی اللہ کی پناہ مجھے جنون نہیں میں شہادت دیتی ہوں کہ میرا مالک اور تیرا مالک اور زمین و آسمان کا مالک ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں باپ نے کہا آسیہ کیا (آج) تو خاندان عمالقہ کی سب سے اعلیٰ عورت نہیں اور تیرا شوہر عمالقہ کا خدا ہے آسیہ نے کہا اعوذباالله من ذالک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر سچ ہے تو اس سے کہو مجھے ایسا تاج پہنادے جس کے سامنے سورج پیچھے چاند اور گرداگرد ستارے ہوں۔

آخر فرعون نے آسیہؓ کے ماں باپ سے کہا تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ۔ پھر آسیہؓ کو لٹا کر چومیخا کر دیا اور اللہ نے اس عذاب (کی برداشت) کو اس پر سہل بنانے کے لئے اس کے سامنے جنت کا دروازہ کھولدیا۔ اس وقت آسیہؓ نے دعا کی الٰہی جنت کے اندر اپنے قرب میں میرے لئے مکان بنادے اور فرعون اور فرعون کی بداعمالیوں سے مجھے نجات عطا فرمادے (دعا قبول ہوئی) اللہ نے اسکی روح قبض کرلی اور جنت میں اسکو سکونت عطا فرمائی۔ انتہی

فرعون کی بیوی وہی تھی کہ حضرت موسیٰ کی ماں نے فرعون کے خوف سے بحکم خدا جب موسیٰ کو دریا میں پھینک دیا اور فرعون کے آدمیوں نے ان کو پاکر نکال لیا تو اسی بیوی نے فرعون کو حضرت موسیٰ کے قتل سے روکا تھا اور کہا تھا یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے امید ہے کہ ہم کو اس سے فائدہ پہونچے چنانچہ آسیہ کو اس بچہ سے فائدہ پہنچا وہ مومن ہو گئی پورا قصہ سورۂ قصص میں گزر چکا ہے۔

الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾ جنھوں نے بستیوں میں حد سے زیادہ نافرمانیاں کی تھیں۔

فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾ اور کفر و ظلم کی بہت تباہ کاریاں مچائی تھیں۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾ نتیجہ میں اللہ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے یعنی ہر قسم کا ملا جلا عذاب ان پر نازل کیا۔

سَوْطَ عَذَابٍ میں صفت کی اضافت موصوف کی جانب ہے اصل میں عذاب سوط تھا یعنی مخلوط عذاب جیسے اخلاق ثیاب پرانے کپڑے سوط کا اصل لغوی معنی ہے مخلوط کر دینا کوڑے میں مختلف بل مخلوط ہوتے ہیں اسی لئے اسکو سوط کہتے ہیں۔ آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دنیا کا عذاب ایسا ہے جیسے تلوار کے مقابلہ میں کوڑا اسی لئے دنیوی عذاب کو کوڑے سے تشبیہ دی۔ قتادہ نے کہا (اضافت بتقدیر مِن ہے) یعنی عذاب سے بنے ہوئے کوڑے اللہ نے ان پر برسائے۔ اہل معانی کہتے ہیں کہ یہ استعارہ ہے عذاب تازیانہ سخت ترین عذاب ہے اور لفظ صَبَّ یکدم (پانی کے ریلے کی طرح) نزول عذاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے یکدم ان پر سخت عذاب نازل کیا۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾ یہ قسم کا جواب ہے یا محذوف جواب (ہم ان کو ضرور ہلاک کر دینگے) کی تاکید ہے

بِمِرْصَادٍ کی جہات کا مقام اللہ کے مرصاد ہونے کا یہ معنی ہے کہ اللہ بندوں سے اطاعت اور فرماں پذیری چاہتا ہے اور انکے اعمال کو نگاہ میں رکھتا ہے اسکو تمام اعمال کا علم ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ جس طرح کمین گاہ میں بیٹھنے والے سے سامنے گزرنے والا مخفی نہیں ہوتا مگر انسان اس سے غافل ہے اس کے پیش نظر صرف دنیا اور اسکی لذتیں ہیں اسی لئے آگے فرمایا۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ　پس جب اللہ دولت اور فراخدستی دیکر انسان کی آزمائش کرتا ہے کہ شکر کرتا ہے یا ناشکری

فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ　پس دنیا میں اس کو عزت دیتا اور بیوی بچے اور مال عطا فرماتا ہے یہ آزمائش کی تفصیل ہے۔

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾　فَيَقُوْلُ کا ماقبل مابعد کی علت ہے یعنی اللہ نے چوں کہ انسان کو عزت دی دولت اور اولاد دی اس لئے وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے فضیلت دی۔

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ　لیکن جب افلاس میں مبتلا کر کے اللہ بندہ کی جانچ کرتا ہے تاکہ (افلاس کے بعد) انکشاف ہو جائے کہ بندہ صبر رکھتا اور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے یا بے صبر ہو کر کفر کرنے لگتا ہے اور اللہ کی طرف نہیں لوٹتا

فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ　ابن عامر اور ابو جعفرؒ کی قرات میں فَقَدَّرَ تشدید کے ساتھ آیا ہے اور عام طور پر مشہور قرات فَقَدَرَ (بغیر تشدید کے ہے بعض کا قول ہے کہ بر صورت تشدید ترجمہ ہو گا مفلس کر دیا اور بغیر تشدید کے ترجمہ ہو گا بقدر کفایت دیا۔ بعض علماء نے کہا دونوں ہم معنی ہیں یعنی رزق تنگ کر دیا۔ سابق آیت میں اَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فرمایا تھا یہاں نَعَّمَهٗ کی جگہ قَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ تو فرمایا مگر اَكْرَمَهٗ کی جگہ اَهَانَهٗ نہیں فرمایا وجہ یہ ہے کہ رزق کی تنگی ہمیشہ بے عزتی ہی نہیں ہوتی کبھی آخرت میں عزت کا سبب بھی ہوتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (بروایت ابن عباس) کہ حسد صرف دو شخصوں پر جائز ہے ایک وہ شخص جس کو اللہ نے قرآن عطا فرمایا اور وہ تمام اوقات روز و شب میں اس کو پڑھتا ہے دوسرا وہ شخص کہ اس کو اللہ نے مال عطا کیا اور وہ تمام اوقات روز و شب میں اس کو (راہ خدا میں) خرچ کرتا ہے۔ بخاری و مسلم۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال کی وسعت دنیا میں اللہ کی مہربانی ہے جو موجب شکر ہے اور آخرت میں بھی کبھی موجب عزت ہوتی ہے۔

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾　تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری بے عزتی کی کیونکہ اس کی نظر کوتاہ ہے صرف دنیا پر محدود ہے اور دنیا ہی میں اس کا انہماک ہے کلبی اور مقاتل نے کہا یہ آیت امیہ بن خلف جمحی کے حق میں نازل ہوئی۔

كَلَّا　ہر گز نہیں یعنی جیسا وہ کہتا ہے واقعہ ایسا ہر گز نہیں دنیوی نعمت و دولت تو اللہ کی طرف سے ایک ڈھیل ہوتی ہے بشرطیکہ مالدار نعمت کا استقبال شکر سے نہ کرے اور شکر کے ہاتھوں سے نہ لے۔ بلکہ نعمت کی شکر گزاری کے بعد بھی فقیر صابر پر غنی شاکر کو برتری حاصل نہیں۔

حضرت مصعب بن سعدؓ کی روایت ہے کہ حضرت سعد دوسروں سے اپنے کو بڑھا چڑھا کر خیال کرتے تھے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں کو صرف ضعفاء (اہل افلاس) کے سبب ہی رزق دیا جاتا ہے۔ بخاری۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فقراء مہاجرین قیامت کے دن دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے مسلم۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ فقراء جنت میں دولت مندوں سے پانچ سو سال آدھے دن پیشتر جائیں گے۔ ترمذی اگر فقر اور کمزوری کے ساتھ صبر اور رضا ہو تو ایسا فقر نعمت ہے بے عزتی نہیں۔ حضرت قتادہ بن نعمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو دنیا کو اس سے الگ رکھتا ہے جیسے تم لوگ اپنے بیمار کے پانی سے پرہیز رکھتے ہو۔ احمد و ترمذی۔ اس مبحث کی احادیث بکثرت آئی ہیں (ہم نے چند نقل کر دیں)

بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾　یعنی یہ بات نہیں کہ فقیر رکھ کر اللہ تمہاری بے عزتی کرتا ہے بلکہ اس نے مال

عطا فرما کر تم کو نوازا مگر تم یتیم کو نہیں نوازتے اس کی پاسداری نہیں کرتے نہ اس سے محبت کرتے ہو نہ اس پر خرچ کرتے ہو۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ بل کا عطف یَقُولُ پر ہے مراد یہ ہے کہ ان کا یہ قول خود بتارہا ہے کہ وہ یتیم کی عزت نہیں کرتا اور دنیا میں انہماک رکھتے ہیں مقاتل نے کہا کہ قدامہ بن مظعون امیہ بن خلف کے زیر پرورش تھا مگر امیہ قدامہ کا حق ادا نہیں کرتا تھا۔ ابو عمرو کی قرات میں لَا تُکْرِمُوْنَ اور لَا تَحَاضُّوْنَ اور تَاْکُلُوْنَ اور تُحِبُّوْنَ جمع غائب کے صیغے آئے ہیں اور ضمیریں انسان کی طرف راجع ہیں کیونکہ جنس انسان مرادہے ایک انسان مراد نہیں لیکن لفظ انسان مفرد ہے اس لئے اِبْتَلَاهُ اور اَکْرَمَهٗ اور نَعَّمَهٗ اور یَقُوْلُ کی مفرد ضمیریں بھی اس کی طرف راجع کی گئی ہیں۔

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ اور آپس میں ایک دوسرے کو آمادہ نہیں کرتا۔ یہ قرات اہل کوفہ کی ہے باقی اہل قرات کے نزدیک وَلَا تَحُضُّوْنَ ہے یعنی تم دوسروں کو آمادہ نہیں کرتے۔

عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ مسکین کو کھانا دینے پر دوسروں کو ترغیب بھی نہیں دیتے چہ جائیکہ کہ خود اپنے مال سے کھلاؤ۔

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ اور میراث کو سب سمیٹ کر کھاجاتے ہو حلال ہو یا حرام وہ لوگ اپنے میراثی حصے کے ساتھ کمزور عورتوں اور بچوں کے بھی میراثی حصے کھا جاتے تھے۔ ابن زید نے کہا اَکْلٌ لَمٌّ کا یہ معنی ہے کہ جو کچھ لگے کھا جائے حلال حرام کا امتیاز نہ کرے یہ بھی اَکْلًا لَّمًّا کی تشریح آئی ہے یہ جانتے ہو۔ یہ بھی کہ مورث نے حلال اور حرام ہر طریقے سے مال جمع کیا تھا جب وہی مال ان کی میراث میں آتا ہے تو سب کھا جاتے ہیں۔

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾ اور بڑی حرص و خواہش کے ساتھ مال کی بہت محبت کرتے ہیں۔

كَلَّآ ہرگز نہیں۔ یہ مذکورہ حرکتوں سے سے بازداشت ہے مقاتل نے کہا (یہ نفی ہے یعنی جو حکم ان کو دیا گیا ہے اس کی تعمیل نہیں کریں گے یا بعد والے کلام کی تحقیق کے لئے ہے یعنی جس وعید عذاب اور ان کے حسرت و افسوس کا بیان بعد والی آیت میں کیا گیا ہے اس سے شک کو دور کرنے کے لئے لفظ کلا کا استعمال کیا گیا۔

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ یعنی زمین کو پیہم جھنجوڑا جائے گا یہاں تک کہ پہاڑ درخت عمارتیں جو کچھ روئے زمین پر ہوگا ٹوٹ پھوٹ کر خاک پران بنجائے گا۔

وَّجَآءَ رَبُّكَ اس کا عطف دُکَّتِ پر ہے اللہ کا آنا متشابہات میں سے ہے متشابہات کے متعلق سلف خلف اور اہل تصوف کے اقوال ہم آیت اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تشریح میں ذکر کر چکے ہیں۔

وَالْمَلَكُ الف لام جنسی ہے یعنی ملائکہ۔

صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ یہ اَلْمَلَکُ سے حال ہے۔ یعنی ملائکہ قطار در قطار بنائے ہوں گے۔

ابن جریر اور بن مبارک نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کا دن ہوگا تو اللہ کے حکم سے دنیوی آسمان پھٹ جائے گا اور ملائکہ اس کے کناروں پر رہ جائیں گے پھر بحکم رب اتریں گے اور زمین کو اس کی موجودات سمیت گھیر لیں گے، پھر دوسرا، پھر تیسرا، چوتھا پھر پانچواں پھر چھٹا پھر ساتواں آسمان پھٹے گا اور ملائکہ (ترتیب وار) اتر کر صف بستہ ہوتے جائیں گے پھر سب سے اعلیٰ فرشتہ اترے گا جس کے بائیں طرف جہنم ہوگا جب زمین والے جہنم کو دیکھیں گے تو ادھر ادھر بھاگیں گے مگر زمین پر ہر طرف ان کو ملائکہ کی سات قطاریں دکھائی دیں گے مجبوراً جہاں سے چلے ہوں گے وہیں لوٹ آئیں گے۔ یہی مصداق ہے مندرجہ ذیل آیات کا اِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ اور وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ اور یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاهِیَةٌ وَّالْمَلَکُ عَلٰۤی اَرْجَآئِهَا اسی حالت میں ایک آواز سنادی جائے گی اور لوگ حساب کی جانب چل دیں گے۔

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ اور اس روز جہنم کو لایا جائے گا حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس روز جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی اور ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچتے ہوں گے۔ مسلم و ترمذی۔

ابن وہب نے کتب الاہوال میں زید بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیلؑ آئے۔ حضرت علیؓ نے جبرئیل کے آنے کی وجہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کی حضور ﷺ نے فرمایا جبرئیلؑ نے آکر مجھ سے کہا کَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَ جَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِيْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ جہنم کو ستر ہزار لگاموں سے کھینچ کر لایا جائے گا ستر ہزار فرشتے لگام کھینچتے ہوں گے اچانک فرشتوں کے ہاتھوں سے لگامیں چھوٹ پڑیں گی (لیکن فرشتے پھر فوراً پکڑلیں گے) اگر وہ پھر نہ پکڑلیں تو سب جماعت کو جہنم جلاڈالے مگر پکڑلیں گے۔

قرطبی نے کہا جہنم کو اس کے پیدائشی مقام سے قید کر کے سرزمین حشر میں لایا جائے گا اور سواء پل صراط کے جنت کو جانے کا اور کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

ابو نعیمؒ نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کا دن ہو گا اور ملائکہ اتر کر قطار در قطار ہو جائیں گے تو اللہ جبرئیلؑ سے فرمائے گا جہنم کو لاؤ جبرئیل جہنم کو ستر ہزار لگاموں سے جکڑے ہوئے لائیں گے جب انسانوں سے جہنم کا فاصلہ سو سال کی مسافت کے برابر رہ جائے گا تو جہنم ایک سانس لے گی جس سے مخلوق کے دل اڑنے لگیں گے پھر دوبارہ سانس لے گی تو کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی بغیر دوزانو بیٹھ جانے کے نہیں رہے گا۔ پھر تیسرا سانس لے گی تو دل اچھل کر حلق تک آجائیں گے کسی کے حواس درست نہیں رہیں گے ہر شخص گھبرا جائے گا یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ عرض کریں گے اپنی خلت کا واسطہ میں صرف اپنی جان کے بچاؤ کی تجھ سے درخواست کرتا ہوں حضرت موسیٰؑ کہیں گے (تو نے اپنی مناجات سے سرفراز کیا) میں اس مناجات کا واسطہ دیتا ہوں اور صرف اپنے نفس کے بچاؤ کی تجھ سے درخواست کرتا ہوں حضرت عیسیٰؑ عرض کریں گے (تو نے مجھے عزت عطا فرمائی) تیرے کرم کا واسطہ میں صرف اپنی ذات کے لئے تجھ سے درخواست کرتا ہوں اپنی ماں مریمؑ کے لئے بھی عرض نہیں کرتا لیکن محمد ﷺ عرض کریں گے۔ میری امت کو بچا میری امت کو محفوظ رکھ۔ میں اپنی جان کو بچانے کی تجھ سے درخواست نہیں کرتا اللہ فرمائے گا تیری امت کے اولیاء کے لئے نہ خوف ہے نہ رنج اپنی عزت کی قسم میں تیری امت کے معاملہ میں تیری آنکھیں ٹھنڈی رکھوں گا (سجدہ سے) اٹھ کر کھڑا ہو جا اس وقت ملائکہ اللہ کے حضور میں حکم کے منتظر کھڑے ہوں گے۔

يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وہ کافر آدمی جس نے دنیوی سکھ میں رَبِّيْٓ أَكْرَمَنِ اور دکھ میں رَبِّيْٓ أَهَانَنِ کہا تھا اس روز اپنے گناہوں کو یاد کر کے توبہ استغفار کرے گا۔

وَأَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ استفہام انکاری ہے یعنی اس یاد سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا قبول توبہ کی شرط تو ایمان بالغیب ہے (قیامت کے ظہور کے بعد غیب نہ رہا سامنے دیکھ کر تو ہر ایک کو ماننا ہی پڑے گا۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ یہ ایک فرضی سوال کا جواب ہے سوال کیا جا سکتا تھا کہ ایسی حالت میں کافر کیا کرے گا اس کے جواب میں فرمایا اس وقت کہے گا۔ اے کاش میں دنیا میں اعمال صالحہ اپنی لازوال زندگی کے لئے پہلے سے بھیج دیتا۔ لِحَيَاتِيْ میں لام بمعنی وقت ہے، اس وقت مطلب یہ ہو گا کہ کاش میں اپنی دنیوی زندگی کے زمانہ میں اعمال صالحہ پہلے ہی کر لیتا۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ أَحَدٌ ﴿۲۵﴾ عَذَابَهٗ (مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہے) یعنی کعذابہ اس کے عذاب کی طرح کوئی (کسی کو) اس روز عذاب نہیں دے گا اسی طرح۔

وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ أَحَدٌ ﴿۲۶﴾ میں بھی (مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہے اور) کوثاقہ مراد ہے یعنی اس کی جکڑ بند کی طرح کوئی کسی کو قید نہیں کرے گا۔ عَذَابَهٗ اور وَثَاقَهٗ کی ضمیریں یا فاعلی ہیں یا مفعولی اول صورت میں اللہ کی طرف راجع ہیں یعنی قیامت کے دن اللہ جس طرح عذاب دے گا اور جس طرح جکڑ بند کرے گا اس کے سوا کوئی ایسا

نہیں کرے گا۔ اس روز سارا اختیار اسی کو حاصل ہوگا۔ دوسری صورت میں مفعول کی طرف اضافت ہے اور ضمیریں کافر کی طرف راجع ہیں یعنی دوزخ کا کوئی کارندہ جیسا عذاب اس کافر کو دے گا اور جیسے اس کو گرفتار کر کے باندھ دے گا ویسا نہ کسی کو عذاب دے گا نہ کسی کو باندھے گا۔ مذکورہ تشریحات اس صورت میں ہوں گی جب یَوْمَئِذٍ کو لَا یُعَذِّبُ اور لَا یُوْثِقُ کا ظرف زمان قرار دیا جائے لیکن اگر عَذَابَهٗ اور وَثَاقَهٗ سے یَوْمَئِذٍ کا تعلق مانا جائے تو مطلب اس طرح ہوگا کہ ازل سے ابد تک کسی نے کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہوگا اور نہ دے گا جیسا اس روز اللہ اس کافر کو دے گا نہ کبھی کسی نے کسی کو ایسا باندھا ہوگا اور نہ باندھے گا۔ جیسے اللہ اس کافر کو باندھے گا۔

یہ تمام مطالب مشہور قرات کی بناء پر ہیں لیکن کسائی اور یعقوب کی قرات میں لَا یُعَذَّبُ اور لَا یُوْثَقُ بصیغہ مجہول آئے ہیں اس قرات پر مطلب صاف ہے کہ کسی کو اس روز نہ ایسا عذاب دیا جائے گا جیسا عموماً کافروں کو یا مخصوص کافر یعنی امیہ بن خلف کو دیا جائے گا نہ کسی کو ایسا باندھا جائے گا جیسا اس کو باندھا جائے گا۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ﴿۲۷﴾　　اس جگہ یُقَالُ محذوف ہے یہ جملہ مستقلہ ہے گویا ایک فرضی سوال کا جواب ہے سوال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ کافر کی حالت تو مندرجہ بالا آیات سے واضح ہو گئی مگر مومن کی کیا حالت ہوگی۔

نفس مطمئنہ وہ نفس جس کو اللہ کی یاد اور اطاعت سے ایسا سکون حاصل ہوتا ہے جیسا مچھلی کو پانی میں حاصل ہوتا ہے ایسا سکون اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب نفس کو امارہ بنانے والی رذیل صفات سے بالکل پاک کر لیا جائے اور اوصاف قبیحہ زائل کر دیئے جائیں مگر ان ناپاک اوصاف کا ازالہ اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کے اوصاف حسنہ کا پرتو پڑ جائے اور نفس ان جلوہ پاشیوں میں فنا ہو کر بقاء باللہ حاصل کر لے۔ اس مرتبہ پر پہنچ کر ہی حقیقی ایمان حاصل ہوتا ہے جس طرح کتا ناپاک ہے اس کو کھانا حرام ہے اس کی طہارت اور حلت کی صرف یہی صورت ہے کہ اس کو نمک میں ڈال دیا جائے اور نمک کے ساتھ وہ بھی نمک ہو جائے اوصاف کلبی فنا ہو جائیں اور نمکی اوصاف حاصل ہو جائیں۔

ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ　　یعنی اسماء اور صفات کے پردوں کو ہٹا کر رب کی ذات محض کی طرف لوٹ آ۔

رَاضِیَةً　　یہ ارْجِعِیْ کے فاعل سے حال ہے مطلب یہ کہ اللہ کی ربوبیت محمد ﷺ کی رسالت اسلام کی ملت اور اللہ نے جو کچھ تیرے لئے مقدر کر دیا ہے اس پر راضی رہتے ہوئے اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس شخص نے ایمان کی لذت پالی جو اللہ کے رب ہونے پر محمد ﷺ کے رسول ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہو گیا۔ بخاری و مسلم ایمان کی لذت پانے سے مراد ہے حقیقی ایمان کا حاصل ہونا۔

مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾　　اور اس حالت میں اللہ کی طرف آ کہ اللہ بھی تجھ سے راضی ہے کیونکہ بندہ جب اللہ کی الوہیت سے راضی ہوتا ہے تو اللہ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے بلکہ اللہ سے بندہ کا راضی ہونا ہی رضا من جانب اللہ کی علامت ہے۔ حسن نے کہا جب اللہ نفس مطمئنہ کو قبض کرنا چاہتا ہے تو نفس کو اس سے سکون حاصل ہوتا ہے اور وہ اس پر راضی ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ اللہ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ حضرت عبادۃ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اللہ کی ملاقات پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے یہ سن کر حضرت عائشہؓ یا کسی دوسری بی بی نے عرض کیا ہم تو مرنے سے نفرت کرتے ہیں۔ فرمایا یہ مطلب نہیں مقصد یہ ہے کہ مومن کے سامنے جب موت آتی ہے اور اس کو اللہ کی طرف سے خوشنودی اور عزت بخشی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کو آئندہ ملنے والی نعمتوں سے زیادہ کوئی چیز مرغوب نہیں ہوتی اس لئے اس کو اللہ سے ملنے کی قلبی رغبت ہوتی ہے نتیجہ میں اللہ بھی اس کو پسند فرماتا ہے لیکن کافر کے سامنے جب موت آتی ہے اور اس کو اللہ کی طرف سے عذاب اور سزا کی اطلاع ملتی ہے تو آئندہ پہنچنے والے عذاب سے زیادہ اس کی نظر میں کوئی چیز قابل نفرت نہیں ہوتی اس لئے وہ اللہ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اللہ کو بھی اس کی ملاقات پسند نہیں ہوتی۔ بخاری و مسلم حضرت عائشہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ موت اللہ کی ملاقات سے پہلے ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن کے سامنے جب موت آتی ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں (اے پاک روح) خوش خوش اللہ کی رحمت وراحت کی طرف نکل چل تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی رب ناراض نہیں ہے اس کی جانب چل۔ روح مشک کی پاکیزہ ترین خوشبو کی طرح (مہکتی ہوئی) نکلتی ہے فرشتے اس کو دست بدست لے کر آسمان کے دروازوں تک پہنچتے ہیں آسمان والے فرشتے کہتے ہیں یہ کیسی پاکیزہ خوشبو ہے جو زمین کی طرف سے تم کو پہنچی ہے روح لے جانے والے ملائکہ اس روح کو مومنوں کی روحوں تک پہنچا دیتے ہیں ان کو اس کے پہنچنے سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ تم کو اپنے غائب مسافر کے آجانے سے بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی مومن اس سے پوچھتے ہیں (دنیا میں) فلاں شخص کا کیا حال ہے۔ دوسرے مومن کہتے ہیں اس کو آرام لینے دو یہ دنیا کے غم میں تھا روح کہتی ہے وہ تو مر چکا کیا تمہارے پاس نہیں آیا مومن کہتے ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ) اس کو اس کے اصلی ٹھکانے یعنی ہاویہ کی طرف پہنچا دیا گیا لیکن کافر کی موت کے وقت عذاب کے فرشتے ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں (اے خبیث روح) اللہ کے عذاب کی طرف نکل (آنے والے عذاب) تجھے ناگوار۔ اور اللہ تجھ سے ناخوش۔ روح فوراً سڑے ہوئے بدبودار مردار کی پھیلتی ہوئی بو کی طرح نکلتی ہے فرشتے اس کو لے کر زمین کے دروازہ تک پہنچتے ہیں زمین والے ملائکہ کہتے ہیں یہ کس قدر سڑی ہوئی بدبو ہے فرشتے اس روح کو کافروں کی روحوں کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں۔ احمد اور نسائی۔

ابن ماجہؒ کی حدیث بھی اسی طرح کی ہے اس میں اتنا زائد ہے کہ پھر مومن روح کو آسمان کی طرف چڑھایا جاتا ہے آسمان کا دروازہ اس کے لئے کھول دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے پاکیزہ روح کے لئے مرحبا جو پاکیزہ جسم میں تھی اور کافر روح کے متعلق فرمایا کہ اس کو آسمان کی طرف چڑھا کر لے جایا جاتا ہے (لیکن آسمان کا دروازہ اس کے لئے نہیں کھولا جاتا) اور کہا جاتا ہے خبیث روح کے لئے جو خبیث جسم میں تھی مرحبا نہیں ہے ذلیل حالت میں لوٹ جا تیرے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے پھر اس کو آسمان سے نیچے چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ قبروں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

اس مبحث کے متعلق بکثرت احادیث آئی ہیں نزاعی مسئلہ یہ ہے کہ یہ قول روح سے کس وقت کہا جاتا ہے بعض علماء قائل ہیں کہ مرنے کے وقت یہ بات کہی جاتی ہے احادیث اسی پر دلالت کر رہی ہیں ابو صالح نے کہا دنیا سے نکلنے کے وقت روح سے کہا جاتا ہے اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً اور قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ کچھ دوسرے علماء قائل ہیں کہ قبر سے اٹھائے جانے کے وقت روح سے کہا جائے گا۔ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ وادخلی فی اجساد عبادی اپنے رب کی طرف لوٹ آ اور میرے بندوں کے اجسام میں یعنی اپنے جسم میں داخل ہو جا پس (کہ اِرْجِعِیْ کا حکم) اجسام میں لوٹ کر داخل ہونے کے لئے ہوگا۔

یہ قول عکرمہ عطاء اور ضحاک کا ہے اور بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے حسنؒ نے آیات کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا کہ اللہ کے عطاء کردہ ثواب وعزت کی طرف لوٹ آ۔ اللہ نے جو کچھ تیرے لئے تیار کر رکھا ہے تو اس سے راضی اور خدا تجھ سے راضی۔ اور میرے بندوں میں یعنی میرے بندوں کے ساتھ (جنت میں) داخل ہو جا۔

میں کہتا ہوں آیت کی رفتار اسی تشریح کی تائید کر رہی ہے یعنی دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت روح سے یہ کہا جائے گا کیونکہ کافروں کے اٹھائے جانے کے وقت ان کی جو حالت ہوگی اس کے متعلق فرمایا تھا فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗٓ اَحَدٌ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَہٗٓ اَحَدٌ اسی طرح مومنوں سے بھی بعث کے وقت مذکورہ بالا قول کہا جائے گا لیکن احادیث مذکورہ سے اول قول (یعنی موت کے وقت کہنے) کی تائید ہوتی ہے دونوں کے تضاد کو دور کرنے کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں (مرنے اور اٹھائے جانے) کے وقت مذکورہ بالا قول کہا جائے گا۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ اس خطاب کا روح کو استحقاق دنیا میں ہی ہو جاتا ہے اور اس کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اس لئے اس سے کہا جاتا ہے اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ یعنی اللہ کے مراتب قرب اور انوار ذاتیہ کی طرف لوٹ آ۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ﴿۲۹﴾ یعنی اگر میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا یہ نیک بندے وہی ہیں جن میں داخل ہونے کی دعا حضرت سلیمان نے کی تھی اور عرض کیا تھا وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی انہیں کے ساتھ شامل ہونے کے لئے عرض کیا تھا تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ اور انہی نیک بندوں کے سلسلہ میں اللہ نے ابلیس سے فرمایا تھا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ۔

فَادْخُلِیْ میں فاء سببی ہے کیونکہ اطمینان نفس اور نفس کا راضی مرضی ہونا ہی خالص عبدیت کے حصول اور باطل الوہیت نفسانی کی رسی سے گلو خلاصی اور شیطانی وسوسوں سے نجات مل جانے کا سبب ہے۔ اللہ نے (نفس پرست کی مذمت کرتے ہوئے) فرمایا اَفَمَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے (دنیا پرست کی مذمت میں) فرمایا نفس عبد الدینا روالدرا هم والقطیفة و الخمیسة الخ

وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾ اللہ نے جنت کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرمائی اس اضافت کا تقاضا ہے کہ اس جنت کو دوسری جنتوں سے کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہو۔ سعید بن جبیر نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ کی وفات طائف میں ہوئی میں جنازہ میں موجود تھا اچانک ایک ایسا پرندہ آیا جس کی مثل کبھی کوئی پرندہ دیکھنے میں نہیں آیا اور آتے ہی نعش مبارک میں داخل ہو گیا پھر اس کو نعش کے اندر سے نکلتا ہوا ہم نے نہیں دیکھا۔ جب نعش دفن کر دی گئی تو قبر کے کنارہ کسی نے یہ آیت پڑھی یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ لیکن پڑھنے والا دکھائی نہیں دیا۔ معلوم نہیں کس نے پڑھی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت بریدہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عثمان غنیؓ کے حق میں ہوا تھا۔

فائدہ

بعض صوفیہ نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی کہ اے نفس جو دنیا پر مطمئن ہو بیٹھا ہے دنیا چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کر اور صوفیہ کے راستہ پر چل کر اللہ کی طرف چل۔ واللہ اعلم۔

سورۃ الفجر ختم ہوئی بعونہ و منہ تعالیٰ

سُوْرَۃُ الْبَلَدِ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۰ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ لَا (لفظاً) زائد ہے (معنی) تاکید قسم کے لئے مفید ہے لَا کی زیادتی سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس مدعا کو بیان کیا ہے وہ اتنا واضح الثبوت ہے کہ اس کے لئے قسم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ هٰذَا الْبَلَد سے مراد مکہ معظمہ ہے۔

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲ یہ جملہ گزشتہ هٰذَا الْبَلَد سے حال ہے اللہ نے مکہ کی قسم کھائی لیکن اس قید کے ساتھ کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ مقیم ہیں اس کی وجہ مکہ کی دوہری فضیلت کا اظہار ہے ایک تو مکہ خود ہی فضیلت رکھتا ہے (کہ اللہ نے اس کی قسم کھائی) دوسری فضیلت یہ کہ رسول اللہ ﷺ اس میں فروکش ہیں (اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں فروکش ہونا مکہ کی ذاتی فضیلت کو بڑھادیتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے مکہ کو خطاب کر کے فرمایا تھا تو کیسا پاکیزہ شہر ہے اور اللہ کو کس قدر پیارا ہے اگر میری قوم والے مجھے تیرے اندر سے نہ نکالتے تو میں تیرے علاوہ کہیں نہ رہتا۔ رواہ الترمذی عن ابن عباسؓ وقال حدیث حسن صحیح غریب اسناداً۔ اسی طرح ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہؓ بن عدی کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم تو سب سے برتر زمین ہے اور اللہ کو زمین کے ہر حصہ سے زیادہ پیاری ہے اگر مجھ کو تیرے اندر سے نکالا نہ جاتا تو میں نہیں نکلتا۔

حِلٌّ کا معنی مستحل بھی کیا گیا ہے یعنی اس شہر سے تمہارا نکال دینا حلال سمجھا جائے جس طرح دوسرے مقامات پر شکار کرنا حلال سمجھا جاتا ہے گویا یہ جملہ کفار کی مذمت کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ لوگ تم کو جلاوطن بنانے اور قتل کر دینے کو حلال قرار دیں گے۔

حِلٌّ کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکہ میں تمہارے لئے کسی کو قتل اور قید کرنا حلال ہے تمہارے لئے یہ جرم نہیں اس صورت میں یہ جملہ آئندہ کے متعلق ایک وعدہ ہوگا کہ آئندہ ایک وقت آئے گا کہ اس وقت اس شہر میں لوگوں کو قتل اور قید کرنا تمہارے لئے حلال کر دیا جائے گا چنانچہ فتح مکہ کے دن ایسا ہوا کہ حضور ﷺ نے مکہ میں مقاتلہ کیا اور عبداللہ بن حنظل کو مار ڈالنے کا حکم دیا ابن حنظل اس وقت کعبہ کے پردوں کو پکڑے ہوئے تھا اور مقیس بن خبابہ وغیرہ کے قتل کا بھی آپ ﷺ نے حکم دیا۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ آسمان و زمین کے آفرینش کے دن ہی اللہ نے اس شہر کو حرم بنا دیا تھا پس اللہ کے حرم بنانے کی وجہ سے روز قیامت تک یہ حرم ہے۔ مجھ سے پہلے یہاں قتال کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا اور میرے لئے بھی دن کی صرف ایک ساعت میں یہاں قتال حلال ہوا اب قیامت تک بحکم خدا یہ حرم ہے یہاں کی خار دار جھاڑیاں نہ کاٹی جائیں یہاں کے شکار کو نہ نکالا جائے یہاں گری پڑی چیز کوئی نہ اٹھائے سوائے اس شخص کے جو اس کی تشہیر کرنی چاہتا ہو اور یہاں کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے۔ الخ

وَوَالِدٍ بَلَد پر عطف ہے والد سے مراد ہیں حضرت آدمؑ یا حضرت ابراہیمؑ یا ہر والد کوئی ہو۔

وَّمَا وَلَدَ ۝۳ اس سے مراد ہے کل بنی آدم یا حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے پیغمبر یا رسول اللہ ﷺ لفظاً تنکیر پر دلالت کر رہا ہے اور تنکیر اظہار عظمت کے لئے ہے۔ مَنْ (جس شخص) کی جگہ مَا (جس چیز) کا استعمال تعجب کے طور پر ہے جیسے

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ میں (من کے بجائے ما ذکر کیا گیا)۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ یہ جواب قسم ہے الانسان میں لام جنسی ہے (کوئی انسان ہو) یا عہد کا ہے یہ اس روایت کے بموجب ہو گا کہ یہ آیت ابوالاشد کے متعلق نازل ہوئی ابوالاشد کا نام اسید بن کلدہ بن جمح تھا۔ یہ بڑا طاقتور تھا عکاظی چمڑا اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر کہتا تھا جو اس چمڑے سے میرے قدم کو ہٹا دے گا اس کو اتنا انعام ملے گا لیکن کوئی اس کے قدم کو ہٹا نہ سکتا یہاں تک کہ چمڑا کھینچنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا اور قدم اپنی جگہ جما رہتا تھا۔

فِیْ كَبَدٍ ۝ اگر الانسان سے جنس انسان مراد ہو تو کبد کا معنی ہو گا دکھ مشقت یعنی ہر انسان کو ہم نے دکھ میں پیدا کیا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت قتادہ کا یہی قول مروی ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف مندرجہ ذیل توضیح کی نسبت کی ہے کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا یعنی حالت حمل پھر ولادت پھر شیر خوارگی کی انتہا پھر حصول معاش پھر (مشاغل) حیات اور آخر میں مرنے کے دکھ میں رکھا۔

عمر بن دینار نے کہا منجملہ دکھوں کے دانت نکلنے کا دکھ بھی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ دشواریاں تو انسان اور دوسرے جانوروں میں مشترک ہیں صرف انسان کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ انسان عقل اور شعور رکھتا ہے کمال احساس کے ساتھ شدائد کو برداشت کرنا بے شعوری کے ساتھ برداشت کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔

میرے نزدیک کَبَد سے مراد اس بار امانت کی برداشت ہے جس کو اٹھانے سے آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ اب اگر یہ اپنے فرض کو ادا کرے گا تو کامیاب ہو جائے گا اللہ مومن مردوں اور عورتوں پر رحم فرمائے گا اگر فرض ادا نہ کرے گا تو تباہ ہو جائے گا اور آخرت کی تکالیف میں مبتلا ہو جائے اللہ منافق اور کافر مردوں اور عورتوں کو عذاب دے گا اس مطلب کی بناء پر اس آیت کا مفہوم آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ کے مفہوم کی مثل ہو جائے گا۔ رسول اللہ کو تبلیغ اسلام کے سبب قوم والوں کی طرف سے جو سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں ان کی برداشت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے اس آیت میں تسکین آفرینی ہے۔ مقاتل نے نزول آیت کو ابوالاشد کے متعلق قرار دیتے ہوئے کہا کہ کبد کا معنی ہے قوت اور طاقت۔

اَيَحْسَبُ اس کا فاعل الانسان ہے اگر الانسان سے مراد ابوالاشد ہو تو اس کو فریب خوردگی اور غرور سے باز داشت ہو گی اور اگر جنس انسان مراد ہو تو اس وقت عام انسان کی طرف يَحْسَبُ کی ضمیر راجع ہو گی مگر (خارج میں کلی کا تحقق افراد اور اشخاص کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے ضمیر راجع کرنے کے وقت) بعض اشخاص کا خصوصی لحاظ ہو گا اور کوئی ایسا انسان مراد ہو گا جس سے رسول اللہ ﷺ کو بہت زیادہ دکھ پہنچتا تھا یعنی وہی ابوالاشد اور بعض کے نزدیک ولید بن مغیرہ۔ بہر حال استفہام انکار اور زجر کے لئے ہے۔

اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ کیا اس کا یہ خیال ہے کہ کوئی بھی اس پر قدرت نہیں رکھے گا ایسا اس کو خیال نہ رکھنا چاہئے نفی کے بعد اَحَد کو نکرہ لانا مفید عموم ہے (کوئی ایک بھی) ابوالاشد کا گمان تھا کہ عذاب کے فرشتے اس پر قابو نہیں پائیں گے۔ یا اُحَد ہے مراد اللہ ہے جس نے ابوالاشد کو اتنی عظیم الشان پیدائشی قوت عطا فرمائی تھی اس کا خیال تھا کہ خدا کو بھی اس سے انتقام لینے کی طاقت نہیں۔

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ یہ جملہ يَحْسَبُ کے فاعل کی حالت کا بیان ہے وہ کہتا ہے میں نے تو خود مال کثیر خرچ کر ڈالا۔ لُبَد لُبَدَة کی جمع ہے لبدة بہت جمع شدہ کثیر۔ ابوالاشد کا یہ قول یا تو اظہار فخر اور دکھاوٹ کے لئے تھا یا یہ مراد ہے کہ میں رسول کی مخالفت میں کثیر مال خرچ کر چکا اس وقت اس جملہ کی غرض یہ ہو گی کہ میں دوسرے قریشی غیر مسلموں کے مقابلہ میں اونچا درجہ رکھتا ہوں (کیونکہ میں نے رسول کی عداوت میں کثیر مال خرچ کیا ہے) اس لئے تمام کفار قریش کو میری برتری کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ؕ کیا اس کا یہ خیال ہے کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا یقیناً اللہ اس کو اس وقت دیکھ رہا تھا جب وہ ریاکاری کے طور پر یا رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کر رہا تھا۔ اللہ اس سے ضرور باز پرس کرے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور لامحالہ اس کو اس کی سزا بھی دے گا۔ آیت کی یہ تشریح سعید بن جبیر اور قتادہ کے قول کے موافق کی گئی ہے۔ کلبی کا قول ہے کہ ابوالاشد جھوٹا شیخی باز تھا جو کثیر مال خرچ کرنے کا دعویٰ کرتا تھا اس نے اپنے بیان کے مطابق مال نہیں خرچ کیا تھا۔ اس جملہ سے پہلے اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ تھا اس جملہ سے زجر و انکار کی مزید تاکید کر دی گئی۔

اللہ کو انتقام کی قدرت ہے اس کے ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل دلیل میں اللہ نے اپنی چند عمومی نعمتیں ذکر فرمائیں تاکہ منکر بھی اقرار پر مجبور ہو جائے فرمایا۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں جن سے وہ دیکھتا ہے۔

وَلِسَانًا اور کیا اس کی زبان نہیں بنائی جس سے وہ بات کرتا ہے۔

وَّشَفَتَيْنِ ۙ اور دو لب نہیں بنائے جن سے منہ پر پردہ پڑا ہے اور بولنے کھانے پینے اور پھونکنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے اللہ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم اگر تیری زبان ناجائز چیزوں کے لئے تجھ سے کشاکش کرے تو میں نے اس کے خلاف تیری مدد کے لئے دو ڈھکن تجھے دیئے ہیں تو اس کو ڈھکن میں بند کر دے (اور ناجائز بات زبان سے نہ نکال) اور اگر تیری نگاہ ناجائز چیزوں کے لئے تجھ سے کشاکش کرے تو تیری مدد کے لئے میں نے دو غلاف دے دیئے ہیں تو ان غلافوں میں اس کو بند رکھ اور اگر تیری شرم گاہ ناجائز امور کی طرف تجھے کھینچے تو میں نے تیری مدد کے لئے دو پردے دے دیئے ہیں ان پردوں میں اس کو بند رکھ۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ اور ہم نے اس کو دو راستے بتا دیئے یعنی دودھ پینے کے لئے (ماں کی) چھاتیاں۔ بروایت محمد بن کعبؓ حضرت ابن عباسؓ نے یہی فرمایا سعید بن میتب اور ضحاک کا بھی یہی قول ہے لیکن اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ اَلنَّجْدَيْن سے مراد ہیں خیر و شر، حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے راستے مطلب یہ ہے کہ عقل دے کر اور پیغمبروں کو بھیج کر ہم نے اچھائی برائی واضح کر دی اب جو شر کا راستہ اختیار کرے گا اور گمراہ ہو گا اس کا کوئی عذر (قیامت کے دن قبول نہ ہو گا)۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ فَلَا میں بعض کے نزدیک لا اپنے اصل معنی (نفی) میں نہیں بلکہ ھلا کے معنی میں ہے کیونکہ جب تک تکرار نہ ہو لا ماضی پر نہیں آتا اس وقت مطلب اس طرح ہو گا کہ اللہ کی اطاعت میں مال اس نے کیوں خرچ نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ سے گھاٹی کو عبور کر لیتا (زندگی کی یا جنت کی یا اطاعت کی گھاٹی) اور رسول اللہ ﷺ کی عداوت میں صرف کرنے سے اطاعت رسول میں صرف کرنا اس کے لئے بہتر ہو جاتا۔

بعض علماء نے کہا اس جگہ لا اپنے معنی پر ہے لا کا مدخول اگرچہ لفظاً مکرر نہیں مگر معنوی تعدد ضرور ہے کیونکہ عقبہ کے مرادی معنی میں تعدد ہے (عقبہ سے مراد ہے (۱) فک رقبہ (۲) اور اطعام مسکین (۳) اور مومن ہونا) اصل کلام اس طرح تھا فَلَا فَكَّ رَقَبَةً وَّلَا اَطْعَمَ مِسْكِيْنًا وَّلَا كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا نہ اس نے کسی بردہ کی گلو خلاصی کی نہ مسکین کو کھانا دیا نہ مومنوں میں سے ہوا۔

اول الذکر تقدیر پر اس جملہ کا عطف اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا پر ہو گا اور موخر الذکر تفسیر پر جواب قسم پر عطف ہو گا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے انسان کو اوامر و نواہی کے دکھ میں پیدا کیا مگر وہ تحمیل احکام کی گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا اور نہ اس نے اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کیا یا اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا الخ کے مضمون پر عطف ہو گا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اس

کی آنکھیں زبان اور دونوں لب بنائے اور دو راستے بھی اس کو بتا دیئے مگر وہ اطاعت کی راہ میں داخل ہی نہیں ہوا کہ ان نعمتوں کا صَرف ان کے مصرف میں ہو جاتا اور منعم کے انعام کا شکر کچھ پورا ہو جاتا۔

عَقَبَۃٌ اصل لغت میں پہاڑی راستہ کو کہتے ہیں۔ اقتحام گھسنا۔ یہاں مراد ہے اوامر و نواہی کی پابندی کی مشقت برداشت کرنا۔ قتادہ۔ بعض علماء نے کہا کہ اِقْتِحَامِ عَقَبَۃ سے مراد ہے۔ گھاٹی کو پار کر لینا اور اداء واجب سے عہدہ بر آ ہو جانا۔ کیونکہ گناہ گار پر گناہ کرنے کا بار اور اداء واجبات کی ذمہ داری پہاڑی گھاٹی کے مشابہ ہے اور فرائض مذکورہ کو ادا کر دینا گھاٹی کو عبور کر لینے سے مشابہت رکھتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا یہ عقبہ جہنم کا ایک پہاڑ ہے۔ حسنؒ (بصری) اور قتادہؒ نے کہا عقبہ جہنم میں پل سے ورے ایک گھاٹی ہے جس کا عبور اللہ کی اطاعت سے ہوگا۔

مجاہدؒ، ضحاکؒ اور کلبیؒ نے کہا۔ عقبہ جہنم پر ایک پل ہے تلوار کی دھار کی طرح (باریک اور تیز) جس کی چڑھائی اور اتار اور میدانی رفتار کی مسافت تین ہزار برس کی راہ کے برابر ہے اس کے دونوں طرف سعدان کے کانٹوں کی طرح کانٹے اور آنکڑے لگے ہیں کوئی اس پر سے صحیح سالم نکل جائے گا۔ کوئی خراش اور کھرونچ پا کر اور کوئی سرنگوں جہنم میں چلا جائے گا۔ پھر کوئی بجلی کی طرح گزر جائے گا، کوئی تیز آندھی کی طرح، کوئی گھوڑے کے سوار کی طرح کوئی پیادہ کی طرح کوئی سرینوں کے بل سرکے گا اور کچھ لوگ پھسل کر گریں گے اور کچھ زخمی ہو کر جہنم میں چلے جائیں گے۔

ابن زیدؒ نے کہا اللہ فرماتا ہے پھر کیوں راہ نجات پر نہیں چلتا۔ راہ نجات کونسی ہے آئندہ خود ہی اس کو بیان فرما دیا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ اور تم کو کیا معلوم کہ عَقَبَہ کیا ہے تم کو نہ اس کی صعوبت کا علم ہے نہ اس کی کثرت ثواب کا۔ ابن عیینہ کا قول ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ نے مَآ اَدْرٰىكَ فرمایا اس کی اطلاع بعد کو دے دی اور جس چیز کے متعلق مَا يُدْرِيكَ فرمایا اس کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔

اگر عقبہ سے مراد اطاعت ہو تو عبارت میں کسی لفظ کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں اور اگر گناہ کا بار مراد ہو تو مضاف محذوف ہوگا کلام اس طرح ہوگا تم کیا جانو کہ گناہ کے راستہ میں داخلہ اور اس سے خروج کیا ہے۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ فَكُّ رَقَبَۃٍ گلو خلاصی۔ عام ہے۔ پورا غلام آزاد کرنا یا قیمت دے کر آزاد کروانا یا مکاتب کی مدد کرنا یا کسی غلام کی اگر کچھ آزادی باقی ہو تو بقدر آزادی روپیہ سے اس کی مدد کرنا سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔

ارشاد فرمایا تو نے اگرچہ لفظ چھوٹا بولا مگر درخواست لمبی چوڑی کی بردہ آزاد کر اور گلو خلاصی کر۔ اعرابی نے عرض کیا کیا یہ دونوں چیزیں ایک ہی نہیں ہیں فرمایا نہیں بردہ آزاد کرنا یہ ہے کہ تم تنہا پورا بردہ آزاد کرو۔ اور گلو خلاصی کا یہ مطلب ہے کہ غلام یا باندی کی قیمت ادا کرنے میں تم مدد کرو اور منحہ بخشش یہ ہے کہ مہربانی کے ساتھ اپنے ظالم رشتہ دار کی طرف تم خود رجوع کر لو اگر اس کی (یعنی غلام آزاد کرنے کی) تم میں طاقت نہ ہو تو بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور پیاسے کو پانی پلاؤ اچھا کام کرنے کا حکم دو اور بری بات سے باز داشت کرو اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کلمہ خیر کے علاوہ زبان روکے رکھو بیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مسلمان بردہ آزاد کیا۔ اللہ اس کے ہر عضو کے مقابل آزاد کرنے والے کے اسی عضو کو دوزخ سے آزادی دے گا یہاں تک کہ اس کی شرم گاہ کے مقابل اس کی شرم گاہ کو متفق علیہ۔ عکرمہ نے کہا فَكُّ رَقَبَۃٍ سے مراد ہے گناہوں سے توبہ کر کے اپنے نفس کو آزاد کرنا۔

اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾

مَسْغَبَۃ، مَقْرَبَۃ اور مَتْرَبَۃ تینوں بروزن مَفْعَلَۃ ہیں سغب بھوکا ہوا قرب فی النسب نسب میں قریب ہوا ترب فقیر

ہو گیا انتہائی محتاجی کی وجہ سے خاک پر پڑ گیا۔ بھوکے ہونے کی نسبت یوم کی طرف حقیقی نہیں (دن بھوکا نہیں ہوتا) مجازی ہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِقْتَحَمَ پر یا فکّ پر عطف ہے (بہر حال نفی کے ماتحت ہے) ثُمَّ (تراخی زمانی کے لئے آتا ہے یعنی ثم کے مابعد کا زمانہ ماقبل کے زمانہ سے موخر ہوتا ہے لیکن یہاں ایسا ہونا ناممکن ہے کیونکہ ہر عمل صالح کی بناء ایمان پر ہے اگر عمل صالح مع ایمان نہ ہو تو ایسا عمل آخرت میں مفید اجر نہیں اس لئے اس جگہ ثمّ کا استعمال مجازی ہے یعنی مرتبہ کا بلند اور بعید ہونا) عتق اور اطعام سے ایمان کے بعید المرتبہ ہونے کو ظاہر کر رہا ہے ایمان بجائے خود مستقل (افادی حیثیت رکھتا) ہے اور تمام اطاعتیں ایمان کے ساتھ مشروط ہیں۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ شخص ان لوگوں میں سے نہ تھا (یا نہوا) جو ایمان لائے اور ایک نے دوسرے کو نصیحت کی گناہوں سے بچنے کی اطاعت پر پابندی کی اور راہ حق میں پیش آنے والے مصائب پر ثابت قدم رہنے کی اور اللہ کے بندوں پر رحم کرنے کی یا ایسے اعمال اختیار کرنے کی جو اللہ کی رحمت کے جاذب ہیں۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾ مندرجہ بالا صفات کے حامل بابرکت ہیں اور دائیں جانب والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا اور جن لوگوں نے ہماری آیات یعنی قرآن کو یا ہماری قائم کردہ دلائل صداقت یعنی کتاب اللہ اور حجت عقلیہ کو نہ مانا۔

هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿١٩﴾ وہی لوگ منحوس یا بائیں طرف والے ہیں۔

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾ وہی آگ کے طبقات میں بند کئے جائیں گے۔

ع ۱ ۲۰ ۱۵

مُؤْصَدَةٌ اوصدت الباب سے بنایا گیا ہے میں نے دروازہ بند اور مقفل کر دیا۔ سورۃ البلد ختم ہوئی۔

بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ الشمس

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۵ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝۱ آفتاب اور اس کی روشنی کی قسم مجاہدؒ اور کلبیؒ نے کہا یعنی طلوع کے وقت آفتاب کی روشنی کی قسم کیونکہ اس وقت کی روشنی صاف ہوتی ہے۔ قتادہؒ نے کہا ضحیٰ سے مراد پورا دن ہے مقاتل نے کہا سورج کی گرمی مراد ہے۔ قاموس میں ہے ضَحِيَّة بروزن عَشِيَّة دن چڑھ جانا ضحیٰ بغیر مدہ کے اور ضحاء مد کے ساتھ قریب دوپہر۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝۲ یعنی چاند کی قسم جب آفتاب کے طلوع کے پیچھے اس کا طلوع ہو ایسی صورت ہر مہینہ کے نصف اول میں ہوتی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ چاند کی قسم جب آفتاب کے غروب کے پیچھے اس کا طلوع ہو یا چاند کی قسم جب وہ پوری گولائی اور کامل روشنی میں سورج کا تابع ہو (یعنی پورا چاند) زجاج نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے یہ دونوں صورتیں ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کی راتوں میں ہوتی ہیں۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝۳ اور دن کی قسم جب وہ سورج کو یا تاریکی کو یا زمین کو روشن کر دے۔ روشن کرنے کی طرف دن کی نسبت مجازی ہے۔ جیسے صام نہارہ اس کے دن نے روزہ رکھا۔ ھا ضمیر آفتاب کی طرف راجع ہے دن پھیلنے سے سورج نمایاں ہو جاتا ہے یا ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہے یعنی تاریکی یا زمین۔ یا دنیا۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝۴ اور رات کی قسم جب رات سورج کو یا آفاق کو یا زمین کو ڈھانک لے۔ تینوں آیات میں اِذَا ظرف زمان کا تعلق جمہور کے نزدیک فعل قسم سے ہے۔ لیکن بحر الامواج کے مؤلف نے لکھا ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ قسموں کا وقوع ان اوقات میں مراد نہیں۔ نہ اس کو قمر اور نہار اور لیل کی صفت قرار دیا جا سکتا ہے۔

کیونکہ ظرف زمان فعل کی صفت ہوتا ہے یعنی وقوع فعل زمانہ میں ہوتا ہے کسی امر حسی کی صفت نہیں ہوتا۔ اس لئے بر مسلک جمہور تاویل کی ضرورت ہے اور مضاف کو محذوف مانا جائے گا۔ مطلب اس طرح ہوگا۔ چاند کے اس انجلاء کی قسم جو سورج کے پیچھے چلنے کے وقت اس کو حاصل ہوتا اور دن کے اس نمود کی قسم جو سورج کو نمایاں کرتے وقت ہوتا ہے اور رات کے نمودار ہونے کی قسم جو آفاق پر چھا جانے کے وقت ہوتا ہے اور اس تاویل پر ظرف زمان مضاف محذوف کی صفت ہوگا یا اس سے متعلق ہوگا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تینوں آیات میں اِذَا ظرفیہ نہ ہو۔ بلکہ اِذَا کا معنی ہی وقت ہو جیسے اذا یقوم زید اذا یقعد عمرو یعنی عمرو کے بیٹھنے کے وقت زید کا قیام ہوتا ہے اس وقت اِذَا اپنے مابعد سے مل کر مقسم بہ ہوگا یعنی مقسم بہ سے بدل۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝۵ آسمان کی قسم اور اس کی جس نے اس کو بنایا یعنی اللہ کی مَا مَنْ کے معنی میں ہے عطاء اور کلبی کا یہی قول ہے۔

سوال

اس وقت سوء ادب لازم آئے گا قسم کے وقت غیر اللہ کی اللہ پر تقدیم سوء ادب ہے (کیونکہ اللہ کی عظمت کے مقابلہ میں دوسری ہر چیز بے مقدار ہے)۔

جواب

اس وقت ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو گی یہی کمال ادب ہے (یعنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قسمیں پہلے کھائیں اور آخر میں عظیم الشان ہستی کی قسم کھائی)

زجاج اور فراء نے کہا ما مصدری ہے یعنی آسمان اور اس کے بنانے (یا بناوٹ) کی قسم

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝ اس آیت میں بھی مَا بمعنی مَنْ ہے یا مصدری ہے یعنی زمین کی اور اس کو بچھانے والے کی یا بچھانے کی قسم یہی مراد آئندہ آیت

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ میں ہے۔ یعنی نفس کی اور اس ذات کی قسم جس نے اس کی تخلیق متوازن کی اور تقاضاء حکمت کے موافق اس کی تخلیق کا فیصلہ کیا۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ صاحب کشاف کی تقلید میں بیضاوی نے بھی لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں ما کو مصدری قرار دینے سے عبارت میں اختلال پیدا ہو جائے گا کیونکہ سوّٰی فعل کو فاعل سے مجرد کرنا ضروری ہو گا اور اَلْهَمَ فعل ہے اس کا عطف مَاسَوّٰی پر ہو گا تو مصدر پر فعل کا عطف ہو جائے گا اس لئے ما مصدری نہیں (بلکہ مَنْ کے معنی میں ہے اور) سَوّٰی کا فاعل اللہ ہے اسی طرح اَلْهَمَ کا فاعل بھی وہی ہے۔ لیکن بحر الامواج کے مولف نے لکھا ہے کہ اَلْهَمَ کا عطف سَوّٰی پر ہے (اس لئے جس طرح مَا کی وجہ سے سَوّٰی بمعنی مصدری ہے اسی طرح الھم بھی بمعنی مصدری ہے) اس طرح مصدر پر فعل کا عطف لازم نہیں آئے گا۔

نفس کی تنوین اظہار کثرت و عموم کے لئے ہے جیسے آیت عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ میں ہے یا اظہار عظمت کے لئے ہے اور ایک فرد مراد ہے یعنی حضرت آدمؑ کا نفس عطاء نے کہا تمام جن وانس مراد ہیں۔ الہام فجور و تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے ہر شخص کے سامنے خیر و شر اور اطاعت و معصیت کا راستہ کھول دیا تاکہ خیر اور اطاعت کو اختیار کرے اور شر و معصیت سے پرہیز رکھے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہی مطلب مروی ہے۔

لیکن سعید بن جبیر اور ابن زید نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے انسان کے لئے بدکاری یا تقوی کو لازم کر دیا ہے اس کے دل میں وہی میلان پیدا کر دیتا ہے جو انسان چاہتا ہے یا نفس کو تقوی کی توفیق دیتا ہے اور دل میں تقوی پیدا کر دیتا ہے یا نفس کو بدکاری کے لئے بے مدد چھوڑ دیتا ہے اور دل میں بدکاری کی تخلیق کر دیتا ہے زجاج نے اسی مطلب کو پسند کیا ہے۔

حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ قبیلہ مزینہ کے دو آدمیوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو فرمائیے کہ آج کل لوگ جو کچھ عمل اور مشقت کرتے ہیں کیا یہ کوئی پہلے سے فیصل شدہ امر اور گزشتہ تقدیر کے موافق ہے یا آئندہ ہونے والے اختیاری امور ہیں جو نبی لے کر آتا ہے اور بصورت نافرمانی لوگوں پر حجت قائم ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ نہیں۔ بلکہ یہ فیصلہ شدہ امر اور سابقہ تقدیر ہے اور اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں موجود ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام آدمیوں کے دل ایک دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جدھر چاہتا ہے ان کو موڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف موڑ دے۔ مسلم۔

فجور کو تقویٰ سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ علاوہ رعایت سجع کے یہ بھی ہے کہ نفس کا امارہ بالسوء ہونا اصل ہے (اور پرہیزگار بن جانا بعد کی چیز ہے)

اور دوسرا اور تیسرا واؤ باتفاق علماء قسمیہ ہے اور اس کے بعد والے واؤ میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک وہ بھی قسم کے

لئے بہر حال تینوں پہلے واؤ عطف کے لئے نہیں ہیں ورنہ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا جیسی آیات میں دو مختلف عاملوں کے معمول پر عطف لازم آئے گا کیونکہ اللیل واؤ قسم کی وجہ سے مجرور ہے اور اِذَا يَغْشٰى محذوف فعل قسم کی وجہ سے منصوب۔ اب وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا میں واؤ کو عطف کے لئے قرار دیا جائے گا تو یہ واؤ فعل کا بھی قائم مقام ہوگا اور حرف جر کا بھی۔

صحیح بات یہ ہے کہ صرف پہلا واؤ قسمیہ اور باقی عاطفہ کیونکہ پہلی قسم کی تکمیل کے بغیر اس کے اندر دوسری قسم کو داخل کر دینا جائز نہیں اور واؤ عطف صرف واؤ قسم کے قائم مقام ہے لیکن واؤ قسم باء قسم اور فعل قسم کے مجموعہ کے قائم مقام ہوتا ہے اسی لئے واؤ قسم کے ساتھ فعل قسم کو ذکر کرنا جائز نہیں۔ گویا واؤ قسم کا عمل نصب بھی ہے اور جر بھی یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک عامل کے دو عمل ہوتے ہیں (ضرب زید عمروا۔ ضرب عامل ہے زید کو فاعل ہونے کی بناء پر رفع اور عمروا کو مفعول ہونے کی وجہ سے نصب ایک ہی وقت میں دیتا ہے)۔

پس دو معمولوں پر دو چیزوں کا عطف ہو جائے گا اور یہ بالاتفاق جائز ہے جیسے ضرب زید عمروا وبکر خالدا اس تاویل کی اس وقت ضرورت پڑے گی جب ظروف کا تعلق فعل قسم سے قرار دیا جائے لیکن مولف بحر الامواج کی تفسیر پر تو اس توجیہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ کامیاب ہوا وہ شخص جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا زکي کا فاعل اللہ ہے اور ھا ضمیر من کی طرف راجع ہے (مگر مَنْ مذکر ہے اور ھا ضمیر مونث) اس کی وجہ یہ ہے کہ مَنْ سے واقع میں نفس ہی مراد ہے (اور نفس مونث ہے)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں نے خود سنا حضور ﷺ آیت قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا کی تشریح میں فرما رہے تھے وہ نفس کامیاب ہو گیا جس کو اللہ نے پاک کر دیا۔ رواہ ابن جریر من طریق جویبر۔

مسلم۔ ترمذی۔ نسائی اور ابن ابی شیبہؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا الٰہی میں تیری پناہ چاہتا ہوں بے بسی سے سستی سے بزدلی سے زیادہ بڑھاپے سے اور عذاب قبر سے الٰہی میرے نفس کو تقویٰ و طہارت عطا فرما تو سب سے بڑھ کر نفس کو پاک کرنے والا ہے تو نفس کا کارساز اور مولیٰ ہے الٰہی میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو فائدہ بخش نہ ہو اس دل سے جو خشوع والا نہ ہو اس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو قبول نہ ہو۔

آیت کا مطلب اس تفسیر پر یہ ہو گا کہ جس نفس کو اللہ نے اپنی صفاتی جلوہ پاشیوں کے ذریعہ سے رذائل سے پاک کر دیا یہاں تک کہ وہ اللہ سے اور اللہ کے احکام سے رضامند ہو گیا اس کی یاد اور اطاعت سے اطمینان اندوز ہو گیا اس کے ممنوعات سے اور ان تمام امور سے جو اللہ سے روکنے والے ہیں مجتنب بن گیا وہی کامیاب ہو گیا۔ حسن بصریؒ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا کہ جس شخص نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اس کو صالح بنا لیا اور اللہ کی اطاعت پر آمادہ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ گویا حسن بصریؒ کے نزدیک زَكّٰى کی ضمیر مَنْ کی طرف راجع ہے۔ اول الذکر تفسیر پر یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہو گا جو مراد خداوندی بن گئے ہیں (ان کا اپنا ارادہ کچھ بھی نہیں رہتا) اور موخر الذکر تفسیر پر یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہو گا جو مشیت الٰہی کا ارادہ کرتے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے برگزیدہ بنا دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو اپنا راستہ بتا دیتا ہے۔

یہ آیت قسم کا جواب ہے (یعنی اسی بات کو ظاہر کرنے کے لئے مذکورہ بالا قسمیں کھائی گئی ہیں لیکن جواب قسم ہونے کی بناء پر قد سے پہلے لام آنا ضروری ہے اس کے جواب میں) زجاج نے کہا کہ کلام سابق کا طول خود لام کا بدل ہو گیا گویا جب اللہ نے لوگوں کو کوشش اور سعی بلیغ کے ساتھ نفوس کو پاک کرنے پر برانگیختہ کرنا چاہا تو ایسی قسمیں کھائیں جن سے خالق کا وجود اور اس کا ازلی ابدی ہونا اور اس کی صفات کاملہ کا ثبوت دلائل کی روشنی میں واضح ہو گیا اور اس طرح قوت نظریہ (فکر و عقیدہ کی طاقت) اپنی اعلیٰ چوٹی پر پہنچ گئی اور قسموں کے ذیل میں ہی اللہ نے اپنی پر عظمت آیات رحمت کا ذکر فرمایا تاکہ انسان ادائے شکر میں پوری توجہ کے ساتھ منہمک ہو جائے اور یہی درجہ قوت عملیہ کے کمال کا ہے۔ علم و عمل کی تکمیل پر ہی اللہ کی طرف سے

جذب اور بندہ کی طرف سے تقویٰ مرتب ہوتا ہے اور اس طرح نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔[1]

بعض علماء کا قول ہے کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا کے بعد یہ (اور اس کے بعد آنے والا) جملہ معترضہ ہے اور دونوں فریق (کافر و مومن) کے فرق کو واضح کرنے کے لئے اس کو ذکر کیا گیا ہے اور قسم کا جواب محذوف ہے جس پر آیت كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا دلالت کر رہی ہے کیونکہ قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کی تکذیب کی تو اللہ نے اس کو تباہ کر دیا پس تکذیب ثمود کی طرح جب کفار مکہ بھی رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کر رہے ہیں تو ان کو بھی خدا تباہ کر دے گا۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝١٠ یعنی جس کے اندر اللہ نے گمراہی پیدا کر دی اور تخلیق ضلال کی وجہ سے اس کو ہلاک کر دیا، وہ نامراد رہا یا یہ مطلب کہ جس نے خود گمراہی کو اختیار کر کے اپنے نفس کو ہلاک کر لیا وہ نامراد رہا۔ دَسَّا اصل میں دَسَّسَ تھا آخری سین کو حرف علت (الف سے بدل دیا جیسے تقضی اصل میں تقضض تھا تدسس کا معنی ہے چھپانا اللہ نے فرمایا ہے أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ یا اس کو مٹی میں چھپا دے۔ آیت میں ہلاک کرنا مراد ہے کیونکہ ہلاک کرنا اخفاء کو مستلزم ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۝١١ یہاں سے سورت کے ختم تک خَابَ کی تاکید معنوی ہے۔ كَذَّبَتْ کا مفعول محذوف ہے (یعنی حضرت صالحؑ کی نبوت اور ہدایت) بِطَغْوَاهَا میں باء سببی ہے یعنی ثمود کی قوم چونکہ کفر کی آخری حد سے آگے بڑھ چکی تھی اس لئے اس نے حضرت صالحؑ کے پیام توحید و نبوت کی تکذیب کی حضرت صالحؑ نے قوم سے فرمایا تھا إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ مگر قوم والوں نے جواب دیا۔

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ قوم والوں نے نشان صداقت کے طور پر ایک معین پتھر سے دس ماہہ گابھن اونٹنی کو برآمد کرنے کی بھی خواہش کی تھی اور حضرت صالحؑ کی دعا سے اونٹنی پتھر کے اندر سے برآمد

زجاج کے قول کی تشریح یہ ہے کہ فطری طور پر نفس انسانی کو دو قوتیں دی گئی ہیں۔ نظریہ اور عملیہ۔ نظریہ کو علمیہ اور فکریہ اور اعتقادیہ بھی کہا جا سکتا ہے اس کا کام خالص فکری علمی امور کو جاننا غور کرنا کائنات اور خالق کائنات کے احوال کو پہچاننا اور سمجھنا ہے علوم سفلی طبعی ہوں یا فلکی اور علوی یا الٰہی اور فوق الطبعیاتی سب کا حصول قوت نظریہ سے ہی ہوتا ہے مگر عملی علوم کی تحصیل اس قوت سے نہیں ہوتی سچ اچھا ہے جھوٹ برا ہے شکر واجب ہے کفران نعمت حرام ہے۔ غرض سارے اخلاقی سماجی تمدنی اور سیاسی علوم و معارف کا تعلق قوت نظریہ سے نہیں بلکہ قوت عملیہ سے ہے۔ ان دونوں قوتوں کے استکمال کے بعد نفس انسانی پاکیزہ اور جہالت و خباثت کے میل کچیل سے صاف ستھرا ہو جاتا ہے اور اگر ان قوتوں کی تکمیل نہ ہو سکی تو جتنی کثافت ان میں باقی ہو گی اتنی ہی آلودگی اور آغشتگی نفس میں ہو گی اگر مبدء کائنات تخلیق کائنات، ترتیب کائنات نظم کائنات اور مآل کائنات کا علم صحیح حاصل ہو جائے اور خالق کائنات کی ہستی اور صفات ہستی کے متعلق علم میں غلطی نہ ہو تو بس قوت نظریہ کی یہی معراج ہے اور اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد نفس کا فکری رخ روشن ہو جاتا ہے اس کے عقائد و افکار کے آئینہ پر کوئی داغ دھبہ نہیں ہوتا اس کی عقلی نظر پاک ہو جاتی ہے اس کے بعد اگر اخلاقی سماجی اور معاشرتی و انتظامی امور سے تعلق رکھنے والے معلومات میں بھی غلطی نہ ہو اور انسان اعمال حسنہ کو حسنہ اور قبیحہ کو قبیحہ جاننے لگے اور صحیح علم کی روشنی میں اس کے اعمال بھی صحیح ہو جائیں اور اللہ کے قائم کردہ ضوابط خیر و شر کو جاننے کے بعد ان کا پابند بھی بن جائے تو قوت عملیہ بھی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ جاتی ہے اور نفس کا عملی رخ بھی پاک صاف اور شستہ رفتہ ہو جاتا ہے ایسے نفس کو نفس مزکی کہتے ہیں لیکن اس رخ پر اگر بے عملی یا بد عملی کی کوئی کثافت آگئی تو ایسا نفس نفس خبیثہ کثیفہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ حال و مآل کے اعتبار سے نفس مزکی ہی کامیاب فلاح یاب اور نجات یاب ہو گا اور نفس کثیف ناکام بد انجام اور خاسر المرام۔

اللہ نے نفس کو مزکی بنانے کی ترغیب کیلئے اور کثافت و خباثت سے روکنے کیلئے فائز المرام اور ناکام نفوس کے نتائج واضح کر دیئے اور توضیح نتائج کو قسموں سے پختہ کر کے بیان کیا چاند سورج رات دن آسمان زمین تخلیق نفس اور تقدیر فجور و تقوی کی قسمیں کھا کر فلاح و خسران کی اطلاع دی لیکن قسمیں کھانے میں ہی ایک لطیف طرز ایسا اختیار کیا کہ فلاح و خسران کی خبر تک پہنچنے سے پہلے ہی اہل علم سمجھ جاتے ہیں کہ نفس کے دونوں رخ روشن کرنے کی تعلیم قسموں کے ذیل میں ہی خدا نے دے دی مثلاً پتہ چل جاتا ہے کہ (باقی آئندہ صفحہ)

بھی ہو گئی تھی اور فوراً اس کے پیٹ سے اسی جیسا بچہ بھی پیدا ہو گیا تھا اور چونکہ (غیبی) اونٹنی سب (جانوروں کا) پانی پی جاتی تھی اس لئے حضرت صالحؑ نے اس کے لئے پانی کا ایک حصہ مقرر کر دیا تھا (تاکہ دوسرے جانور پیاسے نہ مریں) اور فرمایا تھا ایک دن کا پانی اس اونٹنی کا حصہ ہے اور دوسرے دن کا پانی تمہارے جانوروں کے لئے ہے کافروں (کو یہ تقسیم ناگوار ہوئی اور انہوں) نے اونٹنی کو قتل کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا تاکہ پورا پانی انہی کے جانوروں کو مل جائے۔

اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾ یعنی ثمود نے (عملی) تکذیب اس وقت کی جب ان میں سے سب سے بڑا بدبخت اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ انبعاث کا معنی ہے تعمیل امر کے لئے جلد تیار ہو جانا۔ قتل کا مشورہ قوم والوں نے دیا تھا اللہ نے خود فرمایا ہے فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ الخ۔

اس شخص کا نام قدار بن سالف تھا اس کا رنگ سرخ آنکھیں نیلی اور قد چھوٹا تھا اور چونکہ دوسروں نے صرف مشورہ دیا تھا اور یہ قتل کا ذمہ دار بن گیا اس لئے اس کی بدبختی دوسروں سے بڑھ گئی۔ بخاریؒ نے حضرت عبداللہؓ بن زمعہ کی خود شنید روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوران خطبہ میں ناقہ کا اور اس کو قتل کرنے والے کا تذکرہ کیا اور فرمایا اِذِ انْبَعَثَ اَشْقَاهَا اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے ایک صاحب عزم جو اپنے لوگوں میں باعزت تھا اٹھا جیسے ابو زمعہ۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سب سے بڑا بدبخت ناقہ ثمود کی کونچیں کاٹنے والا اور آدم کا وہ بیٹا تھا جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا اس نے سب سے پہلے قتل کا طریقہ نکالا اس لئے روئے زمین پر جو خون بہایا جائے گا اس کے عذاب کا ایک حصہ اس کو پہنچے گا۔ رواہ الطبرانی والحاکم وابو نعیم فی الحلیۃ بسند صحیح۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ پس ان سے اللہ تعالیٰ کے رسول یعنی حضرت صالحؑ نے فرمایا۔

نَاقَةَ اللّٰهِ اللہ کی (غیبی) اونٹنی کو چھوڑ دو اور اس کو قتل کرنے سے ڈرو۔ اللہ کی طرف ناقہ کی اضافت سے اونٹنی کی عظمت کو ظاہر کرنا اور سخت ڈرانا مقصود ہے۔

وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾ اور اونٹنی کے پانی پینے سے بھی تعرض نہ کرو پانی پر سے اس کو واپس نہ کرو اور دکھ پہنچانے کے لئے اس کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ ورنہ عذاب عظیم میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

فَكَذَّبُوْهُ لیکن حضرت صالحؑ کی طرف سے عذاب کی دھمکی کو انہوں نے سچا نہ مانا۔

فَعَقَرُوْهَا اور سب نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں (قتل کر دیا) قتل کرنے والا اگرچہ ایک ہی تھا لیکن مشورہ قتل میں سب شریک تھے اس لئے قتل کرنے کی نسبت سب کی طرف کر دی۔ مقاتل نے کہا کہ قتل کرنے والے نو آدمی تھے کیونکہ اَشْقٰی اگرچہ اسم تفضیل واحد ہے مگر اسم تفضیل اگر مضاف ہو تو واحد بھی مراد ہو سکتی ہے اور جمع بھی۔

(گزشتہ سے پیوستہ) آسمان کو کوئی بنانے والا ہے زمین کو کوئی بچھانے والا ہے نفس کا کوئی خالق ہے پھر انہی قسموں سے اس کی صفات کاملہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ ساری تخلیق تعمیر تنظیم اور تقدیر الٰہی پر حکمت ہے قادر کے زیر قدرت ہے اضطراری نہیں غیر اختیاری نہیں غیر متوازن نہیں اٹمل بے جوڑ نہیں خالق کا ارادہ اور علم اور حکمت اور قدرت ان پر محیط ہے اور خالق ان سب سے وراء الوراء ہے اس طرح قوت نظریہ کا استکمال ہو جاتا ہے۔ پھر انہی قسموں میں یہ بھی ذیلی طور پر بیان کیا ہے کہ سورج سارے جہاں کو روشن کرتا ہے گرمی پہنچاتا ہے ضُحٰهَا کا لفظ اس مضمون کو بتا رہا ہے کہ چاند سورج کا تابع ہے۔ تَلٰهَا سے یہ مضمون سمجھ میں آتا ہے آسمان ایک عظیم الشان عمارت ہے اور زمین بچھایا ہوا فرش اور تخلیق انسانی معتدل متوازن اور خطرات قلبی اور امواج تصوری تقدیر کے ہاتھوں میں مسخر اور یہ سارا نظام ربانی ہے رحمانی ہے باہم تصادم نہیں تعاون ہے ٹکراؤ نہیں توافق ہے شر واقعی نہیں خیر مجسم ہے سورج کی روشنی اور گرمی چاند کی تابانی اور خنکی آسمانوں کی علوی فیاضی اور زمین کی راحت بخش سطحیت اور انسان کا جسمانی اور عقلی توازن واعتدال اور فجور واطاعت کا اختیار موجب شکر ہے اتنی وجودی اور بقائی نعمتوں کا کفران حرام ہے اس مرتبہ پر پہنچ کر قوت عملیہ کا تزکیہ کامل ہو جاتا ہے پس فلاح یاب ہے وہ شخص جس نے نفس کو پاک کر لیا اور خسران مآب ہے وہ بدنصیب جس نے نفس کو گندہ کر لیا۔

حضرت صالحؑ نے فرمایا تین روز تک تو تم زندگی سے بہرہ اندوز ہو پہلے دن صبح کو تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے اور دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ اور تین روز کے بعد تم سب ہلاک کر دیئے جاؤ گے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ تین روز کے بعد اللہ نے بیخ و بن سے ان کو غارت کر دیا۔ مؤلف الامواج نے لکھا ہے کہ دَمْدَمَة کا معنی ہے بیخ و بن اکھاڑ کر ہلاک کر دینا۔

عطاءؒ اور مقاتلؒ نے ترجمہ کیا ہے کہ اللہ نے ان کو تباہ یعنی ہلاک کر دیا۔ قاموس میں ہے دمدمة غصہ کرنا اور دَمْدَمَ عَلَيْهِ اس نے غصہ سے کلام کیا دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ کا معنی گھیر لینا اور ہر طرف سے ڈھانک لینا بھی کیا گیا ہے۔

بِذَنْۢبِهِمْ ان کے گناہ یعنی پیغمبر کی تکذیب اور اونٹنی کو قتل کرنے کی وجہ سے۔

فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ پس سب کی تباہی ایک سی کر دی ہلاکت عام کر دی چھوٹا بڑا کوئی زندہ نہ بچا

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾ لَا يَخَافُ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے یعنی اللہ کو اس تباہی یا ثمود کی بربادی کے انجام کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ وہ کسی قدر رحم فرماتا (اور کسی کو زندہ چھوڑ دیتا۔)

ضحاکؒ کلبی اور سدی نے کہا لَا يَخَافُ کی ضمیر اَشْقٰى کی طرف راجع ہے اور کلام میں کچھ تقدیم تاخیر ہے اصل کلام اس طرح تھا اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا یعنی سب سے بڑا بدبخت اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے فوری تیار ہو گیا اور اس کے نتیجہ کی طرف سے اس کو کچھ خوف نہ ہوا۔ دَمْدَمَ یا اِنْۢبَعَثَ کے فاعل سے یہ جملہ حال ہے اور واؤ حالیہ ہے۔

ع ۱ ۱۵ ۱۶

سورۃ الشمس ختم ہوئی۔

(بعونہ ومنہ تعالیٰ)

سورۃ اللیل

یہ سورت مکی ہے اس میں ۲۱ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ۝ یعنی رات کی قسم جب وہ سورج کو یا دن کو ڈھانک لیتی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے ہے يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ یا جب وہ ہر چیز کو ڈھانک لیتی ہے اپنی تاریکی میں چھپا لیتی ہے إِذَا يَغْشٰى کا تعلق فعل قسم محذوف سے ہے یا مضاف محذوف سے اور إِذَا ظرف زمان ہے اور اللیل کی صفت یا ظرفیہ نہیں ہے بلکہ اذا کا معنی ہے وقت یہ پوری تفصیل إِذَا يَغْشٰهَا میں گزر چکی ہے۔

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ۝ اور قسم دن کی جو رات کی تاریکی دور ہونے سے یا سورج کے نکلنے سے نمودار ہوتا ہے۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ۝ ما بمعنی مَنْ ہے یعنی قسم ہے اس قدرت والے خدا کی جس نے ہر توالد تناسل رکھنے والی مخلوق کی دو صنفیں پیدا کیں نر اور مادہ یا صرف آدمؑ و حواء مراد ہیں ما مصدریہ بھی ہو سکتا ہے یعنی نر و مادہ کو پیدا کرنے کی قسم۔ جواب قسم آئندہ آیت میں ہے۔

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ کہ تمہارے اعمال مختلف ہیں کوئی دوزخ سے گلو خلاصی اور مراتب جنت و مدارج قرب کے حصول کی کوشش کرتا ہے اور کوئی اپنے نفس کو ہلاک کرنے کی۔ بغوی نے حضرت ابو مالک اشعری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب لوگ صبح کو نکلتے ہیں اور اپنے نفوس کو بیچتے ہیں کچھ (دوزخ سے) نفس کو آزاد کرتے ہیں اور کچھ ہلاک کرتے ہیں۔ اس سے آگے اللہ نے اختلاف سعی (اور ہر سعی کے نتیجہ) کی تفصیل بیان کی اور فرمایا۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى یعنی جس نے راہ خدا میں مال دیا یا اپنے ہر فرض کو ادا کیا۔

وَاتَّقٰى ۝ اور اللہ کے عذاب سے بچ گیا (جس کا ثبوت یہ ہے) کہ عذاب میں مبتلا کر دینے والے گناہوں سے اس نے اجتناب کر لیا۔ حدیث میں آیا ہے دوزخ سے بچو اگرچہ چھوارہ کا نصف حصہ دے کر ہو۔ بخاری و مسلم عن عدی بن حاتم۔ واحمد عن عائشہؓ والبزار والطبرانی فی الاوسط عن انسؓ وفی الکبیر عن ابن عباسؓ وابیؓ امامہ والبراءؓ عن نعمانؓ بن بشیر وابی ہریرہؓ۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ ابو عبدالرحمٰن سلمی اور ضحاک نے کہا اَلْحُسْنٰى یعنی لا الہ الا اللہ بروایت عطیہ حضرت ابن عباس کا بھی یہ قول آیا ہے اور مجاہد کے نزدیک جنت مراد ہے اللہ نے فرمایا لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى نیک اعمال کرنے والوں کے لئے اَلْحُسْنٰى ہے یعنی جنت مطلب یہ کہ اس کو یقین ہو گیا کہ اللہ اس کو جنت میں جگہ دے گا۔

عکرمہؒ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول آیا ہے۔ قتادہؒ۔ مقاتل اور کلبی نے کہا اللہ کا وعدہ مراد ہے یعنی جس نے تصدیق کی کہ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى ۝ تو ہم اس کے لئے سہولت کر دیں گے اس کو توفیق دیں گے یُسْرٰی کی یعنی ایسے خصائل کی جو اس کو یسر اور راحت تک پہنچا دیں گی۔ مطلب یہ کہ ایسے عمل کی توفیق دیں گے جو اللہ کی خوشنودی اور جنت کے حصول کا ذریعہ ہو گا یہ لفظ یسر الفرس کے محاورہ سے ماخوذ ہے یسر الفرس کا معنی ہے گھوڑے کو زین اور لگام لگا دی۔

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ اور جس نے راہ خیر میں خرچ کرنے میں بخل کیا یا امر خدا کی تعمیل میں بخل کیا۔ حدیث میں آیا

ہے بخیل وہ شخص ہے جس کے پاس میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے ترمذی و نسائی از علی و حاکم و ابن حبان از انسؓ۔

وَاسْتَغْنٰى ﴿۸﴾ اور دنیوی خواہشات میں مشغول ہو کر آخرت کے ثواب اور ثواب دینے پر قدرت رکھنے والے خدا سے لاپرواہ ہو گیا۔

وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿۹﴾ اور سب سے اچھی بات (یعنی کلمہ توحید ورسالت) کو نہ مانا جھوٹ قرار دیا۔ تو

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿۱۰﴾ ہم اس کو ایسی خصلتوں کی توفیق دیں گے جو اس کو دشواری شدت اور دوزخ کی طرف لے جائے گی یعنی ان اعمال کی توفیق دیں گے جو اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ مقاتلؒ نے (عُسریٰ کی تشریح میں) کہا بھلائی کے کام کرنا اس کے لئے دشوار ہو جائے گا۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ اس کی جنت والی اور دوزخ والی جگہ نہ لکھ دی گئی ہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تو پھر کیا اس تقدیر لکھے پر اعتماد کر کے ہم عمل نہ چھوڑ دیں فرمایا کئے جاؤ توفیق ہر ایک کو اسی کی ملے گی جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہوگا جو خوش نصیب ہوگا اس کو اہل سعادت کے اعمال کی توفیق مل جائے گی جو بدنصیب ہوگا اس کے لئے اہل شقاوت کے اعمال سہل کر دیئے جائیں گے یہ فرمانے کے بعد آپ نے پڑھا فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى متفق علیہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے امیہ بن خلف سے حضرت بلال کو ایک غلام اور دس اوقیہ (چاندی) دے کر خرید لیا (پھر آزاد کر دیا) تو اس کے متعلق سورۃ اللیل اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى تک نازل ہوئی حضرت ابو بکرؓ نے بھی ایک سعی کی تھی اور امیہ نے بھی۔ (ایک نے جنت کے لئے دوسرے نے صرف دنیوی فائدہ کے لئے) حضرت ابن مسعودؓ سے بھی یہ روایت آئی ہے۔ ابن ابی حاتمؒ نے باسناد حاکمؒ بن ابان از عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک آدمی کا کھجور کا درخت تھا درخت کی کوئی شاخ ایک عیالدار غریب آدمی کے گھر کے اوپر آگئی تھی درخت کا مالک گھر میں آکر جب پھل توڑنے کے لئے درخت کے اوپر چڑھتا تھا تو کچھ پھل نیچے بھی گر پڑتے تھے اور غریب آدمی کے بچے ان کو اٹھا لیتے تھے لیکن وہ شخص درخت سے اتر کر وہ کھجوریں بچوں کے ہاتھ سے چھین لیتا تھا بلکہ اگر کسی کے منہ میں کھجور ہوتی تھی تو اس کے منہ میں بھی انگلیاں ڈال کر نکال لیتا تھا۔

اس غریب نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی فرمایا تو جا پھر حضور ﷺ درخت کے مالک سے ملے اور فرمایا مجھے اپنا وہ درخت دے دے جس کی شاخ فلاں شخص کے گھر میں ہے تجھے جنت میں اس کے عوض ایک درخت خرما ملے گا۔ اس نے جواب دیا میں دے تو دیتا اور میرے پاس بکثرت درخت اور بھی ہیں مگر کسی درخت کا پھل اس درخت کے پھلوں سے زیادہ مجھے پسند نہیں۔

یہ جواب دے کر درخت کا مالک چلا گیا اس گفتگو کو ایک تیسرا آدمی سن رہا تھا وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اس درخت کے عوض مجھے وہ چیز یعنی جنت کا درخت دے دیں گے جو آپ اس درخت کے مالک کو دے رہے تھے فرمایا ہاں! یہ بات سن کر یہ تیسرا آدمی جا کر درخت کے مالک سے ملا اور اس آدمی کے پاس بھی بہتیرے درخت تھے۔ درخت کے مالک نے کہا کیا تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس درخت کے عوض مجھے جنت کا ایک درخت دے رہے تھے مگر میں نے کہہ دیا کہ دے تو دیتا مگر مجھے اس کے پھل پسند ہیں۔ میرے بہت درخت ہیں مگر کسی درخت کا پھل اس درخت کے پھل سے زیادہ مجھے پسند نہیں اس تیسرے شخص نے کہا تو کیا تم اس کو بیچنا چاہتے ہو درخت کے مالک نے کہا نہیں مگر میری مراد کے موافق اگر وہ قیمت دے دیں تو دے دوں گا مگر میرا خیال ہے کہ وہ اتنی قیمت نہیں دیں گے اس نے پوچھا وہ کتنی قیمت ہے مالک درخت نے کہا اس کے عوض چالیس درخت لوں گا اس شخص نے کہا بڑی قیمت مانگ رہے ہو یہ کہہ کر خاموش ہو گیا پھر بولا میں چالیس درخت دوں گا اگر سچ کہہ رہے ہو تو اس بات کا کسی کو گواہ بنا لو درخت کے مالک نے اپنی قوم والوں کو بلوا کر اس بیع کا شاہد بنا لیا اس کے بعد وہ شخص خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اب وہ درخت میرا ہو گیا اور میں

حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں یہ سن کر رسول اللہ ﷺ اس غریب مکان والے کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا اب یہ درخت تیرا ہو گیا (یعنی میں نے تجھے دے دیا) اس پر اللہ نے (سورۃ) وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ نازل فرمائی۔ ابن کثیر نے کہا یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔

بغوی نے بھی عطاء کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے لیکن اس روایت کی عبارت اس طرح ہے کہ درخت والے نے حاضر ہو کر اپنے پڑوسی کے بچوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ وہ میرے درخت کے پھل لے لیتے ہیں حضور ﷺ نے اس سے فرمایا اپنا درخت میرے ہاتھ جنتی درخت کے عوض فروخت کر دے اس نے انکار کر دیا اور چلا گیا پھر اس کی ملاقات ابوالدحداح سے ہوئی اس پر (سورہ) وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ، إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ نازل ہوئی۔

پہلی روایت صحیح ہے یعنی حضرت ابوبکرؓ اور امیہ بن خلف کے متعلق آیات کا نزول صحیح ہے کیونکہ سورت مکی ہے اگر کسی درخت کے مالک اور ابوالدحداح کے متعلق نزول مانا جائے تو اس کو مدنی کہنا پڑے گا۔ لیکن اگر دوسری روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس طرح تشریح کی جائے گی کہ آیت کا نزول ابوالدحداح کی مدح میں ہوا اور تصدیق بالحسنیٰ سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کے وعدہ کی تصدیق یعنی ابوالدحداح کی طرح جس نے اپنا مال دیا اور دوزخ سے بچا اور رسول اللہ ﷺ کے وعدہ کو سچا جانا تو ہم اس کے لئے جنت کو سہل الحصول بنا دیں گے اور چونکہ خصوصیت مورد کے باوجود حکم میں عموم تھا اس لئے وعدہ جنت کے بعد بخل استغناء اور تکذیب کرنے والے کے لئے وعید عذاب بھی ذکر کر دی اور فرمایا وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ لیکن یہ وعید اصل مالک درخت کے لئے نہ ہو گی وہ تو انصاری تھا اللہ کے ثواب اور جنت سے لاپرواہ نہ تھا نہ کلمہ توحید و رسالت کو غیر صحیح جانتا تھا نہ درخت کو بیچنے سے انکار موجب دوزخ ہو سکتا ہے صرف فرض زکوٰۃ سے انکار موجب جہنم ہے۔

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ⑪ اور جب وہ ہلاک ہو گا تو اس کا مال اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ مانفی کے لئے ہے استفہام انکاری کے لئے تَرَدَّىٰ ماضی (باب تفعل) ردی (مادہ) بمعنی ہلاکت اور ہلاکت سے مراد ہے استحقاق عذاب۔ یا ردی کا معنی ہے گرنا یعنی جب قبر کے گڑھے میں یا جہنم میں گرے گا قتادہ اور ابوصالح نے دوزخ میں گرنے کا ہی معنی بیان کیا ہے۔

إِنَّ عَلَيْنَا علیٰ کا لفظ تاکید کا معنی ظاہر کر رہا ہے بے شک ہم پر لازم ہے یعنی ہم نے اپنی قضاء سابق کی وجہ سے یا اپنے حکم کے مقتضا کے بموجب خود ہدایت کا ذمہ لے لیا ہے (یعنی فی نفسہ خدا پر کوئی چیز لازم نہیں لیکن چونکہ اس نے ازل میں خود فیصلہ قضائی کر دیا ہے یا وعدہ کر لیا ہے اس لئے وہ خود ذمہ دار بن گیا ہے)

لَلْهُدَىٰ ⑫ حق کا راستہ بتا دینا یعنی دلائل آفاقی (جو عقلی ہیں) اور آسمانی شریعتوں کا بیان اللہ کی طرف سے راہ حق دکھانے والا ہے یہ قول زجاج اور قتادہ کا ہے فراء نے (علیٰ کو بمعنی الیٰ قرار دیتے ہوئے کہا کہ جو شخص راہ ہدایت پر چلتا ہے اس کا راستہ خدا پر ہی (یعنی خدا تک ہی) پہنچتا ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ اللہ ہی تک سیدھا راستہ پہنچتا ہے یعنی جو اللہ تک پہنچنا چاہتا ہے وہ سیدھے راستہ پر ہوتا ہے مراد یہ کہ جو ہدایت کے راستہ پر چلتا ہے وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ⑬ آخرت اور دنیا ہماری ہی ہے یعنی ہماری ہی ملک ہے اور ہماری ہی مخلوق ہے پس جو شخص مالک کو چھوڑ کر دوسرے سے مانگے گا وہ مانگنے میں غلطی کرے گا۔ یا یہ مراد ہے کہ چونکہ ہم ہی مالک اور خالق ہیں اس لئے ہدایت یافتہ لوگوں کو ہم ہی ثواب دیں گے تمہارے ہدایت یافتہ نہ ہونے سے ہمارا کچھ نقصان نہ ہو گا۔

فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ⑭ فاء سببی ہے اللہ کا مالک دارین اور خالق کونین ہونا سبب تخویف ہے پس میں تم کو بھڑکتی آگ سے ڈراتا ہوں جس میں صرف

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝۱۵ بد نصیب ہی داخل ہوگا اس جگہ اَشْقٰی (اسم تفضیل) بمعنی شقی (صفت مشبہ) کے ہے اس لئے کافر بھی اس میں داخل ہے اور وہ مسلم فاسق بھی جس کی مغفرت نہ کی جائے۔

الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۶ جو رسول اللہ کی تکذیب کرتا اور ایمان سے روگردانی کرتا ہے یہ اشقی کے بعض افراد یعنی کافر کی صفت ہے کیونکہ مسلم فاسق تکذیب رسول نہیں کرتا نہ ایمان سے روگردانی کرتا ہے اور یہ صفت احترازی نہیں ہے کہ وہ اشقی جو تکذیب رسول اور ایمان اعراض نہ کرتے ہوں اس قید کی وجہ سے حکم دخول نار ان کو شامل نہ ہو کیونکہ عادۃً اور عموماً ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ مومن شقی نہیں ہوتا ایمان پرہیزگاری اور سعادت ہی چاہتا ہے۔ بدنصیب اور گنہگار عموماً کافر ہی ہوتا ہے پس شقی کو تکذیب اور اعراض کی قید سے مقید کرنا اظہار واقعہ کے طور پر ہے جیسے آیت وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ (میں گود میں ہونے اور زیر پرورش رہنے کی قید رَبَآئِب کے لئے احترازی نہیں کیونکہ تمام رَبَآئِب زیر پرورش ہی ہوتی ہیں بلکہ واقعہ کا اظہار ہے) یا یوں کہو کہ تکذیب صریحی ہو یعنی کفر یا دیکھنے میں تکذیب معلوم ہوتی ہو واقع میں تکذیب نہ ہو جیسے حرمت کا عقیدہ رکھنے کے باوجود ممنوعات کا ارتکاب۔ لفظ تکذیب دونوں کو شامل ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ تکذیب لسانی اور قلبی ہو جو کفر اور نفاق ہے یا نفس امارہ مکذب ہو دل ایمان پر مطمئن ہو اور زبان بھی مقر ہو لفظ تکذیب میں عموم ہے ہر طرح کی تکذیب اس میں داخل ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اشقی اس جگہ تفضیلی معنی میں ہی مستعمل ہے اور اس سے مراد کافر ہی ہے (مگر دوزخ میں تو مسلم فاسق بھی جائے گا پھر دخول جہنم کا حصر کافر میں کیوں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) اس جگہ داخلہ جہنم سے مراد عام داخلہ نہیں بلکہ لزومی اور دوامی داخلہ مراد ہے (اور یہ صرف کافر کے لئے ہی ہوگا) اسی لئے بیضاویؒ نے آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شدت جہنم کو برداشت کرنے والا اور دوامی طور پر داخل ہونے والا صرف اشقی یعنی کافر ہوگا مسلم بدکار بھی جہنم میں اگرچہ داخل ہوگا۔ لیکن اس کا داخلہ دوامی نہ ہوگا۔ اس توضیح کے بعد آیت کا عمومی حصر (یعنی صرف کافر کا ہی داخل جہنم ہونا) صحیح ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا ان توجیہات کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ لَا يَصْلٰىهَا میں هَا ضمیر نَارًا تَلَظّٰى کی طرف راجع ہے (صرف نارا کی طرف راجع نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ بھڑکتی ہوئی شعلہ زن آگ میں صرف کافر جائے گا رہا فاسق مسلمان وہ بھی اگرچہ جہنم میں داخل ہوگا مگر بھڑکتی آگ میں داخل نہ ہوگا کافر کی آگ سے اس کی آگ کا درجہ کم ہوگا یعنی جہنم کے بالائی طبقہ میں مسلم فاسق کا داخلہ ہوگا۔

میرے نزدیک اَلْاَشْقٰی سے مراد کافر ہی ہے اور نار (کالفظ بھی اپنے عموم پر ہے کیونکہ جب دنیا کی آگ بھی بھڑکتی اور شعلہ زن ہوتی ہے تو جہنم کی آگ جو دنیا کی آگ سے بہرحال زیادہ تیز ہے خواہ کتنی ہی کمزور ہو ضرور شعلہ زن ہوگی (جہنم کی آگ خواہ بالائی طبقہ کی ہی ہو التہاب واشتعال سے خالی نہیں ہو سکتی) مگر آیت میں حصر (حقیقی نہیں کہ صرف کافر ہی جہنم میں جائیں گے بدکار مومن نہ جائیں گے بلکہ) اضافی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو مومن موجود تھے وہ جہنم میں نہیں جائیں گے (ان کو آیت کے عموم حکم سے نکالنا مقصود ہے) پس آیت بتا رہی ہے کہ کوئی صحابی جہنم میں نہیں جائے گا کیونکہ باجماع اہل سنت ثابت ہے کہ تمام صحابہ عادل تھے (کوئی فاسق نہ تھا)

اللہ نے بھی فرمایا ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ہر ایک سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرما لیا ہے۔ دوسری آیت میں (صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے) فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تیسری آیت میں ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان نے مجھے دیکھ لیا اس کو آگ نہیں لگے گی۔ رواہ الترمذی عن جابر۔ یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں جس کے پیچھے چلو گے ہدایت پاؤ گے۔ رواہ رزین عن عمرؓ بن الخطاب۔ اگر کسی صحابیؓ سے کسی گناہ کا صدور ہو بھی گیا ہو تو اول تو ایسا ہوا ہی کم ہے پھر

اس کو توبہ کی توفیق بھی عطاء فرمادی گئی اور اس نے توبہ کرلی اور حدیث ابن مسعودؓ میں آیا ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب له گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کی طرح ہو جاتا ہے۔ رواہ ابن ماجۃ۔

یا رسول اللہ ﷺ کی صحبت کی برکت سے اللہ کی رحمت اس کو اپنی آغوش میں لے لے گی کیونکہ (برکت صحبت کے متعلق) رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے نیک لوگوں کی بابت فرمایا تھا وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ ان سے انس رکھنے والا نامراد نہ ہوگا بخاری۔ ترمذی۔ مسلم بروایت حضرت ابوہریرہؓ جب عام صالحین کی صحبت میں رہنے والوں کی یہ کیفیت ہے تو ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جو مدت تک سید المرسلین ﷺ کی صحبت میں رہے۔ واللہ اعلم۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو ہی گروہ تھے (۱) کامل مومن متقی (۲) کافر اسی لئے اللہ کا کلام انہی دونوں گروہوں کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے۔ گناہ گار مسلمانوں کا ذکر تو بہت کم آیا ہے کیونکہ کلام کا رخ عموماً حاضرین کی طرف ہوتا ہے (اور آنے والوں کے لئے حکم کا شمول بطور نیابت ہوتا ہے اگر حاضرین کے ساتھ اس حکم کی خصوصیت نہ ہو)

فرقۂ مرجیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ داخلہ جہنم کافروں کے لئے مخصوص ہے۔ کوئی بدکار مسلمان آگ میں نہیں جائے گا گناہ چھوٹا ہو یا بڑا اگر ایمان موجود ہو تو ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ کفر کی حالت میں جب کوئی نیکی سود مند نہیں تو ایمان کی حالت میں گناہ ضرر رساں کس طرح نہ ہوگا رافضیوں کا بھی یہی قول ہے۔

معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والا ہمیشہ دوزخ میں رہے گا وہ مومن ہی نہیں ہے کیونکہ مرجیہ کو چھوڑ کر اور سب لوگ قائل ہیں کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب موجب جہنم ہے اب اگر مرتکب کبیرہ کو مومن کہا جائے گا تو وہ اشقی نہ ہوگا اور اشقی نہ ہوگا تو جہنم میں کیسے جائے گا۔ اہل سنت نے آیت کی توضیح مختلف وجوہ کے ساتھ کی ہے جن کا ذکر ہم نے اوپر کر دیا ان توجیہات کی ضرورت (مختلف) نصوص کا تعارض دور کرنے کے لئے پڑتی ہے پھر تمام علماء (سلف و خلف) کا اجماع بھی ہے کہ اللہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور شرک کے سوا جس کو چاہے گا بخش دے گا خواہ اس نے توبہ کی ہو یا نہ کی ہو۔ اللہ نے فرمایا ہے یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ہُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر خود زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ سب گناہ بخش دے گا بلاشبہ وہی غفور رحیم ہے۔

دوسری آیت ہے یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ تیسری آیت ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کے سامنے آئے گی۔ لہٰذا مومن کے لئے دوامی دوزخ کا قول درست نہیں خواہ وہ بدکار ہو اور اس کے گناہ معاف نہ کئے جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث من قال لا اله الا الله دخل الجنة تو حد تواتر تک پہنچ گئی ہے جس نے لا اله الا الله کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا (یعنی اس کے لئے دوامی دوزخ نہیں خواہ گناہوں کا عذاب اس کو ایک مدت تک ہوتا رہے۔

پھر اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو ذرہ برابر بدی کرے گا تو وہ اس کے سامنے آئے گی یعنی اگر اللہ اس کو معاف نہ کرے گا اور عذاب دینا چاہے گا تو دوزخ کے اندر گناہ کی سزا اس کے سامنے آئے گی۔ اگر ممنوعات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کا تقاضا جہنم نہیں تو شریعت کے اوامر و نواہی غریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھیں گے اور اس کا قائل سواء کاہن یا دیوانہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

وَسَیُجَنَّبُہَا اور دوزخ سے ضرور بچایا جائے گا۔ سین تحقیق کے لئے ہے۔

الْاَتْقَی ﴿۱۷﴾ شرک جلی و خفی اور جسمانی قلبی اور نفسانی گناہوں سے پرہیز رکھنے والا۔ اتقیٰ کا درجہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس مزکی اور مطمئنہ ہو جائے۔

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ جو اپنا مال غریبوں کو اور بردے آزاد کرنے کے لئے اور دوسرے مصارف خیر میں دیتا ہے

يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾

يُؤْتِيْ سے بدل ہے یا يُؤْتِيْ کے فاعل کی حالت کا اظہار ہے یعنی وہ مصارف خیر میں اس غرض سے مال خرچ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک پاک ہو جائے ریاکاری اور شہرت طلبی اس کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ یا يَتَزَكّٰى باب تفعل سے واحد مذکر مضارع غائب کا صیغہ ہے اور اس سے مراد ہے زکوۃ دینا۔ چونکہ مفہوم مخالف ہمارے نزدیک قابل اعتبار نہیں اس لئے آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جو اُتقی نہ ہو یعنی تقی ہو وہ جہنم میں جائے گا اور شافعی (اگرچہ مفہوم مخالف کا اعتبار کرتے ہیں) مگر ان کے نزدیک بھی اس جگہ تقی کا داخل جہنم ہونا غیر معتبر ہے کیونکہ آیت کا نزول ایک واقعہ کے سلسلہ میں ہوا ہے گویا یہ کلام اس واقعہ کا بیان ہے کیونکہ باتفاق اہل تفسیر یہ آیت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی اور اس سے غرض یہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ انبیاء کے علاوہ سب لوگوں سے زیادہ متقی ہیں الناس سے انبیاء کا استثناء بھی ہم نے عقل اور اجماع علماء اور مختلف نصوص شرعیہ کی بناء پر کیا ہے) ورنہ اس جگہ الف لام) استغراقی ہی ہے اور حضرت ابو بکرؓ کے اتقی الناس ہونے کی صراحت ہے)

آیت میں لفظ اَتْقٰى احترازی نہیں کہ تقی کے جہنم میں داخل ہونے کا حکم بطور مفہوم مخالف سمجھا جائے اور اگر اُتقی کے مخالف تقی کو مانا بھی جائے اور مفہوم مخالف کے طور پر تقی کا جہنم میں داخل ہونا سمجھ بھی لیا جائے تب بھی تقی سے مرادوہ شخص ہو گا جو صرف شرک سے مجتنب ہو شرک اور معاصی سب سے پرہیز کرنے والے (جو اتقی کے درجہ تک ابھی نہ پہنچا ہو) اس حکم میں داخل نہ ہو گا (اور صرف شرک سے بچنے والے کو عذاب جہنم ہونا جائز ہے)

ابن ابی حاتم نے عروہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایسے سات غلام (خرید کر) آزاد کئے تھے جن کو مسلمان ہونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا تھا۔ اس پر آیت وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ الخ نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں تو اس صورت میں الف لام عہدی ہو گا (اور معہود حضرت ابو بکر صدیق) حاکم نے بروایت عامر بن عبد اللہ بن زبیرؓ لکھا ہے کہ ابو قحافہ نے ابو بکر سے کہا میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے ہو جو آزاد ہونے کے بعد تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اگر تم طاقتور مردوں کو خرید کر آزاد کرو تو وہ تمہاری حفاظت بھی کریں اور تمہاری خدمت بھی کریں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا ابا میں اس چیز کا طالب ہوں جو اللہ کے پاس ہے یعنی جنت اس پر آیت فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى الخ آخر سورت تک نازل ہوئی محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت بلالؓ کے باپ کا نام رباح اور ماں کا نام حمامتہ تھا آپ خاندان بنی جمح میں سے کسی کے غلام تھے مگر آپ اسلام میں سچے اور پاکیزہ دل والے تھے۔ امیہ بن خلف تپتی دوپہر میں آپ کو باہر نکال کر مکہ کی وادی میں پشت کے بل لٹا دیتا تھا اور اوپر سے سینہ پر ایک بڑا پتھر رکھوا دیتا تھا پھر کہتا تھا یا تو محمد ﷺ کا انکار کرو ورنہ اسی حالت میں مر جائے گا (مرنے تک یوں ہی رکھوں گا) مگر حضرت بلال اس تکلیف میں بھی احد احد ہی کہتے تھے۔

محمد بن اسحاقؒ نے بروایت ہشام بن عروہؒ۔ عروہ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک روز حضرت بلالؓ کی طرف سے حضرت ابو بکرؓ کا گزر ہوا لوگ بلال کے ساتھ یہی حرکت کر رہے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کا مکان بھی بنی جمح کے محلہ میں ہی تھا آپ نے امیہ سے فرمایا اس بے چارے کے معاملہ میں تم کو ڈر نہیں لگتا۔ امیہ نے کہا تم ہی اس کو لے کر اس مصیبت سے رہائی دلا دو۔

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میں ایسا کروں گا میرے پاس ایک بڑا طاقتور قوی حبشی غلام ہے میں اس کے عوض وہ غلام تم کو دیتا ہوں امیہ نے کہا میں نے تبادلہ کر لیا حضرت ابو بکرؓ نے اپنے غلام کو دے دیا اور بلال کو لے کر آزاد کر دیا پھر ہجرت سے پہلے ہی حضرت بلالؓ کے ساتھ چھ ایسے ہی غلام اور بھی آزاد کئے بلال ساتویں تھے ان میں سے ایک عامر بن فہیرہؓ تھے جو بدر میں شریک تھے اور بیر معونہ کے واقعہ میں شہید ہوئے۔ ایک ام عمیسؓ تھی آزادی کے وقت ان کی نگاہ جاتی رہی تھی جس پر قریش کہنے لگے تھے کہ آزادی نے اس کی نگاہ کھو دی۔ ایک ام عمیس کی بیٹی ہدنہ تھی یہ دونوں ماں بیٹیاں خاندان عبد الدار کی ایک عورت کی باندیاں تھیں اور ان کی مالکہ ان سے آٹا پسواتی تھی اور کہتی تھی خدا کی قسم میں تم کو آزاد نہیں کروں گی حضرت ابو بکرؓ نے اس

سے فرمایا ری فلاں کی ماں ان دونوں کا بند خلاص کر دے اس نے جواب دیا تم ہی ان کا عوض دے کر ان کو آزاد کر دو حضرت نے پوچھا کیا قیمت لے گی اس نے کچھ قیمت بتائی حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میں نے (اس قیمت پر) ان کو لیا اور یہ دونوں آزاد ہیں۔

بنی مومل کے خاندان کی ایک لونڈی تھی جس کو اسلام کی وجہ سے دکھ دیئے جاتے تھے۔ حضرت نے اس کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔ سعید بن مسیب نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جب بلال کو خریدنے کی خواہش کی تو امیہ بن خلف نے جواب دیا ہاں میں بلالؓ کو بیچتا ہوں مگر نسطاش کے عوض بیچوں گا نسطاش حضرت ابو بکر کا غلام تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے پاس دس ہزار دینار اور بہت باندی غلام اور مویشی تھے آپ نے نسطاش کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی تھی اور فرمایا تھا کہ اگر تو مسلمان ہو جائے تو یہ سب مال تیرا ہو گا لیکن نسطاش نے انکار کر دیا تھا آپ کو اس سے نفرت ہو گئی۔

جب امیہ نے بلالؓ کو نسطاش کے عوض بیچنے کا اظہار کیا تو حضرت ابو بکرؓ نے اس کو غنیمت جانا اور تبادلہ کر لیا اس پر مشرک کہنے لگے بلالؓ کا ابو بکرؓ پر کوئی احسان ہو گا جس کی وجہ سے ابو بکرؓ نے یہ سودا کیا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ یعنی بلال یا کسی دوسرے غلام کا ابو بکرؓ پر کوئی ایسا احسان نہ تھا جس کا بدلہ دیا جاتا۔

بزار نے حضرت ابن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکرؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی پورا جملہ یُؤْتِیْ کے فاعل سے حال ہے یا مستانفہ ہے اور ایک وہمی سوال کا جواب ہے۔ (سوال ہو سکتا تھا کہ ابو بکر پر اس غلام کا کچھ احسان ہو گا جس کے بدلہ میں حضرت نے اس کو خرید کر آزاد کیا تو اس تو ہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ) کسی کا ابو بکرؓ پر کوئی احسان نہ تھا کہ وہ مال خرچ کر کے اور اس کو خرید کر آزاد کرتے اور اس طرح احسان کا بدلا چکاتے۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ یا تو استثناء منقطع ہے بلکہ اپنے رب برتر کی خوشنودی کی طلب میں اس نے ایسا کیا۔ یا استثناء متصل ہے مگر مستثنیٰ منہ محذوف ہے یعنی وہ کسی غرض کے لئے اور احسان کا بدلہ چکانے کے لئے ایسا نہیں کرتا سواء اس کے کہ اپنے رب کی مرضی طلب کرتا ہے اور اس کی خوشنودی کا خواستگار ہے۔

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾ اور اللہ اس کے اس فعل سے ضرور راضی ہو گا یا وہ اللہ کی عطاء کردہ جزاء اور عزت سے آخرت میں خوش بھی ہو جائے گا یہ آیت حضرت ابو بکرؓ کے متعلق اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے اللہ نے فرمایا ہے وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔

انبیاء کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ کا سب لوگوں سے زیادہ متقی ہونا بتا رہا ہے کہ آپ سب سے افضل بھی تھے کیونکہ اللہ نے فرمایا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز تم میں سے وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اجماع اہل سنت بھی اسی پر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم حضرت ابو بکرؓ کا ہم پلہ کسی کو نہیں سمجھتے تھے آپ کے بعد حضرت عمرؓ تھے پھر حضرت عثمانؓ تھے پھر باقی صحابہؓ کو ہم یوں ہی چھوڑ دیتے تھے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ بخاری۔

محمد بن حنفیہ نے حضرت علیؓ سے پوچھا رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل کون تھا فرمایا ابو بکرؓ پوچھا پھر کون فرمایا عمرؓ۔ بخاری۔

ہم نے اس مبحث کی پوری تفصیل اور اس سلسلہ کی احادیث آثار اور روایات اجماع اپنی کتاب السیف المسلول میں جمع کر دی ہیں۔

سورۃ الیل ختم ہوئی۔ بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ الضحیٰ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۱ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ بیمار ہو گئے اور ایک دو راتیں نماز کو اٹھ نہ سکے یہ دیکھ کر ایک عورت کہنے لگی محمد ﷺ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمہارا شیطان تم کو چھوڑ گیا اس پر مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ انہوں نے یعنی حضرت جندبؓ نے بیان کیا کہ جس عورت نے مذکورہ بالا بات کہی تھی وہ ابولہب کی بیوی ام جمیل تھی۔ حاکمؒ نے حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت سے بیان کیا کہ کچھ دنوں رسول اللہ ﷺ یوں ہی رہے آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی تو ابولہب کی بیوی ام جمیل نے کہا یہ ہی نظر آتا ہے کہ تیرے ساتھی نے تجھے چھوڑ دیا اور تجھ سے نفرت کرنے لگا اس پر اللہ تعالیٰ نے اَلضُّحٰی الخ نازل فرمائی۔

سعید بن منصور نے حضرت جندب کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیلؑ کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی مشرک کہنے لگے اس نے محمد کو چھوڑ دیا اس پر آیات مذکورہ کا نزول ہوا۔ ابن جریرؒ نے شداد بن عبد اللہؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ کی بے صبری دیکھ کر آپ ﷺ کا رب آپ سے ناراض ہو گیا ہے اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ دونوں مذکورہ روایتیں مرسل ہیں اور راوی دونوں کے ثقہ ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ام جمیل اور حضرت خدیجہؓ دونوں نے یہ بات کہی تھی مگر اول نے خوش ہو کر اور دوسری نے دردمندی کے اظہار کے لئے۔

ابن ابی شیبہؒ اور طبرانی نے ایک ایسی سند کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں ایک مجہول شخص نے حفص بن میسرہؒ قریشی کا قول نقل کیا ہے اور حفصؒ نے اپنی ماں کا اور اس کی ماں نے اپنی ماں کا اور یہ عورت رسول اللہ ﷺ کی خادمہ تھی کہ کتے کا ایک بچہ رسول اللہ ﷺ کی کوٹھڑی میں گھس آیا اور آپ کے تخت کے نیچے جا چھپا اور مر گیا (اس کی وجہ سے) چار روز تک رسول اللہ ﷺ پر وحی نہیں آئی آپ ﷺ نے فرمایا خولہؓ دیکھ تو میری کوٹھڑی میں کیا نئی بات ہو گئی میرے پاس جبرئیلؑ نہیں آتے میں نے اپنے دل میں کہا مجھے کوٹھڑی کی صفائی کرنی اور جھاڑ دینی چاہئے چنانچہ میں جھاڑو لے کر تخت کے نیچے جھکی اور اس مردہ بچہ کو نکالا اس کے بعد میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اس وقت آپ کی ریش مبارک میں لرزہ تھا اور آپ کا قاعدہ ہی تھا کہ وحی کے نزول کے وقت آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا پس اللہ نے وَالضُّحٰی.... تَرۡضٰی تک نازل فرمائی حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کتے کے بچہ کی وجہ سے جبرئیل کے آنے میں تاخیر ہونے کی روایت تو مشہور ہے مگر اس قصہ کا وَالضُّحٰی کے نزول کا سبب ہونا غریب بلکہ شاذ ہے جو قابل قبول نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ انقطاع وحی کی مدت کے متعلق مختلف روایات آئی ہے۔ ابن جریج نے ۱۲ دن اور مقاتل نے چالیس روز کی تعیین کی ہے مقاتل نے کہا اس پر مشرک کہنے لگے کہ محمد ﷺ کے رب نے محمد ﷺ کو چھوڑ دیا تو (اس کے رد میں) یہ سورت نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس کا قول بھی بروایت ابن مردویہ یہی آیا ہے جب جبرئیلؑ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا آپ نہیں آئے میں تو آپ کا مشتاق تھا جبرئیل نے جواب دیا مجھے آپ کے پاس آنے کا بہت ہی شوق تھا مگر حکم کا بندہ ہوں ہم خود رب کے حکم کے بغیر نہیں اترتے۔

وَالضُّحٰی ① قسم ہے وقت چاشت کی یادن کی۔ بعض کا قول ہے کہ ضحیٰ سے مراد دن ہے اس لئے کہ لیل کے مقابل آیا ہے اللہ نے فرمایا ان یا تیہم باسنا ضحی یعنی دن میں قتادہؒ اور مقاتلؒ نے کہا وقت ضحیٰ مراد ہے یعنی سورج کے چڑھنے کا وقت اس وقت کی خصوصیت کی وجہ بعض لوگوں نے یہ بیان کی ہے کہ سردی میں گرمی میں جاڑے میں موسم گرما میں ہر موسم میں اس وقت اعتدالی کیفیت رہتی ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰی ② اور رات کی قسم جب وہ چھا جائے۔ اِذَا ظرفیہ فعل قسم محذوف سے متعلق ہے یا لیل سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی حصول اللیل حصول سے اِذَا کا تعلق ہے یا اللیل کی صفت ہے لیکن بتقدیر مضاف یا اذا ظرفیہ نہیں ہے بلکہ وقت کے معنی میں ہے۔

سَجٰی کا ترجمہ حسن نے کیا ہے اقبل بظلام تاریکی کو لے کر آئے یعنی تاریکی کے ساتھ آتی رات کی قسم عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول آیا ہے والبی نے ذھب ترجمہ کیا یعنی جاتی رات کی قسم۔ عطاء اور ضحاک نے کہا رات کی قسم جب ہر چیز کو وہ اپنی تاریکی سے ڈھانک لے۔ مجاہد نے کہا بالکل ٹھیک ہو جائے قتادہ اور ابن سکن نے کہا جب اس کی تاریکی ٹھہر جائے کہ اس کے بعد اندھیرے میں زیادتی نہ ہو۔

یا یہ مراد ہے کہ رات کی قسم جب لوگ اس میں سکون پذیر ہو جائیں اور آوازیں خاموش ہو جائیں لیل ساج وہ رات جس میں سکون پیدا ہو جائے بحر ساج ساکن سمندر۔ گزشتہ سورت میں لیل کا ذکر نہار سے پہلے کیا تھا کیونکہ رات دن سے واقع میں پہلے آتی ہے اس جگہ ضحیٰ کا ذکر لیل سے پہلے کیا اس لئے کہ رات پر دن کو فضیلت ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ یعنی تمہارے رب نے تم کو بالکل نہیں چھوڑ دیا تم سے قطع تعلق نہیں کر لیا۔

وَمَا قَلٰی ③ اور تم کو مبغوض نہیں بنا لیا تم سے متنفر نہیں ہو گیا یہ جملہ۔ اصل میں مَا قَلَاکَ تھا۔ کَ ضمیر مفعول محذوف کر دی گئی کیونکہ وَدَّعَکَ میں مفعول موجود ہے مزید ذکر کی ضرورت نہیں یا سجع آیات کے لحاظ سے مفعول کا ذکر نہیں کیا گیا۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ④ اور آخرت تمہارے لئے دنیا سے بہتر ہے ممکن ہے یہ آیت گزشتہ آیت سے پیوستہ ہو، وابستگی کی وجہ یہ ہے کہ آیت مَاوَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی کے ضمن میں یہ بات آگئی کہ اللہ وحی بھیج کر تم کو اپنے ساتھ ملائے رکھے گا۔ تم حبیب خدا ہو اور اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے اب اس آیت میں بتایا کہ آخرت میں تمہارا اور جو اس سے بڑا ہو گا وہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہو گی تمام انبیاء کی سرداری حاصل ہو گی مقام محمود عطا کیا جائے گا جس پر پچھلے اگلے سب رشک کریں گے۔ تمہاری امت دوسری امتوں کی شاہد ہو گی۔ آخرت میں رسول اللہ ﷺ کے خصوصی فضائل کا ذکر ہم سورۂ بقرہ کی آیت تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔ بغوی نے بسند ابن ابی شیبہ حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم اہل بیت کے لئے اللہ نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دی ہے۔

یا آیت کا یہ معنی ہے کہ دوسری حالت تمہارے لئے پہلی حالت سے بہتر ہو گی اور انجام امر آغاز سے اچھا ہو گا یعنی بزرگی اور کمال میں تم برابر ترقی کرتے رہو گے۔ صوفیہ کا قول ہے جس کے دونوں دن برابر ہوں (دوسرا دن پہلے دن سے بہتر نہ ہو) وہ گھاٹے میں ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ⑤ بیہقیؒ نے دلائل میں طبرانیؒ نے اوسط میں اور حاکمؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ امت کے آئندہ فتوحات (ممالک کی فتح دولت کی کثرت اقتدار کا حصول دنیوی کامرانی وغیرہ) رسول اللہ ﷺ کے سامنے (کشف کی حالت میں) لائے گئے آپ کو ان سے خوشی حاصل ہوئی اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی يُعْطِيْكَ میں دوسرے مفعول کو اس لئے حذف کر دیا کہ کسی نعمت کو ذکر کرنے سے خصوصیت پیدا ہو جاتی اور

دوسری نعمتوں سے محرومی کا شبہ پیدا ہوتا اور عموم مفعول کا فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو بکثرت عنایات سے نوازے گا دشمنوں پر فتح اقتدار کامل مومنوں کی کثرت۔ تمام عالم میں دین کی اشاعت آخرت میں شفاعت کثرت ثواب اور ایسی ایسی نعمتیں کہ ان کی حقیقت سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ درجات قرب میں سب سے اونچا درجہ اور سب سے بڑی نعمت یہ کہ کمال نبوت کے درجہ کے مطابق اپنے دیدار سے نوازے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں سے ایک بھی اگر دوزخ میں رہ گیا تو میں راضی نہیں ہوں گا۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا (اور اللہ ان کو بخش دے گا) یہاں تک کہ میرا رب ندا دے گا محمد ﷺ کیا تو اب راضی ہو گیا میں عرض کروں گا ہاں میرے رب میں راضی ہو گیا۔

عطاء کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تجھ کو شفاعت کی اجازت عطا فرمائے گا اور تیری امت کو تیری شفاعت سے بخش دے گا۔ یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے گا۔ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی الٰہی میری امت کو بخش دے اور رونے لگے اللہ نے حکم دیا جبرئیلؑ محمد ﷺ سے جا کر کہہ دے کہ تیری امت کے معاملہ میں ہم تجھے راضی کر دیں گے تجھ کو دکھ نہ دیں گے۔ مسلم

عرب بن شرتح کا بیان ہے کہ حضرت ابو جعفر محمد بنؒ، علیؒ (زین العابدینؒ) سے میں نے خود سنا فرما رہے تھے کہ اے گروہ اہل عراق تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ہے اور ہم اہل بیت کہتے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں سب سے زیادہ امید آفریں آیت وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ہے۔

لَسَوْفَ میں لام کو بعض علماء نے ابتدائیہ قرار دیا ہے یعنی مبتدا محذوف ہے اور خبر پر لام آیا ہے اصل کلام وَلَاَنْتَ سَوْفَ یُعْطِیْکَ تھا یہ لام تاکید کے لئے نہیں ہے کیونکہ مضارع پر بغیر نون تاکید کے لام تاکید نہیں آتا۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ لام تاکید ہے لام ابتداء نہیں ہے اسی لئے سَوْفَ کے ساتھ آیا ہے لام ابتداء سَوْفَ کے ساتھ نہیں آتا۔

آئندہ آیات میں اللہ نے ان چند احسانات کا ذکر کیا ہے جو شروع زندگی سے اپنے رسول پر اس نے مبذول فرمائے تھے تاکہ آئندہ جن مہربانیوں کی امید ہے ان کو انعامات ماضی پر قیاس کیا جا سکے فرمایا۔

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا کیا اللہ نے تم کو یتیم نہیں جانا یا حالت یتیمی میں نہیں پایا۔ یَجِد (مضارع) وَجَدَ سے ہے اور وجد کا معنی ہے عَلِمَ (اس نے جانا) اور یَتِیْمًا دوسرا مفعول ہے یا وجد سے تو ہے مگر وجد وجود سے مشتق ہے اور وجود کا معنی ہے پانا اس وقت یَتِیْمًا حال ہوگا۔ استفہام انکار نفی کے لئے ہے اور انکار نفی اثبات کو مستلزم ہے اس سے غرض ہے مخاطب سے اقرار کرانا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تم کو یتیم پایا یعنی جب تمہارا باپ مر گیا تو تم کو خدا نے نادار بچہ پایا باپ نے نہ تمہارے لئے مال چھوڑا تھا نہ کوئی ٹھکانا۔ اس جملہ میں مَا وَدَّعَکَ کے معنی کی تاکید ہے۔

فَاٰوٰی ۞ پس اس نے تم کو ٹھکانا دیا یعنی تمہارے چچا ابو طالب کے پاس تمہارا ٹھکانا بنایا اور اس کو تمہارا کفیل مقرر کر دیا۔

بغوی نے بحوالہ ترمذی حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اللہ سے ایک درخواست کی تھی لیکن اگر نہ کی ہوتی تو میرے نزدیک بہتر ہوتا میں نے عرض کیا تھا پروردگار تو نے سلیمان بن داؤد کو بڑی حکومت عطا فرمائی اور فلاں کو فلاں چیز دی۔ اللہ نے فرمایا محمد ﷺ! کیا میں نے تجھ کو یتیمی کی حالت میں نہیں پایا اور پھر کیا تجھے ٹھکانا نہیں دیا میں نے عرض کیا بے شک پروردگار (تو نے یہ انعام فرمایا)

اللہ نے فرمایا کیا میں نے تجھے متحیر پا کر صحیح راستہ نہیں بتا دیا۔ میں نے عرض کیا بے شک میرے رب تو نے ایسا ہی کیا اللہ نے فرمایا۔ کیا میں نے تجھے فقیر نہیں پایا اور پھر کیا غنی نہیں بنا دیا۔ میں نے عرض کیا بے شک پروردگار تو نے ایسا ہی کیا بعض

روایات میں اتنا زائد ہے کہ کیا ہم نے تیرا سینہ کھول کر تیرا بار تجھ سے دور نہیں کر دیا میں نے عرض کیا بے شک میرے رب (تو نے ایسا کر دیا)۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ سے مال و دولت کی دعا اس لئے کی تھی کہ آپ مفلس تھے اور قوم والے مفلس کی عار دلاتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تم کو دولت کی خواہش ہے تو ہم تمہارے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ مکے کے بڑے خوش حال لوگوں کی طرح تم بھی ہو جاؤ گے۔ حضور ﷺ اس بات سے رنجیدہ ہوئے اور خیال کیا کہ میرے افلاس کی وجہ سے لوگ میری تکذیب کرتے ہیں اس لئے آپ ﷺ نے اللہ سے اس طرح کا سوال کیا اللہ نے تسلی دینے کے لئے اپنے چند احسانات بیان فرمائے اور دولت مند بنا دینے کا وعدہ فرمایا۔ مگر یہ توجیہ بالکل درست نہیں کیونکہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو جو عزت و شان عنایت کی تھی اس کا تقاضا تھا کہ دنیا کی ذلیل چیزوں کی مانگ خدا سے نہ کرتے۔ دوسری وجہ یہ کہ آیت وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَاَغْنٰى میں اَغْنٰى ماضی کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کو غنی بنا دیا تھا اور غنی ہو جانے کے بعد غنی ہونے کی درخواست ناممکن ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ اگر اللہ سے اس قسم کی درخواست کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرماتا حالانکہ (آپ ﷺ کبھی مالدار نہیں ہوئے ہیں) آپ ﷺ کے گھر والے پیہم دو روز بھی جو کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے اسی حالت میں آپ ﷺ کی وفات ہو گئی۔ حضرت عائشہؓ کے قول سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بخاری و مسلم۔

صوفیہ نے اس مقام کی تنقیح کرتے ہوئے کہا ہے کہ دوران سیر میں صوفی کے سامنے دو حالتیں آتی ہیں (۱) ایک حال تو وہ ہوتا ہے کہ صوفی کا تعلق مخلوق سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور کامل توجہ اللہ ہی کی طرف ہو جاتی ہے اس حالت کو صوفی عروج اور سیر الی اللہ یا سیر فی اللہ کہتا ہے (۲) دوسرا حال وہ ہوتا ہے کہ صوفی مخلوق کو اللہ کی طرف بلاتا ہے لوگوں کو ہدایت کرتا ہے اس لئے مخلوق کی طرف توجہ کرتا ہے بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اللہ سے کٹ کر مخلوق کی طرف متوجہ ہو گیا مگر گہری نظر سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اللہ سے کامل انقطاع نہیں ہوتا بلکہ یہ انقطاع تو بحکم محبوب ہوتا ہے اور اسی کی مرضی سے ہوتا ہے اس لئے یہ انقطاع بھی اتصال کا حکم رکھتا ہے اور حقیقت میں یہ وصل ہی ہوتا ہے بلکہ وصل کا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے اس مرتبہ کو صوفی نزول اور سیر من اللہ باللہ کہتا ہے مگر یہ حالت صوفی کی بڑی بے چینی اور اضطراب کی ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی کو سمندر سے نکال کر خشک میدان میں ڈال دیا گیا ہے اور وہ تڑپ رہی ہے ہم کئی جگہ ذکر کر چکے کہ جس عارف کی نزولی حالت زیادہ کامل ہوتی ہے اس کی تبلیغ و ہدایت بھی زیادہ ہمہ گیر اور عمومی ہوتی ہے اہل تصوف کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نزولی کمال کے مرتبہ پر فائز نہیں تھے اسی لئے ساڑھے نو سو برس کی زندگی میں چند آدمی مومن ہوئے یعنی اہل سفینہ اور رسول اللہ ﷺ کو نزولی مرتبہ بدرجہ اکمل حاصل تھا آپ کا ہم رتبہ اس کمال میں کوئی نہ تھا اسی لئے..... صرف ۲۳ سال کی مدت میں آپ کا دین دنیا میں پھیل گیا اسی کے ساتھ آپ کا عروجی کمال بھی اتنا بلند اور ارفع تھا کہ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کے درجہ پر پہنچ گئے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ نوح کی دعوت کا لوگوں نے انکار اس وجہ سے کیا کہ آپ کو لوگوں سے کامل مناسبت نہ تھی (یعنی آپ کو کمال تبلیغ حاصل نہ تھا) اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لوگوں نے لبیک کہی کیونکہ آپ کی دعوت کی بناء کمال مناسبت کے ساتھ تھی (یعنی آپ کو کمال تبلیغ کا درجہ حاصل تھا) لیکن اسی نزولی کمال ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ سخت غمگین اور پریشان رہتے تھے۔ یہی مطلب ہے رسول ﷺ کے اس ارشاد کا مااوذی احد مثل ما اوذیت جیسا مجھے دکھ دیا گیا ایسا کسی کو نہیں دیا گیا۔ رواہ ابن عدی وابن عساکر وابو نعیم فی الحلیۃ عن انسؓ۔

اگر اس حدیث کا یہ مطلب نہ قرار دیا جائے تو کوئی اور توجیہ ممکن نہیں کیونکہ حضرت نوحؑ کو تو نو سو پچاس برس دکھ اٹھانے پڑے اور حضرت عیسیٰؑ کو اتنی ایذا دی گئی کہ آپ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور حضرت یحییٰ وغیرہ اس راہ میں شہید کر دیئے گئے اس مطلب کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سورۂ والضحیٰ اور الم نشرح کا نزول رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کے لئے ہوا اس

وقت ابتدائی دور تھا آپ کی نزولی حالت کا آغاز تھا بظاہر آپ کو اپنی حالت انقطائی محسوس ہوئی آپ نے خیال کیا کہ کیا میں اللہ سے بالکل کٹ گیا اور مخلوق کی طرف میرا رخ ہو گیا اس خیال کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوئی کہ وحی کے عارضی رک جانے کا یہی زمانہ تھا اس لئے آپ کو سخت ترین رنج تھا یہاں تک کہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ آپ ﷺ کئی بار اس ارادے سے نکلے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے اپنے آپ ﷺ کو گرادیں لیکن جب بھی نیچے گرنے کے ارادہ سے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے جبرئیلؑ نے ندا دی محمد ﷺ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی بے چینی کو دیکھ کر ہی کہا تھا کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ سے خفا ہو گیا ہے رسول اللہ ﷺ اس حالت کے زائل ہو جانے کے خواستگار تھے جس میں خالق سے انقطاع اور مخلوق کی طرف میلان ہو گیا تھا اور جس کو حضور ﷺ نے اللہ کی طرف سے بالکل ترک اور خفگی سمجھ لیا تھا اور اسی کا آپ کو رنج تھا اور دل سے خواہش مند تھے کہ اللہ سے دوامی تعلق اور بلا حجاب وصل قائم رہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں آیت مَاوَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ فراقی حالت جو تم کو پیش ہے ترک تعلق اور ناراضگی نہیں کہ آپ ﷺ رنجیدہ ہوں بلکہ یہ کمال عروج و وصل ہے اگرچہ ظاہر میں نزول و فراق ہے تمہاری ہر دوسری حالت پہلی حالت سے بہتر ہی ہوگی تمہارے احوال میں ضعف اور سستی نہیں آئے گی بالآخر دوسری زندگی میں تم کو غیر منقطع وصل اور دیدار حاصل ہو جائے گا وہاں نہ تبلیغ کا حکم ہوگا نہ خلق کی طرف تمہاری توجہ نہ فراق کی تکلیف اور دنیا و آخرت میں اللہ تم کو تمہاری پسندیدہ اور محبوب چیز عنایت فرمائے گا۔

وَوَجَدَكَ اور اللہ نے تم کو پایا (یا جان لیا) اس کا عطف اَلَمْ یَجِدْکَ کے معنی پر ہے کیونکہ اَلَمْ یَجِدْکَ (لفظاً منفی اور معنیً مثبت ہے اور اس) کا معنی بھی وجدک ہے پس عطف خبر پر ہو گیا انشاء پر نہیں ہوا۔

ضَآلًّا علامات نبوت اور احکام شریعت سے بے خبر اور ان تمام علوم سے لاعلم جن کو جاننے کا ذریعہ سوا نقل کے (کسی طور پر عقل) نہیں اسی مفہوم کی مثل آیت وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِیْنَ اور آیت مَاکُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ کا مفہوم ہے۔ حسنؒ، ضحاکؒ اور ابن کیسانؒ نے یہی تفسیر کی ہے ابوالضحیٰ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ (آیت کا مطلب اس طرح ہے) تم بچہ تھے چھوٹے تھے خوبصورت تھے مکہ کے نوجوانوں میں نا قابل ذکر تھے حلیمہ نے تم کو دودھ پلایا تھا پھر دودھ چھڑا کر تمہارے دادا عبدالمطلب کے پاس تم کو واپس دینے لائی تھی۔

سعید بن المسیبؒ نے بیان کیا کہ حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ کے قافلہ میں ابوطالب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی موجود تھے۔ ایک تاریک رات میں جبکہ آپ اونٹنی پر سوار جا رہے تھے اچانک آپ کی اونٹنی کی مہار ابلیس نے پکڑ کر راستہ سے اس کا رخ موڑ دیا فوراً حضرت جبرئیلؑ نے آکر ابلیس پر پھونک ماری کہ وہ حبش میں جا گرا۔ اور رسول اللہ ﷺ کو قافلہ کی طرف لوٹا دیا۔

بعض نے کہا وَجَدَکَ ضَآلًّا کا یہ معنی ہے کہ تم اپنے نفس سے بھی واقف نہ تھے۔ بعض صوفیہ نے اس طرح تشریح کی کہ اللہ نے تم کو عاشق محبت پایا تمہارا عشق حد سے آگے بڑھ چکا تھا جذب کی حالت کو ضلال بطور کنایہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ مجذوب اکثر غلط راستہ پر پڑ جاتا ہے (گویا ضَآلًّا سے مراد ہے مجذوب) حدیث میں آیا ہے کسی چیز کی محبت تم کو اندھا بہرا کر دیتی ہے پس آیت میں مسبب (ضلال) سے سبب (جذب) مراد ہے جیسا کہ آیت میں آیا ہے اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ اللہ نے آسمان سے رزق اتارا یعنی بارش (رزق مسبب ہے بارش سبب) حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے باپ (حضرت یعقوبؑ) کے متعلق کہا تھا اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اور اِنَّکَ لَفِیْ ضَلٰلِکَ الْقَدِیْمِ (یعنی عشق یوسف کی کھلی ہوئی اور پرانی دیوانگی)

مصر کی عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کے متعلق کہا تھا تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِیْ

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ وہ اپنے غلام کو بہکا رہی ہے۔ غلام پر وہ دل سے شیفتہ ہے ہم اس کو کھلی ہوئی دیوانگی میں دیکھ رہی ہیں۔

فَهَدٰى ﴿۷﴾ یعنی تم کو شعائر دین بتا دیئے یا تمہارے دادا عبد المطلب تک پہنچا دیا یا قافلہ تک پہنچا دیا یا اپنے نفس اور حال کو پہچاننے کا راستہ بتا دیا جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا یا محبوب کے وصل کا راستہ بتا دیا یہاں تک کہ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کے مقام پر تم پہنچ گئے۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا اور تم کو نادار پایا۔

فَاَغْنٰى ﴿۸﴾ پس غنی کر دیا خدیجہؓ کے مال کے ذریعہ سے یا تجارتی منافع کی وجہ سے یا مال غنیمت کے ذریعہ سے۔ ان تمام معانی کی صورت میں غناء سے مراد ہے۔ احتیاج کو دور کر دینا خواہ تھوڑے مال کے ذریعہ سے ہی ہو۔ نصاب زکوٰۃ کا مالک بنا دینا مراد نہیں ہے۔ مقاتل نے کہا اللہ نے رزق دے کر تمہارے دل کو مخلوق کی طرف سے بے نیاز کر دیا۔ فراء نے اسی مطلب کو پسند کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیوی مال و متاع کی وجہ سے غنی نہ تھے بلکہ آپ ﷺ کا دل غنی تھی اور نفس کی غنا ہی اصلی غنا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامیاب ہو گیا وہ شخص جو اسلام لایا اور اس کو بقدر ضرورت رزق مل گیا اور اللہ نے اس کو قناعت عطا کر دی۔ مسلم۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿۹﴾ یہاں سے سورت کے آخر تک معترضہ جملے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کے یتیم اور عائل یعنی نادار ہونے کے ذکر کے ذیل میں یتیم اور سائل کے احکام کا ذکر کر دیا اور یہاں فقیر سائل کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ نادار اکثر سائل ہوتا ہے اور رسول اللہ کو ٹھکانا عطا کرنے غنی بنانے اور ہدایت دینے کا ذکر چونکہ مذکورہ بالا آیات میں آیا تھا اس لئے آئندہ یاد نعمت کا حکم دیا۔ فراء اور زجاج نے لَا تَقْهَرْ کا معنی یہ بیان کیا کہ یتیم کے مال پر زبردستی قبضہ نہ کرو اور اس کی کمزوری کو دیکھ کر اس کا مال نہ لے لو جیسا کہ عرب کرتے تھے عزت کی وجہ سے خطاب تو رسول اللہ ﷺ کو ہے مگر ممانعت کا رجوع امت کی طرف ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمانوں کا وہ مکان بہترین ہے جس میں کسی یتیم سے اچھا سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کا بدترین مکان وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بدسلوکی کی جائے حضور نے اپنی دونوں انگلیوں کو جوڑ کر ان سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جنت میں میں اور یتیم کا سرپرست اس طرح متصل ہوں گے۔ بغوی و ابن ماجہ والبخاری فی الادب وابو نعیم فی الحلیۃ۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾ سائل کو نہ جھڑکو۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے مطلب یہ ہے کہ دروازہ پر جو سائل آئے اس کو نہ جھڑکو نہ ڈانٹو۔ کیونکہ تم بھی نادار محتاج تھے یا تو اس کو کھانا دے دو ورنہ نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ اس کو واپس کر دو۔ اس آیت کے ذیل میں حسنؒ نے کہا کہ طالب علم اگر کچھ پوچھے تو اس کو نہ جھڑکو۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے جس نے مستحقین علم سے علم کو چھپایا قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی۔ تفسیر دوم (یعنی حسنؒ بصری کے قول) کی بناء پر اس آیت کی وابستگی وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى سے ہو گی اور لف نشر مرتب ہو گا (یعنی دوسرے مجموعہ کے اول حصہ کا تعلق اول مجموعہ کے اول حصہ سے اور دوسرے مجموعہ کے دوسرے حصہ کا تعلق اول مجموعہ کے دوسرے حصہ سے علی الترتیب ہو گا) لیکن اول الذکر تفسیر پر اس جملہ کا تعلق وَوَجَدَكَ عَآئِلًا سے ہو گا۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾ یعنی خداداد نعمت کا شکر ادا کرو۔ لف نشر مرتب کی صورت میں اس جملہ کا تعلق وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى سے ہو گا۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ یعنی اپنے رب کی عطا کی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرو۔ سنان بن سنہ نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانے والا پھر کھانے کا شکر ادا کرنے والا بھوک پیاس وغیرہ پر صبر کرنے والے روزہ دار

ع ۱ / ۱۱ / ۱۸

کی طرح ہے۔ رواہ احمد وابن ماجۃ والدارمی باسناد صحیح ورواہ الترمذی من حدیث ابی ہریرہؓ۔

حضرت اشعث بن قیسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا سب سے زیادہ شکر گزار وہ ہے جو لوگوں کے احسان کا بہت شکر ادا کرنے والا ہو۔ ایک روایت میں آیا ہے نہیں شکر کرتا اللہ کا جو نہ شکر کرے لوگوں کا۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ رواہ احمد۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا جائے اس کو اس اچھائی کا بدلہ دینا چاہئے اگر بدلہ چکانے کے قابل کوئی چیز نہ ملے تو (دینے والے کی) ثناء ہی کر دے جب ثناء کر دی تو (حقیقت میں) شکر ادا کر دیا اگر احسان کو چھپائے گا تو ناشکری کا مرتکب ہوگا اور جس نے بغیر کسی کے دیئے (اس کے کپڑے) پہن لئے تو ایسا ہے جیسا کہ جھوٹ کا لباس پہن لیا۔ بغویؒ

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے کہا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ ممبر پر فرمارہے تھے جس نے تھوڑے کا شکریہ ادا نہیں کیا اس نے زیادہ کا بھی شکر نہیں کیا جس نے لوگوں کا شکر نہیں کیا اس نے اللہ کا بھی نہیں کیا۔ اللہ کی نعمت کو یاد کرنا شکر ہے نہ یاد کرنا ناشکری ہے جماعت (اہل اسلام) اللہ کی رحمت ہے تفرقہ اللہ کا عذاب ہے بغوی نے یہ تمام احادیث نقل کی ہیں۔ ان احادیث کا تقاضا ہے کہ مشائخ اور اساتذہ کا شکر ادا کیا جائے اور ان کے احسانات کی تعریف کی جائے۔ بشیر کی روایت میں مجاہدؒ کا قول آیا ہے کہ آیت میں نعمت سے مراد نبوت ہے زجاج نے بھی اسی تفسیر کو پسند کیا ہے اس وقت تحدیث نعمت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم کو جو پیام دے کر بھیجا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچاؤ اور اپنی نبوت کا اظہار کرو لیث کی روایت میں مجاہدؒ کا قول یہ ہے کہ نعمت سے مراد قرآن ہے کلبی کا بھی یہی مختار ہے مطلب یہ کہ قرآن کو پڑھو اس تفسیر پر اس آیت کا تعلق آیت وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى سے ہوگا۔ مقاتل نے کہا اللہ کی نعمت کو یاد کرنا شکر ہے لہٰذا تحدیث نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے جو تم کو ٹھکانا عطا کیا اور ہدایت دی اور غنی بنایا اس کا شکر کرو یہ مطلب زیادہ ظاہر ہے کیونکہ جس نعمت کا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ عام ہے پھر تخصیص کی کوئی وجہ نہیں نعمت دینی ہو یا دنیوی سب کا شکر واجب ہے۔ اس تشریح کی بناء پر آیت کا تعلق مذکورہ بالا تینوں آیات سے ہوگا۔

مسئلہ: ہر نعمت کا شکر واجب ہے اور شکر نعمت کا معنی ہے نعمت کو منعم کی مرضی کے مطابق صرف کرنا لہٰذا نعمت مالیہ کا شکر یہ ہوگا کہ اخلاص کے ساتھ مال کو راہ حق میں صرف کیا جائے اور نعمت بدنیہ کا شکر یہ ہوگا کہ فرائض (بدنیہ) کو ادا کیا جائے اور معصیت سے پرہیز رکھا جائے اور علم و عرفان کی نعمت کا شکر یہ ہوگا کہ دوسروں کو سکھایا جائے اور ہدایت کی جائے۔

مسئلہ: چونکہ نعمت کا ذکر کرنا شکر نعمت ہے اسی لئے حضور نے فرمایا انا اکرم سید ولد ادم ولا فخر وغیرہ ہم سورۂ بقرہ میں اس کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔

وکل ولی له قدم وانی　　علی قدم النبی بدر الکمال

ہر ولی کا ایک قدم ہوتا ہے (جس پر وہ چلتا ہے) اور میں رسول اللہ ﷺ کے قدم پر چلتا ہوں جو بدر کمال تھے۔ یہ بھی آپ کا قول ہے قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔

حضرت شیخ مجددؒ کو اللہ نے ولایت کے تینوں مراتب عطا فرمائے تھے نبوت کے کمالات بھی عنایت کئے تھے اور اولی العزم رسولوں کے بھی۔ باتباع رسول بھی اور بوراثت (تخلیقی بلا عمل) بھی آپ کی فطری تخلیق نبی کی طینت سے ہوئی تھی آپ مجدد اور قیوم تھے غرض بڑے درجات قرب پر اللہ نے فائز کیا تھا آپ نے ان تمام امور کا خود ذکر کیا ہے لیکن یہ تذکرہ (غرور نہیں جھوٹا دعویٰ نہیں بلکہ) تحدیث نعمت ہے اگر کوئی شخص ان بزرگان انسانیت کے اس قسم کے اقوال کو خلاف شرع قرار دیتا ہے تو وہ آیت کریمہ کا منکر ہے ہاں تحدیث نعمت کے طور پر اس طرح کی باتیں زبان سے نکالنے کی شرط یہ ہے کہ اس کا قائل نفسانی صفات (اور آلائشوں) سے یکسر پاک ہو ورنہ ایسی رندانہ جرات قطعاً جائز نہیں کہیں شیطانی ورطہ ہلاکت میں گر نہ جائے اور ابلیس کی طرح اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ کہہ کر تباہ نہ ہو جائے۔

فصل

بغوی نے لکھاہے کہ قرات اہل مکہ میں مسنون ہے کہ سورۂ والضحی سے ختم قران تک ہر سورت کے آخر میں اللہ اکبر کہا جائے میں نے امام القراء ابونصر محمد سے اسی طرح قرأت سیکھی تھی اور انہوں نے ابن کثیر کی قرأت کا سلسلہ اسناد ذکر کیا تھااور ابن کثیرؒ نے مجاہدؒ اور مجاہدؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اور حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے یونہی مسلسل روایت کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور سلسلہ اسناد بھی ابونصر نے بیان کیا تھا(اور دونوں اسنادوں سے بیان کیا تھا) کہ جب تم والضحی کو ختم کرو تو اللہ اکبر کہو یہاں تک کہ خاتمہ قرآن تک ہر سورت کے آخر میں یہی کہا کرو ہم کو ابن کثیر نے ایسا ہی حکم دیا تھااور ابن کثیر نے کہاہم نے حضرت ابن عباسؓ سے پڑھا آپ نے مجھے اسی طرح کہنے کا حکم دیااور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایاہم کو حضرت ابی بن کعبؓ نے یہی حکم دیااور حضرت ابیؓ نے فرمایامیں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے قرات کی تو آپ نے مجھے یہی حکم دیا۔

والضحے کے آخر میں تکبیر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کچھ مدت کے لئے وحی رک گئی تو مشرک کہنے لگے محمدؐ کے شیطان نے محمد ﷺ کو چھوڑ دیاوہ ان سے رخصت ہو گیارسول اللہ ﷺ یہ سن کر غمگین ہوئے اس وقت والضحے نازل ہوئی اور نزول وحی کی خوشی میں حضور ﷺ نے تکبیر کہی۔ پس صحابہؓ نے اس تکبیر کو بطور سنت لے لیا۔

بغوی نے جو کچھ بیان کیا تیسیر میں ابوعمرو دانی نے بھی یہ سب بیان کیاہے مگر بیان میں تقدیم تاخیر ہے دانی نے بروایت بزی از ابن کثیر پوری اسناد کے ساتھ بیان کیاہے کہ ابن کثیر والضحی کو ختم کرکے تکبیر کہتے تھے اور ہر صورت کے آخر پر یہی کرتے تھے یہاں تک کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کو ختم کرکے بھی تکبیر کہتے تھے اگر صورت کے آخری کلمہ کا آخری حرف متحرک ہو جیسے اِذَا حَسَدَ اور وَالنَّاسِ اور الْاَبْتَرُ تو اللہ اکبر کی ہمزہ وصل کو حذف کرکے تکبیر کو سورت کے آخری حرف سے ملادیاجائے اور آخری حرف ساکن ہو جیسے فَحَدِّثْ فَارْغَبْ یاتنوین کے ساتھ ہو جیسے تُرَابًا اور لَخَبِیْرٌ اور مِنْ مَّسَدٍ تو حرف ساکن اور نون تنوین کو زیر کے ساتھ پڑھاجائے اور اللہ اکبر کے ساتھ اس طرح ملادیا جائے اب اگر چاہے تو اللہ اکبر کے بعد دوسری سورت کے لئے بسم اللہ الگ شروع کرے اور چاہے تو تکبیر کو بسم اللہ کے ساتھ ملاکر پڑھے اول تقدیر پر بسم اللہ کو آغاز سورت سے وصل کرلے یا فصل دونوں صورتیں درست ہیں اور دوسری تقدیر پر بسم اللہ کا آغاز سورت سے وصل ہی کیا جائے گا فصل درست نہیں۔

دانی نے کہاکہ بعض اہل تجوید آخر سورت کو ختم کرنے کے بعد اللہ اکبر شروع کرتے ہیں اور اللہ اکبر کو دوسری سورت کی بسم اللہ سے ملاکر پڑھتے ہیں۔ نقاش نے بروایت ابوربیعہ بزی کا یہی عمل نقل کیاہے اور علی فارسی نے بھی اسی طرح پڑھاہے۔ دانی کی بیان کردہ یہ تفصیل بغوی نے مقدم ذکر کی ہے اور دانی نے مؤخر میں کہتا ہوں کہ میں نے دونوں طریقوں سے قاری صالح مصری اور شیخ القراء شیخ عبدالخالق سے پڑھاہے۔ شیخ صالح مصری نے صرف اللہ اکبر کہنے کی بجائے لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر پڑھنا بیان کیاتھا۔

اگر سورۂ والضحی شروع کرنے سے پہلے تکبیر پڑھ چکاہو تو والناس ختم کرنے کے بعد تکبیر نہ پڑھے۔

اگر تکبیر کو پہلی سورت کے آخر سے وصل دے کر کہاہو تو دوسری سورت کے آغاز سے بھی قطع نہ کرے بلکہ جس تکبیر کو پہلی سورت سے ملاکر پڑھاہے اس کو دوسری سورت کی بسم اللہ سے ملادے اور بسم اللہ کو دوسری سورت سے بھی وصل کر دے اور اگر پہلی سورت کے آخر سے تکبیر کو قطع کیاہے تو دوسری سورت کی بسم اللہ سے وصل کرے یا قطع دونوں کا اختیار ہے اسی طرح اس دوسری سورت کو بسم اللہ سے متصل پڑھے یا منفصل دونوں طرح درست ہے۔ واللہ اعلم۔

سورۃ الضحیٰ ختم ہوئی۔ بعونہ ومنہ تعالی

سورۃ الانشراح

یہ سورت مکی ہے اس میں ۸ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ جملہ اور اس کے بعد والے جملے آیت اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ۔ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی سے وابستہ ہیں اگر یہ روایت صحیح مانی جائے تو پھر یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ مذکورہ سابق حالت میں ہی رسول اللہ ﷺ کی درخواست کے بعد اس سورت کا بھی نزول ہوا خواہ سوال واقعی آپ ﷺ نے کیا ہو یا سوال فرض کیا جائے بہر حال آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارا سینہ کھول دیا جس کے اندر بنور الٰہی ایسے علوم صادقہ اور معارف دینیہ سما گئے جو کسی دانشمند کو دانش کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور دل کے اندر اللہ کی طرف کامل توجہ بھی پیدا کر دی گئی (تاکہ مرتبہ عروج کی تکمیل ہو جائے) اور حضور کامل کے ساتھ مخلوق کی طرف بھی اس کا دعوتی اور تبلیغی رخ کر دیا گیا تاکہ مرتبہ نزول بھی حاصل ہو جائے پس حالت نزول میں بھی تمہارا انقطاع اللہ سے نہیں ہے کہ تم کو اس کا رنج ہو۔

اس عالم شہود میں رسول اللہ کا دو مرتبہ شرح صدر ہوا ایک بار تو بچہ پن میں ہوا تھا جیسا کہ حضرت انسؓ کی روایت سے مسلم نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اچانک جبرئیلؑ آگئے اور آپ کو پکڑ کر زمین پر گرا کر سینہ چیر کر دل نکالا اور دل کے اندر سے خون کا لوتھڑا نکال ڈالا اور کہا دل کے اندر یہ شیطان کا حصہ تھا جس کو میں نے نکال ڈالا پھر ایک طشت میں زمزم کے پانی سے دل کو دھویا اور دل کو جوڑ کر دوبارہ اس کی جگہ رکھ دیا اور سینہ جوڑ دیا بچے دوڑے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی ماں یعنی انا دودھ پلانے والی) کے پاس پہنچے اور کہا محمد ﷺ کو قتل کر دیا گیا۔ لوگ لینے کو گئے تو آتے ہوئے مل گئے مگر آپ کا رنگ اترا ہوا تھا حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ سینہ مبارک پر میں (کھال کو جوڑ کر سینے کا) نشان دیکھا تھا۔

دوسری بار شق صدر شب معراج میں ہوا جیسا کہ صحیحین میں حضرت انسؓ نے حضرت ابوذرؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کا واقعہ ذکر کیا اس تذکرہ میں یہ بات بھی تھی کہ حضور نے فرمایا جبرئیل نے نازل ہو کر میرا سینہ چاک کیا پھر زمزم کے پانی سے اس کو دھویا پھر حکمت وایمان سے بھرا ہوا سونے کا طشت لا کر میرے سینے میں الٹ دیا پھر سینہ کو بند کر دیا۔

صحیحین میں حضرت کی روایت بحوالہ حضرت مالک بن صعصعہ آئی ہے کہ حضور نے صحابہ سے بیان کیا کہ جبرئیلؑ نے اس کے اور اس کے درمیان یعنی ہنسلی کے گڑھے سے پیٹ کے بالوں تک سینہ چاک کیا پھر دل کو باہر نکالا پھر ایمان سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت لا کر دل کو دھویا پھر اس کو ایمان سے بھر دیا پھر دوبارہ دل کو اس کی جگہ رکھ دیا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے پھر پیٹ کو زمزم کے پانی سے دھویا پھر اس دل کو ایمان وحکمت سے بھر دیا۔ (الحدیث)

میں کہتا ہوں جس لوتھڑے کو رسول اللہ ﷺ کے دل سے نکال دیا گیا تھا وہ عنصری اور نفسانی اور قلبی رذائل تھے جو نفس کو امارہ بالسوء ہونے پر اور اعضاء جسم کو گناہوں پر ابھارتے ہیں۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ اس کا عطف اَلَمْ نَشْرَحْ پر ہے کیونکہ (الم نشرح میں استفہام انکاری ہے اور انکار نفی کے لئے ثبوت لازم ہے اس لئے) اَلَمْ نَشْرَحْ کا معنی ہوگیا شَرَحْنَا لَکَ صَدْرَکَ، وِزر کا اصلی لغوی معنی ہے

پہاڑ۔ اللہ نے فرمایا کَلَّا لَا وَزَرَ یعنی کوئی پہاڑ نہ ہوگا کہ اس پر پناہ لی جاسکے۔ یہاں مجازی معنی مراد ہے یعنی بڑا بار۔ بار یا تو غم فراق اور تو ہم انقطاع کامل تھا۔

جس نے غمگین بنادیا تھا اور آپ کی قوت صبر توڑ دی تھی پھر اللہ نے سورۃ الضحیٰ اور الم نشرح کو نازل فرما کر اس رنج و غم کو دور کر دیا اور آپ کے دل کو قرار اور طبیعت کو سکون حاصل ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ وہ فراق (وحی کی بندش) انقطاع کلی اور ناراضگی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ حکمت اور منفعت کے زیر اثر تھا پس ازالہ غم کو ہی اللہ نے اپنا انعام قرار دیا۔ یا بار سے مراد ہے شرعی احکام کا بار۔ دعوت حق۔ تبلیغ احکام ادائے اوامر اور ممنوعات سے باز داشت کیونکہ تکالیف شرعیہ کی پابندی بڑی دشوار ہے دیکھو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں نے اس بار کو اٹھانے پر رضامندی ظاہر نہ کی اور اس کو اٹھانے سے ڈر گئے۔

اللہ نے فرمایا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ پس جب اللہ نے ایمان و علم سے رسول اللہ ﷺ کا سینہ کھول دیا اور دل کے اندر جو شیطانی حصہ تھا اس کو دور کر دیا اور نفسانی خباثت جو فطرت نفوس میں داخل ہیں دور کر دیں تو شرعی تکالیف آپ کے لئے مرغوب محبوب اور فطری ہو گئیں یہاں تک کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری آنکھ کی خنکی (یعنی دل کا سکھ اور راحت) نماز میں کر دی گئی ہے۔ یہی مرتبہ جس کو اللہ نے ازالہ بار سے تعبیر فرمایا ہے صوفیہ کے نزدیک ایمان حقیقی ہے اور صوفی جو کہتا ہے کہ صوفیہ سے تکالیف شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں اس قول کی مراد بھی یہی ہے (کہ تکالیف شرعیہ تکالیف نہیں رہتیں بلکہ مرغوب اور محبوب اور راحت آفریں ہو جاتی ہیں) یہ اونچا مرتبہ یعنی شرح صدر اور ازالہ بار کا درجہ رسول اللہ ﷺ کو ظاہری طور پر اور علی الاعلان حاصل ہوا تھا مگر اولیاء امت کو آپ کے وسیلہ سے باطنی طور پر حاصل ہو جاتا ہے یعنی عالم مثال میں اس مرتبہ کا ظہور ہوتا ہے مگر یہ بات نفس اور نفسانیات کی مکمل فناء کے بعد حاصل ہوتی ہے نفس کی نام و نمود مٹ جانے کے بعد ہی صوفیہ کو شرح صدر اور ایمان حقیقی کی بشارت دی جاتی ہے۔ حضرت مجدد ؒ نے یہی فرمایا ہے اور دوسرے مشائخ کرام کے ملفوظات سے بھی ہم نے یہی استفادہ کیا ہے۔

عبداللہ بن یحییٰ ؒ اور ابو عبیدہ ؒ نے (تفسیر آیت کے متعلق) کہا ہم نے تم پر نبوت کا بار ہلکا کر دیا اور فریضہ نبوت کی ادائیگی کو خفیف بنادیا یہ مطلب بھی تفسیر دوئم کے مناسب ہے۔

بعض لوگوں نے کہا آیت کی مراد یہ ہے کہ دور جاہلیت میں جو لغزشیں تم سے ہو گئی تھیں ہم نے ان کو ساقط کر دیا (یعنی معاف کر دیا) مگر یہ مطلب غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شان صدور لغزش سے بلند و برتر تھی بعض علماء نے کہا وزر سے مراد یہ ہے کہ فاضل کو کیا جائے اور افضل کو ترک کر دیا جائے۔ یہ محض تکلف ہے۔

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ یعنی جس بار نے تمہاری پشت کو بھاری اور کمزور کر دیا تھا ہم نے اس کو دور کر دیا جس طرح زیادہ بھاری بوجھ لادنے سے پالان شتر کی چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے جس کو نقیض کہا جاتا ہے اسی طرح زیادہ بار پڑنے سے جو تمہاری پشت سے آواز پیدا ہو گئی تھی اس کو ہم نے دور کر دیا۔

یہ جملہ وزر کی صفت ہے اگر وزر سے مراد غم فراق ہو تو مطلب کی وضاحت کے لئے کسی تکلف کی ضرورت نہیں کیونکہ غم فراق نے حضور ﷺ کی کمر کو کمزور کر ہی دیا تھا۔ اور اگر وزر سے احکام شرعیہ کی مشقت مراد ہو تو یہ معنی ہوگا کہ اگر تمہارا شرح صدر نہ کرتے اور بار ہلکا نہ کر دیتے تو تکلیفی احکام کی مشقت تمہاری پشت کو کمزور بنا دیتی اور واجب الاداء حقوق کو تم ادا نہ کر سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو ہم راہ راست نہ پاتے نہ صدقہ دیتے نہ نماز پڑھتے۔

چونکہ تکالیف شرعیہ کی مشقت دنیا میں ہی پشت شکنی کی موجب اور ادائے فرائض سے مانع ہے اس لئے اَنْقَضَ بصیغہ ماضی فرمایا اور رسول اللہ ﷺ معصوم تھے مگر گناہ صرف آخرت میں قوت برداشت توڑ دینے والے ہوں گے اس لئے آخرت کے لحاظ سے مستقبل کا صیغہ ذکر کرنا مناسب ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ بخاری نے حضرت ابو سعید خدری ؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ

نے حضرت جبرئیل سے آیت وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ کے معنی پوچھے حضرت جبرئیل نے کہا، اللہ فرماتا ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تیرا ذکر بھی کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں اس آیت اور حدیث کا تقاضا ہے کہ ملاء اعلیٰ (آسمانی ملائکہ) جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ محمد ﷺ کا بھی ذکر کرتے ہیں اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا نام ساق عرش پر لکھا ہوا تھا۔ سورۃ البروج میں ہم لکھ چکے ہیں کہ بغوی نے اپنی اسناد سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ لوح محفوظ کے وسط میں لکھا ہوا ہے لا الہ الا اللہ وحدہ دینہ الاسلام و محمد ﷺ عبدہ ورسولہ، ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسلام اس کا دین ہے اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ الحدیث۔

عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں (ذکر سے مراد) اذان، اقامت تشہد اور خطبہ ممبر (میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر) ہے اگر کوئی شخص اللہ کی عبادت اور تصدیق کرے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت نہ دے تو اس کے لئے بالکل بے سود ہے وہ کافر ہی رہے گا حضرت حسان بن ثابت کے شعر ہیں۔ ترجمہ۔

اللہ نے اپنے نام کے ساتھ اپنے نبی ﷺ کا نام ملا دیا ہے جبکہ پانچوں وقت اذان میں اشہد کہتا ہے اور ان کی عزت افزائی کے لئے اپنے ہی نام سے ان کا نام نکالا ہے پس مالک عرش تو محمود ہے اور وہ محمد ﷺ ہیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ رفعت ذکر نبی یہ ہے کہ آپ کے لئے اللہ نے (ازل میں) تمام انبیاء سے میثاق لیا تھا اور آپ پر ایمان لانے کو لازم کیا تھا اور آپ کی فضیلت کا اقرار کرایا تھا۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ یعنی جس دشواری میں آپ ہیں اس کے ساتھ بڑی سہولت بھی ہے یسرا میں تنوین یسر کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔

یہ جملہ گویا کلام محذوف کی علت ہے گویا اصل کلام یوں تھا کہ آپ پر جو دشواری پڑی ہے اس سے آپ رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ عسر کے ساتھ یُسر بھی آئے گا۔ بعض لوگوں نے دوسری آیت میں یُسرا کی تنوین کو وعدہ کی تاکید اور امید کی تعظیم کے لئے قرار دیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ ازسر نو وعدہ ہے (وعدہ سابقہ کی تاکید نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ عُسر کے ساتھ ایک دوسرا یُسر بھی آئے گا۔

عبدالرزاقؒ نے اپنی تفسیر میں اور حاکمؒ نے مستدرک میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں مرسل حدیث نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کو بشارت ہو یسر تمہارے لئے آ پہنچا ایک دشواری دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہ آئے گی۔

اس حدیث کو ابن مردویہ نے بھی ضعیف سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے امام مالکؒ نے موطا میں اور حاکمؒ نے (مستدرک میں) اس حدیث کی شاہد ایک اور حدیث نقل کی ہے جو عمرؓ پر موقوف ہے حاکم نے لکھا یہ اسناد اس حدیث کی تمام سندوں سے زیادہ صحیح ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اگر عسر کسی سوراخ کے اندر بھی ہو گی تو یسر اس کی تلاش میں سوراخ کے اندر بھی جا گھسے گی۔ ایک عسر دو یسر پر کبھی غالب نہیں ہو گی۔ علماء لغت عربی کا قول ہے کہ اگر کسی لفظ کو بصورت معرفہ دوبارہ ذکر کیا جائے تو وہ بعینہ اول لفظ ہی ہوتا ہے (یعنی دوسرے لفظ سے مراد پہلے لفظ کے معنی کی تاکید ہوتی ہے) خواہ پہلا لفظ معرفہ ہو یا نکرہ کیونکہ اصل لغت میں الف لام عہدی ہی ہوتا ہے (جنسی اور استغراقی اور طبعی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں) اور اگر پہلے کلمہ کو بصورت نکرہ دوبارہ ذکر کیا جائے تو دوسرا پہلے سے غیر ہوتا ہے (یعنی دوسرے لفظ سے اول لفظ کے معنی کی تاکید نہیں ہوتی بلکہ کوئی جدید معنی مراد ہوتا ہے) خواہ اول لفظ معرفہ ہو یا نکرہ کیونکہ کلام کو تکرار اور تاکید پر محمول کرنے سے نئے معنی مراد لینا اولیٰ ہے۔

تنقیح الاصول میں آیا ہے کہ اگر ہزار روپیہ (اپنے ذمہ ہونے) کا کسی نے اقرار کیا اور دو مرتبہ اقرار کیا مگر مندرجہ دستاویز کی قید لگا دی تو صرف ایک ہزار روپیہ اس کے ذمہ ثابت ہوں گے اور اگر بلا قید لگائے دوسری مرتبہ اقرار کیا تو دو ہزار واجب ہو جائیں گے۔ یہ امام اعظمؒ کا مسلک ہے مگر مجلس اگر ایک ہی ہو (تو قید لگانے یا نہ لگانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا بہر حال ایک ہی ہزار کا اقرار مانا جائے گا)

میں کہتا ہوں دوسرے اقرار کو اول اقرار کی تاکید اس وقت کہا جائے گا کہ اس کا قرینہ موجود ہو (ورنہ اصل کلام میں استیناف ہی ہے جتنی مرتبہ اقرار کرے گا ہر مرتبہ کا کلام مستقل اقرار مانا جائے گا۔

ایک شبہ

مذکورہ بالا ضابطہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ان مع الفارس سیفا ان مع الفارس سیفا میں دونوں جگہ الفارس سے ایک ہی سوار اور دونوں جگہ سیف سے الگ الگ دو تلواریں مراد نہیں ہوتیں (بلکہ دوسرا کلام پہلے کلام کی تاکید ہوتا ہے۔)

ازالہ

ہم کہتے ہیں کہ اگر تاکید کا قرینہ موجود ہو تو دونوں لفظوں سے مراد ایک ہی معنی ہوتا ہے (اور قرینہ نہ ہو تو تاکید نہیں استیناف ہوتا ہے) اور پیش کردہ مثال میں قرینہ (اتحاد مجلس۔ سیاق عبارت وغیرہ) موجود ہے (اس لئے دونوں جگہ ایک ہی معنی مراد ہے) لیکن آیت میں (لغت کے اعتبار سے) دونوں تاویلیں درست ہیں (تاکید بھی اور استیناف بھی) مگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ نے جو تفسیر فرمائی اس نے صحیح تاویل کی تعیین کردی (اس لئے العُسر سے مراد وہی عُسر اول ہے اور یُسرًا سے مراد دوسرا یسر ہے)۔

بغوی نے ایک اور تشریح کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت میں ایک عسر کے ساتھ دو یُسر کا مراد ہونا اس وجہ سے نہیں کہ نکرہ بصورت نکرہ مکرر آیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق گزشتہ کلام سے ہے گزشتہ کلام میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی تھی اور خصوصیت کے ساتھ دنیا میں یسر اور غنا عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا چنانچہ اس وعدہ کو اللہ نے پورا بھی کیا۔ رسول اللہ کو فراخ دست بنا دیا مختلف بستیاں آپ کے زیر اقتدار کردیں یہاں تک کہ (بعض حالات میں) آپ نے دو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا کئے اور بیش قیمت چیزیں عنایت فرمائیں۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ قرینہ دلالت کر رہا ہے کہ یہ استینافی کلام ہے (سابق کی تاکید محض نہیں) کیونکہ یہاں نہ فاء عاطفہ ہے نہ واؤ۔

اس میں تمام مومنوں سے وعدہ جزا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے بھی وعدہ ہے مگر مومنوں سے وعدہ ہے کہ عسر دنیوی کے بعد یسر اخروی ملے گا اور رسول اللہ ﷺ سے وعدہ ہے کہ ایک عسر کے بعد یسر دنیا میں اور ایک یسر آخرت میں حاصل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا تھا کہ ایک عسر دو یسر پر ہر گز غالب نہ ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی عسر اگر ایک یسر یعنی دنیوی یسر پر غالب آ بھی جائے (اور مومن دنیا کے اندر مدۃ العمر تنگی میں رہے) تو آجائے آخرت کے یسر پر غالب نہیں آسکتا اور آخرت کا یسر ہی عظیم الشان اور لازوال ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ العسر میں الف لام عہدی ہے اور دوسرے العسر میں جنسی واللہ اعلم۔ بعض اہل تفسیر نے اس کی تشریح میں کہا ہے کہ العسر سے مراد وہ ناداری اور شدت و مصیبت ہے جو مشرکوں کے ہاتھوں سے رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تھی اور آپ نے اس کا شکوہ اللہ سے کیا تھا اور پہلے یسر سے مراد ہے اس حالت کا زوال اور فقر کی بجائے غناء۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ العسر سے مراد ہے سینہ کی تنگی۔ پشت شکن بار۔ قوم کی گمراہی اور ان کی طرف سے اذیت یابی۔ اور پہلے یسر سے مراد ہے شرح صدر۔ بوجھ دور کر دینا۔ قوم کا ہدایت کی توفیق پانا اور اطاعت کرنا اور دوسرے یسر سے

سب کے نزدیک ثواب آخرت مراد ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کا معنی ہے اِنَّ بَعْدَ الْعُسْرِ یُسْرًا بعد کی جگہ مَعَ کا استعمال یہ بتانے کے لئے ہے کہ عسر کے بعد یسر کا حصول اتنا متصل ہے کہ گویا دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں۔

میرے نزدیک العسر سے مراد ہے مقام نزول میں مخلوق کی طرف توجہ کرنا (اور قلب کا مکمل ہر وقت رخ خالق کی طرف نہ ہونا) جس کا رسول اللہ ﷺ کو ملال اور دکھ تھا اور یسر اول سے مراد ہے اسی مقام نزول میں خالق کی طرف رخ ہونا کیونکہ نزولی حالت میں بظاہر صوفی کا رخ خدا کی طرف نہیں ہوتا مخلوق کی طرف ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ خدا کی طرف سے رخ گرداں نہیں ہوتا بلکہ اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دونوں رخوں کی وجہ سے اس کو شرح صدر حاصل ہوتا ہے بلکہ مخلوق کی طرف توجہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ صوفی اس یسر کو سیر من اللہ باللہ کہتا ہے (یعنی اللہ کی طرف سے رخ کو موڑ کر مخلوق کی طرف کرنا مگر اللہ کے حکم سے اور اس کی رضا کے موافق) اس صورت میں لفظ مع اپنے حقیقی معنی پر ہے یعنی پہلے جملہ میں مع مقارنت کے لئے ہی ہے لیکن دوسرے جملہ میں بے شک مع کا استعمال مجازی ہے (اور مع بجائے بعد کے لایا گیا ہے)۔

اس توجیہ پر یہ مطلب ہوگا کہ تم رنجیدہ نہ ہو یہ عسر اور مخلوق کی طرف توجہ جو تمہارے لئے موجب حزن ہے اسی کے ساتھ یسر اور خالق کی طرف توجہ بھی ہے آخرت میں تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے گا اور خلوص توجہ سے کوئی مانع نہ ہوگا۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ نَصَبٌ کا معنی ہے تھکان مطلب یہ ہے کہ جب تم دعوت خلق سے فارغ ہو تو عبادت کی محنت کرو تاکہ مذکورہ سابق نعمتیں جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور آئندہ جن نعمتوں کا وعدہ کیا ہے ان سب کا شکر ادا ہو یا یہ مطلب ہے کہ جب ایک عبادت سے فارغ ہو تو دوسری عبادت کی محنت کرو کوئی وقت عبادت سے خالی نہ چھوڑو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اہل جنت کو بس اس وقت کا افسوس ہوگا جو یاد خدا کے بغیر دنیا میں ان کا گزرا ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، ضحاکؒ، مقاتلؒ اور کلبیؒ نے یہ معنی بیان کئے کہ جب فرض نماز یا مطلق نماز سے فارغ ہو تو دعاء کرنے کے لئے محنت کرو اور رب سے مانگنے کی طرف راغب ہو یعنی تشہد کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے یا سلام کے بعد۔ شعبیؒ نے کہا جب تشہد سے فارغ ہو تو اپنی دنیا اور آخرت کے لئے دعا کرو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا جب فرائض کی ادائیگی سے فارغ ہو تو نماز شب میں محنت کرو۔ حسن اور زید بن اسلم نے کہا جب دشمن سے جہاد کرنے سے فارغ ہو تو عبادت کے لئے محنت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا ہم جہاد اصغر سے لوٹ آئے اور جہاد اکبر کی طرف متوجہ ہوگئے اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے۔

منصور کی روایت سے مجاہد کا قول آیا ہے کہ جب امور دنیا سے فارغ ہو تو عبادت رب میں محنت کرو۔ ابن حبان کی روایت سے کلبی کا قول آیا ہے جب تبلیغ رسالت سے فارغ ہو تو اپنے لئے اور اہل ایمان کے لئے استغفار کرو۔ ان صورتوں میں گزشتہ آیت سے اس آیت کا ربط اس طرح ہوگا کہ گزشتہ آیات میں عطاء نعمت کا اظہار تھا اور نعمت موجب شکر ہے لہٰذا نعمت کے شکریہ میں عبادت کرو ہماری تفسیر کے مطابق اس آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ جب دعوت خلق سے فارغ ہو اور مرتبہ نزول کامل کا یہی مقصد ہے تو مراتب عروج و مقام شہود کی طرف اٹھو۔

اس وقت اِنْصَبْ کا معنی ہوگا اِنْتَصِبْ اور انتصب کا معنی ہے اِرْتَفِعْ صحاح میں ہے کہ نصب الشیئی کا معنی ہے کسی چیز کو رکھنا جیسے غلہ یا مکان یا پتھر کو (ایک خاص وضع پر) رکھنا قاموس میں ہے کہ نصب اضداد میں سے ہے نصب الشیئ کسی چیز کو نیچے رکھا یا اوپر اٹھایا نصب (متعدی) سے اِنْتَصَبَ (لازم) اور تَنَصَّبَ آتا ہے۔ ناقة نصباء اٹھے ہوئے سینہ والی اونٹنی۔ تنصب الغراب کوا اٹھا اس تفسیر کے بموجب رسول اللہ ﷺ کو ویسی ہی پیام تسلی ہوگا جیسے آیت اِنَّ

ختم التفسیر بتمامہ ہے۔

وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۝ ۔ فَانْصَبْ عطف تفسیری ہے یعنی اللہ سے مانگنے کی رغبت کرو۔ دوسرے سے مت مانگو۔ عطاء نے (اس جملہ کی تفسیر میں) کہا دوزخ کے خوف اور جنت کی رغبت رکھتے ہوئے اللہ کے سامنے زاری کرو۔ بعض نے اس طرح معنی کیا کہ اپنے تمام احوال میں اللہ ہی کی طرف راغب ہو۔ زجاج نے کہا اپنے میلان طبع کو خدائے واحد کی طرف کرلو۔

اِلٰی رَبِّکَ فعل محذوف سے متعلق ہے یعنی فَارْغَبْ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ میں کہتا ہوں کہ دو مرتبہ راغب ہونے کا حکم اس لئے دیا کہ پہلی رغبت تو اللہ کے انعامات اور صفات کی جانب ہونی چاہئے اور دوسری رغبت اللہ کی ذات مجرد کی طرف جو تمام کیفیات اور اعتبارات سے منزہ ہے۔

نوٹ: مقام نزول میں اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ کی قرات اور مقام عروج میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی کی قرات (حصول مرتبہ کے لئے) مؤید ہے۔ اس کا بیان ہم سورۃ الاعلیٰ میں کر چکے ہیں۔ (سورۃ الانشراح ختم ہوئی)۔

بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ التین

یہ سوت مکی ہے اس میں ۸ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ① حضرت ابن عباسؓ، حسن بصری ابراہیمؒ، عطاءؒ، مقاتلؒ اور کلبیؒ نے کہا (اَلتِّيْنِ اور اَلزَّيْتُوْنِ سے مراد) یہی انجیر ہیں جن کو تم کھاتے ہو اور یہی زیتون کے پھل ہیں جن کا روغن نکالتے ہو۔ انجیر کی قسم کھانے کی خصوصی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ ایسا میوہ ہے کہ اس کے اندر گٹھلی نہیں ہوتی گویا جنت کے پھلوں کے مشابہ ہے۔

ثعلبیؒ نے اور ابو نعیمؒ نے طب میں ایک مجہول اسناد کے ساتھ حضرت ابوذرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انجیر بواسیر کو کھو دیتا ہے اور نقرس کو فائدہ دیتا ہے۔ زیتون ایک بابرکت درخت ہے جس کا پھل روغنی ہوتا ہے اور روغن سالن کی جگہ بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ عکرمہؒ نے کہا تین اور زیتون دو پہاڑ ہیں۔ قتادہؒ نے کہا تین وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق آباد ہے اور زیتون مسجد بیت المقدس ہے۔ ابو محمد بن کعب نے کہا اصحاب کہف کی مسجد تین ہے اور ایلیا زیتون ہے۔

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ② طور وہ پہاڑ جس پر اللہ نے موسیٰ سے کلام فرمایا تھا۔ یہ مصر اور ایلہ کے درمیان واقع ہے۔ ضحاک نے سِيْنِيْنَ کو نبطی لفظ قرار دیا ہے جس کا معنی ہے خوبصورت یا اچھا۔ مقاتل نے کہا جس پہاڑ پر پھل دار درخت ہوں اس پہاڑ کو نبطی زبان میں سِيْنِيْن اور سینا کہتے ہیں۔ عکرمہؒ نے کہا وہ خطہ جہاں طور واقع ہے اس کو سِيْنِيْن اور سینا کہا جاتا ہے۔ بعض نے اس کو سریانی لفظ کہا ہے جس کے معنی ہے گھنے درختوں کا جھاڑ۔ کسی نے حبشی لفظ کہا ہے مجاہد نے کہا سینین کا معنی ہے برکت یعنی برکت والا پہاڑ قتادہ نے کہا اچھا (یا خوبصورت) پہاڑ۔ کلبی نے کہا سینین کا معنی ہے درخت یعنی درختوں والا پہاڑ۔ بعض نے کہا یہ ایک خاص پتھر ہوتا ہے۔ اس قسم کے پتھر کوہ طور کے قریب تھے اس لئے طور کی سِيْنِيْنَ کی طرف اضافت کردی گئی۔

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ③ اَلْاَمِيْن امانت والا۔ امین مال امانت کی حفاظت رکھتا ہے (امین کے پاس مال محفوظ اور مامون رہتا ہے) اس لئے اس کو امین کہتے ہیں یا (امن سے مشتق ہے اور) اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی جو اس میں داخل ہوتا ہے اس کو یہ شہر امن دیتا ہے یا اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی جو اس میں داخل ہوتا ہے مامون ہوتا ہے۔

بلد امین سے مراد مکہ ہے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں مکہ مقام امن تھا۔ اللہ نے ان چیزوں کی قسم اس لئے کھائی کہ (یہ تمام مقامات برکت والے ہیں) انجیر اور زیتون کی پیدائش گاہ حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت گاہ انبیاء کی قرار گاہ اور نزول وحی کا مقام ہے طور وہی جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ کو پکارا گیا تھا اور مکہ میں تو اللہ کا باحرمت گھر اور رسول اللہ کی پیدائش گاہ اور منزل وحی ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ہم نے انسان کو پیدا کیا اَلْاِنْسَان سے جنس انسان مراد ہے۔ (کوئی ہو)

فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ④ بہترین ساخت میں۔ تَقْوِيْم بروزن تفعیل قیام اور قوام سے ماخوذ ہے قیام اور قوام اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کا ثبات اور تقوم ہو۔ صحاح۔ میں کہتا ہوں کہ قوام وہ چیز ہے جس سے کسی چیز کا تحقق (یعنی حقیقت کی ساخت) ہو انسان کے اندر بیرونی جہان کی ساری چیزیں موجود ہیں اس میں عالم روح کی نازک حقائق بھی ہیں اور عالم خلق کے عناصر بھی اور نفس ناطقہ بھی جو عالم عناصر کی پیداوار ہے اسی جامعیت کی وجہ سے کل سنسار کی خصوصیات اس میں

موجود ہیں۔ اس کے اندر ملکی صفات بھی ہیں اور درندوں کے اوصاف بھی اور چوپاؤں کی کیفیات بھی اور شیطانی خباثت بھی۔ یہ ان صفات کاملہ سے متصف ہے۔ جوالٰہی حیات علم قدرت ارادہ شنوائی بینائی کلام اور محبت غرض تمام صفات الوہیت کا پر تو ہیں یہ نور عقل سے آراستہ ہے یہ انوار ظلی اور صفاتی اور ذاتی کا قابل ہے اسی لئے اس کو خلعت خلافت پہنایا گیا اور اسی کے لئے اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً فرمایا گیا۔

اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ کا ترجمہ بعض لوگوں نے اَحۡسَن صورت کیا ہے کیونکہ تَقۡوِیۡم مصدر ہے جس کا معنی ہے معتدل (متوازن) بنایا۔ قاموس میں ہے قومتہٗ میں نے اس کو معتدل بنادیا۔ قویم اور مستقیم سیدھا ہموار آیت میں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یا قویم (بروزن فعیل) کے معنی میں ہے یعنی انسان کو بہترین صورت اور متوازن درست ساخت میں بنایا کیونکہ علاوہ انسان کے ہر چوپایہ کی فطری ساخت واژ گونی کے ساتھ ہے صرف انسان دراز قامت اور صاف جلد والا ہے اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے۔

ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ پھر ہم نے اس کو کر دیا۔

اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ نیچے والوں سے بھی نچلا۔

بغوی نے برعایت مقام اس کو نکرہ قرار دیا ہے جو عموم جنسی کے لئے مفید ہے (یعنی سب نچلوں سے نیچے) اور اگر اس کو عموم جنسی کے لئے نہ قرار دیا جائے تو مہملہ ہوگا جو جزئیہ کے حکم میں ہوتا ہے (یعنی بعض سافلین سے اسفل) اس وقت جائز ہوگا کہ بعض نیچے طبقہ والے انسان سے بھی اسفل ہوں۔[1]

آیت خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ کی تائید اس فرمان نبوی ﷺ سے ہوتی ہے جو صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ہر بچہ کی پیدائش فطرت اسلام پر ہوتی ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنادیتے ہیں یا عیسائی بنادیتے ہیں یا مجوسی بنادیتے ہیں فرق آیت وحدیث میں اتنا ہے کہ آیت میں انسان کو اسفل بنادینے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے لیکن یہ نسبت تخلیقی ہے کیونکہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہی ہے اور حدیث میں یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنادینے کی نسبت ماں باپ کی طرف کی ہے مگر یہ نسبت کسبی ہے کیونکہ انسان اپنے اعمال کا کاسب (فاعل) ہے۔

سٰفِلِیۡنَ سے مراد شاید وہ درندے چرندے اور شیاطین ہیں جن کی سرشتی استعداد ہی اللہ نے پست بنائی ہے کہ نہ ان کے لئے کسی انسانی کمال کو حاصل کرنا ممکن ہے نہ مراتب قرب اور انوار رحمانیہ تک چڑھنا۔ سافل کی جمع سالم سافلین ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ (اگرچہ درندے چرندے پرندے وغیرہ ذی عقل نہیں مگر شیاطین جنات تو حامل عقل ہیں) غیر ذی عقل پر اصحاب عقل کو تغلیب دے دی گئی پس انسان جب اپنی صلاحیتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ منعم کا شکر نہیں کرتا کامیابی اور رضاء خداوندی کے اسباب فراہم نہیں کرتا اور کفر و ناشکری وغیرہ کو اختیار کرتا ہے جو غضب الٰہی کی موجب اور داعی ہے تو اللہ اس کو ہر خبیث سے زیادہ خبیث ہر ذلیل سے زیادہ ذلیل اور کتوں سوروں بلکہ شیطانوں سے زیادہ بدحال اور بدمآل کر دیتا ہے حضرت انسؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ کافر کے لئے جنت کی طرف ایک دریچہ کھول دیا جاتا ہے وہ اہل جنت اور موجودات جنت کو دیکھتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے ان چیزوں کو دیکھ جن کو اللہ نے تیری طرف سے موڑ دیا ہے پھر دوزخ کی طرف ایک دریچہ کھول دیا جاتا ہے۔ الحدیث۔

---

[1] مہملہ وہ جملہ ہے جس میں کل یا بعض کی کوئی علامت نہ ہو مگر احتمال دونوں کا ہو اور ظاہر ہے کہ اگر مہملہ کو کلیہ قرار دیا جائے گا تب کلیہ کے ذیل میں جزئیہ صادق آئے گا اور اگر کلیہ نہ قرار دیا جائے اور جزئیہ مانا جائے تب تو جزئیہ کا صادق ہونا ظاہر ہی ہے مثلاً الانسان ظلوم میں الف لام جنسی ہے اور یہ جملہ مہملہ ہے اب اگر ہر انسان ظلوم ہو تو بعض انسان بدرجہ اولیٰ ظلوم ہوں گے اور جزئیہ ضرور صادق آئے گا اور اگر بعض انسان ظلوم ہوں بعض نہ ہوں تب بھی جزئیہ صادق ہوگا اسی وجہ سے مہملہ کو جزئیہ کی قوت میں کہا جاتا ہے۔

اس حدیث کو ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مومن کو پوری مسرت اور کافر کو کامل حسرت ہو۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں کوئی اس وقت تک نہ جائے گا جب تک اس کو اس کی دوزخ والی جگہ نہ دکھادی جائے یہ دوزخ والی جگہ اس کے لئے اس وقت ہوتی جب وہ بدی کا مرتکب ہوتا ایسا اس لئے کیا جائے گا کہ وہ زیادہ شکرادا کرے اور دوزخ میں کوئی اس وقت تک نہ جائے گا جب تک اس کو اس کی جنت والی جگہ نہ دکھادی جائے یہ جگہ اس کے لئے اس وقت ہوتی جب وہ نیکوکار ہوتا ایسا اس کی حسرت بڑھانے کے لئے کیا جائے گا۔

لیکن شیاطین (اور جانوروں) کی حالت ایسی نہیں ہوگی کیونکہ ان کے اندر جنت میں داخل ہونے کی (فطری) صلاحیت ہی نہیں ہے۔ حسن مجاہد اور قتادہ نے اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ سے مراد دوزخ قرار دیا ہے کیونکہ دوزخ کے (مختلف طبقات ہوں گے) بعض درجات بعض سے اسفل ہوں گے ابوالعالیہ نے کہا یعنی ہم اس کو دوزخ کی طرف خنزیر وغیرہ کی بدترین صورت میں لے جائیں گے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یہ استثناء متصل ہے کیونکہ نیکوکار مومن دوزخ کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے اور نہ بدترین حالت کی طرف ان کو لے جایا جائے گا۔

فَلَهُمْ پس صالح الاعمال مومنوں کے لئے۔

اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۞ لازوال ثواب ہوگا یا ایسا اجر ہوگا جس کا ان پر احسان نہیں رکھا جائے گا۔ فلہم میں فاء سببی ہے اور جملہ علت استثناء کے مقام میں ہے کہ استثناء کو پختہ کر رہا ہے بعض علماء نے آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم یعنی متوازن ترین صورت اور درست ترین حالت میں پیدا کیا کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو بسہولت مل جاتا ہے تمام حیوانات بلکہ جنات وشیاطین اور بحروبر اس کے مطیع فرمان ہیں پھر انسان کو یعنی انسان کے بعض افراد کو انتہائی پیرانہ سالی اور بدترین عمر کی وجہ سے سافلون سے بھی اسفل بنادیا۔ سَافِلِيْنَ (پست اور نچلے) سے مراد ہیں۔ بہت کمزور اور اپاہج اور بچے (زیادہ بوڑھا آدمی ان سے بھی نیچے پہنچ جاتا ہے) کیونکہ پیر فرتوت کے ہوش وحواس جب درست نہ رہیں۔ بدنی طاقت کمزور ہو جائے عوارض اور امراض غالب آجائیں تو وہ ہر کمزور سے زیادہ کمزور ہو جاتا ہے اس تفسیر پر اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں استثناء منقطع ہوگا یعنی اِلَّا کا معنی لیکن ہوگا اور استدراک یعنی اس خیال کو دفع کرنے کے لئے ہوگا جو کلام سے پیدا ہوتا ہے خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عام انسان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو انتہائی بوڑھا اور کھوسٹ ہونے کے بعد مومن بھی ایسا بدحال ہو جاتا ہوگا اور ایسی زندگی مومن کے لئے وبال ہو جاتی ہوگی اس خیال کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ہاں جن اہل ایمان نے اس ناکارہ عمر کو پہنچنے سے قوت اور جوانی کی حالت میں نیک اعمال کئے ہوں ان کا اجر (پیرانہ سالی اور ضعف جسمانی وعقل کی وجہ سے) منقطع نہیں ہو جاتا جیسے اعمال صالحہ قوت وجوانی کی حالت میں تھے ویسے ہی اس ناکارہ عمر میں پہنچنے کے بعد ان کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ ضحاکؒ نے کہا (یعنی) اجر بغیر عمل کے۔

عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے جس کو ابن جریرؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ ناکارہ عمر کو پہنچ گئے تھے جب ان کے ہوش وحواس درست نہ رہے تو ان کا حکم رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تو اللہ کی طرف سے ان کی معذوری میں یہ فیصلہ نازل ہوا کہ اوسان خطا ہونے سے پہلے جو (اچھے) اعمال انہوں نے کئے تھے ان کے لئے (اس بدحواسی کے زمانہ کے اعمال کا) اجر (بھی ویسا ہی) ہے۔

بغوی نے عکرمہ کا قول لکھا ہے کہ جب اللہ نے اس شیخ فرتوت کا خاتمہ (حواس) بہترین اعمال پر کر دیا تو اب زیادتی عمر سے اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

عاصمؒ احول نے بروایت عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (یعنی) وہ لوگ جو قرآن پڑھتے ہیں ان کو ناکارہ بدترین عمر تک نہیں پہنچایا جاتا۔ جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ مومن اگر اتنی عمر کو پہنچ

جائے کہ عمل سے عاجز ہو جائے تب بھی اس کے لئے عمل کا اجر لکھا جاتا ہے۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب مسلمان جسمانی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ اس کے لئے (اب بھی) وہی نیک عمل لکھ جو وہ (صحت کی حالت میں) کرتا تھا۔ حضرت عمروؓ سے بھی ایسی ہی حدیث مروی ہے دونوں روایتیں بغوی نے نقل کی ہیں اور بخاریؒ نے مریض و مسافر کے بارے میں ایسی ہی حدیث حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

ایک سوال: بلاغت کلام کا تقاضا ہے کہ مخاطب اگر کسی حکم کا منکر ہو (اور اس حکم کو ثابت کرنا مقصود ہو) تو درجہ انکار کے مطابق ثبوت حکم کو پختگی سے بیان کیا جائے اور اسی قدر حرف تاکید کا استعمال کیا جائے (اور اگر مخاطب منکر نہ ہو تو کلام کو سادہ رنگ میں بغیر تاکید کے بول دیا جائے) انسان کا بہترین صورت میں مخلوق ہونا اور پھر کسی کا ناکارہ عمر کو پہنچنا اور کمزور ہو جانا کھلی ہوئی بات ہے اس کا کوئی بھی منکر نہیں پھر کیا وجہ کہ اللہ نے اس کلام کو قسم اور لام تاکید اور حرف قَدْ کے ساتھ موکد کیا (یہ تاکید بلاغت کے خلاف ہے)

جواب: اگر کسی چیز کی دلیل واضح ہو اور مدلول کا انکار کیا جائے تو گویا دلیل کا انکار ہو گا کیونکہ ایک دوسرے کو مستلزم ہے۔ احوال انسانی کا انقلاب دوسری زندگی اور جزاسزا ہونے کی واضح دلیل ہے پس جو شخص دوسری زندگی اور جزاسزا کا منکر ہے وہ گویا احوال انسانی کے تغیر کا منکر ہے کافر دوسری زندگی کے منکر تھے تو گویا انسانی احوال کے تغیر کا بھی ان کو انکار ہوا اس لئے کلام کو تاکید کے ساتھ پیش کیا۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۞ اس آیت میں کلام کا رخ موڑ کر انسان کو مخاطب کیا اور فرمایا اے انسان کیا باعث ہے کہ تو تکذیب جزاء کر رہا ہے یا یہ مراد کہ کس چیز نے تجھ کو کاذب بنایا ہے کہ تو برخلاف حق۔ حشر نشر اور جزاسزا کا منکر ہے باوجود یہ کہ تیرے اندر خود ایسی کھلی دلیلیں موجود ہیں کہ جس نے تجھے پیدا کیا اور طاقتور بنایا پھر کمزور کیا اور مردہ بنایا۔ وہ دوبارہ تجھ کو زندہ کرنے اور کئے کرائے کی سزا جزا دینے پر قادر ہے۔

اس صورت میں استفہام زجر اور انکار کے لئے ہو گا یعنی تجھے تکذیب جزاسزا نہ کرنی چاہئے یا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور مانفی کے لئے ہے یا استفہام انکاری کے لئے۔ نفی کے لئے ہو گا تو یہ مطلب ہو گا کوئی چیز تم کو جھٹلانے والی نہیں اور استفہام کے لئے ہو گا تو یہ مطلب ہو گا کونسی چیز تمہاری دروغ گوئی پر دلالت کر رہی ہے یعنی جب تمہاری سچائی پر کھلی دلیلیں موجود ہیں تو کونسی چیز تمہارے قول جزاء کو جھوٹا قرار دے سکتی ہے۔ (معنوی لحاظ سے) اس آیت کی نظیر آیت قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں مَا بمعنی مَنْ ہے اور استفہام تعجب کے لئے ہے یعنی تمہاری سچائی کی ان شہادتوں کے بعد کون شخص تم کو جھوٹا کہہ سکتا ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۞ نفی کا استفہام انکاری ہے اور نفی کی نفی اثبات ہوتی ہے اس لئے یہ کلام گزشتہ کلام کی تائید اور تاکید ہے (یعنی معنوی حیثیت سے اس کی تاکید ہے) مطلب یہ ہے کہ وہ خدا جس نے تخلیق کی اور پھر انسان کو اسفل ترین بنا دیا کیا وہ بناوٹ اور تدبیر کا سب سے بڑا حاکم نہیں اور جب ایسا ہے تو کیا وہ دوبارہ زندہ کرنے اور سزاو جزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا (ضرور رکھتا ہے) یا یہ مطلب ہے کہ کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں (ضرور ہے) لہٰذا وہی تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا جو تمہاری تکذیب کرتے ہیں۔ کذا قال مقاتل۔

بہر حال یہ جملہ یا تو رسول اللہ ﷺ کی تسلی بخشی کے لئے ہے کہ کفار جو صرف عناد اور خصومت کے زیر اثر تمہاری تکذیب کرتے ہیں اس سے تم کو کبیدہ خاطر نہ ہونا چاہئے۔ یا کافروں کے لئے (عذاب کی) دھمکی ہے۔ یا یہ جملہ گزشتہ جملہ کی علت کی بجائے ہے مطلب یہ ہو گا کہ اے انسان تجھے تکذیب نہ کرنی چاہئے کیونکہ اللہ احکم الحاکمین ہے وہ تجھے عذاب دینے کا حکم دے دے گا۔

ع ۸ ۲۰

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص (سورة) التین پڑھے اور آخر میں اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ تک پہنچے تو اس کے بعد ہی اس کو کہنا چاہئے بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ۔ رواہ ابوداؤد۔

حضرت براءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے آپ ﷺ نے عشاء کی نماز کے اندر ایک رکعت میں وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ پڑھی رواہ البخاری۔ واللہ اعلم

سورة التین ختم ہوئی۔

(بعونہ ومنہ تعالی)

سورۃ العلق

یہ سورت مکی ہے اسمیں ۱۹ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بغوی نے اپنی سند سے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلی سورت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ نازل ہوئی اکثر اہل تفسیر کا اسی پر اتفاق ہے سُورۂ اِقْرَاْ، مَالَمْ یَعْلَمْ تک سب سے اول نازل ہوئی تھی یہ کل آیات کا پانچواں حصہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا آپ ﷺ جو خواب بھی دیکھتے تھے وہ صبح کی پو پھٹنے کی طرح (سامنے) آجاتا تھا کچھ مدت کے بعد آپ تخلیہ پسند بنادیئے گئے اور غار حرا میں خلوت گزیں ہونے لگے وہاں آپ متعدد راتیں بغیر گھر آئے عبادت میں گزرتے تھے (مگر) کھانے کا سامان ساتھ لے جاتے تھے (جب کھانا ختم ہو جاتا تو) پھر خدیجہؓ کے پاس آکر حسب سابق کھانے کا سامان لے جاتے یہاں تک کہ حق آگیا آپ حراء میں ہی تھے کہ فرشتہ نے آکر کہا اِقْرَاْ (حضور ﷺ نے فرمایا) میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے (یہ جواب سنکر) مجھے پکڑ کر اتنی زور سے دبایا کہ میں بے طاقت ہو گیا پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَاْ میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس نے پھر پکڑ کر اتنی زور سے مجھے دبایا کہ میں بے طاقت ہو گیا پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَاْ میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس نے تیسری بار مجھے دبایا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔

رسول اللہ ﷺ ان آیات کے ساتھ لوٹ کر گھر آئے اس وقت آپکا دل دھڑک رہا تھا۔ خدیجہؓ بنت خویلد کے پاس پہنچ کر فرمایا مجھے کپڑا اڑھاؤ مجھے کپڑا اڑھاؤ، مجھے کپڑا اڑھاؤ (گھر والوں نے کپڑا اڑھادیا) یہاں تک کہ جب خوف دل سے جاتا رہا تو خدیجہؓ کو واقعہ بتایا اور فرمایا مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے خدیجہؓ نے کہا ہر گز ایسا نہیں ہو سکتا خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رنج نہیں پہنچائے گا۔ آپ عاجزوں کا بار اٹھاتے ہیں آپ ناداروں کو مال دیتے ہیں آپ مہمان کی میزبانی کرتے ہیں آپ واقعی مصائب میں امداد کرتے ہیں اسکے بعد خدیجہؓ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بن سید بن عبدالعزیٰ کے پاس لے گئیں ورقہ جاہلیت کے زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے عبرانی کتاب لکھتے اور انجیل کو عربی میں حسب مشیت خدا تحریر کرتے تھے بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے خدیجہؓ نے ان سے کہا میرے چچا کے بیٹے اپنے بھتیجے سے تو سنو (یہ کیا کہتے ہیں) ورقہ نے کہا بھتیجے تم کو کیا دکھتا ہے رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بتادیا ورقہ نے کہا یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ نے حضرت موسیٰ پر اتارا تھا کاش میں اس زمانہ میں جوان ہوتا کاش میں اسوقت تک زندہ رہتا جبکہ تم کو تمہاری قوم نکالے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا مجھے وہ نکال دیں گے ورقہ نے کہا ہاں جو چیز تم لے کر آئے ہو جو شخص بھی ایسی چیز لے کر آیا اس کو ضرور ایذادی گئی اگر مجھے تمہارا وہ زمانہ ملا تو میں تمہاری بڑی مضبوط مدد کروں گا۔ پھر کچھ مدت کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا اور وحی رک گئی۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ قرآن (کی سورتوں) میں سب سے پہلے المدثر نازل ہوئی تھی ہم سورۃ المدثر میں اسکا ذکر کر چکے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ (الحمد) نازل ہوئی کیونکہ بیہقی نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا عتیق ان کو ورقہ کے پاس لے جاؤ حضرت ابوبکرؓ آپ کو لے کر ورقہ کے پاس گئے اور آپ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ورقہ سے بیان کر دیا اور یہ بھی فرمایا کہ جب میں تنہائی میں ہوتا ہوں تو ایک نداء سنائی دیتی ہے (کوئی) کہتا ہے

محمد ﷺ میں یہ سن کر بھاگ کر چلا جاتا ہوں ورقہ نے کہا ایسا نہ کیا کرو بلکہ رک کر سنو پھر آکر مجھ سے بیان کرو اس کے بعد جب تنہا ہوئے تو کسی نے پکارا محمد ﷺ آپ رک گئے تو کسی نے کہا کہو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ آخر سورت تک پھر اس نے کہا کہو لا الہ الا اللہ الحدیث۔

صحیح اول روایت ہے بغوی نے کہا یہی درست ہے اور جمہور سلف وخلف کا اسی پر اجماع ہے۔ المدثر کو جو نزول میں اول کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی کے عارضی انقطاع کے بعد سب سے پہلے المدثر نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ کی اولیت کے قول کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے پوری سورت یہی نازل ہوئی (اقراء کی تو صرف پانچ آیات نازل ہوئی تھیں) یا یوں کہا جائے کہ سورۂ فاتحہ کی اولیت اضافی ہے یعنی اقرء اور المدثر کے بعد باقی قرآن سے پہلے اس کا نزول ہوا۔

غار حرا میں گوشہ گیر ہونے کی مقدار مدت میں مختلف اقوال ہیں۔ صحیحین میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حرا میں میں ایک مہینہ معتکف رہا اور وہ رمضان کا مہینہ تھا ابن اسحاق نے سیرت میں اسی کو نقل کیا ہے اور زرقانیؒ نے صراحت کی ہے کہ اس سے زیادہ مدت کی روایت صحیح نہیں مسوارؒ بن مصعب نے چالیس روز کی مقدار بتائی ہے مگر یہ شخص متروک الحدیث ہے۔

بعض لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلہ پر قیاس کیا ہے اور دلیل میں یہ فرمان نبوی بھی پیش کیا ہے کہ جس نے اللہ کے لئے ایک چلہ خالص کر لیا اس کے دل سے حکمت کے چشمے برآمد ہو کر زبان پر آجاتے ہیں اس حدیث کو ابو نعیم نے حلیہ میں ایوب کی روایت سے بیان کیا ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی میقات پر قیاس کرنا بھی ضعیف ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے لئے تو ایک ماہ میقات کا تھا پھر اللہ نے دس راتیں بڑھا کر چالیس راتیں پوری کر دیں اور یہ تکمیل ایک عارض کی وجہ سے کی تھی اللہ نے خود فرمایا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً۔

رسول اللہ ﷺ غار میں کس طرح عبادت کرتے تھے اس کی تفصیل میں اختلاف ہے کسی نے شریعت نوحؑ (کسی نے) شریعت ابراہیمؑ اور کسی نے شریعت عیسیٰؑ کے مطابق عبادت کرنا ظاہر کیا ہے مگر یہ سب غلط ہے کیونکہ آپ امی تھے صحیح یہ کہ آپ کی عبادت صرف یہ تھی کہ آپ خلق سے یکسو ہو گئے تھے حق کی طرف جھک گئے تھے اور مراقبہ فکری کرتے تھے۔ قسطلانی نے کہا کہ نزول وحی کے بعد لرزہ پیدا ہونے کا جو ذکر حدیث میں آیا ہے (وہ جبرئیلؑ کے خوف سے نہ تھا حضور ﷺ کی شان تو اس سے بہت اعلیٰ تھی اور آپ بڑے ثابت القلب تھے بلکہ اس خوف کی وجہ سے لرزہ پیدا ہو گیا تھا کہ آپ کو اللہ کے علاوہ دوسرے کے شغل میں مصروف ہونا پڑتا بعض لوگوں نے کہا بار نبوت کے اٹھانے سے آپ پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

ابو نعیم کی نقل کردہ روایت میں آیا ہے کہ جبرئیل اور میکائیل دونوں نے حضور ﷺ کا سینہ چاک کیا اور دھویا تھا پھر دونوں نے کہا تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الخ۔

مسئلہ: اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کا جز نہیں ہے۔ لیکن ابن جریرؒ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ پہلی بار جب جبرئیلؑ نازل ہوئے تو انہوںؑ نے کہا محمد ﷺ اللہ کی پناہ مانگو آپ نے کہا استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم پھر جبرئیلؑ نے کہا کہو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پھر کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ یہ روایت صحاح کے مقابلہ میں شاذ ہے۔

فائدہ: سہیلؒ نے ذکر کیا ہے کہ انقطاع وحی کی مدت ڈھائی سال تھی۔ امام احمدؒ کی روایت شعبیؒ سے آئی ہے کہ چالیس سال کی عمر میں نبوت کا نزول ہوا نبوت کے تین سال تک اسرافیل ساتھ رہے اور آپ کو کسی بات اور کسی چیز کی تعلیم دیتے رہے مگر اسرافیل کی زبانی قرآن مجید نہیں نازل ہوا جب تین سال گزر گئے تو جبرئیلؑ کا تعلق آپ کی نبوت سے ہوا اور بیس سال تک جبرئیلؑ کی زبانی قرآن اترتا رہا بندش وحی کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کے رنجیدہ رہنے کا بیان ہم سورۂ والضحیٰ کی تفسیر میں کر آئے ہیں۔

اِقْرَاْ پڑھو یہ قرآت کا امر ہے اور مفعول محذوف ہے یعنی قرآن پڑھو۔

بِاسْمِ رَبِّکَ اللہ کے نام سے آغاز کرتے ہوئے یا تبرک حاصل کرتے ہوئے۔ یعنی بسم اللہ کہو پھر قرآن پڑھو یہ بھی احتمال ہے کہ بِاسْمِ رَبِّکَ مقام مفعول میں ہو اور با زائد ہو یعنی اپنے رب کے نام کو پڑھو۔

آیت میں اِسْمِ رَبِّکَ فرمایا اِسْمُ اللّٰہِ نہیں فرمایا کیونکہ اللہ ذات واجب الوجود کا علم (اسم مخصوص) ہے اور ذات کی معرفت کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے آثار و صفات پر غور کیا جائے اور صفات میں سے ہم سے واضح ترین تعلق صرف تخلیق و ربوبیت کا ہے اللہ کی صفت تخلیق و ربوبیت کا جو اثر ہم پر نمایاں ہے وہ بتا رہا ہے کہ تمام ممکنات زوال پذیر ہیں اور ممکنات کا زوال ان کے حادث ہونے کی نشانی ہے اور ہر حادث کے لئے پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے جو ازلی ابدی ہو اور نقصان و زوال اور تغیر احوال کی آمیزش سے پاک ہو اس لئے معرفت ذات کے لئے معرفت ربوبیت ہی (اول ترین شرط) لازم ہے لیکن صوفیہ نے اسماء صفات سے قطع نظر کر کے اسم ذات اللہ کو اختیار کیا ہے کیونکہ طریقت کا سفر ذات واجب پر ایمان رکھنے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے اس لئے صوفی کے حق میں اسم ذات ہی اولی ہے اسم ذات میں تمام صفات اجمالی طور پر آجاتی ہیں یہ تمام صفات کو حاوی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسم ذات ہی ذات سے زیادہ قرب رکھتا ہے اور صوفی کا مقصود اصلی ذات ہی ہے۔

طیبی نے لکھا ہے کہ اِقْرَاْ میں مطلق قرآت کا حکم ہے کیا پڑھو اس کی کوئی تخصیص نہیں (یعنی قرآن وغیرہ کوئی معین مفعول محذوف بھی نہیں ہے) نفس فعل (عدم تعیین مفعول میں) الف لام جنسی کی طرح ہے اور باسم میں باء استعانت کی ہے (زائد نہیں ہے) اور یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کا جواب ہے جو آپ نے کہا تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں (کیسے پڑھوں) مطلب یہ ہے کہ پڑھو مگر اپنی قوت اور علم کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے رب کی مدد سے طیبی کی تشریح پر بِاسْمِ رَبِّکَ میں لفظ اسم زائد ہو گا جیسے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ اسم زائد ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ ① وہ رب جس نے پیدا کیا۔ یہ رب کی صفت ہے جو رب کے معنی کی توضیح کر رہی ہے۔ کیونکہ تخلیق ربوبیت کا تقاضا ہے ربوبیت کا معنی ہی ہے کہ کسی چیز کو (عدم یا) نقص سے کمال کی طرف (تدریجاً لایا جائے) خَلَقَ کا مفعول مذکور نہیں تاکہ ہر چیز کی مخلوقیت معلوم ہو جائے (اگر کوئی خاص مفعول ذکر کیا جاتا تو شبہ ہوتا کہ شاید اسی کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسری چیزیں یا تو مخلوق نہیں یا کسی دوسرے کی پیدا کی ہوئی ہیں) یا یوں کہا جائے کہ خَلَقَ اگرچہ فعل متعدی ہے لیکن اس کو فعل لازم کی طرح استعمال کیا گیا (کیونکہ فعل سے اس جگہ مراد ہے معنی مصدری ثبوتی) گویا اَلَّذِیْ خَلَقَ سے مراد ہے وہ خدا جس کی صفت مخصوص تخلیق و تکوین ہے کسی دوسرے میں اس صفت کا پایا جانا ممکن نہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ بظاہر یہ جملہ مستانفہ ہے سابق جملہ سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ نے کیا چیز پیدا کی اس سوال کا جواب اس جملہ میں دے دیا کہ انسان کو پیدا کیا۔ انسان کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیوں کیا اس کی وجوہ متعدد ہیں۔

(۱) انسان ساری کائنات کا مجموعہ ہے جو کچھ اس بڑے سنسار میں موجود ہے وہ سب انسان میں موجود ہے اسی لئے انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے پس انسان کو پیدا کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ سارے جہان کی ہر چیز کو پیدا کر دیا۔

(۲) انسان اشرف المخلوقات ہے انوار ذات و صفات کی قابلیت رکھتا ہے معرفت کا مستحق ہے اور معرفت خداوندی ہی تخلیق کائنات کی غرض ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ یعنی جنات اور انسان کو میں نے صرف اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا۔ حدیث قدسی میں ہے لو لاک لما خلقت الا فلاک ولما اظہرت الربوبیۃ اگر تم (کو پیدا کرنا) نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا اور اپنی ربوبیت کا اظہار نہ کرتا۔ اس حدیث میں صرف رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنایا گیا ہے کیونکہ معرفت الٰہیہ کے لحاظ سے آپ انسان کے فرد اکمل تھے دوسری حدیث میں آیا ہے کنت کنزا مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق میں چھپا خزانہ تھا میں نے اپنی شناخت کرانی پسند کی اس لئے مخلوق کو پیدا کر دیا۔ پس آیت میں انسان کے خصوصی ذکر کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے شرف کو ظاہر کرنا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان ہی تخلیق

کائنات کا مقصد ہے۔

(۳) انسان ہی تکالیف شرعیہ کا مکلف اور ضوابط الہیہ کا مامور اول ہے وہی دوسروں کے حال اور اپنے حال میں فرق سمجھتا ہے پس اپنے احوال کے تغیر کو دیکھ کر صانع کی ہستی پر استدلال اس کے لئے معرفت الہیہ کے حصول کا قریب ترین ذریعہ ہے (اس لئے اسی کی تخلیق کا بیان ہے)

یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے خَلَقَ کا مفعول محذوف ہو یعنی خَلَقَکَ اس نے تم کو پیدا کیا اب سوال ہو سکتا تھا کہ کس چیز سے پیدا کیا تو دوسرا جملہ بطور استیناف فرمایا کہ جنس انسان کو علق سے پیدا کیا (پس تمہاری تخلیق بھی عَلَق سے ہوئی) یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے جملہ کا مفعول الانسان محذوف ہو اور دوسرا خَلَقَ الْاِنْسَانَ اس کی تاکید اور توضیح ابہام ہو اور اس سے عظمت انسان کا اظہار مقصود ہو اور تخلیق انسانی کے متعلق کلام کو مخاطب کے دل نشین بنانا غرض ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الانسان سے مراد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مبارکہ ہو اور خصوصیت ذکر کی وجہ آپ کا شرف ہو یا اس وجہ سے آپ ﷺ کی خصوصیت ہو کہ آپ ہی کلام کے مخاطب ہیں۔

مِنْ عَلَقٍ ۝۲ عَلَق عَلَقَۃٌ کی جمع ہے الانسان چونکہ جنس ہے (جس کے اندر جمعیت کا مفہوم ہے اس لئے بجائے عَلَقَۃٍ کے عَلَق بصیغہ جمع ذکر کیا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ یا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ تُرَابٍ کی بجائے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کہنے کی وجہ یا تو مقطع آیات کے تناسب کی رعایت ہے یا تخلیقی کیفیت جو مختلف دوروں سے گزرتی ہے ان تمام دوروں میں وسطی دور کو اختیار کرنے سے تمام احوال تخلیق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ (سب سے پہلے) انسان مٹی سے بنایا گیا پھر انسانی بدن کے اندر پہنچنے والی غذائیں کثیر تغیرات کے بعد منی کی شکل اختیار کرتی ہیں پھر نطفہ بستہ خون ہو جاتا ہے پھر جامد خون بوٹی بن جاتا ہے پھر ہڈیاں بنتی ہیں پھر ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنایا جاتا ہے پھر روح پھونکی جاتی ہے اور انسان ہو جاتا ہے۔ جامد خون یعنی لوتھڑا ہونے کا درمیانی درجہ ہے اور اس سے گزشتہ اور آئندہ تغیرات کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔

اِقْرَاْ تاکید اور مبالغہ کے لئے دوبارہ اِقْرَاْ فرمایا اول اِقْرَاْ مطلق ہے اور دوسرا تبلیغ کے لئے یا نماز میں (قرآن) پڑھنے کا حکم دینے کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ بِاسْمِ رَبِّکَ اس اِقْرَاْ سے متعلق ہو اور پہلا اِقْرَاْ فعل لازم کی طرح استعمال کیا گیا ہو اس وقت اقرء کا معنی ہو گا قاری بن جاؤ گویا دوسرا اقرء جملہ مستانفہ ہو گا جب رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا میں نہیں پڑھوں گا اور کس طرح پڑھ سکتا ہوں (جبکہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا پڑھو اور بسم اللہ کر کے قرآن پڑھو۔ اس مطلب کی تقدیر پر رسول اللہ ﷺ کا قول ما انا بقاری جو جبرئیلؑ کے اقرء کہنے کے جواب میں تھا۔ استفہامیہ ہو گا اور ما نفی کے لئے نہیں بلکہ سوال کے لئے ہو گا اور (قبائل) مضر کے محاورہ کے مطابق بقاری میں باز ائد ہو گی اور بقاری انا کی خبر ہو گی (یعنی کیا میں قاری ہوں کیا میں پڑھا ہوا ہوں) یہ بھی احتمال ہے کہ پہلی مرتبہ جو رسول اللہ ﷺ نے ما انا بقاری فرمایا تھا اس میں ما نفی کے لئے ہو اور جبرئیلؑ کے دبانے کے بعد جو فرمایا اس میں استفہام ہو۔

وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝۳ واؤ حالیہ ہے ربک مبتدا ہے اَلْاَکْرَم مبتدا کی صفت ہے یا خبر ہے۔ اَلْاَکْرَم کا معنی یہ ہے کہ (ساری کائنات میں) جس کریم کا وجود مانا جائے وہ ہر ایک سے زیادہ کریم ہے خواہ کریم کا وجود (واقعی ہو یا) محض فرضی ہو کیونکہ وہ بغیر کسی (ذاتی) غرض کے اتنا ایسا اور اتنے مقامات سے دیتا ہے کہ اس کی گنتی اور شمار ممکن نہیں اور بندوں کی نادانی شرک ناشکری اور نافرمانی کی اس سلسلہ میں پرواہ نہیں کرتا سب بیہودگیوں کو برداشت کرتا ہے پھر یا تو (قابل عفو گناہوں کو) معاف کر دیتا ہے یا فوری انتقام تو نہیں لیتا باوجودیکہ (بندوں کی نافرمانیوں کو) جانتا ہے اور فوری سزا دینے کی پوری قدرت اس کو ہے (وہاں آخرت میں اگر چاہے گا تو سزا دیگا) یا اَکْرَم (اسم تفضیل) سے مراد ہے کریم (صفت مشبہ)

علماء نے کہا ہے کہ صفات خداوندی میں افعل اور فعیل کا ایک ہی معنی ہے یعنی حقیقت میں اللہ ہی کریم ہے اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں دوسرے چونکہ اللہ کی صفت کرم و رحمت کا آئینہ ہے اس لئے مجازاً ان کو کریم و رحیم وغیرہ

کہہ دیا جاتا ہے۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ بعض علماء نے کہا کہ عَلَّمَ کا مفعول محذوف ہے اور بالْقَلَم کا تعلق اسی مفعول سے ہے۔ یعنی علم الخط بالقلم اللہ نے قلم سے لکھنے کا طریقہ سکھایا تاکہ علوم اور آسمانی کتابیں مفید ہو سکیں اور مدت تک باقی رہ سکیں اور دور کی چیزوں کی اطلاع ہو سکے۔ سب سے پہلے تعلیم تحریر کا ذکر تحریر کی عظمت کو ظاہر کر رہا ہے کیونکہ سیکھنے کی اصل غرض یہ ہے کہ سیکھنے والا یاد رکھے اور علوم باقی رہے اور علوم کا تحفظ اکثر تحریر کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سب سے اول لکھنے والے حضرت ادریسؑ تھے (یعنی تحریر حرفی حضرت ادریسؑ کی ایجاد ہے)

میں کہتا ہوں کہ بظاہر بِالْقَلَم عَلَّمَ سے متعلق ہے یعنی قلم کے ذریعہ سے اللہ نے علوم سکھائے چونکہ تعلیم بالقلم ہر طریقہ تعلیم سے مقدم ہے اس لئے سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا۔ الحدیث۔ یہ تذکرہ سورہ نٓ والقلم میں گزر چکا ہے۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ پورا جملہ یا تو رَبُّکَ کی اول خبر ہے یا (اول خبر اَلْاَکْرَمُ ہے اور یہ) دوسری خبر ہے یا الاکرم صفت اول ہے اور یہ جملہ دوسری صفت ہے جو تکریم کے معنی کی وضاحت کے لئے لایا گیا ہے کیونکہ علوم سکھانا اور افادہ علوم کے ذرائع کی تعلیم دینا اللہ کا بڑا اکرم ہے۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ اللہ نے عقل اور (عملی و علمی) قوتیں پیدا کیں (اندرونی اور بیرونی) دلائل قائم کیے (انبیاء کے پاس) وحی بھیجی (اولیاء اور صلحاء امت کو) الہام کیے (عوام و خواص کے) ذہنوں میں بدیہی علوم پیدا کیے (آسمانی) کتابیں نازل کیں پیغمبروں کو بھیجا اخبار متواترہ کے ذریعہ سے اطلاعات بہم پہنچائیں اور ان تمام ذرائع سے انسان کو وہ علوم سکھائے جن سے وہ ناواقف تھا۔

اگر الاکرم اور اَلَّذِیْ کو رَبُّکَ کی صفات مانا جائے تو یہ جملہ خبر ہوگا۔ اور اگر الذی علم بالقلم کو خبر کہا جائے تو یہ جملہ اس سے بدل ہوگا۔ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ میں چونکہ تعمیم مفعول مقصود تھی اس لئے کوئی خاص مفعول ذکر نہیں کیا لیکن عَلَّمَ کو بالقلم کے ساتھ مقید کر دیا اور عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ میں مفعول تو ذکر کر دیا گیا مگر بالقلم کی شرط ذکر نہیں کی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری کائنات انسانی علم کا ایک حصہ ہے (انسان کو دوسری کائنات سے زیادہ علم دیا گیا ہے) کیونکہ پہلی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہو یا دوسری مخلوق (ملائکہ) وغیرہ سب کو قلم کے ذریعہ سے علم دیا ہے اور قلم سے دیا ہوا علم تمام کا تمام لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے کوئی چھوٹی بڑی اور تر و خشک چیز ایسی نہیں کہ لوح محفوظ سے چھوٹ گئی ہو سب لوح محفوظ میں لکھی ہوئی موجود ہے لیکن انسان کو دیا ہوا علم مکتوب لوح محفوظ کے علاوہ بھی ہے اللہ نے فرمایا وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (اگر علم آدم صرف وہی ہوتا جو لوح محفوظ میں تحریر ہے تو فرشتے آدم کے سوال کا جواب کیوں نہ دے سکتے حقیقت ذات باری تعالیٰ کا علم حصولی نہیں کہ لوح محفوظ میں اس کی سمائی ہو سکے اور قلم اس کو لکھ لے وہ تو علم حضوری کی ایک شاخ ہے بلکہ اس کائنات سے وراء حقیقت خداوندی کے بعد انسان کو ذات موہوم کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوتا ایک شاعر کا قول ہے۔

فان من جودک الدنیا ومن فیھا ومن علومک علم اللوح و القلم دنیا اور جو کوئی دنیا میں ہے تیری سخاوت کا ایک جزء ہے اور علم لوح و قلم تیرے ہی علوم کا ایک حصہ ہے۔

جملہ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ اِقْرَاْ کی ضمیر فاعل سے حال ہے جب رسول اللہ ﷺ نے امر قرات کے جواب میں ما انا بقاری کہا تو آپ سے کہا گیا اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ یعنی اپنے اس رب کریم کی مدد کے ساتھ پڑھو جس نے قلم کے ذریعہ سے علوم کی تعلیم دی اور آدمؑ یا ہر نبی کو وہ علوم سکھائے جن سے وہ ناواقف تھا وہی تم کو بھی پڑھنا سکھا دے گا اگرچہ تم پڑھے ہوئے نہیں ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ الانسان سے مراد محمد ﷺ ہوں۔ گویا جب رسول اللہ ﷺ نے ما انا بقاری کہا اور (ہر بار) جبرئیلؑ نے آپ کو پکڑ کر اتنی زور زور سے دبایا کہ آپ بے طاقت ہو گئے اور اقرء کہا تو

تین بار اقرء کہنے سے اللہ نے آپ کو اولین و آخرین سب کے علوم عطا فرما دیئے کیونکہ بندوں کے تمام افعال کا خالق تو اللہ ہی ہے (وہی نہ جاننے والے کو علم دیتا ہے اور نہ پڑھ سکنے والے کو پڑھنا بتاتا ہے) اسکے بعد اپنے انعام کا ذکر کیا اور فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ایک اور آیت میں آیا ہے وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ یعنی تم کو وہ علم عطا کیا جس سے تم ناواقف تھے۔

ایک شبہ: مَالَمْ یَعْلَمْ کہنے کا کیا فائدہ؟ تعلیم تو نامعلوم چیز کی ہوتی ہی ہے تعلیم معلوم کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا (تحصیل حاصل ناممکن ہے)

ازالہ شبہ: عجز انسان کی صراحت کرنی مقصود ہے تاکہ وہ اپنی نادانی کا اعتراف کرے اور نعمت علم کا شکر گزار ہو۔

مواہب لدنیہ میں ایک روایت مذکور ہے کہ جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے سامنے خوبصورت ترین شکل اور پاکیزہ ترین خوشبو کے ساتھ نمودار ہوئے اور کہا محمد ﷺ تم کو اللہ سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم جن وانس کے لئے رسول (بنا کر بھیجے گئے) ہو ان کو کلمہ لا الہ الا اللہ کی دعوت دو پھر جبرئیل ؑ نے اپنا پاؤں زمین پر مارا فوراً پانی کا ایک چشمہ ابل پڑا جبرئیل علیہ السلام نے اس سے خود وضو کیا اور رسول اللہ ﷺ کو (اسی طرح) وضو کرنے کا حکم دیا (حضور ﷺ نے بھی وضو کیا) حضرت جبرئیل ؑ نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی (اپنے ساتھ) نماز پڑھنے کا حکم دیا اس طرح جبرئیل ؑ نے رسول اللہ ﷺ کو وضو اور نماز کی تعلیم دی پھر خود آسمان پر چڑھ گئے اور رسول اللہ ﷺ (واپس آئے) راستہ میں جس پتھر ڈھیلے اور درخت کی طرف سے گزرتے تھے وہ کہتا تھا السلام علیکم یا رسول اللہ ﷺ آخر حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور ان سے واقعہ بیان کیا حضرت خدیجہؓ انتہائی مسرت سے مدہوش ہو گئیں پھر آپ نے ان کو وضو کرنے کا حکم دیا اور ان کو ساتھ لے کر اسی طرح نماز پڑھی جس طرح آپ کو ساتھ لے کر جبرئیل ؑ نے پڑھی تھی۔

پس سب سے پہلے یہی دو رکعت نماز فرض ہوئی پھر سفر میں تو اللہ نے اس کو اسی طرح ادا کرنے کا حکم برقرار رکھا اور اقامت کی حالت پوری چار کر دیا۔

ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ معراج سے پہلے رسول اللہ ﷺ یقیناً نماز پڑھتے تھے اور صحابہؓ بھی اسی طرح پڑھتے تھے اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ پنجگانہ نمازوں سے پہلے کیا کوئی فرض نماز تھی یا نہ تھی بعض علماء کا خیال ہے کہ طلوع اور غروب سے پہلے نماز فرض تھی (یعنی فجر و عصر)

ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ سب سے اول دعوت توحید اور (مشرکین کو عذاب سے) ڈرانا واجب ہوا پھر اتنا قیام شب جس کا ذکر سورۂ مزمل کے اول میں آیا ہے واجب ہوا پھر سورۂ مزمل کے آخری حکم نے قیام شب کی اتنی مقدار کو منسوخ کر دیا جس کا ذکر اول سورت میں آیا ہے پھر مکہ میں شب معراج کے اندر پنجگانہ نمازوں کی فرضیت سے قیام شب کا وجوب منسوخ ہو گیا۔

روایت مذکورہ میں جو یہ آیا ہے کہ حضرت جبرئیل ؑ نے رسول اللہ ﷺ کو وضو سکھایا اور وضو کرنے کا حکم دیا تو ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے وضو فرض ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن المنذرؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ابوجہل نے لوگوں سے پوچھا کیا محمد ﷺ تمہاری موجودگی میں خاک پر چہرہ رگڑتا ہے (سجدہ کرتا ہے) جواب دیا گیا ہاں ابوجہل بولا لات و عزی کی قسم اگر میں نے اس کو ایسا کرتے دیکھ لیا تو پاؤں سے اس کی گردن روند ڈالوں گا اور اس کے منہ کو مٹی میں رگڑ دوں گا اس پر اللہ نے نازل فرمایا۔

کَلَّآ جو مشرک حد (حقانیت) سے آگے بڑھ کر رسالت کے منکر تھے اور نماز سے روکتے تھے ان کو باز داشت کی گئی اگرچہ اس کا ذکر کلام میں نہیں مگر (سیاق) کلام یا حال اس پر دلالت کر رہا ہے یا کَلَّا کا معنی ہے حقاً اور اس سے آئندہ کلام کی حقانیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ (اگرچہ الانسان میں لام جنسی ہے لیکن) بعض افراد کا لحاظ پیش نظر ہے اس لئے مراد ابوجہل ہے۔

لَيَطْغَىٰٓ ۝ ابو جہل کفر میں اور اللہ کے مقابل غرور میں حد سے بڑھ رہا ہے۔
اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اس لئے کہ وہ اپنے کو غنی پاتا ہے۔ اَنْ سے پہلے لام مقدر ہے پس اَنْ رَاٰی علت طغیان ہو گیا اس سے پہلے لفظ وقت محذوف ہو گا اس وقت رُوْیَۃُ طغیان کے لئے ظرف زمان ہو گی یعنی احساس استغناء کے وقت وہ طغیان کرتا ہے۔ رویت سے مراد ہے دل سے دیکھنا (یعنی پانا اور احساس کرنا) آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے ورنہ مرفوع اور منصوب دونوں ضمیروں کا مرجع ایک ہی ہو گا اور یہ ناممکن ہے ابو جہل کو مال مل جاتا تھا تو وہ کھانے پہننے اور سواری میں دوسروں پر اپنا امتیاز قائم کرتا تھا۔
اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝ رُجْعٰی بروزن بشری مصدر ہے یہ جملہ مفید تہدید و تخویف ہے اور مستانفہ ہے (سوال ہوتا تھا کہ پھر اس طاغی کا انجام کیا ہے تو یہ جواب دیا گیا)
کلام کا رخ موڑ کر اسی طاغی انسان کو خطاب کیا۔ اَلرُّجْعٰی میں الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے یعنی اے طاغی تیری واپسی تیرے رب ہی کی طرف ہو گی وہ تجھے اس طغیان کی سزا دے گا۔
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل آگیا اور نماز سے روکا اس سلسلہ میں اَرَءَيْتَ سے كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ تک آیات کا نزول ہوا۔
اَرَءَيْتَ میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے اور استفہام تقریری ہے یعنی قَدْ کے معنے میں ہے اور مقصود یہ ہے کہ مخاطب اقرار کرے۔ یا استفہام سے مقصود یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا اس کو بیان کرے (یعنی نفس رؤیت کے متعلق سوال نہیں ہے کہ تم نے دیکھا یا نہیں دیکھا بلکہ جس چیز کو دیکھا اس کو پوچھنا مقصود ہے) موخر الذکر صورت استفہام تعجب کے مقام میں ہوتی ہے۔
رؤیت سے مراد رؤیت قلب ہے اور افعال قلوب کے دو مفعول ہوتے ہیں جو معنوی لحاظ سے باہم مبتداء اور خبر ہوتے ہیں یہاں مقصود اس نسبت کا اقرار کرنا ہے جو دونوں مفعولوں کے درمیان ہے اور اسی نسبت کو ظاہر کرنے کی طلب ہے۔
اَلَّذِيْ يَنْهٰى سے مراد ابو جہل اور عَبْدًا سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے اَرَءَيْتَ مخاطب کا صیغہ ہے اور عَبْدًا اِذَا صَلّٰى کا ذکر بصورت غائب ہے کلام کے رخ کو موڑ کر بجائے کاف خطاب کے لفظ عبد کو ذکر کرنے سے مقصود ہے کمال عبودیت کی صراحت اور رسول اللہ ﷺ کا واضح طور پر برحق ہونا کیونکہ کمال عبودیت کا تقاضا ہے عبادت پھر عبادت سے روکنے والے کے کمال طغیان کا بھی اس سے اظہار مقصود ہے۔
الذی صلّٰی تک اَرَءَيْتَ کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول كَيْفَ يَطْغٰى محذوف ہے مگر حکم مذکور میں ہے اصل کلام اس طرح تھا اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى كَيْفَ يَطْغٰى۔
اَرَءَيْتَ رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ اے محمد ﷺ کیا تم کو معلوم ہے کہ۔
اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝ اگر وہ بندہ ہدایت پر ہو نماز پڑھنے میں۔
اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝ یا پرہیزگاری کا حکم دے رہا ہو جبکہ وہ توحید اور نماز کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے۔ (یعنی نماز پڑھنے اور توحید کی دعوت دینے میں اگر وہ بندہ حق پر ہو تو اس کو روکنے والے کا نتیجہ کیا ہو گا یقیناً اس وقت یہ تباہ ہو گا) ان آیات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ابو جہل نے دونوں چیزوں کی روک کی تھی نماز پڑھنے کی بھی اور دعوت توحید کی بھی لیکن پہلے جملہ میں صرف نہی صلوٰۃ کا ذکر کیا (ممانعت توحید کا ذکر نہیں کیا) کیونکہ اس جگہ دونوں کا ذکر کرنا تھا اس کے علاوہ دعوت بالفعل تھی اور یہ بھی احتمال ہے کہ نہی العبد سے مراد عام ممانعت ہو نماز کی ممانعت ہو یا کسی دوسری چیز کی اور رسول اللہ ﷺ کے عمومی احوال (اس وقت) انہی دونوں چیزوں پر محصور تھے تکمیل نفس کے لئے عبادت اور دوسروں کی تکمیل کے لئے دعوت

توحید (پس نہی عبد کا انحصار صرف ممانعت نماز میں نہ ہوگا بلکہ دعوت توحید کی ممانعت بھی اسی نہی میں داخل ہوگی) بہر حال جملہ اِنْ کَانَ شرط ہے اور جزا محذوف ہے سیاق کا تقاضا یہی ہے مثلاً اگر رسول اللہ ﷺ کا ہدایت پر ہونا اور دعوت توحید دینا حق ہے تو پھر ابو جہل اس کی ممانعت کیسے کرتا ہے یا یہ ممانعت کرنے والا ہلاک ہو جائے گا یا یہ بندہ کامیاب ہو جائے گا۔ وغیرہ۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۳﴾ یعنی اے محمد ﷺ! بتاؤ تو کہ اگر یہ حق سے روکنے والا تمہاری تکذیب کررہا ہے اور ایمان سے منہ موڑ رہا ہے تو اللہ کے عذاب سے کیسے بچے گا یقیناً ہلاک ہوگا۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾ استفہام انکاری ہے نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے استفہام کی غرض زجر اور وعید عذاب ہے۔ اَلَمْ يَعْلَمْ کا معنی ہو قَد علم اور یری کا معنی ہے یعلم یعنی وہ جانتا ہے کہ اللہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ طاغی ہدایت اور دعوت توحید سے روکتا ہے حق کی تکذیب کرتا ہے ایمان سے خود روگرداں ہے اور اس بات سے بھی واقف کہ بندہ خاص ہدایت پر ہے اور توحید کی دعوت دے رہا ہے۔ اور اللہ کے علم کے مطابق سزا جزا ملنی لازم ہے پس (علم کا نتیجہ لازمہ چونکہ جزا سزا ہے اس لئے) لفظ رؤیت (بمعنی علم) سے لازم رویت یعنی جزا سزا مراد ہے۔

پس (ہمارے کلام سے معلوم ہو گیا کہ) یہ چار جملے ہیں صاحب بحر مواج نے ایسا ہی لکھا ہے مگر اس نے اَلَمْ يَعْلَمْ جملہ شرطیہ دوئم کی جزا قرار دیا ہے اور پہلے شرطیہ کی جزا کو محذوف مانا ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اول اَرَءَيْتَ اور تیسرے اَرَءَيْتَ میں تو خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہی ہے اور دوسرے اَرَءَيْتَ میں خطاب کافر کو ہے اور یہ روئے خطاب کی تبدیلی ایسی ہی ہے جیسے حاکم کبھی ایک فریق کو خطاب کرتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کو۔

شیخ جلال الدین محلی نے آیات کی تشریح اس طرح کی ہے اے مخاطب تجھے تعجب ہونا چاہئے کہ یہ نماز پڑھنے سے روکتا ہے باوجودیکہ جس کو روکتا ہے وہ ہدایت پر ہے اور تقوی کا حکم دیتا ہے اور روکنے والا مکذب ہے اور ایمان سے منہ موڑنے والا ہے۔ اس تشریح پر بھی چار جملے ہوں گے۔

بعض لوگوں نے آیات کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اے محمد ﷺ دیکھو تو کہ جو شخص بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے ہم نے (نماز پڑھنے میں) تمہاری طرف سے اس کو کیسا پھیر دیا اے محمد ﷺ! دیکھو تو اگر ابو جہل ہدایت پر ہو جاتا یا تقوے کا (دوسروں) کو حکم دیتا تو اسی کے لئے بہتر ہوتا اے محمد ﷺ دیکھو تو اگر ابو جہل نے تمہاری تکذیب کی اور ایمان سے منہ موڑا تو اسی کا نتیجہ خراب ہوگا میں اس کو ضرور عذاب دوں گا کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ اس کی ان حرکات سے واقف ہے اور اس کے کرتوت کی اس کو سزا دے گا تین مرتبہ اَرَءَيْتَ کی تکرار اور صرف ایک مرتبہ ذکر پر اکتفانہ کرنا اور آخری دونوں شرطیہ جملوں کو اَلَّذِيْ يَنْهٰى پر معطوف نہ بنا دینا انتہائی تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔

بیضاوی نے اس طرح مطلب لکھا ہے بتاؤ تو کہ یہ شخص جو اللہ کے بندہ کو نماز سے روکتا ہے یا یہ نماز سے روکنے میں ہدایت پر ہے یا بت پرستی کا جو یہ حکم دیتا ہے یہ تقوی کا حکم ہے یا یہ حق کی تکذیب کرتا ہے اور راستی سے روگرداں ہے کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ اس کے احوال ہدایت و ضلالت سے واقف ہے اور اللہ کو اس کے حال کی اطلاع ہے۔ اس مطلب پر پوری آیات کا ایک جملہ ہو جائے گا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے دیکھو تو کیسے تعجب کی بات ہے کہ بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو یہ اس کو روکتا ہے حالانکہ وہ بندہ ہدایت پر ہے اور تقوی کا حکم دیتا ہے اور یہ روکنے والا مکذب اور ایمان سے روگرداں ہے۔

بیضاوی کے نزدیک اَلَّذِيْ يَنْهٰى اَرَءَيْتَ کا پہلا مفعول ہے اور دونوں شرطیے دوسرا مفعول ہیں اور دوسرے شرطیہ کی جزا اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ہے اور پہلے شرطیہ کی جزا محذوف ہے لیکن بغوی کے نزدیک پہلا شرطیہ يَنْهٰى کے مفعول سے اور دوسرا شرطیہ يَنْهٰى کے فاعل سے حال ہے اور اَلَمْ يَعْلَمْ جملہ مستانفہ وعیدیہ ہے اور يَعْلَمْ کی ضمیر اَلَّذِيْ يَنْهٰى کی طرف راجع ہے۔

كَلَّا نماز سے روکنے والے مکذب کو باز داشت ہے وہ ہرگز ایسا نہ کرے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ اگر وہ کار خیر کو روکنے اور تکذیب حق کرنے اور ایمان سے روگرداں ہونے سے باز نہ آئے گا۔

لَنَسْفَعًا تو ہم پکڑ کر کھینچیں گے۔ یہ لفظاً جواب قسم ہے اور معنیً شرط کی جزاء نون تاکید ساکن (لَنَسْفَعَنْ) بصورت تنوین لکھا جاتا ہے (یہی اس جگہ رسم خط ہے) سفع کا معنی ہے کسی چیز کو پکڑنا اور زور سے کھینچنا۔ مطلب یہ کہ ہم اس کو کھینچ کر دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔

بِالنَّاصِيَةِ ۙ اس کی پیشانی کے بالوں سے الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے۔ اَلنَّاصِیَة سر کا اگلا حصہ یعنی پیشانی۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ جھوٹی گناہ گار پیشانی، کَاذِبَة اور خَاطِئَة پیشانی کی صفت مجازاً ہے اور نَاصِیَةٍ اَلنَّاصِیَةِ سے بدل ہے۔

ترمذیؒ اور ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل آ گیا اور کہنے لگا کیا میں نے تجھے اس (نماز) سے منع نہیں کر دیا تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کو جھڑک دیا کہنے لگا تو خوب جانتا ہے کہ مکہ میں میری چوپال (نشست گاہ مجلس) سے بڑی کوئی چوپال نہیں (یعنی میرا جتھا بڑا ہے تو مجھے جھڑکتا ہے خدا کی قسم میں اس وادی کو تیرے خلاف اڑیل گھوڑوں کے سواروں اور نوجوان پیادوں سے بھر دوں گا اس پر مندرجہ ذیل آیت اتری۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۙ نادی وہ اونچا مقام جہاں قوم والے جمع ہوتے ہیں۔ اس جگہ مراد ہیں نادی والے یعنی قوم قبیلہ۔ نادی سے پہلے یا لفظ اہل محذوف ہے۔ یعنی اہل نادی (اس وقت مجاز بالحذف ہوگا) یا نادی کی طرف نسبت مجازاً ہے (اس وقت مجاز بالاسناد ہوگا، مطلب یہ ہے کہ (جب اس کو اپنے جتھے پر غرور ہے تو) اپنے کنبے قبیلے کو بلا لے۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ ہم زبانیہ کو بلا لیں گے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زبانیہ سے مراد ہیں جہنم کے زبانیہ (کارندے) زجاج نے کہا وہ درشت خو سخت مزاج ملائکہ ہیں۔ زَبَانِیَة زبنی کی یا زبنیة بروزن عفریة کی جمع ہے اس کا مادہ زبن ہے زبن کا معنی ہے دفع کرنا کلام میں شرط محذوف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر وہ اپنے کنبے قبیلے والوں کو بلا لیتا تو جہنم کے کارندے علی الاعلان آنکھوں دیکھتے اس کو پکڑ لیتے محلی نے اس قول کو حدیث مرفوع کہا ہے۔

كَلَّا یقیناً ایسا ہوگا کہ اگر اس نے اپنے کنبہ والوں کو بلایا تو ہم زبانیہ کو بلائیں گے۔ یا یہ معنی ہے کہ یقیناً یہ اپنے جتھے کو نہیں بلوا سکے گا۔

لَا تُطِعْهُ تم اس کی بات مت مانو یعنی نماز نہ چھوڑو یہ جملہ مستانفہ ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے سوال ہو سکتا تھا کہ جب یہ روکتا ہے تو میں کیا کروں اس کا جواب دے دیا کہ اس کی بات مت مانو۔

وَاسْجُدْ یہ لفظاً لَا تُطِعْہُ پر معطوف ہے لیکن معنوی اعتبار سے لَا تُطِعْ کے معنی کی تاکید ہے سجدہ کرو۔

وَاقْتَرِبْ ۩ اور نماز کے ذریعہ سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔ ابو داؤد وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سجدہ کی حالت میں بندہ اپنے رب سے بہت قریب ہوتا ہے پس دعا زیادہ کرو۔

سورہ انشقت میں سجدہ تلاوت کے مبحث میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس جگہ لفظ اُسْجُدُ اللہ کی طرف سے سجدہ تلاوت کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کی دلیل ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ اور اِقْرَاْ میں سجدہ کیا۔

جمہور کے نزدیک اُسْجُدْ کا عطف چونکہ لَا تُطِعْہُ پر ہے اس لئے اس سجدہ سے مراد نماز ہے۔ جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے پس یہ نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ سجدہ کا حکم نہیں ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے اقرء میں سجدہ کیا تو آپ ﷺ کے عمل کا اتباع سنت ہے اس سے سجدہ اقرء کا مسنون ہونا ثابت ہوتا ہے وجوب نہیں چاہتا۔ سورہ علق ختم ہوئی بعونہ ومنہ تعالیٰ۔

سورۃ القدر

یہ سورت مکی ہے اس میں ۵ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترمذی، حاکم اور ابن جریر نے حضرت امام حسنؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ بنی امیہ آپ ﷺ کے ممبر پر (چڑھے ہوئے) ہیں آپ ﷺ کو اس خواب سے کچھ ناگواری ہوئی تو نازل ہوئی اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ اور اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ، وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ........ لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ یعنی بنی امیہ کی ہزار مہینوں کی حکومت سے ایک شب قدر بہتر ہے۔ قاسم بن الفضل ہمدانی نے کہا ہم نے بنی امیہ کی حکومت کا زمانہ شمار کیا تو بغیر کمی بیشی کے پورے ایک ہزار مہینے ثابت ہوئے۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے مزنی اور ابن کثیر نے اس کو بہت زیادہ منکر کہا ہے۔

ابن ابی حاتم اور واحدی نے مجاہد کا قول نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر کیا جو اللہ کی راہ میں ہزار مہینوں تک ہتھیار بند رہا تھا (یعنی ہزار مہینوں تک اس نے جہاد کیا تھا) مسلمانوں کو یہ بات سن کر تعجب ہوا اس پر نازل ہوا اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ..... مِنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ تک یعنی ایک شب قدر ان ہزار مہینوں سے بہتر ہے جن میں اس اسرائیلی نے جہاد کیا تھا۔

ابن جریر نے مجاہد کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا جو صبح تک نماز پڑھتا اور صبح سے شام تک جہاد کرتا تھا اس کا یہ عمل ایک ہزار مہینہ تک جاری رہا اس پر اللہ نے نازل فرمایا لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ یعنی اس شخص کے (مذکورہ بالا) اعمال کے ہزار مہینوں سے لیلۃ القدر افضل ہے۔

امام مالکؒ نے موطا میں لکھا ہے کہ میں نے ایک قابل اعتماد عالم سے سنا جو کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی امت کی عمریں چونکہ تھوڑی ہیں اس لئے دوسری امتوں کے اعمال کی تعداد کی برابر تو ان کے اعمال ہو نہیں سکتے تھے ان کی عمریں زیادہ تھیں پس اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو شب قدر عطا فرمائی جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

میں کہتا ہوں یہ روایت مرسل ہے مگر شان نزول کے سلسلے میں جتنی روایات آئی ہیں سب سے زیادہ صحیح ہے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر صرف اسی امت کے لئے مخصوص ہے (کسی امت سابقہ کو نہیں عنایت کی گئی) ابن حبیب مالکی کا یہی خیال ہے اور صاحب العدہ شافعی نے اس کو جمہور کا قول قرار دیا ہے لیکن اس کی تردید حضرت ابوذرؓ کے اس قول سے ہوتی ہے جو نسائی نے نقل کیا ہے حضرت ابوذرؓ نے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا شب قدر انبیاء کے ساتھ ہوتی ہے جب وہ وفات پاجاتے ہیں تو اٹھالی جاتی ہے ارشاد فرمایا (نہیں) بلکہ وہ باقی رہنے والی ہے اس حدیث کی بناء پر ابن حجر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ شب قدر گزشتہ امتوں کے لئے بھی تھی اور امام مالک کی روایت کے متعلق ابن حجر نے کہا یہ قابل تاویل ہے اور قابل تاویل صریح کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوذرؓ کی مرفوع حدیث کے مقابلہ میں تو امام مالک والی روایت زیادہ صریح ہے حضرت ابوذرؓ کی مرفوع حدیث کے الفاظ بَلۡ بَاقِیَةٌ قابل تاویل ہیں ان الفاظ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف ایک سال کے لئے نہیں تھی بلکہ آئندہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی ہو گی گویا اس سے ازالہ ہو جائے گا کہ (ہوئی تو متعدد مرتبہ تھی لیکن) رسول

اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اٹھالی گئی دیکھو حضرت ابوہریرہؓ سے جب کہا گیا کہ لوگوں کا خیال ہے شب قدر اٹھالی گئی ہے تو فرمایا جس نے ایسا کہا غلط کہا۔ رواہ عبد الرزاق۔

راوی کا بیان ہے میں نے (حضرت ابوہریرہؓ سے) کہا کیا آئندہ ہر ماہ رمضان میں میں اس کو پا سکتا ہوں فرمایا ہاں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ ہم ہی نے اس کو یعنی قرآن کو اتارا قرآن کی تعظیم اور عظمت شان کے اظہار کے لئے (بغیر ذکر مرجع کے) ضمیر کو ذکر کیا کیونکہ اَنزَلنا کو سننے کے بعد سننے والے کا ذہن کسی دوسری چیز کی طرف منتقل ہی نہیں ہو سکتا اسی اظہار عظمت کے لئے اتارنے کی نسبت اپنی طرف کی فاعل کی عظمت فعل کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے اور حکم میں تاکید و قوت پیدا کرنے کے لئے مسند الیہ (انا) کو خبر فعلی (انزلنا) سے پہلے ذکر کر دیا یا یہ تقدیم خصوصیت فاعل کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ پھر قرآن کی مزید عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا۔

فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ یعنی قرآن کا وقت نزول بھی عظیم الشان ہے لیلۃ القدر میں اس کا نزول ہوا ہے۔ تمام ممالک اور انسانوں کے متعلق سال بھر تک ہونے والے امور کو لیلۃ القدر میں اللہ مقرر کر دیتا ہے حسین بن فضل سے سوال کیا گیا کیا زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے ہی اللہ نے تمام امور کا تقرر نہیں کر دیا ہے۔ حسین نے جواب دیا بے شک کر دیا ہے سوال کیا گیا پھر لیلۃ القدر کا کیا معنی حسین نے کہا مقررہ امور کو ان کے مقررہ اوقات کی طرف چلانا اور قضاء مقدر کو نافذ کرنا یعنی آئندہ سال بھر تک جن امور کا واقع ہونا اللہ نے مقدر کر دیا ہے شب قدر میں اس کی اطلاع ان ملائکہ کو دی جاتی ہے۔ جن سے ان امور کا نفاذ وابستہ ہے۔

عکرمہ نے کہا مقدرہ امور کا تقدر اور تمام امور کا انتظام نصف شعبان کی رات کو ہوتا ہے زندوں اور مردوں کی فہرست بنتی ہے جس میں (آئندہ سال بھر) نہ بیشی ہوتی ہے نہ کمی۔ عکرمہ کے اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بغوی نے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک کی موتوں کا فیصلہ (نصف شعبان کی رات کو) کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض آدمی نکاح کرتے ہیں۔ نکاح کے بعد اولاد بھی ہوتی ہے مگر ان کا نام مردوں کی فہرست میں ہوتا ہے (یعنی اس کو آئندہ شعبان تک اپنا مر جانا معلوم نہیں ہوتا اسی لئے وہ نکاح کر لیتا ہے لیکن وہ آنے والے سال کی آخری تاریخ تک مر جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں شاید مقدرہ امور کا جزوی طور پر کسی طرح کا تقرر نصف شعبان کی رات میں ہوتا ہو اور تمام امور کا عمومی تقرر اور کارندوں کو ان امور کی تفویض شب قدر میں ہوتی ہے اللہ نے شب قدر کے متعلق فرمایا ہے فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سال بھر تک جو خیر و شر، رزق، زندگی موت یہاں تک کہ حاجیوں کا حج غرض جو بات ہونے والی ہوتی ہے وہ شب قدر میں لوح محفوظ سے (نقل کر کے) لکھ دی جاتی ہے۔

زہری نے کہا لیلۃ القدر کا نام اس رات کی عظمت و شرف کی وجہ سے ہی لیلۃ القدر رکھا گیا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ یعنی اللہ کی عظمت جیسی واقع میں ہے ویسی انہوں نے نہیں کی۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نصف شعبان کی رات کو اللہ تمام احکام کا فیصلہ کر دیتا ہے اور شب قدر میں ان احکام کی تفویض کارندوں کو کر دیتا ہے۔ کذا ذکرا لبغوی۔

شب قدر کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس رات کے نیک اعمال کی اللہ کے ہاں بڑی قدر ہوتی ہے اور بڑا ثواب ملتا ہے۔ شب قدر میں نزول قرآن کا معنی یہ ہے اور حضرت ابن عباسؓ کے کلام سے یہی مستفاد ہے کہ شب قدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے دنیوی آسمان کے بیت العزت میں نازل کر دیا گیا تھا پھر (بیت العزت سے) حضرت جبرئیلؑ بیس برس تک تھوڑا تھوڑا رسول اللہ ﷺ کو پہنچاتے رہے آیت بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ کا یہی مطلب ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے تیسری رمضان کو اور ایک روایت میں

آیا ہے کہ پہلی رمضان کو نازل ہوئے اور توریت موسیٰ چھٹی رمضان کو اور انجیل تیرہویں رمضان کو اور زبور داؤد اٹھارہویں رمضان کو اتاری گئی اور قرآن رسول اللہ ﷺ پر چوبیسویں رمضان کو جبکہ رمضان کی چھ راتیں باقی تھیں نازل کیا گیا۔

امام احمدؒ اور طبرانیؒ نے حضرت واثلہؓ بن الاسقع کی حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے رمضان کی پہلی رات کو نازل ہوئے اور توریت چھٹی رمضان کو اور انجیل تیرہویں رمضان کو اتری اور قرآن چوبیسویں کو انہی احادیث کی بناء پر بعض علماء نے کہا کہ شب قدر رمضان کی چوبیسویں رات ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ، شعبیؒ حسنؒ بصری اور قتادہ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے اس کی تائید حضرت بلالؓ کی اس مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے کہ شب قدر کو چوبیسویں تاریخ میں تلاش کرو۔ اس حدیث کو اسناد میں ابن لہیعہؒ بھی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ابن لہیعہ نے اس حدیث کو مرفوع قرار دینے میں غلطی کی ہے۔

میں کہتا ہوں اگر یہ احادیث صحیح ہیں تب بھی ان سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ہر سال شب قدر چوبیس رمضان کو ہوتی ہے بلکہ اتنا معلوم ہے کہ جس سال قرآن کا نزول ہوا اور جس سال کے متعلق حضرت بلالؓ کا قول منقول ہے ان سالوں میں شب قدر کی تاریخ چوبیسویں رمضان تھی۔

فائدہ: تعیین شب قدر کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں جن کی کل تعداد تقریباً چالیس ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہر سال شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ضرور ہوتی ہے مگر تاریخیں بدلتی رہتی ہیں (ہر سال کے لئے ایک ہی تاریخ مقرر نہیں ہے) تمام احادیث کے تعارض کو دور کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ذیل میں مختلف احادیث درج کی جاتی ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شعبان کے آخری دن خطبہ دیا اور فرمایا لوگو! ایک عظمت والا مہینہ تمہارے قریب آگیا یہ برکت والا مہینہ ہے اس مہینہ میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہ حدیث سورۂ بقرہ اور فضائل رمضان میں گزر چکی ہے اور اس سے اس قول کی تغلیط ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شب قدر رمضان میں بھی ہوتی ہے اور غیر رمضان میں بھی۔ امام اعظمؒ کا یہی مذہب ہے قاضی خاں نے ذکر کیا ہے۔

ایک شبہ: شاید یہ واقعہ نزول قرآن والے سال کا ہو یا صرف اسی سال کا ہو جس کے متعلق حضرت سلمان فارسیؓ نے بیان کیا ہے۔ پس جو لوگ رمضان اور غیر رمضان میں شب قدر ہونے کے قائل ہیں ان کے مسلک کی تغلیط اس حدیث و آیت سے نہیں ہوتی۔

ازالہ: حضرت سلمانؓ والی حدیث میں ماہ رمضان کے کچھ اوصاف بیان کئے گئے ہیں اسی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس ماہ کے روزے اللہ نے فرض کئے ہیں اور رات کی نمازیں نفل کی ہیں جو شخص اس میں نفل پڑھے گا وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے غیر رمضان میں فرض ادا کئے اور جس نے اس میں فرض ادا کئے وہ اس شخص کی طرح ہوگا جس نے ستر (۷۰) فرض ادا کئے (گویا ماہ رمضان کی نفل نماز دوسرے مہینوں کے فرض کا اور اس کی ایک فرض نماز دوسرے مہینوں کی ستر فرض نمازوں کا ثواب رکھتی ہے) یہ صبر کا مہینہ ہے یہ ہمدردی کا مہینہ ہے وغیرہ وغیرہ اور چونکہ یہ اوصاف کسی مخصوص رمضان کے ہی نہیں ہیں (بلکہ ہر رمضان کے ہیں) پس شب قدر کا حکم بھی سال نزول قرآن یا کسی مخصوص رمضان سے متعلق نہیں۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ آخری عشرہ میں اتنی ریاضت کرتے تھے جتنی دوسرے ایام میں نہیں کرتے تھے۔ مسلم۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا جب آخری عشرہ آجاتا تھا تو رسول اللہ ﷺ تہبند مضبوطی سے باندھ لیتے تھے اور شب بیداری کرتے تھے یعنی رات کو نماز پڑھتے تھے اور گھر والوں کو بھی بیدار کرتے تھے متفق علیہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا وفات تک رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے رہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا بخاری و مسلم۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری دس ایام میں اعتکاف کرتے تھے اور فرماتے تھے رمضان کے آخری عشرہ میں شب قدر تلاش کرو بخاری۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا پھر درمیانی عشرہ میں ترکی خیمہ میں اعتکاف کیا پھر فرمایا میں نے اس رات کی تلاش میں پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا پھر درمیانی عشرہ میں کیا پھر میرے پاس کوئی فرشتہ آیا اور مجھ سے کہا گیا کہ وہ رات آخری عشرہ میں ہے پس جس کو میرے ساتھ اعتکاف کرنا ہو وہ آخری عشرہ میں کرے کیونکہ مجھے وہ رات خواب میں دکھائی گئی تھی میں نے اس کو پالیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ میں اس کی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس فرمان کے بعد صحابہؓ نے ہر طاق رات میں شب قدر کی جستجو رکھی۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک رات کو پانی برسا مسجد چھپر کی تھی اس لئے ٹپکنے لگی اکیسویں شب کی صبح کو جو میری آنکھ رسول اللہ ﷺ پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کی پیشانی پر پانی اور کیچڑ کا نشان تھا متفق علیہ۔

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ لیلۃ القدر کی تلاش میں رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے درمیان عشرہ میں اعتکاف کیا جب عشرہ گزر گیا تو آپ نے خیمہ اکھاڑ لینے کا حکم دیا حسب الحکم خیمہ اکھاڑ لیا گیا۔ پھر حضور ﷺ کو (لیلۃ القدر کی تعیین کہ کس عشرہ میں بتائی گئی تھی) فراموش ہو گئی۔ واقع میں وہ آخری عشرہ میں تھی (مگر حضور ﷺ کو درمیانی عشرہ کا خیال رہا اسی لئے درمیان عشرہ میں اعتکاف کیا) اس لئے آپ نے دوبارہ خیمہ لگوایا پھر برآمد ہو کر فرمایا لوگو! مجھے لیلۃ القدر خواب میں دکھائی گئی تھی اور میں تم کو اطلاع دینے باہر نکلا تھا مگر دو آدمی آگئے جن کے ساتھ شیطان تھا اس لئے میں اس کو بھول گیا اب تم رمضان کے آخری عشرہ میں اس کی جستجو کرو اور نویں اور ساتویں اور پانچویں شب میں تلاش کرو۔ راوی نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے عرض کیا آپ تو گنتی ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا ہاں اور ہم اس کے تمہاری نسبت مستحق بھی زیادہ ہیں فرمایا نویں اور ساتویں اور پانچویں۔ جب اکیس راتیں گزر جائیں تو اس سے متصل بائیسویں رات ہو گی یہی نویں رات ہے (یعنی اس تاریخ سمیت رمضان کی نو راتیں باقی رہتی ہیں) اور جب تئیس گزر جائیں تو اس سے متصل ساتویں رات ہو گی اور جب پچیس راتیں گزر جائیں تو اس سے متصل پانچویں ہو گی ابو داؤد طیالسی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ کہ شب قدر چوبیسویں رات ہے۔

حضرت عبداللہ بن انیس کی مرفوع حدیث ہے حضور ﷺ نے فرمایا مجھے شب قدر (خواب میں) دکھائی گئی تھی مگر میں بھول گیا۔ میں نے اس رات کو صبح کو پانی اور کیچڑ میں اپنے کو سجدہ کرتے (خواب میں) دیکھا تھا راوی کا بیان ہے پھر ۲۳ کی رات کو بارش ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نماز پڑھائی۔ یعنی فجر کی نماز سے فارغ ہو کر منہ پھیرا تو پانی اور کیچڑ کا نشان آپ ﷺ کی پیشانی اور ناک پر موجود تھا۔ مسلم و ابو داؤد۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ راوی کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں بدوی ہوں مجھے کوئی (معین) رات بتا دیجئے کہ میں اس رات کو جاؤں فرمایا تیئس تاریخ (کے بعد) کی رات کو آ جانا ایک روایت میں ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اکیسویں تاریخ کی صبح کو شب قدر کے متعلق دریافت کیا فرمایا کون سی رات ہے میں نے عرض کیا بائیس کی رات فرمایا وہ یہی رات ہے یا آگے والی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو (شب قدر کا) طلب گار ہو وہ ستائیسویں شب میں تلاش کرے۔ رواہ احمد و ابن المنذر بمعناہ۔ طبرانی نے حضرت جابرؓ بن سمرہ کی حدیث بھی اسی طرح بیان کی ہے۔

حضرت معاویہؓ بن ابوسفیان کی شب قدر کے متعلق روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لیلۃ القدر ستائیسویں ہے۔ جن احادیث میں ستائیسویں شب کو لیلۃ القدر کہا گیا ان کے ساتھ ابو داؤد نے اس حدیث کو بھی بیان کیا ہے اور امام احمدؒ نے اسی کو لیا ہے اور امام اعظمؒ کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے حضرت ابی بن کعبؓ کو تو اس پر یقین تھا اور آپ نے اس پر قسم کھائی تھی کسی نے پوچھا ابو منذر آپ کس وجہ سے اس کے قائل ہیں فرمایا اس علامت کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بتائی تھی کہ اس روز صبح کو سورج بغیر شعاعوں کے طلوع ہوتا ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت عمرؓ حضرت حذیفہؓ اور بکثرت دوسرے صحابیوں کا یہ قول ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے اور اس قول کی تائید میں حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت پیش کی جاتی ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا تھا کہ ہم باہم شب قدر کا ذکر کر رہے تھے اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو یاد ہے کہ جب کہ چاند شگاف چشم کی طرح نکلا تھا (یعنی پتلا خمیدہ چھوٹا کم نور) ابوالحسن فارسی نے کہا مراد ستائیسویں شب ہے کیونکہ اس رات کو چاند کی یہی حالت ہوتی ہے۔ ابوالحسن نے کہا اس سے مراد ہے چاند کے وقت کا پورا ہو جانا (جس کے بعد چاند ڈوب جاتا ہے پھر برآمد نہیں ہوتا) اور یہ ستائیسویں شب کو ہوتا ہے۔

مگر یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ حدیث سے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس شب کی صبح کو سورج بغیر شعاعوں کے نکلتا ہے اسی طرح اس رات کو چاند کی بھی شعاعیں نہیں ہوتیں چاند کا وقت پورا ہو جانا اس کی علت نہیں بلکہ کوئی اور وجہ ہے۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر کبھی ستائیسویں شب ہوتی ہے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ ستائیسویں شب ہی شب قدر ہوتی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے ستائیسویں کو شب قدر دیکھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں آخری عشرہ میں تمہارے خوابوں کو (متفق) پاتا ہوں لہٰذا آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اس کو طلب کرو۔ رواہ مسلم۔ حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا شب قدر کو ساتویں کی رات میں طلب کرنا چاہئے۔ رواہ عبدالرزاق حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایسی ہی روایت منقول ہے رواہ احمد۔ یعنی بیس کے بعد ساتویں رات یا باقی رہنے والی راتوں میں سے ساتویں رات۔ حضرت نعمان بن بشیر کی مرفوع حدیث میں ہے گزرتی ہوئی ساتویں (ستائیسویں) یا باقی رہتی ہوئی ساتویں۔ رواہ احمد۔ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث ہے وہ آخری عشرہ میں ہے گزرتی ہوئی نو میں یا باقی رہتی ہوئی سات میں۔ رواہ البخاری۔

حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ ہم کو شب قدر کی اطلاع دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ برآمد ہوئے تھے سامنے آتے ہوئے دو مسلمان مل گئے حضور ﷺ نے فرمایا میں تم کو لیلۃ القدر کی خبر دینے کے لئے نکلا تھا مگر فلاں فلاں شخص سامنے آتے مل گئے (اور ان کے ساتھ شیطان تھا) پس شب قدر اٹھالی گئی (یعنی میں اس کی تعیین بھول گیا) امید ہے کہ یہ بات تمہارے لئے بہتر ہی ہوگی اب تم اس کو نویں اور ساتویں اور پانچویں رات میں تلاش کرو۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اس کو یعنی شب قدر کو باقی نو (راتوں) میں یا باقی پانچ راتوں میں یا (باقی) تین راتوں میں یا آخری رات میں تلاش کرو۔ ترمذی امام احمدؒ نے حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا کہ شب قدر آخری سات راتوں میں ہے (یعنی آخری ہفتہ کی پہلی رات میں) حضور ﷺ نے فرمایا میں خیال کرتا ہوں کہ تم لوگوں کے خواب آخری سات راتوں کے متعلق متفق ہیں لہٰذا جو شخص شب قدر کا طلب گار ہو وہ آخری سات راتوں میں اس کی طلب کرے۔ متفق علیہ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ کچھ لوگوں کو خواب میں دکھایا گیا کہ شب قدر آخری ہفتہ میں اور کچھ لوگوں کو خواب میں دکھایا گیا کہ شب قدر آخری عشرہ میں ہے اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخری ہفتہ میں شب قدر کی تلاش کرو۔

حضرت علیؓ کی مرفوع روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم (نیند یا ضعف جسمانی وغیرہ سے) مغلوب ہو جاؤ (اور رات کو قیام نہ کر سکو) تب بھی آخری ہفتہ میں تم مغلوب نہ ہو (یعنی سوتے نہ رہو اور کوشش کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو) رواہ احمد۔

ان احادیث سے ظاہر ہے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے کبھی اکیسویں شب میں جیسا کہ حضرت ابوسعیدؓ وغیرہ کی روایت سے ثابت ہے اور کبھی تیئسویں شب میں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن انیسؓ کی روایت ہے اور کبھی چوبیسویں شب میں جس میں نزول قرآن ہوا تھا اور کبھی ستائیسویں شب میں جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے علامت سے پہچانا تھا۔ اور کبھی نو روز باقی رہنے والی تاریخ کو یعنی بائیسویں شب میں یا پانچ دن باقی رہنے والی تاریخ کو یعنی چھبیسویں شب میں یا تین روز باقی

رہنے والی تاریخ کو یعنی اٹھائیسویں شب میں یا نو دن گزرنے والی تاریخ کو یعنی انتیسویں شب میں یا آخری رات کو یعنی تیسویں شب میں۔ اس توجیہ کے بعد احادیث میں تعارض باقی نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

بعض علماء نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے شب قدر کی فضیلت میں قرآن نازل کیا (یعنی قرآن کی آیت میں شب قدر کی فضیلت بیان کی) اور یہ بیان فضیلت آئندہ آیت میں ہے فرمایا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ دونوں جگہ استفہام انکار کے لئے ہے اور دونوں جگہ لیلۃ القدر کی عظمت کا اظہار اور تعجب مقصود ہے یعنی کسی چیز نے تم کو شب قدر کی عظمت اور فضیلت نہیں بتائی اس کی فضیلت رسائی عقل سے بھی زیادہ ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ یعنی ایک شب قدر ان ہزار مہینوں سے افضل ہے جو شب قدر سے خالی ہوں۔ مراد یہ ہے کہ ایک شب قدر کی عبادت دوسرے ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ایمان کے ساتھ بامید ثواب شب قدر میں (نماز کے لئے) کھڑا ہوتا ہے اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ بخاری۔

مسلم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ جو شخص لیلۃ القدر میں قیام کرے اور (جس رات میں وہ نماز کو کھڑا ہوا ہے) وہ لیلۃ القدر کی پڑ جائے۔ یعنی بغیر علم کے (جس رات میں نماز کو کھڑا ہو وہ رات واقع میں شب قدر ہو) امام احمد نے حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے جو حدیث بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اس رات میں کھڑا ہوا پھر وہ شب قدر اس کے موافق پڑ گئی۔ یعنی وسط رات میں اٹھا اور واقع میں وہ رات لیلۃ القدر کے مطابق ہو گئی تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ روح کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے یہ شب قدر کی دوسری فضیلت کا اظہار ہے یا خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ کی علت ہے یعنی شب قدر میں رب کے حکم سے ملائکہ اور روح آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہیں۔ (یہ شب قدر کی مزید فضیلت ہے یا شب قدر کے ہزار مہینوں سے افضل ہونے کی وجہ ہے) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرئیلؑ ملائکہ کی فوج کے ساتھ اترتے ہیں (اس وقت) جو شخص کھڑا یا بیٹھا اللہ کی یاد کرتا ہوتا ہے اس کے لئے دعاء رحمت کرتے ہیں۔

مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ ہر اس امر کی غرض سے جو اس رات میں مقدر ہوتا ہے۔

سَلٰمٌ ۛ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی وہ امر سلام (سلامتی والا) ہوتا ہے یا ہر مصیبت سے محفوظ رہنے کا موجب ہوتا ہے بظاہر امر سے مراد ہے رحمت اور ثواب اعمال میں برکت اور وہ اطمینان جو اللہ کی یاد کرنے والے اہل ایمان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ وہ شب قدر طلوع فجر تک ہوتی ہے۔ ھِیَ مبتداء ہے اور حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ خبر۔ ہر رات طلوع فجر تک ہوا کرتی ہے اس لئے محض لیلۃ القدر کی طرف ضمیر راجع کرنا مفید نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ شب قدر مع اپنے اوصاف (نزول ملائکہ وغیرہ) رحمت کے صبح تک رہتی ہے یا یوں کہا جائے کہ ھِیَ مبتداء ہے اور سَلٰمٌ خبر مقدم ہے اور یہ تقدیم مفید حصر ہے اور پورا جملہ لیلۃ القدر کی دوسری خبر ہے یعنی شب قدر محض سلامتی اور ساری خیر ہی خیر ہے اس میں شر بالکل نہیں ہے۔ ضحاکؒ نے کہا اس رات میں اللہ شر مقرر نہیں کرتا اور صرف سلامتی کے احکام جاری کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا ساری رات شیطان کوئی بدی نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اذیت رساں حادثہ پیدا کر سکتا ہے۔ بعض علماء نے سلام کہنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس رات میں ملائکہ مومنوں کو بکثرت سلام کرتے ہیں۔ اس مطلب پر حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ کا تعلق سلام کے مفہوم یعنی تسلیم (سلام کرنا) سے ہو گا یعنی یہ رات طلوع فجر تک سلاموں سے بھری ہوئی ہے۔

فائدہ: بعض علماء کا قول ہے کہ شب قدر میں ہر چیز سجدہ کرتی دکھائی دیتی ہے اور ہر جگہ نور سے جگمگا جاتی ہے اور

ملائکہ کی طرف سے سلام اور خطاب سنا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا انکشاف بعض اہل کشف کو ہی ہوتا ہے ہر شخص کو یہ کیفیت نظر نہیں آتی نہ حصول ثواب کے لئے ان کیفیات میں کسی کیفیت کا انکشاف ضروری ہے اگر ان احوال کا انکشاف عمومی یا اکثری ہوتا تو تمام امت اس کو دیکھتی اور کسی سے پوشیدگی ممکن ہی نہ ہوتی خصوصاً تمام صحابہؓ تابعینؒ اور اولیاء امت کی نظروں کے سامنے تو یہ واقعات ضرور ہی آتے۔ ہاں شب قدر کا ثواب حاصل کرنے کے لئے عبادت میں مشغول ہونا لازم ہے۔ حدیث من قام لیلة القدر ایمانا اور یصلون علي کل عبد قائم او قاعد یذکر الله سے یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔

مسئلہ: جس نے شب قدر کی عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس کو شب قدر کا ثواب مل گیا اور جو اس سے زیادہ عبادت کرے گا اللہ اس کے ثواب میں اضافہ کردے گا۔ حضرت عثمان غنیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی اس نے گویا نصف شب کا قیام کیا اور جس نے جماعت کے ساتھ فجر کی نماز بھی پڑھی اس نے گویا پوری رات عبادت کی۔ مسلم۔

یعنی باجماعت عشاء کی نماز کے بعد باجماعت فجر کی نماز بھی پڑھی تو گویا پوری رات نماز پڑھی ہر نماز نصف شب کی عبادت کے قائم مقام ہوئی رات کو یہی وہ فرض نمازیں ہیں (ایک ابتدائی دوسری انتہائی) اور مغرب کی نماز دن کی وتر نماز ہے۔

مستحب ہے کہ شب قدر میں اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عني کا ورد زیادہ کرے حضرت عائشہؓ کی روایت ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر مجھے شب قدر معلوم ہو جائے۔ تو میں کیا کہوں فرمایا کہو اللھم انک عفو الخ رواہ احمد و ابن ماجہ والترمذی۔

سورۃ القدر ختم ہوئی۔

بعونہ و منہ تعالیٰ۔

سورة البينة

یہ سورت مدنی ہے اس میں آٹھ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے جو اہل کتاب اور مشرک کفر کرتے تھے وہ اپنے کفر سے ہٹنے والے نہ تھے اہل کتاب کا فکر تھا اللہ کی صفات میں غلطی کرنا جیسے عزیز و مسیح کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے۔ اور مشرکوں سے مراد ہیں بت پرست (ان کی بت پرستی موجب کفر تھی۔

حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١ یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی ہوئی حقیقت آگئی جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والی ہے۔ یہاں مستقبل بمعنی ماضی ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یعنی اللہ کی طرف سے رسول ﷺ آگیا۔ یہ فقرہ اَلْبَیِّنَۃ سے بدل ہے۔

يَتْلُوْا صُحُفًا یہ رسول کی صفت ہے رسول ایسا ہے جو صحیفے پڑھتا ہے یعنی امی ہونے کے باوجود وہ ان چیزوں کی تلاوت کرتا ہے جو صحیفوں میں لکھی ہوئی ہیں تو گویا صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔

مُّطَهَّرَةً ۝٢ وہ صحف باطل (کی آمیزش) اور شیاطین کے تصرف سے پاک رکھے گئے ہیں اللہ نے فرمایا ہے لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ یا بے وضو اور ناپاک اور حائضہ کے چھونے سے محفوظ ہیں اللہ نے فرمایا لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣ ان صحیفوں میں درست اور راست تحریریں ہیں جن (کے مضمون و احکام) میں کوئی کجی اور غلطی نہیں ہے۔ جب رسول آگیا تو اس نے لوگوں کو گمراہی کھول کر بیان کر دی جہالت کو دور کر دیا اور ایمان کی طرف بلایا پس جس شخص کو اللہ نے توفیق ایمان دے دی اور سعادت مقرر کر دی وہ کفر سے ہٹ گیا۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝٤

یعنی رسول اللہ ﷺ کے آنے کے بعد ہی رسول پر ایمان لانے کے متعلق اہل کتاب کے اندر اختلاف پیدا ہوا ورنہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے تو آنے والے رسول کی تصدیق پر سب کا اتفاق تھا اور سب بعثت نبی ﷺ کے منتظر تھے کافروں کے خلاف نبی منتظر کے وسیلے سے فتح کی دعا کرتے تھے لیکن جب وہ جانا پہچانا نبی آگیا تو محض حسد اور عناد کی وجہ سے اس کی تصدیق نہیں کی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگرچہ بعض اہل کتاب کا عقیدہ صفات الٰہیہ کے متعلق درست نہ تھا اللہ کو مخلوق کا باپ قرار دیتے تھے (اور بعض اہل کتاب کا عقیدہ درست تھا) لیکن بعثت نبی پر سب کا اتفاق تھا کیونکہ آنے والے نبی کے اوصاف ان کی کتابوں میں بیان کر دیئے گئے تھے چونکہ قبل البعثت تصدیق نبی پر اتفاق صرف اہل کتاب کا تھا، مشرکین اس اتفاق میں شریک نہ تھے اس لئے اس آیت میں صرف اہل کتاب کا ذکر کیا تاکہ جن اہل کتاب نے تصدیق رسول ﷺ نہیں کی ان کی مزید شناعت کا اظہار ہو جائے پہلی آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جو پہلے اہل کتاب اور مشرک تھے پھر رسول اللہ ﷺ پر بعثت کے بعد ایمان لے آئے۔ دوسری آیت میں ان اہل کتاب کا بیان ہے جو کفر پر قائم رہے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لائے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ بعض ائمہ لغت نے مُنْفَكِّيْنَ کا ترجمہ ھالکین کیا ہے عرب کا محاورہ ہے انفک صدر المرءۃ

عند الولادۃ بچہ پیدا ہونے کے وقت عورت کا سینہ پھٹ گیا پھر جڑنہ سکا اور وہ ہلاک ہو گئی۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ قیام حجت یعنی پیغمبر ﷺ کو بھیجنے اور کتاب کو نازل کرنے سے پہلے اہل کتاب معذب نہ تھے ہلاک ہونے والے نہ تھے (پیغمبر کو احکام دے کر بھیجنے سے پہلے اللہ کسی قوم کو ہلاک اور برباد نہیں کرتا) اسی کی مثل ہے آیت وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ　　لام زائد ہے اَنْ محذوف مقدر ہے یعنی اَنْ یَّعْبُدُوْ اللّٰہَ اور یہ اُمِرُوْا کا مفعول ہے یا لام علت ہے اور مفعول محذوف ہے یعنی ان کو جن احکام کا امر کیا گیا ہے وہ اس لئے تھا کہ خلوص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی معرفت کا جو حکم ان کو دیا گیا وہ فی نفسہٖ اور حقیقت میں اچھا تھا دلائل عقلیہ اس کے اچھے ہونے پر دلالت کر رہی ہیں اور گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی یہی حکم دیا گیا تھا پس تعجب ہے کہ منکر کس طرح اس مسلمہ چیز کا انکار کرتے ہیں اور کس بناء پر تفرقہ کر رہے ہیں۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ　　یعنی اللہ کی عبادت کریں اعتقاد کو شرک سے پاک رکھتے ہوئے یہ یَعْبُدُوْا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

حُنَفَآءَ　　تمام باطل مذاہب سے مڑ کر (اور اعراض کر کے) یہ حال مرادف ہے یا متداخل۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے کہ توریت و انجیل میں ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ توحید کا عقیدہ رکھتے ہوئے عبادت کو اللہ کے لئے مخصوص رکھیں۔

وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ　　اور فرض نماز اس کے وقت پر ادا کریں اور زکوۃ کا وقت وجوب آجائے تو زکوۃ ادا کریں۔ یہ دونوں فعل یَعْبُدُوْا پر معطوف ہیں۔

وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝　　یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی جو حکم دیا گیا یہی انبیاء اور گزشتہ صلحاء کی جماعت کا دین تھا اور انبیاء و اولیاء کی جماعت راستی پر تھی اور حق پر ثابت قدم تھی۔ نضر بن شمیل نے خلیل بن احمد سے دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ کا معنی پوچھا خلیل نے جواب دیا قَیِّمَۃ اور قَیِّم اور قَائِم تینوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی یہی دین ہے ان لوگوں کا جو توحید پر قائم تھے۔

یا یہ مطلب ہے کہ کُتُبٌ قَیِّمَۃ کا یہی دین ہے یعنی ان صحیح کتابوں میں یہی دین مندرج ہے جن میں کوئی غلطی نہیں یہ کتب قیمہ وہی ہیں جن کی صراحت آیت فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۙ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ میں کر دی گئی ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہی ملت حق اور شریعت مستقیمہ کا راستہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ دِیْنُ اور الْقَیِّمَۃ دونوں لفظ الگ الگ ہیں اس لئے دین کی القیمہ کی طرف اضافت کر دی اور القیمہ میں تاء تانیث اس وجہ سے لائی گئی کہ اس کا موصوف الملۃ ہے (یعنی ذٰلِکَ دِیْنُ الْمِلَّۃِ الْقَیِّمَۃِ) چونکہ ان آیات میں مومنوں اور کافروں کا ذکر آ گیا تھا۔ اس لئے آئندہ آیات میں وعدہ ثواب اور وعید عذاب از سر نو ذکر کیا اور فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ　　یہ اِنَّ کا اسم ہے۔

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ　　یہ اِنَّ کی خبر ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ　　یہ (جار مجرور) ظرف کے فاعل سے حال ہے یعنی جن اہل کتاب اور مشرکوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں ہوں گے (اور) اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝　　مذکورہ اوصاف والے ہی تمام مخلوق یہاں تک کہ سوروں اور کتوں سے بھی بدتر ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝　　اور ایمان دار نیکوکار

سب مخلوق سے یعنی بے گناہ فرشتوں سے بھی بہتر ہیں۔ اسی جگہ سے علماء نے کہا کہ خاص درجات والے انسان خاص درجات والے ملائکہ سے افضل ہیں اور عام انسان یعنی صاف دل اور پاک نفس رکھنے والے ایماندار نیکوکار عام ملائکہ سے افضل ہیں رہے غیر صالح (گناہ گار) مومن تو جب مغفرت سے یا گناہ ہونے کی سزا دے کر ان کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا تو عمل صالح رکھنے والے مومنوں کے ساتھ ان کو ملا دیا جائے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے (اور گناہوں سے پاک ہونے کے بعد وہ عام ملائکہ سے افضل ہو جائیں گے)

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اللہ کے پاس ان کے لئے اچھا بدلہ جنتیں ہوں گی جن میں وہ قیام کریں گے ان جنتوں کے محلات اور درختوں کے نیچے دریا رواں ہوں گے۔

جَزَآؤُهُمْ مبتداء ہے عِنْدَ رَبِّهِمْ ظرف ہے جس کا تعلق جزاء سے ہے جَنّٰتُ عَدْنٍ خبر ہے۔ عَدْنٍ کا معنی ہے قیام۔ تَجْرِيْ کا فاعل اَلْاَنْهٰر ہے اور اَلْاَنْهٰر کی طرف بہنے کی نسبت مجازی ہے (کیونکہ نھر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں پانی بہتا ہے تو حقیقت میں بہنے والی چیز پانی ہے گڑھا نہیں بہتا) یہ پورا جملہ جَنّٰتُ کی صفت ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا خَالِدِيْنَ حال ہے اَبَدًا خَالِدِيْنَ کا ظرف ہے یعنی ان جنّٰت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بیضاوی نے لکھا ہے اس کلام میں کئی طرح سے (اداء معنی میں) قوت ہے اول مدح فرمائی (خَيْرُ الْبَرِيَّةِ فرمایا) پھر لفظ جزاء بتا رہا ہے کہ یہ ثواب ان کے اعمال و صفات کا بدلہ ہوگا۔ پھر عِنْدَ رَبِّهِمْ کہا اور (بتایا کہ یہ ثواب خدا داد ہوگا لامحالہ کامل ہوگا) پھر جَنّٰتُ کو بصیغہ جمع ذکر کیا پھر عَدْنٍ کا لفظ کہا (جس سے معلوم ہوا کہ یہ باغات صرف ہنگامی عارضی تفریح کے لئے نہیں ہوں گے بلکہ رہنے کے لئے ہوں گے) پھر تَجْرِيْ کہہ کر نعمت کو دوبالا کر دیا پھر خلود کو ابد سے مقید کر دیا (تاکہ زوال نعمت کا خطرہ ہی نہ رہے)

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ جَنّٰتُ اور جَنّٰتُ کے اندر جو خدا داد نعمتیں ہوں گی یہ (رضا خداوندی کی) نعمت سب سے بڑھ کر ہوگی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جنت والوں سے فرمائے گا اے ساکنان جنت! اہل جنت جواب دیں گے لبیک ربنا وسعدیک والخیر کله فی یدیک اللہ فرمائے گا کیا تم راضی ہو اہل جنت عرض کریں گے پروردگار ہمارے ناخوش رہنے کی کیا وجہ ہے تو نے تو ہم کو وہ چیزیں عطا فرما دیں جو تیری مخلوق میں کسی اور کو نہیں دی گئیں اللہ فرمائے گا کیا ان سے بھی بڑھیا چیز میں تم کو نہ دوں اہل جنت عرض کریں گے پروردگار! ان سے اعلیٰ چیز کیا ہوگی۔ اللہ فرمائے گا میں تم پر اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں آئندہ کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ متفق علیہ۔ میں کہتا ہوں کہ اہل جنت جو یہ کہیں گے کہ تیری مخلوق میں سے کسی اور کو نہیں دی گئیں شاید اس کی مراد یہ ہے کہ فرشتوں کو نہیں دی گئیں ورنہ اہل جنت کے علاوہ دوسرے انسان سوائے دوزخیوں کے اور نہیں ہوں گے اور دوزخیوں کے مقابلہ میں اپنی فضیلت کا اظہار (موقع کلام کے لحاظ سے) درست نہیں۔

وَرَضُوْا عَنْهُ بغوی نے لکھا ہے کہ بندہ کی رضا خدا سے دو طرح ہے ایک رضا کے بعد ب آتی ہے رضی بہ دوسری رضا کے بعد عن آتا ہے رضی عنہ۔ اول کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے رب اور مدبر کائنات ہونے پر بندہ راضی ہے دوسرے کا یہ معنی ہے کہ اللہ کے قضاء و قدر سے بندہ خوش ہے۔

میں کہتا ہوں کہ موخر الذکر رضا کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ قضائے الٰہی پر اعتراض نہ کرے اور اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے واقع میں وہ اچھا ہی ہوتا ہے اگرچہ ہم کو اس کی خوبی معلوم نہ ہو اس قسم کی رضا تمام بندوں کے لئے اللہ کے ہر فیصلہ پر لازم ہے خواہ ان کی طبیعت کو پسند ہو یا ناپسند لیکن اگر کسی بندہ سے کوئی گناہ صادر ہو جائے یا کسی دوسرے سے گناہ یا کفر کا صدور ہو جائے تو انسان سے صدور کفر و معصیت اگرچہ اللہ کے ارادہ اور تخلیق سے ہی ہوتا ہے مگر انسانی کسب اور فعل کو اس میں

دخل ہوتا ہے اس لئے بحیثیت کسب و عمل بندہ کو بھی اس پر راضی نہ ہونا چاہئے کیونکہ خدا کو بندہ کا کفر و عصیان پسند نہیں۔
رضا کی اس قسم کا وجوب عقل و دلیل سے ثابت ہے عقل مند جب دیکھتا ہے کہ اللہ تمام چیزوں کا مالک ہے اور مالک اپنی چیزوں میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا اعتراض تو اس شخص پر کیا جا سکتا ہے جو دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرتا ہے اور عقل مند یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ حکیم ہے وہی کام کرتا ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو لامحالہ اللہ کے ہر فعل پر وہ راضی ہوتا ہے اگر اس کے دل میں (ناگواری اور ناپسندی کا) کچھ خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے تو اس کا سرچشمہ عقلی اور دینی کمزوری اور نفس امارہ کے اندر بقیہ کفر کا اثر ہوتا ہے۔ رضا کی اسی قسم کی طرف سری سقطی نے اشارہ کیا ہے کہ جب تو اللہ سے راضی نہیں تو پھر اس کی خوشنودی کا سوال کس طرح کرتا ہے۔

(۲) رضا کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ کی ہر مشیت بندہ کو محبوب و مرغوب ہو جائے خواہ اس کی خواہش کے خلاف ہی ہو۔ اس کا سرچشمہ اللہ کی محبت اور اس کا عشق ہے محبوب کا فعل اور مقصود عاشق کے لئے اپنی ذاتی مراد سے زیادہ محبوب ہوتا ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

اگر تو فراق سے خوش ہے تو میں اپنے اس دکھ پر راضی ہوں۔

(۳) رضا کی تیسری قسم یہ ہے کہ بندہ اپنی انتہائی آرزو اور آخری تمنا کو پہنچ جائے آیت میں یہ ہی رضا مراد ہے آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ایسی حالت میں میں اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں رہے گا۔ سورۂ والضحیٰ کی تفسیر میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ یعنی مذکورہ جزا اور خدا کی خوشنودی اس شخص کو حاصل ہوگی جو اپنے رب سے خوف رکھتا ہے خشیۃ پر ہی مدار کار ہے یہی ہر خیر پر ابھارتا ہے اور یہی ہر معصیت اور بدی سے روکتا ہے۔

ع ۱ ۸ ۲۴

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی (بن کعبؓ) سے فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تیرے سامنے قرآن پڑھوں۔ ایک روایت میں قرآن کی جگہ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا پڑھوں، آیا ہے حضرت ابیؓ نے عرض کیا کیا اللہ نے میرا نام آپ سے لیا ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! حضرت ابیؓ نے عرض کیا میرا ذکر رب العالمین کے پاس ہوا ہے فرمایا ہاں یہ سنکر حضرت ابیؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ متفق علیہ۔ میں کہتا ہوں حضرت ابیؓ کی جو حالت حدیث میں بیان کی گئی ہے یہ عاشقوں کی نشانی ہے۔

سورۃ البینۃ ختم ہوئی۔

بعونہ تعالیٰ۔

سورۃ الزلزال

یہ سورت مدنی ہے اس میں ۸ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① یعنی جب زمین کو ہلایا جائے گا اور اس کی عظمت کی حالت کے مناسب جھنجھوڑا جائے گا یا تقاضا حکمت کے مطابق جھنجوڑا جائے گا یا جس قدر اس کو جھنجوڑنا ممکن ہو گا اتنا جھنجوڑا جائے گا جس قدر جھنجھوڑ زمین کے لئے مقرر ہے اتنی حرکت دی جائے گی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین اپنے اسفل حصہ سے ہلے گی (یعنی ہلنا شروع ہو گی) اس زلزلہ کا وقت مختلف فیہ ہے۔ کیا دوسرے نفخہ کے بعد جبکہ لوگ قبروں سے اٹھ چکے ہوں گے یہ زلزلہ آئے گا یا پہلے نفخہ سے پہلے آئے گا اور یہ قیامت کی علامات میں سے ہو گا اول قول حلیمی وغیرہ کا مختار ہے اور دوسرا قول ابن عربی وغیرہ کا ہے۔ ابن عربی کے قول کی دلیل یہ آیت ہے یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى (اور یہ تمام احوال حقیقت میں نفخہ اول سے پہلے ہوں گے) اول الذکر قول والے کہتے ہیں کہ ان آیات میں شدت ہولناکی کی تصویر کشی مندرجہ الفاظ میں کی ہے الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ کلام کی بناء مجاز اور تشبیہ پر ہے یہ گروہ اپنے قول کے ثبوت میں حضرت عمرانؓ بن حصین کی حدیث پیش کرتا ہے جس کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح کہا ہے حضرت عمران نے بیان کیا ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آیت یَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ الایۃ نازل ہوئی حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کون سا دن ہو گا یہ وہ دن ہو گا جس میں اللہ آدم سے فرمائے گا کہ (اپنی نسل میں سے) دوزخ کا حصہ بھیجو۔ الحدیث۔

یہ حدیث مختلف طریقوں سے مروی ہے صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت آئی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا اور اپنی نسل میں سے دوزخ کا حصہ بھیج۔ آدم عرض کریں گے پروردگار دوزخ کا حصہ کیا۔ اللہ فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ ایک باقی رہے گا۔ اس کلام کو سن کر بچے بوڑھے ہو جائیں گے ہر حمل والی کو اسقاط ہو جائے گا اور تم کو لوگ نشہ میں (لڑکھڑاتے ہوئے) دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہو گا۔ یہ حدیث صحابہؓ پر شاق گزری اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ (محفوظ رہنے والا) ایک فی ہزار ہم میں سے کون ہو گا فرمایا یاجوج ماجوج میں سے ہزار ہوں گے اور تم میں سے ایک، دیگر اقوام میں تم ایسے ہو جیسے سفید بیل (کی کھال پر) ایک سیاہ بال یا سیاہ بیل (کی کھال) پر سفید بال۔

قول دوئم کے قائل اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زلزلہ اس وقت ہو گا جس وقت حضرت آدمؑ کو اپنی نسل میں سے دوزخ کا حصہ بھیجنے کا حکم ہو گا بلکہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ اس روز ہو گا پس آدمؑ کو حکم زلزلہ کے بعد دیا جائے گا گویا رسول اللہ ﷺ نے جب اس زلزلہ کا ذکر کیا جو نفخہ اول سے پہلے ہو گا تو ان عظیم ہولناکیوں کا بھی ذکر کر دیا جو اس روز رونما ہوں گی۔ میں کہتا ہوں کہ صحیحین کی حدیث کی عبارت اس تاویل کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ حدیث میں ہے اس وقت یعنی حصۂ دوزخ کے وقت بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حمل والی اسقاط کر دے گی۔ واللہ اعلم۔

میرا خیال ہے کہ زلزلہ کئی بار آئے گا ایک بار وہ زلزلہ ہو گا جو قیامت کی علامات میں سے ہے اور ایک بار بعث کے بعد ہو گا۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ زمین کی طرف سے نکالنے کی نسبت مجازی ہے (حقیقت میں اخراج اثقال کرنے والی خدا کی قدرت ہے) یعنی زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین مردوں کو قبروں سے باہر نکال دے گی (گویا ابن عباسؓ کے نزدیک اثقال سے مراد ہیں مردے) فریابی نے مجاہد کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اس مطلب پر یہ واقعہ نفخہ دوم کے بعد کا ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے عطیہ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین اپنے اندر کے خزانے باہر نکال دے گی (اس قول پر اثقال سے مراد ہوئے زمین کے اندرونی خزانے) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین اپنے جگر پاروں کو سونے چاندی کے ستونوں کی طرح (باہر نکال کر) پھینک دے گی قاتل آئے گا اور (زمین کے اوپر سونے چاندی کے ڈھیر دیکھ کر) کہے گا اسی کے سلسلے میں میں نے قتل کیا تھا۔ رشتہ داری قطع کرنے والا آئے گا کہے گا اسی کے لئے میں نے رشتہ داری قطع کی تھی چور آئے گا اور کہے گا اسی کے سلسلے میں میرا ہاتھ کاٹا گیا تھا پھر سب لوگ اس کو چھوڑ جائیں گے کوئی کچھ بھی اس میں سے نہیں لے گا۔ رواہ مسلم۔

صحیحین میں مرفوع حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریب ہے کہ فرات سے بہتیرا سونا برآمد ہوگا اگر کوئی شخص (اس زمانہ میں وہاں) موجود ہو تو اس میں سے کچھ نہ لے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ قیامت بپا نہ ہوگی جب تک فرات سونے کا پہاڑ برآمد نہ کر دے گی اس سونے پر لوگ ایک دوسرے کو قتل کریں گے یہاں تک کہ) سو میں سے ننانوے مارے جائیں گے (ایک بچے گا وہ) ایک کہے گا شاید میں ہی وہ شخص ہوں جو بچ گیا ہوں۔ میں کہتا ہوں شاید شروع میں قتال ہوگا پھر آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی کچھ نہ لے سکے گا۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ اور انسان تعجب سے کہے گا زمین کو کیا ہو گا کہ ایسا سخت زلزلہ آیا اور زمین اپنے پیٹ کے اندر کی چیزیں باہر پھینکنے لگی۔

بعض علماء کا قول ہے کہ الانسان سے مراد کافر آدمی ہے چونکہ اس کو قبروں سے اٹھنے کی امید ہی نہ ہوگی اس لئے قبر سے اٹھنے کے وقت وہ یہ بات کہے گا اور مومن کہے گا یہ وہی ہے جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بغوی نے لکھا ہے عبارت میں کچھ تقدیم تاخیر ہے اصل کلام اس طرح تھا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا یعنی اس روز زمین اطلاع دے گی اور جو کچھ اس پر کیا گیا ہو گا اس کو بیان کرے گی تو انسان کہے گا اس زمین کو کیا ہو گیا کہ اپنے اوپر کئے ہوئے اعمال کو بتا رہی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ زمین کی خبریں کیا ہوں گی صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہے فرمایا زمین کی خبریں یہ ہوں گی کہ جس بندے اور بندی نے زمین کے اوپر جو کچھ کیا ہو گا زمین اس پر شہادت دے گی۔ اور کہے گی فلاں شخص نے ایسا ایسا کیا تھا یہی زمین کی اطلاعات ہوں گی رواہ احمد و نسائی و ابن حبان و البیہقی۔ ترمذی نے نقل کرنے کے بعد اس کو صحیح کہا ہے۔ طبرانی نے حضرت ربیعہؓ حرشی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین سے احتیاط رکھو یہ تمہاری ماں ہے جس شخص نے بھی اس کے اوپر کوئی اچھا برا کام کیا ہو گا وہ اس کی خبر ضرور دینے والی ہے۔ طبرانی نے مجاہد کا قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ ب سببی ہے اور لام بمعنی اِلٰی ہے۔ یعنی زمین کا خبر دینا اس سبب سے ہو گا کہ اللہ کی طرف سے اس کو یہی اشارہ بالاذن ملا ہو گا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا کا جواب ہو یعنی انسان کے سوال کے جواب میں کہے گی مجھے اللہ کا حکم ہی یوں ملا ہے کہ اپنے اندر زلزلہ پیدا کروں اور اندرونی بوجھ باہر نکال پھینکوں۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۝ یعنی حساب کی پیشی کے بعد مقام حساب سے لوگ متفرق طور پر لوٹیں گے کچھ دائیں سمت کو جنت کی طرف جائیں گے اور کچھ بائیں سمت کو دوزخ کی طرف۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ يَوْمَئِذٍ

يَتَفَرَّقُوْنَ۔

لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لِيُرَوْا جَزَاءَ اَعْمَالِهِمْ یعنی مقام حساب سے دائیں بائیں واپسی اس لئے ہوگی کہ ان کو ان کے اعمال کی سزا جزا دکھادی جائے مطلب یہ کہ جنت یا دوزخ کے اندر اپنے اپنے مقامات پر جا کر اتر جائیں۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ یہاں سے آخر سورت تک لِيُرَوْا کی تفصیل ہے ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ نازل ہوئی تو مسلمانوں کا خیال ہوا کہ اگر ہم کچھ تھوڑی سی (راہ خدا میں) دیں گے تو اس کا اجر نہیں ملے گا کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہوا کہ اگر کوئی حقیر سا گناہ ہو جائے مثلاً کوئی جھوٹی بات یا نامحرم پر ایک نظر تو اس پر عذاب نہ ہوگا وعید عذاب تو بڑے گناہوں کے لئے ہے اس پر اللہ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ یعنی جو شخص چھوٹی چیونٹی کے وزن کی برابر یا اس سے بھی کم نیکی کرے گا تو اس کے سامنے آئے گی (نملہ چھوٹی چیونٹی۔ یہاں حقیر وزن مراد ہے خواہ چیونٹی سے بھی کم ہو) سامنے آنے سے مراد ہے اس نیکی کی جزاء کا سامنے آنا (ملنا) مقاتل نے کہا اس آیت میں مسلمانوں کو خیرات دینے کی ترغیب دی جا رہی ہے خواہ قلیل ہی ہو کیونکہ آئندہ قریب وقت میں ہی چھوٹی خیرات بڑی ہو جائیں گی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص پاک کمائی سے آدھے چھوارے کی برابر کوئی چیز خیرات کرتا ہے اور اللہ پاک (کمائی) ہی کو قبول فرماتا ہے۔ تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کو لیتا ہے پھر خیرات کرنے والے کے لئے اس کی (اس حقیر) خیرات کو بڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی برابر ہو جاتی ہے۔ جیسے تم میں سے بعض لوگ بچھڑے کو پرورش کرتے ہیں متفق علیہ۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھوڑی بھلائی کو بھی حقیر نہ سمجھو خواہ اتنا ہی کہ اپنے بھائی سے شگفتہ روئی سے پیش آؤ۔ رواہ مسلم۔ معتزلہ کے خلاف اس آیت سے اہل سنت کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے سے مسلمان بھی ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہیں گے بلکہ آخر کار جنت میں پہنچا دیئے جائیں گے کیونکہ اللہ نے ذرہ برابر نیکی کی جزاء دینے کا وعدہ کیا ہے اور وعدۂ الٰہیہ میں خلاف ورزی ناممکن ہے ایمان تو تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور تمام عبادات کی بنیاد ہے تو گناہوں کے ارتکاب سے اس کی جزاء کس طرح معدوم ہو سکتی ہے اور چونکہ ثواب کو دیکھنے کا مقام صرف جنت ہے اس لئے مومن خواہ فاسق ہو اور بغیر توبہ کے مر جائے آخر میں جنت میں ضرور جائے گا۔ اسی پر اجماع ہے اور رسول اللہ ﷺ کے متواتر فرمان بھی اسی مطلب پر دلالت کر رہے ہیں۔ حضرت انسؓ کی متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اس کا یعنی کلمہ توحید و رسالت کا قائل ہے اور اس کے دل میں ذرہ برابر خیر یا ایمان ہے وہ دوزخ سے نکل آئے گا۔

حضرت عثمانؓ غنی کی روایت مسلم نے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ یقین رکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں مر گیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص شرک کی حالت میں مر گیا وہ دوزخ میں جائے گا۔ اور جو شخص ایسی حالت میں مرا کہ کسی کو اللہ کا ساجھی نہ بناتا تھا تو وہ جنت میں جائے گا۔

مسلمؒ نے حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے جس شخص نے شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اللہ نے اس پر دوزخ حرام کر دی۔ صحیحین میں حضرت انسؓ اور حضرت عتبانؓ بن مالک کی روایت سے اور حاکم کے نزدیک حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے اور مسلم کے نزدیک حضرت معاذؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔ مسلم نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ان الفاظ میں حدیث نقل کی ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر ایمان ہوگا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ یعنی اللہ نے دوامی دوزخ اس پر حرام کر دی ہمیشہ کے لئے دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوا پھر اسی پر مر گیا وہ جنت میں داخل ہو گیا میں نے

عرض کیا خواہ اس نے زنا کیا ہو خواہ اس نے چوری کی ہو فرمایا خواہ اس نے زنا کیا ہو خواہ اس نے چوری کی ہو میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو (تب بھی جنت میں جائے گا) فرمایا خواہ اس نے زنا کیا ہو خواہ اس نے چوری کی ہو (تب بھی جنت میں جائے گا) ابو ذرؓ کی ناک کو خاک آلود کر کے۔ احمد بزار اور طبرانی نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے سیوطی نے کہا اس مضمون کی احادیث تواتر سے بھی زائد ہیں۔

ایک شبہ

آیت میں عموم ہے جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا مثلاً فقیروں کو کچھ دے گا یا کنبہ پروری کریگا تو اس کا ثواب سامنے آئے گا خواہ نیکی کرنے والا کافر ہو یا مسلمان (سب کو نیکی کا ثواب ملے گا) حالانکہ (قرآن اور حدیث کی) صراحتیں اور اجماع علماء دلالت کرتا ہے کہ کافر دوامی دوزخی ہیں (ان کی کوئی نیکی مقبول نہیں۔ جنت میں کبھی نہیں جائیں گے اور ثواب کی شکل بھی نہیں دیکھیں گے)

ازالہ

آیت کا مفہوم کافروں کو شامل نہیں کیونکہ ہر نیکی کی ضروری شرط ایمان باللہ اور اللہ کے لئے خلوص نیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اعمال کا مدار نیتوں پر ہے جب کافروں میں ایمانی شرط مفقود ہے تو نتیجہ (یعنی نیکی کا ثواب) مفقود ہونا ہی چاہئے کافروں کی نیکیاں ایسی ہی ہیں جیسے بغیر وضو کی نماز۔ ایسی نماز نماز نہیں بلکہ اس کا شمار استہزاء اور معصیت کی فہرست میں کیا جاتا ہے اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ حالت کفر میں جس نے نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کا اعتکاف کرنے کی منت مانی پھر مسلمان ہو گیا تو نذر کو پورا کرنا واجب نہیں کیونکہ حالت کفر کی نماز روزہ اور اعتکاف خالص اللہ کے لئے نہیں ہوتا پس کفر کی حالت کی نماز وغیرہ بھی کفر اور معصیت ہے طاعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور معصیت کی نذر (معتبر) نہیں کافروں کے اعمال میدانی سراب کی طرح ہیں جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے لیکن قریب پہنچتا ہے تو کچھ نہیں ملتا (پس کافروں کو اعمال کا کوئی نتیجہ نہ ملے گا اور) خدا کے پاس پہنچیں گے تو اللہ ان کے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا اور اللہ کا حساب جلد آنے والا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿٨﴾ یعنی اگر گناہوں کی معافی نہ ہوئی تو جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی اس کو اس بدی کی سزا دیکھنی (یعنی اٹھانی) پڑے گی۔ ہم نے عدم مغفرت کی قید اس لئے لگائی کہ آیات اور احادیث سے بغیر توبہ کے گناہوں کے بخشے جانے کا جواز ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے اللہ اس بات کو تو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور شرک کے علاوہ جس کے گناہ چاہے گا بخش دے گا۔

ع ۱ ۸ ۲۲

دوسری آیت میں ہے جس کے گناہ چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا تیسری آیت ہے رب کی رحمت سے سوائے گمراہوں کے اور کوئی آس نہیں توڑتا۔ چوتھی آیت ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اس کے علاوہ اور بھی اسی طرح کی آیات ہیں۔

حضرت حذیفہؓ بن یمان کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ قیامت کے دن اللہ ضرور ایسی مغفرت (عمومی) کرے گا کہ ابلیس بھی اس کی طرف بڑھے گا اور اس کو پالینے کے قریب پہنچ جائے گا (مگر پا نہیں سکے گا) رواہ البیہقی۔ اس مضمون کی احادیث اتنی کثرت سے آئی ہیں کہ حد تواتر میں داخل ہو گئی ہیں۔

مرجیہ فرقہ کا قول ہے کہ مومن خواہ فاسق ہی ہو اللہ اس کو عذاب نہیں دے گا اور مومن کو ایمان ہوتے ہوئے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچائے گا۔

آیت مذکورہ مرجیہ کے خیال کے خلاف اہل سنت کے قول کی تائید کر رہی ہے (کہ ہر گناہ کی سزا سامنے آئے گی بشرطیکہ اس کو معاف نہ کر دیا گیا ہو یا کسی مومن سے گناہ کے معاف کر دینے کا تو قطعی وعدہ نہیں کیا گیا بلکہ سزا کے سامنے آنے

کی صراحت فرمائی) مومنوں کو صغیرہ کبیرہ گناہوں کی سزا دینے کی صراحت بکثرت ان گنت آیات واحادیث میں آئی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل سنت کا مسلک حق ہے اگر اللہ چاہے گا تو چھوٹے گناہ کی بھی سزا دے گا اور یہ اس کے انصاف کا تقاضا ہوگا اور چاہے گا تو بڑے بڑے گناہوں کو بھی معاف فرما دے گا اور یہ اس کی مہربانی کا نتیجہ ہوگا۔

مقاتل نے کہا چھوٹا گناہ کرنے والے کی نظر میں قیامت کے دن پہاڑ سے بھی بڑا معلوم ہوگا۔ حضرت سعید بن حبان نے کہا حنین سے فراغت پا کر رسول اللہ ﷺ واپس ہوئے تو ہمارا پڑاؤ ایک ایسے چٹیل میدان میں ہوا جہاں کچھ نہ تھا (نہ درخت نہ عمارت نہ سبزہ) حضور ﷺ نے فرمایا۔ جو کچھ کسی کو ملے وہ لے آئے سب کو جمع کر لو گھڑی بھر میں ہی لوگوں نے جمع کر لیا حضور ﷺ نے فرمایا اس کو دیکھ رہے ہو اسی طرح آدمی پر گناہوں کا انبار اکٹھا ہو جاتا ہے پس آدمی کو چاہئے کہ اللہ سے ڈرتا رہے اور چھوٹا بڑا کوئی گناہ نہ کرے۔ کیونکہ اس کے خلاف تمام گناہوں کو جمع رکھا جاتا ہے طبرانی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عائشہؓ حقیر گناہوں سے پرہیز رکھ۔ اللہ کی طرف سے ان کی باز پرس کرنے والا بھی ہوگا۔ نسائی وابن ماجہؒ وابن حبانؒ۔ ابن حبانؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

حضرت انسؓ نے فرمایا تھا تم کچھ عمل ایسے کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک (یعنی حقیر) ہوتے ہیں مگر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم ان کو ہلاکت آفریں گناہوں سے شمار کرتے ہیں۔ رواہ البخاری امام احمد نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے جس کی سند صحیح ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اللہ کی کتاب میں سب سے زیادہ فیصلہ کن آیت فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ہے۔

مسلم نے حضرت انسؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو فاذہ جامعہ فرمایا ہے (فاذہ اکیلی یگانہ یکتا) ربیع بن خثیم کا بیان ہے کہ ایک شخص حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ سورت پڑھتا ہوا گزرا جب آخری حصہ پر پہنچا تو حسنؒ بصری نے فرمایا بس میرے لئے کافی ہے تو نے نصیحت کی حد کر دی۔

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ پڑھا دیجئے فرمایا الرٰ والی تین سورتیں پڑھ۔ اس شخص نے عرض کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں دل بھی سخت ہو گیا ہے اور زبان بھی موٹی پڑ گئی ہے فرمایا حٰم والی تین سورتیں پڑھ۔ اس نے پہلے کی طرح اب بھی گزارش کی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے سورت جامعہ (جو سب کے ثواب کو جامع ہو) پڑھا دیجئے حضور ﷺ نے اس کو اِذَا زُلْزِلَتِ پڑھا دی پڑھنے سے فارغ ہو کر اس شخص نے عرض کیا قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں کبھی اس سے زیادہ نہیں پڑھوں گا (اور نہ اس میں کمی کروں گا) پھر پشت موڑ کر چل دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ فرمایا مرد کامیاب ہو گیا۔ رواہ احمد وابو داؤد۔

حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِذَا زُلْزِلَتْ نصف قرآن کے برابر ہے اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ایک چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ ترمذی وبغوی۔ ترمذی کی ایک اور روایت میں آیا ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت انس نے فرمایا اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ چوتھائی قرآن ہے۔

جزری نے کہا چوتھائی قرآن ہونے کا یہ مطلب ہے کہ قرآن میں چار چیزیں ہیں (یعنی چار چیزوں کا بیان ہے) زندگی، موت، حشر، حساب اور اس سورت میں صرف حساب کا بیان ہے اور اس کو نصف قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں احوال دنیا کا بھی بیان اور احوال آخرت کا بھی اور اس سورت میں صرف احوال آخرت کا بیان ہے۔ لہٰذا یہ سورت ایک حیثیت سے چہارم قرآن ہے اور دوسری حیثیت سے نصف قرآن۔ ایک بہت ہی ضعیف سند سے حضرت علیؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے چار بار اذا زلزلت پڑھ لی تو وہ (ثواب میں) اس شخص کی طرح ہے جس نے پورا قرآن پڑھا واللہ اعلم۔

سورۃ العدیت

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۱ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزاز دار قطنی حاکم اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ سواروں کو (کہیں) بھیجا اور مہینہ بھر ان کی کوئی خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس نہیں آئی تو مندرجہ ذیل آیات کا نزول ہوا۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ① اَلْعٰدِيٰت سے مراد ہیں غازیوں کے گھوڑے جو راہ خدا میں دوڑتے ہیں حضرت ابن عباسؓ مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، کلبی، قتادہ، ابوالعالیہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ مذکورہ بالا شان نزول اور اَلْعٰدِيٰت کے اس تفسیری معنی پر اس سورت کا مدنی ہونا ظاہر ہوتا ہے کیونکہ ہجرت سے پہلے جہاد نہیں تھا لیکن اگر سورت کو مکی مان لیا جائے تو پھر غازیوں کے گھوڑوں کی قسم ایک پیش گوئی کے بجائے ہوگی (گویا یہ پیش گوئی ہے کہ آئندہ جہاد کا حکم ہوگا اور غازیوں کے گھوڑے ہوں گے)

ضَبْحاً کا فعل محذوف ہے اور پورا جملہ حال واقع ہوا ہے یعنی ہانپتے ہوئے۔ دوڑنے کے وقت گھوڑے کی سانس کی آواز کو ضبح کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جانوروں میں سوائے گھوڑے کتے اور لومڑی کے ہانپنے کی آواز کسی اور جانور کی نہیں ہوتی اور یہ بھی اس وقت ہوتی ہے جب تھکنے وجہ سے ان کا حال بگڑ جاتا ہے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا اَلْعَادِيَات (سے مراد) ہیں حاجیوں کے اونٹ جو عرفہ سے مزدلفہ تک اور مزدلفہ سے منیٰ تک دوڑتے ہیں۔ اسلام میں اول ترین جہاد بدر کا ہوا تھا اس وقت ہمارے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے ایک زبیر کا گھوڑا دوسرا مقداد بن اسود کا گھوڑا اس لئے اَلْعَادِيٰت سے مراد جہادی گھوڑے کیسے ہو سکتے ہیں حضرت ابن مسعودؓ سدی اور محمد بن کعب کا بھی یہی قول ہے اس تشریح پر ضبحاً کا معنی ہوگا چلنے کی حالت میں گردنیں لمبی کئے ہوئے۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ② اَلْمُوْرِيٰت سے وہ گھوڑے مراد ہیں کہ جب رات کو پتھریلی زمین پر چلتے ہیں ان کی ٹاپیں پتھروں سے رگڑتی ہیں تو چنگاریاں نمودار ہو جاتی ہیں۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ③ الاغارۃ رفتار کی تیزی۔ اَلْمُغِيْرَات سے مراد ہیں وہ گھوڑے جو اپنے سواروں کو لے کر صبح کے وقت دشمن پر حملہ کرتے ہیں (دشمنوں پر چھاپہ مارتے ہیں) اکثر مفسرین کا یہی قول ہے قرطی کے نزدیک المغیرات سے مراد وہ اونٹ ہیں جو اپنے سواروں کو لے کر قربانی کے دن صبح کے وقت جمع (یعنی مزدلفہ) سے منا کو روانہ ہوتے ہیں صبح سے قبل جمع سے روانہ نہ ہونا سنت بلکہ واجب ہے البتہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور ضعیف مردوں کو شب نحر کی فجر نکلنے کے بعد ہی روانہ ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ④ بِهٖ کی ضمیر دشمن پر چھاپہ مارنے کے وقت کی طرف راجع ہے جو سیاق کلام سے معلوم ہو رہا ہے یا دشمن کے مقام کی طرف راجع ہے جو اقتضاء عبارت ہے یعنی وہ گھوڑے جو دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں چھاپہ مارنے کے وقت یا چھاپہ مارنے کی جگہ پر اپنے حملے کی وجہ سے غبار اڑاتے ہیں۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ⑤ پھر اس غبار میں یا چھاپہ مارنے کے وقت یا چھاپہ مارنے کے مقام پر دشمنوں کی فوج کے اندر وہ داخل ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ یہ قسم کا جواب ہے اَلْاِنْسَان میں لام جنسی ہے مگر اطلاق جنس میں اکثر افراد ملحوظ ہیں (کیونکہ بعض انسان اس حکم کے عموم سے مستثنیٰ ہیں) جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (میرے بندوں میں سے شکر گذار کم ہیں۔ لِرَبِّهٖ کا تعلق كَنُوْدٌ سے ہے مقطع آیات کی رعایت سے كَنُوْدٌ سے پہلے ذکر کر دیا گیا ہے کہ كَنُوْدٌ ناشکرا قبائل مضر کے محاورہ میں كَنُوْدٌ کا یہی معنی ہے حضرت ابن عباس مجاہد اور قتادہ نے یہی ترجمہ کیا ہے یا كَنُوْدٌ کا معنی نافرمان یہ بنی کندہ کے محاورہ میں ہے یا بخیل یہ بنی مالک کے محاورہ میں ہے ابو عبیدہ نے کہا کنود بمعنی قلیل الخیر اور ارض کنود شور (بھوڑ) زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ ابن کیسان نے کہا کہ اِنَّهٗ کی ضمیر الانسان کی طرف راجع ہے اور ذٰلِكَ سے اشارہ ناشکرا ہونے یا نافرمان ہونے یا بخیل ہونے کی جانب ہے۔

لَشَهِيْدٌ ۚ یعنی اکثر انسان اپنے رب کی نعمتوں کے بڑے ناشکرے ہیں اور تھوڑے سے غور کرنے کے بعد وہ اپنی ناشکری یا نافرمانی یا کنجوسی پر شہادت بھی دیتے ہیں اور اس ناشکری پر شہادت دینے کی نشانیاں نمایاں ہو جاتی ہیں یا آخرت میں اپنے نفس کی شہادت دیں گے اور اپنے گناہ کا اقرار کریں گے اور کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اکثر اہل تفسیر کے نزدیک وَاِنَّهٗ کی ضمیر رب کی طرف راجع ہے یعنی انسان کے کنود ہونے پر اللہ واقف ہے اس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اس مطلب پر آیت ناشکرے کے لئے وعید ہو گی۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ اِنَّهٗ کی ضمیر اَلْاِنْسَان کی طرف راجع ہے اور اَلْخَيْر سے مراد مال ہے اللہ نے فرمایا ہے اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اگر میت نے مال چھوڑا ہو۔

لَشَدِيْدٌ ۚ بڑا سخت اور قوی ہے اگر کنود کا معنی ناشکرا ہو تو لِحُبِّ الْخَيْرِ میں لام محض صلہ کے لئے ہو گا یعنی انسان مال کی محبت میں بڑا اشدید ہے محسن کی راہ میں خرچ نہیں کرتا اور اگر کنود کا معنی بخیل لیا جائے تو لام تعلیل کا ہو گا یعنی انسان محبت مال کی وجہ سے بڑا کنجوس ہے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ ہمزہ استفہامیہ تعجب کے لئے ہے ف حرف عطف ہے لَا يَعْلَمُ کا عطف فعل محذوف پر ہے یعنی الا ینظر فلا یعلم مطلب یہ ہے کہ تعجب ہے انسان کیوں نہیں دیکھتا اور ابھی اس بات کو کیوں نہیں جان لیتا جو کل کو جان لیگا کہ اس کا رب اس سے باخبر ہے اس کے کرتوت کا اس روز بدلہ دے گا جبکہ مردوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا اور سینوں کے اندر کی باتیں کھول دی جائیں گی۔

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ جب قبروں کے اندر کے مردے اٹھائے جائیں گے اکھاڑے جائیں گے (ما موصولہ بے عقل چیزوں کے لئے آتا ہے اور مَنْ موصولہ عقل والی مخلوق کے لئے جیسے آدمی فرشتہ وغیرہ) اس جگہ مَا سے مردہ انسان مراد ہیں (اس لئے مَنْ ہونا چاہئے لیکن) ما کو مَنْ کی جگہ لانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ مَا فِي الصُّدُوْرِ میں ما آیا ہے اس کی مناسبت سے مَا فِي الْقُبُوْرِ میں بھی ما کو ذکر کیا یا یہ وجہ ہے کہ مردے، جمادات کی طرح بے عقل ہوتے ہیں (اس لئے ان کے مناسب ما ہی ہے)

وَحُصِّلَ اور صحیفوں میں جمع کر دیا جائے گا یا الگ کر دیا جائے گا اور ظاہر کر دیا جائے گا۔

مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ جو کچھ سینوں میں ہو گا یعنی خیر و شر جو کچھ جنس انسان کے سینوں میں ہو گی وہ ظاہر کر دی جائے گی ہاتھ پاؤں کے اعمال کو (ظاہر کرنے) کا ذکر آیت میں نہیں کیا بلکہ دل کے (اسرار و) عقائد کے اظہار کا ذکر کیا کیونکہ قلبی افکار و عقائد ہی اصل ہیں۔ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۞

ان کا رب اس روز ان سے باخبر ہو گا اللہ تو ہر وقت باخبر ہے اس روز باخبر ہونے کی خصوصیت اس لئے بیان کی کہ سزا جزا اس روز ظاہر ہو گی پس اللہ کا باخبر ہونا اس روز ظاہر ہو جائے گا یا یوں کہا کہ خبیر سے مراد ہی بدلہ دینے والا مطلب یہ کہ ان کا رب اس روز بدلہ دے گا زجاج نے یہی بیان کیا ہے۔ (سورۃ العادیات ختم ہوئی بعونہ ومنہ تعالیٰ)

ع ۱ ۱۱ ۲۵

سورۃ القارعۃ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۱ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ اَلْقَارِعَةُ کی تفصیل اَلْحَاقَّةُ میں گزر چکی ہے اس میں تاء یا تانیث کی ہے اور موصوف محذوف ہے یعنی کھٹ کھٹانے والی ساعت یا مبالغہ کی ہے۔

مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ یوم ظرف منصوب ہے اس کا فعل محذوف مضمر ہے جس پر اَلْقَارِعَةُ کا لفظ دلالت کر رہا ہے یعنی وہ ساعت اس روز کھٹ کھٹائے گی جب لوگ اس طرح ہوں گے یا لفظ یَوْم کا نصب اس وجہ سے ہے کہ اس جگہ جملہ کی طرف مضاف ہے ورنہ اس کو مرفوع ہونا چاہئے کیونکہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی وہ ساعت ایسا دن ہوگا جس میں لوگ ہوں گے۔

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ منتشر پتنگوں کی طرح جو لوٹ کر آگ میں گرتے ہیں کثرت حقارت شدت ہول کے سبب ایک کا دوسرے پر چڑھا جانا اور مجمع کی لہریں مارنا وصف مشترک ہے جس کی بناء پر آگ میں گرنے والے پتنگوں سے میدان حشر میں جمع ہونے والے آدمیوں کو تشبیہ دی ہے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ العھن رنگا رنگ کا اون اور پہاڑ رنگ برنگ کے اون کی طرح ہوں گے رنگا رنگی وصف تشبیہ ہے۔

الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾ اون بھی دھنکی ہوئی، پہاڑوں کے ذرات پراگندہ ہوا میں اڑتے ہوں گے اور رنگ برنگ کے ہوں گے گویا دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اون ہوا میں منتشر و پریشان ہوگی۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ میں انسانوں کی حالت مجمل بیان کی گئی تھی یہاں سے تفصیل شروع کر دی۔ مَوَازِيْنُ موزوں کی جمع ہے اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو انسان کے سامنے تولا جائے گا اور اعمال سے مراد بھی اعمال صالحہ ہیں کیونکہ وجود اعمال کا اصل مقصد ہی اعمال صالحہ کا وجود ہے۔ یا مَوَازِيْن میزان کی جمع ہے اور اس سے مراد ہے نیکیوں والا پلڑہ۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ میزان عدل کی زبان (قبضہ) بھی ہوگی اور دو پلڑے بھی (جیسے عموماً ترازو کے ہوتے ہیں) ابن مردویہ نے حضرت عائشہ کی روایت سے اور ابن مبارک نے زہد میں اور ابو الشیخ نے تفسیر میں نیز آجری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ اللہ نے میزان کے دو پلڑے آسمان زمین کی طرح پیدا کئے ہیں۔

مَوَازِيْن کو بصیغہ جمع ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مَنْ ثَقُلَتْ میں مَنْ اگرچہ لفظاً مفرد ہے اور اسی وجہ سے مفرد کی ضمیر اس کی طرف راجع کی گئی ہے۔ لیکن معنوی حیثیت سے یہ جمع ہے اور جمع کے مقابل جب جمع لائی جاتی ہے تو اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اکائیوں کو اکائیوں پر تقسیم کیا جائے پس اس صورت میں ہر شخص کی ترازو جدا جدا ہونا لازم ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ (میزان اگرچہ ایک ہی ہوگی لیکن) جن کے اعمال تولے جائیں گے چونکہ وہ متعدد ہوں گے اس لئے (گویا) انکی ترازوئیں بھی متعدد ہوں گی۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ پس وہ پسند کرنے والی زندگی میں ہوگا عِيْشَةٍ کی طرف پسند کرنے کی نسبت مجازی ہے اصل میں پسند کرنے والا زندگی والا ہوتا ہے جیسے نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ میں گزر گیا یا اسم فاعل بمعنی اسم مفعول ہے پسند کرنے والی یعنی پسندیدہ جس طرح کہ اسم مفعول بمعنی اسم فاعل وَعْدًا مَاْتِيًّا میں آیا ہے یا (فاعلی اور مفعولی کوئی حیثیت ملحوظ نہیں بلکہ صرف مصدر کی اسناد فاعل کی طرف مقصود ہے یعنی رَاضِيَةٍ سے مراد ہے رضا والی۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ یعنی جس کے اعمال حسنہ یا نیک اعمال کا پلڑہ ہلکا ہوگا اس آیت کے عموم میں کافر بھی داخل ہے جس کے پاس ایمان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی نیکی نہ ہوگی اور وہ فاسق مومن بھی داخل ہے جس کا گناہوں کا پلڑہ

نیکیوں کے پلڑہ سے بھاری ہوگا۔ لیکن مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ میں صرف وہ مومن داخل ہیں جو معصوم ہوں یا ان کے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں یا ان کی نیکیاں گناہوں سے بھاری ہوں۔

قرطبی نے کہا ہمارے علماء کا قول ہے کہ آخرت میں لوگوں کے تین فرقے ہوں گے ایک فرقہ متقیوں کا ہوگا جن کے کبیرہ گناہ نہ ہوں گے ان کی نیکیاں روشن پلڑہ میں رکھی جائیں گی اور وہ پلڑہ نہیں اٹھے گا البتہ دوسرا تاریک پلڑہ (یعنی گناہوں کا پلڑہ) بالکل خالی پلڑہ کی طرح اوپر اٹھ جائے گا۔ دوسرا فرقہ کافروں کا ہوگا ان کے کفر اور گناہوں کا بار تاریک پلڑے میں رکھا جائے گا اور اگر کوئی اچھا عمل ہوگا جیسے کنبہ پروری وغیرہ تو اس کو دوسرے پلڑہ میں رکھا جائے گا مگر یہ پلڑا پہلے پلڑہ کے برابر نہ ہو سکے گا اور خالی پلڑے کی طرح اوپر کو اٹھ جائے گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بعض موٹے لمبے چوڑے آدمی آئیں گے مگر اللہ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے برابر نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے آیت لَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَزْنًا پڑھی متفق علیہ بروایت حضرت ابوہریرہؓ۔

تیسرا فرقہ مومن بدکاروں کا ہوگا ان کی نیکیاں روشن پلڑے میں اور برائیاں تاریک پلڑے میں رکھی جائیں گی اگر نیکیوں کا پلڑہ بھاری ہوگا تو جنت میں داخل ہو جائے گا اور بدیوں کا پلڑہ بھاری ہوگا تو اس کا معاملہ مشیت الٰہی پر موقوف ہوگا یعنی اگر اللہ چاہے گا تو دوزخ میں داخل کر دے گا اور چاہے گا تو گناہ بخش دے گا اور جنت میں بھیج دے گا اور اگر دونوں پلڑے برابر ہوئے تو اعراف والوں میں سے ہو جائے گا یہ حالت اس وقت ہوگی جب کبیرہ گناہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے ہوں لیکن اگر بندوں کے حقوق ہوں گے تو انہی حقوق کے موافق اس شخص کی نیکیاں صاحب حق کو دے دی جائیں گی اس طرح اگر حقوق پورے ہوگئے تو خیر ورنہ حقوق والوں کے گناہ اس شخص پر بڑھا دیئے جائیں گے اور سب گناہوں کا عذاب اس پر ہوگا۔

احمد بن حارثؒ نے کہا قیامت کے دن لوگوں کے تین فرقے اٹھائے جائیں گے ایک فرقہ اعمال صالحہ کی وجہ سے غنی ہوگا۔ دوسرا فرقہ (اعمال صالحہ کم ہونے کی وجہ سے) محتاج تیسرا فرقہ جو (اپنے اعمال صالحہ کی وجہ سے شروع میں) غنی ہوگا پھر آخر میں دوسروں کے حقوق میں (اعمال صالحہ چلے جانے کی وجہ سے) محتاج ہو جائے گا۔

سفیان ثوریؒ نے کہا اگر خدا کے ستر گناہ لے کر تم خدا کے سامنے جاؤ تو وہ (ستر گناہ کے ساتھ پیشی اس سے آسان ہوگی کہ بندوں کا ایک گناہ لے کر خدا کے سامنے جاؤ ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہوگا جس کی ایک نیکی بھی گناہوں سے زائد ہوگی وہ جنت میں جائے گا اور جس کے گناہ نیکیوں سے زائد ہوں گے وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ ترازو ایک دلنہ کے وزن سے ہلکی بھاری ہو جائے گی اور جس کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ اعراف والوں میں سے ہوگا ایسے لوگ صراط پر رکے رہیں گے یہاں تک کہ جب بعض گناہوں کی سزا ان کو دے دی جائے گی اور نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو ان کو جنت میں داخلہ مل جائے گا۔

سیوطی نے کہا جس متقی کا کوئی گناہ نہ ہوگا اس کے اعمال بھی تولے جائیں گے تاکہ اس کا شرف لوگوں پر ظاہر کر دیا جائے اور کافر کے اعمال بھی اس کی ذلت کے (اظہار) کے لئے تولے جائیں گے میں کہتا ہوں کہ قرآن میں صالح مومنوں کے ثواب کے مقابلہ میں کافروں کی سزا کا ذکر اکثر جگہ آیا ہے لیکن جس مومن کے ایک نیک کام کے ساتھ ایک برا کام مخلوط ہو (کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ہوں) ان کی طرف سے خاموشی اختیار کی گئی ہے ظاہر یہ ہے کہ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ سے مراد کافر ہی ہیں ان ہی کی سزا کا بیان اگلی آیت میں ہے۔

فَاُمُّہٗ هَاوِیَۃٌ ۝ یعنی اس کا مسکن دوزخ ہوگا مسکن کو ماں اس لئے کہا کہ اولاد کے سکون کا مقام ماں ہوتی ہے هَاوِیَۃ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے هَاوِیَہ ایسا غار ہے جس کی گہرائی سے سوائے خدا کے کوئی واقف نہیں۔ قتادہ نے کہا اُمُّہٗ هَاوِیَۃ اس کی ماں گرنے والی ہے عربی کا ایک محاورہ ہے جب کوئی شخص کسی سخت مصیبت میں پڑ جاتا ہے تو کہتے ہیں ھَوَتْ اُمُّہٗ

اس کی ماہ گر گئی۔ بعض نے کہا کہ اُم سے مراد ہے سر یعنی وہ سر کے بل دوزخ میں گریں گے۔ بغوی نے کہا اسی تفسیر کی جانب قتادہ اور ابو صالح گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث میں متقیوں کے مقابلہ میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے انسے مراد بھی کفار ہیں حضور ﷺ نے فرمایا تھا آدمی کو پورا عوض ملے گا۔ میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان ایک فرشتہ کھڑا ہوگا اگر اعمال بھاری نکلیں گے تو وہ فرشتہ ایسی آواز سے جس کو مخلوق سن لے کہے گا فلاں آدمی خوش نصیب ہو گیا اس خوش نصیبی کے بعد کبھی بد نصیب نہیں ہوگا اور اگر تول ہلکی ہو جائے گی تو وہی فرشتہ ایسی آواز سے جس کو مخلوق سن لے گی پکارے گا کہ فلاں شخص بد نصیب ہو گیا اور اس بد نصیبی کے بعد کبھی اس کو خوش بختی نہیں ملے گی اس حدیث میں بھی مخلوط الاعمال شخص کی حالت کی طرف سے خاموشی اختیار کی گئی ہے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ فرشتہ اس کے لئے کسی طرح کی ندا نہیں دے گا۔

فائدہ: قرطبی نے کہا کہ ہر شخص کے لئے میزان (حساب) نہیں ہوگی جو لوگ بلا حساب جنت میں جائیں گے انکے اعمال تولنے کے لئے میزان نہیں لگائی جائے گی اسی طرح جو لوگ فی الفور بلا حساب دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے ان کے لئے ترازو نہیں قائم کی جائے گی موخر الذکر لوگوں کا ہی آیت ذیل میں ذکر کیا گیا ہے یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمَاهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ۔

سیوطی نے کہا احتمال ہے کہ جن کافروں کے اعمال وزن کشی کے وقت ہلکے نکلے گے وہ وہی منافق ہوں گے جو دنیا میں دکھاوٹ اور شہرت کے لئے مومنوں کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے تھے جب ہر شخص اپنے گروہ کے ساتھ اپنے معبود کے پیچھے چلا جائے گا تو یہ منافق مسلمانوں میں ملے جلے رہ جائیں گے اس وقت میزان کے ذریعے اللہ پاک سے ناپاک کو چھانٹ دے گا۔

غزالی نے لکھا ہے کہ ستر ہزار بلا حساب جنت میں جائیں گے نہ ان کے اعمال کی وزن کشی کے لئے ترازو لگائی جائے گی نہ وہ اعمال نامے لیں گے بلکہ ایک برات نامہ لکھا ہوا ان کو ملے گا جس میں لکھا ہوگا یہ فلاں بن فلاں کا برات نامہ ہے اصبہانی نے حضرت انسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میزانیں لگائی جائیں گی اور نمازیوں کو لایا جائے گا اور وزن کر کے ان کا ثواب پورا پورا کر دیا جائے گا اور حج والے لائے جائیں گے ان کو بھی وزن کشی کر کے پورا اجر دیا جائے گا اور اہل مصیبت کو لایا جائے گا لیکن ان کے اعمال تولنے کے لئے نہ ترازو لگائی جائے گی نہ ان کا رجسٹر کھولا جائے گا بلکہ بلا حساب ان پر ثواب کی بارش ہو گی یہ دیکھ کر وہ لوگ جو دنیا میں عافیت سے رہے تھے تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کے بدن قینچیوں سے کاٹے جاتے یہ تمنا اس فضیلت کو دیکھ کر کریں گے جس کو اہل مصیبت لے کر جائیں گے۔ یہی (مطلب) ہے آیت اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ کا۔

طبرانی اور ابو یعلی نے مناسب سند سے حضرت انس کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن شہید کو لا کر حساب کے لئے کھڑا کیا جائے گا پھر صدقہ (خیرات زکوۃ) دینے والے کو حساب کے لئے کھڑا کیا جائے گا پھر دکھی لوگوں کو لایا جائے گا مگر ان کے اعمال تولنے کے لئے نہ ترازو لگائی جائے گی نہ ان کا رجسٹر کھولا جائے گا بلکہ ان پر ثواب کی ایسی بارش ہوئی کہ اس کو دیکھ کر دنیا میں سکھ سے رہنے والے لوگ موقف قیامت میں تمنا کریں گے کہ کاش ان کے بدن (دنیا میں) قینچیوں سے کاٹے جاتے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جنت میں بلا حساب جانیوالے صوفیہ ہی ہوں گے تو شاید حدیث میں جو لفظ بلاء آیا ہے اس سے مراد عاشقان خدا کا دکھ ہو کیونکہ جس طرح وہ عطاء الٰہی پر راضی ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کے بھیجے ہوئے دکھ پر بھی راضی ہوتے ہیں۔

بیہقیؒ نے حضرت معقل بن یسارؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کا ایک اندازہ اور وزن ہے سواء

ایک آنسو کے کہ اس کے ذریعہ سے آگ کے سمندر بجھا دیئے جائیں گے اس گریہ سے مراد بھی عاشقوں کا گریہ ہے۔ ورنہ عام اہل بلاء کے اعمال کی وزن کشی کا ثبوت تو صحیح احادیث سے ہوتا ہے جیسا کہ نسائی حاکم ابن حبان بزار احمد اور طبرانی نے بروایت ثوبان وابو سلمی نے بیان کیا ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کیا کہنے کیا کہنے پانچ (کلمات) کے میزان میں یہ کیسے بھاری ہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ اور اَلْحَمْدُلِلّٰهِ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور جس مرد مسلم کا صالح بچہ مر جائے۔ الخ۔ بچہ کی موت بلاشبہ مصیبت ہے (اور میزان میں اس کے بھاری ہونے کی صراحت حدیث مذکور میں ہے) اور وہ شہادت جس کا ذکر حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں آیا ہے وہ بھی بلاء ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک سوال

امام احمدؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میزانیں قائم کی جائیں گی پھر ایک آدمی کو لایا جائے گا اور ایک پلڑے میں اس کو نیک عمل سمیت رکھا جائے گا اور وہ اعمال جو اس کے خلاف شمار کئے گئے تھے (یعنی برے اعمال) ان کو بھی دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا بد اعمال کا پلڑا جھک جائے گا تو اس شخص کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا وہ جانے کے لئے پشت موڑے گا تو رحمٰن کی طرف سے ایک منادی چیخ کر آواز دے گا جلدی نہ کر اس کی کوئی چیز (تولنے) سے رہ گئی ہے چنانچہ ایک پرچہ لایا جائے گا جس میں لا الٰہ الا اللّٰہ لکھا ہو گا اس پرچہ کو اس شخص کے ساتھ پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اب یہ پلڑہ جھک جائے گا حاکم ابن حبان اور ترمذی نے بھی ایسی ہی حدیث حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کی ہے جس سے مذکورہ حدیث کی تائید ہوتی ہے اب قابل سوال یہ بات ہے کہ مومن کا پلڑہ ہلکا ہونا ممکن ہی کیسے ہے کیونکہ کوئی مومن لا الٰہ الا اللّٰہ کے اقرار سے خالی نہیں خواہ عمر میں ایک ہی مرتبہ اس نے کیا ہو اور لا الٰہ الا اللّٰہ کا وزن تمام اعمال سے زیادہ ہے جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہو رہا ہے)

جواب

آخرت کے اکثر احکام (عمومی نہیں کہ کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہ ہو) کلیت اور جزئیت دونوں کا احتمال رکھتے ہیں (نہ ان میں کل کی صراحت ہے نہ بعض کی) عمومی کلی احکام بہت کم ہیں امر آخرت اللہ کے فضل سے وابستہ ہے اعمال کا مدار خلوص پر ہے جتنا خلوص ہو گا اتنا ہی اس عمل کا درجہ ہو گا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ امر ھَاوِیَہ کو عظیم الشان سمجھنے کے لئے استفہام کیا گیا۔

مَاهِيَهْ ⑩ حمزہ نے وصل کی حالت میں ھی بغیرہ کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہر حالت میں ھاسکتہ کے ساتھ پڑھا ہے ھی ضمیر ھَاوِیَۃ کی طرف راجع ہے اور مَاھِیَ میں استفہام ھَاوِیَہ کی ہولناکی ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

نَارٌ حَامِيَةٌ ؑ ⑪ وہ انتہائی گرم تپتی ہوئی آگ ہے۔ نَارٌ یا ھَاوِیَۃ سے بدل ہے یا اس کا بیان ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے (ہم نے مبتدا محذوف کا ترجمہ کیا ہے)

ع ۱ / ۱۱ / ۲۶

(سورۃ القارعہ ختم ہوئی بعونہ ومنہ)

سورۃ التکاثر

یہ سورت مکی ہے اس میں ۸ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اَلْهٰكُمُ تم کو غافل بنادیا یعنی بے ہودہ اور لغو اور بے فائدہ کام میں تم کو ڈال دیا اور اللہ کی اطاعت سے اور ان کاموں سے روک دیا جو اللہ کی ناراضگی سے بچانے والے ہیں۔

التَّكَاثُرُ ۝۱ کثرت مال و جاہ اور جتھے کی افزونی پر دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ یعنی مال و جاہ اور کنبہ قبیلہ کی زیادتی پر فخر کرنے نے تم کو لغویات اور بے ہودگیوں میں ڈال دیا یہاں تک کہ موت آگئی اور قبروں میں دفن کردیئے گئے۔

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کا قول بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کو تکاثر نے طاعت سے باز رکھا یہاں تک کہ تم کو موت آگئی۔ قتادہ نے کہا یہودی اپنی کثرت پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم فلاں قبیلہ سے زیادہ ہیں اس شیخی بازی نے انکو (اعتراف حق اور طاعت سے) مرتے وقت تک باز رکھا۔ انہی کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس تفسیر اور شان نزول پر حَتّٰی غایت کے لئے ہے (یعنی مرتے دم تک)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن بریدہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول انصار کے دو قبیلوں کے حق میں ہوا ایک بنی حارثہ دوسرا بنی الحارث۔ ہر ایک نے دوسرے پر فخر اور اپنی کثرت پر شیخی کا اظہار کیا تھا ایک نے کہا کیا تم میں کوئی فلاں فلاں اشخاص کی طرح ہے دوسرے نے بھی ایسا ہی کہا یہ مقابلہ تو زندوں کے متعلق تھا پھر کہنے لگے اب قبرستان کو چلو دونوں قبرستان کو گئے اور ہر ایک نے اپنے قبیلہ کے مردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیا تم میں کوئی ایسا ہے۔

کلبی نے کہا کہ یہ آیات قریشی قبائل کے حق میں نازل ہوئیں بنی عبد مناف اور بنی سہم میں سے ہر قبیلہ نے کہا ہم میں سردار اور غیرت مند آدمی تم سے زیادہ ہیں اور ہماری تعداد بھی تم سے زیادہ ہے گنتی کی تو بنی عبد مناف زیادہ نکلے پھر کہنے لگے اب ہم اپنے مردوں کو شمار کریں گے چنانچہ قبرستان میں جاکر مردوں کو شمار کیا تو بنی سہم کی تعداد کے تین گھر بڑھ گئے کیونکہ دور جاہلیت میں ان کی تعداد زیادہ تھی اس پر اللہ نے آیت نازل فرمائی۔ ان دونوں روایتوں کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قبرستان میں جاکر مردوں کو بھی شمار کیا یہاں تک تمہارا تفاخر عددی بڑھ گیا کہ زندوں کو شمار کرنے کے بعد مردوں کی کثرت پر بھی فخر کرنے لگے۔ اس تفسیر پر زیارت قبور سے مجاز اً مراد ہوگا مردوں کا ذکر کرنا یا زیارت قبور کا حقیقی معنی ہی مراد ہوگا کیونکہ وہ واقعی قبرستان کو قبر شماری کے لئے گئے تھے بہر حال اس صورت میں حَتّٰی سببیت کے لئے ہوگا۔

حضرت عبداللہؓ بن الشخیر نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اس وقت حضور ﷺ آیت اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ رہے تھے پھر فرمایا آدمی کہتا ہے میرا مال ہے میرا مال ہے تیرا مال تو صرف وہی ہے جو تو نے کھا کر ختم کردیا یا پہن کر پرانا کردیا یا خیرات کردی اور جاری کردیا۔ بغوی (بعض دوسری روایات میں جاری کردیا کی جگہ تو نے ذخیرہ کرلیا ہے)

حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میت کے پیچھے تین چیزیں آتی ہیں دو واپس چلی جاتی ہیں ایک میت کے ساتھ رہ جاتی ہے مردہ کے گھر والے مردہ کا مال اور مردہ کے اعمال یہ تین چیزیں پیچھے رہتی ہیں مال اور گھر والے تو لوٹ جاتے ہیں اور اعمال اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ رواہ البخاری۔

حضرت عیاض بن حمار مجاشعی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی کہ تم لوگ تواضع کرو، نہ کوئی کسی پر فخر کرے نہ کوئی کسی پر زیادتی۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو اپنے مردہ باپ دادوں پر فخر کرنے سے باز رہنا چاہئے وہ جہنم کا کوئلہ ہیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو اللہ کے نزدیک گوبر کے اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے جو گندگی کو اپنی سونڈھ سے لڑکاتا ہے اللہ نے تم سے جاہلیت کی حمیت اور باپ دادا پر جاہلیت کے زمانہ کی شیخی زائل کر دی آدمی یا پرہیزگار مومن ہے یا بد بخت فاجر سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے تھی۔ رواہ الترمذی وابو داؤد۔

حضرت عقبہؓ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے یہ نسب کسی پر برتری دینے والے نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو جیسے ایک صاع کی اونچائی دوسرے صاع کی طرح ہوتی ہے بغیر دین اور تقوی کے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ آدمی (کی برائی) کے لئے اتنا ہی بس ہے کہ وہ بد زبان فحش گو بخیل ہو۔ رواہ احمد والبیہقی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کا دن ہو گا تو اللہ ایک منادی کو یہ نداء دینے کا حکم دے گا سن لو میں نے ایک نسبت مقرر کی اور تم نے دوسری نسبت مقرر کی۔ میں نے تم میں سب سے عزت والا اسی کو قرار دیا جو سب سے بڑا متقی ہو مگر تم نے (اس کو ماننے سے) انکار کر دیا ہاں یہ کہنے لگے کہ فلاں بن فلاں فلاں بن فلاں سے افضل ہے پس آج میں اپنی قائم کردہ نسبت کو اونچا کرتا ہوں اور تمہارے نسب کو نیچے گراتا ہوں۔ متقی کہاں ہیں۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط۔

كَلَّا یہ تکاثر سے باز داشت ہے۔

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳ بتقاضائے سیاق عبارت تَعْلَمُوْنَ کا مفعول محذوف ہے یعنی آئندہ جب تم کو عذاب دیا جائے گا تو اس تفاخر و تکاثر کے برے انجام کو تم جان لو گے۔

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ وعید سابق کی تاکید مکرر وعید فرمائی یا پہلی وعید کے علاوہ دوسری وعید کی صراحت کی ثم (ترقی مرتبہ کے لئے آتا ہے اس لئے یہ بتا رہا ہے) کہ دوسری وعید پہلی دھمکی سے زیادہ سخت ہے بعض لوگوں نے کہا کہ پہلی وعید موت کے وقت یا قبر کے اندر عذاب ہونے کی ہے اور دوسری وعید قبر سے اٹھنے کے بعد عذاب کی۔ ابن جریر نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم عذاب قبر میں شک کرتے تھے یہاں تک کہ عذاب قبر کے متعلق اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ، كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تک نازل ہوئی (اور ہم کو عذاب قبر کا یقین ہو گیا)

كَلَّا یہ ممانعت تکاثر کی تاکید در تاکید ہے۔

لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵ یعنی اگر تم اپنے آگے آنے والی چیزوں کا علم یقین رکھتے یعنی تم کو ان کا یقینی علم ایسا ہوتا جیسا اپنے پاس موجودہ چیز کا ہوتا ہے اس کی جزا محذوف ہے یعنی تو یہ یقینی علم آخرت تم کو دوسری (بے ہودگیوں) سے روک دیتا ہے یا یا ہم کثرت مال و قبائل پر فخر نہیں کرتے چونکہ جزا کی عظمت شان دکھانی ہے اس لئے اس کو حذف کر دیا قتادہ نے کہا ہم آپس میں بیان کرتے تھے کہ علم الیقین سے مراد ہے اس بات کو جاننا کہ مرنے کے بعد اللہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا میں کہتا ہوں کہ علم الیقین ایمان بالغیب ہے جو استدلال سے حاصل ہوتا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝۶ یہ شرط مذکور کا جواب نہیں ہے کیونکہ (شرط تقدیری ہے اور) جزا تو بہر حال یقینی الوقوع ہے شرط پر موقوف نہیں علم الیقین ہو یا نہ ہو جحیم کی رؤیت تو ضرور ہو گی) بلکہ یہ قسم محذوف کا جواب ہے اور اس سے وعید عذاب کو پختہ کرنا مقصود ہے میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَوْ (شرطیہ) اِذَا (ظرفیہ) کے معنی میں ہو اور اس سے مراد موت کا وقت یعنی جب موت کے وقت آخرت کا تم کو یقینی علم حاصل ہو گا تو جحیم کو خود دیکھ لو گے مگر تلافی مافات کا وقت جا چکا ہو گا اس لئے اس وقت جاننا سود مند نہ ہو گا۔

رویت سے مراد جاننا پہچاننا اور ممکن ہے کہ رویت چشم مراد ہو اور رویت چشم قبروں میں ہو گی قبروں کے اندر کافروں کو صبح شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے آیت وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا یعنی پھر قبروں سے اٹھنے کے بعد تم اس کو دیکھ لو گے۔

عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ رویت اور معائنہ ہم معنی ہیں (اس لئے یہاں علم سے مراد ہے مشاہدہ) عین الیقین لترون کا مفعول مطلق ہے اگرچہ دونوں کا مادہ جدا جدا ہے مگر معنی ایک ہے اس تقریر سے رویت کو اس جگہ بمعنی علم قرار دینے کا قول دفع ہو گیا مطلب یہ ہے کہ تم آنکھوں سے ایسا معائنہ کرلو گے جو یقین کا موجب ہو گا یہی سبب ہے کہ رویت اور مشاہدہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو عین الیقین کہا جاتا ہے۔ رویت چشم حصول علم کا سب سے قوی ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شنیدہ دیدہ کی طرح نہیں ہوتا۔ خطیبؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حسن سند کے ساتھ حضرت انسؓ کی روایت سے اس حدیث کو لکھا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے حاکم نے اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ اس حدیث میں اتنا زائد بھی نقل کیا ہے کہ اللہ نے موسیٰ کو ان کی قوم کی اس حرکت کی اطلاع دی جو گوسالہ کے سلسلہ میں انہوں نے کی تھی موسیٰ نے (خبر پانے کے بعد بھی) توریت کی تختیاں (ہاتھ سے) نہ پھینکیں لیکن قوم کی حرکت کا جب خود مشاہدہ کرلیا تو غصہ میں تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔

بعض علماء نے کہا کہ عین الیقین کا موصوف محذوف ہے یعنی ایسی رویت جو بعینہ یقین ہے رویت کو بعینہ یقین قرار دینا بطور مبالغہ ہے۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝ پھر اس روز تم سے نعمت کی باز پرس کی جائے گی کہ تم نے نعمتوں کا شکر کیوں نہیں کیا اور ناشکری کیوں کی۔

ع ۱ ۸ ۲۷

بغوی نے کہا جن نعمتوں میں وہ تھے قیامت کے دن ان کے شکر کی باز پرس ان سے کی جائے گی مقاتل نے کہا کفار مکہ کو دنیا میں مال و متال حاصل تھا مگر انہوں نے نعمتیں دینے کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ دوسروں کی پوجا کی قیامت کے دن اللہ کا شکر نہ کرنے پر ان کو عذاب ہو گا۔

یہی قول حسن بصریؒ کا ہے اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی مرفوعاً یہی مروی ہے گویا آیت میں انہی کفار کو خطاب ہے جو تکاثر کی وجہ سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَتَرَوُنَّ سے آخر سورت تک سب لوگوں کو عمومی خطاب ہو جیسے آیت اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا میں ہے حدیث میں بھی آیا ہے کہ قبر کے اندر مومن کو اول وہ دوزخ والی جگہ دکھائی جاتی ہے جس کے عوض میں جنت والی جگہ اس کو عطا کی جاتی ہے تاکہ وہ زیادہ شکر گزار ہو۔

فائدہ: صرف اہل تکاثر سے نعمتوں کی باز پرس ہو گی یہ عبارت قرآن کی رفتار سے بھی معلوم ہو رہا ہے اور ایک تفسیری مطلب بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ کافر مومن ہر شخص سے سوال ہو گا اور نعمت کی باز پرس کی جائے گی۔

فائدہ: صرف اہل تکاثر سے نعمتوں کی باز پرس ہو گی یہ عبارتِ قرآن کی رفتار سے بھی معلوم ہو رہا ہے اور ایک تفسیری مطلب بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ کافر مومن ہر شخص سے سوال ہو گا اور نعمت کی باز پرس کی جائے گی۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا قول (اس آیت کی تشریح) میں آیا ہے امن اور صحت کی باز پرس ہو گی حضرت ابن عباسؓ نے بھی آیت کی تفسیر میں فرمایا آنکھ کان اور جسمانی صحت کے متعلق اللہ بندوں سے سوال کرے گا کہ کن مصارف میں انکو استعمال کیا۔ ابن ابی حاتم۔ اسی آیت کی تفسیر میں مجاہدؒ نے کہا کہ دنیا کی ہر لذت کا سوال ہو گا۔ فریابی اور ابو نعیم۔ قتادہ نے تفسیر آیت میں کہا اللہ نے جو بھی نعمت عطا فرمائی ہے اس کی باز پرس کرے گا عبد الرزاق حضرت ابو قلابہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ گھی اور شہد ملا کر میدہ کی روٹی کے ساتھ کھائیں گے۔ یا رسول اللہ ﷺ ہم سے کس نعمت کی باز پرس ہو گی (کھانے پینے کو صرف) پانی اور کھجوریں ہیں اور دشمن سامنے (لڑنے کو) موجود ہے اور تلواریں ہمارے کندھوں پر (آویختہ) ہیں فرمایا خوب سمجھ لو عنقریب ایسا ہو گا (یعنی نعمتیں ملیں گی) ترمذی۔

عکرمہؒ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم کو کون سی نعمت میسر ہے صرف جو کی روٹی اور وہ بھی آدھے پیٹ اللہ نے وحی بھیجی (کہ ان سے کہہ دو گرم ریت سے بچنے کے لئے) کیا تم جوتے نہیں بناتے اور کیا ٹھنڈا پانی نہیں پیتے۔ ابن ابی حاتم۔

حضرت علی نے فرمایا جو گیہوں کی روٹی کھاتا ہے اور (سردی گرمی سے بچنے کے لئے) اس کو سایہ میسر ہے اور صاف پانی پیتا ہے تو یہ ایسی نعمت ہے جس کی باز پرس ہو گی حاکم نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ ایک حدیث نقل کی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ کا حضرت ابو الہیثم کے مکان پر جانا اور وہاں کھجوریں اور گوشت کھانا اور پانی پینا مذکور ہے اسی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ یہی وہ نعیم ہے جس کے متعلق قیامت کے دن تم سے باز پرس ہو گی جب صحابہ نے تکبیر کہی تو فرمایا جب تم کو ایسی چیز مل جائے اور اپنے ہاتھوں سے روٹی کھانا شروع کرو تو بسم اللہ و علی برکتہ اللہ کہا کرو اور جب کھا چکو تو کہا کرو۔ الحمدالله الذی هو اشبعناواروانا و انعم علینا وافضل

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں اس قصہ کے ذیل میں اسی طرح مذکور ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا باہم علمی خیر خواہی کرو کوئی کسی سے علم کو نہ چھپائے۔ علمی خیانت مالی خیانت سے زیادہ سخت ہے اللہ تم سے اس کی باز پرس کرے گا۔ طبرانی واصبہانی۔ حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے سب سے اول بندہ سے سوال کیا جائے گا کہ جو کچھ تو جانتا تھا اس کے سلسلے میں تو نے کیا عمل کیا۔ احمد وابن المبارک۔

حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ بندہ سے جس طرح مال کے متعلق باز پرس ہو گی اسی طرح اس کے مرتبہ کے متعلق بھی ہو گی طبرانی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر ایک قدم بھی چلے گا تو اس سے پوچھا جائے گا کہ اس قدم اٹھانے سے تیرا مقصد کیا تھا۔ ابو نعیم۔

حضرت معاذؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ قیامت کے دن مومن سے اس کی تمام کوششوں کی باز پرس کی جائے گی یہاں تک کہ آنکھوں میں سرمہ لگانے کی بھی۔ ابو نعیم وابن ابی حاتم۔

حسن بصری کی مرفوع روایت ہے کہ بندہ جو خطبہ دے گا اللہ اس کے متعلق باز پرس کرے گا کہ کس مقصد سے ایسا کیا تھا یہ حدیث مرسل ہے۔ رواہ البیہقی۔

آیت میں لفظ ثُمَّ بتا رہا ہے کہ سوال نعمت جحیم کو دیکھنے کے بعد ہو گا۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ سوال نعمت پل صراط پر ہو گا اللہ نے فرمایا ہے وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ان کو روکو ان سے باز پرس کی جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کے قدم پل صراط سے نہیں ہٹیں گے جب تک اس سے چار باتوں کے متعلق باز پرس نہیں کر لی جائے گی۔

(۱) عمر کو کس کام میں ختم کیا (۲) جسم کو کس کام میں دبلا کیا (۳) علم کے مطابق کیا عمل کیا (۴) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ مسلم حضرت ابن مسعود کی روایت سے ترمذی اور ابن مردویہ نے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

قرطبی نے لکھا ہے کہ ان عمومی احکام سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے متعلق احادیث میں آ گیا ہے کہ وہ بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی میں طاقت نہیں کہ ہزار آیات روز پڑھ لیا کرے صحابہؓ نے عرض کیا ہزار آیات روز کون پڑھ سکتا ہے فرمایا کیا تم میں سے کوئی (روز) اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ الحاکم والبیہقی۔

(سورۃ التکاثر ختم ہوئی بعونہ ومنہ۔)

سورۃ العصر

یہ سورت مکی ہے اس میں ۳ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ ۝۱ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زمانہ کی قسم بعض علماء نے زمانہ کی قسم کھانے کی یہ وجہ بیان کی کہ غور کرنے والوں کے لئے زمانہ بڑا عبرت آگیں ہے ابن کیسانؒ نے کہا اَلْعَصْرِ سے مراد ہے رات دن۔ حسن بصریؒ نے کہا زوال سے غروب آفتاب تک اَلْعَصْرِ ہے قتادہ نے کہا دن کی آخری گھڑی العصر ہے۔ مقاتلؒ نے کہا نماز عصر مراد ہے یہی درمیانی نماز ہے ہم اس کا ذکر سورۂ بقر میں کر چکے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝۲ عموماً انسان بڑے گھاٹے میں ہیں خُسْرٍ میں تنوین مفید عظمت ہے۔ کیونکہ خسر کا معنی ہے اصل پونجی ضائع ہو جانا اور انسان اپنی جان اپنی عمر اور اپنا مال ایسے کاموں میں برباد کرتا ہے جو آخرت میں اس کے لئے بالکل سودمند نہ ہوں گے (اس لئے انسان بڑے گھاٹے میں ہے)

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے (یہ گھاٹے میں نہیں ہیں) کیونکہ انہوں نے فانی دنیا کے عوض لازوال آخرت خرید لی اس لئے ان کی تجارت نفع بخش ہوئی۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ اور باہم ایک نے دوسرے کو نیکی کی نصیحت کی۔ قتادہ اور حسن نے کہا اَلْحَقّ سے مراد قرآن ہے اور مقاتل نے کہا ایمان و توحید مراد ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳ اور باہم صبر کرنے کی نصیحت کی۔ یعنی بری باتوں سے اور ان خواہشات سے جو اللہ کو ناپسند ہیں نفس کو روکنے کی نصیحت کی۔

ع ۳ ۲۸

صَبْر سے مراد مطلق صبر ہے خواہ اطاعت اور مصائب پر صبر ہو یا بری باتوں کے ترک پر۔ پس اعمال صالحہ سے مراد یا تو عام اچھے کام ہیں (کچھ بھی ہوں اور حق و صبر کی نصیحت مخصوص طور پر ایک اچھا کام ہے) اس صورت میں تَوَاصَوْا کا عَمِلُوْا پر عطف ایسا ہوگا جیسے عام پر خاص کا عطف (خاص کی اہمیت کی وجہ سے) ہوتا ہے یا اعمال صالحہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کا کرنا موجب کمال (انسانیت) ہے اس وقت حق و صبر کی نصیحت بھی تکمیل نفس کا موجب ہوگی اور اس کے علاوہ تمام اعمال موجب خسران ہوں گے۔ ابراہیم کا قول مروی ہے کہ جب انسان بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کا نقصان ہو جاتا ہے (اعمال صالحہ نہیں کر سکتا اور اجر سے محروم ہو جاتا ہے) اور وہ پیچھے کو لوٹ جاتا ہے (آگے اعمال کی ترقی نہیں کر سکتا) ہاں مومن بوڑھا ہونے کے بعد بھی گھاٹے میں نہیں رہتا اس کے نامۂ اعمال میں وہی اعمال صالحہ لکھے جاتے ہیں جو صحت اور جوانی کے زمانہ میں کیا کرتا تھا پس یہ آیت بھی (معنوی اعتبار سے) آیت ذیل کی طرح ہو جائے گی لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

مسئلہ: بھلائی کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا واجب ہے اس کو ترک کرنے والا خاسر ہے حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس شخص کے سامنے کوئی برا (ممنوع شرعی) عمل آئے تو اس کو اپنے ہاتھ (کی قوت) سے بدل دے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے ہی روکے اتنی بھی طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے ہی (اس سے نفرت کرے)

اور یہ (درجہ (ضعیف ترین ایمان) کا ہے)۔ رواہ مسلم۔

بغوی نے شرح السنۃ میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ خواص کی بد اعمالی کا عذاب عوام پر نہیں ڈالتا۔ لیکن جب عوام کوئی برا کام اپنے سامنے ہوتا دیکھتے ہیں اور باوجود رد کرنے کی طاقت رکھنے کے رد نہیں کرتے تو اس وقت اللہ عوام خواص سب کو عمومی عذاب دیتا ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ کی مرفوع روایت سے بھی ابوداؤد اور ابن ماجہ نے یہی حدیث نقل کی ہے۔

ابوداؤد نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حدیث نقل کی ہے جس قوم کے درمیان گناہ کئے جاتے ہوں اور وہ بدلنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں مگر نہ بدلیں تو خوب سن لو عنقریب ان پر عمومی وبال آئے گا۔ اس موضوع کی بکثرت احادیث آئی ہے۔) (ہم نے چند ذکر کر دیں) واللہ اعلم

بعونہ ومنہ تعالیٰ

(سورۃ العصر ختم ہوئی)

سورۃ الھمزۃ

یہ سورت مکی ہے اس میں ۹ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝١ عیب چیں چغلخوروں کے لئے ویل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہُمَزَہ اور لُمَزَہ دونوں ہم معنی ہیں دونوں کا معنی ہے عیب چیں خوردہ گیر۔ یہ وہ لوگ جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں دوستوں میں پھوٹ پیدا کرادیتے ہیں اور بے داغ لوگوں کے عیوب کے طلب گار رہتے ہیں۔ مقاتل نے کہا ھمزہ رودررو عیب لگانے والا اور لمزہ پس پشت عیب بیان کرنے والا ابوالعالیہؒ اور حسن بصریؒ نے اس کے برعکس کہا ہے۔ سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ نے کہا ہُمَزَہ غیب کرنے والا آدمیوں کا گوشت کھانے والا اور لُمَزَہ لوگوں پر طنز کرنے والا نکتہ چیں۔

ابن زید نے کہا ہُمزہ وہ شخص جو ہاتھ کے اشارہ سے لوگوں کو مطعون کرے اور دکھ پہنچائے اور لُمزہ وہ شخص جو زبان سے نکتہ چینی کرے اور عیب بیان کرے سفیان ثوری نے کہا ہُمزہ زبان سے عیوب بیان کرنے والا اور لُمزہ آنکھ کے اشارہ سے عیب بیان کرنے والا۔ ابن کیسان نے کہا ہُمزہ وہ شخص جو اپنے ہم نشین کو اپنے الفاظ سے دکھ پہنچاتا ہو اور لُمزہ وہ شخص جو آنکھ یا سر یا ابرو کے اشارہ سے (کسی کے عیب) ظاہر کرتا ہو۔

میں کہتا ہوں اصل لغت میں ہُمزہ کا معنی ہے توڑنا اور چبھونا حدیث میں ہے اللھم انی اعوذبک من ھمزات الشیاطین الٰہی میں شیطانی کچوکوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور لُمزہ کا معنی ہے طعنہ زنی پھر استعمال میں دونوں کا معنی ہو گیا ایسا ذکر جس سے لوگوں کی آبرو کی شکست ہو اور ان پر طنز کیا جائے۔

هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ کا وزن (فعلۃ) خوگر بن جانے پر دلالت کر رہا ہے ضحکۃ شجرۃ لعھۃ ھمزۃ لمزۃ اسی شخص کو کہتے ہیں جو ان افعال کا خوگر اور عادی بن گیا ہو۔ حضرت عثمانؓ اور ابن عمرؓ نے کہا ہم برابر سنا کرتے تھے کہ وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ کا نزول ابی بن خلف کے بارہ میں ہوا تھا۔ ابن ابی حاتم۔

سدیؒ نے بیان کیا کہ اخنس بن شریق بن وہب ثقفی کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا ابن جریر نے رقہ کے باشندوں میں سے ایک شخص کے حوالہ سے بیان کیا کہ جمیل بن عامر کے حق میں اس کا نزول ہوا۔ ابن المنذر نے ابن اسحاق کے حوالہ سے بیان کیا کہ امیہ بن خلف جمحی نے رسول اللہ ﷺ کو عیب چینی اور طنز کے ساتھ دیکھا تھا اس کے بارہ میں یہ پوری سورت اللہ نے اتاری۔ مقاتل نے کہا کہ ولید بن مغیرہ رسول اللہ ﷺ کی غیبت آپ ﷺ کے پیچھے کرتا اور رودررو طنز کرتا تھا اس کے متعلق اس سورت کا نزول ہوا۔

اگر آیت کا نزول کسی خاص شخص کے حق میں بھی ہو تب بھی حکم میں عموم رہے گا جو شخص عیوب مذکورہ کا حامل ہو اس کے لئے یہی حکم ہے۔

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝٢ جس نے مال جوڑا اور گن گن کر رکھ چھوڑا یا آئندہ مصائب کو دور کرنے کے لئے ذخیرہ بنا رکھا۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝۳ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال دنیا میں اس کو ہمیشہ رکھے گا وہ دولتمند ہونے کی وجہ سے کبھی نہیں مرے گا گویا اس کا یہ خیال ہے کہ نادار بھوک سے مر جائے گا اور مالدار کبھی نہیں مرے گا۔ اس کلام کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے کیونکہ کسی مالدار کا بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ کبھی نہیں مرے گا بلکہ بطور کنایہ اس شخص کی مال سے محبت طولانی امید اور موت سے غافل رہنے کا اظہار کیا گیا ہے۔ یا یہ کلام بطور تعریض ہے کہ حقیقت میں دوامی زندگی عطا کرنے والا تو ایمان اور عمل صالح ہے مال سے دوامی زندگی حاصل نہیں ہوگی۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چوکور لکیر کھینچی اور مربع خط کے درمیان باہر کو نکلتی ہوئی ایک لکیر اور کھینچی اور اس وسطی لکیر کی جانب دونوں طرف سے آتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکیریں متعدد بنا دیں اور فرمایا یہ (وسطی لکیر) انسان ہے اور باہر کو نکلا ہوا حصہ انسان کی آرزو ہے اور یہ چھوٹی لکیریں انسانی اغراض ہیں اب اگر ایک (طرف والی) لکیر سے بچ جاتا ہے تو دوسری طرف والی لکیر اس کو نوچتی ہے اور اس سے بچ جاتا ہے تو یہ نوچتی ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چند خطوط کھینچے اور فرمایا یہ آرزو ہے اور یہ انسان کی موت ہے آدمی اسی حالت میں ہوتا ہے کہ اچانک قریب والا خط (یعنی خط موت) اس پر آ پہنچتا ہے رواہ البخاری۔

كَلَّا امور شنیعہ مذکورہ یعنی خوردہ گیری، غیبت، مال کی محبت اور طول آرزو سے یہ بازداشت ہے (مطلب یہ کہ اسکو ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے)۔

لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ یہ قسم محذوف کا جواب ہے اور یہ بھی درست ہے کہ کَلَّا بمعنی حقا ہو (یعنی بازداشت کے لئے نہ ہو) اور معنی قسم کے لئے مفید ہو اس وقت جملہ مذکورہ اسم قسم کا جواب ہوگا۔ حُطَمَة جهنم کا نام ہے (حطم توڑ دینا شکستہ کر دینا) جہنم کے اندر جو چیز ڈالی جائے گی۔ جہنم کی آگ اس کو توڑ مروڑ دے گی اسی وجہ سے اس کا نام حُطَمة ہوا۔ یعنی اس کو حُطَمَہ کے اندر ضرور پھینکا جائے گا۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ جہنم کی ہولناکی ظاہر کرنا مقصود ہے استفہام سوالیہ نہیں ہے۔ پورا جملہ معترضہ جہنم کی عظمت شان ان کو بتانے کے لئے ذکر کیا گیا مطلب یہ کہ تم جہنم کی شدت کو نہیں جانتے اس کی شدت ناقابل تصور ہے۔ اس ابہام کے بعد آئندہ خود ہی توضیح فرما دی۔

نَارُ اللّٰهِ وہ اللہ کی آگ ہے اللہ کی طرف نار کی نسبت نار کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے کیونکہ اس سے اللہ کے قہر کا ظہور ہوتا ہے نعوذ بالله منہا۔ اللہ کی تمام صفات خواہ جلالی ہوں یا جمالی۔ کمال کی اس چوٹی پر پہنچی ہوئی ہیں کہ نہ اس کا اندازہ دماغ کو ہو سکتا ہے نہ اس سے زیادہ کا تصور ممکن ہے۔

الْمُوْقَدَةُ ۝۶ یہ آگ کی صفت ہے یعنی وہ آگ بھڑکائی گئی ہے (فاعل مذکور نہیں کیونکہ اگر فاعل متعین ہو اور فعل ایک ہی فاعل سے مخصوص ہو تو فاعل کو مبہم رکھنا اور ذکر نہ کرنا فعل کی عظمت پر دلالت کرتا ہے) مطلب یہ کہ سوائے خدا کے اس کو بھڑکانے والا کوئی دوسرا نہیں اور خدا کی لگائی کو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہزار برس تک آگ بھڑکائی گئی یہاں تک کہ سرخ ہوگئی پھر ہزار برس تک بھڑکانے کے بعد سفید ہوگئی پھر ہزار برس تک بھڑکائی گئی تو سیاہ ہوگئی اب وہ سیاہ تاریک ہے۔ ترمذی۔

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ یعنی وہ آگ دلوں تک پہنچے گی اطلاع اور بلوغ پہنچنا ہم معنی ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے اطلعت ارضنا تو ہماری زمین تک پہنچ گیا۔ ابن مبارک نے اپنی سند سے خالد بن عمران کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ دوزخ والوں کو کھالے گی یہاں تک کہ جب دل تک پہنچ جائے گی تو رک جائے گی پھر وہ آدمی دوبارہ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا پھر آگ اس کو لے گی اور دل تک پہنچے گی۔ یہی حالت اس کی ہوتی رہے گی۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ کا یہی مطلب ہے۔ قرطبی اور کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں دل کا اس جگہ تذکرہ

(چند وجوہ کے تحت کیا گیا ہے) (۱) اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ عذاب کا دوام معلوم ہو جائے کیونکہ دنیوی آگ جب کسی کو جلاتی ہے تو دل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتی ہے۔ بخلاف آتش جہنم کے (کہ وہ دل تک پہنچنے کے بعد بھی ہلاک نہیں کرے گی اور سوزش کا عذاب ہمیشہ ہوتا رہے گا (۲) یا دل کو ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ سارے بدن میں دل سب سے زیادہ لطیف اور الم پذیر ہے (۳) یا یہ وجہ کہ غلط عقائد کا محل اور برے اعمال کا سر چشمہ قلب ہی ہے گویا یہی آتش جہنم کی پیدائش گاہ ہے۔

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸ عَلَيْهِمْ کا تعلق مُؤْصَدَة سے ہے اور جمع غائب کی ضمیر اس لئے ذکر کی کہ لفظ کل معنوی حیثیت سے جمع ہے۔ یہ پورا جملہ مستانفہ ہے سوال ہو سکتا ہے کہ دوزخی دوزخ سے کیوں نہیں نکلیں گے، اور کیوں نہ بھاگ سکیں گے۔

اس سوال کے جواب میں فرمایا دوزخ (اوپر سے) بند ہوگی۔ مُؤْصَدَة کا ترجمہ مطبقہ ہے۔ ابن مردویہؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ اوصدہ الباب میں نے دروازہ بند کر دیا۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب دوزخ کے اندر صرف دوامی دوزخی رہ جائیں گے تو ان کو لوہے کے صندوقوں میں بند کر دیا جائے گا اور صندوقوں میں لوہے کی کیلیں ٹھوک دی جائیں گی پھر ان صندوقوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر کے جحیم کی تہ میں پھینک دیا جائے گا اور کوئی دوسرے کے عذاب کو نہ دیکھ سکے گا۔ ابو نعیم اور بیہقی نے حضرت سوید بن غفلہ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹ یعنی ان کو لمبے ستونوں کے اندر جکڑ دیا جائے گا۔

اس ترجمہ پر فِيْ عَمَدٍ کا تعلق مُوْثَقِيْنَ محذوف سے ہوگا یہ بھی ممکن ہے کہ مُؤْصَدَة سے متعلق قرار دیا جائے اس وقت آگ ستونوں کے اندر ہوگی۔

عَمَد عمود کی جمع ہے جیسے ادم اور ادم ادیم کی جمع ہے یہ قول فراء کا ہے ابو عبیدہ نے عماد کی جمع کہا ہے جیسے اہاب کی جمع اهب ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ ان کو ستونوں میں داخل کرے گا پھر ان پر ایک ستون تانا جائے گا اور ان کی گردنوں میں زنجیریں پڑی ہوں گی اور اوپر سے ایک ستون کے ذریعہ سے ان پر دروازے مسدود کر دیئے جائیں گے۔ قتادہ نے کہا ہم کو اطلاع ملی ہے کہ ان ستونوں کے ذریعہ سے دوزخ میں ان کو عذاب دیا جائے گا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ عمد ان کواڑوں کی کیلیں ہوں گی جو دوزخیوں کو اندر کر کے بند کر دیئے جائیں گے۔

مقاتل نے کہا دوزخیوں کو اندر کر کے ان پر دروازے بند کر دیئے جائیں گے پھر ان میں
آگ کی آہنی کیلیں ٹھوک دی جائیں گی۔ دروازہ مضبوط کر دیا جائے گا
اور کوئی ان کے پاس داخل نہ ہو سکے گا۔ مُمَدَّدَة لمبے
اس لمبائی کی وجہ سے وہ زیادہ جمے
ہوئے ہوں گے۔ واللہ اعلم۔
سورۃ الہمزہ ختم ہوئی۔
بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ الفیل

یہ سورت مکی ہے اس میں ۹ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَمْ تَرَ رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے اور استفہام انکاری مفید تقریر ہے۔ کیونکہ نفی کی نفی اثبات ہوتی ہے یعنی اے محمد ﷺ آپ ﷺ نے دیکھ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ اصحاب فیل کا واقعہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے آثار دیکھے تھے اور متواتر خبریں سنی تھیں تو گویا دیکھ ہی لیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رویت سے مراد علم ہو کیا تم نے نہیں دیکھا یعنی کیا تم کو نہیں معلوم۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دیکھ لیں کہ ان کے دشمنوں کے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو اصحاب فیل کے ساتھ کیا گیا۔

كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ یہ تعجب آگیں استفہام ہے اسی لئے مَا فَعَلَ کی جگہ كَيْفَ فَعَلَ فرمایا اس قصہ کو بیان کرنے سے مقصود ہے ان امور کو یاد دلانا جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں اس سے اللہ کے علم وقدرت کا کمال بیت اللہ کی عزت اور اللہ کے نبی کا شرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ واقعہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تمہید اور آپ ﷺ کی بعثت کا پیش خیمہ تھا ورنہ بقول ابو نعیم ظاہر ہے کہ اصحاب فیل عیسائی تھے اور اہل مکہ بت پرست اور بت پرستوں کے مذہب سے دین نصاریٰ بہتر ہی تھا (مکہ والوں کی حفاظت اور اصحاب فیل کی تباہی اگر نبوت سید المرسلین کی تمہید اور بیت اللہ کے شرف کا اظہار نہ تھا تو اور کیا تھا اور کیوں ہوا)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ واقعہ فیل ۲۲ محرم کو اتوار کے دن ہوا۔ بعض علماء نے......اس کو متفق علیہ قول قرار دیا ہے اور اس کے خلاف ہر قول کو وہم کہا ہے اسی سال واقعہ فیل سے تقریباً دو ماہ بعد ربیع الاول کے مہینہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی اکثر علماء اسلام کا یہی قول ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے مقاتل نے چالیس سال بعد کسی نے تیس سال بعد کسی نے ستر سال بعد اور کلبی نے ۲۳ سال بعد کہا ہے لیکن صحیح ترین قول اول ہی ہے۔ خلاصۃ السیر۔

بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اصحاب الفیل سے مراد ہیں ابرہہ شاہ یمن اور اس کے ساتھی۔

ضحاک نے کہا آٹھ ہاتھی تھے بعض نے کہا سب سے بڑے ہاتھی کا نام محمود تھا محمود کے علاوہ بارہ ہاتھی تھے۔ الفیل کو مفرد ذکر کیا (باوجود یہ کہ اصحاب صیغہ جمع ہے) کیونکہ اسی بڑے ہاتھی کی طرف سب کی نسبت کرنی مقصود ہے۔ بعض نے کہا کہ مقطع آیات کے توافق کے لئے ایسا کیا۔

محمد بن اسحاقؒ نے بروایت سعید بن جبیر و عکرمہ از ابن عباسؓ بیان کیا اور واقدی نے بھی اسی طرح ذکر کیا کہ نجاشی شاہ حبش نے ارباط (سپہ سالار) کو یمن پر فوج کشی کے لئے بھیجا ارباط نے جاکر یمن پر تسلط قائم کر لیا ابرہہ بن الصباح حبشی ایک فوجی سردار تھا اس کو ارباط کی سیادت پر حسد ہوا اور اس نے بغاوت کردی اس طرح حبشیوں میں پھوٹ پڑ گئی ایک گروہ ارباط کے ساتھ اور دوسرا ابرہہ کے ساتھ ہو گیا۔ دونوں کا ٹکراؤ ہوا ابرہہ نے ارباط کو قتل کر دیا۔ حبشیوں نے ابرہہ کو سردار بنا لیا اور ابرہہ کا یمن پر تسلط ہو گیا پھر ابرہہ نے دیکھا کہ حج کے زمانہ میں لوگ مکہ کو جانے کی تیاری کر رہے ہیں اس حسد میں اس نے صنعاء میں ایک گرجا بنایا اور نجاشی کو لکھا کہ میں نے صنعاء میں ایک کنیسہ بنایا ہے جس کی مثال کسی بادشاہ کے لئے نہیں بنائی گئی آپ اس گرجا میں تشریف لے آئیں تاکہ میں مکہ کے حج سے لوگوں کا رخ موڑ دوں یہ بات بنی کنانہ کے ایک شخص نے سن پائی اور رات کو نکل کر

جا کر گرجا میں بیٹھ گیا اور موقع پا کر گرجا کے اصل قبلہ کو گندگی آلود کر دیا ابرہہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں جا کر کعبہ کو ڈھادوں گا اور نجاشی کو اس واقعہ کی اطلاع بھیج دی اور درخواست کی کہ مجھے کچھ ہاتھی بھیج دیئے جائیں نجاشی نے اس کو ہاتھی بھیج دیئے۔ جن میں ایک بہت ہی بڑا طاقتور ہاتھی بھی تھا جس کا نام محمود تھا ابرہہ مکہ کی طرف چل دیا عرب نے یہ خبر سنی تو ان پر شاق گزری انہوں نے ابرہہ سے مقابلہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ یمن کے راجاؤں میں سے ایک راجہ تھا جس کا نام ذونفر تھا وہ لڑنے کے لئے نکلا مگر ابرہہ نے اس کو شکست دے دی اور گرفتار کر لیا قتل نہیں کیا بلکہ جکڑ دیا اور آگے بڑھا قبائل خثعم کی آبادی کے قریب پہنچا توفیل بن حبیب خثعمی بنی خثعم کو لے کر مقابلہ کے لئے نکلا دوسرے قبائل یمن بھی اس سے آکر مل گئے اور لڑائی ہوئی نفیل گرفتار کر لیا گیا نفیل نے ابرہہ سے کہا۔ بادشاہ میں زمین عرب کے راستوں سے خوب واقف ہوں ابرہہ نے رہنمائی کے لئے اس کو ساتھ لے لیا۔ طائف کی طرف سے گزرا تو مسعود بن مغیث ثقفی بنی ثقیف کے کچھ آدمیوں کو لے کر آیا اور بولا بادشاہ ہم آپ کے غلام ہیں ہماری طرف سے آپ کی کوئی مخالفت نہ ہوگی آپ اس مکان (کو ڈھانے) کے ارادہ سے نکلے ہیں جو مکہ میں ہے ہم آپ کے ساتھ ایک راہنما بھیج دیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے غلام ابورغال کو رہنمائی کے لئے بھیج دیا۔ ابورغال کی رہنمائی میں ابرہہ آگے بڑھا۔ جب مغمس میں پہنچا تو ابورغال مر گیا۔ یہ وہی شخص ہے جس کی قبر پر پتھر مارے جاتے ہیں ابرہہ نے مغمس سے ایک حبشی کو جس کا نام اسود تھا اس غرض سے بھیجا کہ وہ حرم کا مال (یعنی اونٹ وغیرہ) ہنکا لائے۔ اسود نے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ پکڑ لئے پھر ابرہہ نے حناطہ حمیری کو مکہ والوں کے پاس اس غرض کے لئے بھیجا کہ سردار مکہ کو تلاش کر کے یہ پیام پہنچا دے کہ میں لڑنے کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں قاصد چل کر مکہ میں پہنچا اور عبدالمطلب سے ملاقات کی اور ابرہہ کا پیام ان سے کہہ دیا۔ عبدالمطلب نے کہا ہم بھی اس سے لڑنا نہیں چاہتے ہم اس گھر تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے یہ اللہ کا حرمت والا گھر ہے اور خلیل کا بنایا ہوا ہے چونکہ اللہ کا گھر اور حرم ہے اسی لئے وہی اس کی حفاظت کرے گا اگر ابرہہ کو اس گھر سے خدا نہیں روکے گا تو خدا کی قسم ہم میں تو اس کی قوت نہیں ہے۔

اس کے بعد عبدالمطلب اپنے اونٹ مانگنے کے لئے ابرہہ کے فوجی کیمپ میں گئے ذونفر چونکہ عبدالمطلب کا دوست تھا اس لئے اس کے پاس پہنچے ذونفر نے کہا میں تو قیدی ہوں انیس ایک شخص ہے جو میرا دوست ہے اور ہاتھیوں کا داروغہ ہے میں تم کو اس کے پاس بھیج دوں گا پھر ذونفر نے انیس کو (بلوا کر) کہا یہ قریش کے سردار ہیں اور مکہ والے اونٹوں کے مالک ہیں یہ پہاڑوں کے نیچے تو آدمیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور پہاڑوں کے اوپر جنگلی جانوروں کو بھی ان کی خوراک دیتے ہیں بادشاہ کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں لیکن نہ یہ لڑنے والے ہیں نہ تمہاری مخالفت کرنے والے۔

انیس نے جا کر پیغام پہنچا دیا بادشاہ نے داخلہ کی اجازت دے دی عبدالمطلب قد آور اور حسین آدمی تھے ابرہہ نے ان کو دیکھ کر تعظیم تکریم کی اور خود تخت پر بیٹھنا ان کو نیچے بٹھانا مناسب نہ سمجھا اس لئے خود بھی تخت سے اتر کر ان کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا اور ترجمان کی معرفت آنے کی غرض پوچھی۔ عبدالمطلب نے کہا میری غرض دو سو اونٹوں کی واپسی ہے ابرہہ نے کہا جب میں نے تم کو دیکھا تھا تو مجھے تم بہت بھلے معلوم ہوئے تھے مگر اب تم میری نظر سے گر گئے۔ میں تو کعبہ کو ڈھانے آیا ہوں

جو تمہارا ابھی دین ہے اور تمہارے باپ دادا کا بھی اور تمہارے لئے شرف و عزت بھی۔ تم نے اس کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور دو سو اونٹ جو میں نے لے لئے ان کے متعلق مجھ سے گفتگو کر رہے ہو عبدالمطلب نے کہا ان اونٹوں کا مالک میں ہوں اور اس گھر کا مالک کوئی اور ہے جو خود اس کی حفاظت کر لے گا۔ ابرہہ نے کہا وہ مجھ سے اس کو نہیں بچا سکتا۔

ابرہہ نے اونٹ عبدالمطلب کو دے دیئے اور عبدالمطلب نے واپس آکر قریش کو واقعہ بتا دیا اور حکم دیا کہ سب لوگ گھاٹیوں میں منتشر ہو جائیں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنی حفاظت کر لیں تا کہ حبشی ان کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں۔

پھر خود جا کر کعبہ کے دروازہ کی زنجیر پکڑ کر کہنے لگے (ترجمہ اشعار) پروردگار تیرے سوا ان کے مقابلہ میں کسی سے امید

نہیں رکھتا پروردگار اپنے حرم کو ان سے محفوظ رکھ۔ اس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے اپنی بستی کو اجاڑنے سے ان کو روک دے۔ یہ اشعار بھی عبدالمطلب نے پڑھے۔ (ترجمہ)

اے اللہ! بندہ اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے تو اپنا سامان محفوظ رکھ صلیب کے طرف داروں اور پرستاروں کے خلاف اپنے پرستاروں کی مدد کر ان کی صلیب اور چال تیری تدبیر پر غالب نہ آنا چاہیئے۔ تیرے خادموں کو گرفتار کرنے کیلئے اپنے ملک کے سیال لشکر اور ہاتھیوں کو کھینچ کر لائے ہیں انہوں نے اپنی چال کے ساتھ نادانی کی وجہ سے تیرے حرم (کو تباہ کرنے) کا ارادہ کیا ہے اور تیرے جلال کا خوف نہیں کیا اگر تو ان کو اور ہمارے کعبہ کو یوں ہی چھوڑ دینے والا ہے تو پھر جو تیری مرضی ہو وہی کر۔

یہ مناجات کر کے کعبہ کی زنجیر چھوڑ دی اور اپنی قوم کے ساتھ سرداروں کے پاس چلے گئے صبح کو ابرہہ نے مغمس میں مکہ میں داخل ہونے کی تیاری کی اور لشکر کو ہاتھیوں سمیت تیار کیا۔ ایک ہاتھی تھا کہ جسامت اور قوت میں اس کو نظیر دیکھنے میں نہیں کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ بارہ ہاتھی اور بھی تھے۔ نفیل بڑے ہاتھی کے پاس آیا اور اس کا کان پکڑ کر کہا محمود بیٹھ جا اور جہاں سے آیا ہے سیدھا ادھر ہی واپس چلا جا کیونکہ تو اللہ کے حرمت والے شہر میں ہے۔ ہاتھی بیٹھ گیا پھر لوگوں نے اس کو ہر چند اٹھایا لیکن وہ نہیں اٹھا لوگوں نے اس۔ کے سر پر کدال مارے مگر وہ جب بھی نہ اٹھا آخر آنکڑے اس کی آنکھوں کے نیچے چبھوئے اور ڈرا کر اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھا (یعنی اس نے قدم نہ اٹھایا) آخر اس کا رخ یمن کی طرف کر دیا تو فوراً اٹھ گیا اور تیزی سے چلنے لگا پھر شام کی طرف کر دیا گیا تب بھی اس نے ایسا ہی کیا (تیزی سے چلتا رہا) پھر مشرق کی طرف اس کا رخ پھیرا تب بھی اس نے ایسا ہی کیا (تیزی سے چلتا رہا) آخر میں اس کا رخ مکہ کی طرف کیا تو وہ کھڑا بھی نہ رہ سکا (بیٹھ گیا) نفیل دوڑتا ہوا پہاڑ پر چڑھ گیا اور اللہ نے سمندر کی طرف سے ابابیلوں جیسے کچھ پرندے بھیجے۔ ہر پرندہ کے پاس تین پتھر تھے دو دونوں پنجوں میں اور ایک چونچ میں پتھر چنے اور مسور کی برابر تھے جب پرندے ان لوگوں پر پہنچ کر چھا گئے تو انہوں نے پتھریاں چھوڑ دیں جس شخص کے پتھری لگی وہ ہلاک ہو گیا لیکن سب قوم ہلاک نہیں ہوئی فوج والے نکل کر اندھا دھند بھاگے اور راستہ نہ ملنے کی وجہ سے نفیل کو تلاش کرنے لگے تاکہ وہ یمن کے راستہ پر لگا دے نفیل کسی پہاڑی پر سے ان کو دیکھتا رہا غرض لوگ اضطرابی حرکت کے ساتھ ہر راستہ پر گرتے پڑتے اور ہر چشمہ پر ہلاک ہوتے چل دیئے صحیح راستہ پر کوئی نہیں پڑا۔

اللہ نے ابرہہ کو ایک جسمانی روگ میں مبتلا کر دیا اس کی انگلیوں کے پورے گرنے لگے اور جو پور اگر تا تھا اس سے کچ لہو اور خون بہتا تھا آخر پرندہ کے چوزہ کی طرح ہو کر وہ صنعا پہنچا۔ کچھ ساتھی بھی اس کے ساتھ پہنچ گئے آخر آگے کی طرف سے جب اس کا سینہ شق ہو گیا تو مر گیا۔

واقدی نے لکھا ہے کہ نجاشی کے ہاتھی محمود نے حرم کے خلاف جرأت نہیں کی تھی وہ بچ گیا اور دوسرے ہاتھی جنہوں نے اقدام کیا تھا ان کے پتھر لگے۔

مقاتل بن سلیمان نے اصحاب فیل کے چڑھائی کرنے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ کچھ قریشی تاجر نجاشی کے ملک میں گئے اور ساحل سمندر کے قریب پہنچے اور عیسائیوں کے گرجا کے پاس اترے گرجا کو وہ ہیکل کہتے تھے وہاں انہوں نے آگ جلا کر کچھ (گوشت وغیرہ) بھونا پھر آگ کو یونہی چھوڑ کر چل دیئے ہوا تیز چل رہی تھی آندھی کی وجہ سے ہیکل نے آگ پکڑ لی اس کی فریاد نجاشی کے پاس پہنچی گرجا جلنے کا اس کو بڑا افسوس ہوا اور غضب ناک ہو کر کعبہ کو ڈھادینے کے لئے اس نے ابرہہ کو بھیجا۔

اس زمانہ میں سعید ثقفی نابینا مکہ ہی میں تھا یہ شخص گرمی کا زمانہ طائف میں اور سردی کا زمانہ مکہ میں بسر کرتا تھا اور تھا بڑا دانشمند بزرگ اس کی رائے سے تمام امور درست ہو جاتے تھے اور عبدالمطلب کا دوست تھا۔ عبدالمطلب نے اس سے کہا آج تمہاری رائے کی ضرورت ہے بتاؤ کیا رائے ہے (سعید یعنی) ابو مسعود نے کہا تم مجھ کو لے کر حراء پر چڑھ جاؤ پھر ابو مسعود نے عبدالمطلب کو مشورہ دیا کہ سو اونٹ لے کر ان کی گردنوں میں جوتوں کا قلادہ (نذر الٰہی کی علامت) ڈال کر اللہ کے نام پر حرم میں بھجوا دو شاید کوئی حبشی کسی اونٹ کو پکڑ کر ذبح کر لے اور اس گھر کا ایک مالک غضب ناک ہو جائے اور ان کی پکڑ کر لے۔

عبد المطلب نے مشورہ پر عمل کیا۔ ان لوگوں نے ان اونٹوں کو پکڑ کر کسی پر لدان کیا اور کسی کو کھانے کے لئے ذبح کر لیا۔ عبد المطلب اس کے بعد دعاء کرنے لگے اور ابو مسعود نے کہا اس گھر کا مالک خود اس کی حفاظت کرے گا۔

تبع شاہ یمن (تبع یمن کے ہر بادشاہ کا لقب تھا) بیت اللہ کے صحن میں داخل ہو کر عمارت کو ڈھانے کا ارادہ کر چکا تھا مگر اللہ نے اس کو روک دیا اور مصیبت میں مبتلا کر دیا تین روز تک اس پر اندھیرا چھلیا رہا۔ جب تبع نے یہ مصیبت دیکھی تو کعبہ پر مصری سفید ریشم کا غلاف چڑھایا اور تعظیم کی اور بطور نذر اونٹ کی قربانی کی۔ ادھر ابو مسعود نے سمندر کی طرف جو آنکھ اٹھائی تو اس کو کچھ محسوس ہوا اس نے عبد المطلب سے کہا سمندر کی طرف تو دیکھ عبد المطلب نے دیکھا اور بولے مجھے تو سفید پرندے نظر آرہے ہیں جو سمندر کے کنارہ سے اٹھے ہیں ابو مسعود نے کہا ذرا نظر اٹھا کر دیکھو ان کی قرار گاہ کہاں ہے۔ عبد المطلب نے کہا یہ ہمارے سروں پر چکر کاٹ رہے ہیں ابو مسعود نے کہا کیا تم ان کو پہچانتے ہو۔ عبد المطلب نے کہا خدا کی قسم میں ان کو نہیں پہچانتا نہ یہ نجدی ہیں نہ تہامی نہ عربی نہ شامی۔ ابو مسعود نے کہا کتنے ہیں عبد المطلب نے کہا شہد کی مکھیوں کی طرح بے گنتی ہیں ہر ایک کی چونچ میں ٹھیکری کی طرح پتھری ہے رات کی طرح آرہے ہیں ہر پرندہ کی چونچ سرخ سر سیاہ اور گردن لمبی ہے اور ایک لیڈر سب کا قائد ہے جو سب سے آگے اور سب اس کے پیچھے آرہے ہیں۔

غرض پرندے آگئے اور لشکر کی سیدھ میں سروں پر آکر رک گئے۔ جب لوگ اکٹھے ہو گئے تو پرندوں نے اپنی چونچوں سے پتھر نیچے کو گرا دیئے۔ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس پر اس کو گرایا گیا پھر جدھر سے آئے تھے اسی طرح لوٹ کو چلے گئے۔

ابو مسعود اور عبد المطلب صبح کو جب پہاڑ کی چوٹی سے اترے اور ایک ٹیلے پر چلے تو ان کو کسی کی آہٹ بھی محسوس نہیں ہوئی ایک اور ٹیلہ پر گئے تو وہاں سے کوئی آہٹ نہیں سنی کہنے لگے یہ لوگ رات کو نہیں سوئے ہوں گے اس لئے صبح کو سو رہے ہیں لیکن جب فوجی کیمپ کے قریب پہنچے تو سب کو مردہ پایا جس شخص کے خود پر پتھر گرتا تھا خود کو پھاڑ کر دماغ میں اتر جاتا تھا یہاں تک کہ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے اندر بھی گھس کر زمین پر پہنچتا اور زمین کے اندر داخل ہو جاتا تھا عبد المطلب نے انہی کا پھاوڑا لے کر زمین میں بہت گہرا گڑھا کھودا اور (ابرہہ کی فوج کے) زر و جواہر اس میں بھر دیئے اور دوسرا گڑھا اپنے ساتھی کے لئے کھود کر اس کو بھی بھر دیا اور ساتھی سے کہا اگر تم چاہو تو میرا گڑھا لے لو چاہو اپنا لے لو اور چاہو تو دونوں لے لو ابو مسعود نے کہا تم اپنے لئے جو چاہو پسند کر لو۔ عبد المطلب نے کہا میں نے اپنے گڑھے میں سب سے اچھا سامان بھرنے میں کمی نہیں کی تھی مگر اب وہ تمہارا ہے الحاصل دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے گڑھے پر بیٹھ گیا پھر عبد المطلب نے آواز دے کر لوگوں کو واپس بلایا اور لوگوں نے واپس آکر بقیہ مال پر قبضہ کر لیا اور کل مال اٹھا بھی نہ سکے۔ اسی مال کی وجہ سے عبد المطلب قریش کے سردار ہو گئے اور قریش نے اپنی قیادت ان کے سپرد کر دی۔ ابو مسعود اور عبد المطلب ہمیشہ اپنے اپنے گھروں میں اسی مال کے سبب خوش حال رہے اور اللہ نے اصحاب فیل کو کعبہ سے دفع کر دیا۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ استفہام انکاری ہے (جو مفید ثبوت ہے) كَيْدَ سے مراد اصحاب فیل کی وہ چال اور کوشش جو کعبہ کو ڈھانے کے لئے انہوں نے کی تھی۔

فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ ناکام، بے کار۔ باطل یعنی کیا اللہ نے ان کی چال بے کار اور ناکام نہیں کر دی۔

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ اس کا عطف اَلَمْ يَجْعَلْ پر ہے کیونکہ اَلَمْ يَجْعَلْ کا معنی جَعَلَ ہے (اس لئے خبر کا عطف خبر پر ہو گیا۔

طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ اَبَابِيْلَ طَيْرًا کی صفت ہے یعنی کثیر پرندے جھنڈ کے جھنڈ ایک ٹکڑی دوسرے کے پیچھے آنے والی۔

عرب کہتے ہیں جائت الخیل ابا بیلا گھوڑے یا سوار ادھر ادھر سے آئے۔ ابو عبیدہؒ نے کہا اَبَابِيْل اِبَالَة کی جمع ہے ابالۃ کا معنی ہے کسی چیز کا بڑا گٹھا پرندوں کی جماعت میں ہر پرندہ دوسرے سے چسپاں تھا اسی حسپیدگی کی وجہ سے ان کو ابابیل

فرمایا۔ فراء نے کہا ابابیل ایسی جمع ہے جس کا واحد اس مادہ سے نہیں آتا۔ کسائی کا قول ہے کہ ابابیل ابول کی جمع ہے جیسے عجا جیل عجول کی۔ بعض نے ابل کی جمع قرار دی ہے۔

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ ۝ یہ بھی طَيْرًا کی صفت ہے یعنی وہ پرندے اصحاب فیل پر کنکر والے پتھر مار رہے تھے۔ سِجِّيل وہ مٹی جو پتھر بن جائے یہ لفظ سنگ گل کا معرب ہے۔ بعض کے نزدیک سجل سے بنا ہے اور سجل کا معنی ہے بڑا ڈول۔ بعض نے اس کو السجل سے مشتق مانا ہے (رجسٹر ڈمہری) یعنی اصحاب فیل پر برسنے والے پتھر مجملہ اس عذاب کے تھے جو ان کے لئے لکھ دیا گیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان پرندوں کی چونچیں پرندوں کی طرح اور پنجے کتوں کے پنجوں کی طرح تھے۔ سعید بن جبیر نے کہا وہ پرندے سبز تھے اور چونچیں زرد تھیں۔ قتادہ نے کہا۔ وہ سیاہ تھے جو جھنڈ در جھنڈ ہو کر سمندر کی طرف سے آئے تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے ہر پتھر پر ایک پرچہ اس شخص کے نام کا چسپاں تھا جس پر اس کو گرنا تھا اللہ نے پتھر دے کر ان پرندوں کو بھیجا تھا پرندوں نے بڑی زور سے پتھر مارے جس شخص پر پتھر گرا پار نکل گیا سر پر پڑا تو مقعد سے نکل گیا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝ اللہ نے ان کو اس بھوسہ کی طرح کر دیا جس کو جانور کھاتے ہیں اور گوبر کر دیتے ہیں جوڑ جوڑ کے ٹکڑے ہو جانے کو گر کر کے منتشر اجزاء سے تشبیہ دی۔

مجاہد نے کہا عَصْف کا معنی ہے گیہوں کے درخت کی پتیاں۔ قتادہؒ نے کہا بھوسہ
حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا غلاف کی طرح جو چھلکا گیہوں پر
ہوتا ہے وہ عَصْف ہے۔ اور مَاْكُول سے مراد ہے۔
جانوروں کا کھایا ہوا۔ واللہ اعلم۔

سورۂ فیل ختم ہوئی
بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ القریش

یہ سورت مکی ہے اس میں ۴ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ﴿۱﴾ کسائی اور اخفش کے نزدیک لام تعجب کے لئے ہے اور اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے یعنی اِیْلَافِ قریش پر تعجب کرو۔ زجاج نے کہا اس لام کا رخ بعد والے فعل (فَلْیَعْبُدُوْا) کی طرف ہے یعنی اِیْلَافِ قریش کی وجہ سے ان کو اس کعبہ کے مالک کی عبادت کرنی چاہئے۔ فَلْیَعْبُدُوْا میں فاء جزائیہ ہے کیونکہ پہلے کلام میں شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ ان پر اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں اگر وہ سب نعمتوں کی وجہ سے عبادت نہیں کرتے تو خیر کم از کم ایلاف قریش کی نعمت کی وجہ سے تو اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہئے۔ فاء کو جزائیہ قرار دینے پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ما قبل جزاء معمول اور جزاء کا کوئی حصہ عامل بن جائے گا (یَعْبُدُوْا عامل اور لِاِیْلَافِ معمول ہوگا) اس لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ فاء کو زائد قرار دیا جائے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لِاِیْلَافِ کو سابق سورت کے آخری حصہ سے وابستہ قرار دیا جائے جیسے کسی شعر کا دوسرا مصرع پہلے مصرع سے معنوی ربط رکھتا ہے اور بغیر اس ربط کے اس کا معنی صحیح نہیں ہوتا اس صورت میں دونوں سورتوں کا معنوی ربط اس طرح ہوگا کہ اللہ نے اصحاب فیل کو ہلاک کر دیا اور اس کو کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح بنا دیا تاکہ گرمی اور جاڑے کے سفر میں قرش کے ساتھ لوگوں کو مانوس بنا دیا جائے یعنی اس کی علت یہ ہے کہ قریش کی پاسداری کے لئے اللہ نے اصحاب فیل کو تباہ کیا اس خبر کو لوگ سنیں اور قریش کی پوری تعظیم و پاسداری کریں اور اس طرح ہر سفر میں قریش کو امن حاصل ہو اور ان پر حملہ کرنے کی کوئی جرات نہ کرے۔ اسی معنوی تعلق کی وجہ سے کچھ لوگ قائل ہیں کہ سورۂ فیل اور یہ سورت دونوں ایک ہی ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف میں بھی ان دونوں سورتوں میں کوئی فصل نہیں تھا اس توجیہ پر لِاِیْلَافِ کا لام جَعَلَهُمْ سے متعلق ہوگا۔

نضر بن کنانہ کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے جو نضر کی اولاد میں نہیں ہے اس کو قریشی نہیں کہا جاتا۔ قریش کا لفظ قرش سے بنا ہے تقرش کا معنی ہے کمائی کرنا جمع کرنا۔ فلان تقرش لاهله فلاں شخص اپنے اہل و عیال کے لئے کمائی کرتا ہے۔ فلان یتقرش فلاں شخص کمائی کرتا ہے۔ قریش بھی تاجر تھے اور مال جمع کرنے کے بڑے حریص اس لئے ان کو قریش کہا گیا۔

معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قریش کی وجہ تسمیہ پوچھی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قریش ایک بہت بڑا دریائی جانور ہوتا ہے جس طرف اس کا گزر ہوتا ہے اور کوئی موٹا دبلا جانور سامنے پڑ جاتا ہے تو وہ اس کو کھا لیتا ہے مگر اس کو کوئی نہیں کھا سکتا وہ سب پر غالب ہے کوئی اس پر غالب نہیں۔

قاموس میں ہے قَرَشَهٗ اس کو کاٹا اور ادھر ادھر سے جمع کیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ضم کر دیا۔ قریش بھی سب حرم میں جمع تھے یہ بھی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہے۔ کہ قریش تجارتی سامان جمع کرتے اور خریدتے تھے یا یہ وجہ ہے کہ نضر بن کنانہ اپنے ایک کپڑے میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا تو لوگوں نے کہا تقرش یا یہ وجہ ہے کہ نضر بن کنانہ جب اپنی قوم کے پاس آیا تو لوگوں نے کہا یہ تو قریش اونٹ یعنی قومی اونٹ ہے یا یہ وجہ ہے کہ یہ لوگ حاجیوں کی حاجتیں پوری کرتے تھے یا لفظ قریش قرش کی تصغیر ہے اور قرش ایک دریائی جانور ہوتا ہے جس سے تمام سمندری جانور ڈرتے ہیں۔

فائدہ

حضرت واثلہ بن اسقع کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اولاد اسمٰعیلؑ میں سے اللہ نے کنانہ کو چن لیا اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرما لیا۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگ اس معاملہ میں قریش کے تابع ہیں ان میں سے مسلمان (قریشی مسلمانوں کے) اور ان میں سے کافر (قریشی کافروں کے) متفق علیہ۔ حضرت جابرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ لوگ خیر و شر (اچھائی برائی یا اسلام و کفر) میں قریش کے تابع ہیں۔ رواہ مسلم۔

میں کہتا ہوں شاید اول حدیث میں استعداد قریش کی قوت کی طرف اشارہ ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر (بڑے بڑے) صحابہؓ اور اولیاء قریش میں ہی ہوئے اور دوسری حدیث سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت قریش میں ہوئی تو سب سے اول ایمان اور احکام کے مکلّف قریش ہی ہوئے باقی لوگ ان کے پیچھے مکلّف قرار پائے۔ اللہ نے فرمایا وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ دوسری آیت میں ہے وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔

لہٰذا جو قریشی ایمان لائے اور رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں طریقۂ حسنہ پر چلے ان کو اپنے کئے کا اجر بھی ملے گا اور پیچھے آنے والے نیک لوگوں کا بھی اسی لئے یہ لوگ انبیاء کے بعد مرتبہ میں سب لوگوں سے زائد ہیں اور اگر ان میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے انکار کیا اور حضور ﷺ کے خلاف راستہ پر چلا اور اسی کفر و مخالفت کی حالت میں مر گیا تو اس پر اپنے کفر کا بھی عذاب ہوگا اور بعد کو آنے والے کافروں کا بھی جیسا کہ قابیل سب سے پہلا قاتل تھا اور اس پر ہر دوزخی (قاتل) کا عذاب بھی پڑے گا مگر اس سے اصل دوزخی کے عذاب میں کمی نہیں آئے گی۔ یہ حدیث بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور ایک حدیث سورۂ والشمس میں گزر چکی ہے کہ قابیل سب سے زیادہ بدبخت انسان ہوگا۔ حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا قریش میں سے جب تک دو آدمی بھی رہیں گے یہ امر ان میں رہے گا۔ متفق علیہ۔

معاویہؓ نے کہا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے یہ امر ان میں رہے گا جو کوئی ان سے دشمنی کرے گا اللہ اس کو منہ کے بل گرا دے گا۔ بخاری۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں امر سے مراد ہے خلافت اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کی غرض (آئندہ کی) خبر دینا نہیں ہے بلکہ قریش کی خلافت کا حکم مقصود ہے اور معاویہؓ کی حدیث کا مقصد اس شخص کے لئے بددعا ہے جو قریشی عادل خلیفہ کا باغی ہو۔ حضرت سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قریش کو ذلیل کرنے کا ارادہ کرے گا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔ (ترمذی)۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے قریش کو سات خصوصیت کی وجہ سے فضیلت عطا فرمائی ہے نہ ان سے پہلے یہ خصوصیات کسی کو عطا فرمائیں نہ آئندہ کسی کو عطا فرمائے گا اللہ نے قریش کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ میں ان میں پیدا ہوا نبوت ان میں ہوئی۔ کعبہ کی دربانی ان کے لئے مخصوص ہوئی حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت ان کو دی گئی اصحاب فیل پر ان کو کامیابی عطا فرمائی۔ دس برس تک سوائے قریش کے کسی نے اللہ کی عبادت نہیں کی (یعنی نبوت کے ابتدائی دس سال میں اور کوئی مسلمان نہیں ہوا) اور قریش کے متعلق قرآن کی ایک سورت نازل کی جس میں ان کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں کیا اور وہ سورت لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ہے۔ رواہ الحاکم والطبرانی والبخاری فی التاریخ۔

حضرت زبیر بن العوام سے بھی یہ حدیث مروی ہے مگر اس میں حضور ﷺ نے اپنا قریش میں پیدا ہونا ذکر نہیں فرمایا بلکہ یوں فرمایا کہ ان میں نبوت اور خلافت اور کعبہ کی دربانی ہے۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط۔

إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ﴿٢﴾ یہ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ سے بدل ہے اور رِحْلَةَ

الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کی قید اِیْلٰفِ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے لگائی گئی قریش پر یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت تھی کیونکہ حرم کی وادی بے آب و گیاہ وادی تھی نہ وہاں کھیتی ہوتی تھی نہ مویشی کی پیداوار اگر گرمی سردی میں ان کے تجارتی سفر نہ ہوتے تو نہ وادی میں رہنا ممکن تھا نہ معاش کا حصول پھر اللہ نے مکہ کو حرم محترم بنادیا تھا۔ حرم سے باہر ادھر ادھر لوٹ مار ہوتی مگر قریش کی ایذا رسانی سے لوگ اعراض کرتے تھے اور کہتے تھے یہ حرم خدا کے باشندے ہیں خانہ خدا کے مجاور ہیں ان کو ایذا نہ پہنچانی چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قریش کے لئے گرمی و سردی میں تجارتی سفر ناممکن تھا۔ یمن میں سردی زیادہ نہیں ہوتی تھی اس لئے سردی کے موسم میں قریش تجارت کرنے کے لئے یمن کو جاتے تھے اور شام کا ملک ٹھنڈا تھا اس لئے گرمی میں شام کو جاتے تھے اور دونوں ملکوں میں تجارت کر کے نفع حاصل کرتے اور معاش پیدا کرتے تھے۔

عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قریش بڑے دکھ اور فاقوں میں مبتلا تھے ہاشم نے سب کو سردی گرمی میں سفر کرنے پر متفق کیا جو تجارتی منافع ہوتے وہ مالدار اور نادار کو برابر بانٹ دیئے جاتے اور نادار بھی دولت مندوں کے برابر ہو جاتے تھے۔ کلبی کا بیان ہے سب سے اول ہاشم بن عبد مناف شام سے گیہوں اونٹوں پر لاد کر لایا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ یمن و شام کی آمدورفت سے قریش کو تکلیف ہوتی تھی یمن میں تبادلہ اور حرش کا علاقہ بڑی پیداوار کا تھا وہاں سے کچھ لوگ تو کشتیوں پر لاد کر سمندری راستہ سے لا کر جدہ پر اتار دیتے تھے اور کچھ لوگ اونٹوں اور گدھوں پر بار کر کے خشکی کے راستہ سے محصب میں پہنچادیتے تھے اور جدہ اور محصب سے قریش مکہ کو لے آتے تھے اسی طرح اہل شام اپنے ملک سے غلہ لا کر ابطح تک پہنچادیتے تھے اور قریش ابطح سے مکہ میں لے آتے تھے اس طرح قریب کے مقامات سے ہی مکہ والوں کو غلہ مل جاتا تھا اور دونوں سفروں کی ضرورت نہیں رہی تھی اسی لئے اللہ نے ان کو عبادت کا حکم دیا اور فرمایا۔

فَلْيَعْبُدُوْا ان کو عبادت کرنی چاہئے۔ اگر لِاِيْلٰفِ کا لام جَعَلَهُمْ سے متعلق مانا جائے یا تعجب کے لئے کہا جائے تو فاء عطف اور سببیت کے لئے ہوگی اور اگر لام کو يَعْبُدُوْا سے متعلق کیا جائے تو فاء زائد ہوگی یا شرط محذوف کی جزاء ہوگی۔

رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ کعبہ کے مالک کی۔ یعنی اللہ کی جو پروردگار ہے اور بیت اللہ قریش کے مامون رہنے کا سبب ہے۔

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ یعنی اصحاب فیل کے خوف سے محفوظ کر دیا یا حرم کا باشندہ بنا کر دوران سفر میں لوٹے جانے سے یا خود اپنی بستی میں غارت ہو جانے سے مامون کر دیا۔

ضحاک اور ربیع اور سفیان نے کہا اللہ نے ان کو تباہی اور بربادی کے خوف سے امن دے دیا حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اس دعا کی برکت سے ان کے شہر میں کوئی بربادی اور تباہی نہیں ہوگی۔

جوزی نے حصن حصین میں ابوالحسن قزوینی کی موقوف روایت بیان کی ہے کہ دشمن وغیرہ کا خوف ہو تو لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ پڑھنے سے ہر برائی سے امن مل جاتا ہے۔ جوزی نے کہا یہ مجرب ہے۔

میں کہتا ہوں میرے شیخ نے مجھے حکم دیا تھا کہ ہر مصیبت کے دفع کے لئے تمام خوفناک واقعات میں یہ سورت پڑھا کروں میں نے اس کا تجربہ کیا اور صحیح پایا۔ (سورت لایلاف قریش ختم ہوئی)۔

بعونہ و منہ تعالیٰ

سورۃ الماعون

یہ سورت مکی ہے اس میں ۷ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ﴿۱﴾ استفہام بمعنی تعجب ہے رویت سے مراد دیکھنا اور پہچاننا۔ بحر مولج میں ہے کہ استفہام تقریری ہے اور رؤیت بمعنی علم۔ یہ آیت عاص بن وائل سہمی کے متعلق نازل ہوئی (ایک روایت میں مقاتل کا قول) یا ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی۔ سدی، ابن کیسان اور مقاتل کا دوسرا قول یہی ہے یا عمرو بن عامر مخزومی کے متعلق نازل ہوئی۔ ضحاک۔

ان اقوال پر سورت کا ابتدائی حصہ مکی ہوگا، اور آخری مدنی۔ بروایت عطاء حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ایک منافق شخص کے متعلق نازل ہوئی ان تمام روایات پر اَلَّذِی عہدی ہوگا۔ بعض لوگوں نے جنسی قرار دیا ہے۔ دین سے مراد ہے اسلام یا جزاء۔

فَذٰلِکَ فاء سببی ہے مابعد فاء ماقبل فاء کی علت کے مقام پر ہے اور ذٰلِکَ خبر ہے مبتدا محذوف ہے بعض لوگوں نے فاء کو جزائیہ کہا ہے اور شرط محذوف ہے اصل کلام اس طرح تھا کیا تم نے دین کی تکذیب کرنے والے کو پہچانا اگر نہ پہچانا ہو تو سمجھ لو کہ وہ وہی شخص ہے جو۔

الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ﴿۲﴾ یتیم کو دھکے دیتا ہے یعنی اس پر ظلم کرتا ہے اور اس کا حق روکتا ہے دع کا معنی ہے قوت سے دھکا دینا۔

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴿۳﴾ یعنی اس کو چونکہ جزا کا ہی یقین نہیں ہے اس لئے نہ اپنے نفس کو مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ابھارتا ہے نہ اپنے گھر والوں کو اور دوسرے لوگوں کو اس کا مشورہ دیتا ہے۔

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ﴿۴﴾ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ فاء جزائیہ ہے یعنی جب یتیم کی پرواہ نہ کرنا ضعف دین کی علامت اور موجب ذم و زجر ہے تو پھر اس نماز کی طرف سے غافل ہونا جو دین کا ستون ہے اور دکھاوٹ کرنا جو کفر کی ایک شاخ ہے اور اس زکوٰۃ کو روکے رکھنا جو اسلام کا پل ہے بدرجہ اولی موجب ذم اور مستحق تنبیہ ہے اسی مفہوم کے لحاظ سے فاء کے بعد لفظ وَیْل ذکر کیا (جس سے معلوم ہوا کہ یہ اوصاف تباہی اور عذاب شدید کا موجب ہیں)

یا فاء سببی ہے (یعنی ماقبل فاء مابعد فاء کا سبب ہے) لیکن لَهُمْ کی جگہ لِلْمُصَلِّیْنَ فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مخلوق کے ساتھ معاملات کا ذکر تھا اور اس جگہ خدا کے ساتھ معاملہ کرنے کا ذکر ہے۔ سَاهُوْنَ سے مراد ہیں غفلت کرنے والے پرواہ نہ رکھنے والے۔ بغوی نے بروایت مصعب بن سعدؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ کی تشریح پوچھی گئی فرمایا (نماز کی طرف سے سہو کرنے کا مطلب ہے) نماز کا وقت ضائع کر دینا۔ ابن جریر اور ابو یعلی کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا (سَاهُوْن) وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر کرتے ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا یعنی مقررہ اوقات پر نماز نہیں پڑھتے اور رکوع و سجود کو پورا نہیں کرتے۔ قتادہ نے کہا سہو کا معنی یہ ہے کہ اس کو پرواہ نہیں ہوتی نماز پڑھی یا نہیں پڑھی بعض لوگوں نے سَاهُوْن کا معنی یہ بیان کیا کہ اگر وہ نماز پڑھ لیتے ہیں تو ثواب کی امید نہیں رکھتے اور نہیں پڑھتے تو عذاب سے نہیں ڈرتے۔ مجاہد نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ نماز میں غفلت اور سستی کرتے

ہیں حسن بصریؒ نے کہا ساھی سے مراد وہ شخص ہے کہ اگر نماز پڑھتا ہے تو دکھاوٹ کی اور نماز فوت ہو جاتی ہے تو اس کو افسوس نہیں ہوتا۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ يُرَآءُوْنَ رویت سے باب مفاعلت ہے لوگوں کو وہ اپنے (اچھے) اعمال دکھاتے ہیں تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دکھاوٹ کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا جس نے دکھاوٹ کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا جس نے دکھاوٹ کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔ رواہ احمد عن شداد بن اوس۔

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷ اور وہ ماعُوْن کو روکتے ہیں قطرب نے کہا اصل لغت میں مَاعُوْنَ تھوڑی چیز کو کہتے ہیں یہاں زکوٰۃ مراد ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حسن قتادہ اور ضحاک سے یہی تفسیر منقول ہے زکوٰۃ کو مَاعُوْن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت مال کی تھوڑی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کلہاڑی، ڈول، ہانڈی اور انہی جیسی چیزیں ماعون ہیں۔ سعید بن جبیر کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔ مجاہدؒ نے کہا ماعُوْن سے مراد عاریت (مانگی ہوئی مستعار چیز) ہے عکرمہؒ نے کہا مَاعُوْن سے (اعلیٰ اور ادنیٰ ہر چیز مراد ہے) اعلیٰ چیز فرض زکوٰۃ ہے اور ادنیٰ چیز مستعار لیا ہوا استعمال کا گھریلو سامان۔ محمد بن کعبؓ اور کلبیؒ نے کہا ماعون وہ معروف چیزیں ہیں جن کا لین دین لوگ آپس میں کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا ماعون وہ چیز ہے جس کو روک رکھنا (دوسروں کو نہ دینا) درست نہیں جیسے پانی نمک آگ۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ پانی تو خیر۔ نمک اور آگ میں کیا بات ہے فرمایا حمیرا جس نے آگ دے دی گویا اس نے اس آگ سے پکا ہوا کل کھانا دیا اور جس نے نمک دے دیا اس نے گویا اس نمک سے درست کیا ہوا کھانا دے دیا اور جس نے کسی مسلمان کو ایسے مقام پر جہاں پانی ملتا ہے پانی پلایا اس نے گویا ایک بردہ آزاد کیا اور جس نے پانی نہ ملنے کے مقام میں کسی مسلمان کو پانی پلایا اس نے گویا اس کو زندہ کر دیا۔ رواہ ابن ماجہ۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا آیت فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ الخ منافقوں کے متعلق نازل ہوئی جو مسلمانوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے تھے لیکن اگر مسلمان موجود نہ ہوتے تو نماز نہیں پڑھتے تھے اور عاریت (کی چیزوں) کو روک رکھتے تھے۔ ابن المنذر بروایت ابو طلحہؓ

حضرت انس اور حسن کا قول مروی ہے کہ دونوں نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ فرمایا اور فِيْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں فرمایا عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ نماز کو ترک کرتے ہیں نماز کی پرواہ نہیں کرتے اور یہ منافقوں کا فعل ہے۔

اور فِيْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ان کو کچھ ادھر اور ادھر کے خیالات آجاتے ہیں اور شیطانی وسوسے پیدا ہو جاتے ہیں ان وسوسوں کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور جہاں تک ممکن ہو دفع کرے لیکن اگر دفع نہ کر سکا تو معاف ہیں۔ مدارک۔

حضرت عثمان بن ابی العاص کی روایت ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شیطان آکر میرے اور میری نماز اور قرات کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مشتبہ بنا دیتا ہے۔ فرمایا اس شیطان کا نام خنزف ہے جب تم کو اس کی آہٹ معلوم ہو تو اس سے اللہ کی پناہ مانگو اور بائیں طرف تین بار تھتکار دو۔ حضرت عثمانؓ کا بیان ہے میں نے ایسا ہی کیا اور اللہ نے اس کو مجھ سے دور کر دیا۔ رواہ مسلم۔

حضرت قاسم بن محمد سے کسی شخص نے کہا مجھے نماز میں وہم ہو جاتا ہے اور کثرت سے ہوتا رہتا ہے فرمایا اپنی نماز جاری رکھو جب تک نماز ختم نہیں کر لو گے یہ وہم دور نہ ہو گا تم یہی کہتے رہو گے کہ میری نماز ابھی پوری نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم سورۃ الماعون ختم ہوئی

بعونہ و منہ تعالیٰ

سورۃ الکوثر

یہ سورت مکی ہے اس میں تین آیات ہیں
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت انسؓ نے فرمایا ایک روز ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اچانک آپ پر کچھ غفلت طاری ہو گئی کچھ دیر کے بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے مسکرانے کا کیا سبب ہے فرمایا ابھی مجھ پر ایک سورت اتری ہے پھر حضور ﷺ نے پڑھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ اور ارشاد فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کوثر کیا چیز ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہے فرمایا یہ ایک نہر ہے جس کو عطا کرنے کا وعدہ مجھ سے میرے رب نے کر لیا ہے اس پر بہت خوبیاں (جمع) ہیں قیامت کے دن اسی حوض پر میری امت اترے گی اس کے ظروف ستاروں کی تعداد کی برابر ہوں گے ایک بندہ کو حوض پر اترنے والوں میں سے کھینچ کر الگ کر دیا جائے گا میں عرض کروں گا۔ پروردگار یہ تو میری امت ہے حکم ہو گا۔ تم واقف نہیں ہو کہ تمہارے پیچھے اس نے (دین میں) کیا کیا نئی چیزیں نکالی تھیں۔ مسلم۔ طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابوایوبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ کی وفات ہو گئی تو مشرک باہم کہنے لگے یہ صابی آج رات اَبۡتَر (منقطع النسل نکوڑا) ہو گیا اس پر اللہ نے نازل فرمایا اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ۔ ابن المنذر نے ابن الجریج کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

ابن الجریر نے حضرت شمر بن عطیہ کا قول نقل کیا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط کہتا تھا محمد کا کوئی بچہ باقی نہیں رہے گا وہ ابتر ہو گا تو اللہ نے اس کے بارہ میں نازل فرمایا اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۔

آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ کے سلسلے میں ابن جریرؒ نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حدیبیہ کے دن اتری تھی حضرت جبرئیلؑ نے آکر کہا تھا کہ قربانی کرو اور لوٹ کر چلے جاؤ اس حکم پر رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ خطبہ میں بال کتروانے اور قربانی کرنے کا حکم دیا پھر دو رکعت نماز پڑھی اور جا کر اونٹوں کو ذبح کیا۔ یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔ بزار وغیرہ نے صحیح سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ کعب ابن اشرف (مدینہ کا یہودی) مکہ میں آیا تو قریش نے اس سے کہا تم اہل مدینہ کے سردار ہو ذرا اس شخص کو تو دیکھو جو اپنی قوم سے الگ ہو گیا ہے اور سب سے کٹ گیا ہے اس کا خیال ہے کہ ہم مجرم ہیں باوجود یہ کہ ہم حاجیوں کے خدمت گزار ہیں ان کو پانی پلاتے ہیں اور کعبہ کے دربان ہیں کعب نے کہا تم اس سے بہتر ہو اس پر آیت اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ نازل ہوئی۔

ابن المنذر نے اور مصنف میں ابن ابی شیبہ نے عکرمہ کا قول بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر وحی آئی تو قریش بولے محمد ہم سے کٹ گیا اور اس پر نازل ہوا اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۔ ابن ابی حاتم نے سدی کا قول بیان کیا کہ جب کسی شخص کی نرینہ اولاد مر جاتی ہے (اور کوئی لڑکا باقی نہ رہتا) تو قریش کہتے تھے فلاں شخص کی نسل کٹ گئی چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادہ کی وفات ہو گئی تو عاص بن وائل نے کہا محمد ﷺ کی نسل کٹ گئی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت محمد بن علی (زین العابدین) بن امام حسینؓ کی روایت سے بھی بیہقی نے دلائل النبوہ میں ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اور نبی زادہ کا نام قاسم بتایا ہے۔ بیہقی نے دلائل النبوہ میں مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول عاص بن وائل کے حق میں ہوا جس نے کہا تھا کہ میں محمد ﷺ کا دشمن ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ سے باہر تشریف لا رہے تھے اور عاص بن وائل اس وقت اندر داخل ہو رہا تھا دونوں کی ملاقات ہو گئی اور باب بنی سہم کے پاس (کھڑے ہوئے) دونوں کچھ گفتگو کرنے لگے۔ سرداران قریش اس وقت کعبہ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ عاص جب اندر پہنچا تو قریش نے پوچھا تم کس سے باتیں کر رہے تھے عاص نے کہا وہی اَبْتَر تھا یعنی رسول اللہ ﷺ اس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادہ کی جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھے وفات ہو چکی تھی۔

محمد بن اسحاق نے یزید بن رومان کا قول نقل کیا ہے کہ عاص بن وائل جب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کرتا تو کہتا اس کو چھوڑو وہ تو ابتر آدمی ہے اس کے پیچھے کوئی نسل نہیں۔ جب مر جائے گا تو اس کا ذکر بھی ختم ہو جائے گا اس پر اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کا نزول رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے کی وفات کے قریب نہیں ہوا کیونکہ حضرت قاسم کی وفات تو مکہ میں ہجرت اور بقول بعض بعثت سے پہلے ہوئی تھی۔ اور حضرت محمد بن علیؒ کی روایت کے سلسلہ میں جابر جعفی ایک راوی ہے اور جابر بڑا دروغ گو تھا۔ واقدی کا قطعی خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی وفات منگل کے دن دس ربیع الاول ۱۰ھ نبوی۔ کو ہوئی۔ کذافی سبیل الرشاد۔ اس آیت کے شان نزول کے بیان میں دو روایات صحیح ہیں۔ ایک حضرت انسؓ کی روایت جو مسلم نے بیان کی ہے دوسری حضرت ابن عباسؓ کی روایت جو بزار نے بیان کی ہے کہ کعب بن اشرف مکہ میں آیا اور قریش نے اس سے کہا۔ الخ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① اہل لغت نے لکھا ہے کہ کوثر بروزن فوعل کثرت سے مشتق ہے جیسے نوفل نفل سے۔ جو چیز تعداد میں زیادہ یا مرتبہ اور قدر میں بڑی ہو عرب اس کو کوثر کہتے ہیں اسی کی تائید کرتا ہے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول کہ کوثر سے مراد ہے وہ خیر کثیر جو اللہ نے اپنے رسول کو عطا فرمائی تھی اس قول کے راوی ابو بشر اور عطاء بن سائب ہیں دونوں نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے۔ ابو بشر کا بیان ہے میں نے سعید بن جبیر سے کہا لوگوں کا خیال ہے کہ کوثر جنت کے اندر ایک نہر ہے سعید نے جواب دیا جنت کے اندر والی نہر بھی تو اسی خیر کثیر کا ایک حصہ ہے جو اللہ نے حضور ﷺ کو عطا فرمائی تھی اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے الکوثر کے لام کو جنسی قرار دیا ہے اور آپ کے خیال میں حوض کوثر الکوثر (یعنی نعمت کثیرہ) کا ایک حصہ ہے اسی طرح جن لوگوں نے الکوثر کو نبوت اور قرآن کہا ہے (ان کے نزدیک بھی لام جنسی ہے) اولیٰ یہ ہے کہ لام کو عہدی قرار دیا جائے اور وہی تفسیر کی جائے جو رسول اللہ ﷺ نے کی ہے جس کا ذکر مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث میں آچکا ہے۔

صحیحین میں بھی حضرت انسؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں جنت میں گیا تو وہاں ایک نہر دیکھی جس کے دونوں کناروں پر موتی کے خیمے تھے میں نے نہر میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو خالص مشک (کی طرح خوشبودار) تھا میں نے کہا جبرئیلؑ یہ کیا ہے جبرئیلؑ نے کہا یہی وہ کوثر ہے جو اللہ نے آپ کو عطا کی ہے۔

حضرت انسؓ کی مرفوع روایت میں آیا ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے بڑھ کر شیریں ہے اس میں پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہیں حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر وہ تو بڑے لطیف ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا عمرؓ ان کا کھانا ان سے زیادہ لطیف ہے۔ احمد و ترمذی۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ راوی ہیں کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی بیوی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کو جنت کے اندر ایک نہر دی گئی ہے جس کو کوثر کہا جاتا ہے فرمایا ہاں اور اس کی زمین موتی مونگے زبرجد اور یاقوت کی ہے وہ اتنی بڑی ہے جیسے ایلہ سے صنعاء تک مسافت ہے اس کے کوزے ستاروں کی تعداد کے موافق ہیں۔ طبرانی۔

طبرانی کی دوسری روایت ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کی تشریح میں فرمایا جنت میں ایک بہت بڑے پاٹ کی نہر ہے جس کے ظروف سونے چاندی کے ہوں گے جن کی تعداد سے سوائے خدا کے کوئی واقف نہیں۔ حضرت

ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے دونوں کنارے سونے کے ہیں اور پانی موتیوں (کی زمین) پر بہتا ہے۔ ابن ماجہ واحمد وترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا ایک نہر ہے جو اللہ نے تمہارے نبیؐ کو عطاء فرمائی ہے۔ رواہ البخاری۔

حوض کوثر کا تذکرہ کچھ اوپر پچاس صحابیوں کی روایات میں آیا ہے۔ چاروں خلفاء حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت امام حسن بن علی، حضرت حمزہ بن عبد المطلب، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبد الرحمن بن عوف، حضرت جابر بن عبد اللہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اور دوسرے صحابہؓ کی روایت کردہ احادیث میں حوض کوثر کا ذکر موجود ہے۔ سیوطیؒ نے بدور سافرہ میں تقریبا ستر احادیث نام بنام ترتیب وار صحابہ کرامؓ کی نقل کی ہیں۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ فاء سببی ہے یعنی اللہ نے تم کو کوثر عطا فرمائی اس کے شکریہ میں نماز پڑھو نماز کے اندر شکر کی ہر قسم موجود ہے زبان سے دل سے اور ہاتھ پاؤں سے ہر طرح سے نماز میں شکر خدا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ صل سے مراد ہے نماز پر قائم رہو (ترک نہ کرو) مطلب یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ محض رب کے لئے نماز پڑھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ کرو جو غیر اللہ کے لئے نماز پڑھتے اور قربانی کرتے ہیں یا دکھانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

وَانْحَرْ ؁ اور اونٹوں کی قربانی کرو۔ عرب میں اونٹ ہی سب سے اعلی مال شمار کیا جاتا تھا۔ اور قربانی کے بعد گوشت پوست وغیرہ غریبوں اور یتیموں کو دے دو ان لوگوں کی طرح نہ کرو جو یتیموں اور مسکینوں کو دھکے دیتے اور ماعون کو روک کر رکھتے ہیں اس تشریح کی بناء پر یہ سورت گویا سورت مَاعُوْنَ کی مقابل ہو گئی (وہاں مذمت آمیز ممانعت تھی یہاں ان مذموم چیزوں کے خلاف کرنے کا حکم ہے)

عکرمہ عطاء اور قتادہ نے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ کی تفسیر میں کہا نحر کے دن عید کی نماز پڑھو اور اپنی قربانی ذبح کرو۔ اس تفسیر پر عید الاضحیٰ کی نماز اور قربانی واجب ہو گی۔ سعید بن جبیر نے اس طرح تشریح آیت کی کہ مزدلفہ میں فرض نماز پڑھو اور منا میں قربانی کرو۔ ایک روایت میں ابن جوزاء کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نماز پڑھو اور نحر (ہنسلی کی ہڈی سے نیچے) کے پاس نماز کے اندر بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھو (یعنی اِنْحَرْ کا مطلب ہے نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھو اور بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھو۔ یہ روایت ضعیف ترین ہے اسی بناء پر حضرت مولف نے راوی کا نام نہیں بتلایا)

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ؂ یعنی تمہارا دشمن ہی ابتر ہے اسی کے پیچھے کوئی نہیں رہے گا مراد یہ ہے کہ اس کے بعد اس کا اچھا نام نہیں رہے گا بلکہ اللہ ملائکہ اور تمام آدمیوں کی لعنت اس پر پڑتی رہے گی۔

ایک شبہ کیا جا سکتا تھا کہ عاص بن وائل کی نسل تو اس کے بعد باقی رہی اس کے دونوں بیٹے عمرو اور ہشام مسلمان ہوئے اور اس کے بعد رہے پھر وہ منقطع النسل کس طرح ہوا۔ لیکن ہماری تفسیر سے یہ شبہ دفع ہو گیا کیونکہ عاص کے دونوں بیٹے جب مسلمان ہو گئے تو ان کا رشتہ اپنے باپ سے کٹ گیا یہاں تک کہ اس کے وارث بھی نہیں ہوئے وہ تو رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے ہو گئے اور حضور ﷺ کی بیویاں ان کی مائیں ہو گئیں۔

ھو ضمیر فصل ہے اور اَلْاَبْتَرُ اِنَّ کی خبر ہے۔ خبر پر الف لام اور مبتدا خبر کے درمیان ضمیر فصل کا لانا حصر پر دلالت کرتا ہے یعنی تمہارا دشمن ہی ابتر ہے تم ابتر نہیں ہو تمہارا ذکر اللہ کے ذکر کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور قیامت تک تمہاری اچھی شہرت اور بزرگی کے نشانات باقی رہیں گے اور آخرت تمہارے لئے دنیا سے بہتر ہو گی اور تمہاری امت کے مومنوں کا ذکر ملائکہ اور مومنوں کی زبانوں پر رہے گا اور وہ اللھم اغفر للمومنین و المومنات کہتے رہیں گے۔ واللہ اعلم۔

سورت الکوثر ختم ہوئی۔ بعونہ ومنہ تعالی

ع ۱ ۳۲

سورۃ الکافرون

یہ سورت مکی ہے اس میں ۶ آیات ہیں
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو دعوت دی اور کہا محمد ﷺ ہم تم کو اتنا مال دیں گے کہ تم مکہ میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے اور جس عورت سے تم چاہو گے تمہارا نکاح بھی کر دیں گے۔ لیکن ہمارے معبودوں کو گالیاں دینا تم ترک کر دو اور ان کو برا نہ کہو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر یوں کرو کہ ایک سال تم ہمارے معبودوں کی پوجا کرو اور ایک سال ہم تمہارے معبود کی پوجا کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں دیکھ لوں میرے رب کے پاس سے کیا حکم آتا ہے (ابھی کچھ نہیں کہتا) عبدالرزاق نے وہبؒ کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ قریش نے کہا اگر آپ کو پسند ہو کہ ایک سال ہم آپ کا اتباع کریں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں لوٹ آئیں (تو ہم ایسا کر سکتے ہیں)

ابن حاتم نے سعید کی روایت بیان کی ہے کہ ولید بن مغیرہ عاص بن وائل۔ اسود بن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف رسول اللہ ﷺ سے ملے اور کہا محمد آؤ تم اس کی پوجا کرو جس کو ہم پوجتے ہیں اور ہم اس کی پوجا کریں جس کو تم پوجتے ہو۔ اس تمام معاملہ میں ہم تم شریک ہو جائیں اس پر اللہ نے نازل فرمایا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ① یہ خطاب خاص طور پر کافروں کی اس جماعت کو ہے جو صلح کے خواستگار تھے مگر اللہ کو معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② میں کبھی ان بتوں کی پوجا نہیں کروں گا۔ جن کی تم کرتے ہو۔ عبادت میں بالکل علیحدگی اور رسول اللہ ﷺ کا ان کی عبادت سے الگ ہونا تو گفتگو کے زمانہ میں ظاہر ہی تھا اس لئے آیت میں فی الحال عبادت کی نفی نہیں ہے بلکہ آئندہ زمانہ میں عبادت میں متفق بننے کی نفی ہے کیونکہ وہ لوگ آئندہ زمانہ میں مشترک عبادت کے خواہشمند تھے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ لَا صرف اس مضارع پر آتا ہے جو مستقبل کے معنی میں ہو جیسے مَا صرف اس مضارع پر آتا ہے جو بمعنی حال ہو۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ اور نہ تم آئندہ عبادت کرنے والے ہو۔ چونکہ یہ جملہ لَا اَعْبُدُ کے مقابل آیا ہے اس لئے اس جگہ بھی مستقبل کی نفی ہے۔

مَآ اَعْبُدُ ③ جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ لفظ ما (جو بے علم چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے) بجائے مَنْ کے (جو اہل علم کے لئے استعمال ہوتا ہے) ذکر کیا گیا (حالانکہ مَا اَعْبُدُ میں ما سے مراد اللہ ہے اور اللہ سب سے بڑا عالم ہے اس لئے مَنْ کہنا چاہئے تھا) اس کی وجہ یا تو صرف لفظی مطابقت ہے پہلے مَا تَعْبُدُوْنَ تھا اس کے مطابق یہاں بھی مَا اَعْبُدُ فرمایا یا محض وصف معبود ملحوظ ہے (بے علم اور ذی علم ہونے کی حیثیت ملحوظ نہیں) یعنی میں باطل کی پرستش نہیں کروں گا اور تم حق کی پرستش نہیں کرو گے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس جگہ مَا مصدری ہے (موصولہ نہیں ہے)

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ④ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ⑤ اکثر اہل معانی قائل ہیں کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو اس کی رفتار خطاب بھی وہی ہونی چاہئے جو عرب کے خطابیات کی ہے اور عرب کسی کلام یا لفظ کی تکرار اس وقت کرتے ہیں جب مخاطب کو سمجھانا اور اس کلام یا لفظ کو مؤکد کرنا ہوتا ہے جس طرح کلام میں اختصار اس

وقت کرتے ہیں جب تخفیف اور ایجاز پیش نظر ہوتا ہے۔ پس اس جگہ بھی تکرار کلام تاکید کے لئے ہے۔ قتیبی نے کہا وقت (اشتراک) کی تکرار کی وجہ سے کلام کی تکرار کی گئی کیونکہ قریش نے کہا تھا کہ اگر تم پسند کرتے ہو کہ ہم ایک سال تمہارے دین میں داخل رہیں تو تم بھی ایک سال ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ (گویا ایک سال دونوں فریق کفر میں شریک رہیں اور دوسرے سال اسلام میں شریک ہوں) اس پر یہ سورت نازل ہوئی گویا دونوں وقتوں میں اشتراک کی نفی کر دی گئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر جملہ میں اول ما موصولہ ہے اور دوسرا ما مصدری اور مقصود دونوں قسم کی نفی ہے اتحاد معبود کی بھی اور اتحاد عبادت کی بھی۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿۶﴾ یہ دونوں جملے خبری ہیں یعنی جس دین پر تم ہو کبھی اس کو نہیں چھوڑو گے اور جس دین پر میں ہوں میں انشاء اللہ اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس تفسیر پر اس آیت سے نہ کافروں کو کفر پر رہنے کی اجازت مستفاد ہوتی ہے نہ مسلمانوں کے لئے جہاد کی ممانعت نکلتی ہے بلکہ مضمون سابق کی تکمیل اور تاکید ہے۔ اور دونوں جملوں میں خبر کو مبتدا سے پہلے ذکر کرنا مفید تاکید ہے جب اس آیت میں ممانعت جہاد ہی نہیں ہے تو پھر اس کو آیت جہاد سے منسوخ قرار دینا ہی غلط ہے اور جب اجازت کفر اس آیت سے مستفاد نہیں ہے تو پھر یہ کہنا کہ یہ ہر فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو اس کے مذہب پر قائم رہنے کی چھوٹ اور باہم سمجھوتہ کی تعلیم ہے بے بنیاد ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ برابر اس کے بعد ہی کافروں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اور کافر بھی آپ ﷺ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایذاء دیتے رہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ [illegible] کا معنی اس طرح ہو تمہارے لئے تمہارے اعمال کی پاداش ہے اور میرے لئے میرے اعمال کا بدلہ۔

حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیث میں اِذَا زُلْزِلَتْ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (ثواب میں) چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑی اچھی ہیں وہ دونوں سورتیں جو فجر کے (فرض) سے پہلے والی دو (سنت) رکعتوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ الْكٰفِرُوْنَ اور اَلْاِخْلَاص۔ رواہ ابن ہشام۔

فردہ بن نوفل بن معاویہؓ کا بیان ہے کہ میرے باپ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے کہ میں بستر پر جانے کے وقت (یعنی سونے سے پہلے) پڑھ لیا کروں فرمایا قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو۔ یہ شرک سے بیزاری (کا اظہار) ہے۔ رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی۔

حضرت جبیرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جبیرؓ کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ جب تو سفر میں ہو تو تیری حیثیت سب ساتھیوں سے اعلیٰ ہو اور تیرے پاس زاد راہ سب سے زیادہ ہو۔ میں نے عرض کیا جی ہاں! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ فرمایا تو یہ پانچوں سورتیں پڑھا کرو قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہر سورت کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کر اور قرات کو بسم اللہ پر ہی ختم کر۔ حضرت جبیرؓ کا بیان ہے میں تھا تو دولت مند اور بڑا مالدار۔ لیکن سفر کو جاتا تھا تو سفر میں میری حیثیت بڑی فرسودہ ہو جاتی تھی اور زاد راہ بہت کم ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے رسول اللہ ﷺ واصحابہ وسلم نے مجھے ان سورتوں کی تعلیم دی اور میں نے ان کو پڑھا (سفر میں) میری پوزیشن سب سے اعلیٰ ہونے لگی اور زاد راہ سب سے زیادہ ہونے لگا اور سفر سے واپسی تک میری یہی حالت رہتی تھی۔ رواہ ابو یعلی

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی بچھو نے کاٹ لیا آپ ﷺ نے پانی اور نمک منگولیا (نمکین پانی سے دھارا اور) قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر کاٹنے کی جگہ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ واللہ اعلم۔

(سورۃ الکافرون ختم ہوئی) بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ النصر

یہ سورت مدنی ہے اس میں ۳ آیات ہیں
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معمر نے بحوالہ زہری بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو فتح سے پہلے خالد بن ولید کو کچھ ساتھیوں کے ساتھ مکہ کے نشیبی حصہ میں مامور کر دیا مگر قریش کی کچھ جماعتوں نے خالدؓ کا مقابلہ کیا آخر اللہ نے ان کو شکست نصیب کی پھر حضور ﷺ کے حسب الحکم قتال بند کر دیا گیا اور قریش دین اسلام میں داخل ہو گئے اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اخرجہ عبدالرزاق فی مصنفہ۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ جب اللہ کی مدد آچکی یعنی جب اللہ نے تم کو دشمنوں پر غلبہ عنایت کر دیا۔ اگر اس سورت کا نزول فتح مکہ کے دن فتح کے بعد مانا جائے تو اِذَا (شرطیہ) اِذۡ (ظرفیہ) کے معنی میں ہوگا جیسے آیت اِذا جاء اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ میں اور آیت حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغۡرِبَ الشَّمۡسِ میں (اذا بمعنی اذ) ہے۔

وَالۡفَتۡحُ ﴿۱﴾ اور فتح یعنی فتح مکہ۔ طبرانی نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح کے دن فرمایا یہ وہی ہے جس کا وعدہ میرے رب نے مجھ سے فرمایا پھر آپ ﷺ نے اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ کی تلاوت فرمائی۔

اصحاب اخبار نے فتح کا قصہ اس طرح لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے سال قریش سے دس سال کے لئے صلح کر لی جس کی شرط یہ تھی کہ اس مدت کے اندر لوگ امن سے رہیں گے اور جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حلیف ہونا چاہیں گے وہ آپ کے معاہدہ میں ہوں گے اور جو لوگ قریش کے حلیف ہونا چاہیں گے وہ قریش کے معاہدہ میں ہوں گے چنانچہ بنی بکر قریش کے معاہدہ میں داخل ہو گئے اور بنی خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف ہو گئے بکر اور خزاعہ میں پرانی جنگ تھی کچھ مدت کے بعد بنی بکر کی ایک شاخ بنی نفاثہ نے بنی خزاعہ پر زیادتی کی اور بنی نفاثہ کے قبیلہ نوفل بن معاویہ دیلمی نے مکہ کے نشیبی حصہ میں بمقام وتیر بنی خزاعہ پر شب خون مارا یہاں تک کہ بنی خزاعہ حرم میں داخل ہو گئے تب بھی قبیلہ نوفل نے قتال جاری رکھا۔ قریش نے ہتھیاروں سے بنی بکر کی مدد کی بلکہ صفوان بن امیہ عکرمہ بن ابی جہل سہیل بن عمرو شیبہ بن عثمان خویطب بن عبدالعزی اور کچھ دوسرے لوگ اپنے غلاموں سمیت رات کے وقت چھپ کر بنی بکر کی طرف سے لڑائی میں بھی شریک ہوئے لڑائی کے بعد قریش کو عہد شکنی پر پشیمانی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو ملامت کی ادھر لڑائی کے بعد عمرو بن سالم خزاعی چالیس سواروں کو ساتھ لے کر بنی خزاعہ پر واقع ہونے والی معیبت کی اطلاع دینے اور مدد مانگنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن رسول اللہ نے عمرو کے پہنچنے سے پہلے ہی بنی نفاثہ اور بنی خزاعہ کی جنگ کی اطلاع دے دی تھی اور فرمایا تھا جو کام خدا کو مقصود ہے اس کی تکمیل کے لئے قریش عہد شکنی کریں گے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا (کیا مسلمانوں کے لئے) خیر ہوگی۔ فرمایا خیر ہوگی۔

محمد بن عمرو نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ام سلمہ کی روایت سے (واقعہ) اسی طرح بیان کیا ہے۔ غرض جب عمرو بن سالم خزاعی نے حاضر ہو کر اطلاع دے دی۔ (اور مدد کا طلب گار ہوا) تو رسول اللہ ﷺ چادر کھینچتے ہوئے اٹھے اور فرمایا اے عمرو اگر میں تیری مدد اس (قوت) کے ساتھ نہ کروں جس (قوت) سے اپنی مدد کرتا ہوں تو خدا کرے

میری مدد نہ کی جائے۔
یہ واقعہ ماہ شعبان کا ہے جب صلح حدیبیہ کو بائیس ماہ گزرے تھے پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کو قریش کے پاس یہ پیام پہنچانے کے لئے بھیجا کہ تین باتوں میں سے ایک بات قریش کو اختیار کر لینا چاہئے یا بنی خزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کریں۔ کل تیرہ آدمی مقتول ہوئے تھے یا جن لوگوں نے یعنی بنی نفاثہ نے معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کی ہے ان کو اپنا حلیف ہونے سے خارج کر دیں (یعنی بنی نفاثہ سے محالفہ ختم کر دیں تاکہ مسلمان ان سے بنی خزاعہ کا انتقام لے لیں) یا حدیبیہ والے معاہدہ صلح کو ایک قلم منسوخ کر دیا جائے۔ یہ پیام سن کر قریش کی رائیں باہم مختلف ہو گئیں آخر کار معاہدہ کو منسوخ کر دینے پر سب متفق ہو گئے اور حضرت حمزہؓ فسخ معاہدہ کی خبر لے کر واپس آ گئے۔
رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے مشورہ لیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے صلح اور نرمی کا مشورہ دیا اور عرض کیا وہ آپ کی قوم والے ہیں یہاں تک کہ حضرت ابو بکرؓ کا خیال ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ میرے مشورہ پر چلیں گے۔ حضرت عمرؓ نے جنگ کا مشورہ دیا اور عرض کیا انہوں نے آپ کو جادوگر کاہن اور بڑا دروغ گو کہا وہ کفر کے سردار ہیں۔ قریش نے جو جو باتیں رسول اللہ ﷺ کے متعلق گزشتہ زمانہ میں کہی تھیں حضرت عمرؓ نے وہ سب کچھ کہا کوئی بات بغیر ذکر کئے نہیں چھوڑی اور عرض کیا جب تک اہل مکہ اطاعت نہیں کریں گے عرب اطاعت نہیں کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے مشورہ کو اختیار کیا اور خفیہ تیاری شروع کر دی اور عرب کو لڑائی میں شریک ہونے پر آمادہ کیا چنانچہ قبائل اسلم غفار، مزینہ، حرفیہ، اشجع اور سلیم آ گئے۔ کچھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ ہی میں پہنچ گئے اور کچھ حضور کی روانگی کے بعد راستہ میں آ ملے کل مسلمان ایک روایت میں دس ہزار اور دوسری روایت میں بارہ ہزار تھے۔ دونوں روایتوں کے اختلاف کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ سے روانگی کے وقت دس ہزار ہوں گے اور راستہ میں قبائل کے مل جانے کی وجہ سے بارہ ہزار ہو گئے ہوں گے۔
آخر قریش فسخ معاہدہ پر پشیمان ہوئے اور ابو سفیان کو بھیجا۔ ابو سفیان اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ کے پاس پہنچا اور جوں ہی رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا حضرت ام حبیبہؓ نے بستر کو لپیٹ دیا اور فرمایا یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے ابو سفیان بولا بیٹی خدا کی قسم میرے بعد تجھ میں خرابی آ گئی ہے۔ ام المومنینؓ نے فرمایا اللہ نے مجھے اسلام کی ہدایت فرما دی ہے مگر ابا جان آپ قریش کے سردار ہیں اور آپ پتھروں کو پوجتے ہیں جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت آپ سے کس طرح ساقط ہو سکتی ہے۔ ابو سفیان ام المومنین کے پاس سے اٹھ گیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ گفتگو کی لیکن حضور ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا پھر ابو سفیان حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں پہنچا اور کچھ گفتگو کی اور درخواست کی کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے میری سفارش کر دیجئے حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا پھر ابو سفیان نے حضرت عمرؓ سے جا کر کچھ بات کی حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا کی قسم اگر درہ (کوڑا) ہی میرے پاس ہو (کوئی اور ہتھیار مجھے نصیب نہ ہو) تب بھی میں تم سے درہ لے کر ہی لڑوں گا۔ آخر ابو سفیان حضرت علیؓ کی خدمت میں پہنچا اس وقت حضرت علیؓ کے پاس حضرت سیدہؓ اور حضرت حسنؓ موجود تھے ابو سفیان نے کہا علیؓ تم سے میرا رشتہ سب سے زیادہ قریب کا لگتا ہے تم میرے لئے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کر دو حضرت علیؓ نے فرمایا ارے ابو سفیان رسول اللہ ﷺ پختہ ارادہ کر چکے ہیں کوئی بھی حضور ﷺ سے اب (اس سلسلہ میں) بات نہیں کر سکتا۔ ابو سفیان نے حضرت سیدہؓ کی طرف رخ کیا اور عرض کیا آپ ہی اپنے والد سے کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کے ٹوٹے ہوئے تعلقات کو جوڑ دیں حضرت فاطمہؓ نے انکار کر دیا آخر ابو سفیان بولا ابو الحسن اب میرے لئے معاملہ سخت ہو گیا آپ مجھے کوئی اچھا مشورہ دے دیں (کہ اب میں کیا کروں) حضرت علیؓ نے فرمایا تمہارے لئے کوئی فائدہ رساں بات میری سمجھ میں تو نہیں آتی البتہ تم بنی کنانہ کے سردار ہو تو لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر کہہ دو کہ میں لوگوں میں امن (ہونے کا اعلان) کرتا ہوں ابو سفیان نے کہا کہ کیا یہ بات میرے لئے فائدہ مند ہو گی حضرت علیؓ نے فرمایا میری سمجھ میں تو اس کے علاوہ کوئی بات نہیں آتی۔ ابو سفیان نے مسجد میں جا کر کہہ دیا لوگو میں نے لوگوں کے لئے امن جاری کر دیا یہ کہہ کر اونٹ پر سوار ہو کر چل دیا

اور قریش کے پاس پہنچ کر پورا قصہ بیان کر دیا قریش نے کہا خدا کی قسم علیؓ نے تمہارے ساتھ صرف دل لگی کی ہے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ابن مکتوم کویا ابوذر غفاری کو اپنا جانشین بنایا موخر الذکر قول صحیح ہے رواہ الطبرانی اور بدھ کے دن ۱۰ رمضان ۸ ھ کو مدینہ سے بر آمد ہوئے اور دعا کی الٰہی جاسوسوں اور مخبروں کو قریش سے روک دے (ان کو میری روانگی اور تیاری کی اطلاع نہ ہو)۔

بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا مجھے اور زبیر و مقداد کو رسول اللہ ﷺ نے مامور کیا اور فرمایا کہ (تم تیزی کے ساتھ آگے) جاؤ اور بستان خاخ پر پہنچو وہاں ایک عورت اونٹ پر سوار ملے گی اس کے پاس ایک خط ہے وہ خط اس سے حاصل کر لو۔ حسب الحکم ہم گھوڑوں کو تیز دوڑاتے ہوئے چل دیئے اور بستان خاخ پر پہنچے تو وہ عورت مل گئی ہم نے اس سے کہا خط نکال عورت نے کہا میرے پاس تو کوئی خط نہیں ہے ہم نے کہایا تو خط نکال دے ورنہ کپڑے اتار دے مجبورا اس نے اپنے چونڈے سے خط نکال کر دیا ہم خط لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ خط حاطب بن بلتعہؓ کی جانب سے مشرکین مکہ کے نام تھا جس میں حاطب نے مشرکین کو رسول اللہ ﷺ کے بعض امور کی اطلاع دی تھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حاطب یہ کیا ہے حاطب نے عرض کیا.........یارسول اللہ مجھ پر ناراض ہونے میں عجلت نہ فرمایئے (میری گزارش سن لیجئے بات یہ ہے کہ) میں قریش میں پڑ گیا (اجنبی مستامن) تھا اور حضور ﷺ کے ساتھ جو دوسرے مہاجر ہیں ان کے رشتہ دار مکہ میں موجود ہیں جو ان کے مال و عیال کے نگراں ہیں۔ (مگر میرا وہاں کوئی رشتہ دار نہیں ہے) اس لئے میں نے چاہا کہ جب میرا وہاں کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو کوئی ایسی بات قریش کے لئے مفید کر دوں کہ وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کر دیں میں نے یہ حرکت اسلام سے مرتد ہو کر اور کفر کو اختیار کر کے نہیں کی رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا اس نے سچ بات کہہ دی حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ فرمایا عمرؓ یہ بدر میں شریک تھا اور تم نہیں جانتے کہ بدریوں کے احوال کو جان کر ہی اللہ اہل بدر کے متعلق فرما چکا ہے کہ جو کچھ چاہو کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور اللہ نے آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ .....سَوَاءَ السَّبِيلِ تک نازل فرمائی۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھا اور صحابہؓ نے بھی روزے رکھے لیکن کدید پر پہنچنے کے بعد افطار کر دیا اور صحابہ نے بھی روزے کھول دیئے پھر ختم ماہ تک حضور ﷺ نے روزہ نہیں رکھا۔

عباس بن عبد المطلبؓ مکہ میں حاجیوں کو پانی پلانے کے ذمہ دار تھے اور مکہ میں ہی مقیم تھے لیکن مکہ کو چھوڑ کر پہلے ہی سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بمقام جحفہ حاضر ہو گئے تھے اور عباسؓ کے چچا کا بیٹا ابوسفیانؓ بن حارث اور ابوسفیان کا بیٹا جعفر مقام ابواء میں آکر رسول اللہ ﷺ سے آملے اور مسلمان ہو گئے دوسری روایت میں آیا ہے کہ ابوسفیان بن حارث اور عاتکہ کا بیٹا عبد اللہ بن امیہ جب (مقام ابواء میں) رسول اللہ ﷺ سے ملے تو حضور ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا میری ان سے کوئی غرض نہیں۔ انہوں نے میری عزت برباد کی ہے اور مجھے جو کچھ کہا ہے وہ کہا ہے ان دونوں نے حضرت ام سلمہؓ کی طرف رجوع کیا اور حضرت ام سلمہؓ نے ان کی سفارش کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی پھر کدید میں پہنچ کر جھنڈوں پر پرچم باندھے اور قبائل کو جھنڈے تقسیم کر دیئے رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا حضرت زبیرؓ کے پاس رہا پھر عشاء کے وقت مقام مر الظہران میں اترے۔ قریش کو ان واقعات کی اطلاع اس وقت تک بالکل نہیں پہنچی تھی اسی شب میں ابوسفیان بن حرب اور حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ تجسس احوال کے لئے مکہ سے نکلے رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو (مختلف مقامات میں) آگ روشن کرنے کا حکم دیا حسب الحکم دس ہزار (جگہ) آگ جلائی گئی گویا ہر شخص نے اپنی قیام گاہ پر آگ جلائی غالبا اس سے مراد یہ تھی کہ دیکھنے والوں کو لشکر کی کثرت تعداد معلوم ہو جائے عباسؓ بن مطلب نے اسی رات کہا تھا آہ قریش کی صبح بری ہو گی۔ خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ مکہ میں زبردستی داخل ہو گئے تو ہمیشہ کے لئے قریش کی تباہی ہو جائے گی یہ کہہ کر خچر پر سوار ہو کر نکلے

تاکہ کوئی لکڑہارا یا دودھ والا یا کسی اور کام کو مکہ میں جانے والا اگر مل جائے تو رسول اللہ ﷺ کے قیام فرما ہونے کی اطلاع قریش کو بھجوا دیں تاکہ قریش پہلے ہی آکر حضور ﷺ سے امان مانگ لیں۔ اتنے میں ابوسفیان کی آواز کانوں میں آئی جو کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم آج رات کی طرح میں نے آگ نہیں دیکھی (یعنی کثیر مقام پر یک دم فوجیوں کے پڑاؤ پر اتنی کثرت سے آگ نہیں دیکھی)

حضرت عباسؓ نے کہا ارے ابوسفیان یہ رسول اللہ ﷺ اتنی فوج لے کر آگئے ہیں کہ تم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے ابوسفیان نے کہا پھر کیا تدبیر ہو حضرت عباسؓ نے کہا ابوسفیان اگر تو پکڑا گیا تو تیری گردن ماردی جائے گی اس لئے (مناسب یہ ہے) کہ میرے خچر کے پیچھے سوار ہو جا میں تجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ جاؤں گا وہاں تو امان مانگ لینا چنانچہ حضرت عباسؓ (ابوسفیان کو لے کر پڑاؤ کی طرف) لوٹ پڑے اور جس طرف سے گزرتے تھے لوگ ان کو دیکھتے تھے اور کہتے تھے یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے خچر پر سوار ہیں آخر جب حضرت عمرؓ کی فرودگاہ کی طرف سے گزرے اور حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو دیکھا تو فوراً کھڑے ہوگئے اور بولے یہ اللہ کا دشمن ابوسفیان ہے شکر ہے خدا کا کہ بغیر معاہدہ اور پیمان کے اللہ نے اس پر قابو دے دیا (یہ کہہ کر مارنے دوڑے) حضرت عباسؓ تیزی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی طرف کو دوڑے اور ابوسفیان کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے (پیچھے سے) حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے حضرت عباسؓ نے کہا تم یہ سلوک صرف اس وجہ سے کر رہے ہو کہ ابوسفیان قبیلۂ عبد مناف کا ہے اگر بنی کعب میں سے ہوتا تو تم یہ بات نہ کہتے حضرت عمرؓ نے کہا عباسؓ سختی نہ اختیار کیجئے جس روز آپ مسلمان ہوئے تو آپ کا اسلام مجھے (اپنے باپ) خطاب کے اسلام سے بھی زیادہ پیارا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عباسؓ اس کو اپنے پڑاؤ پر لے جاؤ (عباسؓ لے گئے)

صبح کو پھر ابوسفیان کو لے کر خدمت گرامی میں پہنچے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ارے ابوسفیان کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تجھے لا الہ الا اللہ کا یقین آجائے ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ بہت ہی حلیم کریم اور ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے والے ہیں خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ اگر خدا کی موجودگی میں کوئی دوسرا خدا ہوتا تو اب کچھ کرسکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ارے! ابوسفیان کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تجھے میرے رسول خدا ہونے کا یقین آجائے۔

ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کس قدر تحمل والے کرم کرنے والے اور خاندان سے اچھا سلوک رکھنے والے ہیں لیکن یہ (رسالت) تو اس کے متعلق ابھی میرے دل میں کچھ (تردد ہے) حضرت عباسؓ نے کہا ارے مسلمان ہو جا اور قبل اس کے کہ تیری گردن ماری جائے لا الہ الا اللہ کی شہادت دے دے اس پر ابوسفیان نے کلمہ توحید پڑھ لیا اور مسلمان ہوگیا حکیم اور بدیل ابوسفیان سے پہلے ہی اسلام لاچکے تھے۔

یہ روایت اسحاق بن راہویہ کی سند صحیح کے ساتھ ہے لیکن طبرانی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اللہ کے بندو ابوسفیان اراک (پیلو) کے درختوں میں ہے اس کو وہیں پکڑلو ابن ابی شیبہ نے لکھا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو رسول اللہ ﷺ کے انصاری باڈی گارڈ نے پکڑ لیا تھا اور اس روز حضرت عمرؓ بھی محافظ دستہ میں تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو بند کردو۔ حسب الحکم لوگوں نے ابوسفیان کو صبح تک بند رکھا۔

ابن ابی شیبہ کی یہ بھی روایت ہے کہ ابوسفیان نے کہا تھا مجھے عباسؓ کا پتہ بتاؤ۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ان میں عباس بھی تھے جو ابوسفیان کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں چلا گیا اس کو امان ہے اس فرمان کے بعد ابوسفیان نے کعبہ کے اندر چیخ کر کہا اے گروہ قریش یہ محمد ﷺ تم پر اتنی طاقت لے آئے جس کا تم مقابلہ نہیں کرسکتے۔ پھر امان کی جو خبر ابوسفیان لائے تھے اس کو بیان کیا لوگ یہ اعلان سن کر منتشر ہوگئے کچھ اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے کچھ کعبہ میں داخل ہوگئے۔

جب حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء مسلمان ہوگئے اور بیعت کرلی تو حضور ﷺ نے ان کو قریش کو دعوت اسلام دینے کے لئے اپنے سامنے بھیج دیا اور زبیر کو جھنڈا دے کر مہاجرین اور انصار کے سواروں کا امیر بنا کر روانہ کردیا اور حکم دے دیا کہ بالائی

مکہ میں حجون کے مقام پر پہنچ کر جھنڈے کو نصب کریں اور حکم کے بغیر وہاں سے نہ ہٹیں اسی جگہ سے رسول اللہ ﷺ بھی مکہ میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ کے لئے خیمہ لگایا گیا۔ خالد بن ولیدؓ کو حکم ملا کہ وہ بنی قضاعہ اور بنی سلیم کے مسلمانوں کے ساتھ نشیبی مکہ سے داخل ہوں۔ نشیبی مکہ میں بنی بکر موجود تھے کیونکہ قریش اور حارث بن عبد مناف کی اولاد اور مختلف قبائل کے لوگوں نے بنی بکر کو مکہ سے نکال دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ نشیبی حصہ میں جا کر رہیں خالدؓ اور زبیرؓ کو بھیجنے کے وقت رسول اللہ ﷺ نے حکم دے دیا تھا کہ جو تم سے نہ لڑے اس سے نہ لڑنا۔

سعد بن عبادہؓ کو جھنڈا دے کر حکم دیا گیا تھا کہ کچھ لوگوں کو لے کر کداء سے مکہ میں داخل ہوں۔ سعد جب مکہ میں داخل ہونے کے لئے چلے تو کہنے لگے آج جنگ کا دن ہے آج ممنوع بھی حلال ہے ایک مہاجر نے یہ بات سن لی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سنئے تو سعد بن عبادہؓ کیا کہہ رہے ہیں قریش پر یہ شوکت ان کو کہاں سے حاصل ہو گئی اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تم جھنڈا لے لو اور جھنڈا لے کر (کداء کے راستے سے مکہ میں) داخل ہو۔ حضرت علیؓ نے جھنڈا لے لیا اور لے جا کر رکن پر نصب کر دیا۔

ابو یعلیؒ نے حضرت زبیر کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جھنڈا مجھے دیا تھا اور حضور ﷺ مکہ میں دو جھنڈوں کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور حضرت علیؓ، حضرت زبیر سے پہلے بالائی مکہ میں نہیں پہنچے تھے۔ خالد بن ولید نے جب نشیبی مکہ سے داخل ہونا چاہا تو وہاں قریش وغیرہ جو مشرک موجود تھے انہوں نے مزاحمت کی اور خالدؓ کو ساتھیوں سمیت ہتھیار اٹھا کر چلنے سے روکا اور تیر مارے اور کہنے لگے ان کو زبردستی داخل نہ ہونے دو خالدؓ نے اپنے ساتھیوں کو چیخ کر آواز دی اور مشرکوں سے جنگ کی چوبیس قریشی اور چار بنی ہذیل کے آدمی مارے گئے ابن اسحاقؒ نے لکھا ہے کہ بارہ یا تیرہ مشرک مارے گئے اور سخت شکست کھائی ہر طرف بھاگنے لگے یہاں تک کہ سینہ اور حلق کی سوزش کی وجہ سے کچھ مارے گئے اور کچھ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا مسلمانوں میں سے قبیلہ جہینہ کا صرف ایک آدمی مارا گیا جس کا نام سلمہ بن میلاء تھا یہ خالد کے سواروں میں سے تھا اور کرز بن جابر فہری اور حریش بن خالد بن ربیعہ بھی خالدؓ کے سواروں میں سے مارے گئے...... یہ دونوں خالد کے راستہ سے بچھڑ گئے تھے اور الگ راستہ پر چل دیئے تھے دونوں مارے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے سرداروں کو حکم دے دیا تھا کہ مکہ میں داخل ہونے کے وقت کسی کو قتل نہ کریں ہاں جو مسلمانوں سے جنگ کریں ان کو قتل کیا جا سکتا ہے اس حکم سے نام بنام چند آدمیوں کو مستثنیٰ کر دیا تھا اور حکم دے دیا تھا کہ ان کو ہر حال میں قتل کر دیا جائے خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے نیچے ہی ہوں۔

(1) عبد اللہ بن ابی سرح یہ شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا تھا فتح مکہ کے دن حضرت عثمانؓ نے اس کی سفارش کی تو جان بخشی ہوئی اس کے بعد یہ مسلمان ہو گیا (2) عکرمہ بن ابی جہل یہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گئے اور ان کا اسلام قبول کیا گیا (3) حویرث بن نقید یہ ہجرت سے پہلے مسلمانوں کو بہت دکھ پہنچایا کرتا تھا حضرت علیؓ نے اس کو قتل کر دیا (4) مقیس بن صبابہ اول مسلمان ہو گیا تھا ایک انصاری نے ذی قردہ کے غزوہ میں اس کے بھائی ہشام کو دشمن کا آدمی سمجھ کر غلطی سے مار ڈالا تھا اور مقیس نے انصاری سے اس کی دیت لے لی پھر عہد شکنی کر کے انصاری کو قتل کر دیا اور مرتد ہو گیا اس کو اسی کے قوم کے ایک شخص غیلہ بن عبد اللہ نے قتل کر دیا (5) ہبار بن اسود مسلمانوں کو سخت دکھ دیا کرتا تھا رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب کو اسقاط اسی کی ضرب سے ہوا اور اسی مرض سے آپ کی وفات ہو گئی یہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو معاف کر دیا (6) حارث بن طلاطل خزاعی یہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا کذا ذکرہ ابو معشر (7) کعب بن زہیر شاعر رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا تھا لیکن فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کی مدح کی۔ ذکرہ الحاکم (8) وحشی بن حرب حضرت حمزہ کا قاتل بھاگ کر طائف کو چلا گیا تھا پھر آ کر مسلمان ہو گیا (9) عبد اللہ بن حنظل یہ مسلمان ہو گیا تھا اس کا نام عبد العزیٰ تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام بدل دیا اور عبد اللہ نام رکھ دیا اور محصل صدقات بنا کر بھیجا اور اس کے ساتھ خزاعہ کے ایک شخص کو بھی روانہ کیا خزاعہ شخص عبد اللہ کی خدمت کرتا اور اس کے لئے کھانا پکاتا تھا دونوں ایک منزل پر جا کر اترے

دوپہر کا وقت تھا عبداللہ نے خزاعی کو حکم دیا کہ کوئی جانور ذبح کر کے کھانا تیار کرے مگر خزاعی نے کھانا نہیں تیار کیا اس پر عبداللہ نے خزاعی کو قتل کر دیا اور مرتد ہو کر مکہ کو بھاگ گیا اس کے پاس دو گانے والی لونڈیاں تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہجو کے اشعار گاتی تھیں۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ اور ان دونوں باندیوں کے قتل کا حکم دے دیا سعید بن حریث مخزومی اور ابو برزہ اسلمی نے مل کر عبداللہ کو قتل کر دیا ایک لونڈی بھی ماری گئی دوسری بھاگ گئی پھر مسلمان ہو گئی (10) عمر بن ہاشم کی آزاد کردہ ایک باندی تھی جس کا نام سارہ تھا مکہ میں یہ مغنیہ تھی اور نوحہ خوانی کا پیشہ بھی کرتی تھی اسی کے پاس حاطب بن بلتعہ کا خط برآمد ہوا تھا فتح کے دن مسلمان ہو گئی (11) ابو سفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ جس نے رسول کے چچا حضرت حمزہؓ کا جگر چبایا تھا فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے درگزر فرمائی (12) صفوان بن امیہ یہ بھاگ کر جدہ چلا گیا تھا تاکہ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر یمن کو چلا جائے۔ عمیر بن وہب نے اس کے لئے امن کی درخواست کی حضور ﷺ نے امان دے دی صفوان حاضر ہو گیا اور عرض کیا مجھے اپنے معاملہ پر دو مہینہ تک سوچنے کا اختیار دے دیجئے حضور ﷺ نے چار ماہ کا اختیار دے دیا آخر میں یہ مسلمان ہو گیا۔

مکہ میں داخلہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر عمامہ تھا رواہ احمد و مسلم۔ لیکن صحیحین کی دوسری روایتؓ میں آیا ہے کہ داخلہ کے وقت حضور ﷺ خود پوش تھے۔ دونوں روایتوں کے اختلاف کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ اول حضور ﷺ کے سر پر خود ہو گا پھر خود اتار کر عمامہ پہن لیا ہو گا۔ داخلہ کے وقت رسول اللہ ﷺ لوٹا لوٹا کر سورۂ فتح پڑھ رہے تھے۔ صحیحین

آخر جحون میں پہنچ کر چمڑے کے خیمہ میں حضور ﷺ فروکش ہوئے اس وقت حضور ﷺ کے ساتھ دو بیبیاں حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ بھی تھیں۔ جحون خیف بنی کنانہ میں واقع تھا یہ جگہ وہی تھی جہاں جمع ہو کر قریش اور کنانہ نے باہم قسمیں کھائی تھیں کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے ساتھ نہ نکاح کا رشتہ قائم کریں گے نہ ان کے ساتھ خرید و فروخت کریں گے جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی مدد سے دست بردار نہ ہو جائیں گے یہ قسمیں قائم رہیں گے۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ اپنے گھاٹی والے مکان میں قیام نہیں فرمائیں گے فرمایا عقیل نے ہمارا کوئی مکان چھوڑا ہی کہاں۔ (کہ ہم وہاں ٹھہر سکیں) عقیل نے رسول اللہ ﷺ اور اپنے بھائی بندوں کے مکہ والے سب مکان فروخت کر دیئے تھے مردوں کے بھی اور عورتوں کے بھی (کوئی مکان باقی نہیں چھوڑا تھا) عرض کیا گیا تو پھر اپنے قدیمی مکانوں کو چھوڑ کر مکہ کے اندر کسی اور مکان میں قیام فرمالیجئے۔ حضور ﷺ نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا میں کسی گھر میں داخل نہیں ہوں گا ہر نماز کے لئے جحوں سے کعبہ کو تشریف لاتے تھے۔ غرض فرودگاہ پر دن کے تھوڑے وقت ٹھہرنے کے بعد آپ نے غسل کیا۔ حضرت فاطمہؓ نے پردہ پکڑ لیا آپ نے غسل کے بعد چاشت کی آٹھ رکعتیں پڑھیں۔ رواہ مسلم۔

بخاری کی روایت میں حضرت ام ہانی کا قول آیا ہے کہ آپ نے میرے گھر غسل کیا تھا اور نماز پڑھی تھی پھر اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لے گئے اور کعبہ کے پاس پہنچ کر (طواف کیا اور) لکڑی کی نوک سے رکن کا بوسہ لیا یعنی لکڑی کی نوک سنگ اسود کو لگادی۔ نوک لگادینا بوسہ کا قائم مقام ہو گیا اور تکبیر کہی مسلمانوں نے بھی نعرۂ تکبیر لگایا کہ مکہ گونج گیا رسول اللہ ﷺ اشارہ سے مسلمانوں کو ٹھیرنے کی تلقین فرما رہے تھے اور مشرک پہاڑوں کے اوپر سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے آپ نے سات بار اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں کعبہ کا طواف کیا اور لکڑی کی نوک سے ہر بار سنگ اسود کا بوسہ لیا۔ کعبہ کے آس پاس تین سو ساٹھ بت تھے جو رانگ سے مرصع تھے ہبل سب سے بڑا تھا یہ کعبہ کے سامنے کعبہ کے دروازہ پر تھا۔ اور اساف نائلہ قربانی کے مقام پر تھے رسول اللہ ﷺ جب کسی بت کی طرف سے گزرتے تھے تو اس کی طرف اشارہ کرتے تھے اور جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا پڑھتے تھے بت اشارہ کے ساتھ ہی اوندھے منہ یا پشت کے بل پیچھے کو گر جاتے تھے آپ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگانے پاتے تھے۔ فضالہ بن عمر لیثی نے چاہا کہ طواف کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دے یہ ارادہ کر کے وہ حضور ﷺ کے قریب آیا آپ نے فرمایا فضالہ اس نے جواب دیا جی فرمایا تم دل میں کیا کہہ رہے تھے فضالہ نے کہا کچھ بھی نہیں۔

اللہ کی یاد کر رہا تھا۔ حضور ﷺ یہ سن کر مسکرا دیئے اور فرمایا اللہ سے استغفار کرو۔ یہ فرما کر دست مبارک فضالہ کے سینہ پر رکھ دیا فضالہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دست مبارک میرے سینہ سے اٹھایا بھی نہ تھا کہ آپ کی ذات میری نظر میں ہر شخص سے زیادہ محبوب ہو گئی طواف سے فارغ ہونے کے بعد کھڑی ہوئی اونٹنی سے لوگوں کے ہاتھوں کے سہارے سے نیچے اترے کیونکہ اونٹوں کے بیٹھنے کا کوئی مقام مسجد کے اندر نہ تھا۔ مسجد سے باہر اونٹ کو بٹھایا پھر مقام ابراہیم پر پہنچے۔ مقام ابراہیم کعبہ میں شامل تھا اس وقت آپ خود اور عمامہ پہنے تھے اور دونوں شانوں کے درمیان عمامہ کا شملہ آویختہ تھا اس جگہ آپ نے دو رکعت نماز پڑھی پھر زمزم کی طرف رخ کیا اور اس کے اندر جھانک کر دیکھا اور فرمایا اگر بنی عبد المطلب کے غلبہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں خود اس میں سے ایک ڈول پانی کھینچتا غرض حضرت عباسؓ یا حارث بن عبد المطلب نے ایک ڈول کھینچا اور اس میں سے کچھ پیا اور وضو کیا مسلمان آپ ﷺ کے وضو کے پانی کی طرف ایک دوسرے سے پیش دستی کرنے لگے اور مسابقت کر کے (استعمال کردہ) پانی لے کر اپنے چہروں پر ملنے لگے مشرک اس منظر کو دیکھ رہے تھے اور تعجب کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ہم نے اتنا عالی مرتبہ کسی بادشاہ کو دیکھا نہ سنا پھر آپ نے ہبل کو توڑ دینے کا حکم دیا حسب الحکم ہبل توڑ دیا گیا۔ حضرت علی کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا بیٹھ جاؤ میں کعبہ کے برابر بیٹھ گیا پھر حضور خود اوپر چڑھ گئے اور فرمایا علیؓ آکر میرے کندھوں پر چڑھ جا میں نے حکم کی تعمیل کی حضور ﷺ جب مجھے لے کر اٹھے تو مجھے ایسا لگنے لگا کہ اگر چاہوں تو آسمان کے کنارہ کو چھولوں گا اس طرح میں کعبہ پر چڑھ گیا فرمایا ان کے بڑے بت کو توڑ دے یہ بت تانبے کا تھا اور زمین تک اس میں لوہے کی میخیں ٹھونکی ہوئی تھیں فرمایا اس کو پکڑ لے اور خود پڑھنے لگے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا میں نے بت کو نیچے پھینک دیا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بلال کو کعبہ کی کنجی لینے کے لئے عثمان بن طلحہ کے پاس بھیجا عثمان نے کہا کنجی میری ماں کے پاس ہے عثمان نے ماں سے کنجی منگوائی تو اس نے کہا لات و عزی کی قسم میں تجھے کبھی کنجی نہیں دوں گی عثمان نے کہا نہ دے گی تو میں بھی مارا جاؤں گا اور میرا بھائی بھی عثمان کو گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ انتظار کرتے رہے آخر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بھیجا۔ عثمان کی ماں نے جب حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ کی آواز سنی تو عثمان سے کہا بیٹے ان دشمنوں کے لینے سے تو یہ بہتر ہے کہ تو لے لے عثمان نے کنجی لے لی اور لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا رسول اللہ ﷺ نے کنجی لے کر خود دست مبارک سے کعبہ کو کھولا عثمان اور طلحہ کہا کرتے تھے کہ کعبہ کو کھولنے کا ہمیں کو اختیار ہے (رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے ان کا یہ دعوی ساقط ہو گیا)۔

حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ میرے اندر جانے سے پہلے کعبہ کے اندر سے تمام مورتیاں اور تصاویر دور کر دو مسلمانوں نے کپڑے اتار دیئے صرف تہبند باندھے رہے اور ڈول لے کر رجز پڑھتے ہوئے زمزم پر آئے اور کعبہ کو اندر باہر سے دھونے لگے اہل شرک کا کوئی نشان باقی نہ چھوڑا سب مٹا دیئے اور دھو دیئے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور اسامہ بن زید اور طلحہ اندر داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا اندر پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے ایک ستون دائیں طرف دو ستون بائیں طرف تین ستون اپنے پیچھے دروازہ کی طرف چھوڑے اور قبلہ والی دیوار سے دو یا تین ذراع کا فاصلہ چھوڑ کر بیچ میں کھڑے ہو کر قبلہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں پڑھیں پھر فرمایا یہ قبلہ ہے پھر دروازہ پر کھڑے ہو کر فرمایا ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اپنے بندہ کو کامیاب بنا دیا اور تمام جماعتوں کو خود تنہا شکست دے دی۔ خوب سن لو (جاہلیت کے زمانہ کا) ہر استحقاق اور خون یا مال کا دعوی میرے ان دونوں قدموں کے نیچے (پامال ہو گیا) سب سے اول میں خود ربیعہ بن حارث کا خون ساقط کرتا ہوں ہاں کعبہ کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کا استحقاق اس سے مستثنیٰ ہے۔

سنو لاٹھی اور کوڑے سے اگر قتل ہو جائے یا قتل خطا ہو جو قتل عمد کے مشابہ ہو تو اس کی دیت مغلظہ یعنی سو اونٹنیاں ہیں جن میں چالیس اونٹنیاں گابھن ہوں۔ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور زانی کے لئے پتھر۔ کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے کسی کو کچھ دے دے تمام غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں

کو ایک ہاتھ کی طرح ہو جانا لازم ہے کسی مسلمان کو یا ذمی کو بحالت ذمیت کافر کے عوض نہ قتل کیا جائے۔ دو مذہب والوں میں باہم میراث نہیں ہو گی۔ مسلمانوں کی زکوٰۃ ان کے گھروں اور احاطوں پر پہنچ کر لی جائے۔ محصل زکوٰۃ نہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے ان کو اپنے پڑاؤ پر بلوائے نہ زکوٰۃ دینے والے محصل کو پریشان کرنے کے لئے اموال زکوٰۃ دینے کا اڈہ کسی دوسری جگہ بنائیں۔ کسی عورت کی ماں یا خالہ پر اس عورت سے نکاح نہ کیا جائے (یعنی ماں یا خالہ سے نکاح کر لیا ہو تو پھر اس کی ماں یا بھانجی سے نکاح نہ کیا جائے

دعوے کے گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور (گواہ نہ ہونے کی صورت میں) قسم منکر پر عائد ہو گی کوئی عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے۔ نماز عصر اور نماز صبح کے بعد کوئی نماز جائز نہیں۔ میں تم کو دو دن روزہ رکھنے سے ممانعت کرتا ہوں ایک عید الفطر کے دن دوسرا عید الاضحیٰ کے دن۔ میں تم کو دو صورتوں سے لباس پہننے کی بھی ممانعت کرتا ہوں۔ (1) صرف ایک کپڑے میں گوٹ مارنے سے (اس کی شکل اس طرح ہوتی ہے کہ صرف کرتہ یا صرف تہبند پہن کر کوئی سرینوں کی نوک پر بیٹھ جائے اور پاؤں سمیٹ کر کھڑے کر لے کہ ایڑیاں سرینوں کے قریب آجائیں اور رانیں پیٹ کے قریب پہنچ جائیں اس شکل پر بیٹھنے سے آگے سے برہنگی کا خطرہ ہے اور برہنگی کی حفاظت بھی کر لی جائے تب بھی اعضاء مستورہ غلیظہ کسے بندھے نظر کے سامنے آجائیں گے جو خلاف تہذیب ہے (2) چادر یا کمبل وغیرہ کو اس طرح لپیٹ لیا جائے کہ ہاتھ بھی اندر بند رہ جائیں اور باہر نہ نکل سکیں۔

اے گروہ قریش اللہ نے تم سے جاہلیت کو اور عہد جاہلیت کے غرور خاندانی کو دور کر دیا سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى الخ۔

اے اہل مکہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں تمہارا کیا خیال ہے لوگوں نے جواب دیا آپ اچھے کریم بھائی اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں (اس لئے آپ ہم پر کرم ہی کریں گے) فرمایا آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تم کو معاف کرے وہ ارحم الراحمین ہے جاؤ تم سب آزاد ہو اس حکم کے بعد جب لوگ مجلس سے نکلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبروں سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے ہیں۔

بخاری نے بروایت ابوہریرہؓ لکھا ہے کہ بنی لیث نے جاہلیت کے زمانہ میں بنی خزاعہ کا ایک آدمی مار ڈالا تھا فتح مکہ کے سال اپنے مقتول کے عوض بنی لیث کا ایک آدمی مار ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا مگر اپنے رسول اور مومنوں کو مکہ پر غلبہ عطاء فرمایا خوب سن لو مکہ (پر بزور تسلط) مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہو گا اور میرے لئے بھی دن کی صرف ایک ساعت میں حلال ہوا تھا اور وہ ساعت یہی ساعت تھی۔ اب یہ (ہمیشہ کے) لئے حرام ہے اس کی گھاس نہ کاٹی جائے اس کے درخت نہ کاٹے جائیں یہاں گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے یعنی گری پڑی چیز کو پانے والا اس کو اپنی ملک نہ بنا لے ہاں جس کی چیز گر گئی ہو اور وہ ڈھونڈھ رہا ہو تو اس کو اٹھا لینا جائز ہے۔ اگر کسی کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے دو باتوں میں سے ایک بات کو اختیار کرنے کا اس کو حق ہے یا دیت لے لے یا قصاص یہ سن کر ایک یمنی شخص نے جس کا نام ابو شاہ تھا عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے لئے یہ لکھوا دیجئے فرمایا اس کو لکھ کر دے دو۔ ایک قریشی نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ گھاس کاٹنے کی ممانعت سے اذخر کو مستثنیٰ کر دیجئے فرمایا اذخر مستثنیٰ ہے اذخر مرچیا گند کو کہتے ہیں یہ ایک قسم کی گھاس ہوتی تھی جو مکہ میں بکثرت پیدا ہوتی تھی اور اونٹوں کی خوراک کے کام آتی تھی۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے جاہلیت کے زمانہ میں عقد معاہرہ کیا تھا (یعنی ایک عورت کو داشتہ بنا کر بغیر نکاح کے رکھا تھا اس سے بچے ہوئے ان بچوں کا کیا حکم ہے) حضور ﷺ نے فرمایا جس نے کسی آزاد عورت سے یا کسی غیر کی باندی سے معاہرہ کیا پھر اس کے بچے نے اس زانی سے اپنا نسب ملایا تو یہ جائز نہیں نہ یہ

اس کا وارث ہوگا نہ وہ اس کا وارث ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ سمجھ گئے ہوگے۔ میں اپنی یہ بات کہہ رہا ہوں یعنی کہہ چکا اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے معافی چاہتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مکہ میں منادی نے ندا کردی کہ جو شخص اللہ اور روز آخرت کو مانتا ہے وہ اپنے گھر کے اندر کوئی مورتی بغیر توڑے نہ چھوڑے۔ ظہر کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے اوپر ظہر کی اذان دینے کے لئے بلالؓ کو حکم دیا اس سے مقصود مشرکوں کو جلانا تھا قریش پہاڑیوں کی چوٹیوں پر تھے اور چھپے ہوئے تھے مگر چہرے سامنے تھے (یعنی اس منظر کو دیکھ رہے تھے) ابوسفیانؓ اور خالد بن اسید اور حارث بن ہشام کعبہؓ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خالدؓ بولا اللہ نے (میرے باپ) اسید کی لاج رکھ لی اس نے اس (آواز) کو نہیں سنا۔ حارث نے کہا خدا کی قسم اگر میں اس کو حق پر جانتا تو اس کے پیچھے ہولیتا۔ بنی سعید بن عاص کا ایک شخص کہنے لگا اللہ نے سعید کی لاج رکھ لی کہ کعبہ کی چھت پر اس حبشی کو چڑھا دیکھنے سے پہلے ہی وہ مر گیا ابوسفیان بولا میں کچھ نہیں کہوں گا اگر کچھ بھی بولا تو یہ پتھریاں بھی میری مخبری کردیں گی۔ جبرئیلؑ نے آکر ان لوگوں کی باتوں کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دے دی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کی کہی ہوئی باتیں ان کو بتائیں تو وہ کہنے لگے ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔

اس کے بعد مکہ والے مسلمان ہوئے کسی مسلمان نے ابوقحافہ کے سر پر پتھر مار دیا ان کا سر زخمی ہوگیا اور اسماء کا ہار کسی نے لے لیا حضرت ابوبکرؓ باپ کے پاس پہنچے ان کے چہرہ سے خون پونچھا (اسلام کی طرف سے) ان کے دل میں کینہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ ان کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا میں خود ان کے پاس پہنچ جاتا تم نے بڑے میاں کو وہیں کیوں نہ رہنے دیا۔ پھر حضور ﷺ نے ان کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور وہ مسلمان ہوگئے ابوقحافہ کی داڑھی اور سر ثغامہ (ایک درخت کا سفید پھول) کی طرح سفید تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس رنگ کو بدل دو مگر سیاہی سے الگ رکھو (یعنی سیاہ نہ رنگنا)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ایک چٹان پر بیٹھ گئے حضرت عمرؓ نیچے کی جانب بیٹھ گئے آپ اللہ کو ماننے کی اور لا اله الا الله محمد رسول الله وعبده کی شہادت لینے لگے چھوٹے بڑے عورت مرد سب آنے لگے اور بیعت کرنے لگے۔ مردوں کی بیعت سے فارغ ہوکر عورتوں کی بیعت لی۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ کسی عورت نے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ نہیں چھوا بلکہ آپ ان کی بیعت صرف زبانی لیتے تھے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ طواف سے فارغ ہوکر رسول اللہ ﷺ کوہ صفا پر گئے اور اوپر جاکر اس جگہ کھڑے ہوئے جہاں سے کعبہ دکھائی دیتا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کی حمد، ذکر اور دعا کرنے لگے انصار نیچے تھے انہوں نے آپس میں کہا ان کو اپنے شہر کی طرف رغبت اور اپنے قبیلہ کی طرف میلان طبع ہوگیا ہے حضور ﷺ کے پاس وحی آگئی اور آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا اے گروہ انصار۔ انصار نے جواب دیا لبیک یا رسول اللہ ﷺ فرمایا کیا تم نے ایسی ایسی بات کہی تھی، انصار نے کہا جی ہاں فرمایا۔ حاشا کلا! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ﷺ ہوں۔ اللہ کے واسطے وطن چھوڑ کر تمہاری طرف گیا تھا میری زندگی تمہاری زندگی اور میری موت تمہاری موت کے ساتھ ہے انصار حضور ﷺ کے سامنے رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم نے جو کچھ کہا تھا بخدا اس لئے کہا تھا کہ ہم کو اللہ اور اللہ کے رسول سے انتہائی محبت تھی (ہم کو گوارا نہ تھا کہ اللہ کا رسول ﷺ ہم کو چھوڑ کر پھر مکہ میں آکر مقیم ہو جائے) حضور ﷺ نے فرمایا تمہاری سچائی کی وجہ سے اللہ اور اللہ کا رسول اللہ ﷺ تمہارا عذر قبول کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد قریش کے تین آدمیوں سے روپیہ قرض لیا۔ صفوان بن امیہ سے پچاس ہزار درہم عبداللہ بن ربیعہ سے چالیس ہزار درہم اور حویطب بن عبدالعزی سے چالیس ہزار درہم اور یہ روپیہ کمزور صحابہؓ کو بانٹ دیا پھر ہوازن کی فتح کے بعد یہ قرض ادا کر دیا اور فرمایا قرض کا بدلہ (قرض دینے والے کا) شکریہ اور (قرض کی) ادائیگی ہے۔ یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا آج کے بعد مکہ پر چڑھائی نہ کی جائے اور فتح مکہ کے بعد ہجرت (کی ضرورت) نہیں۔ ابویعلی اور ابونعیم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مکہ کی فتح کے بعد ابلیس آواز سے رونے لگا اس کی ذریت اس کے پاس جمع ہوگئی (اور رونے کا

سبب پوچھا) ابلیس نے کہا اب ناامید ہو جاؤ کہ امت محمدیہ ﷺ شرک کی طرف لوٹ کر آئے گی۔ ابن ابی شیبہ نے مکحول کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو سامنے آکر شیطان حضور ﷺ کی طرف بڑے بڑے شعلے پھینکنے لگے فوراً جبرئیلؑ نے آکر کہا محمد ﷺ ان الفاظ کے ساتھ پناہ مانگو (یعنی یہ الفاظ پڑھو) اعوذ بکلمات اللہ التامۃ التی لا یجاوزھن بر ولا فاجر من شر ما نزل من السماء وما یعرج فیھا ومن شر ما بث فی الارض وما یخرج منھا ومن شر اللیل و النھار ومن شر کل طارق یطرق الا طارق یطرق بخیر یا رحمن۔

بیہقی نے ابن ابی بزی کی روایت سے لکھا ہے کہ جب مکہ کی فتح ہو گئی تو ایک حبشی بڑھیا کھچڑی بالوں والی منہ نوچتی اور واویلا کرتی آئی عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ ہم نے ایک حبشن بڑھیا کھچڑی بالوں والی دیکھی جو منہ نوچتی اور واویلا کرتی آرہی تھی فرمایا وہ کہہ رہی تھی میری آس ٹوٹ گئی کہ تمہارے شہر میں اس کے بعد میری پوجا کی جائے گی۔

فتح مکہ کے دن یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا الخ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن طلحہ کو بلوا کر کعبہ کی کنجی ان کو عطا فرمادی اور فرمایا یہ ہمیشہ نسل در نسل کے لئے لے لو اس کو سوائے ظالم کے تم سے کوئی نہیں چھینے گا اللہ نے تم کو اپنے گھر کا امین قرار دیا ہے پس اس گھر سے تم کو جو کچھ حاصل ہو اس کو جائز طریقہ سے کھاؤ۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے آکر کہا جب تک اس گھر کی اولیت قائم ہے کنجی اور کعبہ کی دربانی عثمان کی نسل میں رہے گی چنانچہ کنجی عثمان کے پاس رہی اور مرتے وقت انہوں نے اپنے بھائی شیبہ کو کنجی دے دی اور یہ کنجی اور دربانی شیبہ کی اولاد کے پاس روز قیامت تک رہے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں انیس شب قیام کیا اس مدت میں قصر کرتے رہے۔ رواہ البخاری۔ ابوداؤد کی روایت میں سترہ رات اور بخاری کی دوسری روایت میں جو ترمذی نے بھی بیان کی ہے اٹھارہ رات کی صراحت ہے تعارض اس طرح دفع کیا جاسکتا ہے کہ اگر داخل ہونے اور واپسی کے دن کو شمار نہ کیا جائے تو سترہ اور دونوں کو شامل کیا جائے تو انیس ہو جائیں گے اور گھنٹوں کا شمار کیا جائے تو اٹھارہ ہوں گے۔ پندرہ کی روایت کو نووی نے خلاصہ میں ضعیف قرار دیا ہے۔

فتح مکہ کے بعد عرب باہم کہنے لگے کہ اے حرم کے باشندو جب محمد ﷺ فتح یاب ہو گئے حالانکہ اصحاب فیل کے حملہ سے اللہ نے تم کو محفوظ رکھا تھا (اور اصحاب فیل کو شکست دے دی تھی) تو اب محمد کے اتباع کے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔ یہ مشورہ طے کر کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے اس سے پہلے ایک ایک دو دو مسلمان ہوتے تھے (مگر اب گروہ کے گروہ ایک وقت میں مسلمان ہونے لگے) اسی کا بیان آیت ذیل میں ہے۔

وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ اگر رَاَیْتَ میں رؤیت سے مراد رویت چشم ہو تو یَدْخُلُوْنَ اَلنَّاسَ سے حال ہوگا اور اگر رویت بمعنی علم ہو تو یَدْخُلُوْنَ رَاَیْتَ کا دوسرا مفعول ہوگا۔ اَفْوَاجًا یَدْخُلُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے یعنی تم نے دیکھ لیا کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

مقاتل اور عکرمہ نے کہا اَلنَّاسَ سے مراد اہل یمن ہیں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اہل یمن تمہارے پاس آئیں ہیں یہ بہت رقیق القلب اور ایمان کے لئے بڑے نرم دل (یعنی ایمان کا جلد اثر قبول کرنے والے) ہیں حکمت تو یمنی ہے فخر اور غرور اونٹ والوں میں ہے اور سکون و بردباری بکریوں والوں میں (یعنی اونٹوں کو چرانے والے بڑے سخت دل مغرور اور شیخی باز ہوتے ہیں اور بکریاں چرانے والے بڑے مسکین طبع اور متحمل مزاج ہوتے ہیں) متفق

علیہ۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یہ شرط مذکور کی جزا ہے۔ بِحَمْدِ کا تعلق فعل مقدر سے ہے یعنی سبحان اللہ وبحمدہ پڑھو اس نعمت پر خدا کی حمد کرو کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ تم قوت کے ساتھ مکہ پر تسلط حاصل کر سکو گے مکہ کو تو اللہ نے اصحاب الفیل سے بھی محفوظ رکھا تھا اور تم کو خدا نے یہ نعمت عطا فرمادی۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوگئے تو لوگوں نے آپ ﷺ کی بڑی اونچی عزت کی یہ دیکھ کر عاجزی کے ساتھ حضور نے سر مبارک اونٹ کے کجاوہ کی لکڑی پر رکھ دیا رواہ الحاکم بسند جید۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ کا سر وسط کجاوہ سے چھونے لگا اور قریب ہونے لگا اس تواضع کی وجہ سے کہ خدا اداد فتح اور مسلمانوں کی کثرت آپ نے دیکھ لی۔ پھر کہا الٰہی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ رواہ ابو یعلی۔

وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اور اللہ سے استغفار کرو۔ یعنی تواضع اور انکسار نفس کے طور پر استغفار کرو اور تم نے جوامت کی رعایت سے فعل حسن (اچھا عمل) کو اختیار کیا اور احسن فعل (بہت ہی اچھے) کو ترک کیا تاکہ امت پر فعل احسن فرض نہ ہو جائے اس کے لئے اللہ سے معافی مانگو[1]۔ یا یہ مراد ہے کہ اپنی امت کے لئے استغفار کرو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں رات دن میں اللہ سے ستر بار استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ستر بار سے زیادہ کا لفظ آیا ہے اور ایک روایت میں سو بار آیا ہے۔ رواہ البخاری والنسائی وابن ماجہ والطبرانی وابو یعلی من حدیث ابی ہریرہ وانس وشداد بن اوسؓ۔ آیت میں استغفار سے پہلے حمد کو اور حمد سے پہلے استغفار کو ذکر کیا کیونکہ طریقہ نزول یہی ہونا چاہئے (اول ذات خدا کی تسبیح پھر اس سے نیچے نعمت کا شکر پھر اپنی لغزشوں کے لئے معافی کی درخواست) دعاء کا یہی مسنون طریقہ ہے لیکن امت کے لئے استغفار سے پہلے درود ضروری ہے (تاکہ دعاء مغفرت قبول ہو جائے)

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳ یعنی جب سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور احکام کا مکلف بنایا اسی وقت سے وہ استغفار کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ثعلبی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ سورت پڑھی تو حضرت عباسؓ رو دیئے حضور ﷺ نے فرمایا کس وجہ سے روتے ہو حضرت عباسؓ نے کہا آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی وفات کی خبر دی گئی ہے فرمایا جیسا تم کہہ رہے ہو ایسا ہی ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اس سورت سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ۔ سورت بتا رہی ہے کہ دعوت پوری ہو گئی اور دین کامل ہو گیا جیسے آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ دین کے کامل ہو جانے کو ظاہر کر رہی ہے مزید یہ کہ استغفار کا حکم بتا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آگیا ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ مجھے بدری بزرگوں کے ساتھ شامل فرماتے تھے کسی بزرگ نے کہا حضرت آپ اس کو ہمارے ساتھ کیوں شامل کرتے ہیں اس کی طرح تو ہمارے بیٹے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو تم جانتے ہو حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ آپ نے ایک دن بدری بزرگوں کو بلوایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ بلوایا اور صرف اس لئے بلوایا کہ ان کو میری کیفیت دکھا دیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا سورت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ الخ کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں ایک صاحب نے کہا اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم اس کی حمد کریں اور اس سے استغفار کریں جبکہ اس نے ہم کو نصرت و فتح عنایت فرمادی۔ ایک

[1] رسول اللہ ﷺ نے کوئی طرز زندگی اتنا اونچا نہیں اختیار کیا کہ امت کے لئے اس کا اتباع دشوار ہو جائے عبادت اور معاملات میں متوسط طریقہ پر چلے اگر تمام رات عبادت میں گزارتے یا رہبانیت اور ترک دنیا کی عملی تعلیم دیتے یا مقدار زکوٰۃ میں غیر معمولی اضافہ کر دیتے تو امت پر ایک مصیبت آجاتی یہاں تک کہ نفل روزوں کے تسلسل کی بھی ممانعت فرمادی تاکہ جسمانی ضعف نہ پیدا ہو جائے گویا شریعت کو سہل العمل بنا دیا اور خود بھی اپنے اعمال میں اسی سہولت کو پیش نظر رکھا غیر معمولی عبادت اور دشوار ترین اخلاق ایثار کا حصول اگرچہ افضل اور احسن تھا مگر حضورؐ نے اس کو ترک کر دیا اور درمیانی درجہ اختیار کیا۔ جلیل القدر نبی کے لئے یہ بات بھی موجب استغفار نہیں اس لئے استغفار کا حکم دیا۔ ۱۲

وقف النبی ﷺ / ع ۳۵

شخص نے کہا ہم کچھ نہیں جانتے بعض لوگوں نے کچھ نہیں کہا۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا تم کیا کہتے ہو میں نے عرض کیا یہ حضور ﷺ کی وفات کی طرف اشارہ ہے اللہ نے آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ جب اللہ کی نصرت آچکی اور مکہ فتح ہو گیا تو یہ تمہاری وفات کی علامت ہے پس اپنے رب کی پاکی بیان کرو اور اس کی حمد کرو اور اس سے استغفار کرو وہ یقیناً توبہ قبول کرنے والا ہے۔
حضرت عمرؓ نے فرمایا میں بھی وہی جانتا ہوں جو تم جانتے ہو۔

امام احمد نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے میری وفات کی اطلاع دی گئی ہے ترمذی نے حضرت انسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ثواب میں چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ بخاری نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع و سجود میں سبحانک اللھم و بحمدک اللھم اغفر بہت پڑھتے تھے۔ مسلم نے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سبحان اللہ و بحمدہ استغفر اللہ اتوب الیہ زیادہ پڑھتے تھے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے میرے رب نے اطلاع دی تھی کہ عنقریب تم اپنی امت کے اندر ایک نشانی دیکھو گے جب تم وہ علامت دیکھو تو سبحان اللہ وبحمدہ استغفر اللہ وا توب الیہ بہت پڑھنا چنانچہ میں نے وہ نشانی دیکھ لی (وہ نشانی ہے) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا حسن بصری نے کہا اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی کہ تمہاری وفات قریب آگئی ہے پس اسی بناء پر اللہ نے پاکی بیان کرنے اور توبہ کرنے کا حکم دیا تاکہ زائد اعمال صالحہ پر آپ کا خاتمہ ہو۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ دو سال تک زندہ رہے۔ واللہ اعلم۔

سورت النصر ختم ہوئی۔

بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ اللّھب

یہ سورت مکی ہے اس میں ۵ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخاری اور مسلم نے صحیحین میں لکھا ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَ تَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقارب کو جمع کیا اور ان کو (اللہ کے عذاب سے ڈرلیا۔ بخاری وغیرہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر آواز دی۔ قریش آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا دیکھو اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ دشمن صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم مجھے سچا جانو گے لوگوں نے کہا کیوں نہیں فرمایا تو میں آنے والے عذاب شدید سے پہلے تم کو ڈراتا ہوں ابو لہب بولا تجھے ہلاکت ہو کیا اسی بات کے لئے تو نے ہم کو جمع کیا تھا یہ کہہ کر ایک پتھر مارنے کے لئے اس نے لیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

تَبَّتْ ہلاک ہو گئے۔ تَبَابٌ ایسا گھاٹا جو ہلاکت کا موجب ہو۔

یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ ابو لہب کے دونوں ہاتھ یعنی اس کی ذات جیسے آیت وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ میں اَیْدِی سے مراد جانیں ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ دونوں ہاتھوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لئے کیا کہ ابو لہب نے ہاتھ سے پتھر مارنے کو اٹھایا تھا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مراد دنیا اور آخرت ہے یا مال اور ملک ہے قلیل ذات ید کم مال والا۔

ابو لہب کا نام عبد العزی بن عبد المطلب تھا مقاتل نے کہا حسن اور چہرہ کی چمک کی وجہ سے عبد العزی کی کنیت ابو لہب ہو گئی تھی (شعلہ رو) اس جگہ کنیت اس لئے ذکر کی کہ نام کا ذکر قبیح تھا اور دوزخی ہونے کی وجہ سے اس کی کنیت کا لغوی معنی اس کے حال کے مناسب تھا (گویا ابو لہب کا لغوی ترجمہ دوزخی ہو گیا) اس کے علاوہ ذات لہب کے مناسب بھی لفظ ابو لہب تھا (عبد العزی کہنا بے جوڑ تھا)

وَّتَبَّ ۝۱ اور وہ ہلاک ہو گیا۔ تکرار مفید تاکید ہے۔ یا تَبَّتْ بددعا کے لئے اور تَبَّ خبر دینے کے لئے (ابو لہب ہو جائے اور وہ ہلاک ہو گیا۔ آئندہ ابو لہب یقینی طور پر ہلاک ہونے والا تھا اس لئے بجائے مستقبل کے ماضی کا صیغہ ذکر کر دیا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقرباء کو دعوت اسلام دی تو ابو لہب نے کہا میرا بھتیجا جو کچھ کہہ رہا ہے (یعنی جس عذاب سے ڈرا رہا ہے) اگر وہ سچ ہے تو میں اپنا مال اور اپنی اولاد اپنے عوض دے کر اپنی جان کو رہا کرا لوں گا اس پر اللہ نے نازل فرمایا۔

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ مَا نفی کے لئے یا استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی اس کا جمع کردہ مال اس سے عذاب کو دور نہیں کرے گا یہ مطلب ہے کہ اس کا مال کیا اس کو عذاب سے بچالے گا۔ ابو لہب بڑا مالدار اور مویشیوں کا مالک تھا۔

وَمَا كَسَبَ ۝۲ اور جو کچھ اس نے حاصل کر رکھا ہے یعنی مال و اولاد۔ حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا اپنی کمائی کھانا تمہارے لئے پاکیزہ ترین کھانا ہے اور تمہاری اولاد تمہاری کمائی ہے (گویا کسب کا اطلاق مال پر بھی ہوتا ہے اور اولاد پر بھی) رواہ البخاری فی التاریخ والترمذی۔

ابو لہب کے بیٹے عتبہ کو شام کے راستہ میں شیر نے پھاڑ کھایا اور خود ابو لہب واقعۂ بدر سے چند روز کے بعد چیچک سے

مر گیا اور چند حبشیوں کو کرایہ پر لے کر لوگوں نے اس کو دفن کر لیا۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ یہ دوزخ کی وعید ہے۔ ذَاتَ لَهَبٍ بھڑکتی ہوئی، یعنی عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں جلے گا۔

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ اور اس کی بیوی بھی۔ سَيَصْلٰى کی ضمیر فاعل پر اس کا عطف ہے اور فصل کلام کی وجہ سے ایسا ہونا جائز ہے۔ یا مبتدا ہے اور آئندہ کلام یعنی فِيْ جِيْدِهَا الخ اس کی خبر ہے ابولہب کی بیوی ام جمیل بنت حرب بن امیہ یعنی ابوسفیان کی بہن تھی۔

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ اظہار مذمت کی خصوصیت کے لئے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کو نصب کے ساتھ لایا گیا۔ ابن اسحاق نے خاندان ہمدان کے ایک شخص کا قول نقل کیا ہے۔ اس شخص کا نام یزید تھا۔ کہ ابولہب کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے راستہ میں کانٹے اور جھانکڑ ڈال دیتی تھی تاکہ آپ زخمی ہو جائیں اسی لئے یہ لفظ نازل ہوا۔ ضحاک کا بھی یہی قول مروی ہے۔ ابن المنذر نے اس قول کو عکرمہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ بروایت عطیہ حضرت ابن عباس کا قول بھی یہی آیا ہے۔ لیکن قتادہ مجاہد اور سدی کے نزدیک حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے مراد ہے چغل خور (آگ لگا دینے والی) ام جمیل چغلیاں کھاتی پھرتی تھی ایک کی بات دوسرے سے جا لگاتی تھی اس طرح لوگوں میں عداوت پیدا کرا دیتی اور آگ بھڑکا دیتی تھی۔ جیسے لکڑیوں سے آگ بھڑکتی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا الحطب سے مراد ہیں گناہ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا معنی ہے گناہ کا بار اٹھانے والی۔ اللہ نے فرمایا ہے وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ۔

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝ جِيْد گلا مَسَد سے مراد ہے لوہے کے تاروں سے مضبوط بٹی ہوئی وہ زنجیر جو ستر ہاتھ لمبی ہوگی اور منہ میں ڈال کر سرینوں سے کھینچی جائے گی اور جو حصہ باقی رہ جائے گا وہ اس کی گردن میں لپیٹ دیا جائے گا۔ مَسَد مضبوط بٹی ہوئی رسی کو کہتے ہیں خواہ کسی چیز کی ہو یہ قول حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عروہ بن زبیر کا ہے۔ اعمش نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ مسد لوہے کی ہی ہوتی ہے۔ شعبی اور مقاتل نے کہا اس سے مراد وہ رسی ہے جو کھجور کے ریشوں سے بنی ہوئی تھی اور ام جمیل اس میں لکڑیاں باندھتی تھی ایک روز لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر لا رہی تھی کہ تھک کر ایک پتھر پر آرام لینے بیٹھ گئی پیچھے سے ایک فرشتہ نے آ کر رسی کھینچ کر اس کو ہلاک کر دیا۔ ابن زید نے کہا مسد یمن میں ایک درخت ہوتا ہے اس کے ریشوں کی رسی مراد ہے۔ قتادہ نے کہا ہار مراد ہے حسن بصریؒ نے کہا اس کے گلے میں کچھ پوتھ پڑے رہتے تھے وہ مراد ہیں۔ سعید بن المسیب نے کہا اس کے گلے میں ایک بڑھیا خوبصورت ہار تھا۔ وہی مراد ہے اس نے کہا تھا کہ محمد ﷺ کی دشمنی میں میں یہ ہار خرچ کر دوں گی۔

بہر حال اگر مَسَد سے مراد لوہے کے تاروں کی رسی ہو تو یہ واقعہ آخرت میں ہوگا۔ اس صورت میں اِمْرَاَتُهٗ مبتدا ہے فِيْ جِيْدِهَا خبر ہے یا حال ہے اگر اِمْرَاَتُهٗ کو سَيَصْلٰى کا فاعل قرار دیا جائے اور حَمَّالَةَ الْحَطَبِ منصوب بالذم ہے۔ چونکہ وہ حمالة الحطب دنیا میں تھی اور آخرت میں فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کا وقوع ہوگا اور دونوں کا زمانہ الگ الگ ہے اس لئے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ کو حال نہیں کہا جا سکتا ہاں اگر حَمَّالَةَ الْحَطَبِ سے مراد ہو دوزخ کے اندر زقوم اور تھوہر کی لکڑیاں اٹھانے والی تو فِيْ جِيْدِهَا کو اس سے حال کہا جا سکتا ہے۔ کذا ذکر البیضاوی۔ لیکن یہ تفسیر سلف سے منقول نہیں ہے۔

اور اگر حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سے مراد معمولی رسی ہو اور اسی زندگی میں اس کے گلے میں رسی کا ہونا مقصود ہو تو فی جیدھا مبتدا محذوف کی خبر ہوگی یا امراتہ کی دوسری خبر ہوگی یا حمالة الحطب کی حالت کا اظہار ہوگا۔ ظاہر یہ ہے کہ کلام مجازی ہے اور جس طرح کوئی عورت لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر سر پر رکھتی اور اس کی رسی گردن میں باندھ لیتی ہے تاکہ گٹھا سرک نہ جائے۔ اسی طرح ام جمیل کی ذلت و حقارت بتانے کے لئے اس واقعہ کی تصویر الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ کلام کا حقیقی مفہوم مراد

نہیں۔ شعبی نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ بعید از فہم ہے کیونکہ ام جمیل اور اس کا شوہر دونوں مالدار اور آبرودار گھرانے کے افراد تھے (عزت مند رمالدار عورت ایسا نہیں کر سکتی) واللہ اعلم

سورۃ اللھب ختم ہوئی۔

بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورة الاخلاص

یہ سورت مکی ہے اس میں ۴ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالعالیہ نے حضرت ابی بن کعبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ اپنے رب کا نسب بتاؤ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ رواہ الترمذی والحاکم وابن خزیمہ۔

طبرانی اور ابن جریر نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے انہی دونوں روایات کی بناء پر اس سورت کو مکی کہا گیا ہے۔ لیکن ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ یہودی جن میں کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب بھی تھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا محمد جس خدا نے تم کو بھیجا ہے اس کے اوصاف ہم سے بیان کرو اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ابن جریرؒ نے قتادہؒ کا اور ابن منذرؒ نے سعید بن جبیرؒ کا بھی یہ ہی قول نقل کیا ہے۔ بغوی نے ضحاک قتادہ اور مقاتل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کچھ یہودی عالم خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اپنے رب کے صفات بیان کرو ممکن ہے ہم آپ پر ایمان لے آئیں کیونکہ اللہ نے تورات میں اپنے احوال بیان کر دیئے ہیں اور ہم کو بتا دیا ہے کہ وہ کس چیز سے (بنا ہوا) ہے اور کھاتا پیتا ہے (یا نہیں) اور وہ کس کا وارث ہوا ہے اور کون اس کا وارث ہو گا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل کی۔

ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں بروایت ابان حضرت انسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا ابوالقاسم اللہ نے ملائکہ کو نور حجاب سے پیدا کیا اور آدمؑ کو گوندھی ہوئی لیسدار کیچڑ سے اور ابلیس کو آگ کی شعلوں سے اور آسمان کو دھوئیں سے اور زمین کو پانی کے جھاگوں سے اب اپنے رب کے متعلق بتاؤ (کہ وہ کس چیز سے بنا ہوا ہے) رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا اس پر جبرئیلؑ یہ سورت لے کر نازل ہوئے۔

ان روایات کی بناء پر اس سورت کو مدنی کہا گیا ہے۔

ابن جریر نے ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ مختلف گروہوں کے لیڈروں نے عرض کیا تھا کہ ہم سے اپنے رب کا نسب بیان کرو اس کے جواب میں جبرئیلؑ یہ سورت لے کر نازل ہوئے۔ اس قول پر روایات کا تعارض باقی نہیں رہتا اور ظاہر ہوتا ہے کہ سورت مدنی ہے اور حضرت ابی بن کعب والی حدیث میں جن مشرکوں کے حاضر ہونے کا ذکر ہے ان سے مراد مختلف گروہوں کے لیڈر ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے یہودیوں نے اور قبائل مشرکین کے سرداروں نے سب نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا ہو۔

بغوی نے ابوالظبیان اور ابوصالح کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے عامر نے عرض کیا محمد ﷺ تم کس کی طرف ہم کو بلاتے ہو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کی طرف۔ عامر نے کہا اپنے رب کی حالت تو بیان کرو کیا وہ سونے کا ہے یا چاندی کا لوہے کا ہے یا لکڑی کا اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ اربد پر بجلی گری اور اس طرح وہ مارا گیا اور عامر طاعون سے مرا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ هُوَ ضمیر شان مبتدا ہے اور آئندہ جملہ اس کی خبر ہے اس صورت میں مرجع کی

ضرورت نہیں یا ھو ضمیر ہے اور اس رب کی طرف راجع ہے جس کے اوصاف سوال کرنے والوں نے پوچھے تھے۔ یعنی اے محمد ﷺ کہہ دو کہ میرے رب کے اوصاف جو تم پوچھتے ہو تو وہ اللہ ایک ہے احد اللہ سے بدل ہے یا ھو کی دوسری خبر ہے اَحَدٌ اصل میں وحد تھا۔ وحد اور واحد دونوں ہم معنی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قرات میں ہُوَاللّٰہُ لَوَاحِدٌ آیا ہے حضرت عمرؓ کی قرات بھی یہی ہے۔

اگر ھُوَ کو ضمیر شان اور اللہ کو مبتدا اور اَحَد کو خبر کہا جائے تو کلام کی صحت ظاہری معنی پر مبنی نہیں ہے کیونکہ اللہ جزئی حقیقی کا نام ہے اور جزئی حقیقی میں احتمال ہی نہیں ہوتا کہ چند اشخاص پر اس کا اطلاق ہو سکے جیسے زید (ابتداء وضع میں) عَلَم ہے اور کلی عمومی نہیں پس اس کے بعد اَحَد کہنا غیر مفید ہے[1] لہٰذا ضروری ہے کہ لفظ اللہ سے ایک ایسی عمومی ذات مراد لی جائے جو معبود کل ہونے کی مستحق ہو اور کسی کے معبود ہونے کا استحقاق صرف اسی کو ہو سکتا ہے جس نے اس کو نیست سے ہست کیا ہو اور لوازم ہستی عطا کئے ہوں اور کسی کو عطاء وجود وہی کر سکتا ہے جس کا اپنا وجود خود بخود ہو اور ضروری ہو اور اس کی صفات کاملہ ہوں موجبات نقص وزوال کا تحقق اس میں ناممکن ہو ممکنات سے اس کی ذات و صفات بالکل الگ ہوں ممکنات کی صفات وذات کا اس میں شائبہ بھی نہ ہو کیونکہ اگر ممکن کی صفات کا کوئی شائبہ اس میں ہوگا تو نقصان وزوال کا موجب ہوگا جس کا خود اپنا وجود نہ ہو وہ دوسرے کو وجود کیسے دے سکتا ہے دوسروں کو عطاء وجود تو ذاتی وجود پر متفرع ہے ممکنات میں سے کوئی چیز ہو جوہر ہو یا عرض یا انسان کا کوئی عمل کسی کی ہستی بھی نیستی سے نکل کر نہیں آسکتی جب تک ہست کرنے والے کی اپنی ہستی نہ ہو اور نقص وزوال سے پاک نہ ہو پس معبود مطلق وہی ہے جو واجب الوجود ہے جس کی صفات کاملہ ہیں جو ہر نقص وزوال سے پاک ہے پس وہی واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس تشریح پر کلام ضرور مفید ہو جائے گا (اور اللہ احد میں حمل اولی غیر مفید نہ رہے گا) مگر جواب سوال کے مطابق نہ ہوگا کیونکہ کافروں نے اللہ کی توحید یا تعدد کے متعلق سوال نہیں کیا تھا رسول اللہ ﷺ بلند آہنگی کے ساتھ توحید کی تو دعوت دے ہی رہے تھے اور لا الہ الا اللہ پکار ہی رہے تھے اصل سوال تو خدا کی ذاتی حقیقت سے متعلق تھا انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ محمد ﷺ جس رب نے تم کو بھیجا ہے اس کے اوصاف بیان کرو کہ وہ سونے کا ہے یا چاندی کا لوہے کا ہے یا لکڑی کا۔

اگر ھو ضمیر کا مرجع اس رب کو قرار دیا جائے جو سوال کرنے والوں کے سوال میں مذکور تھا تب بھی جواب سوال کے مطابق نہیں ہو سکے گا کثرت اور وحدت کا سوال ہی نہیں ہے بلکہ رسول بنا کر بھیجنے والے خدا کی حقیقت ترکیبیہ کا سوال ہے۔ لہٰذا

دونوں صورتوں میں اَحَد سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ہر طرح کے ترکب۔ اجزائی تقوم۔ تعدد۔ نیز ترکب کے تمام لوازم

---

(۱) اگر ایک لفظ کی وضع کسی عام مفہوم کے لئے ہو اور اس مفہوم کا تحقق متعدد یا کم سے کم دو چیزوں میں عقلاً ہو سکتا ہو تو اس کو کلی کہتے ہیں جیسے سیب انار گھوڑا گدھا انسان لوٹا پیالہ وغیرہ عمومی الفاظ ہیں اور ان کے اطلاق میں احتمال کثرت و عموم ہے۔ لیکن اگر کسی لفظ کی وضع کسی خاص معین شخص کے لئے ہو اور باعتبار وضع کے اس کے مفہوم میں کلیت عموم اور احتمال کثرت نہ ہو تو اس کو جزئی حقیقی کہتے ہیں۔ جیسے زید عمر بکر اللہ محمد ﷺ وغیرہ اصل میں تو جزئی کلی مفہوم کے اقسام ہیں لیکن مجازاً ان الفاظ کو بھی کہہ لیا جاتا ہے جن کے مفہوم میں عموم یا تعین ہو۔ پس اللہ ایک معین ذات کا نام ہے جو خالق کائنات ہے رازق ہے وغیرہ وغیرہ لہٰذا وضع کے اعتبار سے اس میں کثرت اور عموم کا احتمال ہی نہیں ہے۔ جزئی حقیقی میں کثرت کا احتمال ناممکن ہوتا ہے اس کے بعد احد کہنا ایسا ہی ہوا جیسے زید زید ہے یا اللہ اللہ ہے یا ایک ایک ہے کہا جائے ایسا کلام اپنے اندر کوئی افادیت نہیں رکھتا۔ ہر چیز اپنی ذات کا عین ہوتی ہے (اہل منطق کی اصطلاح میں اس کو حمل اولی کہتے ہیں اور اس کو غیر مفید کہا جاتا ہے) پس لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ لفظ اللہ میں احتمال کثرت تھا اور احد کہنے کے بعد اس احتمال کثرت کو رد کر دیا گیا یعنی اللہ کی لفظی وضع ذات واجب الوجود کے لئے ہے خواہ واجب الوجود ایک ذات ہو یا دس۔ یہ لفظ وحدت شخصیہ پر دلالت نہیں کرتا گویا یہ لفظ جزئی حقیقی نہیں بلکہ وضع کے لحاظ سے کلی ہے اور کثیر پر اس کا صدق ہو سکتا ہے اور چند اللہ ہو سکتے ہیں مگر عقل بتا رہی ہے کہ چند واجب الوجود ہونا محال ہیں اس لئے اس کا حصر ایک ہی ذات میں ہو گیا اور کسی دوسری ذات کا اللہ ہونا محال ہو گیا اب اللہ کے بعد احد کا ذکر مفید ہو گیا۔

یعنی جسمانیت۔ ہیئت وضع اور تحیز سے پاک ہے نہ اپنی حقیقت میں کسی چیز کے ساتھ شریک ہے نہ کسی صفت کمال میں کوئی چیز اس کے مشابہ ہے جب ذات و صفات میں اس کی طرح کوئی نہیں تو لامحالہ نہ کوئی اس کی نظیر ہے نہ ضد نہ مثل اسی لئے صوفیہ صافیہ نے کہا ہے کہ اللہ کی احدیت ذات و صفات کا تقاضا ہے کہ وجود میں اس کا کوئی شریک نہ ہو وجود تمام صفات کی جڑ ہے اور حیات تمام صفات کا مبدء علم، قدرت، ارادہ، کلام، سمع، بصر اور تکوین حیات پر مبنی ہیں۔ اور حیات وجود کی فرع ہے یعنی وجود مصدری کی گویا ایک انتزاعی امر ہے۔ جس کا مبدء انتزاع وجود ہے اسی لئے صوفیہ نے لا الہ الا اللہ کا معنی لاموجود الا اللہ بیان کیا ہے کیونکہ واقع میں موجود حقیقی سوائے خدا کے کوئی نہیں تمام ممکنات کا وجود واقعی نفس الامری اور حقیقی وجود کے سایہ کی طرح ہیں بے اصل۔ باطل۔ بے حقیقت یہی حال تمام صفات کا ہے (کہ صفات الٰہیہ اصلی ہیں حقیقی ہیں اور صفات ممکن ان کا سایہ اور پرتو اللہ نے فرمایا ہے ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَالْحَقُّ وَاَنَّ مَایَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَالْبَاطِلُ یعنی اللہ ہی ثابت موجود حق اور اصلی ہے اور جس کو وہ پکارتے ہیں وہ واقع میں ہیچ ہے کچھ بھی نہیں دوسری آیت ہے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (ہر چیز زوال پذیر اور بے حقیقت ہے سوائے ذات الٰہیہ کے پس ممکن کی صفات اللہ کی صفات کے ساتھ صرف نام میں شریک

اللہ کی سات صفات ہیں حیات علم قدرت ارادہ کلام سمع تکوین اور آٹھویں صفت وجود ہے جو تمام صفات کی اصل ہے۔ حیات اور وجود ایک نہیں ہیں بقیہ دوسری چھ صفات کا مبدء تو حیات ہے مگر حیات ایک انتزاعی امر ہے وجود مصدری کی فرع ہے اصل سب کی وجہ حقیقی ہے۔ توضیح مقام کے لئے ہم بطور اختصار کہتے ہیں کہ اللہ کی صفات تین طرح کی ہیں (۱) صفات فعلیہ ذوالاضافۃ یعنی وہ صفات جن کا بالفعل تفصیل ظہور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ذات خداوندی سے الگ کوئی دوسری چیز اثر قبول کرنے والی نہ ہو جیسے صفت تکوین اگر کوئی مخلوق بالفعل نہ ہو اور کوئی چیز اس صفت کی معمول نہ ہو تو اس صفت کا ظہور نہ ہوگا تکوین کے ذیل میں تخلیق رزق ربوبیت وغیر داخل ہیں اور یہ سب اپنے ظہور کے لئے کسی کی اثر پذیری کی ضرورت مند ہیں اگر مرزوق اور مربوب اور مخلوق صفت رزاقیت و ربوبیت خلاقیت کا اثر قبول کرنے والے نہ ہوں تو ان صفات کا ظہور بالفعل کسی طرح ہو (۲) صفات فعلیہ غیر ذوالاضافۃ۔ یعنی ایسی صفات جو ذات کی تابع ہیں اپنا مفہوم بھی جدا رکھتی ہیں مگر ان کا بالفعل ظہور کسی غیر کی اثر پذیری پر موقوف نہ ہو بلکہ صرف ذات ہی ان کے اظہار اور ظہور کے لئے کافی ہو جیسے علم باری تعالیٰ کہ اس صفت کا ظہور وجود ممکنات پر موقوف نہیں اگر کسی ممکن کا وجود نہ ہو تا تب بھی خدا بالفعل عالم ہو تا یعنی اپنی ذات اور ہستی کو جانتا (۳) صفات ذاتیہ یعنی وہ صفات جن کا کوئی مفہوم بھی ذات کے علاوہ نہیں جیسے وجود خدا۔ وجود خدا کا کوئی تصور ذات خدا کے علاوہ نہیں وجود خدا مفہوم کے لحاظ سے یہی عین ذات ہے۔ اللہ کی یہ تمام صفات اصلی ہیں حقیقی ہیں واقعی ہیں سچی ہیں کوئی مخلوق کسی وصف میں اس کی شریک یا مشابہ نہیں یعنی کسی ممکن میں کوئی وصف حقیقی نہیں اصلی نہیں نفس الامری نہیں بلکہ مجازی ہے ظلی ہے تبعی ہے عکسی ہے مثلاً مخلوق کا علم اصلی نہیں حقیقی نہیں بلکہ علم خداوندی کا ایک سایہ اور پرتو ہے اس لئے علم ممکن کو مجازاً علم کہہ لیا جاتا ہے حقیقت میں نہ مخلوق کے اندر صفت قدرت ہے نہ کلام نہ سمع بصر نہ ارادہ و مشیت بلکہ حیات بھی حقیقی نہیں صرف اللہ کی قدرت کلام سمع بصر ارادہ مشیت اور حیات کے یہ سایے ہیں بے حقیقی بے اصل غیر نفس الامر سراسر باطل یہی وجہ ہے کہ ان صفات میں باری تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں کیونکہ مجاز حقیقی کا جھوٹ سچ کا باطل حق کا اور سایہ اصل کا نہ شریک ہو سکتا ہے نہ اس کے مشابہ اور مثل ظلی صفات کو صفات کہنا ہی بے اصل ہے پرتو کو اصل قرار دینا ہی باطل ہے۔ اللہ کی صفات میں سب سے بلند صفت وہی ہے جس کو ہم صفت ذاتیہ کہہ چکے ہیں یعنی وجود باقی صفات اسی وجود ذات پر مبنی ہیں اگر نعوذ باللہ بالفرض وجود ذات ہی نہ ہوتا تو ان بقیہ صفات کا اطلاق کس پر کیا جاتا اور یہ ابھی ہم کہہ چکے ہیں کہ تمام صفات فعلیہ حقیقی ہیں یعنی اللہ کے سوا کوئی بھی ان صفات سے موصوف نہیں ممکنات میں ان صفات کا تحقق نام کا ہے حقیقت میں ان صفات کا تحقق واجب تعالیٰ میں ہے پس جب باری کی صفات فعلیہ جو صفات ذاتی سے کم درجہ کی ہیں ناقابل شرکت ہیں اور صرف یہی صفات واقعی ہیں ممکن کی صفات غیر واقعی ہیں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ اللہ کی صفت ذاتی یعنی وجود بھی حقیقی اصلی نفس الامری اور حق ہے اور ساری کائنات کی ہستی غیر حقیقی بے اصلی باطل اور ظلی ہے کائنات پر وجود کا اطلاق محض نام کا ہے۔ واقع میں اس کا وجود وجود الٰہی کا ایک پرتو ہے سایہ ہے عکس ہے جو بجائے خود کچھ نہیں اسی لئے لا الہ الا اللہ کا معنی علماء باطن اور حقیقت شناس اہل عرفان لا معبود الا اللہ نہیں کرتے بلکہ لا موجود الا اللہ کرتے ہیں اس سارے فریب نظر سنسار میں ایک ہی وجود ہے وہی موجود ہے باقی دھوکہ۔ واللہ اعلم

ہیں اشتراک حقیقی نہیں ہے۔ جو شخص کلام صوفیہ کی حقیقت کو نہ سمجھ سکتا ہو اس کو لول ان کے دامن سے وابستہ ہونا چاہئے تاکہ اس پر حق کا انکشاف ہو جائے کیا رب کی توحید وجود ربوبیت کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا علم حضوری رکھتا ہے در حقیقت یہ لوگ رب کی پیشی میں جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہیں خوب سن لو کہ اللہ یعنی اس کی قدرت اور علم ہر چیز کو محیط ہے۔

ایک ہی جملہ میں ذات اور تمام صفات کی طرف اشارہ کر دیا لفظ قُلْ میں نبوت اور تبلیغ کی جانب اشارہ ہے اور اسی آیت کا اعجاز نبوت کی شہادت دے رہا ہے۔ پس جملہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے بے نیاز بنانے کے لئے کافی ہے۔

باقی رہی یہ تحقیق کہ اللہ کی صفات ذات کی عین ہیں یا غیر ذات تو اس سے کوئی دینی غرض وابستہ نہیں یہ فلسفی مباحث ہیں اور ان سے بحث کرنا ہی تباہ کن ہے اللہ نے فرمایا ہے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا جب انسان کو روح کی حقیقت کا علم نہیں دیا گیا حالانکہ روح مخلوق ہے تو خالق کی ذات وصفات کا علم اسے کیسے حاصل ہو سکتا ہے اس کے علم سے عاجز رہنا ہی علم ہے اور اس میں کدوکاوش کرنا شرک ہے وہاں تک رسائی کا راستہ صرف معیت ہے اور کوئی نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ہم قدر کے متعلق باہم بحث کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ برآمد ہو گئے فوراً اتنے غصہ میں ہو گئے کہ چہرہ مبارک سرخ ہو گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انار کے دانے توڑ کر چہرہ پر مل دیئے گئے ہیں اور فرمایا کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اسی لئے مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے تم سے پہلے لوگوں نے جب اس بات میں بحثیں کیں تو نتیجہ سوائے تباہی کے کچھ نہیں نکلا میں تم کو لازمی حکم دیتا ہوں کہ اس بحث میں نہ پڑو۔ رواہ الترمذی۔ ابن ماجہ نے ایسی ہی حدیث بروایت عمرو بن شعیب از شعیب بیان کی ہے۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور سعید بن جبیر نے کہا صَمَدُ کا معنی ہے نڈر یعنی جس کو کوئی خوف نہ ہو۔ ابن جریرؒ نے حضرت بریدہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اور میرے خیال میں یہ قول مرفوعاً بیان کیا ہے ممکن ہے کہ مجازاً ایسی ذات مراد لی جائے جو عقل و فہم کی رسائی اور وہم کے ادراک سے بالا ہو۔

شعبی نے کہا صمد وہ ہے جو نہ کھائے نہ پئے۔ بعض علماء نے کہا اس لفظ کی تشریح آئندہ کلام ہے ابو العالیہ نے حضرت ابی بن کعب کا یہی قول بیان کیا ہے ابو الوائل شقیق بن سلمہؒ نے کہا صمد وہ سردار ہے جس کی سیادت چوٹی پر پہنچ گئی ہو یعنی جس کی سیادت بہمہ وجوہ کامل ہو ابو طلحہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول یہی آیا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا صمد وہ ہے جو اپنے تمام صفات اور افعال میں کامل ہو۔ بعض کا قول ہے صمد وہ ہے جو ہر حاجت کا مقصود ہو۔ (یعنی ہر کام کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے) بعض نے کہا صمد وہ سردار ہے کہ جو کچھ مانگا جائے تو اسی سے مانگا جائے اور مصیبت میں فریاد کی جائے تو اسی سے کی جائے ہر کام کے لئے اسی کا قصد کیا جائے صمد تہ یعنی میں نے اس کا قصد کیا عربی محاورہ ہے۔

قتادہ نے کہا مخلوق کے فناء ہونے کے بعد باقی رہنے والا صمد ہے عکرمہؒ نے کہا صمد وہ ہے جس سے بالا کوئی نہیں یہی قول حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے ربیع نے کہا صمد وہ ہے جس پر کوئی مصیبت نہ آسکے مقاتل بن حبانؒ نے کہا صمد کا معنی ہے بے عیب۔

میرے نزدیک صمد کا حقیقی معنی ہے مقصود صاحب قاموس نے کہا ہے کہ صمد کا معنی ہے قصد کرنا اور صمد میم کے فتحہ کے ساتھ سردار کو کہتے ہیں کیونکہ (ہر کام کے لئے اس کی رعایا اس کا ہی قصد کرتی ہے) وہ مقصود ہوتا ہے) اَلصَّمَدُ کا الف لام بتا رہا ہے کہ وہ صمدیت کی چوٹی پر پہنچا ہوا ہے یوں تو لوگ فساد فہم اور حق الیقین کے راستہ پر نہ چلنے کی وجہ سے دنیا اور دنیا کی چیزوں کو بھی اپنا مقصود بنا لیتے ہیں (مگر کوئی چیز بھی واقع میں مقصود ہونے کے قابل نہیں اصل مقصود اللہ ہی ہے) اقوال مذکورہ بالا میں لفظ صمد کی جتنی تشریحات آئی ہیں وہ صمد کے اصل معنی (مقصود) کے لوازم ہیں (یعنی سلف نے لفظ صمد کی تشریح باللوازم) کی ہے اصل معنی نہیں بیان کئے ہیں) کیونکہ مقصود مطلق وہی ہو سکتا ہے جس کے سب محتاج ہوں اور وہ کسی کام میں کسی کا محتاج نہ ہو لا محالہ اس کے اندر تمام کمالات ہوں گے اور ہر طرح کی سیادت اس کو حاصل ہو گی اور تمام عیوب سے پاک ہو گا اور ہر آفت سے

منزہ ہوگا کھانے پینے کا محتاج نہ ہوگا قدیم ہوگا اس لئے اس کا کوئی والد نہ ہوگا اس کا کوئی ہم جنس نہ ہوگا اس لئے اس کی اولاد نہ ہوگی اس سے کوئی بالا نہ ہوگا بلکہ اس کے مثل بھی کوئی نہ ہوگا غرض اس کے مرتبہ تک فہم و عقل کی رسائی نہ ہوگی۔ وہ سب سے اونچا ہوگا۔

اَللّٰہُ اَحَدٌ کہنے کے بعد اَللّٰہُ الصَّمَدُ اور بعد والے جملے کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اَللّٰہُ اَحَدٌ کے اندر یہ تمام معانی موجود ہیں ہاں ان جملوں کو مزید تاکید کی طرح قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جس طرح عام کے بعد خاص کو خاص کی اہمیت بتانے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے (باوجودیکہ خاص عام کا ایک حصہ یا ایک فرد ہوتا ہے اور بغیر استثناء کے کسی حکم کا عموم خاص کو بھی شامل ہوتا ہے) اسی طرح اللہ احد کے بعد باقی جملوں کو ذکر کیا تاکہ قوت کے ساتھ تنزیہ خداوندی کا اظہار ہو جائے اور جو لوگ توحید کے منکر تھے اور اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے اور خدا کو ہی تنہا مقصود نہیں جانتے تھے بلکہ مقصودیت میں دوسروں کو خدا کا شریک بناتے تھے ان کی تردید واضح اور صریحی طور پر ہو جائے۔ اسی لئے اَللّٰہُ الصَّمَدُ اور اس کے بعد والے جملہ میں حرف عاطف ذکر نہیں کیا اور اَللّٰہُ الصَّمَدُ میں لفظ اللہ دوبارہ ذکر کیا اس بات پر متنبہ کرنے کے لئے کو جو صمدیت سے متصف نہ ہو وہ معبودیت کا مستحق نہیں انسان کا مقصود صرف باری تعالیٰ ہونا چاہئے اللہ کے علاوہ کوئی چیز مقصود نہیں ہونا چاہئے اسی لئے صوفیہ کرام نے لا الہ الا اللہ کا معنی لا مقصود الا اللہ کہا ہے اور صراحت کی ہے کہ انسان کا جو (اصلی) مقصود ہے وہی اس کا معبود ہے کیونکہ عبادت کا معنی ہے معبود کے سامنے انتہائی عاجزی اور فروتنی ظاہر کرنا اور انسان اپنے مقصود کے لئے انتہائی فروتنی کا انکسار کرتا ہے پس جس کے لئے انتہائی فروتنی کی جائے یعنی جو مقصود ہو وہی معبود ہوگا۔

صوفیہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کرتے وقت غیر اللہ کی مقصودیت کی نفی کرتے ہیں اور ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے مقصود ہونے کا خیال بھی ان کے دلوں سے دور ہو جائے۔ اللہ ہر مشکل آسان کرنے والا ہے۔

لَمْ يَلِدْ ۙ مشرکوں نے کہا تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہودی قائل تھے کہ عزیز کا باپ خدا ہے۔ عیسائی کہتے تھے کہ مسیح اللہ کا بیٹا تھا اللہ نے فرمایا کہ اللہ کسی کا والد نہیں کیونکہ اسکا کوئی ہم جنس نہیں نہ اس کو کسی مددگار کی ضرورت ہے نہ کوئی اس کا قائم مقام ہے۔ اس کو کسی کی حاجت ہی نہیں نہ اس پر فنا آسکتی ہے۔

اللہ کا والد نہ ہونا اگرچہ دوامی ہے (وہ ہر زمانہ میں والدیت سے پاک تھا اور ہے اور رہے گا لیکن) آیت میں ماضی کا صیغہ کافروں کے قول کی تردید میں فرمایا دوسری بات یہ کہ اس کے بعد والا فقرہ ماضی ہے (اور اس کا ماضی ہونا ضروری ہے ورنہ بے معنی ہو جائے گا) اس کی رعایت سے اس جگہ ماضی کا صیغہ ذکر کیا۔

وَلَمْ يُولَدْ ۝ اور نہ وہ کسی کا جنا ہوا ہے کیونکہ ہر مولود حادث ہوتا ہے اور اللہ حدوث سے پاک ہے حدوث الوہیت کے منافی ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ اور اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔ كُفُوًا لَمْ يَكُنْ کی خبر ہے اور اَحَدٌ اس کا اسم ہے لَهٗ کا تعلق كُفُوًا سے ہے اللہ کی تنزیہ اور اللہ کے مثل کی نفی مقصود تھی اس لئے کفوا پر لَهٗ (متعلق) کو مقدم کر دیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقطع آیات کا لحاظ کرتے ہوئے لَهٗ کو مقدم ذکر کیا گیا ہو تینوں جملوں کو ترتیب وار عطف کے ساتھ بیان کیا کیونکہ ہر قسم کے مثل کی نفی کرنی مقصود تھی (بیٹا یا باپ یا کوئی غیر ہی مثل ہوتا ہے جب تینوں کی نفی کر دی تو ہر قسم کے مثل کی نفی ہو گئی) گویا تینوں جملے ایک جملہ کی طرح ہو گئے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ اللہ نے فرمایا آدم کا بیٹا مجھے جھوٹا قرار دیتا ہے حالانکہ اس کے لئے یہ جائز نہیں اور مجھے گالی دیتا ہے حالانکہ اس کے لئے یہ درست نہیں میری تکذیب تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے خدا نے مجھے جیسا پہلے پیدا کر دیا ایسا دوبارہ نہیں پیدا کرے گا حالانکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا دوبارہ پیدا کرنے سے میرے لئے سہل نہیں تھا اور گالی یہ دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے خدا نے اپنے لئے اولاد اختیار کی ہے حالانکہ میں واحد ہوں محتاج نہیں ہوں نہ والد ہوں نہ مولود ہوں نہ کوئی میرا مثل ہے۔

فصل

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم (ہر) رات میں ایک تہائی قرآن پڑھنے سے عاجز ہو صحابہؓ نے جواب دیا ہر شب ایک تہائی قرآن کیسے پڑھا جاسکتا ہے فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (ثواب میں) ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ رواہ مسلم۔ بخاری نے ایسی ہی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ کی نقل کی ہے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایات میں بھی ایسا ہی ہے اس کا ذکر ہم سورۂ زلزال کی تفسیر میں کرچکے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک فوجی دستہ کے ساتھ ایک شخص کو (کہیں) بھیجا یہ شخص ساتھیوں کو ہمیشہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ سے نماز پڑھاتا رہا جب وہ لوگ واپس آئے توانہوں نے حضور ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا ارشاد فرمایا اس سے پوچھو ایسا کیوں کرتا تھا اس شخص نے عرض کیا یہ (سراسر) رحمٰن کے اوصاف ہیں اس لئے میں اس کو پڑھنا پسند کرتا ہوں فرمایا اس کو اطلاع دے دو کہ اللہ بھی اس سے محبت رکھتا ہے متفق علیہ۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے سورت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سے محبت ہے فرمایا اس کی محبت تجھے جنت میں لے گئی رواہ الترمذی۔ بخاری نے بھی اس کی ہم معنی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے سنا فرمایا واجب ہوگئی میں نے عرض کیا کیا واجب ہوگئی فرمایا جنت۔ رواہ مالک الترمذی والنسائی۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص سوتے وقت دائیں کروٹ سے لیٹ کر سو بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتا ہے قیامت کا دن ہوگا تو پروردگار اس سے فرمائے گا میرے بندے اپنے دائیں رخ سے جنت میں داخل ہو جا رواہ الترمذی۔ وقال حسن غریب روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص روز سو بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتا ہے اس کے گناہ پچاس کے (سال کے) مٹا دیئے جاتے ہیں۔ ہاں اگر اس پر کسی کا) قرض ہو (تو وہ معاف نہیں ہوتا) رواہ الترمذی والدارمی۔ ایک روایت میں پچاس بار کا لفظ آیا ہے اور قرض کے استثناء کے الفاظ نہیں آئے۔ حضرت سعید بن المسیب کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد گیارہ بار پڑھی اس کے لئے جنت میں ایک محل بنا دیا جاتا ہے۔ اور جس نے بیس بار پڑھی اس کے لئے جنت میں دو محل بنا دیئے جاتے ہیں اور جس نے تیس بار پڑھی اس کے لئے جنت میں تین محل تیار کردیئے جاتے ہیں یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر تو ہمارے محل بہت ہوں گے فرمایا اللہ (کا عطیہ) اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ واللہ اعلم۔ سورت الاخلاص ختم ہوئی۔ بعونہ ومنہ۔

سورہ الفلق مدنی ہے اس میں 5 آیات ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلبی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سخت بیمار ہوگئے (خواب میں) رسول اللہ ﷺ کے پاس دو فرشتے آئے ایک سرہانے کھڑا ہوا دوسرا پائیں۔ پائینتی والے نے سرہانے والے سے کہا اس شخص کو کیا ہو گیا ہے سرہانے والے نے کہا بیمار ہے۔ پائینتی والے نے کہا کیا روگ ہے سرہانے والے نے کہا جادو۔ پائینتی والے نے کہا کس نے کیا ہے۔ سرہانے والے نے کہا لبید بن اعصم یہودی نے پائینتی والے نے کہا وہ کیا ہوا جادو کہاں ہے۔ (اور کیا ہے) سرہانے والے نے کہا وہ ایک تسمہ میں کیا گیا ہے جو کنویں کے اندر پتھر کے نیچے رکھا ہے تم کنویں پر جاؤ سب پانی کھینچ لو پتھر اٹھاؤ اور کھجور کے گابھ کو

لے کر جلا ڈالو صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر کو چند لوگوں کے ساتھ بھیجا لوگ کنویں پر گئے تو دیکھا کہ کنویں کا پانی مہندی کے پانی کی طرح (سرخ) ہے ان لوگوں نے پتھر اٹھا کر گابھ کو نکال کر جلایا تو اسکے اندر سے ایک تانت نکلی جس میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں اس پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ رسول اللہ ﷺ جو نہی ایک آیت پڑھتے تھے ایک گرہ کھل جاتی تھی۔ بیہقی فی دلائل النبوہ۔

ابو نعیم نے دلائل میں ابو جعفر رازی کی روایت سے حضرت انسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ پر کچھ کیا تھا جس سے آپ کو سخت دکھ ہو گیا تھا صحابہ دیکھنے حاضر ہوئے تو انہوں نے خیال کیا کہ حضور ﷺ کو کچھ بیماری ہے جبرئیلؑ معوذتین کو لیکر نازل ہوئے اور حضور ﷺ نے ان دونوں سورتوں سے تعوذ کیا اور تندرست ہو کر باہر صحابہؓ کے پاس تشریف لے آئے۔ صحیحین میں اس کی تائیدی شہادت نزول سورت کے علاوہ بھی موجود ہے۔ (یعنی دعاء سے تعوذ جائز ہے)

بغوی نے حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتا تھا یہودیوں نے خفیہ سازش کی اور اس کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کے ذریعہ سے رسول اللہ ﷺ کی کنگھی کے بال اور کنگھی کے چند دندانے حاصل کر لئے پھر ان پر جادو کیا اس کام کا ذمہ دار لبید بن اعصم یہودی تھا اس پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیمار ہو گئے کچھ توہم سا ہو گیا ان کئے کام کو آپ خیال کرتے تھے کہ میں کر چکا ہوں آپ نے پروردگار سے دعا کی پھر فرمانے لگے کہ اللہ سے میں نے جو کچھ دریافت کیا تھا اللہ نے بتا دیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا بات ہے فرمایا خواب میں دو آدمی آئے ایک میرے سرہانے کھڑا ہوا اور دوسرا پائیں۔ ایک نے دوسرے سے کہا اس شخص کا دکھ کیا ہے۔ دوسرے نے کہا یہ سحر زدہ ہے اول نے پوچھا کس نے سحر کیا ہے دوسرے نے کہا لبید بن اعصم نے اول نے کہا کس چیز پر کیا ہے دوسرے نے کہا کنگھی پر کنگھی کے بالوں پر اور نر کھجور کے گابھ پر۔ اول نے کہا یہ چیزیں کہاں ہیں۔ دوسرے نے کہا بنی زریق کے چاہ ذروان میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اس خواب کے بعد رسول اللہ ﷺ کنویں پر تشریف لے گئے اور واپس آ کر فرمایا۔ واللہ اس کا پانی تو مہندی کے پانی کی طرح تھا اور وہاں کے کھجور کے درخت ایسے تھے جیسے بھوتوں کے سر۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر آپ نے اس کو نکال کیوں نہ لیا فرمایا مجھے تو اللہ نے شفا دے دی میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ لوگوں میں فتنہ اٹھاؤں۔ بغوی کا بیان ہے روایت میں آیا ہے کہ وہ کنویں کے اندر ایک پتھر کے نیچے تھا لوگوں نے پتھر اٹھا کر اس کے نیچے سے کھجور کا کھوکھلا گابھ بھی بر آمد کر لیا اس میں رسول اللہ ﷺ کے سر کے کچھ بال اور کنگھی کے دندانے موجود تھے۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت یزید بن ارقم کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کیا تھا جس سے آپ دکھی ہو گئے تھے جبرئیلؑ نے آ کر بتایا کہ ایک یہودی نے آپ پر جادو کیا ہے اور جادو کی کچھ گرہیں لگائی ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر اس کو بر آمد کرا لیا اور جوں ہی ایک گرہ کھولتے تھے مرض میں خفت محسوس ہوتی تھی آخر آپ بالکل تندرست ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے گویا زانو بند کھل گیا۔ لیکن اس کا تذکرہ اس یہودی سے نہیں کیا اور نہ اس کے منہ پر کچھ فرمایا۔

بیہقی نے دلائل میں اور ابن مردویہ نے اس روایت کی حضرت عائشہؓ کی طرف نسبت کی ہے کہ ایک یہودی نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کر دیا ایک تانت میں گیارہ گرہیں لگا کر تانت کنویں کے اندر پتھر کے نیچے چھپا دیا آپ بیمار ہو گئے اور معوذتین کا نزول ہوا اور جبرئیلؑ نے سحر کی جگہ بتا دی۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ حضرت علیؓ اس تانت کو لے آئے آپ نے دونوں سورتیں اس پر پڑھیں جوں ہی ایک آیت پڑھتے تھے ایک گرہ کھل جاتی تھی اور آپ کو مرض میں کچھ خفت محسوس ہوتی تھی۔

روایت میں آیا ہے کہ آپ اس دکھ میں چھ ماہ مبتلا رہے اور تین راتیں تو بہت شدت رہی آخر معوذتین نازل ہوئیں۔

مسلم نے حضرت ابو سعید کی روایت لکھی ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے آکر کہا محمد ﷺ کیا تم کو دکھ ہے فرمایا ہاں حضرت جبرئیلؑ نے کہا بسم الله ارقیک من کل شیئی یئوذیک من شرکل نفس اوعین حاسد الله یشفیک بسم الله ارقیک۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ① الفلق تاریکی پھٹ کر صبح نکل آنا۔

جابر بن الحسن۔ سعید بن جبیر مجاہد اور قتادہ کے نزدیک یہی معنی مراد ہے جو معنی آیت فَالِقُ الْاِصْبَاحِ میں مراد ہیں۔ وہی اس جگہ مراد ہیں۔ بعض نے کہا (فلق کا معنی ہے پھاڑنا) اس جگہ بھی وہی معنی مراد ہے جو فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی میں مراد ہے اللہ اناج کا دانہ اور گٹھلی پھاڑ کر سوئی نکالتا ابر کو پھاڑ کر پانی نکالتا زمین کو پھاڑ کر چشمے بر آمد کرتا اور رحم کو کھول کر بچہ کو نکالتا ہے۔ ضحاکؒ نے کہا کل خلق مراد ہے والبی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہ قول آیا ہے۔ مشہور اول ہے۔ اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے اور ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہ قول آیا ہے کہ الفلق جہنم کے اندر ایک قید خانہ ہے۔ کلبی نے کہا جہنم میں ایک وادی ہے ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ الفلق جہنم کے اندر سرپوش کنواں ہے۔ ابن جریر اور بیہقی نے لکھا ہے کہ عبدالجبار خولانی نے بیان کیا کہ دمشق میں ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ تشریف لائے اور دنیا میں لوگوں کو مشغول دیکھ کر فرمایا ان کو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کیا ان سے آگے فلق نہیں ہے لوگوں نے پوچھا فلق کیا ہے فرمایا دوزخ میں ایک کنواں ہے جب اس کو کھولا جائے گا تو دوزخی بھی اس سے بھاگیں گے۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے عمرو بن عتبہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ الفلق جہنم کے اندر ایک کنواں ہے جب اس کو کھولا جائے گا اور اس کے اندر سے آگ بر آمد ہوگی تو اس کی تیزی سے جہنم بھی چیخے گی۔

ابن ابی حاتم اور ابن جریرؒ نے حضرت کعب کا قول نقل کیا ہے۔ کہ الفلق جہنم کے اندر ایک گھر ہے جب اس کو کھولا جائے گا تو جہنم والے بھی اس کی گرمی کی شدت سے چیخیں گے۔ ابن ابی حاتم ناقل ہیں کہ حضرت زید بن علیؒ نے اپنے آباء کرام (حضرت امام حسینؓ، حضرت علیؓ وغیرہ ہم) کے حوالہ سے بیان کیا کہ الفلق جہنم کی تہ میں ایک کنواں ہے۔ اللہ نے پناہ مانگنے کے حکم میں اس جگہ رب الفلق کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لئے کیا کہ جہنم اور فلق سب سے بڑی تکلیف دہ مصیبت اور عظیم الشان شر ہے پس اس کا خالق اور مالک یقیناً ہر شر کو رفع کرنے پر قادر ہے لہٰذا اس وصف کے ساتھ اس کا تذکرہ کرنا تمام برائیوں کے دفعیہ کا سبب ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ② مَا خَلَقَ سے مراد کل مخلوق ہے یعنی ہر مخلوق کے شر سے میں پناہ لیتا ہوں مالک فلق کی۔ کوئی ممکن شر سے خالی نہیں عدم ہر ممکن کی حقیقت میں داخل ہے (ممکن وہی ہوتا ہے جو وجوب وجود کا مقتضی نہیں ہوتا اس کی نسبت وجود و عدم دونوں سے برابر ہوتی ہے) ہاں اگر اللہ کی ذاتی اور صفاتی تجلیات سے جگمگا جائے تو ممکن کی ہر خرابی دور ہو جاتی اور شر خیر سے بدل جاتی ہے اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ ان کی برائیاں اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا شیطان ہے مگر وہ مجھے خیر کے سوا مشورہ نہیں دیتا۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ آیت میں صرف عالم خلق کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم اس لئے دیا کہ عالم امر سراسر خیر ہے اس میں کوئی شر ہے ہی نہیں۔ عالم خلق کی شر یا اختیاری اور خود آورد ہے یا طبعی اور نیچرل۔ اختیاری شر کا نقصان یا صرف اپنی ذات تک محدود رہتا ہے جیسے کفر یا دوسروں تک پہنچتا ہے جیسے ظلم طبعی شر جس میں انسانی اختیار کو دخل نہیں۔ اشیاء کے طبعی خواص و لوازم ہیں جیسے آگ جلاتی ہے اور زہر ہلاک کرتا ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ غَسَق کا لغوی معنی ہے بھر جانا اللہ نے فرمایا ہے اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ یعنی رات کے بھرپور تاریک ہونے تک۔ غسق العین آنکھ آنسوؤں سے بھر گئی۔ غسق القمر چاندنی بھرپور ہو گئی۔ قاموس میں ہے غاسق چاند اور رات جب کہ اس کی شفق غائب ہو جائے غسوق اور اغساق تاریک ہو جانا۔

بعض علماء نے کہا کہ غَسَق کا معنی ہے بہنا غَسَقِ اللَّيْلُ کہرا اور تاریکی غسق العين آنسو بہنا غسق القمر چاند کی سرعت رفتار۔ بعض علماء کا قول ہے کہ غسق کا معنی ہے ٹھنڈک سردی رات دن سے ٹھنڈی ہوتی ہے چاند سورج سے ٹھنڈا ہوتا ہے اسی لئے رات اور چاند کو غاسق کہتے ہیں اور اسی بناء پر چاند کو زمہریر بھی کہا جاتا ہے۔

اس جگہ غاسق سے چاند مراد ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا عائشہؓ اللہ کی پناہ مانگ اس غاسق کی شر سے جب یہ ڈوبنے لگے۔ رواہ البغوی بسندہ۔ اس صورت میں اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ کا معنی ہوگا جب وہ بے نور ہونے لگے اور غائب ہونے لگے کیونکہ چاند کے نور میں کمی پورا چاند ہونے اور بھرپور نور ہو جانے کے بعد ہی شروع ہو جاتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور مجاہدؒ نے فرمایا اس سے مراد رات ہے جب وہ آرہی ہو اور اس کی تاریکی دن کی روشنی میں گھسنے لگی ہو۔ ابن زید نے کہا اس سے مراد ہے نیچے کو گرتا ہوا ثریا ستارہ کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ ثریا کے غروب ہونے پر بیماریاں اور بلائیں زیادہ ہوتی ہیں اور ثریا کے طلوع پر جاتی رہتی ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴿۴﴾ اور گرہوں پر دم کرنے والیوں کے شر سے۔ النفثت جمع مونث کا صیغہ ہے اس کا موصوف محذوف ہے یعنی سحر کرنے والی شخصیتیں یا عورتیں جو افسوں پڑھنے اور رسول اللہ ﷺ پر جادو کرنے کے وقت دھاگے کی گرہوں پر دم کرتی تھیں۔ ابو عبیدہؒ نے کہا لبید کی بیٹیاں لبید کے حکم سے ایسا کرتی تھیں۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ اور حاسد کے اس وقت کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جبکہ وہ حسد کا مظاہرہ کر رہا ہو اور اذیت رسانی میں مشغول ہو۔ یہ قید لگانے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ مظاہرۂ حسد اور اذیت رساں عمل میں مشغول ہونے سے پہلے حسد کا دکھ حاسد ہی کو پہنچتا ہے دوسرے کی خوشی سے اسی کو رنج ہوتا ہے (لیکن وہ جل کر ضرر رساں عمل کرنے لگتا ہے تو اس شخص کو دکھ پہنچنے لگتا ہے جس سے حاسد جلتا ہے)

شَرِّ مَا خَلَقَ ہر شر کو شامل تھا اس کے بعد ذکر ہونے والے تینوں شر یعنی شَرِّ غَاسِقٍ اور شَرِّ النَّفّٰثٰتِ اور شَرِّ حَاسِدٍ اس میں داخل تھے اس کے باوجود خصوصیت کے ساتھ اس کو اس لئے ذکر کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو شر کیا گیا تھا اس میں ان تینوں خباثتوں کو دخل تھا جادو بھی تھا اغواء ابلیس بھی تھا اور حسد لبید بھی تھا۔

حَاسِدٍ اور غَاسِقٍ کو نکرہ اور اَلنَّفّٰثٰتِ کو جمع معرف باللام ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لبید کی بیٹیاں تو مخصوص اور معین تھیں ان کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرنے کا حکم بصیغہ خصوصیت (معرف باللام) دے دیا لیکن غاسق اور حاسد معین نہ تھا رسول اللہ ﷺ سے حسد کرنے والے بے شمار تھے اور ہمیشہ ہر وقت ہی حسد کرتے رہتے تھے اس لئے ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی دعا کرنے کا حکم بصیغہ عموم نکرہ دیا۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں سورت ھود اور سورت یوسف پڑھتا ہوں۔ فرمایا قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے زیادہ بارگاہ خداوندی میں رسائی رکھنے والی (کوئی سورت) تم نہیں پڑھو گے۔ رواہ احمد والدارمی والنسائی۔ واللہ اعلم۔

سورۃ الفلق ختم ہوئی۔
بعونہ ومنہ تعالیٰ

سورۃ الناس مدنی ہے اس میں ۶ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ رَبِّ النَّاسِ یعنی خالق پروردگار اور تمام امور کو درست کرنے والا۔ اے محمد ﷺ کہہ دو کہ میں انسانوں کو پیدا کرنے والے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں۔

مَلِكِ النَّاسِ ② جو انسانوں کا مالک اور ان کے مصالح کا مدبر ہے۔

اِلٰهِ النَّاسِ ③ انسانوں کا معبود ہے۔ مَلِكِ النَّاسِ اور اِلٰهِ النَّاسِ رَبِّ النَّاسِ کا بیان توضیحی ہے۔ کیونکہ مربی کا اطلاق باپ پر بھی ہوتا ہے اور گھر کے سرپرست پر بھی اور مالک پر بھی اور مربی بایں معنی نہ مَلِک ہوتا ہے نہ معبود لیکن اگر کبھی مربی مَلِک ہوتا بھی ہے تو مَلِک کا اطلاق بادشاہ پر ہوتا ہے اور بادشاہ معبود نہیں ہوتا اس کو معبودیت کا استحقاق نہیں ہوتا اس لئے رَبِّ النَّاسِ کے بعد مَلِكِ النَّاسِ اور اِلٰهِ النَّاسِ کہنا ضروری تھا تاکہ وضاحت ہو جائے کہ وہ مربی بھی ہے اور حاکم بھی اور معبود بھی نہ تنہا مربی ہے اور نہ صرف مربی بادشاہ بلکہ معبود بھی ہے)

النّاس میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین ہیں اللہ کی ربوبیت ملوکیت اور الوہیت عمومی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ اور متبعین حضور ﷺ کا خصوصی ذکر اظہار شرف کے لئے کیا گیا ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں سورتوں کے نزول کی غرض یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے متبعین سے سحر کا اثر زائل کر دیا جائے کیونکہ مربوب کی شر سے حفاظت رب کے ذمہ اور مملوک کی حفاظت مَلِک کے ذمہ اور عابد کی حفاظت معبود کے ذمہ لازم ہے (یعنی ربوبیت ملوکیت اور الوہیت کا تقاضا ہے کہ مربوب مملوک اور عابد کو ہر شر سے محفوظ رکھا جائے) غوث الثقلین نے فرمایا ہے۔

جب تو میرا پشت پناہ ہے تو کیا مجھے کوئی ذلت پہنچ سکتی ہے جب تو میرا مددگار ہے تو کیا مجھ پر ظلم کیا جا سکتا ہے اگرچہ اگاہ کی حفاظت کرنے والا حفاظت کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہو اور پھر اونٹ کے پاؤں باندھنے کی ایک رسی بھی صحرا میں کھو جائے تو ایسے راعی کے لئے بڑی عار کی بات ہے۔ کفار بھی اگرچہ مربوب اور مملوک خدا ہی کے ہیں لیکن ان کو اس کا اعتراف نہیں اس لئے وہ حفاظت الٰہیہ کے مستحق نہیں ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جنگ احزاب کے دن فرمایا تھا اللہ ہمارا مولا ہے اور تمہارا کوئی مولا نہیں۔

مؤخر الذکر دونوں فقروں میں بجائے ضمیر کے النّاس کا مکرر سہ کرر ذکر بیان توضیح میں زیادتی کرنے کے لئے نیز رسول اللہ ﷺ اور آپ کے متبعین کے شرف کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ سورہ الفلق میں جسمانی دکھوں سے استعاذہ کا حکم تھا اور جسمانی دکھ انسان کو بھی ہوتے ہیں اور دوسرے جانوروں کو بھی اس لئے رَبِّ الْفَلَقِ فرمایا اور رب کی اضافت الفلق کی طرف کی اور سورہ النّاس میں ان نفسانی مضرتوں سے استعاذہ کا حکم ہے جو انسان کے لئے مخصوص ہیں (یعنی وسوسہ انگیزی اور اغواء شیطانی) اس لئے یہاں رَبِّ النَّاسِ فرمایا اور رب کی اضافت خصوصیت کے ساتھ النّاس کی طرف کی گویا مطلب اس طرح ہوا کہ انسان کو وسوسہ میں ڈالنے والے اور اغواء نفسانی کرنے والے کے شر سے میں اس خدا کی پناہ لیتا ہوں جو انسانوں کے امور کا مالک اور ان کی عبادت کا مستحق ہے۔

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ اَلنَّاسُ کو صراحت کے ساتھ پانچ بار ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ النّاس سے مراد جدا جدا ہے اگر ضمیر استعمال کی جاتی تو ایک ہی مفہوم مراد ہوتا وحدت مراد ہو جاتی اور کلام کا مقصد پورا نہ ہوتا)۔

اول النّاس سے بچے مراد ہیں جو محتاج پرورش ہوتے ہیں لفظ رب اس پر دلالت کر رہا ہے، دوسری جگہ النّاس سے جوان مراد ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں لفظ مَلِک اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ لفظ سیاست کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے (اور مجاہدین سیاست کے حاجت مند ہوتے ہیں) تیسری جگہ اَلنَّاسُ سے بوڑھے لوگ مراد ہیں جو دنیوی کاروبار اور مشاغل سے الگ ہو کر اللہ ہی کی طرف جھک جاتے ہیں اس پر لفظ اِلٰہ دلالت کر رہا ہے جس کے اندر عبادت کا مفہوم ہے اور بوڑھے لوگوں کا

شغل سوائے عبادت کے اور کچھ نہیں رہتا چوتھی جگہ الناس سے مراد اہل صلاح و تقوی ہیں کیونکہ شیطان انہی کا دشمن ہوتا ہے پانچویں جگہ الناس سے مراد اغواء کرنے والے مفسد ہیں کیونکہ یہ وہی خناس ہیں جن سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مومنوں کے بچوں بڑوں اور صلاح و تقوی والوں کا ذکر رحمت کی کشش اور عذاب کے دفع کا سبب ہے اس لئے ان تینوں کا ذکر کیا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کمر جھکے بوڑھے مرد اور شیر خوار بچے اور چرنے والے چوپائے نہ ہوتے تو عذاب کی بارش تم پر ہوتی۔ رواہ ابو یعلی والبزار والبیہقی حدیث ابی ہریرۃؓ اس کی تائید ایک مرسل روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو ابو نعیم نے بروایت زہری بیان کیا ہے اور اللہ نے فرمایا ہے اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہیں جانتے تو.......الخ۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ عبارت کلام دلالت کر رہی ہے کہ اللہ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے اعادۂ تخلیق اس کے لئے ناممکن نہیں اور کلام کی ترتیب عارف کے تدریجی مراتب تفکر کو بھی بتا رہی ہے اللہ نے جو ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کو دیکھ کر سب سے پہلے عارف یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا ایک رب ضرور ہے پھر غور کرنے کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ رب کسی کا محتاج نہیں سب اس کے محتاج ہیں تمام نظمی امور اسی کے ہاتھ میں ہیں لامحالہ حقیقی حکمراں اور بادشاہ وہی ہے پھر (جب آغاز آفرینش اور نظم حیات اسی کا ساختہ پرداختہ ہے تو) عارف اس سے استدلال کرتا ہے کہ معبود برحق اور مستحق معبودیت بھی وہی ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۥ الوسواس بروزن زلزال اسم ہے وسوسہ کا ہم معنی ہے وسوسہ اس خفیف خفیہ آواز کو کہتے ہیں جس کا مفہوم تو دل تک پہنچ جائے اور تلفظ سنائی نہ دے (یعنی ذہنی آواز) یہاں وَسْوَاسْ سے مراد شیطان ہے یعنی وسوسہ پیدا کرنے والا۔ یا تو اس وجہ سے کہ مبالغۃً مصدر کو بجائے اسم فاعل کے استعمال کر لیا جاتا ہے یا مضاف محذوف ہے یعنی وسوسہ ڈالنے والا کذا قال الزجاج۔

الْخَنَّاسِ ۝ یہ الوَسْوَاسِ کی صفت ہے (خَنَسْ اور خُنُوسْ کا معنی ہے چپکے سے پیچھے ہٹنا) شیطان کا طریقہ اور معمول ہے کہ اللہ کی یاد کے وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے (اس لئے اس کو خناس فرمایا) حضرت عبداللہ بن شقیق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل میں دو خانے ہوتے ہیں ایک فرشتہ کا دوسرا شیطان کا جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل میں چبھو دیتا ہے اور اس کو بہکاتا ہے۔ رواہ ابو یعلی۔ ابو یعلی نے یہ حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہے۔

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ جو لوگوں کے سینوں کے اندر وسوسہ پیدا کرتا ہے یعنی جب وہ اللہ کی یاد نہ کریں، الَّذِیْ سے الْوَسْوَاس کی دوسری صفت بیان کی گئی ہے اس لئے (محلاً) مجرور ہے یا (محلاً) منصوب علی الذم ہے یا محذوف مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ یہ وَسْوَاس کا بیان ہے یا الذی کا۔ (مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا) یعنی وسوسہ پیدا کرنا جنات کا فعل بھی ہے اور انسانوں کا بھی اللہ نے فرمایا ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ الخ ہم نے انسانی اور جنی شیطانوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے الخ خلاصہ یہ کہ اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ جن و انس کے شر سے پناہ مانگو۔

شبہ: ایک انسان دوسرے انسان کے دل میں وسوسہ نہیں ڈالتا یہ کام تو جن کا ہے پھر انسان کو وسوسہ انداز کیوں قرار دیا۔

ازالہ: آدمی بھی وسوسہ ڈالتے ہیں لیکن ان کی وسوسہ اندازی کا طریقہ انہی کے مناسب ہے آدمی آدمی سے ایسی بات کہتا ہے جو اس کے دل میں جم جاتی ہے اس سے وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔ یا مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ کا تعلق یُوَسْوِسُ سے ہے یعنی لوگوں کے سینوں کے اندر جنات اور انسانوں کے معاملات کے متعلق وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ کلبی نے کہا کہ صُدُوْرِ النَّاسِ میں جو الناس ہے مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اسی کا بیان ہے گویا انسان کا لفظ دونوں کو شامل ہے جن کو بھی اور آدمی کو بھی (یعنی انسان

ع ۱
۲۹

جن بھی ہوتا ہے اور آدمی بھی) جن پر انسان کا اطلاق اسی طرح کیا گیا جس طرح آیت وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ میں رجال کا اطلاق جن پر کیا گیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ایک عربی شخص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ دوران گفتگو میں اس نے کہا جنات کی ایک جماعت آکر کھڑی ہو گئی پوچھا گیا تم کون ہو انہوں نے جواب دیا جنات کے آدمی۔ فراء کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مِنَ الْجِنَّةِ، اَلْوَسْوَاس کا بیان ہو اور اَلنَّاس کا عطف اَلْوَسْوَاس پر ہو اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا میں پناہ مانگتا ہوں وسوسہ ڈالنے والے جنی شیطان کے شر سے اور انسانوں کے شر سے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تجھے نہیں معلوم کہ آج رات ایسی آیات نازل ہوئی ہیں جن کی مثل کبھی کوئی سورت نہیں نازل ہوئی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ رواہ مسلم۔ امام احمد کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تجھ کو ایسی سورتیں نہ سکھلادوں جن کی مثل نہ توریت میں کوئی سورت نازل ہوئی نہ زبور میں نہ انجیل میں نہ قرآن میں۔ میں نے عرض کیا کیوں نہیں (ضرور سکھلا دیجئے) فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو بستر پر جاتے تو دونوں ہتھیلیاں اکٹھی کر کے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر دونوں ہتھیلیوں پر دم کر کے سارے بدن پر جہاں تک پھیر سکتے پھیر لیتے تھے سر اور چہرہ سے ہاتھ پھیرنا شروع کرتے اور پھر اگلے سارے بدن پر پھیرتے تھے یہ سارے بدن کا مسح تین بار کرتے تھے۔ متفق علیہ۔

حضرت عقبہ بن عامر کا بیان ہے کہ جحفہ اور ابواء کے درمیان میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب جارہا تھا اچانک ہوا کا طوفان آگیا اور سخت تاریکی ہم پر چھا گئی رسول اللہ ﷺ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھنے لگے اور فرمایا عقبہ تو بھی یہ دونوں سورتیں پڑھ کر استعاذہ کر کسی پناہ جو نے ان دونوں کی طرح کسی دعا سے استعاذہ نہیں کیا تعوذ اور استعاذہ کا معنی ہے پناہ کے لئے دعا کرنا ابوداؤد۔ حضرت عبداللہ بن حبیبؓ کا بیان ہے کہ ایک رات بارش اور سخت اندھیری تھی ہم رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرنے کے لئے اس رات نکلے تلاش کے بعد ہم نے حضور ﷺ کو پالیا فرمایا کہو میں نے عرض کیا کیا کہوں فرمایا صبح شام تین تین بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور معوذتین پڑھ لیا کرو ہر مصیبت والی چیز سے تمہارا بچاؤ ہو جائے گا۔ رواہ الترمذی و ابوداؤد و النسائی۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوئے تو معوذتین پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرتے تھے لیکن جب بیماری سخت ہو گئی تو میں حضور ﷺ پر پڑھ دیتی اور برکت دست حاصل کرنے کے لئے دست مبارک پکڑ کر بدن پر پھیر دیتی تھی۔ رواہ البغوی۔ سورہ الناس ختم ہوئی۔

فصل

فضائل قرآن مجید

حضرت عثمان بن عفانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا رواہ البخاری و مسلم بیہقی نے الاسماء میں اتنا زائد بیان کیا ہے تمام کلاموں پر قرآن کی فضیلت ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت مخلوق پر۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رشک صرف دو شخصوں پر جائز ہے ایک وہ شخص جس کو اللہ نے قرآن عطا فرمایا اور وہ اوقات روز و شب میں اسی میں لگا رہتا ہے دوسرا وہ شخص جس کو اللہ نے مال عنایت کیا اور وہ رات دن اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن عرش کے نیچے تین چیزیں

ہوں گی (1) قرآن مجید اس کا ایک ظاہر ہے ایک باطن یہ بندہ کی طرف سے حجت کرے گا (2) امانت (3) رحم (رشتہ قرابت) رحم پکار کر کہے گا سنو جس نے مجھے جوڑے رکھا اللہ اس کو اپنے رشتہ میں جوڑے اور جس نے مجھے توڑا اللہ اس سے اپنا رشتہ توڑے۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن والے سے قیامت کے دن کہا جائے گا پڑھ اور چڑھ اور ترتیل کر جس طرح دنیا میں ترتیل کرتا تھا آخری آیت جہاں تو پڑھنا ختم کرے وہی تیرا مرتبہ قیام گاہ ہے۔ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد والنسائی۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے جس کو تلاوت قرآن میرے ذکر سے باز رکھے اور تلاوت کے بعد وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں جتنا دوسرے سوال کرنے والوں کو دیتا ہوں سب سے بہتر اس کو دیتا ہوں۔ تمام کلاموں پر کلام اللہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے مخلوق پر خدا کی فضیلت۔ رواہ الترمذی والدارمی والبیہقی۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اس کے لئے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا ثواب دس گنا ہو گا میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ رواہ الترمذی والدارمی ترمذی نے اس حدیث کی اسناد کو حسن صحیح غریب کہا ہے۔ حارث اعورؓ کا بیان ہے میرا مسجد کی طرف سے گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگ احادیث میں کچھ موشگافیاں کر رہے ہیں میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ کی اطلاع دی فرمایا کیا وہ ایسا کر رہے ہیں میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا سنو میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہوشیار رہو عنقریب فتنہ ہو گا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر اس سے خلاصی کی راہ کیا ہو گی فرمایا اللہ کی کتاب جس کے اندر تم سے پہلے کی خبریں ہیں اور تم سے بعد کی خبریں ہیں اور تمہارے باہمی فیصلے ہیں قرآن قطعی فیصلہ ہے مذاق نہیں ہے جو کسی ظالم کی وجہ سے اس کو چھوڑ دے گا اللہ اس کو توڑ دے گا تباہ کر دے گا جو اس کو چھوڑ کر کسی اور سے ہدایت کا طلب گار ہو گا اللہ اس کو گمراہ کر دے گا یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے یہی پر حکمت نصیحت ہے یہ صراط مستقیم ہے یہی وہ کتاب ہے کہ اس کی وجہ سے میلانات میں کجی نہیں آئے گی اور زبانوں میں اشتباہ نہ ہو گا اور علماء اس سے سیر نہیں ہوں گے اور بار بار کثرت سے پڑھانا اس کو بوسیدہ نہ بنا سکے گا اس کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے یہی وہ کتاب ہے کہ جنات میں (غفلت سے) بیداری اس وقت تک نہ ہوئی جب تک انہوں نے کہہ نہ دیا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا جو راہ راست بتاتا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے جو شخص اس کے موافق بات کرے گا سچا ہو گا اور جو اس پر عمل کرے گا اس کو اجر دیا جائے گا۔ اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا انصاف کرے گا اور جو اس کی طرف بلایا گیا اس کو صراط مستقیم بتادی گئی رواہ الترمذی والدارمی۔ حضرت معاذ جہنی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن پڑھا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل بھی کیا قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی اس روشنی سے بہتر ہو گی جو تمہارے گھروں میں ہوتی ہے (تو اس کے والدین کی حالت ہو گی) پھر اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جس نے خود اس پر عمل کیا۔ رواہ احمد وابو داؤد۔

حضرت عقبہؓ بن عامر کا قول ہے میں نے خود سنا کہ حضور ﷺ فرما رہے تھے اگر قران کو کسی کھال میں رکھ دیا جائے پھر آگ میں ڈالا جائے تو قرآن نہیں جلے گا (یا وہ کھال نہیں جلے گی یعنی جس کے سینہ میں قرآن ہو گا اور اس کو دوزخ میں ڈالا جائے گا تو وہ نہیں جلے گا۔ واللہ اعلم رواہ الدارمی۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن پڑھا اور اس کو اپنا پشت پناہ بنایا اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام قرار دیا اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس آدمیوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرمائے گا جن کے لئے دوزخ لازم ہو چکی ہو گی رواہ احمد و الترمذی (ابن ماجۃ والدارمی)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن نماز کے اندر پڑھنا بیرون صلوٰۃ قرآن پڑھنے سے افضل ہے اور بیرون نماز قران پڑھنا تسبیح و تکبیر (سبحان اللہ واللہ اکبر) پڑھنے سے افضل ہے اور تسبیح سبحان اللہ پڑھنا صدقہ سے افضل

ہے اور صدقہ خیرات کرنا روزہ سے افضل ہے اور روزہ دوزخ سے بچنے کی سپر ہے
حضرت اوس ثقفیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلا دیکھے قرآن پڑھنے کے ہزار مرتبے ہیں اور قرآن میں دیکھ کر پڑھنے کے مراتب دوگنے ہیں یعنی دو ہزار۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان دلوں پر زنگ آجاتا ہے جیسے لوہے پر پانی لگنے کے بعد زنگ آجاتا ہے عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ پھر اس کی صفائی کیسے ہو فرمایا اس کی جلاء کثرت ذکر موت اور تلاوت قرآن ہے۔ مذکورہ بالا تینوں احادیث بیہقی نے شعب الایمان میں بیان کی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کسی کلام کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنی توجہ سے نبی کی خوش آوازی کے ساتھ قرآن خوانی کو سنتا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ اس قدر کان نہیں لگاتا کسی چیز کی طرف یعنی خوش آہنگی اور بلند آواز سے قرآن پڑھنے کی طرف جس قدر نبی کی آہنگی کے ساتھ تلاوت قرآن کرنے کی طرف کان لگاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو اچھی لے سے قرآن نہ پڑھتا ہو۔ بخاری

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ہم قرآن پڑھ رہے تھے ایک عجمی دیہاتی بھی ہم میں موجود تھا اچانک رسول اللہ ﷺ بر آمد ہو گئے اور فرمایا پڑھو ہر ایک کا پڑھنا اچھا ہے عنقریب کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن کی قراءت کو سیدھا کریں جیسے تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے پڑھنے میں جلدی کریں گے۔ یعنی پڑھنے کا عوض دنیا میں لیں گے آخرت کے ثواب کے لئے نہیں پڑھیں گے۔ ابوداؤد والبیہقی۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قرآن کو عربی لے اور عربی آہنگ سے پڑھو عشاق اور اہل کتاب کے دونوں گروہوں کی لے سے اجتناب رکھو آئندہ میرے بعد کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو نغمہ اور نوحہ کی طرح قرآن کو ٹنکری سے پڑھیں گے قرآن پڑھتے وقت ان کے حلقوم سے آگے نہیں بڑھے گا ان کے دل فتنہ زدہ ہوں گے اور ان لوگوں کے دل بھی مبتلاء فتنہ ہوں گے جو ان کی اس کیفیت کو پسند کرتے ہوں گے بیہقی وابن رزین۔ حضرت عبیدہ ملیکی صحابی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بناؤ اوقاتِ روز و شب میں اس کی تلاوت کرو اور حق تلاوت پورا کرو اس کو پھیلاؤ۔ اس کو لے سے پڑھو اس کے اندر جو کچھ ہے اس پر غور کرو۔ تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔ اس کا معاوضہ طلب کرنے میں جلدی نہ کرو یعنی دنیا میں اس کا عوض نہ طلب کرو کیونکہ اس کا عظیم الشان عوض آخرت میں ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بہترین علاج قرآن ہے رواہ ابن ماجہ۔ دوسرے الفاظ میں ہے قرآن ہی علاج ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں آیا ہے کہ (بیماری کے لئے) دو شفا کی چیزیں اختیار کرو شہد اور قرآن۔ حضرت واثلہ بن اسقع کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے حلق کے درد کی شکایت کی فرمایا قرآن پڑھا کرو۔ بیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرے سینہ میں دکھ ہے فرمایا قرآن پڑھ اللہ قرآن کے متعلق فرماتا ہے۔ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔

حضرت طلحہؓ بن مطرف کا بیان ہے کہ جب کسی بیمار کے پاس قرآن پڑھا جائے تو اس کو بیماری میں خفت محسوس ہوتی ہے یہ بات رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کہی جاتی تھی۔ رواہ ابوعبیدہ۔ واللہ اعلم۔

والحمد لله رب العالمین و صلی الله تعالی علی خیر خلقه محمد و اله و اصحابه اجمعین

(کتبه نثار احمد راشد نئی بستی باڑہ ہندو راؤ دھلی ۱ ۱/۶۱ ع)